اردو میں اصولِ تحقیق

منتخب مقالات

مرتبہ

ڈاکٹر سلطانہ بخش

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور

اردو میں اصولِ تحقیق

منتخب مقالات

مرتبہ

ڈاکٹر سلطانہ بخش

مغربی پاکستان
اُردو اکیڈمی
C-25 لوئر مال روڈ، لاہور

نام کتاب	:	اصولِ تحقیق
تالیف	:	ڈاکٹر سلطانہ بخش
اشاعت سوم	:	۲۰۱۵ء
مطبع	:	حاجی محمد حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور
کمپوزر	:	عدنان حیدر
صفحات	:	۴۱۲
تعداد اشاعت	:	۶۰۰
قیمت	:	۶۰۰ روپے

یہ کتاب حکومت پنجاب کے محکمہ اطلاعات و ثقافت کی مالی اعانت سے شائع ہوئی۔

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی

C-25 لوئر مال روڈ، لاہور

0301-8408474

0333-4182396

فہرست

حصہ اول

❖❖❖❖

حصہ اول

(الف)

مقدمہ

(اشاعت اوّل: ۱۹۸۶ء)

ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش

کسی شے کو جاننے کی خواہش فطری ہے۔ کرید اور جستجو وہ جبلی طاقت ہے جو نسلِ انسانی کو تہذیب و تمدن کے ارتقائی سفر کو جاری رکھنے پر مجبور کرتی ہے جیتی جاگتی زندگی ایک مجاہدہ ہے۔ منزلِ آخر کبھی نہیں آتی ہمیشہ سفر جاری رہتا ہے۔ قومیں اور افراد اپنے اپنے نصب العین کی طرف رواں دواں ہیں۔ ان کے مرحلے، منزلیں اور معیار مختلف ہوتے ہیں۔ اور ان کی کامیابیوں کے درجات بھی الگ ہوتے ہیں۔

علمی دنیا میں ترقی کا ثبوت وہ تحقیقی کام ہے جو ہر شعبۂ علم میں ہوتا ہے۔ تحقیق کی بنیاد تلاش و جستجو، مشاہدات، تجربات اور علوم کے افہام و تفہیم پر ہوتی ہے۔ تحقیق ایک محتاط، سرگرم جستجو اور مسلسل کاوشِ اظہار ہے، جس میں مروجہ حقیقتوں کی تصدیق، نئی حقیقتوں کی تلاش اور سچائی کی کھوج مضمر ہے۔ جس کے منطقی نتائج تمام علوم کے لیے مفید ثابت ہوتے ہیں۔ اس سے علم و فن کی نئی راہیں دریافت ہوتی ہیں، نئی حقیقتیں ابھرتی ہیں اور نئے انکشافات جنم لیتے ہیں۔ ان نئی دریافتوں، نئے حقائق اور نئے انکشافات کی روشنی میں مروجہ نتائج یا نظریات پر نظر ثانی کی جاتی ہے اور ان کے اثرات کا کھوج لگا کر اس کی صحیح تاویل پیش کی جاتی ہے۔ بااین ہمہ انسان ہر امر کا ثبوت چاہتا ہے، تحقیق یہ ثبوت مہیا کرتی ہے۔ اس کی ابتدا کسی مسئلے یا موضوع سے ہوتی ہے، پھر حقائق کی کھوج کا عمل شروع ہوتا ہے اور مواد جمع کیا جاتا ہے۔ مواد کو تنقیدی تجزیے کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے اور شہادت کی بنا پر نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے، کیونکہ حقائق کی ضروری تصدیق اور دریافت کے بغیر تنقیدی یا فنی تاثر ممکن نہیں۔

تحقیق کی تعریف اور مفہوم کے بارے میں مختلف اہلِ علم اور دانش وروں نے اظہارِ خیال کیا ہے:

تحقیق [۱] عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی کھرے کھوٹے کی چھان بین یا کسی بات کی تصدیق کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں تحقیق کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے علم و ادب میں کھرے کھوٹے، مغز کو چھلکے سے، حق کو باطل سے الگ کریں"۔ تحقیق کسی موضوع پر مناسب معلومات حاصل کرنے کی باضابطہ جستجو ہے اور تحقیق [۲] "کسی امر کو اس کی اصلی شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے"۔

"تحقیق [۳] مخصوص حالات میں مخصوص شواہد اور روایات کی روشنی میں اس صداقت کی تلاش ہے جو محقق کی دسترس میں ہو یا اس کی دسترس میں ہو سکتی ہے"۔ اس طرح تحقیق ایک ایسی کوشش کا نام ہے جو علم کی پہلے تلاش، پھر تصدیق اور بعد میں اس کی تشہیر کرتی ہے۔

"Research si simply a systematic quest of uncovered truth. Research is simply the manner in which men solve the knotty problems in their attempt to push back the frontiers of human ignorance".(4)

سی۔سی کرافورڈ کے خیال میں تحقیق کا مفہوم یہ ہے کہ:

Research may be defined as a method of studying problems,whose solutions are to be derived partly or wholly from facts".(5)

ان تمام خیالات میں تحقیق کے بارے میں ایک مشترک عنصر ملتا ہے وہ حقیقت کی تلاش کا جذبہ اور حقائق کی بازیافت ہے، جو مختلف ذرائع سے حاصل کیے گئے اعداد و شمار کی چھان بین کے بعد نئی معلومات پیش کرتے ہوں۔ گویا تحقیق ایک موزوں، متوازن اور فکر یہ لائحہ عمل ہے جو کسی حالات کو معلوم کرنے میں اختیا کیا جاتا ہے۔ کسی امر کی اصلی شکل کی دریافت اس لیے ضروری ہوتی ہے کہ صحیح صورتِ حال معلوم ہو سکے۔ اس سلسلے میں جو شہادتیں مہیا کی جائیں اور جو معلومات حاصل کی جائیں وہ ایسی ہونی چاہیے کہ استدلال کے کام آسکیں تاکہ واقعات کی ترتیب میں صحیح طور پر اُن سے مدد ملے اور حدودِ تحقیق کے اندر نتائج نکالے جا سکیں۔

تحقیق کا فن بہت دشوار گزار اور محنت طلب ہے۔ اس راہ پر چلنے کے لیے صرف شوق ہی نہیں جنون درکار ہے۔ لیکن حقیقت تک رسائی چاہنے وا دیوانے کو فرزانگی کی بھی ضرورت ہے تاکہ وہ سمندر کی تہہ سے صرف گوہرِ مقصود تلاش کر سکے۔ دراصل تحقیق، تلاش و جستجو کے اعمال کو تمام قوتِ ارادی سے جاری رکھ کا نام ہے۔ یہ فن بہت ذمے داری، متانت، خلوص اور حقیقت پسندانہ کاوش کا متقاضی ہے۔ سچائی کی تلاش، مطالعہ، مشاہدہ، موازنہ اور تجزیہ کے ذریعے کی جا ہے۔ اس تلاش میں محقق کی سوچ حقائق پر اثر انداز نہیں ہو پاتی اور وہ اپنے متعین کردہ مفروضوں کی اس وقت تک محض مفروضے ہی سمجھتا ہے، جب تک حقائق خود ا زبان سے انھیں حقائق کا درجہ نہ دیں۔ سوچ کا یہ سفر نہ صرف تحقیق کے مروجہ راستوں پر چلتے ہوئے محقق کی اپنی ذہنی تربیت کا مرہونِ منت ہے، بلکہ حقائق کی مناس

توجیہہ ایک فنی کام بھی ہے، ظاہر ہے کہ کسی بھی معلوم حقیقت کو فکر میں تبدیل کر کے علم کی توسیع کے امکانات کو روشن کرنے کے لیے مسلسل محنت، لگن، دیانت داری اور پتہ مار کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ تحقیق میں کوئی نتیجہ حرف آخر نہیں ہے۔ سالہا سال کی بنائی ہوئی عمارت صرف ایک معمولی سے انکشاف سے مٹی میں مل سکتی ہے۔ لہٰذا محقق اگر جستجو میں صادق ہے تو بددل نہیں ہوتا۔ ہر موج خوں کو اپنے سر سے گزارتا ہوا آگے بڑھتا ہی رہتا ہے۔ محقق حقائق کی تلاش اور ان کے تجزیے کے بعد جو نتائج اخذ کرتا ہے انھیں بلاکم وکاست، بغیر بیان آرائی اور تعصب کے بیان کر دینا ہی اس کا مقصد ہوتا ہے اور یہ ضروری ہے کہ اس قسم کی تحریر کے لیے محقق کا انداز بیان سنجیدہ ہو۔ ''اس کا حسن، قطعیت، ربط، استدلال، ترتیب مقدمات اور نتائج کی معقولیت اور توازن میں پوشیدہ ہوتا ہے''۔ ایسی تحریر میں الفاظ پوری احتیاط اور تعین معنی کے ساتھ استعمال کیے جاتے ہیں۔ سنجیدگی اور علمی وقار تحقیق کے معیار کو بلند اور اس کی روایت کو تابناک بناتے ہیں۔

فن تحقیق ایک قدیم فن ہے، جسے کئی زاویوں سے دیکھا جاتا رہا ہے اور آج بھی مختلف علوم وفنون کے لیے مختلف طریقہ ہائے تحقیق مقرر کیے جاتے ہیں۔ منضبط تحقیق کا جدید تصور سب سے پہلے اہل یونان نے اپنایا اور یونانی مفکر ارسطو نے اسے پروان چڑھایا۔ خیال یہ تھا کہ کسی بات کو اس وقت تک تسلیم نہ کیا جائے جب تک اس کا ثبوت یا اس کی صداقت کی دلیل موجود نہ ہو۔ اس طریق کار نے اہل یونان کی فکر ونظر میں ایک ایسا انقلاب پیدا کر دیا کہ ہر شخص حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہنے لگا۔ اہل یونان کے طریقہ کار کے مطابق پہلے اصل مسئلہ یا موضوع کو سمجھنا ضروری تھا، پھر اسے حل کرنے کے لیے مختلف دلائل یا مفروضوں کو ثابت کرنے کے لیے مشاہدہ، لوگوں کی آرا، معلومات اور متعلقہ تحریری مواد سے استفادہ کرنا تھا۔ چنانچہ ان سب کی جانچ پڑتال کے بعد ہی نتائج اخذ کیے جاسکتے تھے۔ لیکن سائنس میں تحقیق کا عنصر بہت حد تک مسلمانوں کا مرہونِ منت ہے، کیونکہ علم کے لیے تجربات، مشاہدات، باریک بینی اور تلاش وجستجوئے حقائق میں مسلمان، یونانیوں سے بھی آگے بڑھ گئے تھے۔ اگرچہ یونانی محققین، بیشتر حقائق کی فراہمی کے ذمے دار تھے۔ تاہم اس ضمن میں عربوں کی بالادستی، ان کی عمیق نظری کا باعث تھی۔ الفارابی، الغزالی، ابن خلدون، ابن سینا اور ابن رشد جیسے سائنس دانوں اور ماہرین علم نے جدید طریقۂ تحقیق کی بنیاد ڈالی اور ان ہی کی تحقیقات سے اہل یورپ نے استفادہ کیا۔

سترھویں صدی کے قریب انسان نے حصول علم کا ایک نیا طریقہ اخذ کیا۔ یہ سب کچھ جدید سائنس کی تحریک کا نتیجہ تھا۔ فرانسس بیکن نے سب سے پہلے سائنسی طرز فکر کی بنیاد رکھی اور نیوٹن جیسے سائنس دانوں نے اس طریقے کو مزید تقویت بخشی۔ چنانچہ دلیل اور مشاہدے کے اشتراک سے جدید سائنسی طرز فکر کی ابتدا ہوئی۔ اس طرز فکر میں پہلے مسئلے یا موضوع کا احساس ہوتا ہے، پھر اس کی حقیقت معلوم کرنے کی جستجو ہوتی ہے۔ اس موضوع کے متعلق مشاہدات اور تجربات کے ذریعے ابتدائی معلومات حاصل کی جاتی ہیں اور یوں ایک نظریہ قائم ہوجاتا ہے۔ یہ نظریہ پہلے مشاہدات کے نتیجے میں مرتب ہوتا ہے اور ان نتائج کو لے کر مزید تحقیقات یا ان کی تصدیق، دوبارہ مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں کی جاتی ہے۔ اگر دوبارہ کی جانے والی تحقیق پہلے نظریے کے مطابق ہوتو وہ نظریہ سائنس کا ایک اصول یا ایک دریافت ہے، ورنہ اسے ترک کر دیا جاتا ہے۔

یہ سائنسی طریقہ گو زیادہ تر طبعی علوم تک محدود رہا، مگر اب معاشرتی علوم نے بھی اس طریقۂ تحقیق کو اپنے دائرۂ عمل کا حصہ بنالیا ہے۔ سائنسی علوم نے گذشتہ دوصدیوں میں جو ترقی کی ہے وہ دنیا کی فکری تاریخ کا ایک ہنگامہ خیز باب ہے، مگر اس برق رفتار ترقی کے باوجود سائنسی تحقیق اور سائنسی انکشافات کا اہم خاصہ ان کی عدم قطعیت ہے، جو سائنسی حقائق وواقعات کے رخ سے پردہ اٹھاتی جاتی ہے۔ خلائی تسخیر کی تحقیق ہو یا ایٹمی توانائی کے پُرامن استعمال کی ایجادات، اس تحقیق نے دنیا کی کایا پلٹ دی ہے۔

تحقیق کی ہر شعبۂ علم میں اہمیت ہے۔ سائنس اور سماجی سائنس کی دشوار گزار راہیں اس کے بغیر طے نہیں ہوسکتیں۔ نفسیات جسے ابھی اہم علم بننا ہے ہر قدم پر تحقیق کا محتاج ہے۔ شعور کا نازک نکتہ ہو یا لاشعور کی گتھیاں سب اس کے دائرے میں آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے بے شمار مراکز میں اہلِ علم، اس کی تحقیق و تنقید میں مصروف ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں ہم بیگانہ محض رہ کر جدید انکشافات سے دور نہیں رہ سکتے۔ ہمیں اپنے مزاج کو کسی حد تک یقینی تحقیق سے مانوس رکھنا پڑے گا، تاکہ معلومات کے پس پردہ علم کی معرفت اور دانش وری کو حاصل کر پائیں، ورنہ آج کی تکنیکی دنیا میں ترقی اور بقا ممکن نہیں۔ نیز تحقیق کے فن میں مہارت حاصل کرنے کی ضرورت وقت کا اہم تقاضا ہے۔

ادبیات میں تحقیق وتنقید کے طریقۂ کار کو سماجی علوم کی روشنی میں سائنٹیفک بنانے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ دوسری زبانوں کے تحقیقی سرچشموں کی طرف بھی رجوع کرنا ہوگا، تاکہ جدید تحقیق سے نئے حقائق دریافت ہوں اور ہماری تہذیب وثقافت کا نیا باب لکھا جائے۔ ادبیات کی تحقیق میں فن نقدان کی رہنمائی بے شک کرتا ہے لیکن خود تنقید موجودہ دور میں مختلف ڈسپلن کے مطالعے کی محتاج بن گئی ہے۔ ادب کا زمانے سے رشتہ قائم کرنا یا یہ بتانا کہ تصورات اور نظریات کی تاریخ

کیسے بنتی ہے، سماجی علوم سے براہ راست رشتے کا مطالعہ ہے۔ یہ سب سماجی اور تاریخی دستاویزات ہیں۔ اس لیے ان پر تحقیق اس گہرے سماجی شعور کے بغیر ممکن نہیں جو مختلف علوم کی دین ہوتا ہے۔

تحقیق ایک جامع عمل ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے مختلف پہلوؤں کا حامل ہے۔ چند پہلو ایسے ہیں جو اپنے مقاصد کے لحاظ سے اہم اور قابل توجہ ہیں۔ ان میں نظریاتی یا بنیادی پہلو، اطلاقی پہلو اور عملی پہلو نمایاں ہیں۔

تحقیق کا پہلا مقصد نظریے کی نشو و نما اور ارتقا ہے۔ اس قسم کی تحقیق نئے خیالات کو واضح طور پر متعین کرنے اور مقاصد زندگی کو سمجھنے میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی افادیت اشیا کو تفصیل سے بیان کرنا ہے جو سائنسی طریقوں کی مدد ہی سے ممکن ہے اور اس کے نتائج کا اطلاق ہمیشہ مستقبل پر ہوتا ہے۔ اس قسم کی تحقیق کو نظریاتی یا بنیادی تحقیق (Theoratical & Basic Research) کہا جاتا ہے۔ تحقیق کا دوسرا مقصد حقائق کو ایک جگہ اکٹھا کرنا ہے۔ لہذا اس عمل کے لیے بکثرت سروے یا تاریخی تحقیق سے خاص اطلاعات حاصل کی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں سائنسی طریقہ تحقیق سے بھی حقائق اکٹھے کیے جا سکتے ہیں اور مسائل حل کیے جا سکتے ہیں۔ اس کو اطلاقی تحقیق (Factual or Applied Research) کہتے ہیں۔

تحقیق کا تیسرا مقصد یہ ہے کہ اس کا تعلق فوری اور عملی مسائل سے ہو یا وہ محقق کو سمجھنے یا حل کرنے میں مدد دے سکے۔ اس قسم کی تحقیق سے تعلق رکھنے والوں کو سائنٹفک طریقہ تحقیق استعمال کرنا چاہیے۔ تحقیق کے اس مقصد کو انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن بالآخر ان دونوں سطح پر کی جانے والی تحقیق سے تجربات کو ہر صورت بہتر بنانا مقصود ہوتا ہے۔ ایسی تحقیق (Practical or Action Research) کہلاتی ہے۔

تحقیق کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ماہرین تحقیق نے بے شمار قسمیں بیان کی ہیں۔ لیکن یہ تمام قسمیں خالص تحقیق اور اطلاقی / عملی تحقیق کے دائرے میں آتی ہیں۔

خالص تحقیق

ایڈری، جے رو تھ (Audrey J.Roth) کے خیال میں اس تحقیق کا مقصد معلومات کا دائرہ وسیع کرنا ہے۔ اس عمل میں بہت سے سوالات اور موضوع سے متعلق گوشوں کو بے نقاب کرنے سے تقریباً ایک نئی دنیا کی تلاش کا کام پورا ہو جاتا ہے۔ اور کام کرنے والا اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس طریقہ تحقیق میں تحقیق کے نتائج کو، علوم کی جانچ پڑتال، نئے حقائق کی فراہمی اور مختلف عوامل کے نظریات کے بارے میں تصوراتی ڈھانچے ترتیب دیئے ہوتے ہیں۔ خواہ ان نتائج سے سماجی زندگی پر کسی قسم کا اثر ہو یا نہ ہو۔ ان اثرات سے اسکالر بے نیاز ہوتا ہے اور صرف اس قول پر یقین رکھتا ہے کہ علم سب سے بڑا زیور اور صداقت اعلیٰ ترین قدر زندگی ہے۔

اطلاقی تحقیق

اس کا مقصد نتائج کی روشنی میں خالص تحقیق کو پرکھنا ہے۔ یہاں صرف معلومات کی حصول یابی ہی منزل نہیں، بلکہ نتائج کو عملی شکل میں دیکھنا مقصود ہے۔ لہذا مسئلے کو سامنے رکھ کر اسے حل کرنے کے لیے اصول و ضوابط کی حدود میں رہ کر ضروری اقدامات کیے جاتے ہیں۔ گویا خالص تحقیق کا طالب علم مسائل کی نوعیت کا جائزہ لیتا ہے۔ ''کیوں اور کیونکر'' تک اس کی تحقیق کی دنیا محدود ہوتی ہے۔ لیکن اطلاقی تحقیق سے وابستہ افراد مسائل کو حل کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔ تحقیق کے ان دونوں طریقوں میں فرق کے باوجود ان کی دنیا ایک ہے۔

ڈیوڈ جے فاکس (David J. Fox) خالص تحقیق اور اطلاقی تحقیق کے فرق کو ان الفاظ میں واضح کرتا ہے کہ[8]:

At one end of the Continuum is pure research which in its extreme form, is research motivated solely by intellectual interest and directed towards the acquisition of Knowledge for Knowledge's Sake.______In Contrast, applied research in its extreme form would be directed toward Solving a Specific Practical Problem, even though no new Knowledge was acquired in the process".

اسٹیفن کوے[9] (Stephen Covey) نے تحقیق کو دو خانوں میں تقسیم کیا ہے۔ اور اسے بنیادی اور عملی تحقیق کا نام دیا ہے۔ عملی تحقیق کو

وہ (Action Research) بھی کہتا ہے۔ بنیادی تحقیق اشیاء کی ماہیت سے متعلق ہوتی ہے۔ وہ نظریاتی اصولوں سے بھی گہرا تعلق رکھتی ہے۔ کسی نظام کے فکری پہلوؤں، اصولوں اور ضابطوں سے اس کا رشتہ خود بخود پیدا ہوتا ہے'' لیکن عملی تحقیق کی دنیا قدرے محدود ہے اس سے فوری مسائل کے حل تو مل جاتے ہیں لیکن اس کا اطلاق مختلف جگہوں پر نہیں ہوسکتا۔ لیکن ڈیوڈ جے فاکس کے خیال کے مطابق بنیادی اور عملی تحقیق کا دائرہ عمل ایک خاص مقامی مسئلے کے حل کی تلاش ہے جب کہ بنیادی تحقیق کا دائرہ کار عمومی اور وسیع ہوتا ہے۔ وہ ان دونوں طریقہ ہائے تحقیق کے فرق کو اس طرح بیان کرتا ہے:[۱۰]

"The pair of terms, fundamental research and action research are used to make a distinction between research, which is motivated by a spceific local problem and is designed only to resolve that problem in that setting (action research), as contrasted to research which is motivated by interest in a general problem and which is actually done in specific settings, because they seem to offer appropriate sample sites for the populations and universes of interest (fundamental research), the consequence of this distinction is that with action research the findings are considered limited to the settings actually studied, where-as in fundamental research the findings are considered applicable to the population and universes sampled".

اس کے علاوہ اور بے شمار قسمیں ہیں جن کے صرف نام درج کیے جاتے ہیں۔

1. Problem Solving research.
2. Theory Developing research.
3. Operational research.
4. Theory testing research.
5. Experimental research.
6. Historical research.
7. Descriptive research.
8. The philosophical type of research.
9. Prognostic type of research.
10. Sociological research.
11. The creative type of research.
12. Social, Scientific research.
13. Survey research.
14. Practical research.
15. Market research. وغیرہ

ان ناموں سے ان کی نوعیت اور ان کے مقاصد کا علم ہوجاتا ہے۔ تحقیق کی یہ تمام قسمیں الگ الگ ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے بے حد قریب ہیں۔ ان میں سے کسی کا تعلق خالص تحقیق سے ہے اور کسی کا اطلاقی تحقیق سے۔ مثلاً تاریخی تحقیق اگر خالص تحقیق کے زمرے میں آتی ہے اور تجرباتی تحقیق میں دانشورانہ نظریات کے ساتھ ساتھ اس کا اطلاقی پہلو بھی ہوتا ہے۔ تحقیق کی تمام اقسام پانچ بڑی قسموں میں آسانی سے منقسم ہوسکتی ہیں۔

۱۔ تاریخی تحقیق (Historical research)

۲۔ بیانیہ تحقیق (Descriptive research)

۳۔ تجرباتی تحقیق (Experimental research)

۴۔ کلینکی تحقیق (Clinical research)

۵۔ موضوعاتی تحقیق

ا۔ تاریخی تحقیق (Historical research)

ڈیوڈ۔ جے فاکس[11] کے بیان کے مطابق اس میں تاریخی دستاویزوں، آثار قدیمہ اور ماضی کی برگزیدہ شخصیتوں، کارناموں اور فلسفوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس کا طریقۂ کار اور اقدامات وہی ہیں جو عام سائنسی طریقے کے ہیں یعنی۔

۱۔ مسئلہ یا موضوع کی وضاحت اور مفروضہ کا تعین

۲۔ Data کا حصول، مع طریقۂ کار

۳۔ تنقیدی تجزیہ

۴۔ نتائج اخذ کرنا اور مفروضہ کا رد یا قبول

۵۔ رپورٹ مرتب کرنا۔

اس طریقۂ کار میں تجزیے کے لیے مواد تیار نہیں کیا جاتا بلکہ مواد پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ جس کی تلاش کے لیے دو قسم کے مآخذ استعمال میں لائے جاتے ہیں۔

(الف) ابتدائی مآخذ: دستاویزات، مخطوطات یا اصلی شواہد، جو واقعہ سے متعلق دستیاب ہوں۔

(ب) ثانوی مآخذ: سرکاری اطلاعات، ذاتی بیانات، قصے کہانیاں، تصویری مجموعے اور مطبوعات وغیرہ۔ اس طریقۂ کار میں حقائق کا تنقیدی تجزیہ، داخلی اور خارجی شواہد کی روشنی میں کیا جاتا ہے یہ طریقۂ کار خالص تحقیق کے دائرۂ عمل میں آتا ہے۔

۲۔ بیانیہ تحقیق (Descriptive research)

اس طریقۂ کار میں حقائق اور واقعات کو بعینہٖ اس طرح واضح طور پر بیان کیا جاتا ہے جس طرح کہ وہ اپنی اصلی حالت میں رونما ہو رہے ہیں۔ اس قسم کی تحقیق سے حاصل شدہ data نئے اور اچھوتے پروگراموں کی نشاندہی کے لیے مفید اور کارآمد ہوتے ہیں۔ اس تحقیق میں حقائق جمع کرنے کے لیے متعلقہ اعداد و شمار کی زبان استعمال کی جاتی ہے اور نتائج اخذ کرنے کے لیے جدول کی تیاری ضروری ہوتی ہے، تاکہ نتائج کی روشنی میں مفروضے کو رد یا قبول کیا جائے۔ اس طریقۂ کار کا دائرۂ عمل بہت وسیع ہوتا ہے۔ حقائق جمع کرنے اور تجزیے کے لیے سروے کی مختلف قسمیں[12] استعمال کی جاتی ہیں۔ مثلاً۔

1. Cross Sectional Survey.
2. Longitudinal Survey.
3. Approximating Longitudinal Survey.
4. Parralel Samples.
5. Contextional Studies.
6. Sociometric Studies.

تجزیے کی قسموں کے علاوہ کیس اسٹڈی کے ذریعے بھی حقائق کی تلاش کی جاتی ہے۔ نیز تقابلی جائزے بھی بیانیہ تحقیق کی بنیادی سرگرمیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اور ان ذرائع سے حاصل کردہ معلومات، تجرباتی تحقیق کے لیے بنیادوں کا کام دیتے ہیں۔

۳۔ تجرباتی تحقیق (Experimental research)

تحقیق کے ضمن میں جن جن حقائق کا مشاہدہ مطلوب ہوتا ہے، ان کا قابلِ اعتماد ہونا ضروری ہے۔ ''تاریخی حقائق[۱۳] کی نسبت بیانیہ حقائق پر آسانی سے اعتماد کیا جاسکتا ہے اور سب سے بڑھ کر ان حقائق کی صحت اور جواز پر یقین کیا جاتا ہے، جن کا عملاً اور اختیاری طریقے پر جوڑ توڑ کرنے کے بعد اس بات کی تسلی کی جاچکی ہو کہ ان کے عناصر ترکیبی کیا ہیں اور وہ کس طرح رونما ہوتے ہیں؟ ایسے جوڑ توڑ (Manipulation) کرنے کا باقاعدہ طریقہ کار ہوتا ہے جس میں سائنسی تجزیے کا پیش از وقت منصوبہ تیار کیا جاتا ہے اور اس کے بعد ان اقدام کا باضابطہ طریقے سے اطلاق کیا جاتا ہے جو بالکل معروضی ہوتے ہیں''۔ سائنسی تجزیے میں حالات و واقعات میں اختیاری طور پر اور عملاً ایسی تبدیلیاں پیدا کی جاتی ہیں جن کے ذریعے واقعات یا حالات کی علتوں یا واقع ہونے کا پتہ چل جائے۔ اس کے بعد جن نئی چیزوں کا مشاہدہ ہوتا ہے ان کی تشریح آجاتی ہے۔ اس طریقہ کار میں افتراقات[۱۴] (Variables) کا مطالعہ ہوتا ہے اور اس کے اثرات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ نیز تجزیے کے پیچیدہ ترین طریقوں سے تحقیق کی منزل طے ہوتی ہے۔

۴۔ کلینکی تحقیق (Clinical research)

گلبرٹ ساکس[۱۵] (Gilbert Sax) کے بیان کے مطابق اس میں کیس اسٹڈی پیشِ نظر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں تھوڑے بہت نمونے (Samples) بھی استعمال ہوتے ہیں۔ عام طور پر معلومات کے حصول کے لیے مشاہداتی طریقے، انٹرویو، پڑتالی فہرستیں، اطلاقی اور معروضی آزمائشیں اور لیبارٹری کے طریقے وغیرہ استعمال ہوتے ہیں اور حقائق کا مشاہدہ و مطالعہ بڑے جامع طریقے سے کیا جاتا ہے۔

۵۔ موضوعاتی تحقیق

اس سلسلے میں ادبی تحقیق آتی ہے۔ قدیم ادب کا سرمایہ ادبی تحقیق کی اہم بنیاد ہے۔ کلاسیکی زبان و ادب کا جدید حالات کی روشنی میں از سرِ نو جائزہ بھی اسی ذیل میں ہے۔ یہاں تدوین ادبی تحقیق کی رہنمائی کرتی ہے۔ تدوین کے سلسلے میں اصل مسئلہ متن کی شناخت اور فیصلے کا ہے۔ اصل متن سے الحاقی حصے کو الگ کرنا ادبی تحقیق کے دائرے میں شامل ہے۔ اس میں بھی سائنسی (Documentation) کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ادبی تحقیق جو تاریخی اور سماجی تناظر میں کسی فیصلے پر پہنچتی ہے، غلط اور غیر اہم نہیں کہی جاسکتی، کیونکہ یہاں حقائق کے تجزیے کے لیے منطق کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اس طرح ادبی تنقید کے فلسفیانہ اور فکری پہلوؤں پر بھی تحقیق کی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ ادبی تحقیق سماجی علوم کے طریقہ ہائے تحقیق سے استفادہ کرسکتی ہے۔

ان تمام قسموں کا جائزہ لینے سے ان تمام طریقہ ہائے تحقیق میں چند باتیں مشترک ملتی ہیں۔ وہ یہ کہ تحقیق نئے حقائق کی جستجو ہے۔ اس تلاش سے حاصل شدہ مواد یا حقائق کی چھان بین کر کے نتیجہ مرتب کرنا اور اسے قبول کرنا یا رد کر دینا ہے۔ اس طرح سوالات، مسائل اور ان کے حل، ذہنی تصورات سے چل کر تجربے اور مشاہدے کے باقاعدہ عمل میں تبدیل ہو کر نئے علوم کو جنم دیتے ہیں۔ تحقیقی کام کے آغاز میں جو بات بے حد اہم ہے وہ تحقیقی موضوع کا انتخاب ہے۔ ماہرینِ تحقیق کی رائے یہ ہے کہ نوجوان محقق موضوع کا انتخاب اپنی دلچسپی اور اپنی علمی سطح کے مطابق کرے، ورنہ تحقیق کے دوران مشکلات سے ہمت ہار بیٹھے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی تحقیق کے حدود کا تعین کرے گا، ورنہ مواد سمیٹنا دشوار ہوگا۔ بنیادی طور پر موضوع کا انتخاب اور تحقیقی نقطۂ نگاہ سے اس کی تشکیل اس طرح کرے کہ اس کی غیر ضروری وسعت خود بخود سکڑتی چلی جائے تاکہ موضوع کے انتخاب میں محقق کی آزادانہ رائے اور دلچسپی شامل ہو اور موضوع اس کی اپنی صلاحیت کے مطابق ہو۔ البتہ وہ اپنے موضوع کی اہمیت، افادیت اور مواد کی فراہمی کے امکانات وغیرہ سے متعلق اپنے رہنما سے مشورہ حاصل کرسکتا ہے اور مبتدی کے لیے یہ بہت ضروری ہوتا ہے کہ موضوع سے متعلق ان اہم امور پر اپنے رہنما کے مفید مشوروں سے استفادہ کرے۔

موضوع کے انتخاب سے پہلے چند ضروری باتوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے مثلاً کیا منتخب کیا جانے والا موضوع تحقیق طلب ہے یا نہیں؟ کیا اس موضوع پر تحقیق سے علم کی حدود میں وسعت ہوسکتی ہے؟ کیا اس پر تحقیق مکمل ہوسکتی ہے؟ کیا محقق اس پر تحقیق کرسکتا ہے؟ کیا اس موضوع سے متعلق مواد ملنے کے امکانات موجود ہیں؟ ان تمام امور پر غور کیا جانا اور اس سلسلے میں کسی تجربہ کار محقق یا استاد یا رہنما سے مشورہ حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔

تحقیق کے لیے جو موضوع منتخب کیا جائے وہ نیا اور اہم ہو جس پر اب تک لکھا نہ گیا ہو یا بہت کم لکھا گیا ہو۔ ایسے موضوع کا بھی انتخاب کیا جاسکتا ہے جس

پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہو، لیکن ایسے موضوع پر تحقیق کا نیا نقطۂ نظر پیش کرنا ہوگا اور نئے زاویے دریافت کرنے ہوں گے، وگرنہ مواد کی تکرار سے نہ علم میں توسیع ممکن ہوگی اور نہ تحقیق میں جدت پیدا ہوگی۔

تحقیق کا موضوع بہت وسیع اور بسیط نہ ہو۔ وسیع موضوع کی صورت میں اس کا ایک جز تحقیق کے لیے منتخب کرنا بہتر ہوگا، ورنہ وسیع موضوع پر مواد کو سمیٹنے اور اس کا تجزیہ کر کے نتائج اخذ کرنے میں تحقیق سے انصاف ممکن نہیں۔ بہت محدود موضوع پر بھی تحقیق مشکل ہوتی ہے۔ لہٰذا موضوع کے انتخاب میں بہت غور و خوض اور مفید مشورے درکار ہیں۔

تحقیق میں دوسرا اہم قدم مآخذ کی تلاش ہے۔ اس سلسلے میں بنیادی ذرائع سے مواد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ مواد مستند ترین ہوتا ہے۔ اگر کسی کتاب سے مواد حاصل کرنا مقصود ہو تو اصل کتاب کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے، نہ کہ ترجمے سے، کیونکہ ترجمہ ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔

تحقیق میں مطلوبہ مواد کی حصول یابی کا مؤثر ترین ذریعہ لائبریری ہے۔ کوئی محقق جس کا موضوع خواہ کسی مضمون سے تعلق رکھتا ہو، لائبریری سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ ہر بڑی لائبریری میں دو طرح کی کتابیں ہوتی ہیں۔ ایک حوالے کی اور دوسرے عام مطالعے کی کتابیں۔ حوالے کی کتابوں سے محقق نہایت مفید رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔ ایڈری جے روتھ[16] (Audry J. Roth) کہتا ہے کہ: ''حوالے کی کتابیں خصوصاً انسائیکلو پیڈیا نوجوان محقق کے لیے نہایت مفید ہے۔ اس کے ہر مضمون کے آخر میں مآخذ کی ایک منتخب فہرست ہوتی ہے، جس کی مدد سے وہ آسانی سے قدم بڑھا سکتا ہے''۔ مواد کی تلاش کے سلسلے میں مخطوطوں اور کتابوں کے علاوہ معیاری رسالوں کی جلدوں سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ رسائل کے مضامین چونکہ ایک ہی پہلو سے بحث کرتے ہیں، اس لیے ان میں تفصیل زیادہ ہوتی ہے اور جدید تحقیق بھی شامل ہوتی ہے۔ مواد کی فراہمی اور محقق کی رہنمائی کے لیے لائبریریوں کے کیٹلاگ بھی مفید ہیں۔ ان سے محقق کو نہ صرف یہ کہ اس موضوع سے متعلق کتابوں کا علم ہوتا ہے بلکہ اور بھی کارآمد اشارے ملتے ہیں۔ ہمارے ملک میں بڑی لائبریریوں کے بہت کم کیٹلاگ مطبوعہ شکل میں دستیاب ہیں۔ اگر مطبوعہ کیٹلاگ میسر ہوں تو طالب علم کے لیے بے حد آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔

مواد کی حصول یابی کے لیے ریکارڈ آفس، آرکائیوز (Archieves) اور میوزیم کے ذخیروں سے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ یہ ذخیرے تاریخ اور فنونِ لطیفہ کے موضوعات پر تحقیق کے سلسلے میں خصوصاً اہمیت رکھتے ہیں۔ بعض بڑی لائبریریوں میں بہت سی اہم کتابوں کے مائیکرو فلم یا فوٹو گراف سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ کسی موضوع پر تحقیقی کام کرنے کے لیے ضروری نہیں کہ صرف لائبریری ہی پر تکیہ کیا جائے بلکہ محقق کو موضوع کی نوعیت کے مطابق مناسب اور موزوں ذرائع سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔ جن سے تحقیقی کام کے دوران میں مواد کے حصول میں مدد لی جا سکے۔ اس سلسلے میں ماہرین نے مختلف طریقے تجویز کیے ہیں جو حقائق کو اکٹھا کرنے میں مددومعاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ مثلاً انٹرویو، سروے، خطوط یا ڈائریاں، خود نوشتہ سوانح عمریاں، تخلیقی تحریریں، سرکاری روداد یں، تحقیقی اداروں اور دانش گاہوں کی روداد یں، فرامین، مردم شماری رپورٹ وغیرہ۔ محقق کو اپنے موضوع کی نوعیت کے مطابق اور مفروضات کی تصدیق کے لیے مناسب اور موزوں طریقۂ کار اپنانا چاہیے۔ چونکہ تحقیق کے نتائج اکثر و بیشتر عمومی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں اس لیے تحقیق کے لیے مظہرات کے جو نمونے مخصوص اصولوں کے پیشِ نظر لیے جاتے ہیں، انھیں نمونہ بندی (Sampling) کہتے ہیں۔ سماجی علوم میں یہ طریقۂ کار اپنایا جاتا ہے، جسے شماریاتی تجزیے کی کسوٹی پر پرکھ کر نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔

موضوع کے انتخاب کے بعد محقق کو تحقیقی کام شروع کرنے سے پہلے کئی اقدامات کی منصوبہ بندی کرنا ہوگی، جس کے تحت وہ اپنے کام کی تکمیل کر سکے۔ اس مقصد کے لیے ایک خاکہ تشکیل دیا جا سکتا ہے جس میں مندرجہ ذیل اقدامات کی وضاحت کی جائے تاکہ منصوبہ بندی کے تحت کام کا آغاز ہو۔

۱۔ موضوع، جس پر تحقیقی کام کیا جائے۔

۲۔ موضوع کی اہمیت اور اس کے دوسرے اہم پہلو۔

۳۔ مفروضات: زیرِ تحقیق موضوع کی ابتدا، چند مفروضات کی بنیاد بنا کر کی جاتی ہے۔ چنانچہ خاکہ میں موضوع سے متعلق سوالات کے عارضی حلوں یا ممکنہ نتائج کو (Hypothesis) کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔

۴۔ نمونہ اور نمونہ بندی کا طریقۂ کار (Sampling)۔

۵۔ مفروضوں کی تردید یا تصدیق کے لیے شماریاتی تجزیے کا طریقہ (Statistical Analysis)۔

۶۔ آزمائشی تحقیق کے تمام منضبط اقدامات کا ذکر۔

۷۔ مواد اکٹھا کرنے کے ذرائع و آلات اور اعداد و شمار اکٹھے کرنے کا طریقہ کار۔

۸۔ زیرِ تحقیق موضوع پر تحقیق مکمل کرنے کی مدت کا تعین۔

۹۔ اس کام پر صرف آنے والے اخراجات کی تفصیل وغیرہ۔

مواد کی فراہمی کے بعد تحقیق کے سلسلے میں دو اہم کام ہوتے ہیں۔ مواد کی تشریح و توضیح اور مواد کا سائنسی تجزیہ۔ مگر ان سے پہلے موضوع سے متعلق تمام مواد کو از سرِ نو ترتیب دینا ہے، تا کہ کام کی باتیں الگ ہو جائیں اور تجزیہ کرنے میں آسانی ہو۔ تجزیے سے نتائج اخذ کیے جاتے ہیں یا حقائق کو پرکھا جاتا ہے۔ اس کے بعد ان اخذ شدہ نتائج یا حاصل شدہ حقائق کی تشریح و تعبیر کی جاتی ہے، جو تحقیق کی روح ہے۔

Data یا مواد کے تجزیے کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ مفروضہ کی روشنی میں یا تحقیق سے متعلق پیدا ہونے والے سوالات کے پیشِ نظر وہ ان نظریوں کی روشنی میں، جو موجودہ عہد میں تسلیم کیے جاتے ہیں، یہ دیکھے گا کہ کیا وہ واقعی قابلِ اعتماد ہیں؟ ہر موضوع کی نوعیت کے اعتبار سے اس کے تجزیے کا طریقہ کار بھی مختلف ہوگا، جس میں تجزیے کے ذریعے مواد کو خاص طریقے سے منظم کیا جاتا ہے اور اس سے نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔ البتہ مواد کی تشریح و تفسیر اور اس کے تجزیے کے درمیان کوئی واضح خطِ امتیاز کھینچنا بہت دشوار ہے۔ یہ ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر تجزیے کے ذریعے Data کو ایک خاص طریقے سے منظم کیا جاتا ہے تو تشریح، افہام و تفہیم کے مسئلے کو حل کر دے گی۔ اگر تجزیے کے بعد محقق خاص نتائج اخذ کرتا ہے تو ان نتائج کی مزید تفسیر بیان کرنا ضروری ہے۔ تجزیہ اور تشریح کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا، یہی ریسرچ کی اعلیٰ ترین سطح ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں ایک بات غور طلب ہے، وہ یہ کہ سائنس اور ادب کے تجزیے اور تشریح و تفسیر میں نمایاں فرق ہے۔ سائنسی اور سماجی علوم کے موضوعات پر تحقیق کے دوران مواد کی حصول یابی کے مختلف ذرائع اور طریقہ کار ہیں، جن میں اطلاعات کا بڑا ذخیرہ ہوتا ہے۔ ان میں موضوع اور مفروضات کی تمام خصوصیات آ جاتی ہیں، گویا Data جمع کرنے کے ذرائع کے اندر ہی تجزیاتی اصول پوشیدہ رہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ادبیات کی تحقیق میں اس طرح کی تقسیم بہت مشکل ہے۔ خاص کر شعر و ادب کی دنیا ایسی نہیں ہوتی کہ انھیں قید خانوں میں مقید کر دیا جائے۔ یہ عمل بظاہر میکانکی ہوگا، لیکن یہاں وہ فرق لطیف حائل ہے جو ادب کو سائنس اور سماجی علوم کو سائنس سے الگ رکھتا ہے، کیونکہ سماجی و سائنسی علوم میں تجزیاتی طریقہ کار ادب کی روایتی تنقید اور تحقیق کے تجزیے سے مختلف ہے۔ تاہم اب اس امر کی ضرورت ہے کہ ان علوم کے تجزیاتی طریقہ کار سے ادبی تحقیق میں استفادہ کیا جائے۔ سماجی علوم میں خاص طور پر علمِ نفسیات، بشریات، سماجیات اور معاشیات کے تعلق نے ادب کو اپنے حصار میں لے رکھا ہے۔ شعر، افسانہ اور ہر تخلیقی کاوش کسی نہ کسی طرح ان علوم کی روشنی میں تجزیے اور تشریح کا مطالبہ کرتی ہے۔ سماجی نفسیات میں رویوں کو علامتوں کی شکل دی جاتی ہے اور ان کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ Content Analysis کا بنیادی مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ افراد کے علامتی رویوں کو سائنٹفک Data میں بدل دیا جائے۔ جدید ادب میں بھی ہمارے رویے علامتوں کی شکل میں نمودار ہو رہے ہیں۔ لہٰذا علمِ نفسیات کا تجزیاتی طریقہ کار ایک حد تک ادبی تحقیق میں رہنمائی کر سکتا ہے۔ خاص طور پر افسانوی ادب کا تجزیہ اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک اس کا Inter disciplinary مطالعے کی روشنی میں جائزہ نہ لیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید علوم کے تحقیقی طریقہ کار نے سوال نامون اور دیگر ذرائع سے تحقیق کو ایک نیا شعور اور نئی سمت عطا کی ہے۔ تحقیق خود ایک مکمل سائنس بنتی جا رہی ہے۔

پاکستان میں مختلف علوم کے تحقیقی سرمائے کو دو حصوں میں رکھا جا سکتا ہے۔ ایک وہ کام جو دانش گاہوں میں ہو رہا ہے، دوسرا وہ کام جو اربابِ علم یونیورسٹیوں سے باہر کر رہے ہیں۔ ایسے سرکاری یا غیر سرکاری ادارے بہت کم ہیں جو خالص تحقیق کے لیے وجود میں آئے ہوں، اگر ہیں تو وسائل محدود ہیں۔ پاکستان میں تحقیق کی رفتار کو تیز کرنے میں یونیورسٹیوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ نارسائیوں اور خامیوں کے باوجود تحقیق کے میدان میں قدم آگے بڑھائے ہیں، لیکن اعلیٰ معیار کی تحقیق بہت کم ہے۔ جس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ مثلاً نوجوانوں کا علم تو خام ہوتا ہی ہے، ان کے لیے وسائل کی بھی کمی ہے۔ کام منصوبوں کے تحت نہیں ہوتا۔ معمولی سے معمولی معلومات کے حصول کے لیے دربدر بھٹکنا پڑتا ہے۔ اربابِ علم یا کتب خانوں سے استفادہ کرنے کے لیے سفر ناگزیر ہے، اس کے لیے وقت اور پیسہ درکار ہے۔ بنیادی کتب کی کیٹلاگ دستیاب نہیں ہے جو تحقیقی کام میں ریڑھ کی ہڈی کی اہمیت رکھتی ہے۔ مرکزی اور اعلیٰ پایہ کی لائبریریاں کم ہیں، نیز مواد فراہم کرنے کی آسانیاں ہر کتب خانے میں حاصل نہیں۔ حوالہ جات کی کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ایک ہی موضوع پر کن کن اداروں میں کام ہو رہا ہے۔ کن کن موضوعات پر کام ہو چکا ہے اور کن کن موضوعات پر کتابیں شائع ہو چکی ہیں؟ اس کے علاوہ غیر ملکی لائبریریوں کے ذخیرہ مخطوطات کی فہرست میسر نہیں آتی۔ قدیم اور نایاب نسخوں کے ذخیرے ذاتی کتب خانوں، درس گاہوں اور امام بارگاہوں میں

بکھرے پڑے ہیں جن کی فہرست دستیاب نہیں ہوتی۔ وسائل کی کمی اور بے شمار مسائل کی موجودگی میں کوئی حوصلہ افزا افادی یا اخلاقی محرک بھی نہیں، جس سے اعلیٰ معیاری کام انجام دیا جا سکے۔

ہماری دانش گاہوں میں ادبی تحقیق اور سائنسی انکشافات کے مسائل ابھی حل نہیں ہوئے۔ بالعموم تحقیق کے طریقۂ کار کو نصاب کا ایک جز نہیں بنایا گیا۔ اس کی اہمیت اور ضرورت کو محسوس کرنے کے باوجود ابھی تک بیش تر دانش گاہوں میں یہ اعلیٰ تعلیم کا ایک حصہ نہیں بن پایا۔ لہٰذا زیادہ تر تحقیقی مقالے ایسے حضرات کی نگرانی میں داخل کیے جاتے ہیں جنھیں اس علم کی کوئی واقفیت نہیں۔ اگرچہ ہمارے ہاں تحقیق کے لب ولہجہ اور رنگ و آہنگ میں تبدیلی آ چکی ہے، اس کی اہمیت کا احساس اور عرفان بھی ہو چکا ہے، لیکن ابھی تک محقق کا یہ ڈسپلن محض ذوقی ہے۔ اس کی باقاعدہ تربیت کی طرف کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ اس کے آداب وضوابط، اس کے آئین وضع کرنے اور تحقیق کا کام کرنے والوں کو سہولتیں اور آسانیاں بہم پہنچانے کا کوئی سامان نہیں۔ تحقیق کی زبان، اس کے طریقۂ کار، اس کی ذمے داریوں اور ان کو پورا کرنے والی شرائط کے بارے میں ہنوز کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ تحقیق کے طریقۂ کار کا شعور ابھی عام نہیں ہوا۔ نتیجتاً تحقیقی سلیقے کی کمی بری طرح کھٹکتی ہے۔ تحقیقی کام اپنے معیار اور کیفیت کے اعتبار سے بڑی حد تک تشویش ناک ہے۔

انگریزی میں تحقیق کے اصول اور طریقۂ کار پر درجنوں معیاری کتب دستیاب ہیں، لیکن پاکستان میں اس موضوع پر اردو میں چند کتب موجود ہیں جو نوجوان محققوں کی رہنمائی کر رہی ہیں۔ عرصۂ دراز سے یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ بہت سی ضروری شرائط اور ضوابط سے بے خبری کی وجہ سے ساقط المعیار تحقیقی کام سامنے آ رہا ہے، یہی خیال اس مجموعے کی پیش کش کا باعث ہوا۔ اس کتاب کی ترتیب میں اس بات کی کوشش کی گئی کہ تحقیق کے طریقۂ کار، فن تحقیق اور اس کی قسمیں، موضوع کا انتخاب، مواد کی ترتیب، متن کی تیاری اور مواد کی فراہمی، تحقیق متن اور تصحیح متن جیسے اہم موضوعات پر ہند و پاک کے ممتاز اہل علم اور محققین کے مقالات یک جا کر کے، ایک مجموعے کی شکل دی جائے، لیکن تمام تحقیقی مقالوں پر دسترس نہ ہونے کی وجہ سے مختصر دائرے میں یہ کوشش کی گئی کہ تحقیق کرنے والوں کے ذہن ونظر کی تربیت کے ابتدائی کام میں رہنمائی کی جا سکے۔ یہ مجموعہ کسی طور بھی تسلی بخش نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم نوجوان محققوں کی تحقیق کی چند مشکلات کو حل کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔

اگرچہ اس کتاب میں شامل مقالوں میں بعض جگہ اصولوں اور خیالات کی تکرار ملے گی لیکن یہ تکرار تحقیق کے طلبہ کے لیے اصولوں کو ذہن نشین کرانے میں مفید ثابت ہوگی۔ اصول تحقیق اور ترتیب متن کے عنوان سے منتخب مقالات کا یہ مجموعہ چند اضافوں کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ حصۂ اول میں اصول اور طریقۂ کار اور حصۂ دوم میں ادبی تحقیق کا جائزہ اور اطلاقی تحقیق سے متعلق مقالات پیش کیے گئے ہیں۔

اس کے لیے میں جناب ڈاکٹر وحید قریشی سابقہ، صدر نشین مقتدرہ قومی زبان کی بے حد ممنون ہوں جن کی ذاتی دلچسپی اور مفید مشوروں نے میرے حوصلوں کو توانائی بخشی۔ امید ہے کہ یہ کتاب تحقیق کے طلبہ کو تحقیق کے طریقۂ کار، مسائل اور مشکلات کو سمجھنے میں مدد دے گی اور ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔ کتاب کے آخر میں کتابیات دی گئی ہے جس سے یقیناً اہل تحقیق مستفید ہوں گے۔

❖❖❖❖

حواشی

(۱) مالک رام "اردو میں تحقیق" مجموعہ مقالات رہبر تحقیق، لکھنؤ، اردو سوسائٹی لکھنؤ یونیورسٹی، ۱۹۷۶ء، ص ۵۵۔
(۲) قاضی عبدالودود "اصول تحقیق" مجموعہ مقالات رہبر تحقیق، لکھنؤ، اردو سوسائٹی لکھنؤ یونیورسٹی، ۱۹۷۶ء، ص ۱۰۹۔
(۳) پروفیسر محمد حسن "ادبی تحقیق کے بعض مسائل"، مجموعہ مقالات رہبر تحقیق، لکھنؤ، اردو سوسائٹی لکھنؤ یونیورسٹی، ۱۹۷۶ء، ص ۱۴۸۔
(۴) Paul, D. Leedy ; "Practical Research Planning Design" New York, Macmillon Publishing Co. Inc. P.5.
(۵) ڈاکٹر ش اختر "تحقیق کے طریقہ کار"، گیا، تاج پریس سن ندارد، ص ۱۹۔
(۶) پروفیسر محمد حسن "ادبی تحقیق کے بعض مسائل"، رہبر تحقیق لکھنؤ، نامی پریس ۱۹۷۶ء، ص ۱۵۱۔
(۷) Audrey, J. Roth, The Research Paper Form & Content, Belmont, California, Wadsworth Publishing Co., Inc., 1966 P. 4-5.
(۸) David J. Fox, "The Research Process in Education" New York Halt, Rinehort and Winston, Inc., 1969. P. 93-94.
(۹) ڈاکٹر ش اختر "تحقیق کے طریقہ کار"، ص ۲۵۔
(۱۰) David, J. Fox, the Research Process in Education, P.97.
(۱۱) David, J. Fox, "The Research Process in Education" p.406.
(۱۲) EARL, R. BABBIE; "Survey Research Methods" Belmont, California, Wads worth Publishing Co., Inc., 1973-74, p.62-65.
(۱۳) ڈاکٹر احسان اللہ خان، "تعلیمی تحقیق اور اس کے اصول و مبادی، لاہور، بک ٹریڈرز ۱۹۷۸ء، ص ۹۲۔
(۱۴) David J. Fox, p.138.
(۱۵) Gilbert Sax, "Foundation of Educational Research", New Jersey, Prentic Hall, Inc., Englewood Clifs, 1979, p.77.
(۱۶) Audrey J. Roth. "The Research Paper Form & Content" p.17.

❖❖❖❖

تحقیق کے تقاضے[۱]

ڈاکٹر وحید قریشی

(۱)

اُردو میں تحقیق کی روایت زیادہ قدیم نہیں، پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد جب ترک موالات اور خلافت کی تحریکیں اُٹھ رہی تھیں اور شعروادب کی دنیا میں جذباتیت عروج پر تھی، اردو ادب میں تنقید کے مقابلے میں تحقیق کا رجحان ترقی کر گیا۔ شبلی اور ان کے رفقاء کی بیشتر توجہ اردو ادب کے تخلیقی سرچشموں کی طرف تھی۔ اب جن فضلا نے نثر میں قدم رکھا وہ تحقیق کی طرف زیادہ راغب تھے۔ ڈاکٹر زور، عبدالسلام ندوی، سید سلیمان ندوی، عبدالحی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مولوی عبدالحق، حافظ محمود شیرانی، پروفیسر محمد اقبال، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ یہی وہ بزرگ ہیں جنھوں نے صحیح معنوں میں ریسرچ کا آغاز کیا، اُردو فارسی اور عربی کے سرمائے کو بندالماریوں سے نکالا، متون کی ترتیب وتصحیح کی، تاریخ ادب کی گم شدہ کڑیوں کو دریافت کیا، زبان کے آغاز وارتقاء کی نشاندہی کی، ادبا اور شعرا کے حالات وواقعات کو متعین کیا اور وہ سرمایہ فراہم کیا جس سے تاریخ ادب کی تدوین کا کام ممکن نظر آنے لگا۔ یہ لوگ حقائق کی تاویل وتعبیر اور ان کی فلسفیانہ توجیہ کے دعوے دار نہ تھے۔ انھوں نے بیک وقت دو کاموں کا بیڑا نہیں اٹھایا بلکہ انھیں تو صرف یہ دھن تھی کہ جدید سائینٹفک اصولوں پر متون کو درست کریں اور تاریخ ادب کے لیے خام مواد جمع کر دیں۔ وہ ادب کے تخلیقی عمل اور تنقیدی شعور کے لیے بنیاد مہیا کرتے تھے۔ انھیں احساس تھا کہ ابھی تاریخ ادب کی کئی شخصیتیں نامعلوم ہیں، لسانی مسائل مزید توجہ اور تفتیش کے محتاج ہیں اور شعرا وادبا کی زندگی کے واقعات کے بغیر تنقیدی فیصلے محض ہوائی باتیں ہوں گی۔ یہ نئی تحقیقی روایت یوں تو کئی ادبی مراکز میں دکھائی دیتی ہے لیکن مشرقی زبانوں کے علاوہ اُردو کے لیے جو کام ہوا اس میں تین مقام خاص طور پر قابل ذکر ہیں اعظم گڑھ، حیدرآباد (دکن) اور لاہور۔

یوں تو مشرقی زبانوں پر تحقیق کے کام کی ابتدا انیسویں صدی ہی میں ہو چکی تھی اور ایشیاٹک سوسائٹی (کلکتہ) اور اس کا جریدہ فلالوجی کے اصولوں پر زبانوں کی شجرہ بندی اور نشو ونما کو جانچ رہا تھا۔ لیکن اس ادارے کی مرکزی توجہ سنسکرت اور آریائی زبانوں کی طرف تھی۔ ولیم جونز کی لسانی دریافت برگ وبار لانے لگی، یونیورسٹیوں میں اسی نوع کا کام ہونے لگا۔ مغربی یونیورسٹیوں کے تربیت یافتہ لوگ یہاں آ کر مختلف تعلیمی اداروں میں اسی نوعیت کا کام کرنے لگے۔ ان جوانوں کی علمی مساعی میں زیادہ اہمیت متون کی ترتیب وتحشیہ کو حاصل تھی اور ان کی نظری بحثیں لفظوں کے عہد بعہد تغیرات تک محدود تھیں، یہ تحقیق کی لسانی روایت بیسویں صدی کے اداروں میں بھی سرایت کر گئی، لیکن مقامی ضرورتوں کے لحاظ سے اس کی تفصیلات میں فرق ہوتا گیا۔

(۲)

دکن میں ڈاکٹر زور اور ان کے رفقا خصوصاً سید محمد، ڈاکٹر سروری اور نصیرالدین ہاشمی نے دکنی ادب کے متن کی تصحیح کا کام شروع کیا اور لسانی لحاظ سے زبان کے ارتقاء کا جائزہ لیا۔ اس تحقیقی روایت میں یہ کمی رہ گئی کہ متن کی تصحیح میں مرتبین نے قلمی نسخوں کے تمام اختلافات کو اپنے ہاں درج کرنے کا جھگڑا نہیں پالا، دوسرے فطری بحثوں اور ادبا وشعرا کے حالات کی تلاش میں اپنا زیادہ سروکار ادبی کتابوں سے رکھا اور تاریخوں سے حاصل ہونے والی معلومات کو ادبی مواد سے مطابقت دینے کی زیادہ کوشش نہیں کی، اس لیے ان محققین کے علمی کارناموں میں واقعات وسنین کی غلطیاں زیادہ ہیں۔ تاہم اس علمی مرکز نے دکنیات کے ذخیرے کو زندہ کیا اور لسانیات کو فلالوجی کی حدود سے نکال کر صوتیات کے علم سے ملا دیا۔ ڈاکٹر زور کی کتابیں ہندوستانی لسانیات اور Daccani Phonetics بہت اہم ہیں۔ لسانیات کا علم ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سے گہرائی اور توانائی حاصل کرتا ہے۔ آگے چل کر اس ذہنی رجحان نے ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے لیے لسانیات کو مستقل موضوع بنایا۔

دکنی مصنفین کی کاوشیں ادبی ہیں، اس کے مقابلے میں دارالمصنفین کی تحقیق مذہبی رجحانات کے لیے مخصوص ہے۔ مشرقی علوم کی ترویج کی حد تک ان مصنفوں نے عربی اور فارسی کے بعد اُردو ادب کی طرف توجہ کی۔ اس لیے ادب کو ان کی تالیفات کے خاکے میں ضمنی حیثیت حاصل ہے۔ شبلی کی مورخانہ بصیرت نے ان محققین کو ادب کا راستہ تاریخ کے واسطے سے دکھایا۔ ان کے ہاں متن کی ترتیب وتحشیہ کو زیادہ اہمیت نہیں بلکہ اخذ وترجے کو زیادہ نمائندگی حاصل ہے۔ سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریا آبادی، صباح الدین عبدالرحمن، عبدالسلام ندوی اور عبدالحیؒ کے نام اس ادارے کی علمی وادبی کارگزاری میں قابل ذکر ہیں۔

اعظم گڑھ کے ادبا ومحققین کی طرح لاہور کے محققین بھی مشرقی علوم کی برتری کے قصیدہ خواں ہیں۔ یہاں سنسکرت اور آریائی زبانوں کا لسانیاتی مطالعہ

ولنر کے بعد سے محدود ہوگیا اور اس کی جگہ عربی، فارسی اور اردو ادب کے مطالعے میں صرف کہیں کہیں فلالوجی کی جھلک پائی جاتی ہے ورنہ ان محققین نے لفظوں کے نسب نامے اور زبانوں کے شجرے بنانے کی بجائے مسلمانوں کے علوم کو زندہ کرنے کی کوشش کی۔ اس تگ ودو میں قلمی کتابوں کے متن ترتیب دینے کو اہم جانا۔ یہاں کیمبرج کی روایت زیادہ استعمال میں آئی اور معمولی سے معمولی اختلاف نسخ کو بھی حواشی میں جگہ دی گئی۔

(۳)

دبستان لاہور کے محققین مختلف علوم اور مختلف زبانوں کے مطالعے کو بھی ضروری قرار دیتے ہیں۔ وہ ادب کو جداگانہ اکائی نہیں مانتے بلکہ معاشرتی علوم کے وسیلے سے ادب کے مختلف رشتے دریافت کرتے ہیں۔ خصوصاً تاریخ کو ان کے نظام تحقیق میں اساسی رتبہ حاصل ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ لوگ بنیادی طور پر مورخ ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ ادب سے حاصل شدہ واقعات وسنین اور حالات وکوائف کو تاریخ کی مدد سے دریافت شدہ مواد کے ساتھ تطبیق دے کر مقالہ نگاری کی روش بہت نتیجہ خیز رہی۔

یہ تحقیقی روایت حزم واحتیاط کا اچھوتا معیار پیش کرتی ہے۔ فراموش شدہ مصنفین کے حالات کی تلاش، عام اور مسلمہ ادبی مفروضوں کی بے رحمانہ چھان بین، تمام معلومہ مواد کو جرح وتعدیل کی کسوٹی پر کسنا، حوالے کے قلم بند کرنے میں کامل احتیاط اس گروہ کا امتیازی کارنامہ ہے۔ یہ لوگ معیار پر بہت زور دیتے تھے۔ سہل انگاری اور صحافتی انداز بیان انھیں ناپسند تھا۔ شاعرانہ اسلوب کو بھی ان لوگوں نے خیر باد کہی اور اُردو میں ایسی جامع زبان کی داغ بیل ڈالی کہ اس میں علمی باتوں کے بیان کی صلاحیت پیدا ہوگئی۔

اُردو انسائیکلو پیڈیا کی زبان اپنی غرابت کے باوجود accuracy کے اعتبار سے اُردو کے علمی سرمایے میں گراں قدر اضافہ ہے۔ ان اصحاب کمال کے ہاں تحقیقی کام میں غفلت یا عدم احتیاط جرائم میں داخل تھی اور ایسے مواقع پر ان کی گرفت سخت ہوتی تھی۔ اس محاسبے کی زد میں بعض بڑی بڑی شخصیتیں بھی آتی تھیں، چاہے سید سلیمان ندوی ہوں یا پروفیسر حبیب ان کی کڑی تنقید معاف کرنا نہیں جانتی تھی۔ پروفیسر شیرانی کی تنقید شعر العجم، تنقید بر آب حیات، مغلوں سے قبل فارسی ادب، خزائن الفتوح، اس رجحان کی عظیم یادگاریں ہیں۔ اب چاہے کوئی اسے منفی طریقہ قرار دے، چاہے ظالمانہ کہے حقیقت یہ ہے کہ اس سخت رویے نے ہمارے تحقیقی معیار کو مدتوں گرنے نہیں دیا اور کسی بڑے سے بڑے محقق کو بھی یہ جرأت نہ تھی کہ ''طومار نویسی'' کو شعار بنا کر کھرے کھوٹے کی تمیز مٹا سکے۔ شیرانی کا بے رحم قلم طنز وتعریض کے راستے سے اپنا کام کر جاتا تھا۔

اس تحقیق کا ایک اور پہلو بھی اہم ہے اور وہ ریاضت کا عنصر ہے۔ اس کی عمدہ مثال ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کی ذات گرامی ہے۔ ایک ایک حوالے کا احتیاط سے اصل کے ساتھ مقابلہ، ثانوی مآخذ اور بنیادی مآخذ کے استعمال میں امتیاز، دلائل کے سلسلوں کو ہر پہلو سے دیکھنا، نسخوں کی قدامت کا تعین، رسم الخط کی شناخت، املا کے خصائص کا ادراک، کاغذ کی قدامت اور سبک شناسی کا شعور، شفیع صاحب کی ذات میں جمع تھا۔ وہ حوالوں کے اندراج میں اخلاقی قدروں پر سختی سے عمل پیرا تھے اور متاخر حوالوں کو بھی نظر انداز کرنے کو ادبی بد دیانتی جانتے تھے۔ ان کے ہاں اقتباسات اور اپنی عبارتوں کے درمیان گہرا تعلق ہوتا تھا۔ وہ اس طرح جرح اور محاکمہ کرتے تھے اور استخراج نتائج کا عمل یوں اقتباسات کے ساتھ پیوست ہو جاتا تھا کہ حوالے مولوی صاحب کی عبارتوں کا ضروری حصہ ہو جاتے تھے۔ ان کے فارسی اور عربی کام سے قطع نظر اُردو میں اس نوع کے مقالات میں محمد حسین آزاد، ذوق اور داغ پر ان کے مقالے تحقیق کے اعلیٰ نمونے ہیں۔

ان جامع کمالات شخصیتوں کے علم اور مطالعے کی حدود کا احاطہ ممکن نہیں۔ پروفیسر شیرانی نے عربی، فارسی اور اُردو کو تاریخ کے مطالعے کی مدد سے روشن کیا۔ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع نے عربی کا استاد ہوتے ہوئے زیادہ علمی کام فارسی کے بارے میں کیا اور ترکی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں کی مدد سے اپنے موضوعات کے دور دراز گوشوں کو دیکھا۔ ڈاکٹر اقبال نے عربی اور فارسی کے پیوند سے آثار قدیمہ اور تاریخ کے ہفت خوان کو طے کیا اور ایران قدیم کی زبانوں خصوصاً پہلوی کو سیکھا۔ پروفیسر شوشتری بی۔ ایس۔ سی بکٹر یالوجی ہوتے ہوئے عربی، فارسی، اُردو، ہندی اور سنسکرت میں عالمانہ مرتبہ رکھتے تھے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے عربی، فارسی اور اُردو ہر سہ زبانوں کے بارے میں تحقیقی اور علمی کام کیا۔ یہ ''آوارہ خرامی'' ان بزرگوں کی علمی جدو جہد کا محور ہے۔ وہ کسی ایک مضمون پر بند نہیں تھے۔ مختلف علوم اور زبانوں کی مدد سے تحقیقی مقالات کی تحریر میں وسعت اور گہرائی پیدا کرتے اور علوم کی اکائیاں بنانے کی بجائے کل پر نظر رکھتے تھے۔ اس سے ان کے علمی کارنامے پائیدار اور عظیم ہوئے۔

❖❖❖❖

(۱) تحقیق کے تقاضے، ڈاکٹر وحید قریشی، لاہور، صحیفہ، شمارہ ۴۵، اکتوبر، ۱۹۶۸ء

تحقیق و تنقید[1]

ڈاکٹر سید عبداللہ

کچھ عرصے سے ہمارے تنقیدی ادب میں کچھ غلط بحث سا پیدا ہو رہا ہے۔ بعض اہل علم کی تحریروں سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک تحقیق و تنقید گویا دو ایسے نقطے ہیں جو کسی خط کی دو متضاد سمتوں پر واقع ہوتے ہیں اور آپس میں کبھی مل نہیں سکتے۔ لہٰذا محقق و نقاد بھی دو متضاد مشاغل کے آدمی سمجھے جانے لگے ہیں یعنی محقق وہ جسے تنقید سے کچھ غرض نہ ہو اور نقاد وہ جو تحقیق سے بالکل بے نیاز ہو۔ غرض تحقیق و تنقید کے درمیان ایک خاص قسم کی مغائرت بلکہ دشمنی قائم کر دی گئی ہے۔ جس سے عجیب و غریب علمی مغالطے پیدا ہو رہے ہیں۔

مگر کیا تحقیق و تنقید میں واقعی اتنی دشمنی ہے؟ کیا محقق واقعی وہ ہے جو تنقید سے واسطہ نہ رکھتا ہو اور نقاد واقعی وہ ہے جو تحقیق سے بالکل غافل ہو جائے۔ کیا ان دونوں کا کوئی ایک بھی مشترک میدان ایسا نہیں جہاں یہ دونوں باہم مل بیٹھتے ہوں؟ یہ سب سوال بڑے ہی اہم ہیں اور ان کے صحیح جواب سے ہی بہت سی نظریاتی غلط فہمیاں رفع ہو سکتی ہیں۔

تحقیق کے لغوی معنی کسی شے کی ''حقیقت'' کا اثبات ہے۔ اصطلاحاً یہ ایک ایسے طرز مطالعہ کا نام ہے جس میں ''موجود مواد'' کے صحیح یا غلط کو بعض مسلمات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔ تاریخی تحقیق میں کسی امر واقعہ کے وقوع کے امکان و انکار کی چھان بین مدنظر ہوتی ہے۔ اب عام طور سے تاریخی تحقیق کو (غلط طور پر) تنقید کی ضد سمجھ لیا گیا ہے۔ تنقید کے معنی ہیں کھوٹا کھرا پرکھنا۔ اصطلاحاً کسی موجود مواد کی خوبی یا برائی، حسن و قبح اور جمال اور بدصورتی کے متعلق چھان بین اور اس پر فیصلہ دینا نقاد کے مدنظر ہوتا ہے۔ ایک خاص حد تک تنقید و تحقیق کے دائرہ ہائے عمل الگ الگ ہیں۔ مگر کچھ ایسے دائرے بھی ہیں جن میں یہ دونوں ہم قدم اور ہم رکاب ہیں۔ لیکن یہ بحث اتنی آسان نہیں کہ اس سے اس قدر جلد پلہ چھڑایا جا سکتا ہو۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا تنقید کی وہ جستجو جو ''موجود مواد'' کے حسن و قبح کے سلسلے میں ہوتی ہے تحقیق سے کبھی بے نیاز ہو سکتی ہے؟

کوئی ادب پارہ اتنا مطلق اور قائم بالذات نہیں ہو سکتا کہ اس کو اس کے مصنف کی ذات و شخصیت سے کاملاً منقطع کر کے دیکھا جا سکتا ہو اور ظاہر ہے کہ مصنف کی ذات و شخصیت کے مسائل ان گوناگوں واقعات سے وابستہ ہیں جن سے کسی مصنف یا شاعر کی زندگی عبارت ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ کسی مصنف یا شاعر کی حیات بھی کوئی ایسی شے نہیں جو خلا میں معلق ہو۔ شاعر بھی تو دوسرے انسانوں کی طرح اس دنیائے آب و گل کا مکیں ہوتا ہے۔ وہ بھی تو کسی اجتماع، کسی معاشرہ کا فرد ہوتا ہے۔ وہ بھی تو تہذیبی اور اجتماعی اثرات سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ اس کو بھی تو کچھ ادبی روایات ورثے میں ملتی ہیں۔ اس کو بھی تو کسی اجتماع سے مخاطب ہونا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ آدم اول کی طرح سراپا اجنبی یا اکیلا تو ہے نہیں کہ اس کی گفتگو صرف پہاڑوں اور خاموش وادیوں سے ہوتی ہو اور انسانوں کا کوئی گروہ اس کا مخاطب ہی نہ ہو۔ اس کے انسان ہونے سے ہی یہ لازم آتا ہے کہ وہ چند متعلقات سے وابستہ ہے جن سے اس کا فن متاثر ہوتا ہے۔ پس ایسے حالات میں شاعر اور مصنف اپنے ماحول اور گرد و پیش کے مادی عوامل اور متعلقات سے کیونکر بے نیاز رہ سکتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ سب متعلقات وہ ہیں جن میں ''حسن و قبح'' کا سوال کم اور ''تاریخی واقعیت'' اور واقعہ کی ''حقیقت'' زیادہ مدنظر ہوتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ تاثراتی تنقید فی الفور پکار اٹھے گی۔ محتسب را درون خانہ چہ کار، یعنی کسی نقاد کو اس بحث میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے کہ شاعر اور مصنف کون تھا۔ کہاں پیدا ہوا تھا۔ کس کا بیٹا تھا۔ اس کے مشاغل کیا کیا تھے۔ اس نے کس کس سے محبت کی تھی؟ اس کی عاشقانہ ناکامیوں کے اسباب کیا تھے؟ اور ان ناکامیوں کے سبب بقول میر:

ع: مجھے رکتے رکتے جنوں ہو گیا

ارے صاحب جنوں ہو گیا تب کیا ہوا؟ یا مثلاً:

ع: چلا اکبر آباد سے جس گھڑی

اجی اکبر آباد سے چلا تو کیا ہوا اور نہ چلا تو کیا ہوتا۔ ہمیں تو غرض ان اشعار سے ہے جو اس نے کہے، ان تصانیف سے ہے جو اس نے پیش کیں۔ ہمیں تو

ادب پارے کے جمالیاتی وتاثراتی حسن وقبح سے بحث ہے اور بس۔ باقی باتیں جاننے کی نقاد کو ضرورت ہی کیا ہے؟

مگر تاثراتی نقادوں کی یہ بات دیر تک چلے گی نہیں۔ اس طرح تو وہ یہ بھی جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کریں گے کہ کوئی شاعر کس صدی کا آدمی ہے، کس ملک سے تعلق رکھتا ہے، کیا زبان بولتا ہے، اس کے فن کے ارتقائی مدارج کیا تھے؟ اس کی شاعری میں مدارج عمر نے کہاں تک تصرف کیا؟ یہ سب باتیں بھی تو تاریخ اور امر واقعہ سے متعلق ہیں۔ آخر ان سے کوئی مکمل تنقیدی ضابطہ کس طرح گریز کر سکتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تاثراتی تنقید میں یہ انتہا پسندی جیسا کہ Rickert نے اپنی کتاب New Method of Study of Literature میں احتجاج کیا ہے۔ اس سبب سے پیدا ہوئی کہ تاریخی تنقید کے علمبرداروں نے بھی تنقید کی مٹی پلید کر رکھی تھی۔ ان کی تنقیدوں میں امر واقعہ ہی سب کچھ ہوتا تھا۔ جمال حسن وقبح کی اہمیت ذرا بھی نہ تھی۔ وہ مصنف کی زندگی، اس کی تصانیف کی تاریخی کہانی اور اس کے ماحول سے ہی بحث کرنے لگتے تھے۔ اس کی تصانیف کی ادبی اہمیت تقریباً نظر انداز ہوگئی تھی۔ اسی لیے رکرٹ نے کہا کہ اے تاریخ کے نقادو! یہ سب باتیں، درست اور ضروری سہی مگر تنقید اس کے علاوہ بھی تو بہت کچھ ہے۔ تم جو کچھ کر رہے ہو اس سے تو تنقید کی اصل غرض ہی فوت ہوئی جاتی ہے، کیونکہ مصنف کے متعلق امر واقعہ کی چھان بین سے بھی تو یہی غرض ہوتی ہے کہ اس کی مدد سے ادب کے حسن کے سمجھنے میں مدد مل سکے۔ لیکن یہاں تو ہر چیز موجود ہے مگر ادب کے جمال کی بات موجود نہیں۔ یہاں تو ادب میں حسن کی جستجو ہی غائب ہو رہی ہے۔ لہٰذا یہ تنقید نہیں محض تاریخ ہے۔

اُردو میں ادب کے اولین نقاد بیشتر وہ بزرگ تھے جو ادب کے مورخ تھے مولانا آزاد مورخ پہلے تھے نقاد بعد میں تھے، شبلی کی شعرالعجم تاریخ کی کتاب پہلے ہے تنقید کی کتاب بعد میں ہے۔ حالی مقدمہ شعروشاعری میں تو صرف ناقد کے روپ میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔ مگر حیات سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید میں ان کی ناقدانہ حیثیت ضمنی ہے۔ سوانح نگارانہ حیثیت اصولی ہے۔ چنانچہ ان کتابوں میں امر واقعہ کی تحقیق ہی مقصود بالذات ہے۔ ان وجوہ سے کم وبیش پچاس سال تک تنقید اور تاریخ نگاری تقریباً باہم یک جان رہیں اور امر واقعہ کی تحقیق کا رجحان ہماری تنقید میں اس درجہ غالب رہا کہ اُردو کے پہلے نقاد محقق ہی کہلائے۔ پھر اعظم گڑھ کے مصنفین اور پروفیسر شیرانی وغیرہ نے تو ادبی مباحث سے متعلق مورخانہ جستجو کو اس درجہ اپنی توجہ کا مرکز ومحور بنالیا کہ ہمارے ملک میں مورخانہ چھان بین ہی تحقیق کی بہترین اور مکمل ترین صورت قرار پائی۔ ان حالات میں جب جدید تنقید نے جنم لیا تو نقادوں کو یہ محسوس ہوا کہ مروجہ تنقید سے تنقید کا عنصر تقریباً مفقود ہوگیا ہے۔ اس لیے انھوں نے سہولت کے لیے پرانے انداز تنقید کا نام ہی تحقیق رکھ دیا۔ یوں ان کے نزدیک تحقیق وتنقید دو بالکل الگ الگ شعبہ ہائے عمل قرار پائے۔

خیر۔۔ یہ تو ہے ایک غلط فہمی یا غلط العام، مگر جیسا کہ پہلے بیان ہوا دیکھنا تو یہ ہے کہ کیا سچ مچ تنقید وتحقیق میں اتنا فاصلہ ہے اور کیا ان دونوں شعبوں کے درمیان اتنی کڑی حد فاصل قائم کی جاسکتی ہے؟ اب تو زمانہ وہ آگیا ہے جب خود سائنس اور ادب کے درمیان کوئی خط فاصل کھینچا نہیں جاسکتا۔ میولر نے اپنی کتاب میں کیا مزے دار بات لکھی ہے کہ جدید فزکس خصوصاً آئن سٹائن کے نظریات نے لفظ (یا حرف (The) کو اپنی قلم رو سے بالکل خارج کر دیا ہے اور اس کی جگہ حرف "a" کو علم کی مستقل 'حرف صفت' قرار دے دیا ہے۔ مراد اس سے یہ ہے کہ جہاں پہلے سائنس کو Truth تک پہنچنے کا دعویٰ تھا اب وہ کلی قطعیت کے اس دعویٰ سے دست بردار ہو رہی ہے اور سائنس کی دریافت شدہ سچائیوں کو محض ایک سچائی A Truth ہی قرار دیتی ہے۔ کیونکہ اس ایک دریافت شدہ Truth کے علاوہ بھی تو (Truth) کی کئی شکلیں ہوسکتی ہیں۔ یہاں تک کہ ادبی تنقید کی ناقابل بیان ذوقی دریافتوں کو بھی غیر سائنسی نہیں کہا جاسکتا۔ پھر سائنس کی بزعم خود قطعی سچائیوں کو بھی اتنا قطعی نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ادب کی نقیض قرار پائیں اور یہ تو اب تسلیم کیا جاچکا ہے کہ تنقید بھی ایک سائنس ہی ہے۔ یہ بھی سائنس کی طرح ایک سچائی کی جویندہ و یابندہ ہے اور یہ سچائی حسن کی تلاش اور اس کی نسبتوں اور مقداروں کے تعین سے متعلق ہے اور اس کے بھی کچھ عقلی اصول ہیں۔ اس میں تاثر کی جابرانہ حکومت ہی حکم فرما نہیں جس کے متعلق یہ کہہ دیا جائے کہ بس مجھے تو یونہی محسوس ہوا ہے۔ تنقید میں تاثر کا فیصلہ اگرچہ بہت کچھ ہے مگر سب کچھ نہیں۔ تاثرات کے فیصلوں میں بھی ایک اندرونی عقلی تنظیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ قارئین کے کسی گروہ کو مطمئن کرنے کے لیے عقلی مسلمات کی ضرورت ہوگی۔ جن کا علم مصنف، نقاد اور معاشرے کی مشترک جائداد ہوگی اور یہی عقلی مسلمات جب تنقید کی بنیاد قرار پاجاتے ہیں تو تنقید کا عمل ایک سائنسی عمل بن جاتا ہے اور جونہی کہ تنقید ایک سائنس کی حیثیت سے جلوہ گر ہوجاتی ہے اس میں تحقیق وتجربہ کے انداز خود بخود پیدا ہوجاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ تنقید ادب میں موضوعیت (Subjectively) بڑی ضروری چیز ہے مگر معروضیت (Objectively) کے بغیر صحیح تنقید ادب ناممکن ہے اور اسی سے تنقید سائنس کی حدود میں داخل ہوجاتی ہے۔ سان براو وغیرہ نے تو تنقید کو سائنسی حقیقتوں سے اس درجہ وابستہ کر دیا تھا کہ حسن سائنس ہی کا ایک گوشہ بن کر رہ گیا تھا۔ یہ بھی ایک طرح کی انتہا پسندی تھی مگر تنقید کو سائنس سے بالکل الگ سمجھنا بھی تو سخت غلطی ہے۔

بہر حال یہ تو واضح ہے کہ ادبی تنقید کو کسی نہ کسی صورت میں سائنسی ضرور ہونا ہے اور جہاں یہ سائنسی ہوئی۔ وہاں تحقیق کا قدم آیا۔ مثلاً ان دو معمولی سے سوالوں ہی کو لے لیجیے۔ ایک یہ کہ کسی فن یا شاعری کے ادبی درجے کے تعین میں فن کار اور شاعر کی حیات کوئی حصہ لیتی ہے یا نہیں؟ دوسرا یہ کہ اگر شاعر کا انداز بیان شاعر کی شخصیت ہی کا پرتو ہے تو اس کے انداز بیان کے صحیح تجزیے کے لیے اس کی شخصیت (کے خارجی عناصر) کو بھی زیر بحث لانا ضروری ہے یا نہیں؟

اگر ادبی قدر و قیمت کی تعین میں حیات کا کوئی حصہ ہے جیسا کہ اب ثابت ہے کہ ہے، تو حیات کا کسی مصنف کی ادبی تخلیقات سے رابطہ قائم کرنے کے لیے مورخانہ تحقیق ایک بنیادی ضرورت بن جاتی ہے۔ اسی طرح اسلوب بیان کے لب ولہجہ کی شناخت میں شاعر یا مصنف کی شخصیت کا سوال بھی ویسا ہی اصولی اور بنیادی سوال بن جاتا ہے جس طرح خود حیات کی مورخانہ جستجو ایک اہم جستجو ہوتی ہے۔

اُردو تنقید میں تحقیق و تنقید کی مغائرت کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بعض اوقات شعرا اور مختلف اصناف ادب کے سلسلے میں ایسی غیر ذمے دارانہ باتیں بیان ہو جاتی ہیں جن پر امر واقعہ کو ہنسی آتی ہے۔ مجھے یاد ہے ایک زمانے میں اُردو کے ایک معروف نقاد نے یہ فرما دیا تھا کہ غزل ایک درباری صنف ہے۔ اس میں مقطع بادشاہ کے قائم مقام ہے۔ باقی اشعار غزل گویا امرائے دربار ہیں کہ ہر وقت جوڑ توڑ میں لگے ہیں اگر چہ ان کے دل آپس میں پھٹے ہوئے ہیں۔ مقطع میں شاعر۔ گویا دربار کی آخری صف میں۔ سگِ دربار کی طرح بیٹھا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ غرض اس طرح غزل اور دربار کو ایک شے قرار دیا گیا۔ بظاہر اس نظریے کے واضع نے ذہانت اور طباعی کی بڑی چمک دکھائی ہے۔ مگر سیاسی اور اجتماعی تاریخ کی شہادتیں اس عجیب و غریب نظریے کا ساتھ نہیں دیتیں۔ اس لیے کہ بہت سے غزل گو شعرا نے غزل کے علاوہ دوسری اصناف سخن کی بھی سرپرستی کی ہے۔ مثلاً میر تقی میر نے غزل کے علاوہ عمدہ مثنوی نگاری بھی کی ہے۔ مرزا رفیع سودا نے غزل کے علاوہ قصائد، مراثی، ہجویات بھی لکھی ہیں۔ میر اور درد نے باقی اصناف کی طرف سے تقریباً بے توجہی برتی اور وہ صرف غزل گو ہی تھے۔ مگر وہ درباری نہ تھے۔ پھر فارسی غزل کو لے لیجے۔ فارسی غزل گوؤں میں سعدی نے کچھ درباری داری کی مگر سعدی سگِ دربار کبھی نہیں ہے۔ یہی حال حافظ کا ہے اور شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جو شعرا سچ مچ سگِ دربار بنے ان سے تو کبھی اچھی غزل بن ہی نہیں آئی وہ لوگ تو قصیدہ نگاری کے مردِ میدان تھے اسی میں انھوں نے دادِ سخنوری دی۔

ان باتوں کے ہوتے ہوئے غزل کو درباری اثرات کی پیداوار قرار دینا کیسے درست ہوسکتا ہے۔ پھر یہ دیکھیے کہ غزل کا تو مزاج ہی جلوت پسند نہیں وہ تو خلوت دوست صنف ہے اور جن شاعروں نے اس کو جلوتوں کا ترجمان بنایا بھی ہے، انھوں نے کچھ زبردستی ہی کی ہے اور یہ زبردستی لکھنؤ میں زیادہ ہوئی۔ شعرائے دہلی نے غزل کی خلوت پسندی اور تنہائی پسندی کا خاص خیال رکھا۔ اسی لیے جو تغزل شعرائے دہلی کی غزل میں ہے وہ لکھنؤ کی غزل میں نہیں۔ ان وجوہ سے غزل کے متعلق مندرجہ بالا نظریے کی کچھ حقیقت نہیں رہ جاتی۔ یہ محض اس وجہ سے ہوا کہ اس نظریے کے واضع نے تحقیق کرنے کی تکلیف گوارا نہ فرمائی۔

پھر یہ واقعہ بھی ابھی بہت پرانا نہیں ہوا۔ جب ایک فاضل نقاد نے غزل کو بے سوچے سمجھے ایک نیم وحشی صنفِ ادب قرار دے دیا تھا۔ خیر یہ تو غنیمت ہوا کہ اس خیال کی بہت جلد تردید ہوگئی اور خوب اچھی طرح تردید ہوگئی۔ ورنہ تنقید کو تحقیق سے جدا کر کے دیکھنے کا یہ نتیجہ تقریباً یقینی تھا کہ غزل جیسی مقبول عام صنف سخت غیر مقبول ہو جاتی۔ تنقید میں حالات و واقعات کی تحقیق کو غیر ضروری قرار دینے کا اصل سبب تن آسانی اور سہل نگاری ہے اور یہ بھی کہ ان چیزوں میں ذوق و تاثر کو رہنما بنا لینا کافی سمجھا جاتا ہے۔

''غزل نیم وحشی'' والا نظریہ بھی دراصل اسی سہل نگاری کا دین احسان تھا جو ہمارے نقادوں میں ابھی تک پائی جاتی ہے۔ چنانچہ کسی نظریے کو مشتہر کرنے سے پہلے پوری پوری محنت نہیں کی جاتی۔ بس سرسری مطالعے سے اور اکثر محض اپنے ہی تاثر کی رہنمائی میں ایسے دعویٰ کر دیے جاتے ہیں جن کا نتیجہ برا نکلتا ہے اور چونکہ تاریخ کا گہرا مطالعہ شریک حال نہیں ہوتا اس لیے اکثر وہ نظریات مدت سے مغالطہ انگیز ثابت ہوتے ہیں۔

اُردو ادب اور شاعری کو طبقاتی اور معاشی نظریات میں دیکھنے کا آج کل خاصا رواج ہے اور مجھے اعتراف ہے کہ اس مطالعے سے بعض اچھے نتائج بھی نکلے ہیں مگر اس تحقیق کے نتائج سے بعض اوقات اطمینان نہیں ہوتا اور مجھے تو بعض اوقات ایسا دکھائی دیتا ہے کہ کچھ نتائج پہلے سے (بعض دوسرے عقائد کے زیر اثر) قائم کر لیے جاتے ہیں اور پھر ان کو کافی مورخانہ چھان بین کے بغیر ہی اُردو ادب کے مسائل پر چسپاں کر دیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں مریض، صحت مند، غیر صحت مند، ناسور، دکھتی رگیں، وغیرہ وغیرہ کے چند الفاظ کسی مورخانہ ریاضت و تحقیق کے بغیر (اور بعض اوقات بڑی ناانصافی سے) ہر موقع محل پر بے موقع محل استعمال کر لیے جاتے ہیں اور لطف یہ کہ ان نظریات میں تضاد و تناقض بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً کسی دور کے ادبی انحطاط کا ذمے دار اس دور کے سیاسی اور سماجی حالات کو ٹھہرایا جاتا ہے مگر یہ نہیں کیا جاتا کہ اس دور کی پوری سیاسی اور سماجی تاریخ کا بھی پورا مطالعہ کر لیا جائے۔ اس ادھورے مطالعہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یکساں اسباب کا نتیجہ ایک جگہ اور ہوتا ہے، دوسری جگہ اور۔ مثلاً میر کے دور کو تہذیبی انحطاط کا بدترین دور بیان کیا جاتا ہے مگر یہ نہیں بتایا جاتا کہ آخر اسی زوال کے زمانے میں میر اور درد جیسے

بڑے شاعر کیوں نکل آئے۔ محنت سے بچنے کے لیے میر کے ذکر میں تو میر کے زمانے کو اچھا کہہ دیا جاتا ہے۔ مگر بعض اوقات ایک ہی مضمون میں ان کے کسی اور معاصر کا جب تذکرہ ہوتا ہے تو وہ ہی دور سب سے برا دور بن جاتا ہے۔ یہی حالت خواجہ میر درد، میر حسن، غالب، مومن، حالی اور اقبال کی تنقیدوں میں برابر نظر آتی ہے اور میں دیانت داری سے کہتا ہوں کہ اس طریق کار کے سبب اُردو نقاد اور تنقید دونوں کے متعلق قارئین کا اعتقاد اٹھتا جاتا ہے۔ اس کا باعث بھی یہی ہے کہ تنقید میں تحقیق کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ نقاد صرف ذوقیات کا محکوم بن جاتا ہے اور اس واقعہ کی تحقیق کو اپنے دائرے سے باہر کی چیز سمجھتا ہے۔

میں نے تنقید و تحقیق کی ہم آہنگی اور ہم رکابی پر زیادہ زور اس لیے دیا ہے کہ ہماری تنقید میں تحقیق کی کمی کی وجہ سے بڑا نقصان ہو رہا ہے۔ نقاد اگرچہ اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتے، مگر اس سے پہلو بچانے کے مرتکب ضرور ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے تن آسانی کی عادت بڑھ رہی ہے اور وہ جو مطالعات میں زیر تنقید مصنفوں کی تصانیف کو دس دس بیس بیس مرتبہ پڑھنے اور غور سے پڑھنے کی عادت مغرب کے مصنفوں میں پائی جاتی ہے اس کی مثالیں ہمارے ملک میں شاذ ہی تھیں۔ یہاں تو تصنیف صحافتی ضرورتوں کے ماتحت ہوتی ہے۔ اسی لیے سچی محنت کے آثار بہت کم پائے جاتے ہیں اور نظریات و نتائج اتنے پادر ہوا ہوتے ہیں کہ معمولی سے تجزیے کی بھی تاب نہیں لا سکتے۔ خیر وہ زمانہ تو اب گزر گیا ہے جب محض تاثراتی تنقید کا نیا نیا جوش اٹھا تھا اور بعض نقاد یہ تک کہنے لگے تھے کہ اجی صاحب۔۔ اصل شے تو ادب پارہ ہے پس اسی پر غور کرو، اسی کا تجزیہ کرو، اس سے باہر بالکل مت دیکھو۔ مصنف یا شاعر کو درمیان میں لانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو خود بھی اپنی بات نہیں سمجھتا ہوگا، وغیرہ وغیرہ۔ خدا کا شکر ہے کہ اب ایسی باتیں کہنے والے زیادہ نہیں رہے۔ پھر بھی ہمارے اہلِ قلم میں یہ رجحان اب بھی موجود ہے کہ وہ مصنف کی شخصیت و حیات اور اس کے ادب پاروں کے باہمی روابط کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور اس بارے میں سہل نگاری سے کام لیتے ہیں۔ حالانکہ مصنف کی زندگی کا کوئی واقعہ بھی تنقید کے نقطۂ نظر سے بیکار نہیں سمجھا جا سکتا۔ سوانح عمری سے ادب پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے اور بعض اوقات تو سوانح عمریوں سے بلکہ مصنفوں اور شاعروں کے خطوط سے فنی تخلیقات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اسی طرح تہذیب اور سماج کے حقائق کا علم بھی ادبی جائزوں کے سلسلے میں مفید بلکہ ضروری ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ دوسری زبانوں کے معاصر تنقید و تحقیق کو دو الگ چیزیں قرار دینے والے اس کی اہمیت نہیں سمجھتے۔

ماحصل یہ کہ تنقید میں بھی تحقیق کے کئی پہلو نکلتے ہیں اور تنقید کے لیے بھی تحقیق ایک لازمی سا عمل ہے۔ سیاں بوا فن کے ساتھ فن کار کو بھی سمجھنے کی دعوت دیتا ہے۔ آئی۔ اے رچرڈ فن کے ساتھ قاری کے ذہن اور ماحول کو سمجھنے کی تاکید کرتا ہے۔ رابرٹسن تو اس سے بھی آگے بڑھ کر خود ناقد کو بھی اس میں لے آتا ہے اور اس کی نفسیات شناسی کو ضروری قرار دیتا ہے۔ تاں ساری اجتماعی تہذیب کے مطالعے کو اہمیت دیتا ہے اور ہربرٹ میولر کے نزدیک تو زمانے کی مجموعی فکری روح کی شناخت بھی ضروریات تنقید میں شامل ہے۔ غرض کوئی سچی تنقید تحقیق سے آنکھ نہیں چرا سکتی اور صرف تاریخ ہی نہیں حیات انسانی کی پوری تاریخ اس کی لپیٹ میں آتی ہے، یہیں پہنچ کر تحقیق و تنقید ہم معنی سے الفاظ بن جاتے ہیں۔ کم از کم دونوں کی باہمی بے تعلقی کا دعویٰ غلط ہی ثابت ہوتا ہے۔

❖❖❖❖

(۱) تحقیق و تنقید، ڈاکٹر سید عبداللہ، نیا دور، کراچی شمارہ ۲۵، ۱۹۵۶ء۔

فنِ تحقیق[1]

ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں

ہماری بہت سی تاریخی کتابیں ایسی بھی ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام کے ذکر سے شروع کی جاتی تھیں۔ یعنی حمد و نعت کے بعد تمام انبیاء علیہم السلام کے مختصر حالات ہوا کرتے تھے۔ پھر تمام خلفائے اسلام اور مختلف سلاطین کا تذکرہ ہوتا تھا اور جب مورخ اچھی طرح تھک کر چور ہو جاتا تھا تو وہ لشتم پشتم اپنے زمانے کے حالات تک پہنچتا تھا۔ ایسی حالت میں، ظاہر ہے کہ وہ اپنے معاصرین کا سرسری جائزہ ہی لے سکتا تھا اور اس کا قلم پھر ہمیشہ کے لیے رُک جاتا تھا۔ قریب قریب یہی انداز آج کل کے اکثر تحقیقی مقالات کا ہوتا ہے۔ جن میں اصل موضوع سے متعلق بہت کم مواد ہوتا ہے، مگر ضروری مباحث کے لیے کوئی ایک دو نہیں، بلکہ متعدد ابواب ہوا کرتے ہیں اور غیر متعلق اقتباسات سے مقالات کا حجم بڑھایا جاتا ہے۔ بعض تحقیقی مقالات ایسے بھی ہیں کہ ان میں نثر و نظم کی پوری داستان تو موجود ہے لیکن موضوع سے متعلق صفحات بہت کم ہیں۔ گویا وہ اپنی وسعت اور پہنائی میں داستان امیر حمزہ ضرور ہیں لیکن تحقیق اور جانچ پڑتال سے ان کا بہت کم واسطہ ہے۔ ایسی سرسری ''تحقیق'' عام ہے۔ اسی طرح ہماری تنقید بھی سرسری اور ہوائی ہوا کرتی ہے یعنی تنقید کا عام انداز یہ ہوتا ہے کہ پہلے کتاب کے موضوع سے متعلق چند جملے تمہید میں کہے جاتے ہیں، پھر کتاب کے ابواب کی تفصیل دے دی جاتی ہے اور اگر زیادہ کرم فرمایا تو یہ بھی کہہ دیا کہ فلاں باب زیادہ کمزور ہے۔ پھر اس کتاب کی چند موٹی موٹی خوبیاں یا خامیاں جو اچھا یا زیادہ سرسری مطالعے ہی سے نظر آ جاتی ہیں، بیان کر دی جاتی ہیں لیکن اکثر یہ ہوتا ہے کہ خوبیوں کا مختصر تذکرہ کر کے خامیوں کے بارے میں فرمایا جاتا ہے کہ:

''امید ہے کہ یہ خامیاں آئندہ ایڈیشن میں دور کر دی جائیں گی نیز یہ کہ کتاب بہر حال اچھی ہے اور مصنف کے حسنِ ذوق کی شاہد ہے''۔

ہماری عملی تنقید کا عام انداز یہی ہے۔ اسی طرح بعض تنقید نگار جب کسی فرمائشی تنقید کے لیے مجبور کیے جاتے ہیں تو ان کی ایسی تنقید میں قدیم تقریظ کی طرح، الفاظ کے گورکھ دھندے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ مثلاً انگریزی کے ایک ''اردو'' نقاد ایک مرتبہ ایک صاحب کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

> ''وہ نظم و نثر دونوں میں کافی (یعنی ناکافی نہیں) شہرت اور مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ اُن کا انشا پردازی کی طرف رجحان بہت نمایاں ہے اور ان کے طرز میں ایک انفرادیت ہے جو ان کی دل کش ہستی کی آئینہ دار ہے۔ انھوں نے شاعری کی طرف، نثر سے زیادہ، توجہ دی ہے اور زیادہ تر ان کا شمار ایسے شاعروں میں ہوتا ہے جو قدیم و جدید کی آمیزش سے ایک نیا رنگ جما چکے ہیں۔.............. ان کے یہاں پرانے اثرات کا وجود لازمی تھا، مگر اثرات سے زیادہ ان کی شاعری میں فطرت نمایاں ہے اور ان کا حساس مزاج ان کی شاعری کو مخصوص طور پر پُر اثر بناتا ہے...... اُردو ادب پر ان کے اہم احسانات ہیں[2]''۔

یہ ایک کہنہ مشق لیکن مروت کے ''زیر مشق'' نقاد نے ایک ادیب اور پریس دونوں کو خوش کرنے کے لیے تنقید لکھی ہے۔ جو شاید پہلے ہی سے لکھی لکھائی یا چھپی چھپائی رکھی ہوئی تھی اور صرف دستخط کی محتاج تھی بہر حال: ع

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

ایسی تنقید اور تحقیق کے ذکر سے مقصد صرف یہ ہے کہ ہم سمجھ تو سکیں کہ ہم کہاں ہیں۔

تحقیق بظاہر تنقید سے مختلف ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں فن ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہم نے اپنی آسانی کے لیے ان دونوں کے درمیان حد فاصل قائم کر دی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے ''تحقیق و تنقید کے مقامات اتصال'' کے سلسلے میں صحیح لکھا ہے کہ:

> ''تاریخی تنقید میں کسی ادیب کے ماحول کو تاریخ کی روشنی میں دیکھ کر تاریخ ہی کی طرح بیان کیا جاتا ہے اور یہ انداز سائنسی تنقید کا بھی ہے، کیونکہ ایسی تنقید میں ادب کی پہچان، عقل اور تجربے کے معیار سے ہوا کرتی ہے۔ تاثراتی تنقید میں بھی محض ذاتی ذوق اور انفرادی تجربہ کارفرما نہیں ہوتا بلکہ اس کی راہ میں ایسے ایسے مقامات بھی آ جاتے ہیں جہاں اجتماعی پسند یا ناپسند کا عمل دخل ہوتا ہے۔ بہر حال، تنقید کسی طرح کی ہو، اسے تاریخ، عقلیات، اجتماعیات، یا نفسیات سے قریب تر ہونا پڑتا ہے اور جب تنقید کے یہ رشتے قائم ہو جاتے ہیں تو

پھر تحقیق اور تنقید کے درمیان بہت کم تفریق رہ جاتی ہے۔"[۳]

اس جائزے کے ساتھ ہی دیکھنا یہ ہے کہ ہم نے کیا کچھ کرلیا ہے اور اس مقصد کے لیے اب کیا کرنا ضروری ہے۔

اسلامی طرزِ تحقیق

قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے علم حدیث کے بارے میں روایت اور درایت کے لیے جو اصول منضبط کیے ہیں اُن پر جس قدر فخر کیا جائے کم ہے۔ روایت کے بارے میں ان کے حزم واحتیاط کا عالم یہ تھا کہ سیر ومغازی تو بہت بڑی چیز ہے، وہ عام خلفاء اور سلاطین کے حالات اس وقت تک بیان نہیں کرتے جب تک کہ ان کے پاس آخری راوی سے لے کر چشم دید گواہ تک تسلسل کے ساتھ روایت موجود نہ ہو۔ یعنی جو واقعہ لیا جائے وہ اس شخص کی زبانی ہو جو خود شریک واقعہ رہا ہو اور اگر وہ خود شریک واقعہ نہیں تھا تو اس واقعے تک تمام درمیانی راویوں کے نام ترتیب کے ساتھ بیان کیے جائیں اور ساتھ ہی یہ بھی تحقیق کی جائے کہ وہ لوگ کون تھے؟ کیسے تھے؟ ان کے مشاغل کیا تھے؟ ان کا کردار کیسا تھا؟ ان کی سمجھ کیسی تھی؟ ثقہ کہاں تک تھے؟ سطحی الذہن تھے یا نکتہ رس تھے؟ عالم تھے یا جاہل؟ تمام جزئی باتوں کا پتا لگانا بے حد دشوار تھا لیکن ہزاروں محدثین نے اس کام کے لیے اپنی عمریں وقف کردیں اور ان تحقیقات سے اسماء الرجال کا ایک بے مثل فن ایجاد کیا کہ جس کی بدولت کم از کم ایک لاکھ شخصیتوں کے صحیح حالات معلوم ہوسکتے ہیں۔ اگر کسی راوی پر کذب، تہمت، غفلت، ثقاہت کی مخالفت یا حافظے کی کمزوری وغیرہ کا الزام ہے تو محدثین نے بلا تکلف اس کو مجروح اور اس کی روایت کو مردود۔ بدعت قرار دیا ہے۔ مرفوع، موقوف، قولی وفعلی وتقریری، نیز آحاد ومتواتر، مشہور وعزیز وغریب۔ اسی طرح صحیح وحسن اور مقبول ومردود وغیرہ کتنی اقسام حدیث ہیں[۴] جن کی تقسیم خود اپنی جگہ اس امر کی شاہد ہے کہ علمائے اسلام کی نظر کس قدر گہری تھی اور ان کا معیار تحقیق کس قدر بلند تھا۔ فنِ روایت کے بعد درایت کا نمبر آتا ہے۔ یعنی ایک حدیث کے تمام راوی (شروع سے آخر تک) ثقہ اور مستند تو ضرور ہیں لیکن ممکن ہے کہ عقلاً اس روایت میں کوئی خامی موجود ہو۔ چنانچہ ایسی روایت بھی غیر معتبر قرار دی جائے گی۔ محدثین نے درایت یعنی عقلی حیثیت سے روایتوں کو پرکھنے کے لیے یہ اصول قائم کیے ہیں۔

۱۔ واقعۂ مذکورہ کیا اصولِ عادت کی رو سے ممکن ہے یا نہیں؟

۲۔ اس زمانے میں لوگوں کا عام میلان کیا واقعے کے مخالف تھا یا موافق؟

۳۔ اگر واقعہ کسی حد تک غیر معمولی ہے تو اسی نسبت سے ثبوت کی شہادت زیادہ قوی ہے یا نہیں؟

۴۔ اس امر کی تفتیش ضروری ہے کہ واقعے کے متعلق راوی کے قیاس اور رائے کو کہاں تک دخل حاصل ہے؟

۵۔ راوی نے واقعے کو جس صورت میں ظاہر کیا ہے وہ واقعے کی پوری تصویر ہے یا اس امر کا احتمال ہے کہ راوی اس واقعے کے ہر پہلو پر نظر نہیں ڈال سکا اور اس کی تمام خصوصیات کا جائزہ نہیں لے سکا۔

۶۔ اس امر کا اندازہ لگانا بھی ضروری ہے کہ زمانے کے امتداد اور مختلف زاویوں کے طریقۂ ادا نے واقعے میں کیا کیا اور کس کس قسم کے تغیرات پیدا کردیے ہیں[۵]؟

درایت یعنی عقلی حیثیت سے واقعات کو جانچنے کے یہ اصول اس قدر قوی ہیں کہ راویوں کی صداقت اور دیانت کا پورا پورا اندازہ ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی منافقین کی افترا پردازی کی قلعی بھی کھل جاتی ہے۔ شمع رسالت کے ایک لاکھ چوبیس ہزار پروانوں میں سے ساڑھے سات ہزار ایسے ہیں جن کی روایات، کتب احادیث میں منقول ہیں اور سب کی سب مستند ومعتبر ہیں۔ چنانچہ محدثین نے بے خوف ہو کر بڑے سے بڑے راوی اور روایت کو پرکھا ہے اور حزم واحتیاط کے معاملے میں کسی رورعایت کو جگہ نہیں دی۔ امام وکیعؒ کا مشہور واقعہ ہے کہ وہ اپنے والد سے جب روایت کرتے ہیں تو ان کی تائید میں کسی دوسرے راوی کو ضرور ملا لیتے ہیں کیوں کہ ان کے والد سرکاری خزانچی تھے۔ اسی طرح محدث مسعودی کا واقعہ ہے کہ ۱۵۴ھ میں امام معاذؒ بن معاذ نے جب ان کے نسیان کا اندازہ کیا تو فوراً ان کے حافظے سے متعلق اپنی بے اعتباری ظاہر کردی[۶]۔ لیکن یہ حالات دیر تک ایک آہنگ پر قائم نہ رہ سکے اور خیر القرون قرنی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم کے مصداق معاشرے کے صدق حال ومقال میں فرق آ گیا۔ چنانچہ جب علامہ ابن خلدون (۸۰۸ھ) نے فلسفہ تاریخ پر بحث کرنی چاہی تو انھیں یہ اعتراف کرنا پڑا کہ واقعات کی تصویر کشی میں غلطیوں کا رجحان پایا جاتا ہے، کیونکہ انسان اپنی رائے سے مطابقت رکھنے والی چیزوں کو بغیر چھان بین کے بھی قبول کرلیتا ہے اور خبر پہنچانے والوں کی روایات کو حالات کے تقاضے کے متعلق جانچنے کی کوشش نہیں کرتا کہ فلاں حالات کے تحت ایسا واقعہ رونما ہو بھی سکتا تھا، یا نہیں۔ اصول عادت، قواعد سیاست، طبیعت

تمدن اور اجتماع انسانی کے حالات پر نظر رکھنی بہر حال ضروری ہے۔ کیونکہ انسان کے زمان و مکان کا واسطہ انھی چیزوں سے ہوتا ہے اور ان کے بغیر کوئی تاریخ، تاریخ نہیں ہو سکتی۔

مغربی فکرِ تحقیق

مسلمانوں کے اصولِ تحقیق اوپر آ چکے ہیں، قریب قریب یہی اصول اب مغرب کی کتابوں میں بھی بیان ہونے لگے ہیں Carter V. Good کی The Methodology of Educational Research میں جو اصول بیان کیے گئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے[8]۔

''کسی واقعے کو پرکھنے کے لیے خارجی اور داخلی شہادتوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ مواد کہاں سے حاصل ہوا؟ راوی کون تھا؟ اس کے ذاتی حالات یعنی مزاج، مذاق، کردار و گفتار کی نوعیت کیا ہے؟ پھر اس خاص واقعے کے کتنے عرصے کے بعد راوی نے اسے نقل کیا؟ وہ روایت محض حافظے کی بنا پر بیان کی گئی ہے یا کسی اور راوی نے بھی اس کی تصدیق کی ہے؟ اصل واقعہ کتنا ہے اور تحریف یا اضافہ کس حد تک ہے؟''

یہ اصول Carter V.Good نے فراہم کیے ہوں یا Dr. Hollis[9] نے جمع کر لیے ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ سب کے سب اور قطعی طور پر مسلمانوں کے اصولِ حدیث سے ماخوذ ہیں اور ایسے ہیں کہ اُن پر خود مغربی مستشرقین کما حقہٗ عمل نہیں کر سکتے۔ چنانچہ یہ اصول ''فکری تحقیق'' یا ''نظریاتی تحقیق'' کے ذیل میں تو آ سکتے ہیں لیکن ''عملی تحقیق'' کے دائرہ عمل سے باہر ہیں اور یہ محض اس لیے ہے کہ اُن کے یہاں بلکہ اب تو کسی کے یہاں بھی وہ احتیاط برتی نہیں جاتی جو مسلمانوں کے قرونِ اولیٰ میں تھی۔ موجودہ دور کا محقق صرف اس بات سے خوش ہو جاتا ہے کہ اس نے اپنے موضوع سے متعلق کوئی معاصر شہادت ڈھونڈ نکالی۔ اب اسے مزید تحقیق و تنقیح سے سروکار نہیں اور اس کے لیے اس کے پاس کوئی گنجائش بھی تو نہیں۔ وہ کہاں سے اور کس طرح معلوم کر سکتا ہے کہ معاصر راوی، ثقہ ہے یا غیر ثقہ، نکتہ رس ہے یا سطحی الذہن؟ حافظے میں پختہ ہے یا نسیان کا شکار؟ بے جا عقیدت رکھتا ہے یا بغض پرور؟ ملازمت یا خدمت گزاری کی وجہ سے خوشامدی اور ذہنی پستی میں گرفتار ہے یا حق گو اور بے خوف ہے؟ یہ اور اسی قسم کے دوسرے سوالات اگر اٹھائے بھی جائیں تو ان کا حل کہاں اور کیونکر مل سکے گا؟ بالآخر اسی بات پر اکتفا کرنا پڑتا ہے کہ جس شخصیت پر کام کیا جائے، اس کے ماحول اور معاشرے کا جائزہ لے لیا جائے اور اس کی ''باقیات'' کا بغور مطالعہ کر لیا جائے۔ مجھے یہ عرض کرنے میں باک نہیں کہ ہم لوگوں نے اس انداز سے بھی بہت کم کام کیا ہے اور افسوس تو یہ ہے کہ اس نقص کا احساس بھی بہت کم ہے۔ ایک موٹی مثال ''عالمگیریات'' کی ہے۔ یعنی اورنگزیب عالمگیر سے متعلق جو ہمارے فضلاء کا یہ دعویٰ ہے کہ ہمارے برصغیر میں اُس پر سب سے زیادہ کام ہوا ہے تو کیا وہ انصاف سے بتا سکیں گے کہ عالمگیر کی مذہبی پالیسی کے لیے اُن اسباب و علل پر بھی غور کیا گیا ہے جو اخلاقی اور روحانی طور پر اُن کو متاثر کیے ہوئے تھے؟ میری مراد ہے حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے صاحبزادگان اور بالخصوص اُن کے پوتے یعنی حضرت خواجہ محمد نقشبندی ثانی رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت خواجہ سیف الدین رحمتہ اللہ علیہ کی مساعی جمیلہ سے۔ اُنھوں نے اپنے بکثرت مکتوبات سے اور خود اپنی صحبت بابرکت سے اُس کو متاثر کیا تھا۔ افسوس کہ ہم نے عموماً اُن خانقاہوں سے ہنوز رجوع نہیں کیا جہاں اس قسم کے بکثرت جواہر پارے موجود ہیں۔ ان بزرگانِ دین کے بارے میں وقائع نعمت خان عالی کا یہ شعر ہم نے بار ہا پڑھا ہوگا۔

افترا و زور و بہتاں، فال و خواب خواجگاں
شید و خدعہ دعوتِ شیخانِ سرہندی وطن

لیکن کبھی اس شعر پر ہم نے غور بھی کیا ہوتا، کہ وہ حقیقت نگار ہے یا حقیقت سوز؟

پھر عالمگیر کے مقربین میں سے قاضی شیخ الاسلام، شائستہ خان، عاقل خاں، سیف خان، بختاور خاں، مکرم خاں، مصطفیٰ خاں، میرزا میرک گرز برادر وغیرہ بکثرت لوگ ایسے ہیں جن کے نام اُن بزرگوں کے متعدد مکتوبات موجود ہیں۔ کیا یہ مکتوبات، تصوف کے ساتھ ساتھ تاریخ کا بیش بہا خزینہ نہیں؟ ان بزرگوں کے اعزا اور خلفاء میں سے بہت سے ایسے ہیں جن کی تصانیف موجود ہیں اور اُن سے بعد والے سیاسی، معاشرتی اور تاریخی حالات کے لیے بہت کچھ مواد حاصل ہو سکتا ہے۔ خود سندھ کے مختلف بزرگانِ دین کے ملفوظات اور مکتوبات بھی اس لحاظ سے بہت اہم ہیں اور ان جواہرات کی قدر کے لیے کسی شاہ کی نہیں بلکہ کسی جوہری کی ضرورت ہے۔

خارجی شہادت

خیر بات کہاں سے کہاں جا پہنچی! میں عرض کر رہا تھا کہ مغرب کے جدید اصولِ تحقیق، زیادہ تر بلکہ کلیتہً مسلمانوں کے اصول سے ماخوذ ہیں۔ لیکن چونکہ اس دور میں ان پر عمل کرنا سخت دشوار ہے، اس لیے ہم نے صرف چند موٹی موٹی باتیں اپنالی ہیں۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ موضوع ایسا ہو جس میں پھیلاؤ نہ ہو۔ یہ اس لیے ہے کہ وسیع کام عموماً ایک سرسری جائزے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا اور وقتِ نظر کے فقدان کی وجہ سے اُسے کسی لحاظ سے بھی "تحقیقی سرمایہ" نہیں کہہ سکتے۔ بعض حضرات کسی خاندان یا کسی مدت کی تاریخ لکھواتے ہیں تو وہ تاریخ بھی گہرے مطالعے سے محروم رہتی ہے اور زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتی۔ بہر حال، کام کسی نوعیت کا ہو، سب سے پہلے ایک عارضی خاکہ تیار کرایا جاتا ہے اور کتابیات کی ایک جامع فہرست بھی مرتب کی جاتی ہے تاکہ موضوع سے متعلق تمام ضروری معلومات فراہم ہوسکیں۔ امریکا والوں نے Comentation centres بنالیے ہیں جن سے یقیناً بڑی مدد ملتی ہے۔ تاہم اگر ہمارے ملک میں ایسے مراکز نہ بھی ہوں تب بھی آپ جیسے فضلا کی نگرانی میں ہمارے طلبہ بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں اور ان کی مختلف صلاحیتوں کے پیشِ نظر، ان کے لیے مختلف اہم موضوعات مقرر کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً ہمارے کسی طالب علم کو اگر شعر و شاعری سے زیادہ لگاؤ ہے تو اس سے ہم یہی کہیں گے کہ کسی لمبے چوڑے موضوع کے بجائے اپنا کام کسی ایک شاعر تک محدود رکھ کر خارجی مواد سب سے پہلے تلاش کرو۔ یعنی اس شاعر کے متعلق تمام ضروری تذکرے اور تاریخیں دیکھ لی جائیں اور حالات میں جہاں کہیں اختلاف نظر آئے اسے خاص طور پر نوٹ کرلیا جائے تاکہ دیگر معاصرانہ یا داخلی شہادتوں کے ذریعے اس کی تحقیق و تنقیح کی جاسکے۔ شاعر کے اساتذہ اور تلامذہ کے حالات اور تصانیف کا بھی پورا پورا مطالعہ کیا جائے اور دیکھا جائے کہ اس نے اپنے اساتذہ نیز معاصرین سے کس حد تک اتفاق یا اختلاف کیا ہے اور کیوں؟ اگر فنی اختلاف ہے تو اس کے اسباب و علل پر غور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اس کا صحیح پس منظر اور پیش منظر واضح ہوسکے، اسی طرح اُس شاعر کے مختلف تلامذہ کی تصانیف اور مختلف صلاحیتوں کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے تاکہ اُستاد اور شاگردوں کی امتیازی خصوصیات اجاگر ہوسکیں۔ یعنی جس طرح یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ شاعر یا مصنف اپنے اساتذہ یا معاصرین سے کہاں تک متاثر ہے، اُسی طرح یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے تلامذہ یا معاصرین کو متاثر کرنے کی کس حد تک صلاحیت رکھتا ہے۔ پھر اس شاعر کے ماحول کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اس کی ذہنی تخلیق اُسی کے ماحول کی پروردہ ہوتی ہے۔ معاشی، معاشرتی، تاریخی اور سیاسی حالات بھی بہت کچھ متاثر کرتے ہیں۔ پھر اس کے والدین، اعزا اور احباب کے مزاج اور مذاق کا اندازہ لگانا بھی بہت مفید ہوگا کیونکہ یہ اثرات بہت دور رس ہوتے ہیں اور فن کار کی تخلیقات کے ایسے گوشوں میں چھپے ہوئے ہوتے ہیں کہ اُن کا ڈھونڈ نکالنا بظاہر آسان نہیں بلکہ خارجی شواہد کا داخلی شواہد سے صحیح اتصال اسی موقع پر ہوا کرتا ہے۔ پھر اگر وہ کوئی "عہد آفریں" فن کار ہے تو اُس کی ذہنی فکر سے متعلق ان تمام خارجی کیفیات کا مطالعہ اور بھی ضروری ہے جو کسی نہ کسی طرح اُسے متاثر کرسکتی تھیں۔ اس قسم کے مواد کی فراہمی کے سلسلے میں کسی طرح کا اغماض بھی روا رکھنا سخت ظلم ہے۔ کیونکہ

ع خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات

مجھے اپنی طالب علمی کے زمانے کا یہ واقعہ اب تک یاد ہے کہ ایک مرتبہ علامہ ڈاکٹر محمد شفیع صاحب مرحوم نے خارجی شواہد کے سلسلے میں مجھے ایک ایسی نادر قلمی کتاب کے مطالعے کا مشورہ دیا جس کا ایک نسخہ جرمنی میں تھا۔ میں نے اس کے حصول میں اپنی معذوری ظاہر کی تو انھوں نے فرمایا کہ حکیم یا ڈاکٹر ایک دوا کے میسر نہ ہونے پر کوئی دوسری دوا تجویز کرسکتا ہے لیکن ریسرچ کے سلسلے میں جو کتاب تجویز کی جائے وہ ہر قیمت پر حاصل کرنی ہوگی، کیونکہ اس کا کوئی بدل نہیں ہوسکتا۔

خارجی شواہد کے لیے تذکروں اور تاریخوں کے علاوہ بعض مرتبہ معمولی معمولی رسائل بلکہ اخبار بھی بہت اہم ثابت ہوتے ہیں۔ یعنی ان میں کسی شخصیت کے متعلق کوئی اشارہ بھی مل جاتا ہے تو اس سے اتنا تو ضرور معلوم ہوجاتا ہے کہ فلاں وقت تک اس نے کیا کیا لکھ لیا تھا۔ اکثر معاصر تذکروں یا کلام کے مجموعوں میں تھوڑے بہت حالات کے ساتھ کسی شاعر کے جو اشعار بطور نمونہ پائے جاتے ہیں ان سے ان کی غزلوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جو ایسے مجموعوں کی ترتیب کے وقت تک تیار ہوچکی تھیں۔ پھر داخلی شواہد سے ایسے کلام کی تعیین میں بڑی مدد ملتی ہے اور شاعر کے ذہنی ارتقا کے سمجھنے کے لیے یہ کام بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ معاصرانہ چشمک اور محبت سے متعلق اچھے بلکہ بُرے اشعار یا حوالے بھی کسی شخصیت کے سمجھنے میں مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ان کے افہام و تفہیم میں حزم و احتیاط کی یقیناً ضرورت ہے اور آپ جیسے فضلا کی رہبری میں یہ بات کچھ مشکل نہیں۔

خارجی مواد کی خاطر اگر ممکن ہو تو شاعر یا مصنف یا جس شخصیت پر کام کیا جائے اُس کے وطن اور مقاماتِ قیام کو بھی دیکھا جائے۔ کیونکہ گرد و پیش کے حالات اور واقعات کو سمجھنے کے لیے اس قسم کے سفر سے بھی بڑی مدد ملتی ہے۔ اسی طرح اس شخص کی استعداد کے متعلق مختلف علوم و فنون سے بھی متعارف ہونا ضروری

ہے، کیونکہ جو چیز بلا واسطہ حاصل ہو سکتی ہے وہ زیادہ اہم ہوا کرتی ہے۔ مزید یہ کہ مختلف مآخذوں کے لیے ترجموں سے کام لینا صحیح نہیں۔ کیونکہ ترجمے کا لاصل نہیں ہو سکتے اور تحقیقی نکتہ شناسی اور جزرسی کے اہم مقصد کو پورا نہیں کر سکتے۔

داخلی شہادت

داخلی مواد سے متعلق پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس شخصیت کی جملہ تخلیقات کا جائزہ تاریخی ترتیب و توقیت کے ساتھ لیا جائے تا کہ اس کے ذہن کی تدریجی ترقی کا اندازہ ہو سکے۔ دیکھیے زبان، انداز بیان اور خیالات ہی ایسی چیزیں ہیں جو کسی شخصیت کے عیب و ہنر کی چغلی کھاتی ہیں۔ ایک زمانے میں وہ شخص کس طرح کی زبان بولتا تھا؟ کیا کیا تشبیہات و استعارات استعمال کرتا تھا؟ کون سے جذبات و خیالات اُس کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے؟ زمانے کی پسند یا ناپسند سے اس کا تعلق کس حد تک تھا؟ کون سے اصناف سخن اُسے پسند تھے؟ کون سے موضوعات سے اس کا تعلق تھا؟ یہ تمام باتیں خود اُس کے کارنامے یا شہ پارے میں مل سکتی ہیں۔ اگر ان باتوں کے ساتھ ہی ان کے اسباب پر بھی غور کر لیا جائے تو اُس شخصیت کی نفسیات کی بہت سی گتھیاں سلجھائی جا سکتی ہیں۔ قصیدہ گو شاعر کی مدح سرائی جسے خوشامد سے تعبیر کیا جاتا ہے، مادح اور ممدوح دونوں کی نفسیات کی نقاب کشائی کرتی ہے۔ اسی طرح ایک ہجو نگار، لاکھ برا سہی، اپنے معاصرین کی دکھتی ہوئی رگ کو اس طرح پکڑتا ہے کہ معاشرے کے بہت سے ناسور رستے ہوئے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ رزمیہ بحور میں مثنویاں لکھنے والا اپنے اس ماحول کی ترجمانی کرتا ہے جس میں جنگ و جدال کا چرچا تھا، خواہ وہ میدان کارزار ہو، خواہ مجلسِ مرثیہ نگار۔ اسی طرح محفل طرب کو گرما دینے والی مثنویاں اور ناٹک وغیرہ بھی اپنے اپنے ماحول کی عکاسی کرتے ہیں۔ گویا ایسے مطالعے سے فن کار اور محل کار دونوں کو پہچانا جا سکتا ہے اور اگر یہ مختلف اصناف سخن ایک ہی فرد کے زور قلم کا نتیجہ ہیں تو اُن سے ایک ایسے منتشر الخیال معاشرے کی شناخت بھی کی جا سکتی ہے جس نے ہر رطب و یابس کو لبیک کہا اور وحدت افکار کی بجائے کثرت افکار کو دعوت دی۔

داخلی شہادت کے لیے سب سے پہلا مواد کسی مصنف یا شاعر کی تخلیقات ہی سے حاصل ہوتا ہے اور اس کے کلام سے صراحتہً یا کنایتہً ایسے مطالب نکل آتے ہیں کہ اجمال کے باوجود تفصیل ہم پہنچائی جا سکتی ہے مثلاً ولی (م ۱۱۱۹ھ) کے دیوان کی پہلی غزل میں سے یہ چار اشعار ملاحظہ ہوں:

کیتا ہوں ترے ناؤں کو میں ورد زبان کا
کیتا ہوں ترے شکر کوں عنوان بیاں کا

جس گرد اُپر پانوں رکھیں تیرے رسولاں
اُس گرد کو میں کحل کروں دیدۂ جاں کا

مجھ صدق طرف عدل سوں اے اہل حیا دیکھ
تجھ علم کے چہرے پہ نہیں رنگ گماں کا

ہر ذرہ عالم میں ہے خورشید حقیقی
یو بوجھ کے بلبل ہوں ہر اک غنچہ دہاں کا

ان اشعار سے حسب ذیل باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔

۱۔ اشعار کے الفاظ شہادت دیتے ہیں کہ ان کا کہنے والا کوئی ڈھائی سو سال پہلے کا ہے۔

۲۔ دوسرے شعر (نعتیہ) سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے فارسی شعرا کی تقلید کو اپنا شیوہ بنایا ہوگا اسی لیے اس شعر میں حضرت جامی کا یہ مضمون لیا ہے۔

بہ زمینے کہ نشان کف پائے تو بود
سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

۳۔ شاعر نے تیسرے شعر میں چاروں خلفائے راشدین (رضی اللہ عنہم) کی منقبت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ منقبت کے لیے ایسے لطیف اشارے ہماری شاعری میں شاذ ہی نظر آئیں گے۔

۴۔ شاعر نے چوتھے شعر میں وحدت شہود کے عقیدے کا اظہار کیا ہے کیونکہ وہ حضرت شیخ علی رضا سرہندی رحمتہ اللہ علیہ (م ۱۱۴۳ھ) سے بیعت تھا۔

۵۔ اسی چوتھے شعر کے دوسرے مصرع سے صاف ظاہر ہے کہ اس کا لکھنے والا غزل کا شاعر ہے۔

ان پانچ باتوں کے علاوہ ایک اور چیز یہ بھی ہے کہ رسمیہ حمد ونعت والی غزل جو محض خانہ پری کے لیے دیوان کے شروع میں اضافہ کی جاتی ہے، ظاہر ہے کہ شاعر کے آخری عہد میں لکھی گئی ہوگی۔ چنانچہ اس غزل میں وہ تلازے باقی نہیں رہے جو ولی نے دہلی آ کر حضرت شاہ گلشن علیہ الرحمہ کے مشورے پر شعرائے متاخرین فارسی کی تقلید میں اختیار کر لیے تھے اور وہ رفتہ رفتہ کم ہوتے گئے۔

اشعار کا یہ تجزیہ ایک حقیر کوشش ہے۔ آپ حضرات اس سے بہتر طریقے پر اپنے طلبہ کی رہبری فرماتے ہوں گے۔ داخلی شہادت کے سلسلے میں آپ نے اپنے طلبہ کو اُن کے نصاب کے شعرا کا مطالعہ کراتے وقت کلام کی توقیت اور ترتیب بھی سمجھائی ہوگی۔ شعرا کے دواوین میں مختلف اصنافِ سخن کی تاریخ تصنیف شاذ ہی ملتی ہے اور غزلیات میں معدوم ہی ہے۔ (سوائے حاتم یا حسرت جیسے دو چار شعرا کے) لیکن طلبہ کے لیے اس کی شناخت از بس ضروری ہے۔ چنانچہ عرض ہے کہ اگر کسی ظاہری شہادت سے یہ تعیین نہ ہو سکے تو شاید اس طرح ضرور کامیابی ہو سکتی ہے کہ شاعر کے ایک مخصوص جذبے سے متعلق تمام اشعار یک جا کر لیے جائیں، پھر ان کے الفاظ اور اسالیب کی باہمی مناسبت پر غور کیا جائے۔ اگر یہ مناسبت اقرب ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اشعار بلکہ ان اشعار والی غزلیں قریب العہد ہوں گی۔ اسی طرح ہر جذبے سے متعلق شاعر یا مصنف کے الفاظ، محاورات، تلمیحات، مصطلحات، تشبیہات واستعارات نیز مختلف خیالات وغیرہ اگر یک جا کر لیے جائیں تو جس شخص کے کام و دہن سے اُن کا اظہار ہوا ہے، اُس کی گفتار و کردار دونوں کی قلمی تصویر کھینچی جا سکتی ہے اور اس خود گفتہ تاریخ سے بڑھ کر اُس شخصیت کے حالات کے لیے اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے؟ اس قسم کی سبک شناسی یقیناً مشکل چیز ہے لیکن اگر ہم میں سے کوئی شخص ایک سال میں صرف ایک طالب علم بھی اس طرح تیار کرا سکے تو وہ بجا طور پر کہہ سکتا ہے کہ: ع

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

طلبہ میں جب اس قسم کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ آسانی سے اصلی اور الحاقی کلام کے درمیان حد فاصل قائم کر سکتے ہیں اور یہ تمیز نہایت ضروری ہے، کیوں کہ ہم نام اور ہم تخلص شعراء کا کلام اکثر آپس میں خلط ملط ہو جاتا ہے۔ کیا ہمارے لیے یہ امر، موجب افسوس نہیں کہ ہم نے ابھی تک فارسی میں حضرت ابوسعید ابوالخیرؒ، حضرت احمد جامؒ، زندہ پیل، عمر خیام، عثمان مختاری، ظہیر فاریابی، عمادی غزنوی، حضرت عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت معین الدین چشتیؒ، حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، زیب النساء وغیرہ کے الحاقی اور اصلی کلام کا تجزیہ نہیں کیا۔ اسی طرح اردو میں سودا، قائم اور بیان نیز میر اور یقین وغیرہ کے کلام میں ہم نے ابھی تک حدِ فاصل کا کوئی خط نہیں کھینچا۔ اگر ہمارے طلبہ میں یہ صلاحیت پیدا ہو جائے تو پھر داخلی شہادت کا صحیح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

داخلی شہادت کے سلسلے میں ایک اور چیز بہت اہم ہے اور وہ ہے صوت و آہنگ۔ ایک غزل یا ایک تحریر کا آہنگ شروع سے آخر تک ایک ہی نہیں رہتا۔ کیونکہ بقول اقبالؔ:

دما دم نقشہائے تازہ ریزد
بہ یک صورت قرار زندگی نیست

بات یہ ہے کہ لکھنے والا، لکھتے لکھتے ہی مختلف حالات سے دوچار ہوتا ہے۔ شادی، غمی، بیماری اور پریشانی سبھی کے ساتھ لگی ہوئی ہیں۔ پھر مختلف انواع کی مصروفیات بھی درپیش ہوتی ہیں۔ اسی لیے بڑے سے بڑا ادیب بھی تجزیے کے جھول سے پاک نہیں۔ پہلے کے اساتذہ زیادہ تر اور آج کل کے اساتذہ کم تر اس بات کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ فلاں شعر بلند ہے یا فلاں شعر پوچ ہے اور ایسا کیوں ہے؟ اسی طرح نثر کی بلند آہنگی اور کم آہنگی کی شناخت کرانے سے بھی ہم لوگ گریز کرتے ہیں اور اگر اس انداز سے کوئی استاد تعلیم دیتا ہے تو اس کی خدمات کو ہم ''ادب برائے ادب'' کہہ کر پسِ پشت ڈال دیتے ہیں۔ لیکن کیا موجودہ دور کے فاضل نقادوں میں سے بھی کوئی ایسا ہے جو شعر کی بے آہنگی یا نثر کے جھول اور اُس کے اسباب کا تلاش کرنا مشکل ہے تو کم از کم صوتی زیر و بم کی ناموزونیت اور ''شکستِ ناروا'' ہی کی شناخت کرادی جائے۔ ورنہ حسنِ بندش اور حسنِ صورت جیسی اصطلاحات بالکل بے معنی ہو کر رہ جائیں گی اور ایسا ہو بھی رہا ہے۔

ایک اور چیز جو داخلی شہادت کے ذیل میں مفید ہے وہ قطعات تاریخی ہیں۔ ہمارے اکثر دواوین میں یہ صنف بھی ہے لیکن چونکہ فن کے لحاظ سے قطعات بلند نہیں ہوتے اس لیے اُن کا ذکر بھی شاذ و نادر ہی کیا جاتا ہے۔ حالانکہ تاریخی اور معاشرتی معلومات کے لیے اُن کی افادیت مسلم ہے، کیا ضرور ہے کہ دیوان کا ہر جزو، ادب عالیہ کا شاہکار ہو۔

چند مشورے

اب میں اپنی ناقص سمجھ کے مطابق اپنے طلبہ کے لیے چند مفید کام تجویز کرنا چاہتا ہوں[۱۲]۔ مثلاً ہمارے طلبہ اگر فارسی اور عربی سے بخوبی واقف ہیں تو اُنھیں لغت کے بہت سے کام دیے جاسکتے ہیں۔ الفاظ، محاورات، ضرب الامثال، اصطلاحات، تشبیہات واستعارات پر مستقل مقالے لکھے جاسکتے ہیں، جن میں اُن کی اصل اور اشتقاق پر مفصل بحث کرائی جائے۔ پھر نظم ونثر سے اُن کی مثالیں تلاش کرائی جائیں اور مختلف زبانوں میں لغوی اور معنوی حیثیت سے جو تبدیلیاں ہوئی ہیں اُن کی مثالوں کے ساتھ ساتھ اُن کے اسباب وعلل پر بھی غور وخوض کرایا جائے۔ ہم نے تو اب تک دہلی اور لکھنؤ کے مخصوص الفاظ ومحاورات پر بھی مستقل مقالے تیار نہیں کرائے، جن کی سخت ضرورت ہے۔ اسی کے ساتھ مقامی بولیوں، پراکرتوں اور علاقائی زبانوں سے اُردو کی صرفی ونحوی روابط پر بھی کام کرایا جاسکتا ہے تا کہ خود اردو زبان اور دیگر علاقائی زبانوں کی اصل اور ابتدا کو متعین کرنے میں سہولت ہو۔ صرف ونحو کے علاوہ عروض وقافیہ، بیان وبدیع، املا وانشاء، نیز تذکیرہ وتانیث وغیرہ متعدد علوم ہیں جن کے قدیم اور ابتدائی نمونوں کی مدد سے بھی اُردو کی عمر یا اس کی اصل کو متعین کرنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ اس کے ساتھ صوتیات اور لسانیات سے متعلق بھی بہت سی مفید معلومات بہم پہنچائی جاسکتی ہیں اور طلبہ کو بتایا جاسکتا ہے کہ آب وہوا، غذا اور مختلف ضروریات کے اختلاف کی وجہ سے ایک ہی خاندان کے الفاظ کس طرح تبدیل ہوجاتے ہیں۔ ادغام مثلین، ادغام متجانسین اور ادغام متقاربین کے قاعدے سمجھا کر صوتی تبدیلیاں بھی آسانی سے ذہن نشین کرائی جاسکتی ہیں۔ نجوم بنانے کا کام بھی طلبہ کو دیا جاسکتا ہے تا کہ ایک ہی نظر میں یہ معلوم ہوسکے کہ ایک مصنف نے کون کون سے الفاظ، محاورات، اور اصطلاحات وغیرہ کہاں کہاں استعمال کی ہیں۔ نیز افراد ومقامات اور مختلف تصانیف اور اقوال وغیرہ جن کا ذکر اس مصنف نے کیا ہے اُن سے کیا مراد ہے؟ افسوس کہ ہم نے اپنے ادبی شہ پاروں سے متعلق بھی ہنوز ایسا کام نہیں کیا۔ یہی حال فارسی کا ہے کہ سبکِ خراسانی، سبکِ عراقی اور سبکِ ہندی کے باب میں بھی ہم نے ابھی تک کوئی مستقل کام نہیں کیا۔ عربی زبان وادب پر مختلف عجمی اثرات سے متعلق بھی مستقل مقالات کی ضرورت ہے۔ پھر خود ہمارے ملک کے بکثرت عربی شاہ پارے ہنوز پردۂ اخفا میں ہیں، ان کی ترتیب وتہذیب کی بھی بڑی ضرورت ہے اور یہ کام اگر ہم نے اب بھی نہ کیا تو اُن کا ہمیشہ کے لیے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔ دور کیوں جایئے، خود ہماری یونیورسٹی کے بکثرت نادر مخطوطات خراب وخستہ ہوتے جارہے ہیں اور اُن پر فوری توجہ کی ضرورت ہے۔

بعض ذہین طلبہ سے نثر ونظم کی اہم کتابیں ایڈٹ (مرتب) کرائی جاسکتی ہیں اور مفید حواشی وتعلیقات بھی لکھوائے جاسکتے ہیں۔ یہ کام بظاہر معمولی معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ تصحیح وترتیب میں بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ کئی کئی نسخوں کی تطبیق سے اختلافِ قرأت کا کام مرتب کرنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ بعض کرم خوردہ نسخوں کے کٹے مٹے الفاظ کو اُن کی کشید کے لحاظ سے درست کرنا اور خطِ شکستہ کو پڑھ کر تصحیح کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اکابر فضلا کے کاموں کو پیش نظر رکھ کر یہ کام سیکھا جاسکتا ہے۔ متن کی درستی اور حواشی کی فراہمی کے سلسلے میں صحیح منابع اور جامع ومانع مواد سے استفادہ کرنا بھی بڑی سلیقہ مندی ہے۔ ایسے کاموں کے لیے صرف اُنھی اساتذہ سے رجوع کرنا چاہیے جنھیں اس فن کا خاص تجربہ ہو، کیونکہ:

ع: ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں؟

پھر رجوع کرنے میں کسی طرح کا تکلف یا اظہارِ تشکر میں کسی طرح کا بخل کبھی روا نہیں۔ کئی موقعوں پر دیکھا ہے کہ بعض صاحبان کی پوری پوری کتابیں درست کی گئیں اور اُنھوں نے اظہارِ تشکر میں صرف اتنا کہہ دیا کہ فلاں صاحب سے بہت کچھ مشورہ لیا گیا ہے اور بس۔ اسی طرح ایک صاحب نے بڑی محنت سے حالی کے مقدمۂ شعر وشاعری کو مرتب کیا لیکن اُس کے عربی مآخذوں کے سلسلے میں اساتذہ سے رجوع کرنے میں اپنی توہین سمجھی۔ چنانچہ اُن کا بلند پایہ کام ادھورا رہ گیا ہے۔ پھر ایک خامی عام ہے جس کا ذکر شروع میں بھی کیا گیا ہے کہ تحقیقی مقالات کو بھی خواہ مخواہ طویل اقتباسات سے پُر کیا جاتا ہے اور کتاب کے حجم کا رعب جمایا جاتا ہے۔ ایسی متعدد کتابیں موجود ہیں جو پانچ پانچ چھ چھ سو صفحات پر محیط ہیں لیکن اگر اُن کا خلاصہ کیا جائے تو وہ صرف ۲۰، ۲۵ صفحات میں آسکتا ہے۔ چنانچہ تجربہ شاہد ہے کہ ایسی کتابیں مصنف کے فوت ہونے سے پہلے ہی فوت ہوجاتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم اپنے طلبہ کو ایجاز واختصار کی مشق کرائیں تا کہ نفسیاتی طور پر بھی وہ فضول بحثوں میں پڑنے کے عادی نہ بنیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بڑی سے بڑی بات بھی کم سے کم الفاظ میں کہی جاسکتی ہے۔ لیکن شاید راقم الحروف بھی تطویلِ کلام کے جرم میں قابلِ مواخذہ ہے:

ع: صلاح کار کجا و من خراب کجا

(نقوش، جنوری ۱۹۶۶ء)

حواشی

(۱) یہ توسیعی لیکچر سندھ یونیورسٹی میں ۷، اکتوبر ۱۹۶۵ء کو پیش کیا گیا۔ اس سے پہلے کل پاکستان اُردو تدریس کانفرنس منعقدہ لاہور (دسمبر ۱۹۶۱ء) میں اجمالاً پیش کیا گیا تھا۔

(۲) رسالہ ''فنکار'' حیدر آباد۔ جون ۱۹۶۵ء

(۳) رسالہ ''اُردو نامہ'' کراچی۔ اپریل تا جون ۱۹۶۱ء۔

(۴) حضور انور ﷺ نے جو کچھ اپنی زبان مبارک سے فرمایا وہ حدیث قولی ہے، جو کچھ خود کیا ہے وہ حدیث فعلی ہے اور جو کچھ آپ کے سامنے ہوا اور آپ نے اُس سے منع نہیں فرمایا تو وہ حدیث تقریری ہے۔ جس حدیث کو ہر زمانے میں بکثرت لوگوں نے روایت کیا ہو کہ احتمال کذب نہ رہا ہو اُسے متواتر کہتے ہیں اور آحاد وہ ہیں جن کی روایت میں اتنی کثرت نہ ہو۔ پھر آحاد کی تین قسمیں ہیں۔ ۱۔ مشہور جس کو ہر زمانے میں تین یا زائد راویوں نے روایت کیا ہو۔ ۲۔ عزیز جس کو ہر زمانے میں دو راویوں نے روایت کیا ہو اور (۳) غریب جس کو کسی زمانے میں ایک ہی راوی نے روایت کیا ہو۔ آحاد کی وہ روایت جس کے راوی کی سچائی مسلم ہو وہ مقبول کہلاتی ہے ورنہ مردود۔ پھر آحاد مقبول میں سے وہ حدیث جس کو پرہیزگار اور خوب یاد رکھنے والوں نے ہر زمانے میں روایت کیا ہو اور اس میں کوئی عیب پوشیدہ نہ ہو اور معتبر لوگوں کی مخالفت بھی نہ ہو تو اسے صحیح کہتے ہیں اور اگر ایسی آحاد مقبول جس کے راویوں کا حافظہ کم ہو تو اسے حسن کہتے ہیں۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ مرفوع وہ حدیث ہے جو حضور ﷺ کا قول یا فعل ہو اور موقوف وہ حدیث ہے جو کسی صحابی کا قول یا فعل ہو۔

(۵) مولانا شبلی نے بھی سیرۃ النبیؐ اور الفاروق کے مقدموں میں درایت کے ان اصولوں کا ذکر کیا ہے۔ بعض نے لکھا کہ کوئی حدیث اگر عقل، مشاہدہ، مسلسل، اصول مسلمہ، قرآن پاک، احادیث صریحہ، منسوب الیہ کی عادت کے خلاف ہو یا کسی ایسے شخص کی روایت ہو جس سے کسی اور نے روایت نہیں کی یا جس روایت میں راوی کی ذاتی رائے شامل ہو یا جس کے سمجھنے میں راوی سے غلطی کا احتمال ہے جو ایسی روایت پایۂ اعتبار سے ساقط سمجھی جائے گی۔

(۶) خطبات مدراس از مولانا سلیمان ندوی۔ مضمون۔ ''تاریخیت''۔

(۷) مقدمہ ابن خلدون۔

(۸) ایڈیشن ۱۹۴۱ء صفحہ ۲۵۷۔ ۲۵۹۔

(۹) (1945) Towards improving P.H.D. programmes.

(۱۰) افسوس کہ اس فاضل اجل نے ۸۰ سال کی عمر میں ۱۴ مارچ ۱۹۶۳ء کو لاہور میں وفات پائی۔

(۱۱) یہ بزرگ بقول مراۃ احمدی (خاتمہ صفحہ ۱۰۵) نقشبندی بھی تھے اور چشتی بھی۔ چشتی ہونے کا اشارہ ولی نے اس شعر میں کیا ہے، جس میں اپنا نام بھی دیا ہے۔

بعد شاہ نجف، ولی اللہ   کامل علی رضا پایا

(۱۲) محترم ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے کل ہند اورینٹل کانفرنس کے گیارہویں اجلاس منعقدۂ حیدر آباد (دکن) کے خطبۂ صدارت میں تحقیق کے لیے جو مشورے دیے ہیں ان سے یہاں استفادہ کیا گیا ہے۔

❖❖❖❖

تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر لکھنے کے اصول[1]

ڈاکٹر جمیل جالبی

آج کا موضوع یہ ہے کہ تحقیقی وتنقیدی موضوعات پر لکھنے کے اصول کیا ہیں؟ جنھیں ایک مضمون میں پورے طور پر سمیٹا نہیں جاسکتا۔ اسی لیے کم وقت میں بہت سی باتیں پیش کرنے کا طریقہ میں نے یہ سوچا کہ پہلے چند بنیادی باتیں بیان کروں اور پھر انھیں مثالوں سے واضح کردوں تاکہ اس موضوع کا ایک خاکہ آپ کے سامنے آجائے۔ اپنے موضوع کی وضاحت سے پہلے یہ بتاتا چلوں کہ دنیا کے سارے اصول بے معنی اور بے کار ہیں جب تک ان اصولوں پر چلنے والے میں پیدائشی صلاحیت، کام کرنے کی دھن اور اپنی منزل تک پہنچنے کا عزم نہ ہو۔ میں جو کچھ کہوں گا اس کا مقصد یہ ہوگا کہ میں صرف راستے کی نشاندہی کردوں۔ اس کے خطرات و مشکلات سے آگاہ کردوں۔

ہر نارمل انسان ذہانت کے اعتبار سے کم وبیش ایک سا ہوتا ہے۔ جو فرق ہوتا ہے وہ صرف درجوں کا فرق ہوتا ہے۔ اس لیے یہ فرض کرتے ہوئے کہ آپ سب ذہانت کے اعتبار سے نارمل ہیں اور آپ میں لکھنے کی پیدائشی صلاحیت موجود ہے اور آپ میں لگن اور عزم بھی ہے، میں اپنے موضوع کی طرف آتا ہوں۔ اچھا لکھنا ایک مشکل کام ہے۔ وہ خواہ نثر میں لکھا جائے یا نظم میں، لیکن نثر میں لکھنا نظم میں لکھنے سے اس لیے زیادہ مشکل ہے کہ اس کے لیے آپ کو پتا مار کر بیٹھنا پڑتا ہے۔ تیاری کرنی پڑتی ہے، مطالعہ کرنا پڑتا ہے اور سوچ کر اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرنا پڑتا ہے۔ ابہام شاعری کی جان ہے لیکن یہی ابہام نثر کی خرابی ہے۔ نثر میں اچھا افسانہ لکھنا مشکل کام ہے لیکن اچھا تحقیقی وتنقیدی کام کرنا اس سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔ یہ فطری صلاحیت اور ذہانت کے ساتھ ساتھ صبر آزما، وقت طلب کام ہے اسی لیے تحقیقی وتنقیدی موضوعات پر لکھنے کے لیے ضروری ہے کہ لکھنے والے کو یہ معلوم ہو کہ:

۱۔ وہ کیا لکھنا چاہتا ہے اور کیوں لکھنا چاہتا ہے؟

۲۔ اس لکھنے کے لیے اُسے کیا تیاری کرنی ہے؟

پہلی بات کے دو حصے ہیں۔ آپ کیا لکھنا چاہتے ہیں اور کیوں لکھنا چاہتے ہیں۔ ''آپ کیا لکھنا چاہتے ہیں''؟ کے سوال کے ساتھ غور وفکر کا عمل شامل ہو جاتا ہے اور دوسرے حصے سے کہ ''آپ کیوں لکھنا چاہتے ہیں؟'' آپ کی تحریر کا مقصد واضح ہو جاتا ہے، جب تک یہ دونوں باتیں آپ کے ذہن میں صاف نہ ہوں اس وقت تک آپ کی تحریر میں کوئی معنی اور کوئی نقطۂ نظر پیدا نہیں ہوسکتا، اس کے بعد دوسرا مرحلہ آتا ہے۔ یہ مرحلہ لکھنے سے پہلے کا مرحلہ ہے۔ یعنی آپ کو لکھنے کے لیے کیا تیاری کرنی ہے۔ کون کون سی کتابیں اس موضوع پر پڑھنی ہیں۔ تاکہ اپنے موضوع سے آپ نہ صرف واقف ہوجائیں بلکہ آپ کو یہ بھی معلوم ہوجائے کہ دوسروں نے اس موضوع پر کیا لکھا، کیا کہا اور کیا سوچا ہے۔ اگر آپ کو بھی وہی کہنا ہے جو دوسروں نے کہا ہے اور جو مطالعے سے آپ کے سامنے آگیا ہے، تو پھر وہی کچھ کہا لکھنے کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ وہی کچھ دہرا رہے ہیں اور وہی کچھ کہہ رہے ہیں جو پہلے لکھا اور کہا جاچکا ہے۔ اس صورت میں آپ کی تحریر محض ایک خلاصہ کی حیثیت رکھے گی اور ایسے میں مناسب یہ ہے کہ آپ کو لکھنے کے مرحلے میں قدم نہیں رکھنا چاہیے۔ لیکن اس موضوع پر سب کچھ پڑھنے کے بعد آپ کے خیال میں ایک زاویہ ابھی ایسا ہے جو اب تک سامنے نہیں آیا ہے تو پھر آپ کو لکھنے کی طرف مائل ہونا چاہیے۔ دراصل زاویہ اور نقطۂ نظر ہی وہ بنیادی چیز ہے جو آپ کی تحریر کو وقعت اور انفرادیت عطا کرتی ہے ورنہ تنقیدی تحریر نصابی ضرورت کی تحریر بن کر رہ جائے گی۔ آپ کی تحریر چبائے ہوئے لقموں کی طرح نہیں ہونی چاہیے۔ اس میں ایک زاویہ ہونا چاہیے جو آپ کا اپنا زاویہ ہو اور جو نہ صرف غور وفکر اور مطالعہ سے بلکہ زندگی اور اس کے مسائل کے حوالے سے پیدا ہوا ہو اور جسے آپ بیان کرنے کے لیے لفظوں کو وسیلۂ اظہار بنا رہے ہیں۔ اس مخصوص زاویے کی اہمیت ہی آپ کی تحریر کو وہ قوت اور زور عطا کرے گی جس سے دوسرے متاثر ہوں گے۔ یہ بات یاد رہے کہ آپ اس لیے لکھتے ہیں کہ آپ کی بات دوسروں تک پہنچے اور آپ کے خیالات سے دوسرے بھی متاثر ہوں۔ اگر یہ صورت نہیں ہے تو پھر لکھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے بلکہ آدمی خود اپنے ذہن میں لکھتا ہے۔ آخر آپ اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کے لیے ہی تو لکھتے ہیں۔ بہرحال جب آپ نے اپنے موضوع پر پڑھ لیا۔ اس پر غور وفکر کرلیا۔ نوٹس بنا لیے، اُنھیں مرتب کرلیا اور آپ کا نقطۂ نظر خود آپ کے ذہن میں صاف ہوگیا تو پھر آپ کے باطن میں وہ اضطراب، وہ کرب پیدا ہوگا جو آپ میں لکھنے کی خواہش کو تیز تر کردے گا۔ گویا لکھنے سے پہلے آپ نے چار کام کیے۔

۱۔ آپ نے اپنے موضوع سے پوری طرح واقفیت حاصل کر لی۔

۲۔ آپ نے غور و فکر کے بعد اپنا نقطۂ نظر متعین کر لیا۔

۳۔ آپ نے اس نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیے حوالے جمع و مرتب کر لیے۔

۴۔ اور آپ اس موضوع میں اتنے محو و منہمک ہو گئے کہ آپ کے وجود میں اس کے اظہار کی بے چینی پیدا ہو گئی۔

اس کے بعد آپ کے سامنے یہ مسئلہ رہ گیا کہ آپ اپنی بات کس طرح کہیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں سے ابلاغ کر سکے، اسے کہاں سے شروع کریں اور کیسے شروع کریں۔ کون سی بات پہلے کہیں اور کون سی بعد میں، تاکہ آپ اپنی بات اس ترتیب سے کہیں کہ وہ دوسروں کو اسی طرح متاثر کرے جس طرح آپ خود اس بات سے متاثر ہیں۔ اس منزل پر پہنچ کر غور کرتے کرتے اچانک ایک لفظ یا ایک جملہ آپ کے ذہن کے دریچے پر دستک دے گا اور آپ کہیں گے کہ یہ میرا پہلا جملہ یا پہلا لفظ ہے۔ ممکن ہے یہی وہ جملہ ہو جس کی آپ کو ضرورت تھی یا آپ محسوس کریں کہ یہ وہ جملہ تو نہیں ہے اور مزید غور کرنے کے بعد آپ کے ذہن میں کوئی اور جملہ کاغذ پر آ جائے۔ اس طرح جو تحریر وجود میں آئے گی اس میں مطالعہ، تفکر، نقطۂ نظر اور آپ کا باطن شامل ہوگا اور یہی وہ سطح ہے جہاں تنقید اور تخلیق کے حدود مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ یہ بات میں ادبی تحریروں کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔ صحافیانہ تحریریں میرے دائرہ کار سے خارج ہیں۔ لکھتے وقت سارا زور لکھنے پر ہونا چاہیے اور وہ اس لیے کہ کیا لکھنا ہے اور کیوں لکھنا ہے؟ یہ آپ پہلے ہی طے کر چکے ہیں۔ لکھنے کے دوران جو تبدیلیاں آپ کے ذہن میں آئیں گی یہ وہ تبدیلیاں ہوں گی جن کا مقابلہ کرنے کے لیے آپ کا ذہن پہلے سے تیار ہے۔ لکھتے وقت آپ کو ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔

۱۔ اپنی بات کو جہاں تک ممکن ہو عام بول چال کی زبان میں لکھیں۔ انگریزی، عربی و فارسی کے ایسے الفاظ استعمال نہ کریں، جن کے لیے اُردو میں الفاظ موجود ہیں۔ ادق عربی الفاظ اور کثرت سے فارسی تراکیب سے بھی گریز کریں۔

۲۔ لکھتے وقت ایسے لفظ تلاش کریں جن سے آپ کی بات اسی قوت سے پڑھنے والوں تک پہنچے جس قوت سے وہ آپ کے اندر موجود ہے۔ ممکن ہے لکھتے وقت آپ چند جملوں یا چند لفظوں سے مطمئن نہ ہوں اور سوچ رہے ہوں کہ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ اس لفظ یا اس جملے سے پورے طور پر ادا نہیں ہو رہا ہے تو آپ اس پر مزید غور و فکر کرنے کے لیے نشان لگا لیں اور لکھنے کے عمل کو جاری رکھیں۔

۳۔ جب آپ ایک چیز لکھ رہے ہوں تو پھر اس عرصے میں دوسری چیز نہ لکھیں بلکہ اپنے موضوع کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے اور سوتے جاگتے اس کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا ہنر سیکھیں۔

اس طرح آپ کا جب پہلا مسودہ تیار ہو جائے تو اُسے ایک دفعہ پڑھ کر جو تبدیلیاں کرنا چاہتے ہیں کر لیں اور مسودہ کو چند دنوں کے لیے یوں ہی پڑا رہنے دیں اور اس کے ساتھ شب و روز بسر کرتے رہیں۔ کچھ دن بعد جب آپ اُسے پھر پڑھیں گے تو آپ کی بے اطمینانی بڑھ جائے گی آپ اس میں مزید کانٹ چھانٹ کریں گے اور آپ کا جی چاہے گا کہ آپ اسے دوبارہ صاف کریں۔ دوبارہ صاف کرنے سے آپ مکررات کو خود بخود نکالتے جائیں گے۔ بات کو کم سے کم لفظوں میں بیان کرنے کی کوشش کریں گے اور جب آپ کا مسودہ صاف ہو جائے گا تو آپ اس سے پہلے سے زیادہ مطمئن ہوں گے، اعلیٰ درجے کی کوئی تحریر اس عمل سے گزرے بغیر سدا بہار پھول کھلانے سے قاصر رہے گی۔ آپ اپنے مسودہ سے جب تک خود پورے طور سے مطمئن نہ ہو جائیں اسے اشاعت کے لیے نہ بھیجیں اور جب وہ منزل آ جائے کہ آپ خود یہ کہنے لگیں کہ میں اب اس کو اس سے بہتر نہیں بنا سکتا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اب آپ کا مسودہ تیار ہے۔ ایسی تحریر نہ صرف اختصار کی حامل ہو گی بلکہ اس میں دوسرے ذہنوں کو متاثر کرنے اور اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کی صلاحیت بھی ہو گی۔ تکرار سے گریز اور کم سے کم لفظوں میں بات کہنے کی صلاحیت آپ کی تحریر کو بلند درجہ عطا کرے گی اور اسے آپ اُسی طرح بروئے کار لا سکتے ہیں جس طرح میں نے بتایا ہے۔

مختصر لکھنے کے لیے طول طویل لکھنے کے مقابلے میں زیادہ وقت درکار ہوتا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر نے، جو اپنی غیر معمولی سیاسی مصروفیات کی وجہ سے حد درجہ عدیم الفرصت تھے، ''کامریڈ'' اخبار میں ایک طول طویل اداریہ لکھا۔ اس وقت تحریک خلاف زوروں پر تھی۔ اداریے نے لوگوں کو متاثر کیا لیکن ایک صاحب بصیرت نے مولانا کے اداریے کی تعریف تو کی لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ: ''مولانا! اگر یہ مختصر ہوتا تو اس کا اثر کہیں زیادہ ہوتا''۔ مولانا محمد علی جوہر نے اس بات کو توجہ سے سنا اور کہا ''محترم! آپ کی بات نہایت درست ہے لیکن مختصر لکھنے کا میرے پاس وقت نہیں ہے''۔ بظاہر بات ایک چٹکلہ معلوم ہوتی ہے لیکن اس میں اچھے اسلوب کا ایک گہرا نکتہ پوشیدہ ہے۔ مختصر لکھنے کے لیے یقیناً وقت کی ضرورت ہوتی ہے اور اس عمل سے گزرنے کی ضرورت ہوتی ہے، جس کا اظہار میں نے ابھی آپ کے سامنے کیا ہے۔ ممکن ہے اس منزل کو سر کرنے کے لیے آپ کو مسودہ ایک بار، دو بار یا تین بار صاف کرنا پڑے تاکہ اس سے وہ اثر پیدا ہو سکے جو آپ کا مطمحِ نظر

ہے۔ محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' کو کئی بار صاف کیا، تبدیلیاں کیں اور پھر بار بار تبدیلیوں سے اس کی وہ صورت پیدا ہوئی جو آج ہمارے سامنے ہے اور اسلوب کا شاہکار ہے۔ یہ کہنا کہ میں نے قلم برداشتہ لکھا ہے، کوئی قابلِ فخر بات نہیں ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ آپ نے جو کچھ لکھا ہے کیا یہ وہی ہے جو آپ لکھنا چاہتے تھے۔ ٹالسٹائی نے اپنے ضخیم ناول ''وار اینڈ پیس'' کو سات آٹھ دفعہ صاف کیا اور ہر بار ایسی تبدیلیاں کیں جو بنیادی نوعیت کی تھیں اور آج یہ ناول دنیا کے بہترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ اگر ٹالسٹائی اس پر اتنی محنت نہ کرتا تو یقیناً ہم ایک شاہکار سے محروم ہو جاتے۔ اصل چیز تو وہ ہے جو آخری شکل میں سامنے آئی ہے۔ پڑھنے والے کے لیے اس بات کی اہمیت نہیں ہے کہ آپ نے اسے کتنی بار لکھا ہے۔ یہ بات واضح رہے کہ آپ کی تحریر اُسی وقت سدابہار بنے گی جب کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ بات کہی گئی ہو۔ جب اس میں علم و فکر کے جوہر شامل ہوں اور جب اس میں آپ کا سارا وجود رنگ بھر رہا ہو ایسی تنقیدی تحریریں ادبی رفعت کی حامل ہوں گی اور وہ صدیوں تک پڑھنے والوں کو متاثر کرتی رہیں گی۔ ہر اعلیٰ تنقیدی تحریر ان صفات کی حامل ہوگی۔ تنقیدی تحریر ہر ادبی تحریر کی طرح سچائی کی تلاش اور اس کا اظہار ہوتی ہے۔

یہ بات واضح رہے کہ مطالعہ ہر لکھنے والے کے لیے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ مطالعہ کی حیثیت اس کھاد اور پانی کی ہے جس سے ننھا سا پودا تناور اور چھتنا ور درخت بن جاتا ہے۔ جو لوگ صرف لکھنے کا عمل کرتے ہیں اور مطالعہ سے گریز کرتے ہیں۔ اپنی تحریروں میں خود کو دہرانے لگتے ہیں۔ ان کی تمام تحریروں سے گہرائی اور تہہ داری غائب ہو جاتی ہے اور کچھ ہی عرصے بعد ان کے لکھنے کا عمل خود بخود بند ہو جاتا ہے۔ بہت سے ایسے لکھنے والوں کے نام آپ کے ذہن میں ہوں گے۔ مطالعہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ صرف اس موضوع تک محدود نہ ہو جس پر آپ لکھ رہے ہیں۔ بلکہ لکھنے والے کو ہر قسم کی قابلِ قدر علمی و ادبی تحریروں، کتابوں، مضامین و رسائل وغیرہ کا مسلسل مطالعہ کرتے رہنا چاہیے، اس سے ذہنی تناظر وسیع ہوگا اور مختلف علوم و فنون آپ کی تحریروں میں رنگ بھریں گے۔ مثلاً تنقیدی موضوعات پر لکھنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف اپنے سارے ادب اور اس کی پوری تاریخ کا توجہ اور گہرائی سے مطالعہ کریں بلکہ اس کے اہم و غیر اہم، پہلے اور دوسرے درجے کے لکھنے والوں کی تحریروں سے بھی پوری طرح واقف ہوں، وہ نہ صرف قدیم ادب پر نظر رکھتے ہوں بلکہ جدید ادب پر بھی۔ وہ تحریریں جو کل لکھی گئیں اور وہ تحریریں جو آج لکھی جا رہی ہیں، ان سے بھی باقاعدگی سے واقف ہوں، نہ صرف یہ کہ وہ اپنی قوم کی تاریخ سے واقف بلکہ فلسفہ، جنسیات، عمرانیات، علم زبان و لسانیات اور کلچر بات سے بھی واقف ہوں۔ انھیں یہ بھی معلوم ہو کہ دنیا کے ادب میں کیا لکھا جا رہا ہے۔ کیا تحقیقات ہو رہی ہیں اور سائنس کے اثرات ذہنِ انسانی پر کیا اور کس طرح مرتب ہو رہے ہیں۔ وہ سوانح عمریاں بھی پڑھے اور سفرنامے بھی۔ پڑھنا اس کا سب سے بڑا مشغلہ ہو۔ ضروری ہے کہ وہ کم از کم ایک غیر زبان سے بھی اچھی طرح واقف ہو اور اس کے ادب کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتا ہو۔ مطالعہ ہی وہ عمل ہے جو ذہن کو کشادگی، شعور کو پختگی اور جامعیت عطا کرتا ہے اور جب لکھنے والا قلم اٹھاتا ہے تو اس کا وسیع ذہنی پس منظر اُس کے اظہار کو جامعیت، اُس کے خیالات کو وسعت اور اس کی تحریر کو وقار عطا کرتا ہے۔ مطالعہ کے تنوع سے اکثر ایسی باتیں سامنے آتی ہیں جو صرف ایک رخے مطالعے سے نظروں سے اوجھل رہتی ہیں۔ وسیع مطالعہ تحقیق و تنقید کے لیے از بس ضروری ہے۔ وسیع مطالعہ سے ایک طرف مختلف علوم و فنون اور فکر و فلسفہ جذب ہو کر آپ کی تحریروں کو وسعت دیں گے اور دوسری طرف بہت سی ایسی باتوں کی تصدیق بھی غیر ادبی مآخذ سے ممکن ہو سکے گی جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اب ہم اپنے موضوع کے دوسرے پہلو پر آتے ہیں۔ عام طور پر تحقیق کو ہمارے ہاں ایک بے کاری چیز سمجھا جاتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے لکھنے والے محققوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اگر ہمارے محقق وہ کام نہ کرتے جو انھوں نے کیا ہے تو ہماری زبان و ادب کی تاریخ میں تسلسل اور ربط پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ کیا ہم مولوی عبدالحق، سید سلیمان ندوی، حافظ محمود شیرانی، امتیاز علی خان عرشی اور قاضی عبدالودود وغیرہ کی تخلیقات اور اُن کے گہرے اثرات کو نظر انداز کرنے کی جراُت کر سکتے ہیں، وہ مسلمات جو آج ہمارے نقادوں اور ادیبوں کی تحریروں میں نظر آتے ہیں اور جنھیں ہم سب تسلیم کرتے ہیں، انھی محققوں کی کوششوں و کاوش کا نتیجہ ہیں۔ ان لوگوں نے ہمارے ادب کو نہ صرف تسلسل دیا، بلکہ ان کے گم شدہ گوشوں کو سامنے لا کر ہماری تاریخ کی اُلجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھا دیا اور اُنھیں تاریخ کا حصہ بنا دیا۔ وہ نقاد جو تحقیق کو اہمیت نہیں دیتے ایسی غلطیوں کا شکار ہو جاتے ہیں جن سے اُن کی تحریر بے وقعت ہو جاتی ہے۔ تحقیق دراصل تلاش و جستجو کے ذریعے حقائق کو معلوم کرنے اور اُن کی تصدیق کرنے کا نام ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے کہ جس سے آپ صحیح اور غلط میں امتیاز کرتے ہیں۔ اور پھر صحیح کی مدد سے اپنی منزل کی طرف بڑھتے ہیں۔ جب آپ نے تلاش و جستجو سے، جسے آپ تحقیق یا ریسرچ کا نام دیتے ہیں، ''صحیح'' کو تلاش کر لیا تو پھر آپ جو نتائج نکالیں گے جو رائے قائم کریں گے اور جو بات اُس کی روشنی میں کہیں گے وہ بھی مستند اور صحیح ہوگی۔

تحقیق سے بے تعلقی و بے خبری کی وجہ ہی سے ہماری تنقید خود غیر وقیع اور غیر مستند ہو کر رہ گئی ہے اور ہمارے اساتذہ و طلبہ ایسی غلط فہمیوں کا شکار ہیں جن

فنِ تحقیق[1]

عبدالرزاق قریشی

تحقیق کیا ہے؟

ذہین آدمی غور و فکر کا عادی ہوتا ہے۔ زندگی کے عام مسائل سے متعلق عموماً اور جن مسائل سے اسے دلچسپی ہوتی ہے ان سے متعلق خصوصاً وہ سوچتا رہتا ہے یا سوچنے پر مجبور ہوتا ہے۔ وہ فطرتاً ترقی پسند ہے اور اپنے حالات کو بدلنا یا بہتر بنانا چاہتا ہے، اس لیے اس کے دماغ میں نئے نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں یا پرانے مسائل سے متعلق نئے نئے پہلو اور شکوک اس کے سامنے آتے ہیں۔ وہ ان مسائل کو حل کرنا یا شکوک کو دور کرنا یا یقین سے بدلنا چاہتا ہے۔ یہیں سے تحقیق کی ابتدا ہوتی ہے۔ منظم دماغ مسائل کو حل کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہے اور اس وقت تک کوشش کرتا رہتا ہے جب تک کہ وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ جائے۔ اس کے لیے مشتبہ بات ایک جاندار سوال یعنی تلاش بن جاتی ہے اور جذبۂ تحقیق اسے مدعا کی جستجو پر آمادہ کرتا ہے تاکہ مبہم اور غیر معین بات واضح اور مستحکم ہو جائے[1]۔ موجودہ سائنسی دور میں انسان ہر بات کا بدیہی ثبوت بھی چاہتا ہے اور تحقیق یہ ثبوت مہیا کرتی ہے۔ اسی لیے کرافورڈ نے تحقیق کی تعریف کے سلسلے میں کہا ہے کہ اس کی ابتدا کسی مسئلے سے ہوتی ہے پھر وہ مواد جمع کرتی ہے، اس کا تنقیدی تجزیہ کرتی ہے اور صحیح شہادت کی بنا پر کسی نتیجہ پر پہنچتی ہے[2]۔

وبسٹر کے لغت میں تحقیق (Research) کے یہ معنی بتائے گئے ہیں۔ محتاط یا سرگرم تلاش، گہری جستجو۔

> انہماک کے ساتھ جستجو یا چھان بین، مخصوص یا عموماً ناقدانہ اور سیر حاصل تفتیش یا جستجو، جس کا مقصد نئے حقائق کا انکشاف اور ان کی صحیح تاویل اور پھر نئے حقائق کے انکشاف کی روشنی میں مروجہ نتائج، نظریات یا قوانین پر نظر ثانی کرنا یا نئے یا نظر ثانی کیے ہوئے نتائج کا عملی استعمال وغیرہ، نیز کسی شخصیت یا مضمون یا اسی قبیل کی کسی دوسری چیز سے متعلق مخصوص چھان بین جس کے ذریعے چھان بین کرنے والا اپنا انکشاف پیش کرے[3]۔

آکسفورڈ ڈکشنری نے تحقیق کے یہ معنی لیے ہیں:

کسی مخصوص چیز یا شخص سے متعلق گہری یا محتاط تلاش کا عمل کسی حقیقت کے انکشاف کی غرض سے محتاط غور و فکر یا کسی مضمون کے مطالعہ کے ذریعہ تلاش یا چھان بین ناقدانہ یا سائنسی سلسلۂ تلاش۔

کسی مضمون کی چھان بین یا مسلسل مطالعہ۔

دوسری بار یا بار بار کی تلاش[4]۔

تحقیق حقائق کی تلاش ہے اس لیے آلمک کے قول کے مطابق ہر قسم کی تفتیش یا چھان بین کو جو بنیادی ذرائع سے کی گئی ہو، تحقیق کہا جا سکتا ہے[5]۔

لیکن محض مواد جمع کر لینا یا اسے ترتیب دے دینا تحقیق نہیں ہے۔ اسی طرح کسی حقیقت کا پتا لگا لینا تحقیق نہیں ہے، بلکہ اس کے اثرات کا کھوج لگانا ضروری ہے۔ کیونکہ تحقیق نشو و نما کا مظہر ہے اور اس کا ماحصل ارتقاء ہے[6]۔ شکاگو یونیورسٹی کے ایک سابق چانسلر R.M Hutchins نے صحیح کہا تھا کہ ایسی تحقیق کے لیے جس کا مقصد صرف مواد جمع کرنا ہے، یونیورسٹی میں کوئی جگہ نہیں...... وہ تحقیق جو تجربی مواد جمع اور استعمال کرے اور جس کے ذریعہ اصولوں کی نشو و نما، وسعت اور بہتری ہو، یونیورسٹی کی بہترین سرگرمیوں میں داخل ہے اور اس میں یونیورسٹی کے تمام اساتذہ کو مشغول رہنا چاہیے[7]۔

ان مختلف جامع تعریفوں کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ تحقیق کا مقصد (۱) نامعلوم حقائق کی تلاش اور (۲) معلوم حقائق کی توسیع یا ان کی خامیوں کی تصحیح ہے۔ ان دونوں کا نتیجہ حدودِ علم کی توسیع ہے اور حدودِ علم کی توسیع انسانی ترقی کا باعث ہے۔ اسی لیے کیلی کی رائے میں تحقیق سب سے مشکل کام ہے جسے سماج نے دوسری تمام سرگرمیوں سے ممیز کیا ہے اور جس میں صرف چند لوگ مشغول رہتے ہیں۔ وہ کسی نئے انکشاف کو جنگ میں مارے جانے یا مذہب کے لیے زندگی وقف کر دینے پر ترجیح دیتے ہیں[8]۔

(۱)

تحقیق کی خصوصیات

کرافورڈ نے تعلیمی تحقیق کی مندرجہ ذیل خصوصیات بتائی ہیں۔ان میں سے اکثر علمی و ادبی تحقیق کے لیے بھی اہم اور ضروری ہیں۔

۱۔ اس کا مرکز کوئی مسئلہ ہوتا ہے۔

۲۔ اس میں کوئی نئی بات کہی جاتی ہے۔

۳۔ اس کا دارومدار جستجو پسند دل اور دماغی رجحان پر ہے۔

۴۔ اس کے لیے کھلے دل و دماغ کی ضرورت ہے۔

۵۔ اس کا انحصار اس مفروضہ پر ہے کہ دنیا کی ہر چیز میں تبدیلی ممکن ہے۔

۶۔ اس کا مقصد قوانین کا انکشاف کرنا اور پھر انھیں عام بنانا ہے۔

۷۔ یہ سبب اور اثر کا مطالعہ ہے۔

۸۔ اس کی بنیاد پیمانہ پر ہے۔

۹۔ اس کے لیے ایک بیدار فنی طریقہ کار لازمی ہے۔[9]

تحقیقی مقالے میں کوئی علمی مسئلہ حل کیا جاتا ہے یا کوئی نئی بات کہی جاتی ہے۔لیکن یہ ضروری نہیں جو بات کہی جائے وہ بنیادی طور پر نئی ہو۔ایک بات جو پہلے کہی جا چکی ہے، اس میں جدید معلومات کا اضافہ بھی تحقیق ہے۔جو بات پہلے کہی گئی ہے اگر اس میں غلطی یا غلطیاں ہیں تو ان کی تصحیح بھی تحقیق ہے۔مسئلہ کے کسی نئے پہلو پر بحث کرنا یا روشنی ڈالنا بھی تحقیق ہے۔قدیم تحقیقات کو خواہ وہ علم کی کسی شاخ سے تعلق رکھتی ہوں، نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔موجودہ ترقی کا سرا اگر تلاش کیا جائے تو وہ ماضی کے دھندلکے میں ملے گا۔

Method of Research کے مصنفین نے Boyd کے حوالے سے لکھا ہے کہ تھامس ایڈیسن نے یہ اصول بنایا تھا کہ پہلے یہ پتا لگاؤ کہ اس موضوع پر دوسروں نے کیا کام کیا ہے اور پھر وہاں سے شروع کرو جہاں دوسروں نے ختم کیا ہے۔[10] یہ اصول علمی و ادبی تحقیق کے لیے بھی یکساں اہم ہے۔محقق کے منتخب کیے ہوئے موضوع پر جو کام ہو چکا ہے اس کا جائزہ لینا ضروری ہے۔دوسروں کے کام کا جائزہ لینے کے بعد ہی موضوع کی اہمیت و افادیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، یا جیسا کہ آلٹک نے کہا ہے: دوسروں کے کام کے جائزہ کے بعد ہی محقق اپنی تحقیق کی جدت کا اندازہ کر سکتا ہے۔[11] مشہور انگریزی شاعر بائرن نے تخلیقی کام کرنے والوں کے متعلق جو بات کہی تھی وہ تحقیقی کام کرنے والوں پر بھی صادق آتی ہے۔اس نے کہا تھا کہ جدت کے لیے ضروری ہے کہ ادیب سوچے زیادہ اور پڑھے کم۔لیکن یہ ناممکن ہے۔سوچنے سے پہلے اس نے بہت کافی پڑھ لیا ہوگا۔[12]

جائزہ لینے کے علاوہ، نئے محققین کو ماہر محققین کی تصانیف کو نمونہ کے لیے بھی سامنے رکھنا چاہیے۔اچھی تحقیق کا صحیح تصور پیدا کرنے کے لیے یہ بہترین طریقہ ہے۔اگر ماہر محققین کے ذاتی تجربے اور تجویزیں، ان کا مضمون چاہے کچھ بھی رہا ہو تحریری شکل میں مل سکیں تو ان سے بھی استفادہ کرنا چاہیے۔یہ تجربے نئے محققین کے لیے چراغ راہ کا کام دے سکتے ہیں۔مثلاً فرانسس بیکن نے اپنی طبیعت کا تجزیہ اس طرح کیا تھا: مجھ میں جستجو کی خواہش تھی۔میں شکوک پر تامل کرتا تھا۔مجھے غور و فکر سے دلچسپی تھی۔میں اپنے نظریے کو پیش کرنے میں عجلت نہیں کرتا تھا۔میں دوسروں کی بات پر غور کرنے کے لیے آمادہ رہتا تھا اور اپنے خیالات کو پیش کرنے اور ترتیب دینے میں احتیاط برتتا تھا۔یہ خصوصیات مجھے فطرت کی طرف سے عطیہ ملی تھیں۔[13] اسی طرح چارلس ڈارون کا یہ بیان کہ میری عادتوں کی باقاعدگی نے میرے مخصوص کام میں مجھے کم فائدہ نہیں پہنچایا، نوجوان[14] محقق کے لیے سودمند ثابت ہو سکتا ہے۔

تحقیق میں جذبات یا قیاس آرائی کو دخل نہیں ہونا چاہیے اور نہ اسے حمایت یا مخالفت سے واسطہ رکھنا چاہیے۔محقق کا نقطۂ نگاہ اور طریقہ کار سائنسی ہونا چاہیے۔سائنسی نقطہ نگاہ وہ نقطہ نگاہ ہے جو مشتبہ حقائق سے لطف اٹھا سکے، سائنسی طریقہ کار کے ذریعہ آدمی شک کو واضح تلاش کے عمل میں تبدیل کر کے بار آور فائدہ اٹھاتا ہے۔جس آدمی کو غور و فکر سے عشق نہیں وہ ذہنی طور پر ترقی نہیں کر سکتا اور جسے مسائل سے دلچسپی نہیں اُسے غور و فکر سے عشق نہیں ہوتا۔مسائل سے دلچسپی ذہنی تجسس کا باعث ہوتی ہے۔اور ذہنی تجسس آدمی کو جلد بازی سے باز رکھتا ہے اور نئے حقائق کے لیے سرگرم تلاش (تحقیق) کی ترغیب دلاتا ہے۔[15] سائنسی طریقہ کار صرف سائنس کے لیے مخصوص نہیں ہے۔سائنس ایک لاطینی لفظ ہے، جس کے معنی ہیں جاننا۔اس لیے علم و فن کی ہر شاخ سائنس کہی جا سکتی ہے، چنانچہ قدیم زمانے

میں سائنس اور علم ہم معنی الفاظ تھے۔ بقول پیرسن سائنس کا میدان بے کنار ہے۔ اس کے مواد کی حد نہیں۔ مظاہر فطرت کی ہر شاخ، معاشرتی زندگی کا ہر پہلو، قدیم وجدید ترقیوں کی ہر منزل سائنس کی حدود میں آتی ہے، سچ یہ ہے کہ حقائق کو سائنس نہیں کہتے بلکہ ان حقائق کو برتنے کا طریقہ سائنس ہے[۱۶]۔ حقائق میں انسان کی علمی ترقی کے ساتھ ساتھ تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ کل کے بہت سے حقائق آج غلط ثابت ہو چکے ہیں۔ انسان کی علمی ترقی آج کے بہت سے حقائق کو بھی غلط ثابت کر سکتی ہے۔ اس لیے اہمیت طریقۂ کار ہی کی ہے۔ سائنس پوری کائنات کو اپنے احاطے میں لینے کی دعویدار ہے اور اس بات کی مدعی ہے کہ سائنسی طریقۂ کار علم وفن کی اقلیم تک پہنچنے کا تنہا راستہ ہے[۱۷]۔ اسی لیے پیرسن کا مشورہ ہے کہ سائنسی طریقۂ کار کی عادت ہر شخص کو ڈالنا چاہیے۔ ان کی رائے میں یہ طریقہ اچھی شہرت کے لیے لازمی ہے[۱۸]۔ یہ طریقہ اختیار کرنے سے کام نہ صرف منظم ومرتب ہوگا بلکہ جو نتیجہ اخذ کیا جائے گا وہ محقق کے ذاتی رجحان یا روایتی اثر سے آزاد ہوگا۔ اس کی ابتدا ہی صحیح نتیجہ حاصل کرنے کے عزم سے ہوئی ہے۔ اس لیے جہاں تحقیق ہے وہاں سائنس ہے اور جہاں مظاہر فطرت ہیں وہاں تحقیق ہے[۱۹]۔

تحقیق میں قیاس آرائی کو دخل نہیں لیکن تخیل کی کارفرمائی ضرور ہے۔ تخیل محقق کے لیے اتنا ضروری ہے جتنا شاعر کے لیے۔ اسی کی مدد سے وہ نئی نئی باتیں سوچ سکتا ہے، یہاں تک کہ مستقبل کو بھی دیکھ سکتا ہے۔ لیکن یہ تخیل منظم ہونا چاہیے، یہی منظم تخیل ہے جو تمام عظیم سائنسی اکتشافات میں کام کرتا ہے۔ جس شخص کے پاس تخیل نہیں وہ حقائق کو جمع تو کر سکتا ہے لیکن اکتشافات نہیں کر سکتا[۲۰]۔ یہ غلط طور پر مشہور ہو گیا ہے کہ اکتشافات اتفاق ہوتے ہیں۔ ہزاروں میں ایک اکتشاف اس طرح ہوا ہوگا ورنہ عموماً وہ اتفاقی نہیں ہوتے۔ اکتشاف محقق کی مسلسل کوششوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔

وھٹنی کی رائے ہے کہ مفکرانہ خیالات، سائنس اور تحقیق میں بڑی یکسانیت ہے[۲۱]۔ کرافورڈ تحقیق کو غور وفکر کا منظم ومرتب اور پاکیزہ طریقہ بتاتے ہیں[۲۲]۔ خیالات میں تسلسل اور نظم وترتیب حقیقت میں مفکرانہ خیالات ہی کی بدولت پیدا ہوتی ہے۔ مفکرانہ خیالات سے مراد کسی عقیدہ یا علم کی کسی شاخ سے متعلق وہ سرگرم، مسلسل اور محتاط غور وفکر ہے، جو ان اسباب کی روشنی میں جو اس کی تائید کرتے ہیں اور ان نتائج کی روشنی میں جن کی طرف وہ مائل ہو، کی جائے[۲۳]۔ مفکرانہ خیالات غور وفکر کے دوسرے طرز عمل کے برخلاف دو باتوں پر مشتمل ہیں:

۱۔ شک، تذبذب اور دماغی الجھن کی حالت جس میں غور وفکر پیدا ہوتی ہے۔

۲۔ ایسے مواد کی تلاش وجستجو اور چھان بین جو شک کو رفع اور تحیر کو دور کرے[۲۴]۔

تحقیق نہ صرف شک کو رفع اور تحیر کو دور کرتی ہے بلکہ آدمی کے لیے نئی نئی راہیں کھولتی ہے۔ وہ مسائل کو حل کرتی اور گتھیوں کو سلجھاتی ہے۔ وہ خامیوں کو دور کرتی اور خوب کو خوب تر بناتی ہے۔ وہ آئین نو کی قدر سکھاتی ہے۔ وہ انسان کے مقاصد کی تکمیل میں معین ثابت ہوتی ہے۔ Method of Research کے مصنفین کو اس پر اس قدر اعتماد ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جب تک تحقیق کا وجود ہے، مغربی تہذیب کو زوال نہیں آ سکتا[۲۵]۔ انھوں نے صحیح کہا ہے کہ مختلف شعبوں میں تحقیق کی بنا پر ہم اپنے خیالات کو وسعت دے سکتے ہیں، یہاں تک کہ عہد رفتہ کا نقشہ ہماری نگاہوں کے سامنے آ سکتا ہے۔ اس کی بدولت ہم دنیا کی گوناگوں تہذیبوں کو اپنا سکتے ہیں، غیر مرئی چیزوں کو دیکھ سکتے ہیں، فضائے بسیط کے اسرار کا انکشاف کر سکتے ہیں۔ اس طرح تحقیق آدمی کو پوری کائنات سے رشتہ جوڑنے میں مدد دیتی ہے[۲۶]۔

موجودہ دور کی بہت سی ذہنی ومادی ترقیوں کا سبب یہی تحقیق ہے۔ ریل اور جہاز کی تیز رفتاری نے سفر اور رسل ورسائل میں آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ انجینئرنگ کے کارناموں نے اولاد آدم کو مبہوت کر رکھا ہے۔ بجلی کی روشنی سے تاریک دیہات جگمگانے لگے ہیں۔ ریڈیو اور ٹرانزسسٹر نے ایک ملک کو دوسرے ملک سے بہت قریب کر دیا ہے۔ ریگ زار سرسبز وشاداب میدانوں میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ بنجر زمینیں لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں بدل رہی ہیں۔ بہت سے خطرناک امراض کا تقریباً خاتمہ ہو چکا ہے یا ان کا کامیاب علاج تلاش کیا جا چکا ہے۔ غرض علوم وفنون کی ترقی، تعلیم وتربیت کے ماہرانہ طریقے، زندگی کی راحت کے سامان کی فراوانی، انسانی دکھوں کا علاج اور مشکلات کا حل تحقیق ہی کی بدولت ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ تحقیق کا مقصد انسانیت کی خدمت ہے۔

محقق کی خصوصیات

محقق کا مطالعہ بہت وسیع ہونا چاہیے۔ اپنے مخصوص مضمون کے علاوہ اسے متعلقہ مضامین کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے۔ مثلاً اردو کے محقق کو فارسی لازمی طور پر جاننے کی ضرورت ہے۔ عربی جاننا بھی اس کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ قدیم اردو سے متعلق اودھی، برج، ہریانی وغیرہ سے واقفیت کے بغیر تحقیق ناقص ہوگی۔ ادب کے محقق کے لیے عہد متعلقہ کے تاریخی، معاشی ومعاشرتی حالات کا علم بھی ضروری ہے۔ اسے عروض، مبادیات فلسفہ وتصوف وغیرہ سے بھی واقف ہونا چاہیے۔ اسی

طرح تاریخ کے محقق کو جغرافیائی علوم، معاشیات اور سماجی علوم کا مطالعہ لازماً کرنا ہوگا۔ متعلقہ علوم یا مضامین کے مطالعہ کے لیے اس وسعت یا گہرائی کی ضرورت نہیں جو اصلی مضمون یا موضوع کے لیے ضروری ہے۔ وسیع مطالعہ کے ساتھ ساتھ گہری نظر، تنقیدی شعور اور دیانت کی بھی ضرورت ہے۔ واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا یا حقائق پر پردہ ڈالنا تحقیقی دیانت کے خلاف ہے۔ بے تعصب یا بے لوث ہونے کے لیے دو باتوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ مصنف تہذیبی حیثیت سے بہت بلند مرتبہ کا حامل ہو اور اپنے متوقع کتاب خوانوں کو اچھی طرح سمجھتا ہو۔ دوسری بات یہ کہ اس کی قوت ارادی اسے بے لوث ہونے پر مجبور کرے [۲۷]۔

تحقیق کے لیے ذاتی دلچسپی ضروری ہے۔ ذاتی دلچسپی کے بغیر اعلیٰ درجہ کی تحقیق نہیں ہو سکتی۔ تحقیق کا مادی معاوضہ کچھ نہیں ہے۔ اس کا بہترین معاوضہ وہ مسرت ہے جو محقق کو اپنی کامیابی پر ہوتی ہے۔ گلیلیو طب کا پروفیسر تھا لیکن ریاضی اور علوم طبعی سے دلچسپی کی بنا پر اس نے طب کی معقول مشاہرہ کی پروفیسری چھوڑ دی ہرشیل موسیقار تھا، لیکن اسے علوم نجوم سے دلچسپی ہوئی اور دوربین بنانے کا شوق ہوا، اس لیے وہ موسیقی کو ترک کر کے تحقیق کی طرف مائل ہوا۔ جس کا نتیجہ یورانس سیارہ کی دریافت اور بڑے سائز کی دوربین کی ایجاد تھی۔ ایڈورڈ براؤن کو فارسی ادب سے لگاؤ پیدا ہوا تو انھوں نے طب کو خیر باد کہا اور اپنی زندگی کا بیشتر حصہ فارسی ادب کی تحقیق میں گذارا اور اس میں وہ کمال حاصل کیا کہ ایران کے علمائے ادب نے ان کی استادی کو تسلیم کیا۔ (مولانا) شبلی نے وکالت کا نفع بخش پیشہ چھوڑ کر علم و ادب کی تحقیق کو اپنایا۔ ان کا شوق تحقیق انھیں مصر و شام و ترکی تک لے گیا۔ (مولانا) سید سلیمان ندوی نے کالج کی آرام دہ اور معقول تنخواہ کی ملازمت ترک کر کے ساری عمر دارالمصنفین کی علمی خانقاہ میں ایک معمولی مشاہرہ پر گذار دی۔ جسٹس سرشاہ سلیمان دن بھر عدالت میں قانونی گتھیاں سلجھایا کرتے تھے۔ لیکن گھر پر فرصت کے لمحات میں ریاضی کے مسائل حل کیا کرتے تھے۔ ایران کے موجودہ دور کے ایک نامور محقق آقای سعید نفیسی نے طبابت کو تحقیق ادب پر قربان کر دیا تھا۔

تحقیق کے لیے شوق اور دلچسپی کے ساتھ ساتھ سخت محنت کی بھی ضرورت ہے۔ مواد کی گردآوری میں نہ صرف کتابوں، مخطوطوں وغیرہ کے اوراق الٹنا ہوتے ہیں بلکہ ہر قسم کی راحت کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تحقیق میں صبر آزما محنت کی ضرورت ہے۔ مشہور جرمن مؤرخ رینکے (Ranke) اکیانوے برس کی عمر تک کام کرتا رہا۔ اس کے دو نوجوان مددگار جو باری باری سے اس کے ساتھ رہتے تھے، اس کے ساتھ کام کرتے کرتے تھک جاتے تھے [۲۸]۔ کیونڈش کی محنت و انہماک کی یہ حالت تھی کہ اس کا دوپہر کا کھانا ایک سوراخ کے ذریعہ اس کے کمرے میں رکھ دیا جاتا تھا تاکہ اس کے کام میں خلل نہ پڑے [۲۹]۔ سرسید احمد خان نے دہلی کی عمارتوں کی تاریخ لکھنے کے سلسلے میں جو محنت و جاں فشانی کی تھی اس کا اندازہ (مولانا) حالی کے مندرجہ ذیل بیان سے لگایا جا سکتا ہے:

''سرسید کہتے تھے کہ قطب صاحب کی لاٹھ کے بعض کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب نہ پڑھے جا سکتے تھے، ان کے پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلیوں کے بیچ میں ہر ایک کتبہ کے محاذی بندھوا دیا جاتا تھا اور میں خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر کتبے کا چربہ اتارتا تھا۔ جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا صہبائی فرط محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے اور خوف کے مارے ان کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا [۳۰]''۔

حافظ محمود خاں شیرانی کی جفاکشی اور ساتھ ہی سادگی کا اندازہ ان کے ایک ممتاز ہم عصر شیخ عبدالقادر کے اس بیان سے ہوتا ہے۔ شیخ صاحب شیرانی صاحب سے ملنے ان کے مکان پر گئے تھے۔

''گرمی کا موسم تھا اور دوپہر کے بعد کا وقت...... وہ ایک ہلکا سا بنیان پہنے ہوئے تھے اور کمر کے گرد صرف ایک چھوٹا سا تہبند باندھے بیٹھے تھے۔ پنکھا نہ دستی نہ بجلی کا، نہ گرمی سے بچنے کی فکر نہ پروا، کتابیں اور وہ، گرد و پیش فرامین اور سکے۔ یہ پروفیسر محنت کے لحاظ سے مغربی پروفیسروں سے زیادہ (جفاکش؟) اور آسائش اور ماندوبود میں کسی غریب مسجد کے ملا سے زیادہ سادہ تھا [۳۱]''۔

تحقیق میں وقت کا سوال بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ نوجوان محقق چاہتا ہے کہ اس کا مقالہ جلد سے جلد مکمل ہو جائے اور وہ اپنے کاروبار میں لگ جائے۔ لیکن تحقیق کا تقاضا اس کے برعکس ہے۔ عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب۔ تحقیق کے لیے طویل وقت کی ضرورت ہے۔ سائنسی تحقیق کو جانے دیجیے کہ اس میں تجربے اکثر رکاوٹیں ڈال دیتے ہیں۔ تاریخی، معاشرتی، ادبی تحقیق وغیرہ کی تکمیل میں بھی مدتیں گزر جاتی ہیں۔ صرف دو مثالیں کافی ہوں گی۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے حضرت عمرؓ کے خطوط، خطبات اور حکیمانہ اقوال کو جمع کرنا شروع کیا۔ گزشتہ ۴۰، ۴۵ برس میں انھوں نے اس کام کی تکمیل کے لیے خدا معلوم کیا کیا اور کہاں کہاں سے مواد جمع کیا ہے۔ یہ کام جو انھوں نے اپنی جوانی میں اور اپنی تصنیفی زندگی کے آغاز میں شروع کیا تھا، آج تک مکمل نہیں ہوا، حالانکہ سینکڑوں صفحات کا مسودہ لکھا پڑا ہے [۳۲]''۔ انگلستان کی ایک خاتون ہیلن ڈربی شائر نے تیس سال صرف کر کے ملٹن کی Paradise Lost کا ایک مستند ایڈیشن تیار کیا، جسے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کیا ہے۔

لیکن اس کا یہ مقصد نہیں کہ تحقیق کو لازمی طور پر طول دیا جائے۔ اس قسم کی مثالیں بھی موجود ہیں کہ ایک اہم موضوع پر مختصری مدت میں تحقیق مکمل

ہوگئی۔مثلاً اپنی تمام مشکلوں اور رکاوٹوں کے باوجود ''آثار الصنادید'' کا پہلا ایڈیشن ڈیڑھ برس کے اندر اندر چھپ کر تیار ہوگیا [۳۳]''۔

آیووا Iowa کی ریاستی یونیورسٹیوں نے ۱۹۲۲ء میں محقق طلبہ کی صلاحیتوں کو جانچنے کے لیے ایک کارڈ بنایا تھا۔اس میں دس شرطیں رکھی تھیں اور ہر شرط کے لیے نمبر مقرر کیے تھے۔یہ شرطیں حقیقتاً سائنسی مضامین میں تحقیق کے لیے ہیں۔لیکن غیر سائنسی مضامین میں تحقیق کرنے والے طلبہ کا بھی ان شرطوں پر پورا اترنا یکساں ضروری ہے۔نیچے ان شرطوں کو نقل کیا جاتا ہے۔

۱۔ قوت استدلال: مسائل کو استخراجی اور استقرائی دونوں طریقوں سے حل کرنے کی صلاحیت۔

۲۔ جدت: قوت اختراع، ذکاوت، منظم اقدام اور معقول افکار کی زرخیزی۔

۳۔ حافظہ: حقائق کا وسیع منطقی، کارآمد اور فوری اظہار۔

۴۔ چستی: تیز اور اثر پذیر مشاہدہ، فکر اور احساس۔

۵۔ صحت: نپا تلا، تیز، متناسب اور قابل اعتماد مشاہدہ، فکر اور احساس۔

۶۔ کاوش: قوت ارتکاز، مسلسل توجہ، استقلال اور با اصول کوشش۔

۷۔ اشتراک: ذہنی رفاقت اور مل کر کام کرنے اور راہ نمائی کی صلاحیت۔

۸۔ اخلاقی رجحان: ذہنی دیانت، صحت بخش اخلاقی معیار، مطمع نظر اور اثرات۔

۹۔ تندرستی: عضلاتی استحکام، جسمانی ساخت، قوت حیات اور قوت برداشت۔

۱۰۔ تحقیق کے لیے شوق اور سرگرمی: طبع زاد اور تخلیقی کام سے گہری دلچسپی اور اس کی خواہش [۳۴]۔

ان شرطوں میں علمی و ادبی تحقیق کے نقطۂ نگاہ سے مندرجہ ذیل شرطیں نسبتاً زیادہ اہم ہیں۔

قوت استدلال، جدت، حافظہ، اخلاقی رجحان، تحقیق کے لیے شوق اور سرگرمی۔

وقت کی تقسیم

ریسرچ اینڈ رپورٹ رائٹنگ Research and Report Writing کے مصنفین نے پی۔ایچ۔ڈی کے طلبہ کے لیے ایک مفید اور عملی ہدایت دی ہے اور وہ یہ ہے کہ تحقیق کے مختلف پہلوؤں یا منزلوں کو اپنے محدود وقت میں تقسیم کر دینا چاہیے۔ان کی رائے میں دو تہائی حصہ کو مواد کی تلاش اور فراہمی کے لیے اور ایک تہائی مقالہ لکھنے کے لیے مخصوص کرنا چاہیے۔اس کی مفصل تقسیم انھوں نے اس طرح کی ہے:

الف: مواد کی تلاش

۱۔ موضوع کا انتخاب

۲۔ پس منظری مطالعہ

۳۔ عارضی فہرست مآخذ تیار کرنا

۴۔ عارضی خاکہ

۵۔ پڑھنا اور نوٹ لینا

۶۔ نوٹوں کو ترتیب دینا

ب: مقالہ لکھنا

۱۔ جمع کیے ہوئے مواد کا تنقیدی تجزیہ۔

۲۔ آخری خاکہ تیار کرنا۔

۳۔ پہلا مسودہ۔

۴۔ نظر ثانی۔

۵۔ آخری فہرست مآخذ تیار کرنا

۶۔ آخری مسودہ۔[۳۵]

تحقیق کی قسمیں

انسان کی زندگی میں تنوع ہے اس لیے اس کے مسائل میں بھی تنوع ہے۔ مثلاً علمی مسائل، معاشرتی مسائل، تعلیمی مسائل وغیرہ۔ چونکہ مسائل میں تنوع ہے اس لیے موضوعات کی تحقیق میں بھی تنوع ہے یعنی زندگی کے ہر شعبہ میں تحقیق ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے۔ عموماً اسے دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

۱۔ علمی تحقیق

۲۔ عملی تحقیق۔ عملی تحقیق میں سارے علوم و فنون شامل ہیں۔ عملی تحقیق کو حرفیاتی (ٹکنالوجیکل) تحقیق بھی کہتے ہیں۔

❖❖❖❖

(۱) مبادیات تحقیق، عبدالرزاق قریشی، بمبئی، ادبی پبلشرز، ۱۹۶۸ء، ص ۱۔۱۹

حواشی

(۱) The Quest for Cartainty, John Dewey. باب۹،ص۲۱۷۔

(۲) The Elements of Reseach, F.L. Whitney. باب۱،ص۲۱۔

(۳) Webster's New International Dictionary of the Eng.Language. چاپ دوم۔

(۴) A New English Dictionary on Historical Principles. ،جلد۸۔

(۵) Research and Thesis Writing' C. Almack. باب۱،ص۱۱۔

(۶) Scientific Method, T.L. Kelley. باب۱،ص۱۔

(۷) F.L. Whitney کتاب مذکور، باب۱،ص۲۰ بحوالہ The Higher Learning in America' R.M. Hutchins.

(۸) T.L.Kelley کتاب مذکور باب۱،ص۳۔

(۹) F.L. Whitney کتاب مذکور، باب۱،ص۲۴، ۲۵، بحوالہ C.C. Crawford"The Technique of Research in Education"

(۱۰) Methods of Research 'C.V. Good and D.E.Scates باب۲،ص۴۲ Research, T.A. Boyd،ص۴۷۔

(۱۱) J.C. Almack کتاب مذکور، باب۹،ص۲۲۴۔

(۱۲) C.V.Good and D.E. Scates کتاب مذکور، باب۲،ص۵۲۔

(۱۳) Francis Bacon, C.D. Bowen. تعارف،ص۸۔

(۱۴) Life and Letters of Charles Darwin, Francis Darwin. جلد۱، باب۲،ص۱۰۶۔

(۱۵) John Dewey. کتاب مذکور باب۹،ص۲۱۷، ۲۱۸۔

(۱۶) The Grammar of Science, Karl Pearson. تعارف،ص۱۶۔

(۱۷) ایضاً، تعارف،ص۲۶۔

(۱۸) ایضاً،ص۱۲۔

(۱۹) C.V. Good and D.E.Scates. کتاب مذکور، باب۱،ص۱۲۔

(۲۰) Karl Pearson. کتاب مذکور، تعارف،ص۳۱۔

(۲۱) F.L. Whitney. کتاب مذکور، باب۱،ص۲۷۔

(۲۲) ایضاً،ص۲۱۔

(۲۳) How we think, John Dewey. باب۱،ص۹۔

(۲۴) John Dewey، کتاب مذکور، باب۱،ص۱۰۶۔

(۲۵) C.V. Good and Scates. کتاب مذکور، باب۱،ص۱۸۔

(۲۶) ایضاً۔

(۲۷) T.L.Kelley، کتاب مذکور، باب۱،ص۱۶۔

(۲۸) C.V. Good and D.E. Scates، کتاب مذکور، باب۲،ص۵۷۔

(۲۹) C.V. Good and D.E. Scates.، کتاب مذکور، باب۲،ص۵۶۔

(۳۰) خواجہ الطاف حسین حالی، حیات جاوید، پہلا حصہ، دوسرا باب، ص ۴۸۔

(۳۱) شیخ عبدالقادر،'' حافظ محمود شیرانی مرحوم''، اورینٹل کالج میگزین، جلد۲۳، عدد۲، ص ۷۔

(۳۲) مالک رام ومختار الدین احمد (مرتبہ)، ''ذکر عرشی''، نذر عرشی، ص ۱۸۔

(۳۳) خواجہ الطاف حسین حالی، کتاب مذکور، پہلا حصہ، دوسرا باب، ص ۴۸۔

(۳۴) F.L. Whitney کتاب مذکور، باب، ص ۴۷۔

(۳۵) Elliot Gartner and Francesco Cordasco Research and Report Writing چاپ ہشتم، باب ۱، ص ۵، ۶۔

❖❖❖❖

تحقیقی عمل کے مراحل[1]

پروفیسر عبدالستار دِلوی

محقق اور راہ نما

محقق اور اس کے راہ نما دونوں میں کچھ مخصوص محقق اور راہ نما اوصاف ہونا ضروری ہیں۔ یہاں ان ہی اوصاف کا ذکر کیا جائے گا۔ کسی محقق کے لیے ایک محقق اور راہ نما کا ہونا ضروری بلکہ ناگزیر ہے۔ ان دونوں کے درمیان ایک خصوصی تعلق ہوتا ہے اور اگر دونوں اپنے اپنے اوصاف کے حامل ہیں تو تحقیقی عمل کی کامیابی یقینی ہے۔

محقق: محقق کے اوصاف کی فہرست میں مندرجہ ذہنی قویٰ کا ہونا ضروری ہے۔

۱۔	قوتِ استدلال	اخذیاتی اور تخلیقی
۲۔	قوتِ حافظہ	ادراکی۔ مفصل اور مبنی بر دلائل
۳۔	مراقبہ (ارتکازِ فکر)	مضبوط اور طویل
۴۔	ذہنی صداقت	اپنی جانب اور موضوع کی جانب
۵۔	شوق اور حوصلہ	بنیادی تخلیقی عمل سے متعلق
۶۔	تجسس	مستعد اور فعال

مندرجہ بالا فہرست میں محقق کے لیے سارے ضروری اوصاف آ گئے ہیں۔ ان کے علاوہ ''رجحان'' ''خود اعتمادی'' اور موضوع سے دلچسپی کو بھی اس فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ بعض علماء نے محقق کے لیے بعض ضروری اوصاف کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ ان میں سے بعض اوصاف ہر ایک محقق کے لیے ضروری ہیں۔

محقق کے کام اور اس کی ذمے داریوں کو دیکھتے ہوئے اس کے ذہنی اوصاف پر زور دیا جانا فطری بات ہے۔ ایک فعال محقق جب کسی موضوع پر کام شروع کرتا ہے تو بعض اوصاف اس کی ذات میں پہلے سے ہی فطری طور پر موجود ہوتے ہیں اور دیگر اوصاف وقت گزرنے کے ساتھ مشق کرنے پر اس میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ ذہنی اوصاف کی طویل فہرستوں سے محقق کو احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ ان صلاحیتوں کا ذکر صرف محقق کو مستعد اور باعمل بنانے نیز اس میں جوش اور حوصلہ پیدا کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔

محقق کے کام کی ابتدا تجسس سے ہوتی ہے۔ پیچیدہ حالات اور انسانی زندگی میں رونما ہونے والے مسائل کے بارے میں وہ ایک پر تجسس اشتباہ کا احساس کرتا ہے۔ اس سے ایک ذہنی کش مکش پیدا ہوتی ہے۔ یہیں پر حالات کے متعلق ایک متعینہ نتیجے تک پہنچنے کی زبردست ضرورت کا احساس ہوتا ہے اور یہی چیز اس کے لیے باعثِ تحریک بنتی ہے۔

تجسس سے پیدا ہونے والی تحریک جہاں جذباتی طور پر اسے پریشان کر دیتی ہے، وہیں اس کی ذہنی صلاحیتوں کو جلا بخشتی ہے۔ نتیجے کے طور پر اس کی ذہنی طاقت غور و خوض، مفروضہ اور مراقبے کے مراحل سے گزر کر مسئلے کے حل کی جانب رواں دواں ہو جاتی ہے۔ ذہنی نقطۂ نظر سے صبر و سکون اور باہوش ذہنیت کا عمل ہی اس کا معاون بنتا ہے۔

کچھ عرصے تک اپنے کام میں مشغول رہنے کے بعد اس کے دل میں اپنے تحقیقی عمل کے لیے محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسے اپنے ذوق کی تکمیل کی راہ میں پیش آنے والی طبعی دشواریوں اور وسائل کی کمیابی میں بھی ایک لطف آنے لگتا ہے۔ اس کا ذوقِ عمل شدید سے شدید تر ہوتا جاتا ہے۔ اسے اس سلسلے میں اپنا عیش و آرام بھی قربان کر دینا پڑتا ہے۔ تحقیقی عمل کی تکمیل کے بعد محقق کو جس حقیقی فخر و مسرت کا احساس ہوتا ہے وہ دورانِ تحقیق بھی اس کے قلب و ذہن پر چھایا رہتا ہے۔

جہاں تک محقق کی ذہنی صلاحیتوں کا تعلق ہے اس کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز زبردست قوتِ استدلال ہے۔ کسی موضوع کے ہر ایک گوشے پر

قوتِ استدلال کے ذریعے ہی غور وخوض کیا جا سکتا ہے۔

دوسری چیز مسلسل غور وفکر کرنا ہے۔ کبھی کبھی اس کے سوچنے کی رفتار سست بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن زیادہ تر، وقت اور سہولیات کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کو غور وفکر میں مسلسل مصروف رہنا ہی پڑتا ہے۔ ذہن کو فعال رکھنے کے لیے وسیع النظری بہت اہم چیز ہے۔ محقق کا ذہن کسی وقت بھی جامد وساکن نہیں رہنا چاہیے۔ جو چیز اس کی تحقیق اور مطالعے کا موضوع ہوتی ہے اسے عمل تحقیق کے مختلف مرحلوں میں حسبِ ضرورت اس کے ذہن پر مرتسم ہوتے رہنا چاہیے۔ اس کے لیے تحقیقی قوتِ حافظہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے کام کی تکمیل کے ساتھ ساتھ اس کی قوتِ حافظہ بھی اور مضبوط ہوتی جاتی ہے۔

ذہنی اعتبار سے محقق کو دیانت دار ہونا چاہیے۔ ذہنی دیانت داری کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنے موضوع کا ہر وقت جائزہ لے اور اس کا تجزیہ کرے۔ ذہنی مشقت کے سلسلے میں کسی دشواری کا احساس کر کے مطالعے میں غیر ضروری التواء نہیں ہونا چاہیے۔ ایسی حالت پیدا ہو جانے پر تحقیقی عمل کے سلسلے میں محقق کی دیانت داری باقی نہیں رہتی۔

ذہنی اعتبار سے محقق کو اخلاقی صلاحیتوں کا حامل ہونا چاہیے۔ اس کی ذہنی رو کسی ایک سمت میں محدود نہیں رہنی چاہیے۔ تخلیقی صلاحیت، فکرِ نو، قلبی تحریک اور خود اعتمادی جیسے عناصر بھی اس کی ذہنی صلاحیتوں کے لیے ضروری خیال کیے جاتے ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ محقق کی ذات میں جمالیاتی احساس اور ذہنی صلاحیتوں کا امتزاج ہونے پر ہی تحقیقی عمل کامیاب ہو سکتا ہے۔

توضیحِ فکر بھی محقق کا ایک ضروری وصف ہے۔ ممکن ہے کہ بعض حالات میں کچھ الجھنیں اسے درپیش ہوں، لیکن مسلسل کوشش اور غور وفکر کے بعد اسے ان الجھنوں پر قابو حاصل کر لینا چاہیے۔

سہولیات

ذہنی صلاحیتوں سے پوری طرح لیس ہونے کے بعد بھی اگر محقق کو ضروری سہولیات میسر نہ ہوں تو تحقیقی عمل ممکن نہیں ہو سکتا۔ یہ سہولیات مندرجہ ذیل ہیں۔

مالی سکون

محقق کے لیے یہ چیز انتہائی اہم ہے۔ اس سہولت کی عدم موجودگی میں وہ پوری خود اعتمادی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف نہیں رہ سکتا۔ اگر مالی ضروریات کی تکمیل کے لیے اسے اِدھر اُدھر جانا پڑے تو اس کا کام حرج ہوتا ہے۔ اسی لیے بڑے محققین کے لیے وظیفے کی ضرورت بہت ضروری ہوتی ہے۔

لائبریری کی سہولت

اچھی اور اہم کتابوں سے معمور لائبریریاں تحقیقی کام کے لیے بہت ضروری ہوتی ہیں۔ اگر کسی لائبریری میں محقق کو اپنی مطلوبہ کتابیں دستیاب نہیں ہوتیں تو ان کو فوری طور پر منگوائے جانے کا انتظام ہونا چاہیے۔ نایاب کتابوں یا قلمی مخطوطات کے حصول کی خاطر محقق کو دوسرے مقامات پر جانے کی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

سفر

تحقیقی کام کے دوران سفر کرنا بھی ضروری ہو سکتا ہے۔ کبھی کبھی دوسری یونیورسٹیوں کے ذمے دار پروفیسروں وغیرہ سے مشورہ کرنے اور کبھی زیرِ تحقیق مصنف یا شاعر سے ملاقات کرنے اور نایاب کتابوں کی فراہمی کے لیے محقق کا سفر کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس کے زادِ راہ وغیرہ کا مناسب انتظام ہونا چاہیے۔ اگر تحقیق کا موضوع کسی جائزے یا علاقائی کام سے متعلق ہے تو اس کے لیے بھی سفر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

آلات اور مشینیں

کسی موضوع کے جائزے یا علاقائی کام کے لیے ٹیپ ریکارڈ انتہائی ضروری چیز ہے۔ کسی علاقائی بولی یا اس کے عوامی ادب کا مطالعہ کرنے والے محقق کا کام اس کے بغیر چل ہی نہیں سکتا۔ مخطوطات کی تصاویر لینے کے لیے فوٹو اسٹیٹ کیمرہ بھی بہت ضروری ہے۔ ان عکسی تحریروں کو پڑھنے کے لیے بھی ضروری

آلات کی فراہمی اہم ہے۔ محقق کو ان آلات کے استعمال کرنے کی تربیت بھی حاصل کرنی چاہیے۔ اس سلسلے میں کمپیوٹر بھی ایک ایسا آلہ ہے جو کئی قسم کے کاموں میں مفید ہے۔

محقق ایک مفکر

تحقیق کے سارے مراحل میں محقق کے خیالات کی رو چلتی رہتی ہے۔ صرف مواد کی فراہمی اور حقائق کا تجزیہ ہی کافی نہیں۔ تحقیق میں غور و فکر اور تجزیے کا لزوم یقیناً تسلیم کیا جانا چاہیے۔ غور و فکر کا یہ عمل سائنسی اور استدلالی ہونا چاہیے۔ سائنسی اندازِ فکر وہ ہے جس کا تعلق حقائق سے لازمی طور پر قائم رہے اور اس کی ترتیب حقائق کی بنیاد پر کی جائے۔ یہ اندازِ فکر اپنے موضوع پر ہی مرکوز رہنا چاہیے، ورنہ محقق اپنے راستے سے بھٹک سکتا ہے۔

اس اندازِ فکر کو اپنے موضوع کے نامکمل اور ناپختہ حل سے محفوظ رکھا جانا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی متضاد شہادتوں کو بھی اس کے زمرے میں نہیں لانا چاہیے۔ محقق کی ذہنی رو موضوع اور مسئلے کی حدود میں رہ کر ہی مفید ہوسکتی ہے۔ اس اندازِ فکر کی بنیادی خصوصیات میں وقت، مواد، غیر مشتبہ جائزہ، عمل اور سبب، نیز تسلسل اور تواتر کی مکمل واقفیت وغیرہ شامل ہیں۔

ناپختہ نتائج

بعض محقق اپنے جوشِ عمل کے تحت ناپختہ لیکن دلچسپ اور پُرکشش نتائج قائم کرنے کے عمل میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ ایسی حالت میں وہ اس بات کا خیال نہیں رکھتے کہ ممکنہ اور موصولہ شہادتوں سے ان نتائج کی تائید ہوتی ہے یا نہیں۔ یہاں ذہنی عمل پر جذبات غالب ہوجاتے ہیں۔ ایک کامیاب اور ذہین محقق اس وقت تک کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرتا جب تک کہ مکمل مواد کی فراہمی نہ ہوجائے۔

حدود کی خلاف ورزی

مقررہ موضوع اور مسئلے کے حدود کی خلاف ورزی محقق کے ذہنی عمل کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ محقق کے خیالات کو لچک دار ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہو تو حدود کی خلاف ورزی خود بخود ہونے لگتی ہے۔ فکر کی نئی سمتوں اور خلاف امید نتائج پر بھی اس کی نظر رہنی چاہیے، بشرطیکہ ان کی بنیاد حقائق اور استدلال پر ہو۔ نامکمل حقائق پر مبنی نتائج یا اصول کبھی بھی قابلِ یقین نہیں ہوسکتے۔

محقق ایک جاسوس

محقق کی نظر اور طریقۂ کار ایک جاسوس سے مشابہت رکھتا ہے۔ جس طرح ایک جاسوس چھوٹے چھوٹے پُراسرار اشاروں کو ایک باترتیب طریقۂ استدلال کی روشنی میں پرکھتا ہے، اسی طرح محقق اپنے عملِ تحقیق کے دوران ایک منصفانہ اور قابلِ یقین حل کے لیے چھوٹے چھوٹے پُراسرار اشاروں اور نکات کو استدلالی انداز میں مجتمع کرتا ہے۔ جس طرح جاسوس کی قابلِ اعتماد شہادت پر عمل و انصاف کا انحصار رہتا ہے، اسی طرح محقق کی حاصل کردہ شہادتیں ہی اس کے نتائج کو قابلِ قبول بناسکتی ہیں۔

ایک کامیاب جاسوس کی طرح محقق کو بھی یہ معلوم رہنا چاہیے کہ پُراسرار اشارے کہاں سے مل سکتے ہیں؟ محقق کو ان اشارات کو جمع کرنے، ان کو ترتیب دینے اور ان کا تجزیہ کرنے کے علم میں ماہر ہونا چاہیے۔ حصولِ مواد کے ہر ممکنہ ذریعے کے ساتھ اس کا تعلق ہونا چاہیے۔ عام طور پر مفید مطلب شہادتوں کی تلاش لائبریریوں میں ہوتی ہے۔ ان کو کتابوں کی فہرست اور ان کو رکھے جانے کا طریقۂ کار سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیے تاکہ مواد کی تلاش جلد اور مکمل انداز میں ہوسکے۔ مواد کے انتخاب کی مہارت بھی ضروری ہے تاکہ وہ غیر ضروری مواد کو نظر انداز کرکے اپنے لیے مفید اور ضروری مواد ہی جمع کرسکے۔ اگر ضرورت سے کچھ زیادہ مواد جمع کرلیا جائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ لیکن ضرورت سے کم مواد کی فراہمی تحقیقی عمل میں کسی وقت بھی خلل ڈال سکتی ہے۔

راہ نما

تحقیقی طریقۂ کار سے متعلق ملکی اور غیر ملکی کتابوں میں راہ نما کے متعلق بہت کم اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ لہٰذا تجربے کی بنیاد پر ہی راہ نما کے بارے میں غور کیا جاسکتا ہے۔

راہ نما کا انتخاب

یونیورسٹیوں کے تحقیقی شعبوں اور اداروں میں راہ نماؤں کا تقرر بعض علمی صلاحیتوں کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ جب محقق اس میدان میں آتا ہے تو اس کے سامنے راہ نما کے انتخاب کا سوال آتا ہے۔ یہاں دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

۱۔ موضوع کے اعتبار سے راہ نما کا انتخاب

۲۔ راہ نما کے اعتبار سے موضوع کا انتخاب

ان میں سے پہلی صورتِ حال زیادہ صحت مند ہے۔ کیونکہ اس حالت میں محقق کی آزادی ایک مخصوص حد تک قائم رہتی ہے۔ لیکن یہ مفروضہ بھی عام ہے کہ موضوع کے انتخاب سے ہی راہ نما کا کام شروع ہوتا ہے۔ اور اس طرح راہ نما کا انتخاب تحقیقی عمل کا پہلا مرحلہ بن جاتا ہے۔

یونیورسٹیوں میں صورتِ حال کچھ اس انداز کی ہے کہ ایک راہ نما کی راہ نمائی میں کام کرنے والے محققین کی تعداد متعین رہتی ہے۔ دشواری اس وقت پیش آتی ہے، جب کسی کے پسندیدہ موضوع سے تعلق رکھنے والے راہ نما کے پاس اسکالروں کی تعداد پہلے ہی پوری ہو چکی ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں محقق کو یا تو اپنا موضوع تبدیل کرنا ہوگا یا اپنے تحقیقی عمل کو ملتوی کرنا پڑے گا۔ بہر حال عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ موضوع کے انتخاب میں محقق اور راہ نما دونوں کا تعاون شامل رہتا ہے۔

راہ نمائی

یہ بات عام طور پر مسلمہ ہے کہ محقق کو اپنے تحقیقی عمل میں پوری طرح آزاد ہونا چاہیے۔ اس لیے ضروری ہے کہ راہ نمائی کا طریقۂ کار ایسا ہونا چاہیے کہ محقق کی آزادی میں کوئی خلل نہ پڑے۔ تحقیقی عمل کے ہر مرحلے میں یہ آزادی ضروری ہے۔ اصولی طور پر راہ نمائی کی ضرورت اس لیے پڑتی ہے کہ محقق کو راہ نما کے تجربات سے استفادہ کرنے کا موقع مل سکے۔ راہ نما کی ضرورت انھی حالات میں پڑتی ہے جب محقق کے سامنے کچھ دشوار مسائل آ جائیں۔ ان مسائل کے متعلق محقق اپنے راہ نما سے ضروری مشورہ لے سکتا ہے۔ اگر راہ نما کا کام صرف راہ نمائی تک محدود ہے تو محقق کی آزادی میں کوئی خلل نہیں پڑتا۔

مشورہ دیتے وقت راہ نما کو غیر جانب دار اور نرم ہونا چاہیے۔ اس کو چاہیے کہ وہ پوری فراخ دلی کے ساتھ محقق کی دشواریوں کو سمجھے۔ ان کا حل پیش کرنے میں اور محقق کے پیش کردہ دلائل کی تردید میں اپنے احساسِ برتری یا کسی قسم کے دباؤ کا استعمال نہ کرے۔ اسے چاہیے کہ وہ اپنے دلائل کے مخالف دلائل کو بھی، اگر وہ قابلِ یقین ہیں، منظور کر لے یعنی راہ نما کا طرزِ عمل ایسا ہونا چاہیے کہ محقق کی آزادی، اس کا حوصلہ اور تجسس وغیرہ کسی طرح کم نہ ہو سکیں بلکہ بڑھتے ہی رہیں۔

راہ نمائی کے مراحل

راہ نمائی کے مراحل وہی ہیں جو تحقیقی عمل کے مراحل ہیں۔

موضوع کا انتخاب

موضوع کے انتخاب کی ذمے داری خصوصاً محقق پر ہی ہوتی ہے۔ لیکن اصولی طور پر موضوع کے انتخاب میں بھی راہ نما کا مشورہ ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ راہ نما براہ راست کوئی موضوع تجویز کر دے۔ اس سلسلے میں اس قسم کی راہ نمائی محقق کی دلچسپی کے خلاف ہو سکتی ہے۔ اس بارے میں راہ نما کو صرف راہ نمائی کا کام انجام دینا چاہیے۔ راہ نما کے لیے ضروری ہے کہ وہ محقق کے رجحان اور اس کی پسند سے واقف ہو اور پھر اس میدان کے مسائل سے وہ اس کو پوری طرح متعارف کرا دے۔ اس سلسلے میں راہ نما کی ہمدردیاں محقق کے ساتھ رہنی چاہییں۔ آخر میں اپنی پسند کے مطابق موضوع کا انتخاب محقق کو ہی کرنا چاہیے۔

دوسرا راستہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ راہ نما، محقق کی دلچسپی سے متعلق کچھ موضوعات کی فہرست ہی اس کے سامنے رکھ دے اور محقق کو اس فہرست میں سے موضوع کے انتخاب کا موقع دے۔ اس کے برعکس راہ نما، محقق سے ہی اس کے پسندیدہ موضوعات کی فہرست طلب کر سکتا ہے۔ چونکہ اپنے موضوع میں سے کسی ایک انتخاب کے بارے میں پس و پیش رہتا ہے، ایسی صورت میں راہ نما محقق کی مدد کر سکتا ہے اور اس کے کسی موضوع میں تھوڑا سا ردو بدل کر کے وہ محقق کو موضوع کے انتخاب میں تعاون دے سکتا ہے۔ ضروری ہے کہ موضوع کا میدان زیادہ وسیع نہ ہونے پائے۔

دائرہ تحقیق کا تعین

انتخاب موضوع کے بعد تحقیقی عمل کے دائرہ کار کے تعین کا مرحلہ آتا ہے۔اس کے تحت تحقیقی مقالے کے مختلف ابواب کا تعین کرنا بھی ہوتا ہے۔اس موقع پر بھی راہ نما کو چاہیے کہ

۱۔ وہ محقق کو تحقیق کے دائرے اور اس کی ممکنہ تقسیم کے بارے میں مشورہ کرنے کا موقع دے۔

۲۔ اس مشورے کی روشنی میں محقق اپنے مقالے کا خاکہ تیار کرے۔

۳۔ اس خاکے میں راہ نما مناسب تبدیلیاں اور حد بندیاں کر دے۔

طریقہ کار کا تعین:

اس مرحلے میں راہ نما کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔محقق سے یہ امید تو کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے موضوع کے ساتھ ضروری تعلق رکھے لیکن طریقہ کار کے بارے میں اسے بہت کم واقفیت ہوتی ہے۔اسی لیے بعض یونیورسٹیوں میں تحقیق کے طریقہ کار کے بارے میں تربیت لینا لازمی کر دیا گیا ہے۔جہاں یہ انتظام ہے وہاں بھی تحقیقی طریقہ کار کے بارے میں محقق کو بس ایک عام سی معلومات حاصل ہو جاتی ہے۔کسی مخصوص موضوع کے خصوصی طریقہ کار کے بارے میں ضروری معلومات محقق کو اپنے راہ نما سے ہی مل جاتی ہے۔طریقہ کار کے بارے میں راہ نمائی کا اندازہ ایسا ہونا چاہیے کہ محقق ایک مشین بن کر نہ رہ جائے۔

مواد کا تعین:

مواد کی فراہمی کے لیے تو محقق کو سارا کام خود ہی کرنا پڑتا ہے لیکن مواد کے تعین میں راہ نما کے مشورے کی ضرورت ہوتی ہے۔راہ نما سارے جمع شدہ یا ممکنہ مواد کو مختلف حصوں میں تقسیم کر لینے کے لیے ضروری مشورے دیتا ہے۔پھر ہر ایک حصے کے مواد کا تجزیہ کرنے میں بھی راہ نما کی ضرورت ہوتی ہے۔شماریات (Statistics) وغیرہ جیسے خصوصی طریقہ ہائے کار کے بارے میں ضروری واقفیت دینا اور اس پر قاعدے سے عمل کرانا بہت کچھ راہ نما کی ذمے داری ہوتی ہے۔

پیش کش:

آخر میں راہ نما کو یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ فراہم شدہ مواد کا استعمال صحیح طریقے سے ہوا ہے یا نہیں۔اس مرحلے میں راہ نما کی حیثیت ایک تبصرہ کار جیسی ہوتی ہے۔مناسب الفاظ کا استعمال محقق کی تحریر کو باوزن اور جان دار بناتا ہے۔اس سلسلے میں خصوصی اور موضوع سے تعلق رکھنے والے اصطلاحی الفاظ کا تعین پہلے ہی کر لیا جاتا ہے اور پورے مقالے میں ان ہی الفاظ کو بغیر کسی تبدیلی کے استعمال کرنا ضروری ہوتا ہے۔راہ نما ان میں سے غیر ضروری اجزا قلم زد بھی کر دیتا ہے۔ایک مقالے کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا اختصار اور اپنے موضوع کے گرد اس کا حصار ہوتا ہے۔

تحقیقی عمل کے مراحل

تحقیق ایک بامقصد سائنسی اور منضبط فکر کا عمل اور اس کی پیش کش ہے۔یہ کام بعض مخصوص مراحل کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔یہ مراحل ہیں: انتخاب موضوع، موضوع کی وسعت کا تعین، مواد کی فراہمی اور اس کا تجزیہ اور آخر میں اس سے ایک نتیجہ اخذ کرنا۔

لیکن اس سلسلے میں مختلف ماہرین تحقیق کی رائے الگ الگ ہے۔بعض نے ان مراحل کی تعداد زیادہ بتائی ہے اور بعض نے کم۔بہر حال تحقیقی عمل کی باضابطہ تکمیل کے لیے مندرجہ بالا مراحل سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ مختلف علماء نے ان میں سے ہر ایک مرحلے کو کئی شعبوں میں تقسیم کر کے ان کی تعداد بڑھا کر بتائی ہے۔ہم ان مراحل کو قدرے تفصیل سے بیان کریں گے۔

موضوع کا انتخاب:

تحقیقی عمل کا یہ اولین اور اہم ترین مرحلہ ہے۔ صحیح موضوع کا انتخاب کر لینے پر محقق کو اپنے کام کے لیے کچھ زیادہ دلچسپی اور جوشِ عمل پیدا ہو جاتا ہے اور اسے کام کرنے کی تحریک ملتی ہے۔ منتخب کیے ہوئے ہر ایک موضوع کے پردے میں ایک مسئلہ روپوش ہوتا ہے جس کا حل کرنا محقق کا کام ہے۔ بہر حال ہر ایک مسئلے کا حل تلاش کرنا دشوار ہی ہوتا ہے۔ تاہم اس دشوار منزل کو سر کرنا محقق کا ایک اہم اور مقدس فریضہ ہے اور اس فریضے کی ادائیگی میں اس کو پوری توجہ، ہمدردی اور محنت شاقہ سے کام لینا پڑتا ہے۔ مسئلے اور موضوع کا انتخاب کرتے وقت محقق کو اپنی دلچسپی اور رجحان کو ہمیشہ مدِ نظر رکھنا چاہیے اور اپنی پسند کا ایک موضوع منتخب کر لینے کے بعد اس انتخاب کے سلسلے میں اپنے راہ نما یا دیگر ماہرین کا مشورہ ضرور لے لینا چاہیے۔ ایسا کرنے سے اس موضوع کی اصل ہیئت متعین ہو سکے گی، جس کا حل تلاش کرنے کے لیے محقق کو بعض اصولوں پر عمل کرنے سے زیادہ دشواریوں کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

موضوع کا انتخاب کرتے وقت اس بات کا خاص طور سے خیال رکھنا چاہیے کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کام نہ کیا جا چکا ہو۔ ہر حالت میں ایسا موضوع منتخب کرنا چاہیے جس پر کی جانے والی تحقیق کے نتائج سے انسانی علم کا دائرہ وسیع تر ہو سکے۔ البتہ اگر محقق یہ عزم رکھتا ہے کہ وہ پہلے کسی موضوع پر کی جانے والی تحقیق کے خلاف نتائج اخذ کر کے پیش کر سکتا ہے تو یہ اس کا کارنامہ ہوگا۔ بشرطیکہ وہ پہلے سے مسلمہ نتائج کی تردید میں باوزن اور ٹھوس دلائل پیش کر سکے۔ بعض مرتبہ پہلے کے علماء اور محققین کے برآمد کیے ہوئے نتائج میں کچھ نئے مسائل بھی پوشیدہ رہتے ہیں۔ ایسی صورت میں نوجوان محققین کو چاہیے کہ وہ ایسے موضوعات کو لے کر ان پر تحقیقی عمل کو آگے بڑھائیں۔

موضوع کا سرچشمہ:

تحقیقی عمل کے لیے موضوعات یا مسائل کسی بیرونی تحریک یا ذہنی افتاد سے پیدا ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی اچانک ہی کوئی موضوع سامنے آ جاتا ہے۔ پھر بھی انتخابِ موضوع کا مرحلہ محقق کے لیے دشوار گزار ہی ہوتا ہے۔ لیکن جن لوگوں کو اپنے شعبے پر پورا عبور ہوتا ہے ان کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ محقق کو چاہیے کہ اس کے شعبے میں جو تحقیقی کام پہلے ہو چکے ہیں، ان کا بغور مطالعہ کرے۔ اس سے وہ اپنے کام کے لیے ایک ہموار راستہ متعین کر سکے گا اور اس کو اپنے لیے مواد کی فراہمی میں مدد ملے گی۔ پہلے کے تحقیقی کاموں کے مطالعے سے اس کو اپنے موضوع کے انتخاب کے بارے میں بھی روشنی مل سکتی ہے، کیونکہ جب کسی شعبے میں تحقیقی عمل کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے تو نئے نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ہر ایک تحقیقی عمل جہاں کسی مسئلے کا حل پیش کرتا ہے، وہاں وہ نئے نئے مسائل کی جانب اشارے بھی کرتا ہے اور کسی مسئلے کا حل جو پہلے پیش کیا جا چکا ہے اس کو حرفِ آخر نہیں سمجھنا چاہیے۔ لہٰذا ایسے موضوعات پر دوبارہ کام کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال انتخابِ موضوع کے لیے پہلے کے تحقیقی کاموں کا مطالعہ ازبس ضروری ہے اور اس کام کو مندرجہ ذیل طریقوں سے کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ اپنے تحقیقی شعبے کا تجزیہ، مع اس کے متعلقہ تاریخی شواہد کے۔

۲۔ اپنے شعبے میں خالی جگہوں اور نامعلوم کڑیوں کا جائزہ۔

۳۔ اس بات کا جائزہ لینا کہ اس عمل میں اخذ کیے ہوئے نتائج قابلِ تردید تو نہیں ہیں، اگر ہیں تو اس کی اصلاح کے لیے ایک نیا موضوعِ تحقیق پیدا کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ پہلے کے کاموں میں امکانی نتائج کے بارے میں اشارات اور اقوال کا جائزہ۔

مندرجہ بالا اصولوں کی روشنی میں موضوع کا انتخاب آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔

دلچسپی اور ذوقِ عمل

محقق کا فطری ذوقِ عمل انتخابِ موضوع کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے۔ محقق کسی موضوع کا انتخاب اس لیے کرتا ہے کہ اس میں اسے دلچسپی ہے۔ اپنی دلچسپی کی بنیاد پر منتخب کیے ہوئے موضوع پر کام کرنے کے لیے محقق ذہنی طور پر تیار اور مستعد رہتا ہے اور اس کام میں اس کو لطف بھی آتا ہے جو اس کے لیے باعثِ تقویت ہوتا ہے۔ لیکن یہ دلچسپی بھی گذشتہ تحقیقی کاموں کے مطالعے سے پیدا ہوتی ہے۔

موضوع کا انتخاب کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ وہ موضوع اپنی وسعت کے اعتبار سے اتنا طویل نہ ہو کہ اس پر ایک منضبط اور مکمل تحقیقی عمل

کے کام کو سمیٹنا دشوار ہو جائے۔ محقق کو چاہیے کہ موضوع کا انتخاب کر لینے کے بعد اس کے تعین کے سلسلے میں اپنے راہ نما کا مشورہ ضرور لے لے اور راہ نما اس موضوع کی ہیئت و وسعت میں مناسب تبدیلیاں کر کے اسے محقق کے کام کے لیے آخری طور سے منتخب کر دے۔ راہ نما کا فرض ہے کہ وہ موضوع کے بارے میں مشورہ دیتے وقت محقق کی دلچسپی اور صلاحیت کار کو ملحوظ رکھے۔

انتخابِ موضوع کا معیار

۱۔ موضوع تحقیق محقق کی دلچسپی اور رجحان کے مطابق ہونا چاہیے۔

۲۔ موضوع تحقیق نیا اور بنیادی ہونا چاہیے۔ اس موضوع پر پہلے کام نہ کیا گیا ہو اور نہ کیا جا رہا ہو۔

۳۔ موضوع تحقیق سائنسی تحقیق کے لیے مناسب ہونا چاہیے۔ کیونکہ ادبی تحقیق فلسفیانہ انداز میں نہیں بلکہ سائنسی خطوط پر ہونی چاہیے۔

۴۔ موضوع تحقیق کی اپنی ایک اہمیت ہونی چاہیے۔ یعنی وہ موجودہ انسانی علوم میں کسی حد تک اضافہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

۵۔ موضوع تحقیق ایسا ہو کہ اس کے سلسلے میں ضروری مواد کا حصول ممکن ہو اور اس پر تحقیق کا کام کیا جا سکے۔

موضوع کی وسعت اور دائرہ عمل کا تعین:

تحقیق کے لیے موضوع کا انتخاب کر لینے کے بعد یہ طے کرنا چاہیے کہ اس کے تحت کون کون سے نکات زیر بحث آئیں گے اور تحقیق کا دائرہ کس قدر وسیع ہوگا۔ تحقیق کا دائرہ عمل بہت زیادہ محدود یا بہت زیادہ وسیع نہیں ہونا چاہیے۔ اگر اس سلسلے میں موضوع میں کچھ ضروری تبدیلیاں کرنا ناگزیر ہو جائے تو راہ نما کے اشارے سے وہ تبدیلیاں عمل میں لائی جانی چاہئیں۔

موضوع تحقیق کی ہیئت کا تعین بہت ضروری ہے۔ اس کے بعد تحقیقی عمل یکسوئی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے اور اس کی سمت کا بھی تعین ہو سکتا ہے۔ ہیئت کے تعین کے ساتھ یہ طے کرنا بھی ضروری ہے کہ تحقیقی عمل خالص ہے یا اصولی اور یہ کہ اس تحقیق سے ادب میں کون کون سی نئی سمتیں متعین ہو سکیں گی۔

موضوع کی ہیئت یا تفصیلات کا تعین مندرجہ ذیل اصولوں کے تحت کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ اصل موضوع یا متعلقہ موضوعات کا تجزیہ

۲۔ مطالعے کی حدود اور دائرہ عمل کا تعین

۳۔ موضوع کی تفصیلات

۴۔ (الف) تاریخی پس منظر، قریب یا بعید۔

(ب) گذشتہ تحقیق اور متعلقہ مطالعے کی تفصیل۔

(ج) گذشتہ مطالعے کا تجزیہ۔

(د) مجوزہ طریقہ تحقیق۔

(ہ) ممکنہ نتائج۔

۴۔ موضوع کی اصلیت۔

۵۔ موجودہ طریقہ ہائے تحقیق۔

۶۔ طے شدہ معروضات کا بیان۔

۷۔ متعلقہ شعبے کے لیے کیے گئے کام کا جائزہ۔

۸۔ متعلقہ ذخیرۂ الفاظ کی وضاحت۔

موضوع کا بیان واضح الفاظ میں کیا جانا چاہیے۔ بعض محققین تحقیقی دائرہ عمل کا بیان تو کر دیتے ہیں لیکن موضوع کا واضح بیان نہیں کرتے۔ یہ طریقہ آگے چل کر دشواریاں پیدا کرتا ہے۔

تحقیقی عمل کے طریقہ کار کا تعین

انتخاب موضوع کے بعد تحقیقی عمل کے طریقہ کار کا تعین کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں بعض مقررہ اصولوں پر ہی عمل کیا جاتا ہے۔ مواد کی فراہمی سے قبل طریقہ کار کا تعین کرلیا جانا چاہیے اور اس کے بعد ضروری مواد کی فراہمی کا کام شروع کرنا چاہیے۔ ابتدائی مواد کے مطالعے کے بعد طریقہ کار کی صورت اور زیادہ واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

ایک احتیاط

غلطیوں اور غلط فہمیوں سے بچنے کے لیے یہ بہتر ہوتا ہے کہ محقق اپنے کام کے لیے کئی طریقہ ہائے کار متعین کرلے اور پھر ان کا الگ الگ جائزہ لے اور ان میں سے جو سب سے زیادہ قابل اعتماد طریقہ کار ہو اسے اپنالے۔ حالانکہ اس طرح وقت اور محنت تو کافی صرف ہو جاتی ہے، لیکن ایک مناسب ترین طریقہ کار محقق کے ہاتھ آجاتا ہے۔

ایک مناسب اور مفید طریقہ کار میں یہ خصوصیت ہونی چاہیے کہ وہ متعلقہ تحقیقی عمل کے لیے موثر ہو۔ اس کی روشنی میں اپنے مواد کا صحیح صحیح تجزیہ کیا جاسکے اور اس کو کم سے کم الفاظ میں بیان کیا جاسکے اور اس کا بہ آسانی جائزہ لیا جاسکے۔ اس میں لچک ہونی چاہیے، یعنی اس کو حسب ضرورت استعمال کیا جاسکے۔

مواد کی فراہمی

مواد ہی محقق کے غور و فکر کی بنیاد ہوتا ہے۔ خالص مواد کی شکل خام مال کی طرح ہوتی ہے۔ اسی خام مال سے تجزیہ، درجہ بندی اور تحقیق کے ذریعہ نتائج اور عام اصول وضع کیے جاتے ہیں۔ عام اصولوں کی توضیح کے بعد مواد آئندہ کے لیے اندازِ فکر اور مابقی حقائق کی فراہمی کے لیے محرک بنتا ہے۔

مواد کی فراہمی کے عمل میں مواد کی مختلف اقسام کا جائزہ، اس کے ذرائع حصول کا تعین اور صحیح حقائق پر مبنی مواد کی تلاش ضروری چیزیں ہیں۔ مواد کی فراہمی میں محقق کو بہت زیادہ محتاط رہنا چاہیے۔ اگر موضوع کے اعتبار سے مفید مطلب مواد دستیاب نہیں ہوتا، یا اس کو کسی وجہ سے نظر انداز کر دیا جاتا ہے تو تحقیقی عمل کی تکمیل دشوار ہو جاتی ہے اور اس کے نتائج مشکوک و مشتبہ رہتے ہیں۔

مواد کی فراہمی کے عمل میں صرف حقائق کو جمع کرنا ہی شامل نہیں ہے فراہمی کے ساتھ ساتھ ضروری مواد کے انتخاب کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔

مواد کی فراہمی میں محقق کو ایک جاسوس کے فرائض انجام دینے پڑتے ہیں اور اس کو مکھیوں کے ذریعے شہد کی فراہمی جیسی محنت و مشقت، سے کام لینا پڑتا ہے۔ اپنے مفید مطلب چھوٹے سے چھوٹے نکات اور حقائق کو بھی وہ نظر انداز نہیں کرتا۔ اس کام کے لیے محقق کو دقیق النظر ہونا چاہیے۔

مواد کی اقسام

مواد کئی قسم کا ہوتا ہے۔ اُن میں سے خاص خاص اقسام مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔ انفرادی مواد

اس مواد کے تحت ماضی کے مفروضات، اپنی دلچسپیاں، رجحانات اور اثرات وغیرہ آتے ہیں۔ اس قسم کے مواد میں زیادہ تر انفرادی خیالات و جذبات سے متعلق حقائق ہی آتے ہیں۔ اس لیے ضروری نہیں کہ اس قسم کے مواد کی بنیاد پر سارے محققین ایک ہی نتیجے پر پہنچیں۔ یہ مواد سائنسی مزاج سے عاری ہوتا ہے۔ محقق کی ذہنی کمزوریاں بھی اس قسم کے مواد میں شامل ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا اس قسم کے مواد کی بنیاد پر کی ہوئی تحقیق نامکمل، مشکوک اور مشتبہ ہوتی ہے۔

۲۔ معروضی مواد

اس قسم کے مواد میں کسی خاص فرد کی نہیں، بلکہ مجموعی وسائل کی تلاش کی جاتی ہے۔ اس قسم کا مواد کسی شعبے یا میدان سے تجزیے کی بنیاد پر جمع کیا جاتا ہے۔ اگر کسی تخلیق پر تحقیقی عمل کیا جاتا ہے تو علم الاعداد کے طریقے سے اس کے حقائق کا تجزیہ کر کے نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔ اس قسم کے مواد کی بنیاد پر تحقیق

کر کے سارے محققین ایک ہی نتیجے پر پہنچتے ہیں، کیونکہ اس مواد کا مزاج سائنسی ہوتا ہے۔

۳۔ حلقہ جاتی مواد

دراصل یہ مواد معروضی مواد سے مختلف نہیں ہوتا۔ اس کی فراہمی، تجزیے اور جائزہ کاری کے ذریعے بہ آسانی ہو جاتی ہے۔ یہ مواد بڑی حد تک متعین رہتا ہے۔ حالانکہ اس کا حصول ایک فرد کی سطح پر ہوتا ہے، لیکن مجموعی شکل میں اس مواد کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ مجموعی جائزہ ہی حلقہ جاتی مواد کو سائنسی شکل عطا کرتا ہے۔ یہ طریق کار سائنسی ہے اور اس کے ذریعہ اخذ کیے ہوئے نتائج زیادہ معتبر اور قابل اعتماد ہوتے ہیں۔

۴۔ صفاتی مواد

اس مواد کی تلاش معروضی مواد کی تلاش کے مقابلے میں دشوار ہوتی ہے، لیکن اس میں عمومیت زیادہ ہوتی ہے۔ خیال یہ ہے کہ کسی چیز کی بیرونی ہیئت اس کے اوصاف کے ذریعہ ہی متعین کی جاتی ہے۔ اوصاف کی تلاش کے لیے اگر معروضی طریقہ کار کو اپنایا جائے تو وہ طریقہ کار اور اس سے حاصل ہونے والے نتائج سائنسی ہوں گے۔ اصول یہ ہے کہ اوصاف تک پہنچنے کے لیے اشیاء کے واسطے سے ہی چلنا چاہیے۔ اسی لیے آج کے سائنسی دور میں صفاتی مواد کی اہمیت کم ہوتی جا رہی ہے اور اس کی جگہ معروضی مواد کا ہی استعمال کیا جاتا ہے۔

کتابیات (Bibliography)

محقق کو اپنے موضوع سے متعلق مواد کا علم ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں اکثر شائع ہونے والی فہرست کتب کا مطالعہ مفید ہوتا ہے۔ ان مختلف فہرستوں سے محقق اپنے لیے حوالے کی ایک فہرست تیار کر لیتا ہے۔ اس کے بعد مختلف لائبریریوں کے ذریعہ کتابوں، مخطوطات اور تحقیقی رسائل کی تلاش کی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں محقق کو اپنے شعبے میں کام کرنے والے دیگر محققین سے بھی رابطہ قائم رکھنا چاہیے اور اپنے سے پہلے لکھے جانے والے تحقیقی مقالات کا مطالعہ بھی کرنا چاہیے۔

حصول مواد کے وسائل

لائبریری: مواد کی فراہمی کا اہم ترین ذریعہ لائبریری ہے۔ لائبریری جتنی بڑی اور مکمل ہوگی، تحقیقی کام بھی اتنا ہی مکمل ہوگا۔ اسی لیے لائبریریوں میں زیادہ سے زیادہ مواد جمع کیے جانے کے لیے ہر سال کافی روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ عملی مطالعے کے لیے لائبریریوں کا استعمال ضروری ہوتا ہے۔ مواد کی فراہمی کے سلسلے میں لائبریری ایک مرکزی کردار ادا کرتی ہے۔ لائبریری سے مندرجہ ذیل اقسام کا مواد حاصل ہو سکتا ہے۔

۱۔ دستاویزات: اصل قلمی نقول، دستی تحریروں کی نقول۔

۲۔ موضوع سے متعلق فاضلانہ مطالعہ۔

۳۔ ایسی کتابیں یا مضامین جن میں موضوع سے متعلق اقوال یا نقطہ ہائے نظر پیش کیے گئے ہوں۔

۴۔ دیگر قسم کا ملا جلا مواد۔

۵۔ یونیورسٹیوں میں تحقیقی اسناد کے لیے پیش کیے جانے والے تحقیقی مقالات کی مصدقہ نقول۔

۶۔ حوالے کی کتابیں۔ دیگر قسم کی متعلقہ کتب، تحقیقی مقالات کے مختصر جائزے، فہرست کتب اور محقق کے مفید مطلب دیگر آلات۔

۷۔ نایاب کتابوں کی فوٹو اسٹیٹ نقول۔

لائبریری سے صرف کتابیں ہی دستیاب نہیں ہوتیں، بلکہ وہاں سے دیگر سہولیات بھی مل سکتی ہیں۔ مثلاً محقق کی درخواست پر دوسری لائبریریوں سے نایاب کتابیں منگا کر دی جاتی ہیں۔ فوٹو اسٹیٹ نقل کرانے کی سہولت بھی لائبریری سے مل سکتی ہے۔

حلقۂ عمل

جس طرح محقق اپنا ضروری مواد لائبریری کے ذریعہ حاصل کرتا ہے، اسی طرح بعض تحقیقی مسائل کو حل کرنے کے لیے اسے اپنے حلقۂ عمل سے بھی مواد

فراہم کرنا پڑتا ہے۔مواد کی فراہمی کا یہ ایک جان دار سرچشمہ ہے۔محقق اپنی صلاحیت، سہولت اور ضرورت کے مطابق مواد کی فراہمی کے لیے ایک مخصوص حلقے کا انتخاب کر لیتا ہے۔اس علاقے کے قدرتی یا معاشرتی حالات سے متعلق اعداد و شمار جمع کرنا اس کا مقصد ہوتا ہے۔

تحقیقی رسائل

تحقیقی رسائل میں ماضی اور عصر حاضر کے تحقیقی کاموں کی تفصیل پیش کی جاتی ہے اور فاضل علماء کے مضامین بھی شائع ہوتے ہیں۔ان میں تحقیقی موضوعات سے متعلق مواد کے بارے میں معلومات بھی پیش کی جاتی ہیں۔قلمی کتابوں کا تذکرہ بھی ہوتا ہے اور مختلف مقالات پر مختصر تبصرے بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔

بنیادی اور ثانوی وسائل

کسی وسیلے کے براہ راست استعمال کو بنیادی کہا جاتا ہے۔اگر کسی کتاب یا مضمون کا حوالہ دینا ہے تو اس کا براہ راست مطالعہ کرنا چاہیے۔اگر کسی دیگر محقق نے اس کتاب کے حقائق کو اپنے مقالے میں درج کیا ہے اور اس مقالے سے اس متن کو حاصل کیا جائے تو اسے ثانوی وسیلہ کہا جائے گا۔اس طرح حاصل کیا ہوا متن مشکوک یا غلط بھی ہو سکتا ہے، اس لیے جہاں تک ممکن ہو مواد کو بنیادی وسیلے سے ہی حاصل کیا جائے۔دیگر مقالات کے مطالعے سے محقق کو کسی متن کا سرچشمہ معلوم ہو جاتا ہے۔

ایک کامیاب محقق کے لیے اپنے موضوع سے متعلق مواد کی فراہمی کے بنیادی وسائل کا علم ہونا انتہائی ضروری ہے۔اس کو دوسرے محققین کے ذریعے استعمال کیے ہوئے حقائق کو دوسرے لفظوں میں بیان کر دینے کی علت سے بچنا چاہیے۔بنیادی وسائل سے مواد کی فراہمی کے دوران ایسا مواد بھی محقق کے ہاتھ لگ سکتا ہے جس کو ابھی تک کسی دوسرے محقق نے استعمال ہی نہ کیا ہو۔اس طرح نئے حقائق کو منظر عام پر لانے سے محقق کی وقعت و عظمت میں اضافہ ہوتا ہے۔

مواد کی درجہ بندی

مواد کی فراہمی کے بعد اس کے درجہ بندی کا مرحلہ آتا ہے۔درجہ بندی مواد یکساں اور مختلف ہونے کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔درجہ بندی کر لینے سے غور و فکر کا عمل آسان ہو جاتا ہے۔اس طرح وقت اور محنت کی بچت بھی ہوتی ہے۔نیز ذہنی الجھن بھی کم ہو جاتی ہے۔ایک فکری یکسانی اور ترتیب اس طرح قائم ہو جاتی ہے جو آئندہ مطالعے میں معاون ہوتی ہے۔جمع شدہ مواد کی درجہ بندی اپنے موضوع کے مختلف حصوں یا شعبوں کی بنیاد پر کر لینا چاہیے۔درجہ بندی مواد کے مختلف اجزا کی یکسانی کی بنیاد پر ہونی چاہیے۔

درجہ بندی سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ مواد کے ان اجزاء کا پتہ چل جاتا ہے، جن کا تعلق مواد کے کسی بڑے حصے سے نہیں ہوتا۔وہ اپنی فطرت کے اعتبار سے یکہ و تنہا نظر آتے ہیں۔ان اجزاء کو قابل استعمال بنانے کے لیے یا تو مزید مواد فراہم کرنا ہوتا ہے یا ان اجزاء کے بارے میں الگ ہی سے تحقیق کرنی پڑتی ہے۔

مواد کا جائزہ

درجہ بندی کے ساتھ ساتھ مواد کے تجزیے کا مرحلہ آتا ہے۔موضوع تحقیق اور اس کے طریقہ کار کے مطابق ہی مواد کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔اس عمل میں بعض غلطیوں کا امکان رہتا ہے، اس لیے مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھنا چاہیے:

۱۔ مواد کے تجزیے کے وقت محقق کو اپنا موضوع واضح شکل میں اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔

۲۔ موضوع کے مختلف شعبوں کے ساتھ مواد کا تعلق رکھنے میں کبھی غلطی نہیں کرنی چاہیے۔

۳۔ مواد کی حدود پر محقق کو اپنی توجہ ضرور قائم رکھنی چاہیے۔ممکن ہے کہ موضوع کے کسی خاص حصے کی تائید میں ضروری مواد حاصل نہ ہو سکا، تو تحقیقی عمل میں موضوع کا وہ شعبہ کمزور رہ جائے گا۔اس لیے تجزیہ کرتے وقت اگر ان حدود کا پتا چل جائے تو اس کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

طریقہ کار

تحقیقی عمل کا اہم ترین حصہ مواد کی فراہمی ہے، جو مختلف لائبریریوں اور اپنے حلقۂ عمل سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ محقق کو پہلے اپنی ضرورت کے مطابق مواد کا انتخاب کرنا پڑتا ہے اور اس کے لیے طریقہ انتخاب متعین کرنا پڑتا ہے۔ محقق کو لائبریری کے استعمال اور اپنے حلقہ جاتی کام میں ماہر ہونا چاہیے۔ ضروری مواد کو کم سے کم محنت کے ساتھ حاصل کر لینا بہت ضروری ہے۔ جمع شدہ مواد کو لکھے جانے کا طریقہ بھی اہم ہے۔

لائبریری کا استعمال

تحقیقی عمل کی کامیابی اور تکمیل کا انحصار لائبریری کے مواد کی وسعت اور اس کی ہمہ گیری پر ہوتا ہے۔ اس لیے محقق کو چاہیے کہ وہ لائبریری کے طریقۂ استعمال سے پوری طرح واقف ہو۔ اس طرح اس کے وقت اور محنت کی بچت ہوتی ہے۔

متعلقہ ادب کا جائزہ

محقق یہ جانتا ہے کہ وہ خلا میں کام نہیں کر رہا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس کے پسندیدہ موضوع کے شعبے میں اس موضوع سے متعلق مختلف مسائل پر کافی کام ہو چکا ہے۔ اس سابقہ کام کو آگے بڑھانا یا اس کی توسیع کرنا ہی اس کے تحقیقی عمل کا مقصد ہوتا ہے اسی لیے متعلقہ ادب کا جائزہ تحقیقی عمل کا ایک لازمی جزو ہے۔

متعلقہ ادب کا مکمل جائزہ لیا جانا چاہیے۔ اگر اس میں سے کوئی اہم کڑی چھوٹ جاتی ہے تو تحقیقی عمل مکمل طور پر قابلِ اطمینان نہیں ہو سکتا۔ اس تجزیے سے دو فائدے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ محقق اپنے موضوع کی حدود سے واقف ہو جاتا ہے، دوسرے یہ کہ وہ کام کی غیر ضروری تکرار سے بچ جاتا ہے۔ اسے یہ بھی واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے تحقیقی عمل کی اہمیت اور مقام کیا ہے اور اس کے علم میں اضافہ ہوتا ہے یہ تجزیہ تحقیق کے ہر ایک مرحلے میں محقق کی مدد کرتا ہے اور اس کے لیے لائبریریوں کا استعمال سب سے زیادہ ضروری ہوتا ہے۔

متعلقہ ادب کا جائزہ لائبریری کے Catalogue کے ذریعہ لیا جا سکتا ہے جس میں شائع شدہ اور غیر شائع شدہ کتابوں، متعلقہ مضامین، پیش کردہ اور منظور شدہ تحقیقی مقالات (جو ابھی تک شائع نہ ہوئے ہوں) وغیرہ کا اندراج مختلف فہرستوں کے تحت رہتا ہے۔ پہلے محقق اپنی پڑھی ہوئی کتابوں کی ایک فہرست بناتا ہے۔ بعد ازاں لائبریری کی فہرستوں کی مدد سے اپنی فہرست کو اور وسیع کر لیتا ہے۔ اس کے بعد وہ لائبریری کے شعبۂ رسالہ جات کی مدد سے اپنے لیے مفید مطلب مضامین کی ایک فہرست بنا لیتا ہے۔ اس کے بعد وہ ایک لائبریری کی مدد سے دوسری لائبریری سے مزید مواد فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

لائبریری کا استعمال

محقق کو اس بات کا پورا پورا علم ہونا چاہیے کہ اسے اپنے کام کی کتابیں لائبریری کے کون کون سے شعبے میں مل سکتی ہیں۔ تبھی وہ آسانی کے ساتھ اپنا مطلوبہ مواد فراہم کر سکتا ہے۔ اس کے لیے اس کو لائبریری کی تنظیم اور اس کے طریقہ کار سے پوری واقفیت ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ ضرورت پڑنے پر لائبریری کا تعاون بھی حاصل کر سکتا ہے۔ لائبریری کی تنظیم اور طریقہ کار تقریباً سب جگہ یکساں ہوتا ہے۔

لائبریری سے کتابیں حاصل کر لینے کے بعد ان کا تفصیلی مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ مطالعہ کے دوران کتاب کے اہم اجزاء کو ساتھ ساتھ نقل کرتے جانا چاہیے۔ کتابوں سے ضروری حوالے جمع کرنا بھی ایک فن ہے۔ محقق کو اس فن میں ماہر ہونا چاہیے۔ حوالے زیادہ تر، اہمیت کے حامل اور مختصر ہونے چاہییں۔ غیر ضروری حوالے جمع کرنا وقت اور محنت کی بربادی ہے۔

کارڈوں پر فہرست کتب

لائبریری میں تین قسم کا مواد رہتا ہے۔ کتابیں، رسائل اور متفرق مواد (مضامین، قلمی کتابیں اور نقشہ جات وغیرہ) ان میں سب سے زیادہ تعداد شائع شدہ کتابوں کی ہوتی ہے۔ کتابوں کی درجہ بندی ان کے موضوعات کے اعتبار سے کی جاتی ہے۔ ایک کتاب عام طور پر صرف ایک ہی موضوع پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس لیے محقق کتاب کو پہلی نظر میں ہی دیکھ کر یہ طے کر لیتا ہے کہ اسے وہ پوری کتاب پڑھنی ہے یا اس کے بعض اجزا ہی اس کے مفید مطلب ہیں۔ رسائل کا مواد مختلف موضوعات پر مبنی ہوتا ہے، لہٰذا ان کی فہرست مضامین دیکھ کر یہ پتا چلتا ہے کہ اس میں سے کون کون سے مضامین کام کے ہیں۔ رسائل کو عام طور پر اشاعت کی ترتیب سے ہی رکھا جاتا ہے۔ انھیں مضامین کے اعتبار سے بھی مرتب کیا جا سکتا ہے۔ متفرق مواد میں سے بھی اسی طرح انتخاب کیا جاتا ہے۔ پرانے رسائل کی مجلد فائلیں بھی رکھی رہتی ہیں۔ ان کو صرف لائبریری کے اندر بیٹھ کر ہی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

جدید انداز کی لائبریریوں میں کھلی ہوئی الماریوں کے اندر کتابیں اور رسائل رکھے جاتے ہیں۔محقق پوری آزادی کے ساتھ ان الماریوں تک جاسکتا ہے۔

ان سب باتوں کے علاوہ کارڈوں پر کتابوں کی فہرست بنانا واقعی بہت کارآمد طریقہ ہے۔ ہر ایک کارڈ پر کتاب کا نام، مصنف کا نام، موضوع اور لائبریری کا اشاراتی نمبر لکھا رہتا ہے۔اشاراتی نمبر سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں کتاب لائبریری میں کس مقام پر رکھی ہوئی ہے۔

ہر کتاب سے متعلق تین کارڈ بنائے جاتے ہیں۔مصنف کے اعتبار سے، کتاب کے نام کے اعتبار سے اور موضوع کے اعتبار سے۔ یہ کارڈ عام طور پر پانچ انچ لمبے اور تین انچ چوڑے ہوتے ہیں۔لائبریری کی الماریوں میں ان کارڈوں کو حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا جاتا ہے۔ ہر ایک کارڈ پر تفصیلات تو ایک ہی رہتی ہیں، لیکن مختلف انداز کے کارڈوں پر ان تفصیلات کی ترتیب بدل جاتی ہے۔ ہر ایک کارڈ پر مندرجہ ذیل تفصیلات درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ مصنف کا نام۔

۲۔ کتاب کا نام۔

۳۔ اشاعت، جلد نمبر، مقام، پبلشر کا نام اور اشاعت کی تاریخ۔

۴۔ دیگر معلومات، صفحات کی تعداد وغیرہ۔

۵۔ اشاراتی نمبر۔

۶۔ کال نمبر۔

ہر ایک لائبریری اپنا کال نمبر مختلف بھی رکھتی ہے۔ یہ کارڈ کے اوپر کی جانب بائیں طرف کو درج کیا جاتا ہے۔اگر کوئی کتاب کئی مصنفین نے الگ الگ لکھی ہے تو اس کتاب کے مدون کا نام اس کے مصنف کے کارڈ پر ملتا ہے، ورنہ معاون مصنفین کے اعتبار سے الگ الگ کارڈ بھی بنائے جاتے ہیں۔

موضوع کے اعتبار سے بنائے ہوئے کارڈوں کی درجہ بندی ایک سے زائد مقامات پر بھی ہو سکتی ہے۔موضوع کا اظہار کارڈ کے اوپر کے حصے میں عموماً سرخ روشنائی میں کیا جاتا ہے۔موضوعات، نظم، ناول اور مضامین وغیرہ ہو سکتے ہیں۔ کتاب کے نام والے کارڈ پر کتاب کا نام، مصنف کے نام کے اوپر لکھا جاتا ہے۔ مصنف کے نام کے اعتبار سے بنائے ہوئے کارڈ، کتابوں کے نام اور موضوع کے اعتبار سے بنائے ہوئے کارڈوں سے پہلے رکھے جاتے ہیں۔

درجہ بندی کا اصول

لائبریری کا صحیح استعمال کرنے کے لیے درجہ بندی کے اصول کا علم ہونا ضروری ہے۔اس اصول کو جان لینے کے بعد یہ بات آسانی سے معلوم ہو سکتی ہے کہ فلاں کتاب کس مقام پر رکھی ہوئی ہے۔ زیادہ تر لائبریریوں میں ڈیوئی ڈیسیمل سسٹم (Dewey Decimal System) یا لائبریری کانگریس کی درجہ بندی کے طریقوں کو اپنایا جاتا ہے، انھی کی بنیاد پر کارڈوں پر اشاراتی نمبر لکھے جاتے ہیں۔ یہ طریقے مندرجہ ذیل ہیں۔

ڈیوئی ڈیسیمل سسٹم

اس طریقے کے مطابق کتابوں کو دس حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۰۰۰	عام کتابیں
۱۰۰	فلسفہ
۲۰۰	مذہب
۳۰۰	علم معاشرت
۴۰۰	لسانیات
۵۰۰	سائنس
۶۰۰	معاشی فنون
۷۰۰	فنون لطیفہ

۸۰۰	ادب
۹۰۰	تاریخ

لائبریری کانگریس کی درجہ بندی

اس طریقہ کار میں موضوعات کی شاخوں اور ذیلی شاخوں کا تعین زیادہ وسعت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اسی لیے یہ طریقہ کار زیادہ مفید ہے۔ اس میں کتابوں کی تقسیم بیس عنوانات کے تحت کی جاتی ہے۔ بڑی لائبریریوں میں یہ طریقہ کار زیادہ مفید سمجھا جاتا ہے اس کی تقسیم حسب ذیل انداز میں کی جاتی ہے۔

A	عام کتابیں
B	فلسفہ اور مذہب
C	عام تواریخ
D	غیر ملکی تواریخ
E&F	امریکی تواریخ (ملکی تواریخ)
G	جغرافیہ اور طبعی علوم
H	علم معاشرت
J	سیاست
K	قانون
L	تعلیمات
M	موسیقی
N	فنون لطیفہ
P	ادب اور زبان
Q	سائنس
R	علم الادویہ
S	زراعت
T	تکنیکی علوم
U	فوجی قوانین
V	علوم بحریہ
Z	لائبریری سائنس اور حوالے کی کتابیں

مندرجہ بالا درجہ بندی کے علاوہ لائبریری میں کسی کتاب کی درجہ بندی اس کے مخصوص موضوع کے اعتبار سے بھی کی جاتی ہے۔ اس کے مطابق ''کلاس نمبر'' دیا جاتا ہے۔ کتاب پر مصنف کا نمبر بھی رہتا ہے۔ مثلاً S/2/o۔ اس طرح عام موضوع یا خصوصی موضوع کا اظہار کرنے والا کلاس نمبر اور اس کے تحت مصنف کا نمبر بھی کارڈ پر لکھا رہتا ہے۔ یہ تینوں اشاراتی اعداد لائبریری میں موجود کوئی سی بھی دو کتابوں پر کبھی یکساں نہیں ہو سکتے۔ ان اعداد کی مدد سے کتاب کے رکھے جانے کا مقام آسانی سے معلوم ہو جاتا ہے۔

رسائل

لائبریریوں میں رسائل کے لیے الگ کمرہ یا شعبہ ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ سارے رسائل کے سارے شمارے کسی تحقیقی موضوع کے پیش نظر اہم

ہوں۔ رسائل کے مختلف شماروں میں شائع شدہ چند مضامین بھی کام کے ہوسکتے ہیں۔ عام طور پر لائبریریوں میں رسائل کے مضامین اوران کے موضوعات کی فہرست تیار نہیں کی جاتی۔ ان کے کارڈ بھی نہیں بنائے جاتے۔ محقق کو خود ہی رسائل کی فہرستِ مضامین کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ بعض رسائل کے آخر میں اپنے سال بھر میں شائع شدہ مضامین کی فہرست شائع بھی کر دیتے ہیں۔ رسائل کی مجلد سالانہ فائلوں کے شروع میں یا آخر میں یہ فہرستیں مل سکتی ہیں۔ ان کی مدد سے اپنے مفید مطلب مواد کی فہرست بنائی جاسکتی ہے۔

اگر رسائل میں شائع شدہ کچھ مضامین بہت ضروری ہیں تو ان کی فوٹو کاپیاں کرائی جاسکتی ہیں یا ان کو ٹائپ کرایا جاسکتا ہے۔ لائبریریوں میں معاوضہ ادا کرنے پر اس قسم کی سہولیات دستیاب ہوسکتی ہیں۔ رسائل کی اہمیت کتابوں کے مقابلے میں اس لیے زیادہ ہوتی ہے کہ ان کے ذریعے جدید ترین معلومات حاصل ہوسکتی ہیں۔

لائبریریوں کے درمیان کتابوں کا قرض

جو مواد ایک لائبریری میں دستیاب نہیں ہوتا، اس کو محقق کی درخواست پر یا تحقیقی عمل کی ضرورت کے مطابق وہ لائبریری، دوسری لائبریریوں سے ان کتابوں کو ادھار لے سکتی ہے۔ اس سہولت کی معلومات بھی محقق کے لیے ضروری ہے۔ ادھار کا یہ سلسلہ محقق اور دیگر لائبریریوں کے درمیان نہیں بلکہ دو لائبریریوں کے درمیان ہوتا ہے۔ صرف وہی کتابیں عاریتاً حاصل کی جاتی ہیں جو بازار میں دستیاب نہیں ہوسکتیں۔ ایسی کتابیں عاریتاً بھی نہیں مل سکتیں جو بالکل نایاب یا انتہائی زبردست اہمیت کی حامل ہوں۔ ان کتابوں کے لیے براہِ راست ان لائبریریوں میں ہی جانا پڑتا ہے۔

بعض لائبریریاں اپنی ساری موجودہ کتابوں یا ممکنہ طور پر نئی آنے والی کتابوں کی فہرستیں شائع بھی کرادیتی ہیں۔

ضرورت پڑنے پر محقق دوسری لائبریریوں سے خط و کتابت کر کے بھی معلومات حاصل کرسکتا ہے۔

مطالعے کا طریقہ

آج کل ہر ایک موضوع تحقیق کے بارے میں مواد بہت بڑی مقدار میں ملتا ہے۔ سینکڑوں مضامین اور کتابیں شائع ہوتی چلی جارہی ہیں۔ تحقیقی عمل کا تقاضا یہ ہے کہ محقق اس سارے مواد کا مطالعہ اور تجزیہ کرے۔ اس کے لیے تیز مطالعہ کرنے کی عادت بہت ضروری ہے۔ ہوشیار محقق اپنی دقیق النظری سے تیز تیز بڑھتے ہوئے بھی اس کے اصل مفہوم کو نظر انداز نہیں ہونے دیتے۔

محقق زیرِ مطالعہ کتاب کے ہر ایک صفحے پر نظر دوڑا کر اس کے اہم ترین اجزا کی شناخت کر کے اس کے بھی اہم جملوں کا مطالعہ کرتا ہے اور غیر ضروری مواد کو وہ چھوڑ دیتا ہے۔

تیز تیز پڑھنے کی عادت مشق سے حاصل کی جاسکتی ہے

اگر زیرِ مطالعہ مواد اس زبان میں ہے، جسے محقق نہیں جانتا، جیسے فرانسیسی، جرمن یا روسی وغیرہ، تو پھر دو ہی راستے ہیں، یا تو محقق ان زبانوں کو سیکھے یا ان کے قابلِ اعتماد تراجم کا سہارا لے۔ بہتر تو یہی ہوتا ہے کہ محقق اس زبان کا علم اپنی ضرورت کے مطابق حاصل کرے۔ ادب کے محققین کے لیے انگریزی کے علاوہ فرانسیسی زبان سے واقفیت فائدہ مند ہوسکتی ہے۔

حوالے جمع کرنا

جب محقق اپنا سارا ضروری مواد فراہم کرلیتا ہے تو حوالے جمع کرنے کا مرحلہ آتا ہے۔ مختلف علما کے اقوال، حقائق اور دیگر ضروری معلومات کے حوالوں کو احاطۂ تحریر میں لے آنا ضروری ہوتا ہے۔ حوالے جمع کرتے وقت محقق یہ فیصلہ نہیں کرسکتا کہ ان میں سے کون سے حوالے زیادہ اہم ہوں گے، کون سے کم اور کون سے حوالے چھوڑ دینا پڑیں گے۔ اس لیے اس کو زیادہ سے زیادہ حوالے جمع کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کم حوالے جمع کرنے میں اس کا نقصان ہوسکتا ہے۔ اگر محقق کے جمع کردہ حوالے مکمل اور موضوع سے متعلق ہیں، تو وہ ان کا استعمال کسی وقت بھی کرسکتا ہے۔

حوالے جمع کرتے وقت یہ امکان رہتا ہے کہ محقق اپنے راستے سے بھٹک جائے۔ اسے چاہیے کہ وہ اپنے موضوع کے متعلق ہی حوالے جمع کرے۔ اس

کے لاشعور میں جذباتی پروگرام اور دیگر دلچسپیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ جب دوران مطالعہ ان دلچسپیوں اور پروگراموں سے متعلق مواد سامنے آ جاتا ہے تو وہ اس کو بھی جمع کر لینے کی طمع میں آ سکتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ وہ اس مواد کو بعد میں استعمال کرے گا۔ لیکن دراصل اس کا یہ عمل اپنے راستے سے بھٹک جانے کے مترادف ہے۔

حوالے جمع کرنے کے لیے مجلد کاپیاں یا رجسٹر مفید نہیں ہوتے۔ حوالے صرف کھلے کاغذوں پر جمع کرنے چاہییں۔ ایک کاغذ پر صرف ایک ہی عنوان سے متعلق حوالے تحریر کرنا مفید ہوتا ہے۔ الگ الگ کاغذوں پر لکھے ہوئے حوالوں کی درجہ بندی آسان ہوتی ہے۔ ان کاغذوں کو اپنے تحقیقی عمل کے مختلف ابواب کے مطابق الگ الگ فائلوں میں جمع کرتے رہنا چاہیے۔

آج کل حوالے جمع کرنے کے لیے کاغذ کے چھوٹے ٹکڑوں، سلپوں یا کارڈوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ان کو استعمال میں لانا اور الگ الگ فائلوں میں جمع کرنا آسان ہوتا ہے۔ کچھ لوگ کاپی کے ناپ کے کاغذ استعمال کرتے ہیں۔ بہر حال یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ وہ سارے کاغذ ایک ہی ناپ کے ہوں۔

اس بات کا خیال رہنا چاہیے کہ جو حوالے جمع کیے جائیں وہ مکمل اور مفید مطلب ہوں۔ اگر حوالے نامکمل ہیں تو انھیں ایک بار پھر جمع کرنے کے لیے محقق کو دوبارہ محنت کرنی پڑے گی۔

حوالے لکھنے سے پہلے ایک کارڈ پر اس کتاب کے بارے میں تفصیلات بھی لکھ لینی چاہییں، جس سے وہ حوالے لیے گئے ہیں۔ مصنف کا پورا نام، کتاب کا پورا نام، اشاعت کا مقام، اور وقت، نیز دیگر ضروری معلومات، اور پھر اس کتاب سے لیے ہوئے سارے حوالوں کے کارڈ اسی کارڈ کے ساتھ منسلک کرتے رہنا چاہیے۔ یہ ضروری ہے کہ آگے کے سارے کارڈوں پر لکھے ہوئے حوالوں کے ساتھ اس کتاب کا متعلقہ صفحہ نمبر بھی درج کر لیا جائے۔

حوالے جمع کرتے وقت اپنے مقالے کے مختلف عنوانات یا ذیلی عنوانات کے تحت حوالے الگ الگ جمع کرنا چاہییں۔ بہتر تو یہ ہے کہ محقق اپنے ماخذ کو پڑھے اور پھر اس کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کرے۔ کہیں کہیں مصنف کے الفاظ کو بجنسہ نقل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہاں اس قسم کے اقتباسات کو واوین کے اندر تحریر کر لینا چاہیے۔

حلقہ جاتی کام

ادب کے بعض شعبوں مثلاً عوامی ادب اور لسانیات کے موضوع پر کی جانے والی تحقیق میں حلقہ جاتی کام کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں محقق کو اپنے حلقے سے پوری طرح واقفیت رکھنے والے کسی ایک شخص کے تعاون کی ضرورت پڑتی ہے، جو اس کے مفید مطلب مواد فراہم کرنے میں مدد دے سکتا ہو۔ اس کام کے لیے محقق کو خود اپنے حلقے میں جانا بھی پڑتا ہے اور وہ اپنے ''معاون'' یا ''اطلاع کار'' کو اپنے پاس بلا بھی سکتا ہے، تاہم اس قسم کی تحقیق میں حلقہ جاتی کام کی اہمیت ''اندرون خانہ کام'' (Table Work) سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔

لسانیاتی تحقیق میں حلقہ جاتی کام کی اہمیت

لسانیاتی تحقیق کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ انسانی پہلو اور نفسیاتی پہلو۔

انسانی پہلو

انسانی پہلو کا تعلق محقق اور عوام سے ہوتا ہے۔ عوام کی نمائندگی ''معاون'' یا اطلاع کار کرتا ہے۔ محقق کو اپنے مقالے کی تیاری کے لیے اپنے مخصوص حلقے کے لسانی حالات کا پورا پورا جائزہ لینا ہوتا ہے اس کام کے لیے اس کو اپنے اطلاع کار سے قریبی رابطہ قائم کرنا پڑتا ہے اور اس کام کے لیے اس کو پوری پوری مہارت ہونی چاہیے کہ وہ اپنے مفید مطلب مواد کو کس کس ذریعہ سے اور کس طرح حاصل کر سکتا ہے۔ اگر وہ اس سلسلے میں پوری واقفیت اور مہارت نہیں رکھتا تو اس کے وقت اور محنت کی بربادی ہوتی ہے۔

محقق جس زبان کے بارے میں تحقیق کر رہا ہے اس کے مختلف اسالیب اور بولیوں کا مطالعہ اس کو اصولی انداز میں کرنا چاہیے۔ اگر کسی حلقے کی مخصوص قلمی کتابوں کے بارے میں تحقیق کرنی ہے تو محقق کو اس مخصوص رسم الخط سے پوری پوری واقفیت ہونی چاہیے۔

اسی طرح عوامی ادب کے تجزیے کے لیے بھی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔

عوامی تہذیب سے واقفیت

جائزہ کار کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے مخصوص حلقے کی تہذیب سے بھی واقفیت رکھتا ہو۔ اس طرح اپنے اطلاع کار یا معاون کے ساتھ اس کے تعلقات بھی مضبوط ہوتے ہیں اور مواد کا تعین کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ اگر کسی مذہبی فرقے سے متعلق قلمی کتابوں کا جائزہ لینا ہے تو اس مذہب کے بنیادی اصولوں کی واقفیت بھی اسے ہونی چاہیے۔ عوامی ادب کے بارے میں تحقیق کرنے والا اگر بعض ذاتوں کے متعلق حقائق، رسم ورواج اور ان کے غلط عقائد سے بھی کچھ دلچسپی رکھتا ہو تو اس کے لیے مفید رہتا ہے۔ محقق کو اسی بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ وہ جن لوگوں کے درمیان رہ کر کام کر رہا ہے، ان کے ساتھ ان کے مذہبی عقائد اور رسم ورواج کے بارے میں کسی قسم کی بحث نہ کرے۔

نفسیاتی پہلو

حلقہ جاتی کام کرنے کے لیے محقق کے لیے مندرجہ ذیل نفسیاتی اوصاف ہونے چاہییں۔

۱۔ ہر قسم کے لوگوں کے ساتھ کام کرنے کی مہارت۔ اسے اجنبی کو شناسا بنا لینے کا فن آتا ہو۔

۲۔ جلد ہی دوست بنا لینے والا، ملنسار، نرم مزاج، ہنس مکھ، سنجیدہ فطرت اور اطلاع کار سے آسانی کے ساتھ مواد حاصل کرنے والا جائزہ کار ہی کامیاب سمجھا جاتا ہے۔

۳۔ اس کی قوت حافظہ بہت اچھی ہونی چاہیے۔

۴۔ تجربہ کار جائزہ کار اپنے تجربے سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اپنے حاصل شدہ تجربے سے وہ اپنے کام کی مزید اصطلاح کرتا رہتا ہے۔

۵۔ کسی بات کو سن کر فوراً فیصلہ کر لینا مناسب نہیں ہے اور اپنے فیصلے پر اصرار کرنا بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔

مختصر یہ کہ جائزہ کار میں وہ سارے اوصاف ہونے چاہییں جن کے ذریعے وہ اپنے معاون یا اطلاع کار کے ساتھ پرخلوص تعلقات پیدا کر سکے۔

دیگر ضروری ہدایات

محقق کو اپنے حلقے کے کسی بااثر آدمی سے تعلقات قائم کرنے چاہییں تاکہ اس علاقے میں اس کی ہردلعزیزی بڑھ سکے اور اسے اپنے مفید مطلب معاون کار یا اطلاع کار بھی حاصل ہو سکیں۔ معاون کا مطلب یہاں یہ نہیں ہے کہ وہ شخص محقق کے تحقیقی کام میں کچھ مدد کر سکے گا، بلکہ وہ صرف اس کے تحقیقی عمل کے متعلق ضروری اطلاعات اس کو فراہم کرتا رہے گا۔ جو باتیں اس کو اپنے حلقے میں کسی تحریری مآخذ سے حاصل نہیں ہو سکتیں، وہ انھیں وہاں کے مقامی لوگوں کے علم سینہ کے ذریعے حاصل کر سکے گا۔

اس سلسلے میں محقق کو اپنی مدد کے لیے معاونین یا اطلاع کاروں کا انتخاب کرنا پڑے گا جو قوم، مذہب، عمر، جنس اور پیشے کے اعتبار سے مختلف ہوں۔

تحقیقی عمل میں اپنے مفید مطلب اطلاعات حاصل کرنے کے لیے خواتین سے کام لینا ذرا دشوار ہوتا ہے۔ لیکن لسانیات یا کسی مخصوص حلقے کی زبان کے بارے میں مکمل تحقیق کرنے کے لیے جنسِ لطیف میں سے بھی کسی فرد کی خدمات حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔

اپنے کام کے لیے محقق، اطلاع کاروں کے گھر جا سکتا ہے، یا انھیں اپنی جائے قیام پر، یا کسی عوامی مقام پر بلا کر ان سے بات چیت کر سکتا ہے۔

محقق کو چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو وہ اپنے معاون کو غیر فطری ماحول سے بچائے ورنہ اس کی فراہم کردہ اطلاعات غیر فطری ہو سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر اگر معاون سے کہا جائے کہ وہ ٹیپ ریکارڈ کے سامنے بولے تو اس کے لہجے اور اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ میں خود بخود ایک غیر فطری انداز ایسا ہو جائے گا۔ اگر اپنی سہولت کے لیے ٹیپ ریکارڈ استعمال کرنا ہی ہے تو اس انداز میں کیا جائے کہ معاون کو پتہ ہی نہ چلے کہ اس کی آواز ریکارڈ کی جا رہی ہے۔

معاون کے متعلق ضروری معلومات (نام، مقام، عمر، جنس، پیشہ وغیرہ) ایک کاغذ پر واضح انداز میں لکھ لینا چاہیے۔

عوامی ادب کے محقق کو چاہیے کہ وہ:

۱۔ متعلقہ گاؤں کے ہر ایک تیوہار، میلے یا تقریب میں بلاتکلف ان لوگوں کی طرح سے ہی شامل ہوا کرے۔

۲۔ ہر ایک موقع پر انتہائی باریک بینی کے ساتھ ان کے سارے طور طریق کو سمجھے اور انھیں لکھتا جائے۔

۳۔ وہاں پر جو بات سمجھ میں نہ آئے اُسے واقف کار لوگوں کی مدد سے سمجھ لے۔

۴۔ جس شخص سے بھی اسے کسی طرح کا ادب حاصل ہو سکتا ہو اس کا اعتماد حاصل کرے۔

۵۔ ایسے لوگ اکثر کسی نشہ آور چیز کے عادی ہوتے ہیں انھیں ان کا مطلوبہ نشہ استعمال کرا کے ان سے اپنا کام نکالا جا سکتا ہے اور وہ بخوشی اپنا تعاون دینے کو تیار ہو جائیں گے۔

۶۔ کبھی کبھی کسی شخص کو کچھ پیسے بھی دینے کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔

۷۔ دیہاتی گیتوں کو جمع کرنے کے لیے پست اقوام کے لوگوں سے رابطہ قائم کرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔

۸۔ دیہات کے طلبہ میں کہانی کہنے کا مقابلہ یا اسکاؤٹ کے کیمپ فائر منعقد کرانے سے بہت سی علاقائی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

محقق کے تحقیقی کام کے جتنے شعبے ہیں ان کے اعتبار سے اسے ہر ایک شعبے کے لیے ایک الگ معاون یا اطلاع کار کی ضرورت ہوگی۔ مقامی بولیوں اور سماجی لسانیات کے محققین کو ایک سے زیادہ معاونین کی ضرورت ہر حال میں پڑتی ہے۔

ایک معاون یا اطلاع کار میں مندرجہ ذیل اوصاف ہونے چاہییں:

۱۔ اس علاقے کی زبان، اس کی اول زبان یا مادری زبان ہونی چاہیے۔

۲۔ اس کا تلفظ صحیح اور فطری ہونا چاہیے۔

۳۔ اس کو گفتگو کرنے، کہانی سننے، محاوروں کا استعمال کرنے اور بولنے میں ماہر ہونا چاہیے۔

۴۔ وہ ہمیشہ سے اسی علاقے کا رہنے والا ہو اور درمیان میں ایک طویل مدت تک کسی بیرونی مقام پر نہ رہا ہو۔

۵۔ اس کے پاس معاون کے فرائض انجام دینے یا اطلاعات فراہم کرنے کے لیے مناسب وقت اور فرصت ہونی چاہیے۔

۶۔ اس کو ایک ذمے دار شخص ہونا چاہیے۔

معاوضہ

جب اطلاع کار کو روپے پیسے، سامان یا کسی طرح کی خدمت کی شکل میں اپنی خدمات کا معاوضہ ملتا ہے تو وہ بخوشی اپنے فرائض کو انجام دیتا ہے۔ کبھی کبھی اطلاع کار کو اپنے کام میں لطف آنے لگتا ہے اور محقق سے اس کی دوستی ہو جاتی ہے، تو ایسی شکل میں وہ کسی قسم کا معاوضہ لینا قبول نہیں کرتا۔

بعض مرتبہ اس حلقے کے لوگ محقق کی طرف سے مشکوک ہو جاتے ہیں اور وہ کسی قسم کا معاوضہ دینے کے باوجود اس کو کوئی اطلاع فراہم کرنا نہیں چاہتے۔ بعض علاقوں کے جاہل اور کم تعلیم یافتہ لوگ محقق کو حکومت کا نمائندہ یا جاسوس فرض کر لیتے ہیں اور اس کی سرگرمیوں کو اپنے حق میں خواہ مخواہ نقصان دہ تصور کرنے لگتے ہیں۔

بعض اطلاع کار بظاہر کسی قسم کا معاوضہ لینا نہیں چاہتے۔ ایسی صورت میں ان کو کوئی سامان یا قابل استعمال اشیا تحفے میں دے دینی چاہییں۔

اطلاع کار کی تربیت

جو شخص اطلاع کاری کے کام میں پہلی مرتبہ لیا گیا ہو، اس کو اس کام کی تربیت دیے جانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کام محقق کا ہے کہ وہ اپنے کام کو شروع کرنے سے قبل ہی اپنے اطلاع کار کو یہ اچھی طرح سمجھا دے کہ اسے کیا کرنا ہے اور اس میں اس کام کے لیے دلچسپی پیدا کرے اور اس کو اپنے ساتھ تعاون کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر لے۔ اس کے ذہن کو اس قابل بنائے کہ وہ اس موضوع کے بارے میں خود محقق کے انداز میں سوچ سکے۔ وہ اطلاع کار کو اپنے کام کا مقصد اور اہمیت اچھی طرح سمجھا دے۔

عوامی ادب اور لسانیات کی تحقیق کے بارے میں محقق کے فرائض یکساں ہی ہوتے ہیں لیکن عوامی ادب کے لیے اطلاع کار کی صلاحیتیں قدرے مختلف ہونی چاہییں، کیونکہ اس سے کچھ مختلف قسم کا مواد حاصل کرنا ہوتا ہے۔

فراہمی مواد کے طریقے:

مذکورہ اوصاف کے حامل اطلاع کار کے مل جانے کے بعد مواد کی فراہمی کا مرحلہ آتا ہے۔ بامقصد مواد حاصل کرنے کے طریقے بہت اہم ہیں۔ اپنے کام کے لیے مکمل مواد حاصل کرنے کے سلسلے میں ضروری ہے کہ مواد کی فراہمی کے طریقے صحیح اور سائنسی ہوں۔ اس طرح سے وقت کی بچت بھی ہوسکتی ہے۔ اس سلسلے میں کچھ اصول مقرر کیے جاسکتے ہیں۔

کام کے لیے مدت کا تعین:

اس سلسلے میں محقق کو اطلاع کار کے ساتھ باقاعدہ نشستیں کرنی پڑتی ہیں۔ یہ نشست مناسب ماحول اور مقام پر ہونی چاہیے۔ اس نشست کی مدت بھی متعین ہوتی ہے۔ نہ تو بہت زیادہ مختصر نہ بہت زیادہ طویل۔ نشست کے مقام، ماحول اور مدت کا تعین اطلاع کار کی سہولت کے مطابق کیا جاتا ہے۔ تاہم جگہ ایسی ہونی چاہیے جہاں غیر ضروری لوگ آکر کام میں خلل انداز نہ ہوں۔ اس سلسلے میں یہ بھی ضروری ہے کہ نشست میں تبادلہ خیال کرتے وقت اطلاع کار پر غیر ضروری بار اور محنت نہ پڑے اور دوران نشست اطلاع کار کا شکریہ اور اس کے لیے اظہار ممنونیت بھی کرتے رہنا چاہیے، تاکہ کام میں اس کی دلچسپی بڑھتی رہے۔

مواد کی اقسام

لسانیاتی تحقیق میں عام طور پر تین طرح کا مواد فراہم کیا جاتا ہے۔ ذخیرۂ الفاظ، فقرہ جات اور مختلف ساخت کے جملے۔ اس کے علاوہ ایک یا اس سے زائد کہانیاں یا تقریر۔ اسی مواد پر تحقیق کی تکمیل کا انحصار ہوتا ہے۔

ذخیرۂ الفاظ

ذخیرۂ الفاظ میں ان الفاظ کی فراہمی ضروری ہے جو اطلاع کار کی زبان میں محقق کی زبان کے ہم معنی الفاظ ہوں۔ ان الفاظ کا استعمال صوتیات کے تجزیے کے لیے اور اصول قواعد کے تعین کے سلسلے میں بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل باتیں ملحوظ رہنی چاہییں:

۱۔ ذخیرہ الفاظ وسیع سے وسیع تر ہونا چاہیے۔ اس میں زندگی کے سارے شعبوں کی نمائندگی ہونی چاہیے۔ اعضائے جسمانی کے نام، باورچی خانے میں بولے جانے والے الفاظ، خانگی الفاظ، متعلقہ لوگوں کے خصوصی پیشہ جات سے متعلق الفاظ، درختوں، جانوروں، زراعت، آب و ہوا، وقت کے پیمانے، سمتیں، زمین کی اقسام، مختلف قسم کے پیشہ جات، رنگوں کے نام اور ضمائر وغیرہ سے متعلق الفاظ کی فہرست تیار کرلینی چاہیے۔ یہ فہرست پانچ سو سے لے کر دو ہزار الفاظ تک مشتمل ہوسکتی ہے، اس میں عام آوازوں اور صوتیات سے متعلق الفاظ بھی آجانے چاہییں۔

۲۔ جمع شدہ الفاظ کو ممکنہ حد تک زیادہ سے زیادہ حوالوں کے ساتھ استعمال کرکے دیکھنا چاہیے۔ اس طرح ان کے معانی کی باریکیاں ظاہر ہوتی ہیں اور اس بات کا تعین بھی ہوجاتا ہے کہ قواعد کے اعتبار سے ان کا مقام کیا ہے۔

۳۔ الفاظ کی فہرست زیادہ تر اسی زبان میں تیار کرنی چاہیے جو اطلاع کار کی مادری زبان نہ ہو۔ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ اطلاع کار ایک سے زائد زبانیں جانتا ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اشاروں وغیرہ سے اس کے الفاظ معلوم کیے جاسکتے ہیں۔

۴۔ ذخیرۂ الفاظ میں بوقت ضرورت کمی بیشی کرنے کی گنجائش رہنی چاہیے۔

۵۔ اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ایک ہی لفظ مختلف اطلاع کاروں کی زبان سے سننے میں تلفظ کا فرق ہوسکتا ہے۔ صحیح تلفظ کا تعین کثرت استعمال کی بنیاد پر کرلینا چاہیے۔

۶۔ کسی علاقے کے مختلف حلقوں میں ایک ہی لفظ کے کئی ہم معنی الفاظ بھی مل سکتے ہیں۔ ان مختلف حلقوں کو الگ الگ بولیوں کے حلقے تصور کرنا چاہیے۔

جملوں کی فہرست

الفاظ کے ساتھ ہی ساتھ جملوں کا استعمال بھی ہوتا رہتا ہے۔ الفاظ کو جملوں کی مختلف شکلوں میں رکھ کر دیکھنا چاہیے۔ اس طرح جملوں کے اعتبار سے

الفاظ کا باہمی تعلق اور جملے میں ان کا مقام ظاہر ہو جاتا ہے (فاعل، مفعول، فعل، ندا، خبر وغیرہ) اس فہرست میں ہر قسم کے جملے مفرد اور مرکب وغیرہ شامل ہونے چاہییں۔

کہانی یا تقریر

صرف الفاظ اور جملوں سے ہی زبان کی تکمیل نہیں ہوتی۔ اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس زبان میں جس کے بارے میں تحقیق کی جا رہی ہے کوئی ایسی کہانی جو زبان زد خاص و عام ہو۔ یا کسی اہم اور مشہور تقریر کو لے کر اس کا جائزہ لیا جائے۔ کیونکہ ان چیزوں میں الفاظ اور جملوں کا استعمال بعض مقامات پر اتنا فطری اور برمحل ہوتا ہے کہ ان کے کچھ الگ ہی معنی کھل کر سامنے آتے ہیں اور اس طرح اس زبان کی وسعت اور ہمہ گیری کا اندازہ ہوتا ہے۔

مواد کی قلم بندی

لسانیاتی مواد کو محفوظ کرنے کے لیے دو طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔ دستی تحریر اور ٹیپ وغیرہ کر لینا۔

دستی تحریر، ضروری سامان

لسانیاتی محقق کے لیے اچھا کاغذ اور پنسل ضروری سامان ہے۔ کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ۵x۴ اور ۱/۲x۸ ۱/۲ کے ناپ میں کر لینے چاہییں۔ چھوٹے چھوٹے کاغذوں پر الگ الگ الفاظ لکھے جائیں اور بڑے کاغذوں پر بڑی تفصیلات درج کی جائیں۔ ایک آدھ چھوٹے سائز کی کاپی بھی رہنی چاہیے۔ اس کاپی پر عام قسم کی معلومات اگر سر راہے مل جاتی ہیں، تو درج کر لی جائیں۔ بعد میں اس کی تصدیق اطلاع کار سے کر لی جائے۔

جائزے کے دوران حاصل کیا ہوا مواد شروع میں مستقل نہیں سمجھا جاتا۔ اس لیے اس کو پنسل سے لکھنا ہی بہتر ہوتا ہے تا کہ ربڑ کی مدد سے اس میں رد و بدل کیا جا سکے۔ دستی تحریر کی بجائے ٹائپ رائٹر سے بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ اس میں ٹائپ کی عام تحریر کے بجائے شارٹ ہینڈ سے کام لینا زیادہ مفید ہوتا ہے۔

مواد کی تحریر کے لیے خصوصی رسم الخط

جمع شدہ مواد کو احاطۂ تحریر میں لانے کے کئی طریقے ہیں۔ ان میں سے ہندوستان میں سب سے زیادہ مقبول "بین الاقوامی صوتیاتی حروف تہجی ہے"۔ یہ رسم الخط چند مخصوص نشانات اور صوتیاتی اشاروں پر مشتمل ہے۔ وقتاً فوقتاً ان نشانات اور اشاروں میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ اس رسم الخط کا قریبی مطالعہ اور اس میں تھوڑی سی مشق کر لینے کے بعد اس کو بڑی سہولت سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ٹیپ ریکارڈر

حالانکہ تحقیقی کام میں ٹیپ ریکارڈر کا استعمال بہت ہونے لگا ہے، تاہم اس کو دستی تحریر کے برابر مقام دے دینا مناسب نہ ہوگا۔ کیونکہ الفاظ کے املا کی باریکیاں جو تحریر میں نمایاں رہتی ہیں، ٹیپ ریکارڈر میں بند آواز سے ان کا اظہار نہیں ہو سکتا۔ البتہ بعض مقامات پر اس مشین کا استعمال بہت ضروری اور مفید ہوتا ہے۔ اس لیے تحقیقی عمل کے دوران دستی تحریر کے ساتھ اس کو بھی استعمال میں لے لیا جائے تو چنداں مضائقہ نہیں۔ اس مشین کا ایک فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ اس میں بھری ہوئی آواز کو جتنی مرتبہ چاہیں سن سکتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر اطلاع کار کی فراہم کردہ معلومات ہی کو جمع کیا جاتا ہے۔ تا کہ اس کی غیر موجودگی میں بھی اس آواز سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ دستی تحریر اطلاع کار کے بولنے کی رفتار کا ساتھ بھی نہیں دے سکتی۔ اس کے باوجود اس میں کچھ خامیاں بھی ہیں جن میں اہم ترین خامی یہ ہے کہ اس کے استعمال میں خاصی رقم خرچ ہو جاتی ہے۔ کئی بار استعمال کرنے کے بعد ٹیپ ناکارہ ہو جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ٹیپ میں صرف اطلاع کار کی آواز ہی قید کی جا سکتی ہے۔ بولتے وقت اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ اور اس کے جذبات کو اس میں نہیں اتارا جا سکتا۔ تاہم فی زمانہ ٹیپ ریکارڈر کا استعمال تحقیقی عمل کے لیے لازمی سا ہو گیا ہے۔ اس کی مدد سے کم وقت میں زیادہ مواد جمع کیا جا سکتا ہے اور اطلاع کار کی موت کے بعد بھی اس کی فراہم کردہ معلومات کی تصدیق اور دوبارہ سماعت کی جا سکتی ہے۔ معدوم ہوتی ہوئی بولیوں کو زندہ رکھنے کے لیے ٹیپ ریکارڈ ایک نعمت ثابت ہوا ہے۔ ٹیپ ریکارڈ کا استعمال کرنے کے لیے اس کے مختلف پرزوں اور دیگر آلات کا علم ہونا ضروری ہے۔ ٹیپ ریکارڈ کا استعمال کرتے وقت مندرجہ باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔

آواز کی مقدار (Volume)

۱۔ اگر ٹیپ ریکارڈر کا استعمال کھلی جگہ میں کیا جاتا ہے تو آواز اونچی رکھی جاتی ہے اور اگر دفتر یا کمرے کے اندر اس کا استعمال کیا جائے تو آواز کم رہنی چاہیے۔ آواز دھیمی رکھنے سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ دیگر آوازیں اس میں کم شامل ہو پاتی ہیں۔ اگر اطلاع کار اونچی آواز میں بول رہا ہے تو والیوم یعنی ٹیپ ریکارڈ کی آواز قبول کرنے کی صلاحیت کم رکھنی چاہیے اور دھیمی آواز میں بول رہا ہے تو والیوم بڑھا دینا چاہیے۔ لیکن والیوم کو جلدی جلدی بدلنا نہیں چاہیے۔

۲۔ آواز ٹیپ کرتے وقت ماحول بہت پُرسکون اور خاموش ہونا چاہیے۔ پکی دیواروں اور چھتوں کی وجہ سے آواز کی بازگشت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے لیے گھاس کا چھپر یا کچا مکان زیادہ مناسب ہوتا ہے۔

۳۔ کبھی کبھی مشین کی ہی خرابی سے کچھ غیر ضروری اندرونی آوازیں نکلنے لگتی ہیں اس کے لیے مشین کی اس خرابی کو دور کرا لینا چاہیے۔

۴۔ مائیکروفون کو بولنے والے کے منہ سے ۸۔۱۰ انچ دور رہنا چاہیے۔

۵۔ ٹیپ ریکارڈ کی رفتار کو اپنے مواد کی نوعیت کے اعتبار سے کم یا زیادہ کر لینا چاہیے۔

عوامی ادب کے اطلاع کار

مقامی بولی یا لسانیات کی تحقیق میں اطلاع کار اس شعبے یا حلقے سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی شخص ہو سکتا ہے۔ لیکن عوامی ادب یا عوامی گیتوں کے بارے میں تحقیق یا اس کو جمع کرنے کے عمل میں اطلاع کار وہی شخص ہو سکتا ہے جو فنِ موسیقی کے اس مخصوص طبقے سے تعلق رکھتا ہو۔ ہر شخص اس کے بارے میں معلومات فراہم نہیں کر سکتا۔ عوامی فن کار کو بھی اپنے شعبے کی معلومات فراہم کرنے میں کچھ دشواریاں پیش آتی ہیں۔ مثلاً

۱۔ اسے ہر وقت اپنا مواد یاد نہیں رہتا۔ اکثر گانے کی رو میں ہی وہ مواد اس کے حافظے میں تازہ ہوتا ہے۔

۲۔ اگر وہ بغیر گائے ہوئے اپنا مواد لکھنا شروع کرتا ہے، تو درمیان میں وہ بھول بھول جاتا ہے۔ اپنے مواد کو یاد کرنے کے لیے اس کو آہستہ آہستہ گانا پڑتا ہے۔

۳۔ بعض فن کار اپنے فن کو اپنے تک ہی محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنا مواد بھی کسی کو دینے میں بخل سے کام لیتے ہیں۔

۴۔ بعض عوامی گیت ایسے ہوتے ہیں کہ وہ مجموعی شکل میں گائے جاتے ہیں۔ ایسے گیتوں کا متن لکھوانے میں اکیلا آدمی دشواری محسوس کرتا ہے۔

کہانی کے ادب کا جمع کرنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ محقق کو ایسے میں اطلاع کار کے ساتھ ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ جب کبھی وہ کسی پروگرام کے تحت اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہے محقق اس کے مواد کو قلم بند یا ٹیپ ریکارڈ کر لیتا ہے۔

عوامی ادب کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ گیت

۲۔ کہانی

۳۔ متفرقات، اس تیسرے شعبے میں مختصر کہانیاں اور لطیفے، طویل کہانیاں، نظم اور نثر پر مشتمل ملی جلی کہانیاں، چیستانیں، اخلاقیاتی محاورے اور پہیلیاں وغیرہ شامل ہیں۔

عوامی ادب کی نوعیت اور اقسام کے اعتبار سے اس کے لیے اطلاع کاروں کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ عوامی ادب کا تعلق مردوں اور عورتوں دونوں سے ہوتا ہے۔ لہٰذا دونوں جنسوں میں سے اطلاع کاروں کا انتخاب کیا جانا چاہیے۔ اس سلسلے میں کچھ اشارے نیچے دیے جاتے ہیں:

۱۔ ایک بوڑھی عورت یا عورتیں جو پیدائش، شادی اور موت وغیرہ کی رسوم کے بارے میں اطلاعات فراہم کر سکیں، اس مقصد کے لیے مفید ہوں گی۔ یہ عورتیں اعلیٰ اور ادنیٰ دونوں طبقوں سے لی جانی چاہییں۔

۲۔ کچھ دوشیزائیں جن سے کھیل وغیرہ یعنی خالص تفریحی گیت جمع کیے جا سکیں۔

۳۔ کچھ مرد گانے والے جو صرف تفریح کے لیے گیت وغیرہ گاتے ہیں۔ مثلاً قوال۔

۴۔ کچھ ایسے مردجو مذہبی انداز کے گانے یا وعظ وغیرہ پیش کرتے ہیں مثلاً میلادخواں، واعظ وغیرہ۔
۵۔ کچھ ایسے بھکاری لوگ جو مانگتے وقت بعض مذہبی یا اخلاقی گیت وغیرہ گاتے ہیں۔
۶۔ کچھ ایسے لوگ جو گاؤں یا محلے کی پنچایتوں وغیرہ کے رکن ہوتے ہیں۔ ان کے پاس اخلاقیات پر مبنی ایسی کہانیوں وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے جن کی مدد سے وہ پنچایتوں میں انصاف کرتے ہیں۔
۷۔ ایسے فقیر جو عشقیہ مثنویاں وغیرہ گاتے ہیں۔
۸۔ کچھ ایسے تجربہ کار کسان اور عورتیں جو پیشۂ زراعت سے متعلق عوامی ادب کی واقفیت رکھتے ہوں۔

عوامی ادب کا محقق اپنے اطلاع کار سے مواد فراہم کرنے کے علاوہ خود اپنے طور پر بھی اپنے حلقے کے گوشے گوشے کا دورہ کرکے وہاں کے ماحول اور فضاؤں میں رچے بسے عوامی ادب کی جھلکیوں کو قلم بند یا ریکارڈ کرسکتا ہے۔

جس اطلاع کار سے معلومات حاصل کی جائیں اس کا پورا تعارف یا اس کی ذات کے بارے میں مکمل تفصیلات ایک جگہ نوٹ کرکے رکھ لینی چاہیے۔ اس کے ذریعے آخری نتائج اخذ کرنے اور اصولوں کی توضیح میں مدد ملتی ہے۔

جائزہ کاری کے لیے مخصوص سوالات

سب سے پہلے جس مقام یا گاؤں کے رہنے والے اطلاع کار سے مواد فراہم کیا جارہا ہے، اس کے بارے میں سوالات کرنے چاہییں۔ مثلاً:

۱۔ گاؤں کا نام اور اس کی وجہ تسمیہ۔
۲۔ گاؤں کی تاریخ۔
۳۔ گاؤں میں آباد مختلف ذاتوں کے بارے میں تفصیلات۔
۴۔ گاؤں کے خاص خاص فن کار، عوامی ادب کے سرپرست اور مغنی کون کون ہیں۔
۵۔ گاؤں کے بارے میں عوام میں پھیلی ہوئی کہانیاں۔

اس کے بعد مواد جمع کرتے وقت اپنے فن کار اور اطلاع کاروں سے مندرجہ ذیل سوالات پوچھنے چاہییں۔

۱۔ حاصل شدہ مواد کا نام (گیت، کہانی، قوالی وغیرہ)۔
۲۔ مقام، جہاں وہ عام طور پر مستعمل ہے۔
۳۔ ذات یا فرقہ، جس سے اس مواد کا خصوصی تعلق ہے۔
۴۔ موقع، جب اس مواد کا استعمال عام طور پر کیا جاتا ہے۔
۵۔ معاشرہ (مرد یا عورت) جس سے اس کا تعلق ہے۔
۶۔ پیش کش، انفرادی یا مجموعی شکل میں۔
۷۔ حصول کا ذریعہ۔
۸۔ اطلاع کار کا تعارف۔
۹۔ اگر اس مواد کا خالق کوئی عوامی شاعر ہے تو اس کا تعارف۔
۱۰۔ مواد کی ہیئت۔
۱۱۔ حاصل شدہ مواد یا اس کے خالق سے متعلق عوام کے تاثرات۔
۱۲۔ اطلاع کار کو وہ مواد کہاں سے ملا۔
۱۳۔ اس مواد سے پڑنے والے اثرات سے متعلق لوگوں کے خیالات۔
۱۴۔ دیگر خصوصی معلومات۔

۱۵۔ فراہمی کی تاریخ اور دن۔

۱۶۔ اگر گاتے وقت اس مواد کا کوئی حصہ یا فقرہ یا لفظ سمجھ میں نہ آئے تو اس کی تفہیم۔

۱۷۔ اس مواد میں آئے ہوئے الفاظ یا کرداروں کے بارے میں حسب ضرورت سوالات۔

عوامی ادب کی تحریر

اس مواد کو ہاتھ سے بھی لکھا جا سکتا ہے اور ٹیپ ریکارڈ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ اشارے یہاں دیے جاتے ہیں:

۱۔ کہانی کار یا گانے والا اپنی کہانی یا گیت کو اپنے فطری انداز میں پڑھتا چلا جائے اور اسی رفتار سے اس کو تحریر یا ریکارڈ میں محفوظ کر لیا جائے تو بہترین نتائج برآمد ہوں گے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو فن کار کو سمجھا دیا جائے کہ وہ آہستہ بولے۔

۲۔ فن کار جیسے جیسے بولتا جائے اس کے مواد کو اسی شکل میں نوٹ کر لیا جائے۔ اگر درمیان میں کچھ سمجھ میں نہ آئے تو اس کو ٹوکا نہ جائے۔ آخر میں اپنے شبہات کو رفع کر لینا چاہیے۔ محقق کو ہر بات اسی شکل میں لکھ لینی چاہیے جس انداز میں اطلاع کار نے اس کو کہا ہے، چاہے وہ بات کتنی ہی ناممکن اور مہمل کیوں نہ معلوم ہو۔

۳۔ کہانی یا گیت کی ہیئت اور اس کی ممکنہ تاریخ کے بارے میں بھی معلومات حاصل کر کے حاشیے میں درج کر لینی چاہیے۔

۴۔ تحریر مکمل ہو جانے کے بعد اس مواد کو اطلاع کار کے سامنے دوبارہ پڑھ کر اسے سنا دینا چاہیے تا کہ اگر اس میں کوئی فروگذاشت ہو گئی ہے تو اس کی اصلاح ہو جائے۔

۵۔ کہانی یا گیت کو اسی زبان یا بولی میں لکھنا چاہیے جو اطلاع کار بول رہا ہے۔

۶۔ مخصوص آوازوں اور صوتیاتی اشاروں کی تحریر میں خصوصی احتیاط برتنی چاہیے اور اطلاع کار کے تلفظ کو بھی ہو بہو نقل کر لینا چاہیے۔

۷۔ اگر اطلاع کار کی زبان کو حرف بہ حرف اسی شکل میں لکھنا ممکن نہ ہو تو اس کو اپنے الفاظ میں لکھ لینا چاہیے، یا اس کے لیے ٹیپ ریکارڈر استعمال کرنا چاہیے۔ اگر عوامی ادب کی زبان پر کام کرنا ہے تو اس بولی کو اسی شکل میں لینا ہوگا۔

ادبی جائزہ

لسانیات اور عوامی ادب کی تحقیق کے شعبے میں تو جائزہ کاری کا ایک مقام ہے ہی لیکن خالص ادب کی تحقیق کے سلسلے میں بھی جائزہ کاری کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کسی مخصوص رجحان، ادبی مسئلے، متنازعہ سوال، کسی مخصوص دور کے کسی شاعر یا دو شاعروں کا موازنہ وغیرہ سے متعلق تحقیقی عمل کے لیے جائزہ کاری سے کام لیا جا سکتا ہے۔ ملک کے مشہور علما و فضلا سے ملاقات (انٹرویو) یا غیر ممالک کے علماء کے پاس خطوط بھیج کر ان سے مطلوبہ مواد فراہم ہو سکتا ہے۔ ان کی بنیاد پر ایک سائنسی نتیجہ اخذ کرنا ممکن ہوگا۔

یوں تو سارے شعبوں کی جائزہ کاری میں اعداد و شمار کی فراہمی ضروری ہوتی ہے، لیکن خالص ادب کی تحقیق میں اس کی اہمیت کچھ زیادہ ہو جاتی ہے۔ کسی مخصوص مسئلے پر مختلف علماء کے خیالات جمع کرنا اور ان کا آپس میں موازنہ کر کے ان سے ایک نتیجہ اخذ کرنا، تحقیقی عمل کا ایک اہم جزو ہے۔ یہ کام دو طریقوں سے ہو سکتا ہے۔ اول یہ کہ ان علما سے براہ راست ملاقات کی جائے، دوسرے یہ کہ ان کے پاس اہم سوال نامہ بھیج کر ان سے اس کے جوابات دینے کی درخواست کی جائے۔

ملاقات (INTERVIEW)

یہ عمل کئی نقطۂ نظر سے کامیاب رہتا ہے۔ بظاہر انٹرویو ایک انتہائی عام سا طریقہ کار معلوم ہوتا ہے، لیکن دراصل یہ ایک بہت ہی پیچیدہ اور مشکل عمل ہے۔ ایک کامیاب انٹرویو کی پہلی شرط یہ ہے کہ ملاقاتی، سوالات کے جوابات دینے والے کا مکمل اعتماد اور تعاون حاصل کر سکے۔ انٹرویو کے لیے ضروری ہے کہ مطلوبہ عالم سے اس کے لیے پہلے سے وقت اور تاریخ مقرر کر لی جائے۔ دوسری ضرورت ہے کہ انٹرویو شروع کرنے سے قبل ایک خاکہ تیار کر لیا جائے اور جو

سوالات پوچھنے ہیں، ان کا تعین پہلے سے کرلیا جائے۔ سوالات نپے تلے اور واضح الفاظ میں ہونے چاہییں۔ ہر ایک عالم سے انٹرویو لیتے وقت انھی سوالات کو دوہرایا جانا چاہیے۔ ان کے ذیلی سوالات مختلف بھی ہوسکتے ہیں۔ ضرورت ہو تو ان سوالوں کو لکھ لیا جائے اور انٹرویو کے وقت ان کو پڑھتے جانا چاہیے۔

یہ ضروری ہے کہ انٹرویو کے وقت محقق اس عالم کے پاس تنہا ہو۔ تیسرے فرد کی موجودگی سے کام میں خلل پڑ سکتا ہے۔ محقق کو چاہیے کہ وہ اس عالم کو اپنے انٹرویو کا مقصد واضح انداز میں بتلا دے اور یہ بھی بتلا دے کہ وہ اور کون کون سے علما سے اس سلسلے میں انٹرویو کرنا چاہتا ہے۔ محقق کو اپنے سوالات انتہائی واضح انداز میں پیش کرنا چاہییں تاکہ متعلقہ عالم ان سوالات کا صحیح مفہوم سمجھ کر ان کا صحیح جواب دے سکے۔

نفسیاتی نقطۂ نظر سے یہ ضروری ہے کہ محقق اپنے سوال کے بارے میں اپنا خیال کسی بھی شکل میں ظاہر نہ کرے۔ ممکن ہے کہ متعلقہ عالم اس کے نقطۂ نظر سے متاثر ہو کر اس کو صحیح مواد فراہم نہ کر سکے۔ سوال کا انداز ایسا ہو کہ اس کے الفاظ میں محقق کے اپنے نقطۂ نظر کا اظہار نہ ہوتا ہو۔ ایسے سوالات بھی نہیں کیے جانے چاہییں جن کے جوابات کسی پر اعتراض یا طنز کی شکل اختیار کرلیں۔ اس سلسلے میں محقق کو پوری دیانت داری برتنی چاہیے۔

اس سلسلے میں حاصل شدہ جوابات کو پوری احتیاط کے ساتھ دائرہ تحریر میں لانا چاہیے اور انھیں جواب دینے والے کے الفاظ میں ہی لکھا جانا چاہیے۔ لکھ لینے کے بعد سارے جوابات کو ایک مرتبہ متعلقہ عالم کو دکھا دینا بھی ضروری ہوتا ہے۔

انٹرویو دو طرح کے ہوتے ہیں۔ صحافت سے متعلق انٹرویو اور ادبی انٹرویو۔ ادبی انٹرویو دو طرح کے ہوسکتے ہیں۔ تبصرہ کارانہ اور تحقیقی۔

دراصل ان دونوں اقسام میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ ان کے معیار اور مقصد کے اعتبار سے تھوڑا سا فرق رہتا ہے۔ ادبی انٹرویو میں دراصل اس شاعر یا ادیب کی شخصیت کی تہوں کو ادھیڑنا مقصود ہوتا ہے، جس کے بارے میں تحقیق کی جارہی ہے۔ محقق کو شاعر یا مصنف کی اندرونی یا بیرونی تحریکات کے ذرائع کی تلاش رہتی ہے۔ ان تحریکات کو تخلیقات میں تبدیل ہونے کے عمل کو بھی وہ دیکھنا چاہتا ہے۔ اس طرح شخصیت اور تخلیق کا مطالعہ انٹرویو کے دونوں فریقوں کے پیش نظر ہوتا ہے۔

تبصرہ کارانہ انٹرویو اپنی ہیئت کے اعتبار سے ایک ہی انداز کے ہوتے ہیں لیکن تنقیدی انٹرویو کسی مخصوص مسئلے کو سامنے رکھ کر لیے جاتے ہیں۔ دراصل انٹرویو معلومات حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے معلومات حاصل کر کے ان کو اعداد و شمار کی روشنی میں پرکھ کر ان سے ایک سائنسی نتیجہ نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے انٹرویو تحقیقی عمل کے سلسلے میں ایک سنجیدہ کارروائی کا نام ہے۔

کسی ادبی مسئلے پر کسی عالم کے ساتھ بات چیت کرنے یا انٹرویو لینے کی مدت یا وقفہ مختلف ہوسکتا ہے۔ بعض مرتبہ صرف چند منٹ میں کوئی انٹرویو ختم کیا جاسکتا ہے۔ بعض مرتبہ چند گھنٹے بھی لگ سکتے ہیں اور اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ اگر کسی عالم کے ساتھ ایسے تعلقات ہیں تو ان کے ساتھ دو تین روز تک مسلسل رہ کر اس دوران میں جب بھی وقت ملا ہے، ان سے اپنے مسئلے کے بارے میں گفتگو چل رہی ہے اور پھر آخر کار اسی سلسلے میں کلی طور پر مطمئن ہوجانے کے بعد ان سے رخصت حاصل کرلی گئی ہے۔

سوال نامہ

ذاتی طور پر ملاقات کرنے کی بجائے کسی عالم کے پاس ایک سوال نامہ بھیج کر اس کے جوابات بھی حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ بذریعہ ڈاک یا تحقیقی حلقے کے طلبہ، اساتذہ یا دیگر کسی شخص کے ذریعے سوال نامے کو ایک وسیع جغرافیائی خطے میں بہ آسانی بھیجا جاسکتا ہے۔ اس لیے یہ طریقہ کار آسان، سہل اور کم خرچ ہے۔ اس طریقے میں بس ایک ہی دشواری سامنے آسکتی ہے کہ سوالات کے جوابات ملنا یقینی نہیں ہوتا اور اس کے علاوہ دیگر ضمنی سوالات کر کے اصل جوابات سے پیدا شدہ غلط فہمیوں کا ازالہ نہیں کیا جاسکتا۔

تحریری سوال نامے میں وہ سارے سوالات شامل ہوتے ہیں جو بالمشافہ گفتگو میں پوچھے جاسکتے ہیں۔ لیکن ان سوالات کو کچھ زیادہ احتیاط کے ساتھ تشکیل دیا جاتا ہے، کیونکہ جوابات دینے والا شخص سامنے نہیں ہوتا۔ لہٰذا سوال کی وضاحت زبانی نہیں کی جاسکتی۔ سوال نامہ چھپا ہوا یا ٹائپ کیا ہوا ہوتا ہے۔ سوال نامے کے ساتھ ایک منسلکہ رقعہ بھی ہوتا ہے جس میں تحقیق کے موضوع اور اس کے مقصد کو واضح کردیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی پتا لکھا ہوا ایک خالی لفافہ بھی اس کے ہم رشتہ منسلک رہتا ہے تاکہ اس میں رکھ کر جوابات واپس بھیجے جاسکیں۔

سوال نامہ تشکیل دینے میں مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھنا چاہیے:

۱۔ سوالات ممکنہ حد تک مختصر ہونے چاہییں۔

۲۔ سوالات کے ذریعے جو معلومات حاصل کرنی ہیں ان کا حصول کسی دوسرے ذریعہ سے ممکن نہ ہو۔

۳۔ جس موضوع پر سوالات پوچھے جاتے ہیں وہ بہت اہم ہونا چاہیے۔

۴۔ یوں تو سوالات انفرادی نوعیت کے بھی ہو سکتے ہیں، لیکن زیادہ تر معروضی قسم کے سوالات پوچھنا چاہییں۔

۵۔ سوالات کی زبان بہت سادہ اور عام فہم قسم کی ہونی چاہیے۔ ذومعنی الفاظ سے بچنا چاہیے۔

۶۔ سوالات کی ترتیب اور ان کی ہیئت مدلل ہونی چاہیے۔ ہر ایک سوال آئندہ سوال کے لیے زمین ہموار کرنے والا ہو۔

۷۔ جوابات دینے کے وقفے کے بارے میں بھی واضح ہدایات دے دینی چاہیے۔

سوالات دو طرح کے ہوتے ہیں۔ بدیہی اور رمزیہ۔

بدیہی سوالات کے بارے میں جواب دینے والا آزاد ہوتا ہے کہ وہ کوئی بھی جواب دے دے۔ لیکن رمزیہ سوالات کے کئی ممکنہ جوابات درج کیے جاتے ہیں اور یہ لکھ دیا جاتا ہے کہ جواب دینے والے کی نظر میں جو جواب صحیح ہو وہ اس پر ایک مخصوص نشان لگا دے۔ کچھ رمزیہ سوالات کے جوابات ''ہاں'' یا ''نہیں'' میں ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک تیسرا ممکنہ جواب بھی لکھ دینا مناسب ہوتا ہے۔ ''غیر مقررہ'' یا ''غیر متعینہ'' یا؟

سوال نامہ ترتیب دیتے وقت تحقیق کا موضوع، محقق کار جحان اور تحقیق سے متعلق دور یا زمانے کو مدنظر رکھا جانا چاہیے اور جواب حاصل کرنے کے لیے کسی عالم کا انتخاب کرتے وقت بھی ان باتوں کو ملحوظ رکھا جانا چاہیے۔

تجرباتی طریقہ کار

تجربہ ایک امتحانی طریق کار ہے۔ فرضی یا مصنوعی حالات میں زیر تحقیق چیز کو رکھ کر اس کے مختلف ردعمل کے حالات کا امتحان لے کر عمل اور سبب کے سلسلے کو قائم کیا جا سکتا ہے۔

❖❖❖❖

(۱) ادبی و لسانی تحقیق اصول اور طریقہ کار، عبدالستار دلوی، بمبئی، ۱۹۸۴ء، ص ۲۲ تا ۵۶۔

موضوع کا انتخاب [۱]

ڈاکٹر تنویر احمد اختر

موضوع کا انتخاب

تحقیق کے مدارج میں سب سے اہم منزل موضوع کے انتخاب کی ہے۔ اگر اسکالر نے اپنی صلاحیت، مذاق اور اپنی پسند کی روشنی میں موضوع کا انتخاب نہیں کیا تو اس کی تحقیق بھی مکمل نہیں ہوگی (اور اگر مکمل ہو بھی گئی تو اس سے مفید نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔ دانش گاہوں میں تحقیقی صورت حال اسی لیے ابتر ہے۔ جو اسکالر شعر، موزوں نہیں پڑھ سکتا وہ عموماً شعرائے کرام کے دیوان کی تدوین میں لگ جاتا ہے۔ اس طرح جسے علم لسانیات سے کوئی دلچسپی نہیں وہ لسانیات کو موضوع تحقیق بنالیتا ہے۔ اس لیے تحقیق کا سب سے ابتدائی مرحلہ موضوع کے انتخاب کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

موضوع کتنا ہی فرسودہ کیوں نہ ہو اپنے اندر نئے گوشوں کو بے نقاب کرنے کی بے پناہ وسعتیں رکھتا ہے۔ قدیم داستانوں، کلاسیکی کہانیوں، اساطیری قصوں کو محض غیر حقیقی کہہ کر نظرانداز کرنا دانش مندی نہیں۔ ان میں سینکڑوں برسوں کی تہذیبی علامتیں پوشیدہ ہیں۔ اس طرح عوامی شاعری، لوک گیت، پہیلی، آج بھی ادبی تحقیق کے دلچسپ موضوعات ہو سکتے ہیں۔ البتہ یہ ضرور دیکھنا چاہیے کہ جن پہلوؤں پر تحقیق کی جا چکی ہے اور اس سے خاطر خواہ نتائج کے برآمد ہونے کی اُمید ہے یا نہیں۔ اگر مفروضات کی تردید کے قرائن ملتے ہیں تو گریز کرنا چاہیے۔ لیکن اس کا یہ مفہوم نہیں کہ جن موضوعات پر تحقیقی سرمایہ کافی جمع ہو چکا ہے، وہ مزید تحقیق کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے۔

اسکالر کے ذہن میں بیک وقت متفرق موضوعات پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہ ایک فطری امر ہے۔ انسانی ذہن سینکڑوں تصورات کی پرورش کرتا رہتا ہے۔ اس لیے خیالات کی یورش پر گرفت رکھنا ضروری ہے۔ اُسے اپنی علمی استعداد، ذہنی رجحان کو برابر پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اس کی وجہ سے وہ پراگندگی ذہن کا شکار نہ بن جائے گا اور ایک بار موضوع کے انتخاب کا فیصلہ عمل میں آ گیا تو تحقیق کی پہلی اینٹ صحیح جگہ پر رکھ دی جائے گی۔ موضوع کی مناسبت اور اسکالر کے مزاج کے مطابق نگران کا وجود بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اُسے بھی موضوع سے اتنی ہی دلچسپی رہنی چاہیے جتنی اسکالر کو ہے۔ یہ اس لیے ضروری ہے تاکہ وہ مواد کی حصول یابی اور اعداد و شمار کی یکجائی اور تجزیہ کے دوران رہنمائی کے فرائض انجام دے سکے۔

موضوع چنتے وقت یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ دائرہ اتنا وسیع نہ ہو کہ وقت معینہ پر کام مکمل نہ ہو پائے۔ اس لیے اختصار اور وقت کی محدودیت بھی موضوع کے تعین میں ایک اہم عنصر بن جاتی ہے۔ اگر (بھارت میں) پاکستانی ادب پر تحقیق کی جا رہی ہے تو یہ بات پہلے سے سوچ لینی چاہیے کہ پاکستان کا ادب بہ آسانی دستیاب ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اگر جواب نفی میں ہے اور اس کے امکانات ہیں کہ پاکستانی ادبی سرمایہ تک اسکالر کی رسائی ممکن نہیں ہو سکتی تو یہ موضوع فوراً ترک کر دینا چاہیے۔ اگر مواد کی حصول یابی کے ذرائع دسترس میں نہ ہوں گے تو تحقیق آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اس طرح اگر تحقیق کے لیے خاص آلات، لائبریری اور کتابوں کی ضرورت ہے یا تجزیہ گاہوں کی اور وہ اسکالر کی دست رس سے باہر ہوں تو بھی موضوع کے انتخاب پر نظر ثانی کی ضرورت ہوگی۔ پھر یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ یہ مطالعہ سودمند ہے یا نہیں اور اس کے لیے بنیادی اور ثانوی ذرائع تک آسانی سے محقق رسائی حاصل کر سکتا ہے۔

اخراجات بھی تحقیق کے لیے ضروری ہیں۔ موضوع کتنا ہی آسان کیوں نہ ہو روپیہ کے بغیر اسکالر کچھ حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لیے ابتدا ہی میں اندازہ کر لینا چاہیے کہ کون سا موضوع کم سے کم اخراجات میں پایہ تکمیل تک پہنچ سکتا ہے۔

ریسرچ یونیورس اور سی ناپس

مشہور امریکی فلاسفر Charles Peirce نے علم اور معلومات حاصل کرنے کے چار اہم طریقوں سے بحث کی ہے۔ اول Method Tenacity ہے یعنی آدمی صداقت کے تئیں کڑا رویہ اختیار کرتا ہے۔ صداقتوں کی دنیا وہ ہوتی ہے جس کو ایک آدمی اپنے تئیں سچ سمجھتا ہے اور وہ تجربات کی روشنی میں انہیں برابر صادق پاتا ہے۔ دوسرا Method of Authority ہے۔ اس کا تعلق تسلیم شدہ عقائد سے گہرا ہے۔ مذہبی کتابوں میں جتنی باتیں لکھی ہیں وہ اس

مذہب کے ماننے والے بغیر کسی چوں چرا کے سچ سمجھتے ہیں۔ ان کتابوں کے ذریعے زندگی کے بہت سے سربستہ راز وا ہوتے ہیں اور انھیں پہلی نظر میں غیر اہم سمجھنا غلطی ہے۔

Method of Intution تیسرا طریقہ ہے۔ اسے A prior Method بھی کہتے ہیں۔ یہاں ایک حد تک عقل و دانش کا گذر ہے۔ یہاں آدمی تبادلۂ خیالات کے ذریعے سچ کی تلاش کرتا ہے۔

علم حاصل کرنے کا آخری طریقہ Method of Science ہے۔

تحقیق کی ابتدائی منزلوں میں جب موضوع کا انتخاب ہو جاتا ہے اور Synopsis بنانے کا وقت آتا ہے تو ان چار طریقوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ بظاہر امریکی فلاسفر نے ان طریقوں کو علم کے سرچشموں سے تعبیر کیا ہے لیکن تحقیق جو خود بھی حقیقت کی تلاش کا فن ہے ان سے فیض حاصل کر سکتی ہے۔ موضوع کے تعین کے بعد اس کی وسعت، دائرہ اور پھیلاؤ کا تعلق اس صداقت سے بھی ہے جس کو آدمی سچ سمجھتا ہے، ان عقائد سے بھی گہرا رشتہ ہوتا ہے جو مذہبی صحیفوں کی دین ہیں۔ پھر علم و دانش کے تبادلے سے گذر کر جب تحقیق نئی سرحد میں داخل ہوتی ہے تو یہاں سائنسی طریقۂ کار اس کی رہبری کے لیے تیار نظر آتا ہے۔ تحقیق اپنے کینوس کو جب تک واضح نہیں کرتی موضوع کے ساتھ نباہ ممکن نہیں۔ اگر کینوس واضح ہو گیا تو جو خاکہ بنایا جائے گا، وہ خوش اسلوبی سے اُن سارے نکات کو سمیٹ لے گا۔ جو موضوع اور ''یونی ورس'' کی وجہ سے تحقیق کی تکمیل کے لیے ضروری ہے۔

موضوع اور یونی ورس کے انتخاب اور وضاحت کے بعد منزل Synopsis کی ہے۔ اس کی صورت اس طرح ہوگی۔

(ا) دیباچہ: اس میں موضوع کا تعارف، دائرہ، پس منظر اور مقصد شامل ہے۔ اگرچہ یہ مقالہ کا پہلا باب ہوتا ہے لیکن اسے سب سے آخر میں لکھا جاتا ہے۔ جب تحقیق مکمل ہو جاتی ہے تو بہت سے نئے گوشے رونما ہوتے ہیں۔ نئی نئی باتیں سامنے آتی ہیں۔ اس لیے اس کی گنجائش رکھی جاتی ہے کہ وہ سب دیباچے میں شامل کی جاسکیں۔

بہت سے افراد دیباچے کی جگہ تعارف لکھتے ہیں۔ تعارف لکھتے وقت دو اہم باتیں ذہن میں ضرور رکھنی چاہییں۔ موضوع کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا جائے۔ اگر تعارف ہی خشک، بھونڈا، مضحکہ خیز اور غیر منطقی ہے، تو مقالہ کا قاری خواہ وہ ممتحن ہی کیوں نہ ہو، دلچسپی سے نہیں پڑھے گا۔ ابتدائی چند صفحات سے اندازہ لگ جاتا ہے کہ مقالہ کیسا ہے۔ اس لیے تعارف جو تھیسس کا پہلا تعارفی باب ہوتا ہے، خاصا اہم ہوتا ہے۔ پہلی چیز جو پڑھنے والوں کی توجہ اپنی طرف کھینچتی ہے وہ اسلوب ہے۔ اسلوب منفرد، سادہ اور دل پذیر ہے تو موضوع کتنا ہی خشک کیوں نہ ہو، اپنے قارئین کا ایک وسیع حلقہ بنا لے گا۔ ایک اہم خاکے کے لیے ضروری ہے کہ اُس میں حسب ذیل باتوں کی طرف اسکالر اور نگراں نے توجہ دی ہو۔

۱۔ موضوع سے متعلق مسائل کی تشریح کر دی گئی ہو۔

۲۔ مطالعے کی ضرورت اور مقصد کی وضاحت کی محتاج نہ ہو۔ موضوع اور مسائل کی اہمیت پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہو جس میں داخلی جذبات و احساسات کی جگہ سائنسی نقطۂ نظر کی زیادہ جگہ ہو۔

اگر ماضی میں کوئی تحقیق کی گئی ہے تو خاکے میں اس طرح اُس کا ذکر ہونا چاہیے جس سے پتا چل سکے کہ یہ نئی تحقیق پچھلی تحقیق سے آگے کی طرف ایک اہم منزل ہے پھر اس کی ضرورت بھی بیان کرنی چاہیے۔ تا کہ مقاصد پر اچھی طرح روشنی پڑ سکے۔

تحقیق کے طریقۂ کار کا ذکر بھی خاکے میں ضرور ہونا چاہیے۔ سچ پوچھیے تو خاکہ ریسرچ ڈیزائن کی پہلی منزل ہوتا ہے۔

خاکے میں ابواب کی تقسیم اس طرح ہونی چاہیے جس سے ربط و تسلسل کا پتہ چل سکے۔ اس تقسیم کی بنیاد اگر منطقی غور و فکر پر نہ ہو، تو اسکالر مقالہ کی تحریری منزل میں بہت سی دشواریوں میں پھنس جائے گا۔ ان تک تمام کمزوریوں سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ اسکالر خاکے کو آخری شکل دینے سے پہلے کئی بار نگراں کی مدد سے نظر ثانی کرے۔

خاکے میں کتابیات کی شمولیت ناگزیر ہے۔ یہ پورے تھیسس کا ایک اہم حصہ ہوتا ہے۔ اسے کسی قیمت پر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح ضمیمہ بھی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے ضمیمہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ ضمیمہ کوئی بے کار شے نہیں ہے یا فیشن کے طور پر اس کا استعمال نہیں ہوتا۔ خاکے میں اس کی نشان دہی ہونی چاہیے۔ اُردو میں عام طور سے اشارہ یہ نہیں ہوتا۔ اسے نظر انداز کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ ایک اچھی تھیسس میں یہ شامل رہتا ہے۔

خاکہ کا آخری باب اختتامیہ ہوتا ہے۔ اس میں مقالہ نگار کو کئی باتیں شامل کرنی ہوتی ہیں۔ ابواب کی روشنی میں وہ تمام Finding کو یک جا کر لیتا ہے۔ اپنے مقاصد کو پیش نظر رکھتا ہے۔ مفروضات کی تردید یا تصدیق کا جائزہ لیتا ہے۔ طریقہ کار کی روشنی میں جو نتائج سامنے آتے ہیں اُن سبھوں کو اس

آخری باب میں رقم کرتا ہے۔ وہ ان مسائل کا بھی ذکر کر سکتا ہے، جو تحقیق کے دوران وارد ہوئے اور جن پر نئے سرے سے تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔ اچھا مقالہ وہ ہوتا ہے جس کے ابتدائی اور اختتامیہ ابواب قاری کے دلوں میں پہلے جستجو اور کرید پیدا کریں اور جب وہ آخری منزلوں سے گذر رہا ہو تو اُسے یک گونہ طمانیت قلب ہو جائے۔

تحقیق کا ڈیزائن

تحقیق کے سلسلے میں ایک مسئلہ یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ تحقیق کی مختلف منزلوں اور مرحلوں کو کس طرح قابو میں رکھا جائے یعنی ریسرچ کی دنیا گرفت میں رہے اگر ذہن انتشار میں مبتلا ہو جائے اور گرفت میں نہ رہے تو اسکالر، ریسرچ کی حدوں سے کہاں تجاوز کر رہا ہے اُسے خبر بھی نہ ہوگی۔ اس لیے ریسرچ کے ڈیزائن کا عمل ضروری سمجھا گیا۔

ایک آرکیٹکٹ یا انجینئر جب کسی مکان کا نقشہ بناتا ہے تو وہ اپنے فیصلہ پر متعدد بار غور کرتا ہے۔ اسے مکان بنانے والے کی ضرورت، اس کے مقاصد کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ مکان میں کتنے کمرے ہوں، عمارت سازی کا کون کون سا سامان استعمال کیا جائے، دروازوں کی تعداد، دیواروں کے رنگوں تک ہر جگہ آرکیٹکٹ کی جادوگری نظر آتی ہے اور یہ سب جادوگری مکان بننے کے پہلے اس کے ذہن، نقشہ پر بکھری ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ اس لیے ضروری ہے تاکہ مکان بننے سے پہلے وہ اپنے ذہن میں اچھی طرح اُس کو محفوظ کرلے۔ چنانچہ وہ اپنے تخیل کی دنیا میں عمارت کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے مکان بننے کے بعد وہ نظر آتی ہے۔ اگر وہ اس پر عمل نہ کرے تو صاحب مکان کی ضرورتوں کو عملی شکل بھی نہ دے پائے گا۔ اس نقشہ کی مدد سے وہ ان دشواریوں کو محسوس کر لیتا ہے جو مکان بننے کے بعد اچانک نظر آجانے والی ہیں۔ اس لیے پہلے سے ہی وہ تراش خراش کے ذریعہ کتنے اقدامات اُٹھا سکتا ہے۔ مکان بنانے والے کو کسی بات کی تکلیف نہ ہو اور اس کے تمام مقاصد پورے ہو جائیں۔ یہ اچھے آرکیٹکٹ کا اہم مطمح نظر ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی زمین اور روپیوں کی کفالت بھی ذہن میں آتی ہے۔ لیکن ہندوستان میں عام طور سے عمارت سازی چاہے گاؤں کی ہو یا شہروں کی اس طرح دھیان نہیں دیا جاتا۔ نتیجہ برابر دیکھنے میں آتا ہے کہ نہایت بھونڈے، مضحکہ خیز مکانات تعمیر ہوتے ہیں اور اس تعمیر سازی میں زمین اور اخراجات کی بھی زیادتی دیکھنے کو ملتی ہے۔ لیکن ماہرین کی مدد سے نہ صرف روپیہ اور زمین کی بچت ہو جاتی ہے بلکہ وقت اور محنت کی بھی بچت ہوتی ہے جو اس مصروف ترین زمانہ میں بے حد گراں ہیں۔

لہٰذا ہوشیار اور باشعور افراد ایک اچھے آرکیٹکٹ سے نقشہ اپنی ضرورتوں کے پیش نظر بنواتے ہیں۔ اب یہ آرکیٹکٹ ڈیزائن کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ ڈیزائننگ فیصلہ صادر کرنے کے قاعدہ کو کہا جاتا ہے۔ یہ ایک طرح کا ایسا قاعدہ اور ضابطہ ہے جس کے ذریعہ سوچی سمجھی اسکیم کو جب اس کی عملی شکل اختیار کرنے والی ہو قابو میں رکھا جا سکے۔

ریسرچ پر یہ مثال اچھی طرح چسپاں ہوتی ہے۔ سوال ناموں، سروے یا فیلڈ اسٹڈی سے پہلے ہمیں اچھی طرح اس پر غور کرنا ہے کہ ان سے پیدا شدہ مسائل کس طرح حل کیے جائیں۔ اسکالر کے دماغ میں بہت ممکن ہے بے شمار خیالات اور ڈیزائن آتے ہوں۔ لیکن ان تمام باتوں کو یاد رکھنا کسی بھی ریسرچ اسکالر کے لیے ممکن نہیں۔ اس لیے وہ علامتوں کو اخذ کرتا ہے یا بعض تصور کی جگہ ایک نشان بنالیتا ہے۔ اس کی مدد سے وہ ریسرچ کی باتوں کو ذہن میں محفوظ کر لیتا ہے اور انھی نشانات اور علامتوں کی موجودگی میں وہ پورے ریسرچ کا نقشہ مکمل طور پر دیکھ سکتا ہے۔ کہاں خامی رہ گئی، کہاں غیر ضروری چیزیں شامل ہوگئیں۔ یہ سب اسی وقت اس کی نگاہوں کے سامنے اُبھر سکتی ہیں جب وہ علامتوں کے ذریعہ دائرۂ عمل کی دنیا سے واقف ہو۔

ریسرچ ڈیزائن کا تعلق تحقیق کی مندرجہ ذیل باتوں سے ہے۔

۱۔ تحقیقی مطالعہ کے موضوع کی نوعیت کیا ہے اور اُس سلسلے میں کس طرح کی معلومات اور اعداد و شمار کی تلاش ہے؟

۲۔ تحقیق کیوں کی جارہی ہے اور اس کے مقاصد کیا ہیں؟

۳۔ معلومات کا ذخیرہ کہاں ملے گا؟

۴۔ کن کن علاقوں میں مطالعہ ضروری ہوگا؟

۵۔ تحقیق کے لیے مطالعہ میں کتنی مدت لگے گی؟

۶۔ مواد کا کتنا ذخیرہ درکار ہے؟

۷۔ ڈاٹا جمع کرنے کے طریقے کیا ہوں گے؟

۸۔ ڈاٹا کو کس طرح تنقید و تجزیہ کی منزلوں سے گزارنا ہے؟

۹۔ ان باتوں کو کس طرح بروئے کار لایا جائے تاکہ کم سے کم وقت اور روپیوں میں تحقیق مکمل ہوجائے یہ ضروری ہے اس لیے Cook اور State Deutsh, Jahoda, Selitiz, نے ریسرچ ڈیزائن کو ڈاٹا جمع کرنے کے فیصلوں سے تعبیر کیا ہے جس کی وجہ سے ہر امر میں کفایت شعاری کا عمل ممکن ہوجاتا ہے۔ ڈاٹا کس طرح جمع کیا جائے Samples کا انتخاب، جمع کیے گئے ڈاٹا کی یکجائی کا مسئلہ پھر اس کا تجزیہ اس طرح ہو کہ تحقیق کے مقاصد اور اس کی معنویت باقی رہے، ریسرچ ڈیزائن میں شامل ہے۔ سائنسی نقطہ نظر سے ڈیزائن کو ریسرچ کے خصوصی طریقہ کار کی حدود میں رہنا چاہیے۔ اسکالر کو طریقہ کار سے بخوبی واقف ہونا چاہیے اسی حد تک کہ اس کا ہر تحقیقی عمل بے توجہی سے مبرا ہو ایسا کرنے سے جو ڈیزائن ترتیب پائے گا وہ خالص سائنسی ہوگا جو اور کسی دوسرے طریقہ سے سائنسی نہیں بن سکتا۔

ریسرچ ڈیزائن کی ضرورت جو سائنسی طریقہ کار کی حدود میں رہ کر پوری ہوتی ہے، حسب ذیل امور کی بنا پر پیش آتی ہے:

۱۔ بہت سی تحقیق میں اسکالر کو تفتیش و تلاش کے سلسلے میں جمع کیے گئے اعداد و شمار کی معنویت اور افادیت کا مکمل شعور نہیں ہوتا۔ وہ یہ طے نہیں کرپاتا کہ کس حد تک غیر ضروری اطلاعات اور معلومات کو برداشت کیا جائے۔ اگر وہ ان کمزوریوں سے واقف ہے تو وہ ریسرچ ڈیزائن کی ترتیب کی مدد سے دور کرسکتا ہے۔

۲۔ بہت سے ریسرچ پروجیکٹس میں معینہ مدت سے زیادہ وقت لگ جاتا ہے۔ اس طرح اس کی شناخت اور تجزیہ میں مزید اوقات ضائع ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ریسرچ ڈیزائن کی تکنیک سے اسکالر آگاہ ہے اور اس نے اپنے پروجیکٹ کا ریسرچ ڈیزائن بنایا ہے تو وہ بہت کم وقت میں اپنا کام کرے گا۔ تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو کی تلاش آج کی سماجی اور ادبی تحقیق کا ایک اہم نکتہ بن چکا ہے۔ اس کی خاطر غیر ضروری دوڑ دھوپ کی پریشانی مول لینی پڑتی ہے لیکن ڈیزائن بن جانے کے بعد غیر ضروری پریشانیوں سے اس کو نجات مل جاتی ہے۔ جب تک ریسرچ کا مناسب پلان نہیں کیا گیا ہے اسکالر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہے گا۔

۳۔ Ackoff نے ایک معیاری اور اعلیٰ ریسرچ ڈیزائن کے سلسلے میں لکھا ہے:

"The Idealized Research Design is concerned with Specifying the optimum research procedure that could be followed, were there no practical restrictions".

پہلی نظر میں Ackoff کا بیان قابل عمل نہیں معلوم ہوتا اور اسکالر پوچھ سکتا ہے کہ اُن طریقہ کار کی واقفیت حاصل کرنے سے فائدہ کیا! جن پر کار بند نہیں ہوا جاسکتا۔ لیکن ماہرین نے Optimum research condition کے لیے اسے ضروری قرار دیا ہے۔ عملی ریسرچ ڈیزائن چار اہم نکات پر مبنی ہے۔

۱۔ فطرت سے ہم آہنگی پیدا کرنے یا اس میں نئی حقیقتوں کی تلاش کے ذریعہ کسی مفروضہ کی تخلیق کرنا تاکہ ریسرچ کا مسئلہ نئے طریقہ سے سامنے آسکے۔

۲۔ کسی خاص حالت، فرد یا جماعت کی خصوصیات کو بیان کرنے کے سلسلے میں اس ڈیزائن کی ضرورت ہے اس ضمن میں جس قسم کا مطالعہ کیا جاتا ہے اُسے Descriptive studies کہتے ہیں۔

۳۔ کسی واقعہ کے تواتر سے ہونے، اُس کا مطالعہ کیا جانا اسی دائرہ میں آتا ہے۔ اس طرح کا مطالعہ مقصود ہو تو اُسے Diagnostic studies کہتے ہیں۔

۴۔ مفروضہ کے تشخص کی خاطر (افتراقات) Variables کے آپسی رشتہ کا مطالعہ جسے تجرباتی مطالعہ کہتے ہیں اس قسم میں شامل ہے۔

وضاحتی اور تجرباتی مطالعہ میں صحت اور درستی مطالعہ شرط ہے۔ تاکہ تعصبات سے اسکالر بری ہوکر شہادتوں کو جمع کرے۔ ان دونوں قسموں کے ذریعہ ریسرچ ڈیزائن کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ وہ مطالعہ جہاں مفروضہ کا امتحان مقصود ہو (یعنی تجرباتی مطالعہ) قواعد و ضوابط سے آزاد نہیں ہے ہاں اس کے ذریعہ اسکالر کا تعصب کم ہوجاتا ہے۔ لہٰذا تجربوں کو اس نقطہ نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

تفتیش و تلاش کی خاطر کیے جانے والے مطالعہ کا خاص مقصد کسی مسئلہ کو اصولی شکل میں ترتیب دینا ہوتا ہے۔ تاکہ اسکالر دلچسپی لے اور ریسرچ ڈیزائن کی بہتر ترتیب و پیش کی جاسکے۔ کیونکہ بقول Max Weber:

Every Scientific Fulfilment Raises New Questions it asks to be surpassed and out dated".

مفروضات اوران کی نوعیت

ریسرچ کا آغاز کسی نہ کسی مسئلہ سے ہوتا ہے یا کوئی دشواری اس کی ابتدا کرتی ہے اور پھر ذہن تحقیق کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ جو دشواریاں نتائج کی راہ میں حائل ہوں اور مقاصد کی برآوری میں سدِ راہ ہیں انھیں دور کیا جائے، تا کہ صحیح حل کا راستہ ہموار ہو سکے۔ اس لیے بہتر صورت یہ ہوتی ہے کہ اسکالر اپنی دشواریوں اور موضوع سے متعلق مسائل کا ایک واضح نقشہ اپنے سامنے رکھے اور پھر اسے حل کرنے کی طرف مائل ہو۔ انھی مسائل اور دشواریوں کو حل کرنے کے لیے ایک مفروضہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ مفروضات تحقیق کے دوران صحیح ثابت ہوں۔ لیکن اسے غلط ثابت کرنے کے لیے بھی تحقیق کی راہوں سے گذرنا ہے۔ لہٰذا مفروضات کا ذہن میں صاف نقشہ موجود رہنا ضروری ہے۔ جب یہ احاطہ تحریر میں آ گیا تو اسے پانے کے لیے مفروضات کے تمام چھوٹے بڑے نکات اُبھر جاتے ہیں، جنھیں ایک اسکالر حقائق کی روشنی میں پرکھتا ہے۔ اگر مفروضہ درست نہیں ہے یا سرے سے بنایا ہی نہیں گیا ہے تو اسکالر کا ذہن کبھی منطقی طور پر سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس کی تحقیق آگے نہیں بڑھ سکتی۔ گویا مفروضہ کی نوعیت نگراں کی ہوتی ہے جو ہر لحہ اسکالر کو ہدایت دیتا رہتا ہے۔ اگر ہدایت کا یہ سرچشمہ ہوشیاری، دیانت اور بہتر طور پر تیار نہیں کیا گیا ہے تو تحقیق مکمل نہیں ہوگی۔ مفروضہ اسکالر کو حقائق اور اعداد و شمار کی ایک وسیع و عریض دنیا میں لے آتا ہے، جہاں اُسے اپنے کام کے مواد کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ یہ مواد ایسا ہوتا ہے جو معنویت سے پُر ہوتا ہے اور جو مسائل کے حل کرنے میں مدد کرتا ہے۔ مواد کی صرف فراہمی تحقیق کے مسائل کو حل نہیں کرتی بلکہ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ مثبت اور منفی مواد الگ الگ حاصل کیے گئے ہوں تا کہ اپنے نقطۂ نظر کی تردید اور تائید میں مدد مل سکے۔ نقطۂ نظر کی یہی دنیا مفروضات کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے بغیر کسی قسم کی تحقیق ممکن نہیں۔ Lendberg مفروضات کی وضاحت اس طرح کرتا ہے۔

The only difference between gathering data without a hypothesis and gathering them with is that in the latter case we deliberately recognize the limitations of our senses and attempt to reduce their fallibility by limiting our field of investigation so as to prevent greater con-centration of attention on particular aspects which past experience leads us to believe are insignificant for our purpose.

p.65

Methodology and Technique
Of Social Research
(Wilkinson & Bhanlarkar)

مفروضہ کے سلسلے میں عام طور سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی مدد سے مواد کی نوعیت اُن کی فراہمی کے ذرائع تک آسانی سے اسکالر کی رسائی ہو جاتی ہے جس کے بغیر محقق جواب نہیں لکھ سکتا۔ اس کی روشنی میں مواد کی ترتیب و تزئین بھی کی جاتی ہے۔ یوں مفروضہ کی تعریف مقصود ہو تو Webster New International Dictionary of English Language.1986. کی بتائی ہوئی تعریف دیکھنی چاہیے۔

"The word hypothesis, as a proposition, condition or principle which is assumed perhaps without belief, in order to draw out its logical consequences and by this method, to test its accord with facts which are known as may be determined".

Cohen اور Nagal اس سے دو قدم آگے بڑھ کر کہتے ہیں یہ

"We can not take a single step forward in any enquiry unless we begin with a suggested explanation or solution of the difficulty which originated it. Such tentative explanations are suggested to us by something in the subject matter and by one previous knowledge, when they are formulated as propositions, they are called hypothesis".

ایک بار جب اسکالر اپنے مسائل اور اس کی نوعیت کو سمجھ لیتا ہے تو وہ اُس کے حل کا ایک مبہم سا خاکہ ذہن میں ضرور تیار کر لیتا ہے۔ مشکل سوالات کا بالکل ٹھیک نہیں تو ایک حد تک صحیح جواب کے قریب وہ پہنچ جاتا ہے۔ اب Werkmeister کے مطابق یہی خیال اور قریب تر جواب یا حل مفروضہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ یا تو مسائل کا حل پیش کر دیتا ہے یا اُسے مزید تحقیق کی طرف آمادہ کر دیتا ہے۔ لہٰذا یہ کہا جانا غلط نہیں ہے کہ مفروضہ عارضی ضابطہ سازی ہے۔ اسکالر اس تصور سے تحقیق کی ابتدا کرتا ہے کہ اس نے جو مفروضہ بنایا ہے وہ صحیح ہے۔ اپنے اس موقف کی وجہ سے وہ مشاہدات، مطالعہ اور اس کے منطقی نتائج تک بہ آسانی پہنچتا ہے۔ اگر اس کا مفروضہ درست ہے تو وہ مشاہدات اور مطالعہ کے دوران اپنی صداقت کا ثبوت فراہم کر دے گا اور اگر غلط ہے تو بھی اُس کی تصدیق کرے گا۔ اگر مفروضہ معیار پر صحیح و سالم اُتر گیا تو اسکالر کی منزل قریب آ گئی اور اس کو مسائل کا حل مل گیا۔ لیکن اگر مفروضہ کی تردید ہو گی تو اسکالر کو مجبوراً مفروضہ میں تبدیل کرنی ہو گی اور پھر اس کو تجربات کی روشنی میں پرکھنا ہو گا۔ اس طرح ایک مفروضہ تحقیق کی درمیانی منزل کی طرح سامنے آتا ہے جہاں سے وہ پھر مسائل کی نوعیت کا جائزہ لے سکتا ہے اور مزید اعداد و شمار جمع کر سکتا ہے۔

مفروضہ اصولی شکل میں بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ یعنی کیوں، کس طرح اور کیا، جیسے سوالوں کا جواب حاصل کرنے کے قریب مفروضہ کی اصولی شکل آ جاتی ہے۔ مفروضہ مختلف شکلوں میں تیار کیا جاتا ہے۔ اس میں اسکالر اور نگران کی ذہانت اخذ کرنے کی صلاحیت اور نظریاتی لباس پہنانے کی متانت بھی ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ خاصا مشکل کام ہے اور ابتداء میں اس کی رفتار بے حد سست ہوتی ہے اس لیے جو اسکالر تخیل کی دولت سے محروم ہیں اور علم سے بھی بہرہ مند نہیں تحقیق ان کے بس کی بات نہیں۔

جب Cohen اور Nagel یہ کہتے ہیں کہ مفروضہ کے بغیر ایک قدم بھی آگے بڑھنا مشکل ہے تو وہ صرف مفروضہ کی اہمیت اور ضرورت پر زور دیتے ہیں تا کہ اسکالر تلاش و جستجو کی راہوں کو بہ آسانی طے کر سکے۔ اس لیے تحقیق کی ابتدا ہی میں مفروضہ کی تعمیر اس کی اہمیت کو محسوس کرنا لازمی ہے اور یہ شعور بھی ضروری ہے کہ پوری تحقیق میں مفروضہ کا کردار بے حد اہم ہوتا ہے۔ Chaddock مفروضہ کی اہمیت بتاتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

> مفروضہ سائنس کی زبان میں دریافت شدہ حقائق کی تشریح و تفسیر ہے۔ وہ تفتیش کو بامعنی بناتا ہے۔ تلاش جستجو کی راہوں کو طے کرتا ہے۔ اس کے بغیر اسکالر نہ جمع کیے گئے مواد کا مناسب استعمال کر سکتا ہے اور نہ غیر ضروری مواد کو خارج کر سکتا ہے۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ ایک مفروضہ کی عدم موجودگی میں وہ بالکل اُلٹا کام کر دے۔ اس لیے تحقیق کی ابتدا میں ہی نگراں اور اسکالر دونوں کو مفروضہ کی ہیئت اور نوعیت کو سمجھ لینا چاہیے۔

مفروضہ بھی ایک نہیں ہوتا۔ اس کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں۔ لیکن یہ قسمیں صرف مجرد تصورات کی بنیاد پر ہی کارآمد ہوتی ہیں۔ Goode اور Hatt دونوں نے ہی مجرد تصورات کے تئیں تغیر پذیر معیار کا جائزہ لیا ہے۔ پھر مفروضات کے سرچشمہ سے بحث کی ہے۔ ادب اور سائنس کے ہزار سالہ تاریخی سرمایہ سے مفروضات لیے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی محقق کی اپنی افتادِ طبع کی حیرت انگیزی مفروضہ کو جنم دیتی ہے۔ کہیں عوامی عقائد، تصورات اور نظریات کی بنیاد پر مفروضات بنائے جاتے ہیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ اُردو ادب کا اسکالر صرف میر اور غالب تک اپنی تحقیق کو محدود رکھے اور اپنے کلاسیکی ادبی سرمایہ کی بنیاد پر ہی مفروضہ کو تلاش کرے۔ وہ عصری علوم اور دانش وروں کے کارناموں کو بھی پیش نظر رکھ سکتا ہے۔ مثال کے لیے وہ اُردو میں فیملی پلاننگ، پر تخلیق کیے گئے ادب کو موضوع بنائے اور اس طرح کا مفروضہ تعمیر کرے جس سے اس حقیقت کا پتہ چلے کہ اُردو معاشرے میں فیملی پلاننگ اس لیے مقبول نہیں ہو سکتی کہ وہاں مذہب ایک بڑی رکاوٹ ہے۔

چنانچہ مذہب معاشرے کی اصلاح اور خوش حالی کی راہ میں رکاوٹ ہو گیا ہے۔ اب اس طرح کا ادب صرف کلاسیکی روایات کی نمائندگی نہیں کر سکتا۔ بلکہ عصری آگہی کے زیر اثر تراشا گیا مفروضہ اسکالر کو مجبور کرے گا کہ وہ سماجی علوم اور بدلتے ہوئے حالات کو اپنے ریسرچ کا موضوع بنائے اور پھر اس سے متاثر ہو کر مفروضہ اپنی نئی شکل و صورت اختیار کرے گا اور نئے سماجی و معاشرتی حالات مفروضہ کا سرچشمہ قرار پائیں گے۔ بعض مفروضے نظریات کی دین بھی ہوتے ہیں۔ ان نظریات کی تائید میں بھی مفروضے بنتے ہیں اور ان کی تردید میں بھی۔ مارکسی جمالیات پر اگر ریسرچ کیا جا رہا ہے تو ضرورت اس بات کی ہو گی کہ مارکسزم اور جمالیات دونوں کے مختلف اسکول کا جائزہ لیا جائے۔ ان میں سے اگر ایک کی تائید یا تردید مقصود ہے تو مفروضہ کی ہیئت میں ویسی ہی تبدیلی کرنی ہو گی اور بنیادی باتیں پیش نظر رکھنی ہوں گی۔

اس طرح اگر اردو زبان کو ایک کلچر کے فارم میں کوئی اسکالر دیکھنا چاہتا ہے تو اسے اپنے مفروضہ کو کلچر کی تعریف، اس کی وسعت کی روشنی میں ترتیب دینا

ہو گا۔ اب کلچر کا مطالعہ اور اُردو بولنے والوں کی تہذیب وتمدن کی تاریخ بھی سامنے رکھنی ہوگی۔ اس طرح اسکالر صرف کلاسیکی ادبی خزانوں تک اپنی واقفیت کی دنیا محدود نہیں رکھ سکتا۔ اسے سماجی زندگی کے بالائی زینوں تک چڑھنا ہوگا۔ اس لیے میں برابر اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہوں کہ ادب اور آرٹ کا مطالعہ اس وقت محض ایک نقطۂ نظر سے کرنا درست نہیں۔ بلکہ اس کا Interdisciplinary مطالعہ ضروری ہے۔ لہٰذا اچھے اور کامیاب مفروضہ کے لیے Larrbee کی زبان میں ماضی کا تجربہ اور قوت تخیل دونوں ہی لازمی ہیں۔ ماضی لاکھوں سال کی ثقافت وتہذیب کا بڑا انمول خزانہ پوشیدہ رکھتا ہے اور انسان کی قوت تخیل اس سے جب چاہے خوبصورت پیکر تراش لیتی ہے۔ یہاں اس کا عمل بڑے سنگ تراش کا سا ہوتا ہے، جو بے رونق، بھدے پتھروں کو اپنے خونِ جگر سے رنگین بنا کر ایک نئی زندگی عطا کرتا ہے۔

اب مفروضہ کے عناصر اور خصوصیات کا جائزہ بھی لے لیں:

۱۔ ایک مفروضہ تجرباتی نقطۂ نظر سے قابلِ قبول ہو۔ تاکہ اُس سے ضروری نتائج برآمد ہو سکیں۔

۲۔ مفروضہ ایسا ہو جس پر تحقیق کی عمارت کھڑی کی جا سکتی ہو جہاں مشاہدات اور مطالعہ کے ذریعہ حقائق کی از سرِ نو تشریح وتفسیر ممکن ہو۔

۳۔ نظریاتی نقطۂ نظر سے اس کی شکل وصورت واضح ہو۔ تصور اور نظریہ کی وضاحت ہونی چاہیے۔ کوئی چیز پیچیدہ اور گنجلک نہ ہو۔

۴۔ مفروضہ کا بالکل ہی غیر مبہم ہونا ضروری ہے اور کوئی عمومی بات نہیں ہونی چاہیے۔

۵۔ بہتر ہو اگر مفروضہ کسی تصور یا نظریہ سے متعلق ہو۔ اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ تصورات سامنے آتے ہیں۔ ایک مثال کے ذریعہ یہ بات واضح ہو جائے گی۔ جدیدیت، کے موضوع پر پچھلے چند برسوں سے اُردو کے ادیب وشاعر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔ اب اگر ان پر کوئی اسکالر تحقیق کرنا چاہے تو اس کو اپنا مفروضہ ایسا بنانا ہوگا جس کی بنیاد نظریات پر رکھنی ہوگی۔ اب فلسفہ کے مختلف سکول سامنے آئیں گے اور مختلف مشرقی ومغربی تصورات بھی زیر بحث ہوں گے۔ اس طرح بہت ممکن ہے جدیدیت کی اس بحث اور تحقیق میں، کوئی نئی بات، کوئی نیا نظریہ ابھر کر سامنے آئے یا جدیدیت بحیثیت فلسفہ ہی غائب ہو جائے۔ مگر یہ سب اُسی وقت ممکن ہے جب مفروضہ کی تعمیر سائنسی ہو اور ان حقائق کی طرف اسکالر راغب ہو، جن کا ذکر کیا گیا ہے۔

تصورات

نظریات وتصورات کا تحقیق اور اس کے طریقہ کار میں بڑا دخل ہے۔ تصورات، مشاہدات، کی منزلوں سے گزرتی ہوئی اشیاء کا ماورائی نام ہے۔ اس کے دائرے میں حادثات اور ماحول شامل ہیں۔ جن میں شب وروز زندہ رہنے والا انسان بغیر کسی نظریہ کی وضاحت یا وجود وعدم سے قطعی غافل رہتا ہے۔ لیکن ان ہی سیکڑوں انسانوں میں بعض ذہن دن رات رونما ہونے والے واقعات اور حادثات سے استفادہ حاصل کرتے ہیں۔ وہ انھیں بنیاد بنا کر کسی مخصوص تصور کی فلسفیانہ وضاحت کرتے ہیں اور مخصوص تصورات، مشاہدات اور تجربات وحادثات کی راہوں سے گزرتے ہوئے کسی نئے نظام حیات کی داغ بیل ڈالتے ہیں۔ اسی لیے Parsons کہتا ہے کہ کوئی بھی تجزیاتی علم ایسا نہیں ہے جس کا کسی نہ کسی طرح تصور یا نظریہ سے کوئی رشتہ رہا ہو۔ لہٰذا تحقیق کا بنیادی خاکہ بناتے وقت ذہن میں چند تصورات بھی قائم ہوتے ہیں یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مخصوص تصورات کی بنیاد پر ہی بعض تحقیقی مفروضات جنم لیتے ہیں اور اسکالر یا محقق ان ہی مبہم تصورات پر عمارت کی بنیاد رکھتا ہے۔ جوں جوں تحقیقی کام آگے بڑھتا ہے اس عمارت میں استحکام آتا جاتا ہے اور جب تصورات واضح اور صاف ہو جاتے ہیں تو مفروضات کا استدلالی نظام بے حد توانا اور تابناک ہو جاتا ہے۔ پھر کوئی پیچیدگی اور ابہام باقی نہیں رہتا۔ اس طرح تحقیق میں نظریہ اور تصور کی بڑی اہمیت ہے۔ اسے اسکالر اور اس کے نگران کو شروع ہی میں سمجھنا چاہیے۔

بعض تصور ہمارے تحقیقی مقاصد اور حقائق سے قریب ہوتے ہیں۔ ایک اسکالر کے لیے کسی تصور کا واضح خاکہ، نقشہ ذہن میں پہلے سے موجود رہنا ضروری ہے اور اس کا تحقیق کے طریقہ کار سے گہرا تعلق ہے، جب تک کوئی تصور اسکالر کے دماغ میں ہے کسی کو اُس سے کوئی مطلب نہیں۔ لیکن جب وہ اسے کاغذ میں تحریری شکل دیتا ہے تو وہ تصور اس کے دماغ سے نکل کر حقائق کی دنیا میں آجاتا ہے جہاں وہ تنقید وتجزیہ کی منزلوں سے گزرتا ہے اور ترسیل کی دشوار راہوں سے سفر کرتے وقت اسکالر کی تمام صلاحیتوں کو بے نقاب کر دیتا ہے۔ ہو سکتا ہے بعض تصور مطالعہ کی دھند میں غائب ہو جائے۔ اس لیے اچھی تحقیق اپنے اختتام میں تصورات کو واضح اور روشن کر دیتی ہے۔

سماجی علوم کی تحقیق میں ادبیات کی طرح اس کی بہت ضرورت ہے۔ ادبیات میں تصورات کا مسئلہ عام طور پر جمالیاتی یا فلسفیانہ ہوتا ہے۔ لیکن سماجی علوم میں اس کا تعلق معاشرتی نظام سے گہرا ہے۔ اس لیے وضاحت شرط ہے۔ ورنہ محقق کا ایک بڑا نقص سمجھا جائے گا۔ ابتدا سے تحقیق کی آخری منزل تک تصورات اسکالر کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اُس کے ذہن کے دھندلکوں کو دور کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ہدایت کا فرض انجام دیتے ہیں۔ اس سے ذہن کی پختگی ظاہر ہوتی ہے اور ریسرچ کا ایک بڑا تقاضا پورا ہوتا ہے۔

تحقیق کا نظریات سے رشتہ

تجرباتی یا استدلالی تحقیق کا نظریات سے گہرا رشتہ ہے۔ بغیر کسی تصور اور نظریہ کے یہ تحقیق آگے نہیں بڑھتی۔ ایک سائنس دان اپنی تجربہ گاہ میں برابر مصروف رہتا ہے۔ ان تسلیم شدہ حقائق کی کھوج اور تجزیہ میں جنھیں ایک ماڈل کی حیثیت سے لوگوں نے مان لیا ہے۔ اُس کا یہ عمل کسی نہ کسی نظریہ پر مبنی ہوتا ہے۔ مگر یہ بات برابر پوچھی جاتی ہے کہ تحقیق اشیاء کی افادیت کے تجربہ کے دوران کیوں کسی نظریہ کے تابع ہوگی یا کسی طرح وہ نظریات وتصورات کے قریب ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ ان کی حیثیت ایسے ہم راہی کی ہے جن کے سفر کا آغاز ایک خاص منزل سے ہوتا ہے۔ لیکن یہ زندگی میں پھر کبھی ایک مقام پر نہیں ملتے۔

نظریات کا لفظ ان دنوں اس قدر عام سا ہو گیا ہے کہ ہر کس و ناکس اپنے ناقص، بھونڈے اور بیہودہ خیالات کو نظریات کا نام دے دیتا ہے۔ لیکن اس کے سائنسی مفہوم کو اسکالر کے لیے سمجھنا ضروری ہے تاکہ وہ بہ آسانی اس کے عام اور ناقص مفہوم سے ممیز کر سکے۔ عام طور پر خیالات کو ہی نظریہ کا لباس پہنا دیا جاتا ہے۔

جو شے اصولی اور نظریاتی ہوتی ہے اس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ غیر حقیقی، تصوراتی اور غیر عملی ہوتی ہے۔ Metron کہتا ہے کہ صرف ماہر سماجیات کے نزدیک اس کے چھ سے زیادہ مطالب ہیں۔ زمانہ قدیم میں آرام طلبی کے ساتھ کسی وہم اور تصور کو نظریہ کا نام بھی دیا جاتا تھا حالانکہ اس کی پشت پناہی کسی طرح کا استدلالی نظام نہیں کرتا تھا۔ لیکن جوں جوں علم و دانش کی فتح ہوتی گئی نظریہ اور مشاہدات کا رشتہ ایک دوسرے سے مضبوط ہوتا گیا۔ فی الحال کسی نظریہ یا اصول کا بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے جو معلومات اور علم کی دنیا ہمیں میسر ہے اس کے ذریعے مشاہدات کی تشریح کی جاسکے۔ Karl Popper اپنی تخلیق Logic of Sientific Discovery میں اس کی وضاحت کرتا ہے۔

"Theories are nets cast to catch, what we call the world, to rationalize, to explain and to master it. We endeavour to mesh finer and finer".

عہد پارینہ کے برعکس جب کہ اصولوں اور نظریوں کی بنیاد کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھنا گناہ سمجھا جاتا تھا، موجودہ عہد میں کسی نظریہ کو برابر چیلنج کیا جاتا ہے۔ خواہ مخصوص اصولوں اور نظریوں کی فکری پشت پناہی کیوں نہ کی جارہی ہو اور حقائق کا بڑا خزانہ استدلالی نظام کی شکل میں اُس کی اعانت کے لیے کیوں نہ کھڑا ہو۔ یہ اصول و نظریہ تنقید سے ماورا نہیں سمجھے جاتے اور ان کی روشنی میں اُن پر نظر ثانی ہوتی رہتی ہے۔ ایک وقت تھا جب نیوٹن کے دریافت شدہ فطری قوانین حیرت انگیز انکشافات کی طرح سامنے آئے تھے لیکن آئن اسٹائن نے اپنے نظریہ اضافیت کے ذریعہ نیوٹن کی تمام تحقیق کو رد کر دیا۔ رد کرنے کا یہ عمل بیسویں صدی میں زمانہ قدیم کی بہ نسبت بہت آسان ہے اس کے لیے سائنس دان کو آرکمیدس کی طرح اپنی جان گنوانے کا خطرہ مول لینا نہیں پڑتا۔ یہ نئی فضا اس تجرباتی تحقیق کے ذریعے پیدا ہوتی ہے جس کا اصول و نظریہ سے گہرا رشتہ ہے۔ اس وقت کی سائنس تمام دریافتوں کو عارضی سمجھتی ہے۔ اس نے صرف دنیا کا چہرہ نہیں بدلا بلکہ اپنی شکل و صورت بھی بدل ڈالی ہے۔ آج سائنسی طریقۂ کار کی اہمیت علم کے تمام شعبوں میں ہو گئی ہے۔ اس نے طریقۂ کار پر زور دیا ہے۔ اس طریقۂ کار کے ذریعہ ہی مختلف علوم میں تحقیق کی دنیا بدلتی رہتی ہے۔ اس کے ذریعہ ہماری فکر و نظر میں بڑا انقلاب رونما ہوتا ہے۔

John Galtung تھیوری کو مفروضات کا ایک سیٹ سمجھتا ہے جسے نتیجہ اور مفہوم نے استنباط کے ذریعہ کھڑا کر دیا ہے۔ اس وقت کا علم سائنس داں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ بدلے ہوئے حقائق کی روشنی میں نئے اصول و نظریات بنائے اور اس کی بھی وضاحت کرے کہ کس طرح یہ اصول و نظریات اُن مشاہدات کی تشریح کرتے ہیں جن سے ہم سب دوچار ہوئے ہیں۔

کسی خاص تھیوری کا یہ مقصد بھی ہونا چاہیے کہ وہ اُن مشاہدات کی طرف اشارہ کرے، جن کے ذریعے اس تھیوری کو چیلنج کیا جاسکتا ہے۔ تھیوری کے ذریعہ ہی تحقیق کرانے کی منزلیں آسان ہوتی ہیں۔ ایک طرح سے رہنمائی کرتی ہیں۔ آئن اسٹائن تو یہ بھی کہتا ہے کہ تھیوری ہی یہ بتاتی ہے کہ کن چیزوں یا کن حقائق کو مشاہدات کے دائرے میں لایا جائے۔ پھر تھیوری ہی تحقیق میں نتائج کی اہمیت روشن کرتی ہے اور تحقیق جب اپنی آخری منزل میں پہنچ جاتی ہے تو اسکالر نظریاتی طور پر

بے حد کھلے ذہن کا فرد معلوم ہوتا ہے۔ اس کے پاس اپنے موضوع سے متعلق اصولی طور پر کوئی بات نا قابل فہم نہیں رہ جاتی۔ وہ اپنی تحقیق کے ذریعہ جس نتیجہ تک پہنچتا ہے وہیں سے وہ مستقبل میں پیدا ہونے والے سوال نامہ کو بھی جنم دیتا ہے۔ اس طرح اصولوں اور نظریوں کا تحقیق سے رشتہ دوطرفہ ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ صرف تھیوری ہی تحقیق کی اعانت نہیں کرتی بلکہ تجرباتی تحقیق اصولوں اور نظریوں کی کس طرح تشکیل کرتی ہے وہ بھی قابل لحاظ ہے۔

تجرباتی تحقیق کا ایک اہم کام یہ بھی ہے کہ وہ اُن مفروضات کی تصدیق اور جانچ کرے جو مسلمہ اصول ونظریہ سے اخذ کیے گئے ہیں۔ مخصوص حالات کی روشنی میں ماہرسماجیات کی پیشین گوئیاں یا اُن کے ذریعہ بنائے گئے قوانین اور نظریات کس حد تک صداقت پر مملو ہیں اور کہاں تک ان میں حقائق کا پرتو پوشیدہ ہے یہ دیکھنا محقق اور تجرباتی تحقیق کا خاص کام ہے۔ اگر ان مفروضات کی جانچ کی گئی اور ان کی تصدیق کے بعد بھی اصول ونظریہ کی دیواریں مستحکم ہیں تو یہ بات مان لینی چاہیے کہ ماہرسماجیات نے جو اصول ونظریہ بنائے وہ تجربوں کی دنیا میں صحیح ثابت ہوئے۔

تحقیق چار طرح کے اہم رول ادا کرتی ہے جن کی مدد سے کسی اصول ونظریہ کی شکل وصورت سامنے اُبھرتی ہے:

۱۔ سائنسی تحقیق کبھی کبھی ایسے انکشافات کو جنم دیتی ہے جو نئے نظریوں کی تشکیل کے طالب ہوتے ہیں اور موضوع کے دائرہ میں اپنی ایک نئی جگہ بناتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں سمجھنا چاہیے کہ پرانی تحقیق کے ذریعہ جو چیز حاصل ہوئی اسے ضائع کردیا جائے۔ بلکہ آئن اسٹائن کے لفظوں میں صرف یہ احساس رہنا ضروری ہے کہ یہ قدیم تحقیق کی منزل اب سے بہت چھوٹی اور غیر اہم معلوم ہوتی ہے لیکن اس چھوٹی اور غیر اہم منزل سے ہی ایک بڑی شے کی دریافت ہوتی ہے۔ جھونپڑی سے آج Skyscrpaer کا تصور سامنے آیا ہے۔ تحقیق کے دوران ڈاٹا جمع کرنے کے قاعدے اور سفر میں بہت سی غلطیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ان غلطیوں کا تعلق ہمارے مشاہدات کی دنیا سے ہے۔ جس کے متعلق پہلے سے کبھی سوچا نہیں گیا تھا۔ اس کے نتیجہ میں جو چیزیں سامنے آتی ہیں وہ نئے مفروضات کا تقاضا کرتی ہیں اور ان نئے مفروضات کی مدد سے نئی تھیوری جنم لیتی ہے۔

۲۔ ریسرچ کسی تھیوری کو از سرنو زندہ بھی کرتا ہے یا اسے نئی شکل میں پیش کرتا ہے۔ حقائق کو نظرانداز کرنے کی وجہ سے مشاہدات کی دنیا صحیح نہیں ہوتی۔ جب اسکالر اُن پر غور کرتا ہے تو وہ ان حقائق کا نئے سرے سے جائزہ لیتا ہے اور تھیوری کی بالکل بدلی ہوئی ہیئت سامنے آتی ہے۔ شاعری میں نظیر اکبرآبادی کی مثال سے اُردو کے قارئین آسانی سے سمجھ لیں گے۔ عرصہ دراز تک نظیر اکبرآبادی کو قابل لحاظ شاعر نہیں تسلیم کیا گیا۔ لیکن برسوں بعد جب ایک ناقد نے اسے اُردو شاعری کے آسمان پر تنہا ستارہ کی طرح روشن کہا، تو اچانک شاعر کے تئیں پورا شعری رویہ بدل گیا۔ اسی طرح اقبال کی بھی مثال دی جاسکتی ہے۔ یہ ریسرچ کا ہی کمال ہے کہ اس نے پرانی تھیوری کو اپنے استدلالی نظام کے ذریعے بدل دیا اور ان کی جگہ فکر ونظر سے معمور نئی تھیوری پیش کی۔

۳۔ تجرباتی ریسرچ قدیم تھیوری کو از سرنو روشنی میں لاتا ہے جس سے علم میں اضافہ ہوجاتا ہے، نئی ڈسپلن جنم لیتی رہتی ہے، پرانے اصول ونظریہ نشانہ بنتے رہتے ہیں۔ انھیں سائنس داں اپنی تجربہ گاہوں، دانش ور اپنے تصوراتی محلوں اور ادیب وشاعر اپنے ذہن کے نہاں خانوں میں تجزیہ کی منزلوں سے گزارتے رہتے ہیں اور جب وہ تمام مرحلوں سے گزر کر سامنے آتے ہیں تو یا تو ان کی اصلی شکل برقرار رہتی ہے یا بدل جاتی ہے۔ اس بدلی ہوئی شکل کو ریسرچ نیا لباس عطا کرتا ہے۔ ریسرچ اصول ونظریہ کی تشریح بھی کرتا ہے۔ ریسرچ محض تصورات کی بنیاد پر آگے کی منزلیں طے نہیں کرسکتا اس کے لیے تجرباتی تحقیق کی نشان دہی ضروری ہے۔ تصورات محض تصورات رہتے ہیں۔ اگر ریسرچ کے طریقۂ کار کے ذریعہ انھیں تجرباتی تحقیق کی تجربہ گاہ میں نہ لایا جائے۔ اس لیے نظریہ اور تحقیق ایک دوسرے سے قریبی رشتہ رکھتے ہیں اور ان کا آزادانہ وجود سائنسی نقطۂ نظر سے بے معنی ہے۔

❖❖❖❖

(۱) تحقیق کے طریقۂ کار، ش اختر، ڈاکٹر، گیا، ۱۹۸۵ء، ص ۳۹ تا ۴۶۔

دستاویزی طریق تحقیق[1]

سید جمیل احمد رضوی

دستاویزی تحقیق کو تاریخی تحقیق (Historical Research) بھی کہتے ہیں۔ شروع میں ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ تاریخ سے مراد کیا ہے۔ لغت میں اس کے معنی ہیں وقت کی نشاندہی ''ارخت الکتاب و درختہ'' سے مراد یہ ہوتی ہے کہ میں نے کتابت کا وقت درج کر دیا۔ اصطلاح میں اس کے معنی ہیں وقت بتا کر سارے احوال کو متعین کرنا۔ تاریخ وہ فن ہے جس میں سارے زمانے کے واقعات سے بحث کر کے ان کی تجدید اور وقت کا تعین کیا جاتا ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ اس میں ساری دنیا کے واقعات سے بحث کی جاتی ہے۔ تاریخ کا موضوع ہے ''انسان'' اور ''زمان''۔ لفظ تاریخ (History) کا معنی ہے علم اور سچائی کی تلاش۔ ''دریافت کرنے کے لیے تلاش کا عمل''۔ تاریخ گذشتہ حالات و واقعات کا مربوط بیان ہوتا ہے یا ان کی وضاحت ہوتی ہے جس کو صداقت کے پیشِ نظر تنقیدی زاویۂ نگاہ سے لکھا جاتا ہے۔ چونکہ تحقیق کے اس طریقے میں دستاویزات اور ریکارڈز کا استعمال کیا جاتا ہے اس لیے اس کو دستاویزی تحقیق کہتے ہیں۔ اس طریقِ تحقیق کا استعمال ہر علمی شعبے میں کثرت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ تاریخ، ادب، لسانیات اور انسانی علوم میں یہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔

تاریخ میں گذشتہ حالات و واقعات کو ان کے معاشرتی اور عمرانی پس منظر میں دیکھا جاتا ہے۔ تاریخ کا میدان بہت وسیع ہے اتنا ہی وسیع جتنی کہ انسان کی زندگی۔ یہ انسان کے تمام تر ماضی کے واقعات سے متعلق ہے۔ حالات و واقعات کو تاریخی تناظر میں دیکھنے کے ساتھ ساتھ ان کو اس طرح بھی دیکھنا چاہیے کہ وہ ایک خاص معاشرتی ماحول میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ ان کا ظہور الگ حیثیت سے نہیں ہوتا، بلکہ معاشرتی عمل سے ان کا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ کسی فرد کے سوانحی حالات اس وقت تاریخ کا روپ دھار لیتے ہیں جب اس کو اپنے زمانے کے معاشرے کے حوالے سے زیر بحث لایا جاتا ہے۔ لیکن جب اس کے حالات کو معاشرتی پس منظر سے الگ کر کے زیر بحث لایا جائے گا، تو وہ تاریخ نہ ہو گی۔

طریقِ کار

جب محقق تاریخی تحقیق کے مطابق کام شروع کرتا ہے تو اس کو بہت سے ایسے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے جو دوسری قسم کی تحقیق میں مشترک ہوتے ہیں۔ لیکن وہ چند ایسے مسائل سے بھی دوچار ہوتا ہے جو اس کے موضوع کے ساتھ مختص ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خاص معیار (Standards) اور اسلوب (Techniques) اختیار کرتا ہے۔ طریق کار کے مختلف مدارج درج ذیل ہیں۔

۱۔ مسئلے کی تشکیل۔

۲۔ مآخذ و مصادر کی جمع آوری۔

۳۔ مصادر کی جانچ پرکھ۔

۴۔ واقعات یا حالات کی وضاحت کے لیے فرضیات (Hypothesis) کی تشکیل۔

۵۔ حقائق کی وضاحت اور نتائج کا بیان۔

۱۔ مسئلے کی تشکیل

اس میں عموماً ان اصولوں کا اطلاق ہوتا ہے جو موضوع اور اس کے انتخاب کے بارے میں رہنمائی کا کام دیتے ہیں۔ جس شعبۂ علم میں تحقیق کی جانی مقصود ہو، اس کے مختلف پہلوؤں کو سامنے رکھ کر مسئلے کی تشکیل کی جا سکتی ہے۔ مثلاً اگر تعلیمات کے شعبے میں مسئلے کی تلاش ہے تو اس کے لیے یہ پہلو مفید ثابت ہو سکتے ہیں: افراد، ادارے، انجمنیں، ضوابط، نصابات، انتظامی ہیئت، نصابی کتب، تدریس میں تیاری کا طریق کار، تدریسی ساز و سامان اور وہ اہم تصورات ونظریات جنھوں نے تعلیم کو متاثر کیا ہے۔ اسی طرح اگر لائبریری سائنس کے شعبے میں مسئلے کو تشکیل دیا جا رہا ہے تو کتب خانے، لائبریرینز، اور سروس فراہم کرنے کے مختلف پہلو

تاریخی تحقیق کا موضوع بن سکتے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ لائبریری سائنس میں تنویر جہاں خاں نے اس طریق تحقیق کو استعمال کر کے ایک مقالہ ۱۹۸۱ء میں لکھا۔ اس کا عنوان ہے، ہندوستان میں مسلم حکمرانوں کے عہد میں کتب خانے (۱۲۰۶ء۔۱۷۰۷ء) اسی شعبے میں ایک اور طالبہ اس سال (۱۹۸۲ء) پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے تاریخی جائزے پر کام کر رہی ہے۔ اسی طرح کسی معروف لائبریرین پر تاریخی حیثیت سے کام کیا جا سکتا ہے۔ کتب خانوں کے ارتقا پر اس طریق تحقیق کو استعمال کر کے کام کیا جا سکتا ہے مثلاً وہ کون سی قوتیں تھیں جو برصغیر پاک و ہند میں عوامی کتب خانوں کے قیام کا باعث بنیں یا یہ موضوع بھی ہو سکتا ہے کہ برصغیر میں عہد مغلیہ میں عوامی کتب خانوں کے قیام کا تاریخی جائزہ۔ کتب خانے کی قسم کو سامنے رکھتے ہوئے یہ موضوع بھی بن سکتا ہے۔

پاکستان کے قیام سے لے کر ۱۹۸۰ء تک جامعاتی کتب خانوں کا تاریخی جائزہ۔ بہرحال متعلقہ شعبۂ علم کے کسی پہلو کو سامنے رکھ کر تحقیقی مسئلے کی تشکیل کی جا سکتی ہے۔ بشا اور ہارٹر نے لائبریری سائنس کے تاریخی مقالات کی فہرست دیتے ہوئے مندرجہ ذیل موضوعی سرخیاں قائم کی ہیں:

۱۔ تعلیمی اور تحقیقی کتب خانے
۲۔ سوانح (لائبریرینز کے حالات بحوالہ لائبریری سائنس)
۳۔ عوامی کتب خانے
۴۔ خصوصی کتب خانے
۵۔ لائبریری کی خدمات اور مختلف پروگرام
۶۔ عصری تاریخ

۲۔ مآخذ و مصادر کی جمع آوری

اس مرحلے پر ان مآخذ اور دستاویزات کو جمع کر کے ان سے استفادہ کیا جاتا ہے جن پر تحقیق کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ عام طور پر دو قسم کے مصادر استعمال کیے جاتے ہیں۔ ایک کو بنیادی مصادر (Primary Sources) کہا جاتا ہے اور دوسری قسم کو ثانوی مصادر (Secondary Sources) کا نام دیا جاتا ہے۔

(الف) بنیادی مصادر

یہ وہ دستاویزات ہوتی ہیں جن میں ان واقعات وغیرہ کا ریکارڈ شامل ہوتا ہے جن کو مصنف نے خود دیکھا اور اپنے کانوں سے سنا۔ یعنی بنیادی مصادر میں چشم دید شہادت موجود ہوتی ہے جو تاریخ کی معقولیت (Validity) اور قدر و قیمت کو بڑھا دیتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کی دستاویزات میں ابتدائی معلومات درج ہوتی ہیں۔ جے۔ لیونرڈ بیٹس (J.Leonard Bates) نے کہا ہے کہ عام طور پر مورخین بنیادی مصادر کو دو قسموں میں تقسیم کرتے ہیں۔

بنیادی مخطوطات جن کی مزید تقسیم اس طرح کی جا سکتی ہے۔

(۱) ذاتی کاغذات (۲) دستاویزی ریکارڈز (۳) انٹرویوز (۴) اور متفرقات، بنیادی مطبوعات ہیں۔

(۱) مرکزی حکومت کی مطبوعات (۲) صوبائی حکومت کی مطبوعات (۳) خود نوشت سوانح عمریاں اور یادداشتیں (۴) تقریروں اور خطوط کے مجموعے (۵) اور معاصر مضامین شامل ہوتے ہیں۔

(ب) ثانوی مصادر

وہ ریکارڈز ہوتے ہیں جن کو وہ فرد یا افراد مرتب کرتے ہیں جو خود واقعے میں شریک نہیں ہوتے یا جنھوں نے خود اس واقعے کا مشاہدہ نہیں کیا ہوتا۔ لہٰذا یہ ان افراد کی شہادت ہوتی ہے جو (واقعے کے) چشم دید گواہ نہ تھے، لیکن انھوں نے کسی وجہ سے اس کا ریکارڈ تیار کیا۔ اگر کوئی مصنف کسی دوسرے مصنف کا اقتباس پیش کرتا ہے تو یہ ثانوی مصادر میں سے شمار ہوگا۔ نصابی کتب، جنتریاں، دائرۃ المعارف اور اطلاعات کے ایسے ہی خلاصے ثانوی مصادر کہے جاتے ہیں۔ ہاں بعض اوقات

تحقیق کی نوعیت مصادر کو بدل دیتی ہے مثلاً نصابی کتابوں کو ثانوی مصادر میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی محقق شعبۂ تعلیم میں نصابی کتب کی ترتیب و تدوین پر کام کر رہا ہو تو اس صورت میں نصابی کتابیں ثانوی کی بجائے بنیادی مآخذ کی حیثیت اختیار کر جائیں گی۔ تاریخی تحقیق میں محقق کوشش کرتا ہے کہ وہ بنیادی مصادر سے استفادہ کرے۔ جب وہ کام شروع کرتا ہے تو عموماً ثانوی مصادر سے مطالعے کا آغاز کر کے بنیادی مصادر کی طرف لوٹ جاتا ہے۔

ریکارڈز اور آثار

اس طریق تحقیق میں کئی قسم کے ریکارڈز استعمال کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح مختلف قسم کے آثار (Remains) سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ ان کی تفصیلات وان ڈیلن کے حوالے سے ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

ا۔ سرکاری ریکارڈز

مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ کی دستاویزات جن کو مرکزی حکومت یا صوبائی حکومت تیار کرتی ہے، مثلاً آئین، قوانین، چارٹرز، عدالتی روندادیں اور فیصلے، ٹیکس کی فہرستیں اور اہم اعداد و شمار۔ وہ معلومات جن کو مرکزی یا صوبائی محکمہ تعلیم کے شعبے، کمیشن، پیشہ ورانہ انجمنیں، انتظامی اتھارٹی مرتب کرتی ہے مثلاً کمیٹیوں کی رونداديں، انتظامی نوعیت کے احکام، سالانہ رپورٹیں، میزانیے، تنخواہوں کی فہرستیں، حاضری کے ریکارڈز، حادثات کی رپورٹیں اور کھلاڑیوں کے ریکارڈز۔

۲۔ ذاتی ریکارڈز

ان میں ڈائریاں، خودنوشت سوانح عمریاں، خطوط، وصیت نامے، جائیداد کے کاغذات، معاہدے، لیکچر کے اشارات، تقاریر، مضامین اور کتابوں کے اصل مسودات شامل ہوتے ہیں۔

۳۔ زبانی روایات (Oral Traditions)

ان میں اساطیر، لوک کہانیاں، خاندانی کہانیاں، کھیلیں، تقریبات اور واقعات کی چشم دید یادیں شامل ہوتی ہیں۔

۴۔ تصویری ریکارڈز (Pictorial Records)

ان میں تصویریں، متحرک تصویریں، مائیکروفلمیں، مصوری کے نمونے، سکے اور مجسمے آتے ہیں۔

۵۔ مطبوعہ مواد

اس میں اخبار، کتابچے اور رسالوں کے مضمون شامل ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ زیر تحقیق مسئلے کے بارے میں ادبی اور فلسفیانہ کتابیں بھی شامل کی جاتی ہیں۔ ہل وے (Hilway) نے اس سلسلے میں کہا ہے: ''ایسی ادبی تخلیقات مثلاً نظمیں، ناول، ڈرامے اور مضامین جو اصل واقعات کے بارے میں معلومات فراہم کر سکتے ہیں۔ لیکن محقق زیادہ تر ان میں موجود خیالات کے پیش نظر ان کا معائنہ کرتا ہے۔ ادبی یا لسانیاتی مطالعات میں صرف ''تحریریں'' ہی بجائے خود معلومات کا ضروری مآخذ قرار پاتی ہیں۔

۶۔ میکانکی ریکارڈز

ان میں انٹرویوز اور اجلاس کی کارروائی شامل ہوتی ہے جس کو فیتے کی شکل میں تیار کر لیا جاتا ہے۔ فونوگراف ریکارڈز بھی اسی میں آجاتے ہیں۔

۷۔ آثار (Remains)

تاریخی تحقیق کرنے والوں کے لیے ایسے آثار بھی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں جو معلومات کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ہڑپہ اور موہنجوداڑو سے ملی ہوئی قدیم اشیا

بہت سی اطلاعات فراہم کرتی ہیں۔ وہ کھلونے، برتن اور آلات جو کسی قبرستان سے ملتے ہیں، ماضی کے متعلق معلومات بہم پہنچا سکتے ہیں۔ بعض اوقات ایسے آثار سرکاری دستاویزات کی نسبت اصل معمولات اور حالات کو بہتر طور پر ظاہر کرتے ہیں۔ کسی مورخ کے لیے درج ذیل قسم کے آثار مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

(الف) مادی (Physical) آثار

ان میں عمارتیں، فرنیچر، ساز و سامان، ملبوسات، اوزار و آلات، عطیات مثلاً تمغے وغیرہ اور انسانی ڈھانچے شامل ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ مٹی کی تختیوں پر تحریریں، کندہ کیے ہوئے پتھر، مہر زدہ سکے، برتن اور مجسمے بھی ان میں شامل کیے جاتے ہیں۔

(ب) مطبوعہ آثار

ان میں نصابی کتب، معاہدات، حاضری کے فارم، رپورٹ کرنے کے کارڈز اور اخباری اشتہارات آتے ہیں۔

(ج) خطی مواد

مخطوطات۔ پیپرس، السی تختیاں (اینٹیں) جن میں خطِ میخی میں تحریر ہوتی ہے، چمڑے پر لکھے ہوئے مخطوطات اور جدید دور کی ٹائپ کی ہوئی دستاویزات مصوری کے نمونے بھی اسی میں شامل کیے جاتے ہیں۔

چونکہ آثار ٹھوس شہادت فراہم کرتے ہیں۔ ایسی شہادت جس کا ذاتی طور پر معائنہ کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے وہ ریکارڈز کی نسبت زیادہ قابل اعتماد مآخذ بن جاتے ہیں مثلاً ایک ایسا آلہ جو قدیم زمانے میں طلبہ کو سزا دینے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، اگر وہ کسی اسکول کے مقام پر مل جاتا ہے تو اس کو ناپا جا سکتا ہے، اس کا وزن کیا جا سکتا ہے اور اس کی وضاحت کی جا سکتی ہے۔ اس امر کی توضیح و ترجمہ کرنا کہ اس کی حیثیت کیا ہے؟ اس کو کیسے، کب اور کیوں استعمال کیا جاتا تھا؟ تو اس کے لیے محقق کو وہ رپورٹیں دیکھنا ہوں گی جو اس عہد کے لوگوں نے تیار کی تھیں۔

۸۔ متفرقات

ان میں بل وے نے یہ چیزیں شامل کی ہیں۔ فن کے مختلف نمونے، موسیقی کی دھنیں، یادگاریں اور دیگر متفرق ذرائع جن سے معلومات مل سکتی ہیں۔

تاریخی تحقیق کے سلسلے میں بشا اور ہارٹر Busha and Harter نے چند قسم کے مصادر کو گنوایا ہے۔ ان کو لائبریری سائنس اور دوسرے علوم مثلاً انسانی علوم اور معاشرتی علوم کی تاریخی تحقیق میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ان مصادر کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

ا۔ سالنامے

ایسا ریکارڈ جو سالانہ بنیاد پر مرتب کیا جاتا ہے۔ اس میں عام طور پر واقعات کو زمانی اعتبار سے درج کیا جاتا ہے۔ لیکن ان کی اہمیت کا اظہار نہیں کیا جاتا مثلاً کتب خانوں یا دیگر اداروں کی سالانہ رپورٹیں۔

۲۔ دستاویزات (Archives)

ان میں پبلک اور سرکاری دستاویزات آتی ہیں۔ یہ اصطلاح اس مخزن کے لیے بھی استعمال کی جاتی ہے جہاں دستاویزات (Documents) کو محفوظ کیا جاتا ہے، ان کی ترتیب و تنظیم کی جاتی ہے اور ان کو استعمال کیا جاتا ہے۔

۳۔ فہرست (Catalogue)

چیزوں کی مکمل فہرست (کتب، ساز و سامان وغیرہ) جو کہ عام طور پر وضاحتی نوعیت کی ہوتی ہے اور اس کو کسی نظام کے تحت ترتیب دیا ہوتا ہے۔

۴۔ کرانیکل (Chronicle)

حقائق و واقعات کا زمانی اعتبار سے ریکارڈ جس کا تجزیہ اور توجیہہ و توضیح نہیں کی ہوتی۔

۵۔ وثیقہ

وہ سرکاری دستاویز جس میں ایک شخص سے دوسرے شخص کے نام جائیداد کی منتقلی کا ریکارڈ ہوتا ہے۔

۶۔ قصے کہانیاں (Legend)

غیر معمولی واقعات کی کہانی جو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتی ہے۔ اس کی اصل روایتی یا افسانوی نوعیت کی ہوتی ہے اور اس میں ایسی اطلاع پائی جاتی ہے جس کی عام طور پر جانچ پرکھ نہیں کی جاسکتی۔

۷۔ مخطوطہ

ایسی دستاویز جو خطی ہو یا ٹائپ کی ہو (اس میں کاربن کی کاپیاں بھی شامل کی جاتی ہیں) اس میں خطوط، تاریں، روزنامچے، رسیدیں، ذاتی حالات، فہرستیں، اجلاس کی روئیدادیں، معاہدے، ٹیکس کے ریکارڈز، قانونی سرٹیفکیٹ (متعلقہ پیدائش، موت، شادی وغیرہ) ادبی کتب، تقاریر اور دوسری دستاویزات کے اصل مسودات جو شخصیات یا افراد سے تعلق رکھتے ہیں۔

۸۔ یادداشت (Memoir)

ان واقعات کی یادداشت یا رپورٹ جس کی بنیاد مصنف کی زندگی، اس کے مشاہدات یا اس کی کسی خاص اطلاع پر ہوتی ہے۔ ان ریکارڈز کو یادداشتیں کہا جاتا ہے۔

۹۔ یادگار (Memorial)

کسی فرد یا واقعہ کی یاد میں کوئی کی ہوئی، کہی ہوئی یا تعمیر کی ہوئی چیز کو یادگار کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مثلاً اے۔ سی وولنر A.C Woolner جو کہ پنجاب یونیورسٹی میں مختلف ممتاز عہدوں (پرنسپل اورینٹل کالج، رجسٹرار، لائبریرین اور وائس چانسلر) پر فائز رہے ان کا انتقال ۷ جنوری ۱۹۳۶ء کو ہوا۔ "ان کی وفات کے بعد ان کی بہت سی یادگاریں قائم کی گئیں۔ ۱۹۴۰ء میں ان کے رفقاء نے ان کی یاد میں ۳۲۸ صفحات پر مشتمل وولنرز کومیموریشن وولیوم (Woolners Commemoration Volume) (انگریزی) پیش کیا ہے جسے پروفیسر مولوی محمد شفیع نے مرتب کیا اور جس میں مشرق و مغرب کے نامور محققین کے ۵۲ تحقیقی مقالات (سوانحی مضامین کے علاوہ) پیش کیے۔

۱۰۔ اسنادِ حقوق و مراعات (Muniment)

ایسی دستاویز جس میں کسی جائیداد کے استحقاق کی شہادت موجود ہو یا حقوق و مراعات کے مطالبے کی شہادت موجود ہو۔

۱۱۔ رجسٹر

تحریری ریکارڈ جو کہ عام طور پر سرکاری نوعیت کا ہوتا ہے اور اس کو مستقبل میں استعمال کرنے کے لیے مرتب کیا جاتا ہے۔ اس میں واقعات مثلاً پیدائش و موت کے بارے میں سلسلہ وار اندراجات ہوتے ہیں۔ کتب خانوں میں اندراج رجسٹر بھی تیار کیے جاتے ہیں۔

۱۲۔ رول (Roll)

ناموں کی فہرست جس کو کسی خاص مقصد کے لیے ریکارڈ کیا جاتا ہے۔ اس کا استعمال حاضری کی پڑتال کے لیے کیا جاتا ہے۔ مثلاً کلاس روم میں حاضری یا افراد (فوج) کی فرد حاضری۔

۱۳۔ جدول (Schedule)

تفصیلات یا بیانات کے گوشوارے کی صورت میں فہرست جو کہ عام طور پر بار بار رونما ہونے والے واقعات، نظام الاوقات یا پہلے سے طے کی ہوئی ترتیب کے مطابق واقعات کے نقشے کا ریکارڈ رکھتی ہے۔

دستاویزی مواد حاصل کرنے کے مقامات یا ذرائع

تاریخی تحقیق میں استعمال ہونے والی دستاویزات مختلف مقامات اور ذرائع سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اس سلسلے میں بعض حوالہ جاتی کتب رہنمائی فراہم کرتی ہیں۔ کتب خانوں کی فہرستیں، رسائل و جرائد کے اشاریے، کتابیات، تاریخی مواد سے متعلق تبصرے، تحقیقی مقالات اور تحقیقی رسائل کافی رہنمائی دیتے ہیں۔

مقامی کتب خانوں سے بھی دستاویزات مل جاتی ہیں۔ لیکن تلاش کا دائرہ دوسرے کتب خانوں تک وسیع ہونا چاہیے مثلاً اگر کوئی طالب علم جامعہ پنجاب کے کسی شعبے میں تحقیق کر رہا ہے تو اس کو شعبہ جاتی کتب خانے کے علاوہ مرکزی لائبریری سے استفادہ کرنا چاہیے۔ ملک کے دوسرے جامعاتی کتب خانے اور بڑے بڑے عوامی کتب خانے زیر تحقیق موضوع کے بارے میں کافی مواد فراہم کر سکتے ہیں۔

اسی طرح بعض دانشوروں کے ذاتی کتب خانے بہت قیمتی کتب اور دستاویزات رکھتے ہیں۔ ان سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً ذخیرۂ شیرانی، مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے مخطوطات میں بہت گرانقدر دستاویزات اور وثیقہ جات موجود ہیں جو تاریخی تحقیق میں بہت اہم ثابت ہوسکتے ہیں۔

ملک کے عجائب گھروں میں بھی تاریخی دستاویزات محفوظ کی جاتی ہیں مثلاً لاہور عجائب گھر میں ایسی بہت سی چیزیں محفوظ ہیں۔ اسی طرح نیشنل میوزیم کراچی میں بہت سی تاریخی دستاویزات اور مخطوطات محفوظ ہیں۔ محقق ایسے مقالات سے بھی استفادہ کر سکتا ہے۔

سرکاری ریکارڈ کو محفوظ کرنے کے لیے آرکائیوز (Archives) شعبے قائم کیے جاتے ہیں۔ پاکستان میں صوبائی اور مرکزی سطح پر ایسا اہتمام کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری رقم طراز ہیں:

> ''مواد کا ایک اہم ذریعہ آرکائیوز (Archives) ہیں جیسے لاہور میں پنجاب آرکائیوز اور اسلام آباد میں نیشنل آرکائیوز۔ یہاں اہم قومی ریکارڈز محفوظ کیے جاتے ہیں''۔

ذاتی اور انفرادی کوشش سے بھی اہم معلومات مل جاتی ہیں۔ صاحب علم و فضل اور تجربہ کار لوگوں سے بھی بات کی جائے تو وہ بھی قابلِ قدر ذرائع کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔ پرانی کتابوں کا کاروبار کرنے والے لوگ بھی اہم مواد فراہم کر دیتے ہیں۔ ان کے سٹور پر جانا فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ کسی ادارے میں جن لوگوں نے کام کیا ہوتا ہے ان کی ذاتی فائلیں، خط و کتابت، یادداشتیں، خطبات کے اشارات (Notes) وغیرہ وہاں سے مل جانے کے امکانات ہوتے ہیں۔ مثلاً پنجاب یونیورسٹی نے ۱۹۱۵ء میں ایک امریکی لائبریرین آسا ڈان ڈکنسن (Asa Don Dickinsons) کو لائبریری کی تنظیم نو کے لیے بلایا تھا۔ انھوں نے ایک سال یہاں قیام کیا۔ ان کی خط و کتابت اور وہ رپورٹ جو انھوں نے لائبریری کی تنظیم نو کے لیے دی تھی، وہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی تاریخی تحقیق میں ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر اے۔ سی وولنر کے پاس کئی سال تک اس لائبریری کا اعزازی چارج رہا۔ اس سلسلے میں وولنر کی وہ خط و کتابت جو انھوں نے بحیثیت لائبریرین کی بہت اہمیت رکھتی ہے۔

عظیم قومی شخصیات کی رہائش گاہیں جن کو ان کی وفات کے بعد میوزیم میں بدل دیا جاتا ہے، وہاں سے بھی ان کے بارے میں بہت قیمتی دستاویزات مل جاتی ہیں۔ مثلاً علامہ اقبال میوزیم، لاہور یا کراچی میں بابائے قوم قائداعظم کا میوزیم۔

محقق کو دستاویزی مواد کی تلاش میں بسا اوقات صبر آزما اور کٹھن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان ذرائع سے معلومات کی جمع آوری میں کامیابی کا انحصار اس کے تخیل، عزم صمیم اور مستقل مزاجی پر ہوتا ہے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ زیر تحقیق موضوع مثلاً کتب خانے سے متعلق تاریخی ریکارڈ مختلف مقامات سے بھی ملے ہیں۔ مثلاً

بے کار اور ردی کتابیں جنھیں مقامی تاریخ کے ذخیرے میں رکھا ہوتا ہے، ان سے بھی مفید معلومات مل جاتی ہیں۔ بہر حال تلاش میں عزم اور مسلسل کوشش کامیابی کا دروازہ کھولتی ہے۔

دستاویزات پر تنقید

محقق کے لیے یہ مرحلہ بہت اہم ہوتا ہے۔ مصادر کی جمع آوری کے بعد ان کو دیکھنا چاہیے کہ یہ کس حد تک قابلِ اعتبار ہیں۔ اس طرح تحقیق میں معتبر دستاویزات کا استعمال نہایت ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ نتائج مشکوک اور ناقابلِ اعتبار نکلیں گے۔ اس لیے معمول یہ ہوتا ہے کہ مصادر کو تنقیدی نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ عموماً دو قسم کی تنقید کی جاتی ہے۔ خارجی اور داخلی۔

خارجی تنقید/خارجی جانچ پرکھ

(External Criticism/Appraisal)

دستاویز کی خارجی جانچ پرکھ سے مراد یہ ہے کہ کیا دستاویز اصلی ہے اور کیا اس کو معتبر سمجھا جا سکتا ہے؟ کیا دستاویز اپنے دعوے میں درست ہے، کیا جو ظاہر کرتی ہے، درحقیقت وہی ہے؟ تاکہ معلوم کیا جائے کہ اس کی شہادت قابلِ قبول ہے یا نہیں۔

خارجی تنقید میں اس کے مصنف، مقامِ تصنیف اور سالِ تصنیف کے بارے میں معلومات کی جانچ پرکھ کی جاتی ہے۔ دستاویز کا مصنف وہی ہے جو اس پر ظاہر کیا گیا ہے یا کوئی اور ہے۔ کیا جو سال تصنیف بتایا گیا ہے، وہ حقیقت پر مبنی ہے یا اس میں شک و شبہ کی گنجائش موجود ہے۔ خارجی تنقید کے لیے مختلف قسم کے سوالات اٹھائے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ زیرِ نظر دستاویز کا بغور معائنہ کیا جاتا ہے۔ وان ڈیلن (Van Dalen) نے اسی مقصد کے لیے جن سوالات کو بیان کیا ہے، ان کی تفصیل ذیل میں دی جاتی ہے۔

مصنف کے بارے میں معلومات حاصل کرنے، مجہول مصنف اور تاریخ نہ رکھنے والی دستاویزات کی نشاندہی کرنے اور جعلی دستاویزات کا سراغ لگانے، سرقے اور ادبی خیانت دریافت کرنے، غلط شناخت کی ہوئی دستاویزات کی نشاندہی کرنے یا کسی دستاویز کو اصل صورت میں لانے کے لیے اکثر اوقات بہت محنت اور عرق ریزی سے سراغ رسانی کا کام کرنا پڑتا ہے۔ جب محقق سراغ لگا رہا ہوتا ہے، تو وہ دستاویزات کا گہری نظر سے معائنہ کرتا ہے اور موزوں سوالات اٹھاتا ہے۔

۱۔ ریکارڈ کو تیار کرنے کے لیے کون سا جذبہ محرک ثابت ہوا۔ خاص طور پر دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ کیا مالی فائدہ، طرفداری کے میلانات، خوش کن اور دل بہلانے والے فریب کی خواہش یا علمی، خاندانی، گروہی یا قومی تفاخر اس کا محرک بنا۔

۲۔ کیا دستاویز کے ملنے کا واقعہ مشکوک یا قابلِ اعتراض تو نہیں؟

۳۔ کیا یہ رپورٹ یا کہانی واقعہ کے ظہور پذیر ہونے کے طویل مدت بعد ظاہر ہوئی یعنی واقعہ اور اس کی رپورٹ کے درمیان طویل زمانی فاصلہ بھی دستاویز کو مشکوک بنا دیتا ہے۔ یہاں پر اسکندریہ کے کتب خانے میں کتب سوزی کے واقعہ پر تنقیدی نظر اس واقعے کی وضاحت کرے گی۔ پس منظر کو بیان کرنے کے لیے چند سطور اس واقعے کے بارے میں درج کی جاتی ہیں۔

پہلی دفعہ چھٹی صدی ہجری کے اواخر اور ساتویں ہجری کے اوائل میں ایک عیسائی مصنف عبداللطیف بغدادی نے کتاب ''الافادۃ والاعتبار فی الامور المشاہدۃ والحوادث المعاینۃ فی الارض مصر'' (جس کا موضوع صرف وہ حالات و واقعات ہیں جو مصنف نے مصر میں بچشم خود دیکھے، حقیقت میں یہ اس کا سفرنامہ ہے) میں کتب خانہ اسکندریہ کے سابق مقام پر واقع ایک ستون ''عمود السواری'' کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

ویذکر ان ھذا العمود من جملۃ اعمدۃ کانت تحمل رواق ارسطو اطالیس الذی کان یدرس بہ الحکمۃ والہ کان دار علم وفیہ خزانۃ کتب جرقھا عمرو بن العاص باشارۃ عمر بن الخطاب"۔

ترجمہ: اور کہا جاتا ہے کہ یہ ستون منجملہ ان ستونوں کے ہے جس پر وہ چھت قائم تھی جو ارسطو کا رواق تھا اور جہاں ارسطو حکمت کا درس دیا کرتا تھا اور یہ کہ وہ دارالعلم تھا اور اس میں وہ کتب خانہ تھا جس کو عمرو بن العاص نے عمر بن خطاب کے اشارے سے جلا دیا۔

اگر اس پر تنقیدی نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ اور ناقد کے درمیان چھ سو سال کا زمانی فاصلہ پایا جاتا ہے۔ مطہری شہید اس پر تنقید کرتے ہوئے

لکھتے ہیں:

''اگر عبداللطیف بغدادی فتح اسکندریہ کے وقت (پہلی صدی ہجری) زندہ ہوتا یا (کم از کم دوسری سے چوتھی صدی ہجری کے) ان مورخین کا ہم عصر ہوتا جنھوں نے فتح اسکندریہ اور دیگر اسلامی فتوحات کے حالات دوسروں سے روایت کی صورت میں جمع کیے ہیں تو یہ احتمال ہوسکتا تھا کہ عبداللطیف ایسے لوگوں سے ملا ہے جو اس سانحہ کے براہِ راست یا بالواسطہ شاہد ہیں۔ چونکہ دوسرے مورخین ان تک نہیں پہنچ پائے لہٰذا انھوں نے بغدادی کے سامنے واقعہ بیان کیا، لیکن عبداللطیف اپنی محولہ بالا کتاب سے ۱۰ شعبان ۶۰۳ھ/۱۳ مارچ ۱۲۰۷ء کو فارغ ہوا یعنی ۱۷ھ/۶۳۸ء یا ۱۸ھ/۶۳۹ء میں فتح اسکندریہ سے تقریباً چھ سو سال بعد۔ ان چھ سو سالوں میں یہ واقعہ نہ کسی تاریخی کتاب میں دیکھا گیا نہ مسلمان، عیسائی اور یہودی مورخین سے سنا گیا، مگر اچانک عبداللطیف کی کتاب میں پایا گیا۔ اس طرح عبداللطیف کی روایت اصطلاحاً ''غیر مرسل'' سے بھی کم تر درجہ کی رہ جاتی ہے۔''

۴۔ کیا وقت کا تناقض دستاویز کے جعلی ہونے کو ظاہر کرتا ہے؟ اس اجمال کی تفصیل اس طرح ہے کہ کسی خاص زمانی مناسبت سے ایسے واقعات بیان کرنا جو تاریخ میں بعد کے دور سے تعلق رکھتے ہوں یا کسی شخص کے بارے میں دعویٰ کرنا کہ اس نے فلاں مقام پر فلاں وقت پر یہ کام کیا تھا جب کہ مذکورہ شخص کے بارے میں ریکارڈز بتاتے ہیں کہ وہ اس وقت کسی اور جگہ موجود تھا۔ مثلاً گذشتہ کتب سوزی کے واقعہ میں عیسائی مورخ عبداللطیف کا بیان کہ اس عمود پر بیٹھ کر ارسطو حکمت کا درس دیا کرتا تھا، زمانی اعتبار سے غلط ثابت ہوتا ہے، کیونکہ ارسطو کے زمانے میں تو اسکندریہ کا شہر بسا بھی نہیں تھا۔ مرتضٰی مطہری شہید اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عبداللطیف کی بے علمی کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ ارسطو (۳۸۴۔۳۲۲ ق۔م) مصر اور اسکندریہ میں نہیں آیا تھا چہ جائیکہ وہ اس رواق پر بیٹھ کر درس دیتا بلکہ اسکندریہ کی تعمیر ہی ارسطو کے بعد ہوئی تھی۔ (اسکندریہ کی بنیاد ۳۳۲ ق۔م میں رکھی گئی) اسکندریہ مصر پر سکندر کے حملے کے بعد تعمیر ہوا، اس شہر کی تاسیس کا منصوبہ سکندر کے زمانے میں تیار ہوا تھا اور شاید اس کی زندگی ہی میں تعمیر کا کام بھی شروع ہو گیا تھا اور بتدریج ایک شہر کی صورت اختیار کر گیا جب کہ ارسطو سکندر (ولادت تقریباً ۳۵۶، وفات ۳۲۳ ق۔م) کا معاصر تھا''۔

۵۔ کیا دستاویز کی زبان، انداز بیان، ہجے، خط اور طباعت، مصنف کی دوسری دستاویزات سے مشابہت رکھتے ہیں اور اس کی تالیف کا زمانہ مصنف ہی کا دور بنتا ہے۔ زبان اور اسلوب کافی حد تک بتا دیتے ہیں کہ زیر غور دستاویز واقعی اسی مصنف کی ہے یا اس کے نام سے یونہی منسوب کر دی گئی ہے۔ خاص طور پر وہ مصنف جس کی زبان اور بیان کا بہت شہرہ ہوتا ہے، اس کے بارے میں تقابلی مطالعے سے بتانا آسان ہوتا ہے کہ زیر حوالہ دستاویز اسی کی ہے یا کسی اور کی ہے۔ ڈاکٹر مظفر عباس نے ابوالکلام آزاد پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ ۱۹۸۰ء میں پنجاب یونیورسٹی میں پیش کیا ہے۔ اس میں انھوں نے چار کتابوں کے بارے میں ثابت کیا ہے کہ وہ آزاد کی نہیں ہیں بلکہ ناشرین نے ان کتابوں کو ان کے نام سے منسوب کر دیا۔ ان کے نام یہ ہیں: رسولِ عربی (شائع کردہ مکتبہ عظمت، لاہور) خونِ شہادت کے دو قطرے (مطبوعہ مولا بخش کشتہ، اینڈ سنز، امرتسر)، انسانیت موت کے دروازے پر (مطبوعہ مکتبہ شعر و ادب، لاہور) اور شہید اعظم (مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ، دہلی)۔ ان کے جعلی ہونے کے بارے میں دلائل دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مولانا آزاد کی شہرت اور مقام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی ناشروں نے دوسرے لوگوں کی کتابیں ان کے نام سے شائع کر دیں۔ ان کتابوں کا مواد، انداز و اسلوب سے لگا نہیں کھاتا...... دوسرے یہ کہ عبدالرزاق ملیح آبادی، مولانا غلام رسول مہر، ڈاکٹر سید عبداللہ، مالک رام اور عابد رضا بیدار، کسی نے بھی ان کتب کو ابوالکلام کی تصانیف کی فہرست میں شامل نہیں کیا ہے اور پھر خود مولانا آزاد کی کسی تحریر یا تصنیف میں ان کا حوالہ نہیں ملتا''۔

۶۔ کیا مصنف ان چیزوں سے لاعلمی کا اظہار کرتا ہے جو اس کے زمانے میں اس کی سی تربیت رکھنے والے شخص کو معلوم ہونی چاہئیں۔

۷۔ کیا مصنف نے ایسے واقعات، اشیا اور مقامات کا ذکر کیا ہے جو اس دور کے شخص کو معلوم نہیں ہو سکتے تھے؟

۸۔ کیا خطوط یا کاغذات کا عطیہ دینے والے، سرکاری عہدیدار، مترجم یا کسی اور نے دستاویز میں شعوری یا غیر شعوری طور پر تبدیلی کر دی ہے۔ اس طرح کہ اس کو غلط نقل کیا، اس میں اضافے کر دیے یا بعض پیرے حذف کر دیے۔

۹۔ کیا یہ مصنف کا اصل مسودہ ہے یا اس کی نقل ہے؟

۱۰۔ اگر یہ نقل ہے تو کیا یہ اصل مسودے کے الفاظ کے عین مطابق ہے۔

۱۱۔ اگر نقل بمطابق اصل نہیں ہے تو کیا اغلاط کی تصحیح ممکن ہے اور محذوف حصے بحال کیے جاسکتے ہیں؟

۱۲۔ اگر دستاویز نقل ہے اور بہت بعد کی تاریخ اس پر درج ہے یا اس پر کوئی سال کتابت درج نہیں تو کیا خود مصنف یا اس کے کسی قابلِ اعتماد ہمعصر یا اس کے بہت سے معاصرین نے بھی بیان کیا کہ زیرِ نظر دستاویز کے مصنف نے ایسا کوئی مخطوطہ لکھا تھا؟

۱۳۔ اگر دستاویز پر تاریخ درج نہیں اور اس کا زمانہ بھی معین نہیں تو پھر اس کے مندرجات پر نظر ڈالنا ہوگی کہ کیا اس دستاویز میں کوئی ایسے خیالات، نظریات، رسوم ورواج، نمایاں واقعات، اشخاص یا مقامات کے نام، پسندیدہ اطوار، زبان کے اسلوب یا طباعت کے طریقے یا روشنائی کی قسم جو اندازاً یا صحیح طور پر بتادے کہ یہ دستاویز کب اور کہاں تیار کی گئی؟

روشنائی اور کاغذ کا کیمیائی تجزیہ دستاویز کا زمانہ متعین کرنے میں مدد کرتا ہے۔ ٹائرس ہل وے (Tyrus Hilway) اس سلسلے میں رقمطراز ہے:

''وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کاغذ سازی کا فن بدلتا رہا ہے اور بعض اوقات کسی مخطوطے کا زمانہ اس کاغذ سے بھی متعین کیا جاسکتا ہے جس پر وہ لکھا ہوتا ہے یعنی کاغذ کب اور کہاں پر تیار کیا گیا۔ یہی اصول استعمال کی گئی روشنائی پر بھی صادق آتا ہے۔ بعض اوقات طابع (Printer) کا استعمال کیا ہوا ٹائپ بتادیتا ہے کہ یہ مطبوعہ دستاویز کس دور کی ہے۔ فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کی مطبوعات کا ٹائپ ایک خاص نوعیت کا ہے۔ اس ٹائپ میں مطبوعہ کتب اس خاص دور کا پتہ دیتی ہیں...... مختلف ساخت کے ٹائپ رائٹر بھی انفرادی خصوصیات رکھتے ہیں جس کو بغور معائنے سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ مصادر کی جانچ پرکھ کے لیے مکبر شیشہ، خوردبین اور کیمرہ مدد و باصلاحیت ذرائع ثابت ہوتے ہیں''۔

۱۴۔ ماخذ کا کتنا حصہ ذاتی مشاہدے پر مبنی تھا اور کتنا حصہ دوسرے مصادر سے اخذ کیا گیا۔

۱۵۔ اگر دو یا دو سے زیادہ ماخذ نفسِ مضمون کے لحاظ سے مطابقت رکھتے ہوں یا انداز بیان میں مطابق ہوں یا دونوں لحاظ سے ایک جیسے ہوں تو کیا ان میں سے ایک یا ایک سے زیادہ اصل تھے اور دوسرے ماخوذ؟

۱۶۔ کیا اصل دستاویز یا دستاویزات جن سے کوئی مصنف استفادہ کرتا ہے یا بعض چیزیں اخذ کرتا ہے، ان کے سال اشاعت کا مقابلہ کرکے اصل کا پتہ لگایا جاسکتا ہے اور ان کے تقابلی مطالعے سے معلوم کیا جاسکتا ہے یہ کہاں کہاں مطابقت رکھتی ہیں اور ماخوذ دستاویز میں مصنف کے اسلوب میں تبدیلیاں، موضوع سے غیر ضروری انحراف یا تکرار جو بحث کی منطقی ترتیب کو بری طرح متاثر کرتی ہے یا ایسی تفصیلات وتجاویز کا اظہار جو ان تفصیلات سے مطابقت نہیں رکھتیں جن کو مصنف کسی اور مقام پر بیان کرتا ہے۔

جب محقق کسی دستاویز یا اثر (Relic) کا معائنہ کرتا ہے تاکہ اس کی اصلیت اور صداقت کو جان سکے تو وہ بہتر طریقے سے کامیابی سے ہمکنار ہوگا بشرطیکہ وہ تاریخی اور عام معلومات کا وافر ذخیرہ رکھتا ہو۔ محقق کو اچھا بھلا زمانی شعور، کثیر الجہتی ذہانت، عقلِ سلیم، انسانی رویے کو ذہانت کے ساتھ ادراک کرنے کی صلاحیت اور مستقل مزاجی کی صفت رکھنی چاہیے۔ مسائل کو حل کرنے کے لیے اس کو دوسرے متعلقہ علوم سے بھی استفادہ کرنا ہوگا۔ معاون علوم یہ ہیں: لسانیات، کیمیا، بشریات، علم آثار قدیمہ، نقشہ کشی، علم مسکوکات، آرٹ، لٹریچر، کتبہ خوانی یا مختلف قدیم اور جدید زبانیں، کوئی مورخ ہر چیز کا علم نہیں رکھ سکتا، البتہ اس کو ان شعبوں میں خصوصی تربیت لینی چاہیے جو اس کے مسئلے سے بہت زیادہ قریبی تعلق رکھتے ہوں۔

داخلی تنقید / داخلی جانچ پرکھ

(Internal Criticism/Appraisal)

جب دستاویز خارجی تنقید کے مرحلے سے گزرتی ہے تو پھر داخلی تنقید کو سامنے رکھ کر اس کی جانچ پرکھ کی جاتی ہے۔

خارجی تنقید میں دستاویز کے مصنف، اس کے زمانے، مقام تصنیف اور اس کے اصل ہونے کا جواب تلاش کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ دیکھا جاتا ہے کہ جو بیانات اس میں دیے گئے ہیں وہ کس حد تک درست ہیں اور ان کی قدر و قیمت کیا ہے۔ اب دستاویز کے بیانات اور مندرجات کی جانچ پرکھ پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ خارجی تنقید کا ثابت کرنا کہ دستاویز اصل ہے، کا مطلب یہ نہیں کہ جو کچھ اس میں درج کیا گیا ہے وہ بھی درست ہے۔ اگرچہ داخلی تنقید کا بیشتر حصہ متنی تنقید کا ہوتا ہے تاہم اس میں مصنف کی اہلیت، اس کی نیک نیتی، مقام اور میلان خاطر (Bias) بھی زیر بحث آتے ہیں۔ داخلی تنقید جب متن کا لفظی معنی تلاش کرنے کی

کوشش کرتی ہے تو وہ مثبت نوعیت کی ہوتی ہے۔ اس کی نوعیت منفی ہو جاتی ہے جب بیانات ومندرجات پر عدم اعتماد کا اظہار کرنے کے لیے ہر ممکن وجہ تلاش کرتی ہے اور مصنف کی نیک نیتی اور صحت کے بارے میں تنقیدی رخ سے سوالات اٹھاتی ہے۔ اگرچہ مثبت اور منفی دونوں قسم کی تنقید تاریخی تحقیق میں ضروری ہوتی ہے، لیکن محقق کو انسان دشمن اور حد سے زیادہ تنقید کرنے والا نہ ہونا چاہیے۔

داخلی تنقید کے بارے میں گولڈر (Gholhor) کی رائے درج کی جاتی ہے۔

داخلی جانچ پرکھ کا تعلق مصنف کی اہلیت اور دیانت داری سے ہوتا ہے اور اس دائرے میں وہ عہد بھی آتا ہے جس میں دستاویز تیار ہوئی۔ ہم مصنف کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟ کیا اس کا رویہ عام طور پر خلوص پر مبنی تھا یا وہ متعصب تھا؟ کیا وہ صاحب علم اور با صلاحیت تھا؟ کیا وہ سچائی کو جاننے کی پوزیشن میں تھا اور کیا اس کی رسائی قابل اعتماد ذریعۂ اطلاع تک تھی؟ کیا وہ صحیح صحیح، واضح انداز اور غیر جانب داری سے رپورٹ کرنے کی صلاحیت کا مظاہرہ کرتا ہے؟ اُس نے کس مقصد کے لیے دستاویز کو تیار کیا؟ کسی تاریخی واقعے کا بہترین ریکارڈ وہ ہوتا ہے جس میں خود غرضی، جہالت اور تعصب کا کوئی عنصر نہ پایا جائے''۔

۱۔ بیانات کا مفہوم:

کسی بیان سے مصنف کا مطلب کیا ہے؟ اس کے لفظی معنی کے علاوہ اس کا اصل مفہوم کیا ہے؟ کسی دستاویز یا مآخذ کی داخلی تنقید کے لیے جاننا ضروری ہے کہ جو کچھ اس میں لکھا ہوا ہے، اس کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ تحریری آثار میں الفاظ کے معنی جاننے کی ضرورت ہوتی ہے۔ عصر حاضر میں کسی بیان کا لفظی اور معنوی مفہوم عموماً ایک ہی ہوتا ہے، لیکن قدیم مصادر میں ایسا نہیں ہوتا۔ بہت سے پرانے الفاظ اب متروک ہو چکے ہیں۔ پرانے دور کے مصنفین کے ہاں ایسے اداروں اور رسوم ورواج کے بارے میں حوالے ملتے ہیں جن کا سمجھنا آسان کام نہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ معاشرتی اقدار تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ اس کا اثر لکھنے والوں پر بھی پڑتا ہے۔ دور جاہلیت کے عرب شعراء کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے عہد کے سماجی اور معاشرتی ڈھانچے کا مطالعہ کیا جائے۔ اس کے بغیر دور جاہلی کی عربی شاعری صحیح طور پر سمجھ میں نہیں آ سکتی۔

''کسی دستاویز کے معانی کی توجیہ وتوضیح بہت سادہ ہو سکتی ہے یا اس میں بہت پیچیدگی بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مفہوم پالینے کے لیے تاریخ لسانیات، سیاسیات، اقتصادیات، سوشیالوجی، نفسیات اور دیگر علوم کا پورا پورا علم ہونا ضروری ہو جاتا ہے، عقل سلیم بتاتی ہے کہ اگر محقق اپنے مسئلے کے حل کے لیے دستاویز میں موجود بیانات کو معمولات کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے تو اس کو جاننا چاہیے کہ بیانات کا مفہوم کیا ہے''۔

موجودہ دور میں بھی ایسے مصادر ومآخذ ملتے ہیں جن کے اصلی معانی واضح نہ ہونے کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں: تمثیلی زبان کا استعمال، رمزیت، طنز و مزاح، استعارہ وکنایہ اور فصاحت و بلاغت، دیگر صنعتیں استعمال کرنے سے الفاظ کے ظاہری مطلب اور حقیقی مفہوم کو سمجھنے میں دقت پیش آتی ہے زبان و بیان کی نزاکتوں کا صحیح ادراک محقق کے لیے ضروری ہے۔

اس کے علاوہ ہمارے ہاں کچھ خصوصی مسائل ہیں جو بیانات کا مفہوم جاننے کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ مصادر ومآخذ کا کافی ذخیرہ مخطوطات کی صورت میں محفوظ ہے۔ برصغیر پاک وہند کی تاریخ کے اصل مآخذ فارسی زبان میں ہیں۔ اسی طرح تاریخی تحقیق میں استعمال ہونے والے بنیادی مآخذ کو سمجھنے کے لیے عربی اور فارسی دونوں زبانوں کا جاننا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس استعداد کے بغیر اصل مصادر سے استفادہ کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اگرچہ بہت سی کتابوں کے اردو اور انگریزی میں ترجمے ہو چکے ہیں، لیکن تحقیق میں اصل دستاویز کی اہمیت اپنی جگہ پر موجود رہتی ہے۔ ترجمے اور اصل میں جو فرق ہوتا ہے، وہ بھی واضح ہے۔ احتیاط کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ اصل مآخذ سے استفادہ کیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک اور پہلو پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ہماری تہذیب وثقافت کے بارے میں دستاویزات خط کی مختلف اقسام میں لکھی ہوئی ملتی ہیں مثلاً خطِ کوفی، خطِ نسخ، خطِ مکی، خطِ بہار، خطِ شکستہ وغیرہ۔ مخطوطات کا مطالعہ کرنے کے لیے محقق کی ان خطوں کے ساتھ واقفیت ضروری ہے۔ ایک ایک لفظ کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے کافی وقت درکار ہوتا ہے اور بہت محنت کرنا پڑتی ہے۔

۲۔ مصنف کے بارے میں معلومات:

داخلی جانچ پرکھ کے لیے جاننا ضروری ہے کہ زیر حوالہ رپورٹ مصنف نے کن مقاصد کے تحت اس کو لکھا۔ اس بارے میں وان ڈیلن نے بحث کرتے

ہوئے کہا ہے:

''اس مقصد کے لیے چند سوالات اٹھانے چاہئیں۔ کیا ان دستاویزات کے تراجم کے وہی معانی ہیں جو اصل کے ہیں، یعنی ترجمہ اصل متن کی صحیح طریقے سے ترجمانی کرتا ہے۔ دستاویزات کے مصنفین نے کس قسم کا جغرافیائی، اسکول، گھر، نسلی یا پروفیشنل ماحول دیکھا؟ جب مصنفین دستاویزات لکھ رہے تھے تو اس وقت علم کے مختلف شعبوں کی علمی نوعیت اور سطح کیا تھی؟ اس وقت اخلاقی اور جمالیاتی معیار کیا تھے؟ اس دور کے اہم مسائل کیا تھے؟ ان مصنفین کے اپنے خاندان، دوستوں اور پیشہ ورانہ انجمنوں کے افراد کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟ ان مصنفین کے پہلے دور اور آخری دور کی اقتصادی حالت نے کس حد تک ان کے خیالات اور آرا کو متاثر کیا؟ اگر آپ ان سوالات کے جوابات دے سکتے ہیں اور معلوم کر سکتے ہیں کہ ہر مصنف نے رپورٹ کیوں لکھی؟ تو پھر آپ زیادہ درست انداز سے ان کی رپورٹوں کی توضیح و توجیہ کر سکتے ہیں''۔

مصنف کو صداقت معلوم ہو سکتی ہے، لیکن ممکن ہے کہ جب وہ اس کو اپنی تحریر میں لائے تو جزوی طور پر اس کا اظہار کرے۔ سچائی کو جاننے کے لیے کئی طریقے موجود ہیں۔ اس مقصد کے لیے چند سوالات اٹھانا ہوں گے۔ مصنف کی ذاتی دلچسپی کیا ہے؟ مشاہدہ کرنے والا کس نسل، قوم، جماعت، خطے، سماجی اور اقتصادی طبقے یا پروفیشن سے تعلق رکھتا ہے۔ رپورٹ کرنے میں یہ باتیں اس کو تعصب پر مائل کر سکتی ہیں۔ کیا حقائق کو بیان کیا گیا ہے یا جذبات و احساسات کی ترجمانی کی گئی ہے؟ کیا تفاخر کی شہادت پائی جاتی ہے؟ کیا مصنف کسی خاص فرد، جماعت یا عام لوگوں کو خوش کرنے کے لیے لکھ رہا ہے؟ کیا مطلوبہ اثر پیدا کرنے کے لیے لکھ رہا ہے؟ کیا مطلوبہ اثر پیدا کرنے کے لیے مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا؟ اور اس مقصد کے لیے لفظی صنائع و بدائع اور فصاحت و بلاغت کی صنعتیں استعمال کی گئی ہیں؟

۳۔ مشاہدہ کرنے والے کی اہلیت وصلاحیت:

مشاہدہ کرنے والے کی اہلیت وصلاحیت، سچائی اور دیانت کے بارے میں سوال کرنے کا نام منفی تنقید ہے۔ مصنف کی اہلیت کی جانچ پرکھ کرنے کے لیے دیکھنا ہوگا کہ چشم دید گواہ کی حیثیت سے وہ واقعے کو رپورٹ کرنے کے لیے کس حد تک اپنے حافظے پر انحصار کرتا ہے اور اصل مآخذ کے استعمال کرنے میں اس کا رویہ کیا ہے؟

اگر سڑک پر آتش گیر مادہ پھٹنے سے دھماکہ ہوتا ہے اور اس کی تحقیق کی جاتی ہے تو موقع پر موجود گواہ مختلف بیانات دیتے ہیں۔ ایک ریٹائرڈ فوجی سابقہ تربیت کی بنا پر جو بیان دیتا ہے، وہ حقیقی واقعہ کی تصویر کشی کرتا ہے۔ اس خاص شعبہ میں تربیت اس کے بیان کی سچائی کو بڑھا دیتی ہے۔

داخلی تنقید کے سوالات:

احتیاط کا تقاضا ہوتا ہے کہ محقق دستاویزات میں مندرجہ بیانات کو تشکیک کی نگاہ سے دیکھے اور دریافت کرے کہ کیا ان کے مصنفین اصل حالات صحت کے ساتھ بیان کرنے پر نہ صرف مائل تھے بلکہ اس قابل بھی تھے کہ وہ صحیح صحیح بیان کریں۔ جب محقق ایسی تحقیق کر رہا ہو تو وہ مندرجہ ذیل سوالات اٹھا سکتا ہے۔ وان ڈیلن (Van Dalen) کی یہ فہرست داخلی تنقید اور جانچ پرکھ کے لیے کافی مفصل اور اہم ہے۔

۱۔ کیا اس خاص شعبۂ علم میں دیگر ماہرین مصنفین کو باصلاحیت مشاہدہ کرنے والے اور قابل اعتبار بیان کرنے والے تسلیم کرتے ہیں؟

۲۔ جن حالات کو انھوں نے بیان کیا، کیا ان کے پاس ایسی موافق سہولتیں، تکنیکی تربیت اور انھیں ایسا مقام حاصل تھا جن کی وجہ سے وہ ان کا مشاہدہ کر سکتے؟

۳۔ کیا ان کا جذباتی میلان، عمر یا صحت کے حالات ایسے تھے جو غلط مشاہدات یا غلط رپورٹوں کا باعث بنے؟

۴۔ کیا انھوں نے براہ راست مشاہدہ کی بنا پر رپورٹ کیا، سنی سنائی بات کو بیان کر دیا یا انھوں نے دوسرے مآخذ کا استعمال کیا یا ثانوی مآخذ سے استفادہ کیا؟

۵۔ کیا انھوں نے رپورٹوں کو مشاہدے کے وقت لکھا یا ہفتوں یا سالوں کے بعد لکھا؟

۶۔ کیا انھوں نے مشاہدات کی مفصل یادداشتوں سے لکھا یا صرف حافظے پر انحصار کرتے ہوئے لکھا؟

۷۔ کیا ان کا کسی قوم، علاقے، نسل، مذہب، فرد، سیاسی جماعت، سماجی یا اقتصادی گروہ، طریق تدریس، تعلیمی فلسفے کا جھکاؤ تھا جس نے ان کی تحریر کو متاثر

کیا؟

۸۔ کیا کسی شخص نے تحقیقی کام میں مالی امداد اس امید پر دی تا کہ ان سے کسی خاص مقصد کی حمایت میں رپورٹ لے سکے؟

۹۔ کیا انھوں نے کسی اقتصادی، سیاسی، مذہبی یا سماجی حالت کے زیرِ اثر لکھا جس کی وجہ سے انھوں نے چند حقائق کو نظر انداز کر دیا، ان کی غلط توجیہ کی یا ان کو غلط رنگ میں پیش کیا؟

۱۰۔ کیا انھوں نے عناد، بے جا غرور یا اپنے کاموں کو جائز ثابت کرنے کی خواہش کی تحریک پر لکھا؟

۱۱۔ کیا ان کا مقصد آنے والی نسلوں کی خوشنودی حاصل کرنا تھا یا کسی گروہ کو خوش یا ناراض کرنا تھا؟

۱۲۔ کیا مصنفین نے سچائی کی شکل کو بگاڑ دیا یا اس کو پُر وقار بنایا تا کہ خوبصورت لفظی اثرات پیدا کر سکیں؟

۱۳۔ کیا انھوں نے متضاد بیان دیے؟

۱۴۔ جن مصنفین کی رپورٹوں کی محقق جانچ پرکھ کر رہا ہے کیا ان سے مختلف پس منظر رکھنے والے آزاد باصلاحیت مشاہدہ کرنے والوں کے بیان کیے ہوئے حالات ان کی رپورٹوں سے مطابقت رکھتے ہیں؟ یعنی دستاویزات کا وسیع تر تقابلی مطالعہ بھی ان کی جانچ پرکھ میں خاصی اہمیت رکھتا ہے''۔

تنقید کے عام اصول:

محققین جب ریکارڈز اور آثار کی جانچ پرکھ کرتے ہیں، تو وہ بہت سے فیصلے کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ذیل میں وڈی (Woody) کی بیان کی ہوئی چند تجاویز پیش کی جاتی ہیں، جو اس بارے میں عام رہنمائی فراہم کریں گی:

۱۔ بعد والے زمانے کے تصورات کو تلاش کرنے کے لیے پہلے دور کے مآخذ کو نہ پڑھیں۔ یعنی زمانی شعور بہت اہمیت رکھتا ہے اگر تحقیق کے مسئلے کا زمانہ عہدِ مغلیہ سے متعلق ہے تو عہدِ مغلیہ کے بارے میں دستاویزات کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

۲۔ کسی مصنف کے قابلِ اعتبار ہونے کی جانچ پرکھ صرف اس ایک معیار پر نہ کریں کہ وہ بعض واقعات کا علم نہیں رکھتا کیونکہ اس نے ان کو بیان نہیں کیا۔ اس لیے وہ رونما ہی نہیں ہوئے۔ دستاویزات کے تقابلی مطالعے سے اس امر کی مزید جانچ پرکھ کی جا سکتی ہے اور زیادہ قابل اعتبار نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔

۳۔ کسی دستاویز کو کم معیاری خیال کرنا یا اس کو زیادہ معیاری اور قابلِ قدر سمجھنا۔ دونوں باتیں غلط ہیں۔ حقیقت میں جو مقام کسی دستاویز کو حاصل ہے: اس کو اسی لحاظ سے دیکھنا چاہیے۔ اس بارے میں افراط و تفریط درست نہیں۔ کسی واقعے کو اس کے اصل زمانے سے پہلے رونما ہوتے ہوئے خیال کرنا یا اس کو بعد والے دور سے متعلق سمجھنا بھی اچھا نہیں۔ زمانے کا تعین کرتے وقت احتیاط کا دامن نہ چھوڑنا چاہیے۔

۴۔ کوئی ایک درست اور صحیح مآخذ کسی خیال (Idea) کے وجود کو ثابت کر سکتا ہے، لیکن دوسرے براہ راست، باصلاحیت اور آزاد گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو واقعات یا معروضی حقائق کی اصلیت کو ثابت کر سکیں۔

۵۔ مآخذ میں ایک جیسی غلطیوں کا پایا جانا بتاتا ہے کہ انھوں نے ایک دوسرے پر انحصار کیا یا انھوں نے ایک مشترکہ دستاویز سے استفادہ کیا ہے، ورنہ ایک جیسی اغلاط ان میں نہ پائی جاتیں۔

۶۔ اگر کسی خاص نکتے کے بارے میں گواہ متضاد بیان دیتے ہوں تو ممکن ہے کہ ان میں ایک صحیح کہتا ہو اور دوسرا غلط اور یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں غلط کہتے ہوں۔

۷۔ اگر براہِ راست، باصلاحیت اور آزاد گواہ ایک ہی اہم حقیقت اور اس سے متعلق بہت سے معاملات کو رپورٹ کر رہے ہوں اور ان کی بیان کی ہوئی علت (Cause) بھی ایک ہو تو ان کے اتفاق رائے کی وجہ سے اس رپورٹ کو قبول کیا جا سکتا ہے۔

۸۔ اگر ممکن ہو تو سرکاری شہادت۔ خواہ زبانی ہو یا تحریری۔ کا غیر سرکاری شہادت کے ساتھ مقابلہ کر لینا چاہیے، کیونکہ ان دونوں میں سے کوئی ایک اکیلی کافی نہیں ہوتی۔

۹۔ ایسا ممکن ہے کہ ایک مآخذ چند نکات کے بارے میں قابلِ اعتماد اور اہلیت والی شہادت پیش کرے، لیکن دوسرے نکات کے بارے میں اس کی پیش کی گئی شہادت میں کوئی وزن نہ ہو''۔

دستاویزی تحقیق میں فرضیہ:

تحقیق صرف حقائق اور معلومات کی جمع آوری کا نام نہیں، بلکہ اعلیٰ معیار کی تحقیق میں ان سے عام اصول ونتائج نکالے جاتے ہیں۔تاریخی یا دستاویزی تحقیق میں بھی بہت سے فرضیات (Hypotheses) کی مثالیں ملتی ہیں۔ٹائرس ہل وے (Tyrus Hilway) اس پر بحث کرتے ہوئے کہتا ہے:

''اگر ہم امریکی تاریخ کے بارے میں گذشتہ پچاس سال میں کی گئی تحقیق پر نظر ڈالیں تو ہم فوراً جان لیں گے کہ تاریخی واقعات کے متعلق دو فرضیات یا توجیہات نے نمایاں مقام حاصل کیا اور انھوں نے زیادہ اثر ڈالا ہے۔یعنی تاریخی واقعات کیوں اور کس طرح ظہور پذیر ہوئے۔ان میں سے ایک کو فریڈرک جیکسن ٹرنر (Frederick Jackson Turner) نے پوری قابلیت کے ساتھ آگے بڑھایا۔اس کے مطابق سرحدوں کی مستقل حیثیت نے امریکہ میں رونما ہونے والے طرز عمل اور واقعات کو کافی حد تک متاثر کیا اس نظریے کی رو سے مغرب نے آزاد ممالک اور آزاد زندگی نے مشرق کے سماجی اور اقتصادی دباؤ کے ساتھ الجھے بغیر، امریکہ کی جمہوری اور منفرد زندگی کو قائم رکھا ہے۔یعنی امریکہ میں جمہوری فیصلے ہوتے ہیں اور یہ (اس کی) انفرادیت ہے۔آزاد ممالک کی مدد کی جاتی ہے اور ان کے معاشرتی اور اقتصادی ڈھانچے سے دامن بچا کر آزاد ترقی پذیر ممالک کی مدد کی جاتی ہے۔دوسرے فرضیے کے مطابق چارلس اے بیرڈ (Charles A Beard) بیان کرتا ہے کہ امریکی تاریخ میں تمام بڑے واقعات عموماً اقتصادی عوامل کے نتیجے کی وجہ سے رونما ہوئے۔بیرڈ کے نظریے کی رو سے پہلے نوآبادکاروں (Colonists) کو بھی سیاسی اور مذہبی آزادی کی خواہش سے کم تحریک ملی، بلکہ ان کو نئی دنیا میں بہتر اقتصادی مواقع نظر آئے اور ان کو اس مؤخر الذکر عامل سے زیادہ تحریک ملی۔امریکہ کی تاریخ میں انقلاب اور دوسرے بڑے بڑے واقعات کی توضیح وتوجیہ اس کوشش کی روشنی میں کی جاسکتی ہے جو اقتصادی فائدے کے لیے کی جاتی ہے۔بیرڈ کے نظریے کی رو سے امریکی زندگی اور کردار میں مثالیت (Idealism) اور اخلاقی اصولوں نے کم سے کم اثر ڈالا ہے۔لیکن شاید دونوں نظریات کسی حد تک امریکہ کی تاریخی نشوونما کی بنیادی عوامل کو بہت زیادہ سادگی سے بیان کرتے ہیں، جب کہ وسیع معنوں میں وہ ایک دوسرے سے متضاد معلوم ہوتے ہیں، کہیں دونوں ایسے محتاط طریقے سے نکالے ہوئے عام اصول بیان کرتے ہیں جن کی بنیاد واقعاتی معلومات پر ہے اور یہ معلومات دستاویزات کے تجربے سے اخذ کی گئی ہیں۔یہ دونوں فرضیات دوسرے مؤرخین کے خیالات پر کافی حد تک اثر انداز ہوئے ہیں۔ان مثالوں سے تاریخی یا دستاویزی تاریخ میں فرضیے کے کردار کو دیکھا جاسکتا ہے''۔

تاریخی تحقیق میں فرضیات بنانے کا عمل سادہ نہیں بلکہ بہت پیچیدہ نوعیت کا ہوتا ہے۔کوئی ایک یا دو سادہ عوامل کم ہی بڑے بڑے تاریخی واقعات کے رونما ہونے کا باعث بنتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اس میدان میں گہری بصیرت کے ساتھ کام کرنے والے بہت سے عوامل کو زیر غور لاتے ہیں اور ان سب کو پیش نظر رکھ کر فرضیات بناتے ہیں۔لائبریری سائنس کے میدان میں تاریخی تحقیق کی ایک مثال دیتے ہوئے بشا اور ہارٹر بیان کرتے ہیں:

فرض کیجیے کہ کوئی مورخ ان حالات کو معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو دنیا میں کتب خانوں کے ارتقاء کا باعث بنے۔ایک جلد باز مؤرخ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ شہری علاقوں میں آبادی کا اجتماع اور ثقافتی کاموں کے لیے پبلک مالیات کے ذرائع پیدا ہونے کی وجہ سے کتب خانوں نے ترقی کی۔وہ ان دو عوامل کو ہی پیش نظر رکھتا ہے اور مندرجہ ذیل اہم عوامل کو نظر انداز کر دیتا ہے:

۱۔ مختلف معاشروں میں موجود شعور جس کی وجہ سے علم کی جمع آوری، حفاظت اور نشر واشاعت کی ضرورت اور قدر وقیمت سمجھی جاتی ہے۔
۲۔ کسی معاشرے میں سیاسی استحکام اور امن وامان کا موجود ہونا۔
۳۔ فارغ اوقات سے لطف اندوز ہونے کے لیے سہولت کی دست یابی۔
۴۔ معاشرے میں وسیع طور پر نوادرات کا جمع ہو جانا جن کو مخیر حضرات تعلیمی اور ثقافتی اداروں کو عطیہ کے طور پر دیتے ہیں۔
۵۔ افراد کی ترقی اور نشوونما کے عام شعور کی اہمیت اور ایسے شہری پیدا کرنے پر زور دینا جو خوب باخبر ہوں۔
۶۔ علم وآموزش کے احیا کی تحریک جو زور دیتی ہے کہ تحریری آثار کے ذخیروں کو جمع کیا جائے اور ان سے استفادہ کیا جائے۔
۷۔ معاشرے میں اس فضا کا موجود ہونا جو سماجی اداروں کو استحکام اور دوام بخشتی ہے۔

۸۔ ایسی تخلیق ادبی سرگرمیوں کا ظہور جو لکھنے پڑھنے کے عمل کو ترقی دیتی ہے۔

۹۔ کاغذ اور طباعتی ساز و سامان کی کثرت کے ساتھ پیداوار یا ابلاغ کے دیگر ذرائع بھی۔

۱۰۔ مختلف معاشروں کا تجارت اور سیاحت کی وجہ سے باہمی میل جول۔

۱۱۔ حکمرانوں اور سیاسی رہنماؤں کے مقابلے کی خواہش جس کی وجہ سے وہ تحریری اطلاع کے بڑے بڑے مخزن قائم کرنے اور ان کو ترقی دینا چاہتے ہیں۔

۱۲۔ تعلیمی ادارے جیسے جامعات اور سکولوں کی ترقی جو کتب خانوں پر انحصار کرتے ہیں۔

۱۳۔ شرح خواندگی میں اضافے کی وجہ سے ایسے لوگ پیدا ہو گئے جو تعلیم یافتہ ہیں اور شہری شعور رکھتے ہیں۔

۱۴۔ کسی ایک زبان میں سرکاری ریکارڈز اور ادبی مواد کے ذخائر کا وسیع پیمانے پر جمع ہو جانا۔ بلاشبہ اور بھی ایسے عوامل کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مختلف معاشروں میں کتب خانوں کی نشوونما متعدد حالات و عوامل کا نتیجہ ہے۔ مؤرخین کو ایسے بہت سے تعلیلی متغیرات (Multiple Casuative Variables) کی تلاش کرنی چاہیے۔

دستاویزی تحقیق کی اقسام:

دستاویزی تحقیق کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ٹائرس ہل وے (Tyrus Hilway) نے اس کی چھ قسمیں گنوائی ہیں:

۱۔ سوانح حیات

۲۔ اداروں اور تنظیموں کی تاریخ

۳۔ ذرائع اور اثرات

۴۔ ترتیب و تدوین متن

۵۔ نظریات کی تاریخ

۶۔ کتابیات

(۱) سوانح حیات

اس میں کسی شعبۂ علم کی کسی معروف شخصیت کی زندگی، کردار اور کارناموں کے بارے میں بڑے بڑے حقائق کو جمع کیا جاتا ہے اور ان کو صداقت و دیانت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ ادبیات میں محقق کسی ادیب کی سوانح اور آثار کو تحقیق کا موضوع بنائے گا۔ تعلیم کے میدان میں کسی ماہر تعلیم کی حیات اور خدمات پر تحقیق کی جاتی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبے میں کسی سائنس دان کی سوانح اور خدمات پر کام کیا جاتا ہے۔ لائبریری سائنس کے حوالے سے بات کی جائے تو کسی معروف لائبریرین کی حیات اور خدمات پر کام کیا جاتا ہے۔ مثلاً خواجہ نور الٰہی مرحوم پنجاب پبلک لائبریری، لاہور میں کئی سال تک لائبریرین کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ان پر تحقیقی کام ہو سکتا ہے۔ اسی طرح امتیاز علی خان عرشی مرحوم رام پور میں لائبریرین رہے۔ ان کی شخصیت کے بہت سے علمی اور ادبی پہلو ہیں جن پر تحقیقی کام ہو سکتا ہے۔

(۲) اداروں اور تنظیموں کی تاریخ:

اداروں اور تنظیموں کی تاریخ کے لیے بھی دستاویزی تحقیق کا طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔ جامعات، کتب خانے اور دوسرے ادارے اسی میں آ جاتے ہیں۔ پاکستان میں موجود جامعات اور کتب خانوں پر کچھ تحقیقی کام پہلے ہو چکا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کی پہلے پچاس سال کی تاریخ بروس (Bruce) نے لکھی جس کو یونیورسٹی نے ۱۹۳۳ء میں شائع کیا۔ اس سال (۱۹۸۲ء) میں یونیورسٹی کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں یونیورسٹی کی تاریخ کو رواں سال تک مکمل کیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے ۱۹۶۲ء میں تاریخ اورینٹل کالج لکھی۔ اس میں اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں کالج کی خدمات کو بیان کیا گیا ہے۔ کالج کے اساتذہ کی ادبی علمی اور تحقیقی خدمات کا ذکر بھی کیا ہے۔ اسی طرح گورنمنٹ کالج، لاہور کی تاریخ (۱۹۱۴ء) (۱۸۶۴ء) گیرٹ (Garret) نے لکھی تھی۔ اکتوبر ۱۹۸۱ء میں

گورنمنٹ اسلامیہ کالج سول لائنز، لاہور کا مجلّہ فاران (ہجرت نمبر) شائع ہوا ہے۔ اس میں محمد صدیق نے اسلامیہ کالج کی تاریخ پر ایک مبسوط مقالہ لکھا ہے۔ اس کا نام ہے: ''اسلامیہ کالج لاہور برصغیر میں مسلم نشاۃ ثانیہ کا عظیم تعلیمی ادارہ''۔ ہمارے ملک میں ابھی اس میدان میں تحقیقی کام کرنے کی کافی ضرورت ہے۔ بڑے بڑے تعلیمی اداروں کی تاریخیں لکھی جانی چاہییں۔ کتب خانوں پر بھی تحقیقی کام ہونا چاہیے۔

۳۔ ذرائع اور اثرات کی تاریخ:

اس قسم کی تاریخ میں یہ جاننے کی کوشش کی جاتی ہے کہ کسی فرد یا جماعت کے خیالات، تحریروں اور خاص کارناموں پر ایسے عوامل مثلاً تعلیم، احباب، مطالعہ، روزمرہ زندگی کے واقعات اور بالعموم ماحول کس طرح اثر انداز ہوئے۔ عام طور پر اس طرح کی تحقیق کرنے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اس فرد کے تحریری یا زبانی بیانات یا اس کے طرز عمل میں اس اثر کی واضح شہادت معلوم کی جاتی ہے۔ ادبیات میں ایسا ہوتا ہے کہ لکھنے والا کسی دوسرے مصنف سے کوئی پلاٹ، کردار یا قافیہ مستعار لیتا ہے۔ سائنس میں محقق کسی اور سائنس دان سے شعوری یا غیر شعوری طور پر رہنمائی حاصل کرتا ہے۔ جیسا کہ ڈارون کو نظریہ ''جہد للبقا'' (Struggle for existence) کی پہلی بار تجویز ملتھس (Malthus) کے مطالعے سے ملی۔

(۴) ترتیب و تدوین متن:

دستاویزی تاریخ میں تدوین متن بہت اہمیت رکھتا ہے۔ کسی مصنف کی کتاب کو ترتیب دینا، کسی کتاب کے پرانے ایڈیشن کو حواشی کے ساتھ نئی شکل دینا، کسی اہم مخطوطے کو مرتب کر کے عام استفادے کے لیے شائع کرنا۔ ایسے علمی اور تحقیقی کام اس میں شامل ہوتے ہیں۔ محقق اپنے کام کو اس طرح کرتا ہے، پہلے وہ اصل متن کو تلاش کرتا ہے۔ کتابوں کے مختلف پرانے ایڈیشن اور ایک ہی مخطوطے کے متعدد نسخے اپنے اندر متن کے اختلافات رکھتے ہیں۔ ان مختلف مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخوں میں سے بہتر نسخے کو اصل متن کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے۔ پھر ان سب کا تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات مصنف اپنے کام پر نظر ثانی کرتا ہے۔ مرتب کو چاہیے کہ متن میں کی گئی مصنف کی تبدیلیوں کو بھی پیش نظر رکھے۔ متن میں موجود ظاہری اور امکانی اغلاط اور غلط مطبوعہ الفاظ کو درست کر دینا چاہیے۔ مصنف کے الفاظ و معانی کو معلوم کیا جائے اور اگر اس کی تلمیحات و اشارات غیر مانوس اور مبہم ہوں تو ان کی توضیح کر دی جائے۔ بعض حالات میں تدوین متن کے ساتھ ترجمہ بھی کرنا پڑتا ہے۔

پاکستان کی جامعات میں تدوین و ترتیب متن کے سلسلے میں کافی کام ہوا ہے۔ اس میں ایم۔ اے سے لے کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی سطح تک کا کام شامل ہے۔ قاضی عبدالنبی کوکب مرحوم (وفات ۱۹ جنوری ۱۹۷۸ء) فقہ کی عربی کتاب: ''اللباب فی الجمع بین السنة والکتاب'' از جمال الدین علی بن ذکریا بن مسعود المنجی (المتوفی ۶۸۶ھ) کے ایک حصے کو ۱۹۶۶ء میں ایم اے (عربی) کی ڈگری کے لیے مرتب کیا تھا۔ ڈاکٹر محمد بہاء الحق رانا نے عربی کی ایک معروف کتاب: اتمثال الامثال از محمد علی بن علی بن محمد بن ابی بکر المتوفی ۱۳۷ھ کا نصف اول ۱۹۶۱ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے مرتب کیا تھا۔ اسی طرح ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے البطلیوسی کی کتاب ''القرط علی الکامل'' کو پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے ۱۹۶۹ء میں مرتب کیا تھا۔

۵۔ نظریات کی تاریخ:

اس میں عموماً بڑے بڑے فلسفیانہ اور سائنسی نظریات کی تاریخ پر تحقیق کی جاتی ہے۔ یعنی معلوم کیا جاتا ہے کہ اس نظریے کا سب سے پہلے ظہور کب ہوا اور یہ کن ارتقائی منازل سے گزر کر اپنی اصل صورت میں آیا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی خاص دور میں عام لوگوں کے خیالات اور طرز عمل میں تبدیلیوں کو معلوم کیا جاتا ہے مثلاً نظریہ حیاتیاتی ارتقاء (Bilogical Evolution) پر کام کرتے ہوئے محقق اس کا اصل ماخذ یونانی فلسفے میں پاتا ہے اور پھر اس کا موجودہ دور تک جائزہ لے کر معلوم کرتا ہے کہ سائنس پر اس کے اثرات کیا ہیں۔ اسی طرح نظریہ پاکستان کے تاریخی پہلو پر کئی لوگوں نے کام کیا ہے۔ پیام شاہجہانپوری کی کتاب ''تاریخ نظریہ پاکستان'' مثال کے طور پر بیان کی جاسکتی ہے۔ دوسرے نظریات کی تاریخ پر اسی طرح کام کیا جاسکتا ہے۔

۶۔ کتابیات:

کسی بھی شعبۂ علم میں کتابیات کی تدوین دستاویزی تحقیق کے طریقے سے کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کتابیات کے بغیر ذخیرۂ علم خاموش ہے۔ اس سے

کتابیات کی اہمیت وافادیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اس کے ذریعے سے تحقیق کرنے والوں کا بہت سا قیمتی وقت بچ جاتا ہے۔ محقق کو کسی موضوع کے بارے میں ایک ہی مقام پر کتب اور دیگر معلوماتی ذرائع کے اندراجات مل جاتے ہیں۔اس طرح وہ خود اس محنت و مشقت سے بچ جاتا ہے جو اس کو ان کی تلاش میں کرنا پڑتی۔ پاکستان میں کئی شخصیات اور موضوعات پر کتابیات (Bibliographies) شائع ہو چکی ہیں۔اقبالیات کے شعبے میں متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں مثلاً ۱۹۷۷ء میں رفیع الدین ہاشمی کی کتاب ''کتابیات اقبال'' اور سید معین الرحمٰن کی کتاب: ''دو جامعات میں اقبال کا تحقیقی مطالعہ''۔ایک جائزہ اقبال اکادمی پاکستان کی طرف سے شائع ہو چکی ہیں۔ڈاکٹر انیس خورشید نے احمد حسن زبیری و دیگر معاونین کی مدد سے قائداعظم پر دو جلدوں میں کتابیات تیار کی۔اس کو قائداعظم اکیڈمی نے ۱۹۷۸ء۔۱۹۷۹ء میں شائع کیا۔پہلی جلد میں مغربی زبانوں کے حوالہ جات شامل ہیں اور دوسری جلد مشرقی زبانوں کے حوالہ جات پر مشتمل ہے۔جامعہ پنجاب کے مختلف شعبوں میں ایسے تحقیقی مقالات بھی پیش کیے گئے ہیں جو کتابیات کی صورت میں ہیں۔یہاں پر ایسے مقالات کی دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔شعبۂ پنجابی میں شہباز ملک نے ۱۹۷۲ء میں ''فارسی رسم الخط وچ چھپیاں پنجابی کتاباں'' (فارسی رسم الخط میں چھپی ہوئی پنجابی کتابیں) کے عنوان سے ایک ضخیم کتابیات مرتب کی۔ انھوں نے اس کو ایم۔اے (پنجابی) کے امتحان کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا۔اسی طرح شعبہ لائبریری سائنس میں افضل حق قرشی نے ۱۹۸۱ء میں پاکستان میں ضبط شدہ کتب (از ۱۹۴۷ء تا ۱۹۷۲ء) کی کتابیات مرتب کی اور اس کو ایم۔اے (لائبریری سائنس) کے امتحان کی ضروریات کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا۔

حقائق کی وضاحت اور نتائج کا بیان

محقق جب اپنے زیرِ تحقیق مسئلے کے بارے میں شہادت جمع کر لیتا ہے تو پھر جمع کیے ہوئے حقائق کی وضاحت کی جاتی ہے اور ان سے نتائج نکالے جاتے ہیں۔ریسرچ رپورٹ کو لکھتے وقت تحقیق کرنے والے کو کئی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔اس سلسلے میں رہنمائی کے چند اصول بشا اور ہارٹر (Busha & Harter) کے حوالے سے یہاں پر درج کیے جاتے ہیں:

رپورٹ کو لکھتے ہوئے محقق کا مندرجہ ذیل مدارج سے سابقہ پڑتا ہے:

(الف) موزوں معلومات کا انتخاب جن کو ریسرچ رپورٹ میں شہادت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

(ب) جمع کی ہوئی معلومات کا تجزیہ۔

(ج) اور بیانیہ رپورٹ کی تنظیم، تشکیل اور تحریر۔

مورخین کو چاہیے کہ وہ اس شہادت کو زیادہ اہمیت دیں جو ان کے زیرِ تحقیق مسئلے کے لیے سب سے زیادہ اہم اور معنی خیز ہو۔اس کی توضیح و توجیہ بھی کی جائے۔تاریخ کے قارئین عام طور پر صرف حقائق کی فہرست ہی میں دلچسپی نہیں رکھتے۔تحقیقی مطالعہ کے مقصد کے پیشِ نظر معلومات کو مربوط انداز میں پیش کیا جانا ضروری ہوتا ہے اور ان کی وضاحت بھی کی جانی چاہیے۔

تاریخی تحقیق کی رپورٹ کو اس شہادت پر مبنی ہونا چاہیے جس کو تنقیدی نقطۂ نظر سے پرکھ لیا گیا ہو۔حقائق اور توجیہات کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ قارئین ان کو زیرِ حوالہ شہادت کی روشنی میں جانچ پرکھ سکیں۔تاریخی شہادت کو ایسے بیان کی شکل دی جاتی ہے جو کسی گزشتہ واقعہ کو صحیح صحیح بیان کرتا ہے۔اس کے لیے ذہانت، مخیلہ، ممیزہ اور باریک بینی کی صفات مطلوب ہوتی ہیں۔واضح پیرائیہ بیان اچھے مورخ کا مقصد ہوتا ہے۔رپورٹ کو پہلے ابتدائی مسودے کی صورت میں لکھا جائے پھر اس پر نظرِ ثانی اس طرح کی جائے کہ ربط و تسلسل پر زور دیا جائے، خیالات میں وضاحت پائی جائے اور اسلوب میں روانی ہو۔جو لوگ اس میدان میں کام کی ابتدا کرتے ہیں ان کو چاہیے کہ وہ رپورٹیں اس خیال کے زیرِ اثر لکھیں کہ ان کے مخاطب لوگ صاحبِ علم، نقاد اور اسکالرز ہیں۔تاریخی بیان میں ذہنی دیانت کو رہنمائی فراہم کرنی چاہیے...... مورخ کو اس بات کے اعتراف کرنے پر آمادہ رہنا چاہیے کہ اس کے نتائج آزمائشی نوعیت کے ہیں۔ممکن ہے کہ بعد میں دریافت ہونے والی معلومات ان کو کافی حد تک یا قدرے تبدیل کر دیں۔

تاریخ کی سچائی کا انحصار نہ تو اس شخص پر ہوتا ہے جو وضاحت کر رہا ہوتا ہے اور نہ ہی ریسرچ رپورٹ کے قاری پر ہوتا ہے، بلکہ رپورٹ کی سچائی کو اس ڈگری سے ناپا جاتا ہے جہاں پر معلومات اور نتائج کو اس شہادت کے ساتھ جوڑا جاتا ہے جس کو غیر جانب دارانہ اور معروضی طریقے سے حاصل کیا جاتا ہے اور پھر اس کی توضیح کی جاتی ہے۔تاریخ میں یہ خوبی پائی جانی چاہیے کہ وہ ذہین لوگوں کو مطمئن کرے اور ماضی کو حال و مستقبل کے قارئین کے لیے دلچسپ اور قابلِ فہم بنائے۔ اگرچہ بعض تاریخی وضاحتیں لفظی طور پر واضح ہو سکتی ہیں لیکن وہ اس کے ساتھ ہی غلط بھی ہو سکتی ہیں مثلاً کوئی شخص معلوم کر سکتا ہے کہ کسی مورخ نے واقعات کی تصویر کشی

نہایت واضح انداز کے ساتھ کی ہے، لیکن اس کے نتائج ان واقعات کے رونما ہونے کے اسباب اور ان کی کیفیت کی غلط وضاحتوں پر مبنی ہو سکتے ہیں۔ ایسی وضاحتیں اس وقت فراہم کی جاتی ہیں جب تاریخی تحقیق نامکمل، بے نتیجہ، غیر یقینی اور محدود ہو۔

جب مورخ تمام متعلقہ عوامل کو زیر غور لانے میں ناکام رہے تو جو تاریخ وہ لکھے گا، وہ جانب دارانہ ہوگی۔ مورخین اس وقت مکمل تاریخوں کی بجائے تخمینے اور اندازے پیش کرتے ہیں جب وہ ایسی وضاحتیں پیش کرتے ہیں، جو ان لوگوں کے ریکارڈز سے نہیں لی جاتیں، جو ان واقعات میں شریک تھے۔ تاریخی واقعات کی وضاحتیں اس وقت بے نتیجہ ہوتی ہیں جب واقعات اور ان میں شریک لوگوں کے محرکات کے درمیان تعلقات کو مضبوطی سے قائم نہ کیا گیا ہو۔ غیر یقینی تاریخی وضاحتیں ناکافی شہادت پر مبنی ہوتی ہیں، جب کہ محدود تاریخیں وہ ہوتی ہیں جن کا اطلاق صرف ایک خاص صورت حال میں ہوتا ہے اور ان سے ایسے نتائج نہیں نکالے جا سکتے جن کا اطلاق ان جیسی صورتوں پر کیا جا سکے۔

❖❖❖❖

(۱) لائبریری سائنس اور اصول تحقیق، جمیل احمد رضوی، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء، ص ۱۱۹ تا ۱۵۵۔

تحقیق کے طریقۂ کار[1]

ڈاکٹر ش۔ اختر

مشاہدات

ریسرچ کے طریقۂ کار کے ماہرین نے Data جمع کرنے کے مختلف طریقوں پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ سارے طریقے ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ اس لیے ان کا تقابلی مطالعہ مفید ہے۔ Frestenger Kartz نے تین امور کی طرف اسکالرز کی توجہ مبذول کی ہے۔

۱۔ سوال ناموں کے ذریعہ۔

۲۔ افراد کے مشاہدات کے ذریعہ۔

۳۔ ماضی میں جمع کیے گئے ڈاٹا کے مطالعہ کے ذریعہ۔

سماجی نفسیات میں Data جمع کرنے کے طریقوں پر بہت زور دیا گیا ہے اور معروضی مشاہدات کے مسائل پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ تمام ریسرچ اسکالرز کے مشاہدہ کے طریقے الگ ہیں۔ بعض نے سوال نامہ کی افادیت پر زور دیا ہے، بعض نے انٹرویوز پر۔ لیکن کسی نے بھی ان کی افادیت سے انکار نہیں کیا۔ یہ سارے ذرائع ادب میں بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ خصوصیت سے انٹرویوز اور سوال نامہ۔ لہٰذا ان کے متعلق تفصیل سے جاننا ضروری ہے کہ آخر انٹرویوز کیا ہیں؟ ان کی اہمیت کیوں ہے اور ان سے حاصل کیے گئے حقائق سے کس طرح نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔ اس طرح جب ہم مشاہدہ کے متعلق گفتگو کرتے ہیں تو ہمیں اس کا احساس رہتا ہے کہ ہم لوگ بروقت، ہر لمحے مشاہدہ کی مختلف منزلوں سے گذرتے ہیں۔ لیکن یہ تمام مشاہدات، سائنٹفک نہیں ہوتے۔ ہمہ اقسام کے Data جس کی ضرورت اسکالر کو ہوتی ہے، وہ صرف براہ راست مشاہدہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ کیوں کہ اس طرح کے مشاہدہ سے بہت سے فوائد ہیں۔ ان مشاہدوں کی قسمیں بھی کئی ہیں:

Controlled/ Uncontrolled observation Structured / Unstructured observation partially structured participant/ No-participant Disguised observation.

مشاہدہ کی مذکورہ بالا قسموں کا استعمال اس امر پر منحصر ہے کہ اسکالر کا موضوع کیا ہے اور اس کے کام کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور اس کی تحقیق کے مقاصد کیا ہیں۔ اگر کسی حقیقت کی تلاش کا مسئلہ درپیش ہے تو مشاہدہ کا طریقہ قدرے Unstructured ہوگا اور مشاہدہ کرنے والا جماعت یا گروپ میں شامل ہوگا، صرف تماشائی کی حیثیت نہیں ہوگی۔ اس کے برعکس اگر مطالعہ کی نوعیت وضاحتی یا تجرباتی ہے تو مشاہدہ کا طریقہ Structured ہوگا اور اس میں مشاہدہ کرنے والے کی شمولیت گروپ اور حلقہ سے ضروری نہیں ہے لیکن مشاہدہ کرنے والے کا ذہن کم از کم چار طرح کے سوالوں کے سلسلہ میں بالکل واضح ہونا چاہیے۔

۱۔ کس کا مشاہدہ کرنا ہے۔

۲۔ مشاہدات کی تحریری نوعیت کیسی ہوگی۔

۳۔ مشاہدات کی صحت کی ضمانت کیا ہے۔

۴۔ مشاہدہ کرنے والے اور مشاہدہ کے درمیان قربت کیسی ہوگی اور ان میں یہ قربت اگر نہیں ہے تو کیسے قائم کی جائے گی۔

مشاہدات کے ان چار طریقوں کا علم بھی ضروری ہے Unstructured مشاہدہ مرکب ساخت Structured کے برعکس ہے۔ کیوں کہ Structured مشاہدہ میں اشیاء کی حد بندی اور تعریف متعین کردی جاتی ہے۔ اطلاعات کو ریکارڈ کرلیا جاتا ہے لیکن Unstructured میں یہ سب نہیں ہوتا۔ اسے یوں سمجھنا چاہیے کہ مشاہدہ کس کا کیا جائے۔ کیونکہ اس کی وضاحت نہیں ہوئی تو Data جمع کرنا بھی مشکل ہے اور اس کے نتائج کا معلوم کرنا بھی دشوار ہے۔ وہ ریسرچ جس کے اغراض و مقاصد اور طریقۂ کار میں کوئی پیچیدگی نہیں ہوتی اور جس کا مفروضہ واضح ہوتا ہے، وہ یہ بھی بتادیتا ہے کہ اُن کے لیے کس طرح کے Data کی ضرورت ہوگی اور کس طرح حاصل کیے جائیں گے۔

(۱) [illegible]

لیکن وہ ریسرچ جس میں حقیقت کی تلاش کا تصور واضح نہیں رہتا اسے یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کوئی اصول وضع نہیں کیے گئے ہیں۔ لیکن چند اشارے ضرور ملتے ہیں۔ مثلاً

۱۔ ناظر کو یہ دیکھنا چاہیے کہ شرکا کی نوعیت کیا ہے۔ ان کی تعداد کتنی ہے اور اُن کے آپسی تعلقات کیسے ہیں۔

۲۔ مشاہدہ کرنے والے کو یہ جاننا چاہیے کہ ساخت یا ترتیب کیسی ہوگی، وہ کس طرح اپنے ناظرین کو اپنے مصرف کی خاطر استعمال کر سکتا ہے۔

۳۔ اس میں حصہ لینے والوں کی جماعت کے مقصد کو بھی سمجھنا چاہیے جس نے لوگوں کو جمع کیا ہے۔ مقاصد کیسے ہیں اور اس سے افراد کس طرح اپنا رشتہ محسوس کرتے ہیں۔

۴۔ معائنہ کرنے والے کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ شریک ہونے والے افراد کی مصروفیات کیا ہیں۔ ان کی خصوصیات کیا ہیں۔ وہ کس کے درمیان کام کرتے ہیں اور کام کرنے والوں سے ان کے تعلقات کیسے ہیں۔ اسے اس کی بھی جانکاری ہونی چاہیے کہ افراد کے مجمع فعل Stimuls رویوں کو کس طرح ظاہر کرتے ہیں اور بعض رویوں کا مقصد کے حصول سے کیا تعلق ہے۔

اب ان مشاہدات کو ضبطِ تحریر میں لانے کے لیے دو بنیادی باتیں قابلِ غور ہوتی ہیں۔

(الف) انھیں کب اندراج کرنا چاہیے۔

(ب) اسے کس طرح بحفاظت رکھنا چاہیے۔

سب سے عمدہ اور عملی صورت یہ ہے کہ وقت معینہ پر ہی مشاہدات کو رقم کرنا چاہیے۔ اس طرح تعصبات سے آدمی فطری طور پر بچ جاتا ہے اور یادداشت کی کمزوریوں سے بھی نجات مل جاتی ہے۔ مگر اس کے سلسلے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایسا کرنے سے فطری تعلقات کو نقصان پہنچتا ہے اور عموماً ایسا کرنا بروقت ممکن بھی نہیں اور جن لوگوں کے رویوں کا مشاہدہ کیا جا رہا ہے ان کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ حقیقت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں یا پھر ان سے اجتناب کرنے لگتے ہیں۔ پھر سوال و جواب کے دوران تحریری کارروائی اور مشاہدات کا ساتھ ساتھ چلنا آسان نہیں ہوتا یا تو توجہ میں کمی ہوگی یا تحریری کمزوریاں پیدا ہوں گی۔ اس طرح ذہن مختلف کاموں میں بٹ کر رہ جائے گا اور اسکالر پریشان ہو جائے گا۔ مگر اس کی دوسری صورت بھی دشوار اور غلطیوں کے امکانات سے خالی نہیں۔ اگر بروقت احاطۂ تحریر میں مشاہدات کو نہیں لایا گیا تو ساری باتیں یادداشت سے لکھنی پڑیں گی۔ اس لیے بہتر صورت یہ ہے کہ دوران مشاہدہ اہم نکات کو بے حد اختصار کے ساتھ اسکالر لکھتا جائے لیکن اس کا یہ عمل ایسا ہونا چاہیے کہ مخاطب کی طرف برابر دھیان رہے۔ اس کی توجہ میں کوئی کمی نہ ہو اور دلوں میں پیدا ہوئے شکوک و شبہات کو نکالنے کا کام بھی جاری رہے۔ اگر اسکالر Indexing System سے واقف ہے تو اسے اہم نکات کو لکھنے میں مشکل نہیں ہوگی۔ اس طرح جو افراد اس کی آنکھوں کے سامنے ہیں، ان کی بھی توجہ برقرار رہے گی اور وہ بھی مسائل میں دلچسپی لیتے رہیں گے۔

مشاہدات کی صحت اسکالر کا دوہرا اہم مسئلہ ہے۔ اگر کہیں بروقت نکات کو ضبطِ تحریر میں لانا مشکل ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ تنہائی میں انھیں لکھتے وقت مشاہدات کی صحت مشکوک ہو جاتی ہے، تو اسے Tape Recording سے مدد لینی چاہیے۔ یہاں ریسرچ کے لیے Tools اور آلات کی ضرورت ہوتی ہے ویسے اسکالر کو اپنے حواسِ خمسہ کو بیدار رکھنا ضروری ہے۔ ورنہ کام اس کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے اگر اسکالر اس کام کے لیے کئی افراد بحال کر لے تو مشاہدات کی صحت کا مسئلہ آسان ہو جائے گا۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے۔ کوئی کیوں کسی کا کام کرے گا۔ پھر اگر کوئی تیار بھی ہو جائے تو ضروری نہیں کہ اس کی ذہنی سطح بھی اسکالر کے برابر ہوگی اور وہ بھی احاطۂ تحریر میں وہی لکھے (لائے؟) گا جو اسکالر محسوس کرتا ہے۔ دو آدمی بھی اس کام کو بخوبی انجام نہیں دے سکتے۔

اس کام کے سلسلے میں ذاتی مصلحت اندیشی اور داخلیت پسندی نقصان پہنچاتی ہے۔ وہ اگر کسی شخصیت سے متاثر ہے یا مرعوب ہے تو اس کے مشاہدات کا دائرہ محدود ہوگا اور افراد کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور افعال کی طرف اس کی نظر نہیں اٹھے گی۔ اس لیے ہر لحہ اسے اپنے کاموں کا تنقیدی جائزہ لیتے رہنا ہوگا، یعنی اسکالر کے لیے یہ منزل خود احتسابی کی منزل ہوتی ہے۔ جن لوگوں کے مشاہدات اور رویوں کے مطالعہ کے لیے وہ جاتا ہے ان سے اسکالر کو ایک ربط پیدا کرنا ضروری ہے۔ بہت سے لوگ حقائق کے اشتہار کی وجہ سے اطلاعات بہم نہیں پہنچاتے اور اپنا رویہ ظاہر نہیں ہونے دیتے، یہ اسکالر کے لیے پریشانی کی بات ہے۔ اس لیے یا تو ان کا دل جیتنے کی کوشش کرنی چاہیے یا ان کا اعتماد حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ یا پھر اپنی شخصیت اور اغراض و مقاصد کو پوشیدہ رکھنا چاہیے تاکہ افراد بغیر کسی شک و شبہ کے اہم نکات کی نشاندہی کر سکیں۔ رویوں کے مطالعہ میں اسکالر کا محتاط رویہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ آدمی کئی چیزوں کے ساتھ زندہ رہتا ہے۔ حسبِ ضرورت وہ نقاب بدلتا رہتا ہے یہ اس کی بڑی نفسیاتی کمزوری ہے۔ لہٰذا اسکالر کو علم نفسیات کے اصولوں کا علم ہونا چاہیے۔ اسے انسانی نفسیات کا تجربہ بھی درکار ہے۔ اس طرح ریسرچ کا یہ

عمل سماجی نفسیات کے دائرہ میں آجاتا ہے اور ادبی تحقیق بھی اس سے بیگانہ نہیں رہ سکتی۔ ایک طریقہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اگر بہت سے افراد کے رویوں کا مطالعہ مقصود ہو اور اسکالر کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ وہ ان سے ملنے میں کامیاب نہیں ہوگا تو اس جماعت کے ایک ذمے دار نمائندہ افراد کو اپنی مشکلیں بتائے اپنے مقاصد کو واضح کرے اور ان کی مدد سے رویوں کا مطالعہ کرے۔

Structured مشاہدات، اطلاعات کی تقسیم غور و فکر کے بعد کرتی ہے۔ اس کے اغراض معین ہوتے ہیں، اطلاعات پہلے سے طے کر لی جاتی ہیں۔ اس طریقہ کار کا استعمال وہاں ہوتا ہے، جہاں باقاعدہ کسی مفروضہ کو تجربات کے ذریعہ سچ بنانے کی کوشش کی جائے۔ یہاں اسکالر کے سامنے ساری چیزیں واضح رہتی ہیں۔ وہ خاص تکنیک اور پلان کے ذریعہ ان کا مطالعہ کرتا ہے تب Data جمع کرتا ہے۔ تجربہ گاہوں کو اس کی بڑی ضرورت ہوتی ہے، ویسے R.F.Babs نے اس کے بارہ طریقہ کار بتائے ہیں، جن کے ذریعہ رویوں کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

Structured مشاہدوں کو لکھنے کے سلسلے میں Duplicated Sheets کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں وہ لسٹ شامل رہتی ہے جس کی کوڈنگ کرنی ہے بعض مطالعۂ ریسرچ میں Mechanical Recording Instruments استعمال کیے جاتے ہیں۔ مثال کے لیے Chapple نے International Chronograph نکالا۔

Helen نے Babs Audio-Introspectometer اور Gerbands نے Interactional Recorder بنائے۔ ان تمام اشیاء کے ذریعہ رویوں کا ڈاٹا تحریر کیا جاتا ہے اور یہ کام ایک خاص ترتیب کے ساتھ طے پاتا ہے۔ اسی طرح Sound Recording اور Motion Pictures کا بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے ذریعہ بہت سی معلومات آسانی سے حاصل ہو جاتی ہیں۔ لیکن ہر فرد کے متعلق اطلاعات اور اس کے رویوں کا مطالعہ ممکن نہیں۔ اس کی ضرورت وہیں ہوتی ہے جہاں آبادی کا بڑا حصہ ہو یا کسی مخصوص جماعت کے رویوں کا مطالعہ درکار ہو۔

نگران تمام باتوں کے لیے جس خصوصیت کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ اسکالر کی تربیت ہے۔ اگر اسکالر ریسرچ کے طریقہ کار سے بالکل ہی ناآشنا ہے اور اس کے نگران کا بھی وہی حال ہے (جیسا کہ اُردو کے اکثر اساتذہ کرام کا ہے) تو نہ وہ رویوں کا مطالعہ کر سکے گا، نہ اُن ٹولز سے مدد لے سکے گا جس کا ذکر کیا گیا ہے، نہ افراد سے تعلقات قائم کر پائے گا صرف اپنی یادداشت اور وہ بھی یادداشت کے کمزور ترین حصے پر ریسرچ مکمل کر لے گا۔ اُردو میں اسے ڈگری مل جائے گی لیکن ریسرچ کے طریقہ کار کے تحت اس کا کام انتہائی مہمل اور غیر سائنسی ہوگا۔

Participant and the non participant observation یہ تصور سماجی علوم میں پروفیسر Edward Lindon نے دیا۔ موصوف اسکالر کے سوال ناموں کے طریقوں سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ ہاں اور نہیں کے جوابات سے یہ نہیں تسلیم کرتے کہ اس میں اسکالر یا افراد کے تعلقات شامل نہیں رہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر کسی شخص کے رویوں کا مشاہدہ مقصود ہو تو اُن سے سوالات نہیں پوچھیے بلکہ خاموشی کے ساتھ ان کا مطالعہ کیجیے اس کی مثال Nels Anderson نے Hobos کے ساتھ رہ کر دی ہے۔ ہم قبائلی زندگی کے رویوں کے مطالعہ اور مشاہدوں کے لیے سوالات پوچھ کر کے اپنا مقصد پورا نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر ہم اُن کی زندگی کے سفر میں مثل ایک راہی کے ہوں تو رویوں اور مشاہدوں کی نوعیت بڑی سچی ہوگی۔ وہ کسی ایک جماعت یا قبیلہ کی زندگی کے رویوں کا مطالعہ بہتر صورت میں اُسی وقت کر سکتا ہے جب وہ ان کی روزانہ کی زندگی کا ایک جزو ہو۔

اس کی دوسری اچھی مثال W.F.Whyte نے دی ہے۔ جس نے اپنے مطالعہ کے دوران The street Corner Society لکھی۔ پھر Paulcressy نے Taxi Dance Hall میں اسی شرکت اور قربت کے ساتھ مطالعہ کیا۔

Non Participant observation اس کے برعکس ہے۔ یہ قبیلہ، جماعت یا افراد کے ساتھ رہنے یا خاموش مطالعہ کی بات نہیں کہتا۔ بلکہ اس طرح کی شرکت سے وہ بے نیاز رہتا ہے۔ ان دونوں طریقوں کے اپنے اپنے فوائد ہیں۔ جب اسکالر کسی جماعت یا خاندان یا قبیلہ کے اتنا نزدیک آجاتا ہے کہ بقول John Madge ایک دوسرے کی دھڑکن بھی سن سکتا ہے تو وہ بہت آسانی سے مختلف اوقات میں انسانی زندگی کی پیچیدگی کا مطالعہ کر سکتا ہے، اس وقت رویوں کا مطالعہ زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔ وہ زندگی کی چھوٹی بڑی خبروں کے مشاہدہ کے ذریعہ کردار کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ جماعت، افراد یا قبیلوں کی خصوصیات واضح ہو جاتی ہیں۔ اُس کے دل و دماغ میں پیدا ہونے والے سوالات بلا خوف و خطر اپنے جوابات چاہتے ہیں اور جواب دینے والا ایمانداری کے ساتھ بغیر جھجک اس کی وضاحت کر دیتا ہے۔ کیونکہ ان کے درمیان کی اجنبیت ختم ہو جاتی ہے۔ دوسرا بڑا فائدہ اس شرکت سے یہ ہوتا ہے کہ بہت سی باتیں جو افراد کبھی نہیں بتاتے یا خاص موقع پر اپنے خصوصی رویہ سے متاثر رہتے ہیں وہ قربت کی وجہ سے منظر عام پر آجاتے ہیں۔ اس طرح اسکالر ان کے دلوں میں چھپی ہوئی باتوں کو جان لیتا ہے۔ مختلف موقع پر ان کی زندگی

میں اختیار کیے جانے والے موقف سے شناسائی ہو جاتی ہے اور وہ بڑی آسانی کے ساتھ Data جمع کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ وہ بغیر دشواری کے انھیں نوٹ کر لیتا ہے۔ اُسے اپنی یادداشت کی مدد بھی نہیں لینی پڑتی اور ایک ہی وقت میں ریکارڈ اور مشاہدہ عمل سے بھی محفوظ رہ جاتا ہے۔ اس طرح اس کا حاصل کیا ہوا ڈاٹا کمزوریوں اور خامیوں سے معرا ہوتا ہے۔

اس کا کمزور رخ یہ ہے کہ جب اسکالر کسی جماعت یا افراد کا ایک رکن بن جاتا ہے تو وہ غیر جانب دار نہیں رہ پاتا۔ اس طرح اس کی تنقیدی نظر بھی محدود ہو جاتی ہے اور حقائق کی قلم بندی میں وہ تغافل اور مروت کو راہ دیتا ہے۔ ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ جذباتی تعلق کی وجہ سے قابل اعتراض رویوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس طرح جب وہ مقالہ لکھنے بیٹھتا ہے تو اس کا مقالہ ایک حد تک غیر سائنسی رویہ سے متاثر ہو جاتا ہے۔ اس لیے دونوں صورتوں میں سب سے بہتر راہ اعتدال و توازن کی ہے۔ اگر اسکالر اس کو اختیار کرلے تو دونوں قسموں کی اعلیٰ خصوصیتیں اس کے ساتھ رہ سکتی ہیں۔

ان باتوں کے باوجود یہ تسلیم کر لینے میں تامل نہیں کرنا چاہیے کہ ایک غیر جانب دار مطالعہ کا کام خاصا دشوار ہے اور انھی دشواریوں کا ذکر پہلی بار Herbert Spencer نے اپنی تخلیق Study of Sociology میں کیا ہے۔ اس نے موضوع پر چار ابواب لکھے ہیں اور اُن اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے جن کی وجہ سے غیر جانب دارانہ مطالعہ نہیں ہو پاتا۔

۱۔ ہمارے حواس خمسہ کی کمزوریاں۔

۲۔ مشاہدہ اور اس سے حاصل کیے گئے نتائج کے انحصار کی فطری کمزوریاں۔

۳۔ انسانی رویوں کا مطالعہ اس لیے بھی سو فیصدی درست نہیں نظر آتا کیوں کہ وہ عام لوگوں سے متاثر ہوتا ہے اور وہ دوسرے کو متاثر کرتا ہے۔

عام طور پر سے ہم لوگ اپنے حواس خمسہ کو معتبر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ بات ایسی نہیں ہے یہ ہماری خوش فہمی ہے۔ ہم ان پر بھروسہ ضرور کر سکتے ہیں لیکن ان کی حدیں ہوتی ہیں اور علم حیاتین نے ان حدوں کو مقرر کیا ہے۔ آنکھیں ایک خاص دوری تک دیکھ سکتی ہیں۔ کان کی قوتِ سماع محدود ہے۔ زبان ذائقہ محسوسات کے ذریعہ حاصل کرتی ہے۔ ذہن کی پرواز کی بھی حد ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ تمام افراد میں یہ صلاحیتیں یکساں نہیں ہوتیں۔ نفسیات کے ماہرین نے اپنے ریسرچ کے دوران یہ محسوس کیا ہے کہ انسان کسی خاص واقعہ کو خاص پس منظر میں ہی دیکھتا ہے اور یاد رکھتا ہے اور اس کی یادداشت کا سارا عمل اس کے ذہن کی ساخت اور جسمانی صحت پر مبنی ہے۔

اسی طرح مشاہدات اور ماخذ میں قریبی رشتہ ہے ایک دوسرے کو جدا کرنا مشکل ہے۔ کوئی بھی شے جس کا تصادم ہماری قوت مدرکہ سے ہو، ہمارے لیے اہمیت رکھتی ہے۔ اس کا علم ہمیں ہوتا ہے اور ایسا کوئی تجربہ نہیں جس کا علم ہمارے حواس خمسہ کو نہ ہو۔ ریسرچ اسکالر اس حقیقت کے باوجود دیکھتا اور محسوس بہت کچھ کرتا ہے لیکن لکھتا بہت کم ہے۔ کیونکہ اس کے پاس ایک خاکہ پہلے سے موجود رہتا ہے جس میں بہت گھٹانا بڑھانا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اس سے نجات کی یہی صورت ہے کہ جہاں تک ممکن ہو مشاہدات کا بہ غور مطالعہ کیا جائے، اسے احاطۂ تحریر میں لایا جائے اور پھر مفید چیزوں کو آنے والے اسکالر کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ کیونکہ ریسرچ پہلا اور آخری سبق نہیں ہے۔

انٹرویو

ادبیات میں عام طور سے بیانیہ یعنی زبان سے ادا کی گئی باتوں کو اہمیت کم دی جاتی ہے اور تحریریں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے محقق ادب کے سلسلے میں تحریری بیانات اور مسودہ کو زیادہ قابلِ اعتماد، درست اور بنیادی سمجھتے ہیں اور زبانی باتوں اور گفتگو جن کی کوئی تحریری شکل موجود نہیں رہتی، ضمنی تصور کرتے ہیں۔ اگر کسی فرد کے بیان اور تحریر میں کوئی تضاد ہو تو لوگ تحریری بیان کو زیادہ لائق اعتبار سمجھتے ہیں۔ یہ ایک طرح کی روایت بن گئی ہے اور دنیا کے تمام ادب میں عام طور سے تسلیم کی جاتی ہے۔ لیکن یہ درست نہیں ہے اور نہ اسے کلیہ تسلیم کیا جا سکتا ہے اور نہ یہ اعتراف کرنا آسان ہے کہ آدمی اپنی تحریروں میں غلط بیانی اور مبالغہ آمیزی سے کام نہیں لیتا۔ بہر حال انٹرویو ایک زبانی طریقہ کار ہے۔ اس کے ذریعہ بھی Data جمع کیا جاتا ہے۔

آدمی کے خیالات، نظریات اور عقائد کو سمجھنے کے لیے انٹرویو ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے مؤثر طور پر ساری اطلاعات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ G.W.Allport نے اس کی وضاحت اس طرح کی ہے۔

"If you want to know how people feel. What they experience and what they remember. What their emotions

and motives are like, and the reasons for acting as they do -- why not ask them?"

(C.F.Seltiz, Jahoda)

انٹرویو میں اسکالر سوالوں کا آغاز کرتا ہے اور دوسرا شخص جس کا انٹرویو لیا جاتا ہے جواب دیتا ہے۔ مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوران گفتگو انٹرویو کرنے والا ضمنی سوالات بھی کرتا جاتا ہے اور اس استفسار سے مزید جوابات کی گنجائش نکلتی رہتی ہے۔ یہ بہت ہی عام تکنیک ہے لیکن اس میں مغالطہ کی بھی گنجائش ہوتی ہے۔ ویسے سماجی سائنس میں اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ ماہرین سماجیات اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ نظریاتی مباحث اور عقیدوں کی چھان بین کے لیے یہ بہت مؤثر ذریعہ ہے۔

انٹرویو کی تکنیک جس کا ذکر اس باب میں کیا جا رہا ہے Data جمع کرنے کا زبانی وسیلہ ہے۔ دوسرا مؤثر طریقہ سوال نامہ کا ہے جس کی تفصیلات بعد میں آئیں گی۔ دونوں کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ ایک اطلاعات کی فراہمی زبانی ذریعہ سے حاصل کرتا ہے اور دوسرا تحریری، جو زیادہ تر مراسلات کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ چونکہ رویوں کے مطالعہ اور مشاہدہ کے ذریعہ بہت سی باتیں صاف نہیں ہوتیں اس لیے Data جمع کرنے کے دوسرے ذرائع کی طرف محققین کی توجہ مبذول ہوئی۔

انٹرویو عام طور سے دو آدمیوں یا اس سے زیادہ افراد کے سامنے ہوتا ہے۔ اس کا انحصار موضوع کی نوعیت پر ہے۔ اس میں ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سے نکات کی وضاحت اسکالر کو فوراً ہو جاتی ہے۔ ایک جواب سے اگر اس کی تشفی نہیں ہوتی تو وہ اپنی بات کو پھر سے پوچھ سکتا ہے۔ چونکہ انٹرویو لینے والا سوالوں کی ابتدا کرتا ہے اس لیے اُسے بے حد محتاط رہنا پڑتا ہے اور اس کا ہر وقت خیال رکھنا ہوتا ہے کہ انٹرویو دینے والے کو اس کی کوئی بات بری نہیں لگے۔ اس سے نجی زندگی کا دلچسپ خاکہ تیار ہو جاتا ہے۔ اس کی اندرونی زندگی میں جھانکنے کا موقع ملتا ہے۔ اس کے جوابات کی روشنی میں فرد کی ذہنی حالت اور نظریاتی تعصبات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس لیے اسے Empirical طریقہ مطالعہ میں کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ Thomos and Znaneicki نے The polish peasant لکھتے وقت انٹرویو کے ذریعے ایک سماجی اور معاشرتی نظام میں سانس لینے والے پولش عوام کے نظریات اور خیالات کی واقفیت حاصل کی تھی۔ چند اہم انٹرویوز کی تاریخ میں The Authoritarian Personality کی اہمیت زیادہ ہے۔ اس میں Adorno اور اس کے رفقائے کرام نے بڑی محنت سے Data کو جمع کیا اور نتائج معلوم کیے۔ اسی طرح Stouffer نے The American Soldier میں بغور اس کا جائزہ لیا اور مدد لی۔ عام طور سے یہ تکنیک بہت مقبول ہے اور دوسری تکنیک کی بہ نسبت Data جمع کرنے کا آسان طریقہ بھی ہے اس لیے ادب کے ساتھ ساتھ سماجی علوم میں بھی اس کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ خصوصیت سے نفسیات اور سماجیات کے دائرے میں اس کی خاصی قدر و قیمت ہے۔ ہم لوگ عام طور سے انٹرویو کے فائدے سے تو واقف ہیں لیکن بہت کم اسکالر کو اس کا علم ہے کہ انٹرویوز بھی مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ مثلاً

(1) Diagonostic Interview.

(2) Psychaitric Interview.

(3) Individual Interview.

(4) Group Interview.

(5) Therapeutic Interview.

(6) Structured or Unstructured Interview.

(7) Directive or Undirective Interview.

انٹرویو کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ مفروضات کو ثابت کرے۔ دراصل انٹرویو، ڈیزائن اور سوال نامہ سبھوں کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے۔ ایک وکیل اپنے موکل سے سوالات اس لیے پوچھتا ہے کہ وہ حقیقت جان سکے اور اسے قانون شکنی کے جرم سے بچا سکے۔ ڈاکٹر مریض سے تفتیش کرتا ہے امراض کے متعلق پھر بہت سی اشیاء کی جانچ ہوتی ہے تاکہ صحیح مرض کا پتا چلے اور مریض کو شفا ہو۔ اس طرح صحافی، دفتروں میں کام کرنے والے افسر، سبھوں کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے۔ اسی لیے انٹرویو کی تکنیک بہت زمانہ سے رائج ہے اور ابھی تک اسے ترک نہیں کیا گیا۔ ادب میں بھی اس کی اہمیت بدستور قائم ہے بلکہ شخصیتوں پر ریسرچ کرنے کے لیے تو لازمی ہے اور کوئی فن کار زندہ نہیں ہے تو اس کے دوستوں، رشتہ داروں اور اس کے ہم عصروں سے انٹرویو لیا جاتا ہے تاکہ صحیح صورت حال کا اندازہ

ہو اور اس کا مقالہ حقائق کی کمزوریوں کا شکار نہ ہو لیکن اس انٹرویو کا مطلب یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہی واحد مؤثر ذریعہ ہے۔ جس کے ذریعہ Data جمع کیا جاسکتا ہے۔

علم معاشیات میں انٹرویو کے ذریعے ایک گھر اور ایک خاندان کی مالی حالت کا صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ انٹرویو کے علاوہ اس سلسلے میں اور کوئی دوسرا قابل اعتماد ذریعہ نہیں۔

اس طرح کسی کارخانہ کی پیداواری طاقت اور مقدار کا اندازہ صرف ان اعداد و شمار کے ذریعہ نہیں لگایا جاسکتا جو دفتر سے موصول ہوتے ہیں بلکہ اس کی صحیح تصویر مزدوروں اور کام کرنے والے دوسرے افراد کے انٹرویو کے ذریعے معلوم ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اگر اس کارخانے کے افراد مطمئن، آسودہ خاطر اور معاشی طور پر بہتر ہیں تو ان میں کام کرنے کی طاقت، ہمت، لگن اور ایمان داری بھی ہوگی اور اگر حالت تشفی بخش نہیں ہے تو مایوسی، نراجیت، بے رخی اور غیر ذمے داری کی وجہ سے پیداواری طاقت میں کمی ہو جائے گی۔ اس طرح اگر غیر معمولی ادبی شخصیتوں کے رشتہ دار، ان عظیم فنکاروں کی نجی زندگی پر روشنی نہیں ڈالتے تو ہم ایک اہم پہلو سے محروم ہو جاتے ہیں اور تلاشِ حقیقت کی سعی رائیگاں ہو جاتی ہے۔

غالب کی عظمت کا راز صرف اس امر میں نہیں ہے کہ وہ بہت بڑے شاعر تھے بلکہ اس حقیقت میں بھی ہے کہ غالب نے پرانے اقدار کے زوال کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا۔ غالب کی اقدار شکنی اور نئی آواز پر لبیک کہنا نہ صرف جرأت رندانہ تھی بلکہ غالب کے تفکر، سماجی بصیرت اور زندگی کی جدو جہد میں اپنے کو شامل رکھنے کا عزم بھی تھا۔ اب اس کارزارِ حیات میں غالب کی زندگی کے کئی تاریک گوشے بھی ملتے ہیں۔ ان تاریک گوشوں سے غالب کی شاعرانہ عظمت میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ لیکن ان کے علم سے تحقیق کے اہم دروازے وا ہوتے ہیں اور شخصیت کے مطالعہ کے دلچسپ پہلو سامنے ابھرتے ہیں۔ اب اگر ان کے معاصرین یا ان کے شاگردوں نے کہیں اس کی نشاندہی نہیں کی ہے تو تحقیق کا خزانہ اطلاعات سے خالی رہ گیا۔

اس لیے انٹرویو Data جمع کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ تصور کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس سے افراد کے نظریات اور ان کے رویہ پر بھی نگاہ رکھی جاتی ہے ورنہ دوسرے ذرائع سے ہمیں اخذ کرنے کی زحمت اٹھانی پڑے گی اور اس میں مبالغہ کا عنصر شامل ہو جائے گا۔ انٹرویو کے سلسلے میں Leon Festenger اور Daniel Katz نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ انٹرویو کے جوابات فرد کے بس کی بات نہ ہوں تو بھی Data جمع کرنے کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ افراد اپنے تعصبات اور پیچیدہ رویوں کی وجہ سے بہت سی اطلاع نہ دے سکیں۔ لیکن انٹرویو لینے والا کم از کم اپنے تعلقات، اپنی قربت کے ذریعہ Data کا تجزیہ آسانی سے کر سکتا ہے۔ اگر ادب میں شخصیتیں ریسرچ کا موضوع ہیں تو انٹرویو واحد مؤثر ذریعہ ہے جس کی وجہ سے گوشۂ گمنامی میں رہنے والے حقائق کی روشنی میں آجاتے ہیں۔ اس لیے Jahoda اور Cook نے مشاہدہ اور انٹرویو کو رویوں کے مطالعہ کے لیے بنیادی ذریعہ قرار دیا ہے۔ سماجی علوم اور ادبیات عالم میں ریسرچ کے تقاضے اس وقت تک پورے نہیں ہوتے، جب تک اس طریقۂ کار کا استعمال نہ کیا گیا ہو۔ فن کاروں اور دیگر شخصیتوں کے ماضی کے کارناموں اور مستقبل کے منصوبوں کا علم اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک ان سے براہِ راست رابطہ نہ کیا جائے۔ فرد کی قوتِ ادراک، رویہ اور تصورات و نظریات کو جاننے کے لیے مشاہدہ ناکافی ہے بلکہ بے کار ہے اس کے لیے صرف انٹرویو ہی واحد ذریعہ ہے۔ البتہ قباحت اسی وقت ہوتی ہے جب انٹرویو دینے والا حقائق کی پردہ پوشی کرتا ہے یا ان کی ترجمانی سے کتراتا ہے۔ ایسی صورت میں اسکالر کی ذہانت اور صبر ہی اس کے کام آتا ہے۔

انٹرویو کے سلسلے میں سب سے اہم شے انٹرویو لینے والے کی اپنی شخصیت ہوتی ہے۔ وہ ایک تکنیکی آدمی بن جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے سوالوں کو ترتیب دیتا ہے اور ان کے دائرہ کو متعین کرتا ہے، اس کا معیار طے کرتا ہے اور پھر معیاری سطح پر ہی انھیں تحریر بھی کرتا ہے۔ اس عمل سے اسکالر کے جمع کیے ہوئے Data کی آسانی سے ترتیب ہو جاتی ہے اور پھر تجزیہ میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ ایک انٹرویو لینے والے کا رابطہ چونکہ مختلف افراد سے ہوتا ہے اس لیے اسے انسانی نفسیات کا علم ہونا ضروری ہے۔ اسے انسان کی بنیادی کمزوریوں اور خوبیوں کا پتا ہونا چاہیے۔

سائنس اور دوسرے سماجی علوم نے انٹرویو لینے کے دوسرے مؤثر ذرائع پر زیادہ روشنی نہیں ڈالی ہے اس لیے اس کا موجودہ طریقہ ہی بہتر ہے۔ اس کے لیے "Do's" "Don't's" کا مشورہ برسوں سے چلا آرہا ہے۔ اسکالر کبھی اس پر عمل کرتا ہے اور کبھی نہیں۔ کیونکہ ساری کوشش انٹرویو لینے والے کی ذہانت، سمجھ داری اور فنی مہارت سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی لیے ریسرچ کرانے کے سلسلے میں نگران کی ضرورت پڑتی ہے۔

انٹرویو میں سوال و جواب کا سلسلہ بھی خاصا دلچسپ ہوتا ہے۔ اس سے ان خواہشات و جذبات کا پتا چلتا ہے جو محرکات بن جاتے ہیں اور جواب دینے کے لیے آدمی کو مجبور کرتے ہیں۔ سوال و جواب کی حقیقت اس امر میں پوشیدہ ہے کہ انسان فطری طور پر اپنے مقاصد، اپنی انا اور اپنے مفاد کو پیش نظر رکھتا ہے۔ اس کا تمام ذہنی رویہ انھی کے تابع کام کرتا ہے۔ اس کا مخصوص رویہ، فیصلہ، کام اور تصور سب کے سب مفادات اور مقاصد کے زیرِ نگیں رہتے ہیں۔ مختلف افراد کے لیے

مقاصد کی نوعیت مختلف ہو سکتی ہے۔

ادیبوں اور فن کاروں کے لیے شہرت اوزان کی تسکین سبب بن سکتی ہے یا پھر اسکالر کی شہرت اور موضوع کی دلچسپی بھی جواب دینے والے کو مجبور کر سکتی ہے کہ وہ اپنے خیالات کا من وعن اظہار کرے یا پھر بحیثیت Sample وہ مجبور ہو گئے ہوں کہ سوالوں کا جواب دیں۔ بہت سے لوگ انٹرویو لینے والوں کے مقاصد سے نا آشنا ہوتے ہیں۔ اس لیے ان میں احتیاط کا رویہ نظر نہیں آتا۔ حیرت اور استعجاب بھی اس سلسلے کے فکری عناصر ہیں۔ پھر سماجی، اخلاقی اقدار بھی ان پر دباؤ ڈالتے ہیں تاکہ حقائق کو اپنی واقفیت کے مطابق بیان کریں۔ مگر یہ صورت تمام جواب دینے والوں کے ساتھ یکساں نہیں رہتی۔ خاص کر ادیبوں، شاعروں کی بے نیازی اس سلسلے میں بڑی رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ جب انٹرویو لینے والے کو فرد کی رضامندی مل جاتی ہے تو وہ اپنے سارے سوالوں کو اس طرح ترتیب دیتا ہے کہ موضوع سے متعلق باتیں دائرہ تحریر میں آجائیں اس کے لیے وہ پہلے سے جواب دینے والے کو بذریعہ خط، فون، تار وغیرہ مطلع کر دیتا ہے تاکہ وقت مقررہ پر اس کا کام شروع ہو جائے۔ سوال کرنے والا اپنی ذہانت، تجربہ اور تجزیاتی شعور کے مطابق سوالوں کا انتخاب اس طرح کرتا ہے کہ پیچیدہ سے پیچیدہ بات سامنے آجائے اور حقیقت کتنی ہی تاریک اور ناقابل اعتماد کیوں نہ ہوں، لکھی جاسکے۔

انٹرویو کا ایک نفسیاتی نکتہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ سوالات کے ذریعے فرد کو متاثر کیا جاتا ہے تاکہ اس کے نظریات یا ذہنی رویہ میں کوئی بنیادی تبدیلی واقع ہو۔ مگر ادبیات میں انٹرویو کا یہ مقصد نہیں ہوتا۔ ممکن ہے اس طرح کا طرز عمل نفسیاتی مریض کے لیے بہتر ثابت ہو۔ ایک طبیب اپنے مریض کو اس طرح سوالات سے متاثر کر کے اس کی ذہنی الجھنوں کو دور کر سکتا ہے۔ اعصابی امراض کے مریض کے لیے بھی کارآمد ہو سکتا ہے۔ مگر فنون لطیفہ کی کسی صنف کے ریسرچ میں یہ عمل نہ کتھارسس کی کیفیت پیدا کرتا ہے اور نہ کسی ذہنی الجھن کو دور کرتا ہے۔

انٹرویو کی سب سے اچھی صورت یہ ہوتی ہے کہ افراد جن کا انٹرویو لیا جاتا ہے، ان سے پہلے منظوری حاصل کریں، پھر ان کی سہولت کے پیش نظر دن، تاریخ مقرر کر لی جائے اور تب قدرے محتاط ہو کر گفتگو کا آغاز ہو۔ یہ گفتگو موضوع کے دائرے میں ضرور ہونی چاہیے۔ مگر ایسی بھی نہ ہو کہ جواب دینے والا اکتاہٹ محسوس کرے۔ اس کی دلچسپی موضوع میں اتنی ہی رہنی چاہیے جتنی انٹرویو لینے والے کو ہے۔ اس کے لیے ذہنی رابطہ بھی ایک اہم کڑی ہے۔

اس لیے ماہرین فن تحقیق اور خصوصیت سے سماجی علوم کے اہل علم نے انٹرویو کی قسموں کا ذکر کرتے ہوئے اس کا خیال رکھا ہے کہ انٹرویو بالکل واضح ہوں اور اپنے اندر ساری اطلاعات حاصل کریں۔

Wil Kinson اور Bhandatkar نے انٹرویو کی کئی قسموں کا ذکر کیا ہے جن کی طرف ہلکا اشارہ کیا گیا تھا۔ ان کا مختصر جائزہ اسکالر کے لیے ضروری ہے۔

Structured Interview اس قسم کے انٹرویو میں پہلے سے سوال نامہ بنا لیا جاتا ہے۔ جس کا معیار اور تکنیک اعلیٰ ہوتا ہے۔ اس میں ایک سوال ہر طرح کے آدمی کے لیے ایک ہی معنی رکھتا ہے اور اثبات اور نفی میں جواب دریافت کیا جاتا ہے۔

Unstructured انٹرویو اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اس کے دائرے میں جو سوالات ہوتے ہیں ان میں بڑی لچک ہوتی ہے جب کہ پہلے طریقہ میں سوال کا معنی متعین اور واضح ہوتا ہے۔ اس کے معیار کی طرف بھی زیادہ توجہ نہیں دی جاتی۔ سوالات بھی پہلے سے بنائے نہیں جاتے۔ جوابات کے متعلق بھی یقین سے کوئی بات نہیں کہی جاسکتی۔ البتہ جواب دینے والا اپنے خیالات اور تجربات کا بے محابا اظہار کرتا ہے۔ لیکن اس کے افراد کے ذہن اور دل و دماغ کو اچھی طرح سمجھا جاتا ہے بشرطیکہ اس طریقہ کار کا خوبی سے استعمال ہوا ہو۔ غیر ارادی طور پر بہت سے گوشے نمایاں ہو جاتے ہیں۔ انٹرویو لینے والا بھی آزاد ہوتا ہے وہ جو چاہے پوچھ سکتا ہے اور وہ اپنی مرضی سے حسب خواہش موضوع کی اہمیت کے مطابق نوٹس تیار کر لیتا ہے۔ وہ جس بیان کو چاہے حذف کر سکتا ہے اور جسے چاہے شامل کر لے۔ مگر ماہرین تحقیق کا خیال ہے کہ اس طریقہ کار میں وقت کی بہت بربادی ہوتی ہے پھر اس کے لیے مختلف علوم وفنون سے واقفیت بڑی شرط ہے اور تفصیل سے جواب سننے کے لیے، سوال کرنے والے کو صبر اور حوصلہ ہونا چاہیے۔

Focused Interview اس کا مقصد یہ ہے کہ کسی خاص تحریری پہلو اور موضوع پر روشنی ڈالی جائے۔ سوال کرنے والا اپنے مقصد میں بالکل صاف ذہن رکھتا ہے اس لیے اس کا سوال نامہ مبہم نہیں ہوتا۔ اس کے موضوعات بھی متعین ہوتے ہیں۔ لیکن طریقہ کار میں سوالات پوچھنے کی آزادی ہوتی ہے۔ اس طرح کے انٹرویو سے مفروضات کی تعمیر اور تجزیہ میں آسانی ہوتی ہے۔

Clinical Interview یہ فوکس انٹرویو سے قدرے مشابہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ فرد کے احساسات و محرکات جو اس کی زندگی میں اہم ہوتے

ہیں، اس کے متعلق معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ یہاں بھی مقاصد واضح ہوتے ہیں۔ اس کا استعمال علم نفسیات کے ریسرچ میں زیادہ رائج ہے۔

Nondirective یہ طریقہ Psychotherapist کے لیے موزوں ہے۔ اس میں براہ راست کوئی سوال نہیں پوچھا جاتا۔ نفسیاتی طریقہ سے جواب دینے والے کو ذہنی طور پر گفتگو کے لیے آمادہ کر لیا جاتا ہے کہ فلاں موضوع پر اپنے خیال کا اظہار کرے۔ اس میں کسی طرح کی پابندی نہیں۔ لیکن یہ بے حد نازک طریقۂ کار ہے اور سوال پوچھنے والے کے لیے علم نفسیات کا علم ضروری ہے۔

انٹرویو کے فوائد

۱۔ ذاتی انٹرویو سوال نامہ کی بہ نسبت زیادہ فائدہ کا سبب بنتا ہے۔ سوال نامہ صرف اہل علم کے لیے مخصوص ہے۔ جب کہ انٹرویو کا دائرہ پوری آبادی کو اپنے اثر میں سمیٹ لیتا ہے۔

۲۔ اس کے ذریعہ جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ زیادہ درست اور صحیح ہوتی ہیں۔ جواب دینے والا بہت سی غلط فہمیوں کو دور کر سکتا ہے۔ دوران گفتگو بہت سی باتوں کی وضاحت ہوتی جاتی ہے اور سوال پوچھنے والا موضوع کو گہرائی سے دیکھ سکتا ہے۔ اس کے متعلق بہت سی دوسری چیزیں سامنے آجاتی ہیں جن کے متعلق وہ استفسار کرتا ہے اور اصل حقیقت تک اس کی رسائی ہو جاتی ہے۔

۳۔ انٹرویو لینے والا فرد کے ماحول اور اس کی ذاتی زندگی کی تہہ تک پہنچ سکتا ہے۔ حقیقت کی تلاش کی یہ بہتر اور اعلیٰ تکنیک ہے۔ دوران گفتگو وہ بولنے والے کے انداز بیان اور چہرے کے اتار چڑھاؤ کے ذریعہ بھی اپنے تاثرات کی دنیا وسیع کرتا جاتا ہے۔ اس وقفے میں اسے اس کا بھی احساس ہو جاتا ہے کہ جواب دینے والے کی بھی حیثیت کیا ہے۔ وہ خصوصی واقعہ، موضوع یا فن کے متعلق کئی باتیں جانتا ہے۔ لہٰذا سوالات اسی نوعیت سے بدلتے جاتے ہیں۔ یہ کسی اور ذریعہ سے ممکن نہیں۔

۴۔ پہلے سے طے کیے ہوئے انٹرویوز کا سلسلہ کئی دن پہلے چل سکتا ہے۔ کئی گھنٹوں پر بھی یہ سلسلہ جاری رہ سکتا ہے۔ اس لیے تفصیل سے باتیں ہوتی ہیں۔ خصوصیت سے ادب کے میدان اور ریسرچ میں اس کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آپ جدید ادب پر ریسرچ کر رہے ہیں تو باتیں صرف اردو کے جدید ادب تک نہیں رہ سکتیں۔ عالمی ادب کا ذکر ضروری ہو جاتا ہے پھر اس کا اعلیٰ ادب سے رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ موجودہ صدی کی تکنیکی ترقی میں جدید ادب کے نئے تقاضوں کی بات ہوتی ہے۔ عمومی فلسفیانہ مزاج بحث میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس طرح دو آدمیوں کے درمیان کی یہ گفتگو اگر معیاری ہے اور دونوں اعلیٰ علم کی سطح پر ہیں تو یہ گفتگو ٹیپ کرنے کے لائق ہوتی ہے اور ادبی و تہذیبی تذکروں میں اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ یہاں دونوں کی صلاحیتوں سے واقفیت کا موقع ملتا ہے۔ ادب میں کیے جانے والے ریسرچ میں انٹرویو کی یہ قسم بڑی کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ ان دنوں اس کی مقبولیت خصوصیت سے پاکستانی ادب کے سلسلے میں بڑھ گئی ہے۔ پاکستان سے فیض، احمد فراز، فہمیدہ سے لیے جانے والے انٹرویو کا جائزہ لیجیے تو بہت سی کام کی باتیں ملیں گی۔ انھیں پڑھ کر نہ صرف حیرت ہوتی ہے بلکہ پاکستانی ادب میں احتجاج کی ایک نئی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ جس کی طرف ہندوستان کے جدید ادب کے پرستاروں نے دھیان نہیں دیا۔

۵۔ اس طریقہ کار میں انٹرویو کی زبان خاصی اہم ہوتی ہے۔ سوال پوچھنے اور جواب دینے والے کی زبان اور اس کی لیاقت بھی مد نظر رہتی ہے اور اس کا برابر خیال رکھا جاتا ہے کہ کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے تشریح و تفسیر میں دشواری ہو۔

۶۔ پیچیدہ اور گمبھیر واقعات کی حقیقت کو جاننے کے لیے اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔ ادبیات اور سماجی علوم کے دائرہ سے نکل کر اگر ہم قانون شکنی کی تاریخ کا مطالعہ کریں اور سزا و جزا کی طرف نگاہ رکھیں تو اس حقیقت کا پتہ چلے گا کہ پولیس کے محکمہ کا سارا نظام اسی تفتیش پر مبنی ہے۔ یہاں یہ بحث نہیں کہ اس میں صداقت کہاں تک اس کے ہاتھ لگتی ہے۔ کورٹ میں جرح کی نوعیت دراصل اس سے متاثر ہے۔ البتہ ان کی شکل بدل جاتی ہے اور جواب دینے والا کس قدر قانون سے سہا ہوا رہتا ہے۔ اخلاقی اقدار کے دباؤ سے وہ ایک قسم کے احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

۷۔ ملازمتوں کی بحالی کے سلسلے میں جو سوالات کیے جاتے ہیں عام طور پر ان کا تعلق ریسرچ سے نہیں ہوتا۔ لیکن وہ بھی انٹرویو کی ایک ایسی قسم ہے جس سے نہ صرف امیدواروں کی لیاقت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ نظام تعلیم کی خرابیاں اور خوبیاں بھی اجاگر ہوتی ہیں۔ مگر انٹرویو کی ان تمام خصوصیات کے باوجود اس میں چند نقائص بھی ہیں۔ یہ کمزوریاں فطری ہیں ان پر حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ کوئی بھی علم اپنی جگہ مکمل نہیں ہے اگر مکمل ہو جائے تو علم کا ارتقاء ہی رک جائے۔ اس طرح

انٹرویو کی اپنی محدودیت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے اور اسکالر کو ہر وقت کوشش کرنی چاہیے کہ وہ ان پر قابو پائے۔ اس کی یہ سعی جتنی دیانت داری کے ساتھ جاری رہے گی اس کا کام اتنا ہی معیاری ہوگا۔ تلاشِ حق میں اس کے قدم مضبوطی سے جمے رہیں گے۔

۱۔ اس طریقۂ کار کا ایک بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں وقت، انرجی اور روپیہ کا صرفہ کافی ہوتا ہے۔ انٹرویو دینے والا کسی دوسرے شہر میں رہتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ اسکالر کے گھر کے آس پاس کا رہنے والا ہو۔ اسے سفر کی صعوبتیں اور اخراجات برداشت کرنے ہوں گے۔ یونیورسٹی میں کام کرنے والے اساتذہ کرام اور اسکالرز کے لیے ان کو برداشت کرنا بہت ہی مشکل ہے۔

۲۔ اگر نگراں اور اسکالرز کی ذہنی اور علمی سطح اعلیٰ نہیں ہے اور وہ موضوع سے متعلق مختلف پہلوؤں سے واقفیت نہیں رکھتے تو وہ اس طرز انٹرویو کو سلیقے سے نباہنے میں معذور ہوں گے۔

۳۔ سوال و جواب کے دوران محقق ان تعصبات سے خود کو محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ پوچھنے والے اور جس شخص کا انٹرویو مقصود ہے دونوں کے اپنے تحفظات ہوتے ہیں۔ اپنے تعصبات کے دائروں سے وہ واقف نہیں ہوتے انھیں اس کی اطلاع بھی نہیں ہوتی کہ ان کا کون سا طرزِ عمل ان کی عصبیت سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔

۴۔ ریسرچ چونکہ واقعیت کی تلاش کا بھی نام ہے اس لیے اسکالر کو کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اپنے بیانات کے علاوہ جمع کیے گئے Data کی چھان بین بھی اس طرح کرے کہ مبالغہ آمیزی کم سے کم رہ جائے اور موضوع سے متعلق حقائق بہتر اور معروضی طور پر سامنے لائے جائیں۔

۵۔ ہر اسکالر انٹرویو لینے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس لیے نگراں کو چاہیے کہ وہ اس کے طریقوں سے واقف کرائے گویا ایک طرح کی ٹریننگ اسے دی جائے تاکہ اسے استفسار کی جن منزلوں سے گزرنا ہے اس میں کوئی مضحکہ خیز پہلو رونما نہ ہو۔

۶۔ ذاتی تعصبات پسند اور ناپسندیدگی کی وجہ سے اس بات کا اندیشہ رہتا ہے کہ سوال اس طرح پوچھا جائے کہ موضوع کے تقاضے پس پشت نہ پڑ جائیں۔

۷۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جواب دینے والا حقیقت کے بجائے اپنے تخیل کی پرواز میں مصروف ہو جاتا ہے اور انٹرویو لینے والا پریشانی میں پڑ جاتا ہے اور اس کے تمام سوالوں کی معنویت رکھی رہ جاتی ہے۔

ان کمزوریوں کے باوجود انٹرویو کا طریقہ نہ صرف ضروری ہے بلکہ سماجی علوم اور ادبیات کے ریسرچ کی دنیا میں اس کی اہمیت بدستور قائم ہے۔ اس کے فوائد ان کمزوریوں سے کہیں زیادہ ہیں جن کا ذکر کیا گیا۔ البتہ ضرورت اس امر کی ہے کہ نگراں اسکالر کی علمی سطح کے مطابق اسے تربیت دے یا تربیتی کلاس میں اسے بتایا جائے کہ انٹرویو کے طریقے کیا ہیں؟ اس کی قسمیں کتنی ہیں اور کس طرح ان کی دشواریوں پر قابو پایا جائے۔ اگر اسکالر کی تربیت نہیں ہوتی ہے، اسے علم نہیں کہ سوالات کی نوعیت کیا ہونی چاہیے، رابطہ کس طرح قائم کرنا چاہیے تو اسکالر بجز اپنی لاعلمی و بے خبری کے کچھ ظاہر نہیں کر سکتا۔ وہ ضروری Data جمع کرنے کی بجائے غیر ضروری معلومات حاصل کرے گا۔ اسی لیے سوال نامہ کی ترتیب اور اس کے ڈیزائن کی اعلیٰ سطح ہونی چاہیے اور موضوع کو پیشِ نظر رکھ کر ساری باتوں کو سمیٹنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ دراصل یہ آرٹ ہے۔ اگر آپ مشہور صحافیوں اور سیاسی لیڈروں کے انٹرویو کا مطالعہ کریں تو آپ کو پتا چلے گا نہ چاہتے ہوئے بھی لیڈران وقت اپنی گفتگو کے دوران اُن حقائق کا انکشاف کر دیتے ہیں، جس کا ظاہر کرنا اُن کا مقصد نہیں تھا اور جن سے اُن کی حکومت کی خفیہ پالیسی وضع ہوتی ہے۔ بجٹ کے سلسلے میں خاص طور سے ہر سال صحافی وزیر معاشیات سے رجوع ہوتے ہیں۔ اب اگر صحافی ذہین ہے، تجربہ کار ہے، انسانی نفسیات کے علم سے واقف ہے، انٹرویو کے آداب سے آشنا ہے اور ان تمام تکنیک کو سمجھتا ہے جو انٹرویو کے لیے ضروری ہیں تو وہ اپنے مطلب کی باتیں چند لمحوں میں نکال لیتا ہے۔

اس طرح ادبیات کی ریسرچ بھی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ فن کار جو زندہ ہیں اور جن کا ادبی سرمایہ قابلِ لحاظ ہے، اپنی نجی زندگی کے اہم واقعات کو منظرِ عام پر لانا نہیں چاہتے، اس موضوع پر شاید بہت سے فن کار دامن بچاتے ہیں۔ اب انٹرویو لینے والا اگر ہنرمند ہے، اسرار و رموز سے باخبر ہے تو وہ ان مشکلوں پر قابو پالیتا ہے۔ وہ افراد سے ایک ایسا تعلق پیدا کر لیتا ہے جس سے قربت کی فضا بنتی ہے۔ اعتبار اور دوستی کی سازگار فضا کے ذریعہ وہ اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ایسا اسی وقت ممکن ہے، جب سوال کرنے والے کو تمام تکنیک معلوم ہو اور وہ جواب دینے والے کو یہ احساس نہ ہونے دے کہ اس کا امتحان لیا جا رہا ہے بلکہ یہ احساس پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کرے کہ وہ تبادلۂ خیال کے ذریعہ ایک اہم فرض کو پورا کر رہا ہے۔ اس لیے بات چیت بالکل غیر رسمی ہونی چاہیے۔ غیر رسمی گفتگو میں آدمی بہت کھل کر باتیں کرتا ہے اور اپنی زندگی کے تاریک پہلوؤں کی طرف بھی اشارہ کر دیتا ہے۔ بنیادی طور پر انٹرویو کا کام ایک رپورٹر جیسا ہوتا ہے۔ اس لیے اسے گفتگو کو بحث و مباحثہ کا رنگ نہیں دینا چاہیے اور کسی معاملہ میں اپنے مخاطب سے الجھنے کی بھی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ ہر لمحہ ایک خوشگوار فضا

کو بنائے رکھنے کی کوشش جاری رکھنی چاہیے۔ البتہ اسے اپنے سوالوں کا انتخاب نہایت ہوشیاری سے کرنا چاہیے تاکہ جواب دینے والا حقیقت بیانی سے کام لے سکے اور اسکالر کے موضوع پر اُس سے روشنی پڑتی ہو۔ لہٰذا سوالات کی ترتیب میں تسلسل اور ہم آہنگی کا ہونا ضروری ہے۔ اس طرح جواب دینے والے کے ذہنی رویہ اور معلومات کا بھی اندازہ ہوگا۔

اسکالر کو کبھی کبھی دشواری اس وقت ہوتی ہے جب وہ بعض سوالوں کا جواب مبہم پاتا ہے۔ ایسی صورت میں اسے نہایت دانش مندی سے یہ طریق احسن اپنے سوال کی پھر وضاحت کرنی چاہیے تاکہ جواب دینے والا دلچسپی برقرار رکھ سکے اور اسکالر کی دشواریوں کے پیش نظر اُن واقعات، خیالات کی طرف اشارہ کرے، جو مطلوب ہیں۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جواب دینے والا اکثر سوالوں کو منفی صورت میں دیکھتا ہے اور 'نہیں' میں جواب دیتا ہے۔ یہ بڑا نازک اور مشکل مسئلہ ہے اسکالر کو یہ سوچنا چاہیے کہ کیا واقعی وہ سوال کا جواب نہیں جانتا یا قصداً لاعلمی کا اظہار کر رہا ہے۔ اگر وہ واقعات یا حقیقت کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہے تو اس انکار کی وجہ اور اسباب پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور یہ بھی تجزیہ کا محتاج ہو جاتا ہے۔

انٹرویو کو ریکارڈ کرنے کا مسئلہ بھی اس طریقہ کار کا ایک حصہ ہے۔ اس کے بھی دو حصے ہیں:

(الف) اگر سوال متعین ہے تو ہاں اور نہیں میں جواب لکھنا نہیں ہے۔ بلکہ نشان لگا دینا ہے۔

(ب) لیکن اگر سوال نامہ اس کے برعکس ہے تو جواب دینے والے کی گفتگو بجنسہ لکھنی ہوگی۔

اس سلسلے میں اُن غلطیوں سے اسکالر کو بچنے کی کوشش کرنی چاہیے جو تحریر کے وقت اُس سے سرزد ہوئی ہیں۔ چونکہ ایک ہی وقت میں اسے سوال کرنا اور جواب لکھنا بھی ہے۔ پھر اس کی وضاحت کا مسئلہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ اُن کا جواب بھی سنتا ہے اور اس میں اپنے کام کی باتوں کو نوٹ کرنے کا مسئلہ بھی درپیش ہے۔ اس لیے یہ احتمال برابر رہتا ہے کہ غلط باتیں بھی لکھ لی جائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بے حد ضروری اطلاعات اور معلومات چھوٹ جائیں۔ یہ ساری باتیں شعوری نہیں ہوتیں بلکہ ذہن چوکنا اور مسلسل بیدار نہ رہنے کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ اس کی ایک ہی صورت ہے کہ اہم نکات کی طرف فرد کی توجہ پھر سے مبذول کرانے کی کوشش کرے۔ اس کام کے لیے ہوسکتا ہے اُسے کئی بار مخصوص فرد کے پاس جانا پڑے۔ لیکن یہ تحقیق کی ایسی دشواریاں ہیں جن پر قابو پائے بغیر ریسرچ اسکالر تحقیق کی ذمے داریوں سے سبکدوش نہیں ہوسکتا۔

غیر متعین سوالوں کے جوابات کے لیے یہ ضروری ہے کہ جواب کو ہو بہو لکھا جائے اگر اسکالر کوڈنگ سے واقف ہے تو اسے کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ جوابات کو ترتیب اور سلیقے سے لکھنے کی منزل بھی اہم ہوتی ہے۔ کیونکہ سارے جوابات ایک جیسے نہیں ہوتے۔ انٹرویو کے سلسلہ میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تین طرح کا عمل ایک ساتھ جاری رہتا ہے۔

۱۔ سوالات کی بوچھاڑ

۲۔ جواب

۳۔ جوابات کو ریکارڈ کرنے کا عمل

اس لیے ان اعمال میں ہم آہنگی قائم کرنا آسان نہیں۔ وہ شارٹ ہینڈ کا طریقہ بھی استعمال کرسکتا ہے یا دوران تحقیق وہ شناخت کی خاطر بہت سی علامتیں بنالیتا ہے اور انھی علامتوں کے ذریعہ وہ تفصیلات جمع کرلیتا ہے لیکن ان علامتوں کی نہ ادب میں اہمیت ہوتی ہے اور نہ دوسروں کے کام آسکتی ہیں۔ ان کا تعلق ایک مخصوص اسکالر سے ہوتا ہے جس نے اپنی آسانی کی خاطر چند نقوش بنالیے ہیں اور انھیں علامتوں کی شکل دے دی ہے۔

انٹرویو لینے والے کو اپنے تعصبات اور تحفظات سے بھی ہوشیار رہنا چاہیے۔ وہ بھی آدمی ہی ہوتا ہے اور اپنی پسند اور ناپسندیدگی کے ساتھ زندہ رہتا ہے۔ اس لیے تعصبات کی عدم موجودگی کا امکان بہت کم رہتا ہے لہٰذا کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اس پر زیادہ سے زیادہ قابو پایا جائے اور معروضی طریقہ کار کو اختیار کیا جائے۔ اس رویہ کے لیے دو عناصر ذمے دار ہوتے ہیں۔ سوال پوچھنے والا، جواب دینے والے کے تئیں مخصوص رویہ اختیار کرتا ہے اور سوال سے جواب دینے والے شخص کی گفتگو کے دوران ایک خاص رویہ ابھرتا ہے۔ لہٰذا دونوں کے لیے کھلے ذہن سے گفتگو کرنی ضروری ہے۔ کبھی کبھی سوال کرنے والے کو جوابات سے تشفی نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ پہلے سے فرد مخصوص کے متعلق بڑی اونچی باتیں سوچ کر چلا تھا۔ جواب سن کر اسے ایک گونہ مایوسی ہوتی ہے۔ اس کا کوئی حل نہیں۔ بجز اس کے کہ سوال نامہ کو از سر نو ترتیب دیا جائے تاکہ اسکالر کی اعلیٰ اُمیدیں پوری ہوسکیں۔ تعصبات کے سلسلے میں ایک دشواری اسکالر کی اپنی پیدا کردہ ہوتی ہے۔ وہ پہلے سے

شخصیتوں اور افراد کے متعلق مفروضات بنالیتا ہے۔ اگر یہ مفروضات جوابات کی روشنی میں پورے نہیں اُترتے تو کبھی کبھی اسکالر زبردستی دخل درمعقولات کی کوشش کرتا ہے۔ اس امر سے اس کی انا کو تسکین تو ہوجاتی ہے، لیکن یہ خودفریبی ہے۔ تحقیق نہیں۔ تحقیق حقیقت کی تلاش کا نام ہے اور حقیقت ہماری خواہشوں کے مطابق دکھائی نہیں دیتی۔ اس لیے اسکالر کو غیر ذمے دارانہ باتوں سے گریز کرنا چاہیے اور وہی باتیں ریکارڈ کرنی چاہییں جو اس نے زبانی سنی ہیں اور انھی کی بنیاد پر نتائج نکالنے کی منزلوں سے گزرنا چاہیے۔ یہ ایک بات دیانت دار اسکالر کے لیے ضروری ہے۔

اس سلسلے میں نگراں یا کسی پروجیکٹ کے ڈائریکٹر کو تحقیق کے ابتدائی اصول اور طریقہ کار کی تربیت دینی چاہیے۔ تربیت یافتہ اسکالر کم سے کم وقت میں بغیر کثیر رقم کے تحقیق کی دنیا میں قدم رکھ سکتا ہے اور اعلیٰ نتائج اخذ کرنے میں اسے کامیابی ہوسکتی ہے۔ نیز وہ انٹرویو کے مسائل سے بخوبی نبرد آزما ہونے کی صلاحیت پیدا کرلیتا ہے کیونکہ Data حاصل کرنے کا یہ ایک ایسا ذریعہ ہے جس کے بغیر اطلاعات اور معلومات کی حقیقی دنیا تک ہماری رسائی ممکن نہیں۔

نمونوں کی قسمیں اور سروے

ادبیات کے طالب علم اور اسکالر نمونے کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ اس کا تعلق سائنس اور سماجی سائنس سے ہے۔ ادبی تحقیق کی کسی منزل میں اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن یہ غلط خیال۔ روزمرہ کی زندگی میں ہم سینکڑوں ایسے کام کرتے ہیں جس سے نمونوں کا کام لیا جاتا ہے اور جنھیں مثال بناکر ہم نئے تجربات سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ عورتیں چاول پکاتے وقت سینکڑوں چاول کے دانوں کو چھوکر یہ پتہ نہیں لگاتیں کہ چاول تیار ہوا ہے یا نہیں۔ چند دانوں سے معلوم ہوجاتا ہے کہ چاول بن گیا اور اُسے چولھے سے اُتار لینا ضروری ہے۔ یہ چند دانوں کا عمل نمونہ یا(Sampling) ہے۔ اگر ہم 'ریختی' کیا ہے جاننا چاہیں تو چند اشعار کی مدد سے ریختی کے سارے سرمایہ کا اندازہ کرسکتے ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ لکھنؤ اسکول کے تمام صاحب دیوان شعرائے کرام کے یہاں ایسے اشعار کی چھان بین شروع کردیں، جن پر ریختی کے اثرات ہیں۔ ہمارا یہ ادبی عمل ایک طرح کا نمونہ کا عمل ہوگا۔ جس طرح چاول کے چند دانوں کو چھوکر ایک کھانا پکانے والی خاتون یہ پتا چلالیتی ہے کہ چاول تیار ہوگیا، اسی طرح مسلم معاشرہ اور مسلم آبادی کے ایک خاص طبقہ کے افراد کا انتخاب کرکے یہ بھی پتا چلایا جاسکتا ہے کہ وہ کس حد تک فیملی پلاننگ کو بہتر تصور کرتے ہیں اور کیوں وہ اس پر عمل پیرا ہیں۔ ساٹھ سال کے ترقی پسند ادبی سرمایہ کے تفصیلی جائزہ کے بغیر بھی چند نمائندہ فن کاروں کی تخلیقات کو بطور نمونہ سامنے رکھ کر اُس عہد کی ادبی خصوصیات کو پیش کرسکتے ہیں۔

غرض ادب میں نمونوں سے اُسی طرح کام لیا جاسکتا ہے جس طرح سائنس اور سماجی سائنس کی تحقیق میں نمونوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ غزل کے چند اشعار، غزل کی جن خصوصیات کو بیان کرتے ہیں وہ ایک طرح سے پوری غزل کی نمائندگی کرتے ہیں۔ البتہ ان اشعار کا انتخاب بہتر تنقیدی صلاحیت کے افراد کے ذریعہ عمل میں آیا ہو۔

بیسویں صدی کی ابتدائی دو دہائیوں میں A.L.Bowby سماجی سائنس میں نمونوں کے ذریعے مفید حقائق کو ہمارے سامنے لایا۔ اس لیے نمونوں کے سلسلے میں اُس کے کاموں کو سنگ میل تصور کیا جاتا ہے۔ وہ اپنی تحقیق کے جن نتائج تک پہنچا اُس میں Sampling کا طریقہ بہت مفید ثابت ہوا۔ اس نے یہ بھی ثابت کیا کہ اس کے ذریعہ تحقیقی عمل کی مدت بھی بہت کم ہوجاتی ہے۔ اوقات کی کمی، اخراجات کی کمی کا باعث بنتی ہے اور صحت مند نتائج اُبھرتے ہیں۔ اس لیے سماجی سائنس میں نمونوں کی تکنیک نے اہمیت اختیار کرلی اور اس پر خاصا زور دیا جانے لگا۔

نمونہ آبادی سے حاصل کیا ہوا ایک جزو ہے۔ آبادی سے مراد صرف انسانوں کی آبادی نہیں ہے بلکہ انسانوں، اشیا، ادبیات، مشاہدات کے دستاویز اور ایسی تمام چیزیں اس میں شامل ہیں جو زیر مطالعہ ہیں۔ ان کے مجموعی حصہ کو تکنیکی اصطلاح میں ہم آبادی کا نام دیتے ہیں۔ اگر ہم لڑکے لڑکیوں کی مخلوط تعلیم کے متعلق کسی ادارہ کے طالب علموں کی رائے جاننا چاہیں تو ہماری تحقیق کا جو Universe ہوگا اُس میں کالج کے تمام طلباء اور طالبات شامل ہوں گی۔ اب اس 'آبادی' کی تقسیم ہوسکتی ہے۔ اسے کئی حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ نمونوں کے ذریعہ ہم نمائندہ افراد، اشیا، ادبی شہ پاروں اور ایسی ہی دوسری چیزوں کے متعلق اپنے مفروضات کو ثابت کرتے ہیں۔ اگر کسی شہر کی چار لاکھ کی آبادی کی رائے جانی ضروری ہے تو یہ ایک محقق اور اسکالر کے بس کی بات نہیں۔ اس لیے وہ نمونوں کا انتخاب کرے گا۔ اب اس انتخابی عمل میں وہ سب باتیں شامل ہونی چاہییں جن کی مدد سے وہ چار لاکھ انسانوں کی رائے کو تقریباً پوری آبادی کی رائے کہہ سکتا ہے۔ لیکن یہ رائے درست اس وقت ہوسکتی ہے جب اس کی تربیت اور پلان ٹھیک سے بنایا گیا ہو۔ اس نمائندہ نمونے کے ذریعہ اسکالر بہت حد تک صحیح رائے قائم کرنے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ نمائندہ نمونوں کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ وہ ''کل'' کی خصوصیات کا ترجمان ہے۔ اس سے تحقیق کی دشوار منزل آسان ہوجاتی

ہے۔اس کی مزید وضاحت افسانوی ادب کی تحقیق وتنقید سے یوں دی جاسکتی ہے۔مان لیجیے کہ سعادت حسن منٹو کے افسانوں میں نسوانی کرداروں کے رویے سے ہمیں بحث کرنی ہے یا تحقیق کرنی ہے اگر منٹو نے ایک ہزار افسانے لکھے ہیں اور ہر افسانے میں تین نسوانی کردار ہیں تو تین ہزار نسوانی کرداروں کے رویوں کا مطالعہ خاصا دشوار ہوجائے گا۔اس لیے ہم نمائندہ افسانوں کی روشنی میں ایسے کرداروں کا انتخاب کریں گے جن کے رویوں کے مطالعے کے بعد ہم سعادت حسن منٹو کے نسوانی کرداروں کے رویوں اور سلوک کے متعلق قطعیت کے ساتھ کوئی بات کہہ سکتے ہیں۔اس عمل کے لیے جو تکنیک استعمال کی جائے گی اُسے ہم sampling کہیں گے۔

اب ان نمونوں کا جائزہ لیجیے جنھیں ماہرین فن نے بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔لیکن اقسام کے ذکر سے پہلے ایک لفظ Probability کی تشریح ضروری ہوجاتی ہے۔اس کا تعلق نمونوں سے براہ راست ہے۔کسی سوال کے جواب میں اکثر وبیشتر ہم ''شاید''، ''تقریباً'' جیسے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔اس لفظ کا تصور نمونوں کے انتخاب کو سمجھنے میں مدد دے گا۔اوسطاً نمونہ ''کل'' کی خصوصیت کا نمائندہ ہوگا اور دونوں میں آسمان زمین کا فرق نہیں ہوگا۔گویا امکانات کا تعلق حقائق سے مضبوط ہوجاتا ہے۔سماجی علوم میں جب بھی نمونوں کا ذکر ہوتا ہے یا کوئی اسکالر اس کی روشنی میں جائزہ لیتا ہے تو وہ اس لفظ کے استعمال سے خود کو بچا نہیں سکتا۔یہ نمونوں کا ایک جز ولاینفک ہے اور اسے ہم نمونوں کی ایک قسم بھی تصور کرسکتے ہیں۔

نمونوں کی تشریح کے بعد اُس کی قسموں کا جائزہ بھی ضروری ہے۔سب سے اہم قسم Simple Random Sample کی ہے۔اور سچ کہیے تو اس کے دائرہ میں دوسرے نمونے آجاتے ہیں۔یہ وہ طریقہ کار ہے جو آبادی یا ''یونیورس'' کے ایک جزو کی اس طرح نمائندگی عطا کرتا ہے، جس میں اس کا پورا امکان پوشیدہ رہتا ہے کہ آبادی کی ہر اکائی شامل ہوجائے۔

Random لفظ سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ بغیر کسی واضح مقصد اور منزل کے کوئی شے اچانک آگئی۔سائنس دان جو اس تکنیک کو کثرت سے استعمال کرتے ہیں، لغت میں دیے گئے معنوں تک اپنی دنیا محدود نہیں سمجھتے۔کوئی چیز خود بخود نہیں ہوتی، بلکہ ہونے یا نہ ہونے کی وجہیں ہوتی ہیں۔البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان کی معلومات بہت کم ہیں۔اس لیے وہ Atrandom ہونے والی شے کو سمجھنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔

نمونوں کی دوسری قسموں میں مقصدی نمونے یعنی Purposive کا ذکر خصوصی طور پر کیا جاتا ہے۔اس کے علاوہ نمونوں کی دیگر قسموں میں Stratified Samples اور Cluster Samples بھی شامل ہے۔

پہلی قسم میں آبادی کو عورتوں، مردوں، گورے، کالے کی خصوصیات کی بنا پر نمونوں کی شکل دیتے ہیں۔دوسری قسم کا کثرت سے استعمال سروے کے لیے کیا جاتا ہے۔

سروے میں ڈاٹا کا ذخیرہ کثیر آبادی سے حاصل کیا جاتا ہے۔گویا کثیر آبادی سے Sample چن لیے جاتے ہیں۔اس کے بھی حاصل کرنے کے طریقے ذاتی انٹرویو جیسی دوسری ایجنسیاں ہوتی ہیں۔اس طرح کے مطالعے کو سروے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔خاص کر جب مختلف النوع انسانوں سے موضوع کا واسطہ ہو اور اطلاعات کی قسمیں کثیر اور قدرے پیچیدہ ہوں۔کثیر آبادی سے Sample انتخاب کرتے وقت اس کا خیال رکھا جاتا ہے کہ وہ ہر طرح پوری آبادی کا نمائندہ بن جائے۔اس بنیادی سروے کا جائزہ جیسا کہ سماجی علوم میں کیا جاتا ہے ملی جلی تکنیک سے تیار ہوتا ہے۔اس کے تدریجی ارتقاء میں مختلف سماجی علوم نے بڑا ہاتھ بٹایا ہے۔اس کی ایک اچھی مثال انٹرویو ہے۔انٹرویو کا یہ طریقہ خاص طور سے ''علم بشریات اور علم نفسیات'' کے تجربوں سے حاصل ہوا ہے یا اس ڈسپلن سے حاصل ہوسکتا ہے جس نے ذاتی انٹرویو کے فارم کو ایک طریقہ تحقیق کی حیثیت سے استعمال کیا ہے۔سروے کا طریقہ کسی خاص ڈسپلن کا حصہ نہیں ہے۔اس کا استعمال بہت سے موضوعات کے لیے ہوتا ہے خاص کر Behaviorial Science کے مطالعہ میں بہت مدد ملتی ہے۔جب انسانی رویوں اور برتاؤ کا مطالعہ ضروری ہوجاتا ہے تو ادب کی دنیا وسیع ہوجاتی ہے اور محقق کی ذمے داریاں بھی بڑھ جاتی ہیں۔وہ ہر ڈسپلن کی مدد سے مخصوص برتاؤ اور رویوں کا تجزیہ کرنے لگتا ہے اور پھر بے حد مناسب نتائج سامنے اُبھر جاتے ہیں۔اس لیے کہا جاتا ہے کہ سروے کا ان آدمیوں سے یا اُن کے Sample سے براہ راست تعلق ہوتا ہے جن کی خصوصیات ان کے فکری رویہ اور اسلوب سے جھلکتی ہیں۔اس طرح سروے کا طریقہ لائبریری اور آرکائیو سے مختلف ہوتا ہے۔سروے تکنیک وہاں استعمال کی جاتی ہے جہاں خصوصی معلومات بہ آسانی دستیاب ہوسکیں اور نسبتاً اس میں اخراجات بھی کم ہوں۔مگر قباحت یہ ہوتی ہے کہ جب تک عوام اطلاعات کی فراہمی کے لیے تیار نہ ہوں، اس وقت تک اس میں کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔عام نفسیات یہ ہوتی ہے کہ عوام کی کثیر تعداد کوئی اطلاع دینے میں بے حد جھجھکتی ہے یا تو کوئی خوف در پردہ کام کرتا ہے یا اطلاع لینے والا عوامی نفسیات سے عدم واقفیت کی بنا پر ان سے اطلاعات حاصل کرنے میں ناکامیاب رہتا ہے۔اگر عوام تیار نہ ہوں تو ان پر کسی قسم کا دباؤ بھی نہیں ڈالا جاسکتا۔اس

لیے نہایت خوش اسلوبی سے تیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ایک بار وہ آمادہ ہو گئے تو اطلاعات کا خزانہ مل جاتا ہے اور اسکالر کی بہت بڑی پریشانی دور ہو جاتی ہے۔
سروے، اسکوپ ڈیزائن اور مواد کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ان کا استعمال کسی مخصوص مقصد کی بر آوری کے لیے ہوتا ہے۔چنانچہ جہاں کہیں بھی سروے ڈاٹا جمع ہوگا وہاں کسی خاص ڈیزائن کو سامنے رکھنا ہوگا۔ان کے ذریعہ ڈاٹا جمع ہوگا۔اس کام کے لیے بہت سے کام کئی بار کرنے ہوتے ہیں۔کبھی کبھی بہت سا سروے ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی آدمی سے دوبارہ انٹرویو لینا پڑتا ہے۔ایسا اس لیے ضروری ہوتا ہے جب کسی فرد کے افعال و نظریات میں کوئی خاص تبدیلی واقع ہو اور عرصہ بعد وہ اپنی سابقہ حیثیت اور مسلک سے دست بردار ہو جائے۔

Lansing اور Withey نے ایک قومی سروے کے ذریعہ یہ جاننا چاہا تھا کہ بارہ مہینوں کے اندر عوام گاڑی خرید نا پسند کریں گے یا زندگی کی دوسری کار آمد اشیا،ان کے لیے مفید ہوگی۔اس بات کو جاننے کے لیے انھوں نے ایک بڑا سروے کیا جس میں عوام کے خیال میں نمایاں تبدیلی ہوئی اور ان تبدیلیوں کی خبر سے انڈسٹری اور معاشیات کے شعبہ پر کافی گہرے اثرات مرتسم ہوئے۔کیونکہ بارہ مہینوں کے اندر لوگوں کی نفسیات بدل گئی تھی۔سروے کا موضوع یا اس کے ذریعہ حاصل کیا جانے والا Data اہم تو ضرور ہوتا ہے، پر اس کے حصول کے طریقے بہت مشکل اور وقت طلب ہیں۔اس طرح سروے کو بھی ماہرین تحقیق نے کئی ذیلی حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

ذاتی Data:اس ذیل میں اکثر و بیشتر جنس، پیشہ،تعلیم، مذہب،قومیت،مختلف جماعتوں کی ممبر شپ اور دوسرے ذاتی سوالات پوچھے جاتے ہیں۔اس طرح ان کی آمدنی، جائیداد،قرض اور دوسرے Variables بھی شامل ہوتے ہیں۔ان کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ دوسرے افراد کے ذریعہ جو ڈاٹا حاصل کیا گیا ہے ان کو سامنے رکھ کر تجزیہ کی منزلوں سے گذرا جائے۔

Environmental Data:بہت سے سروے میں اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ جواب دینے والے کی زندگی کن حالات میں بسر ہو رہی ہے۔یعنی اس کا تہذیبی تناظر کیا ہے۔وہ کن حالات میں زندگی گزار رہا ہے۔پھر اس کے مطابق اس کے پڑوسیوں کے طرزِ زندگی کا مطالعہ بھی کیا جائے تاکہ ان خارجی حالات اور ماحول کا اندازہ ہو سکے جو جواب دینے والے کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔کیونکہ یہ وہ عناصر ہیں جو اس کی تہذیبی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور وہ مخصوص رویوں کے اظہار پر مجبور ہو جاتا ہے۔

Behavioral Data:بہت سے مسائل افراد کی شعوری اور لاشعوری زندگی سے اس طرح وابستہ ہوتے ہیں کہ جب تک ان گرہوں کی عقدہ کشائی نہ ہو،موضوع کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ایک ہی فرد کا رویہ مختلف اوقات میں ایک جیسا نہیں رہتا یا مختلف افراد کے ساتھ بدل جاتا ہے اور اس میں ایک طرح کی ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔ایک عورت اپنے شوہر کے ساتھ ازدواجی زندگی میں خوش و خرم رہ سکتی ہے۔شوہر اس کی وفاداری پر کبھی شک و شبہ نہیں کرتا لیکن وہی عورت اپنے محبوب (خواہ وہ سابق ہو یا حالیہ زندگی کا عاشق) کے ساتھ ایک بدلی ہوئی شکل میں نظر آتی ہے۔

موپاساں کی کہانیوں کو پڑھیے تو عورت کی وفاداری اور اس کے عشق کی نئی شکلیں کثرت سے ملیں گی۔میں اس ایک رویہ کو بے حیائی بے شرمی اور قابل رسوائی نہیں تصور کرتا۔کیونکہ اس کا تعلق انسان کی اس پیچیدہ حیات سے ہے جس پر قابو پانا مقدس شخصیتوں کے بس کی بات بھی نہیں۔ایک عورت اپنے شریک حیات کے ساتھ پوری ذمے داری کے ساتھ رہتی ہے۔لیکن اپنے چاہنے والے کی رفاقت میں اس کی شخصیت کی پیچیدہ تہیں کھلتی جاتی ہیں۔یہاں وہ تمام سماجی پابندیوں سے آزاد اپنی روحانی اور جنسی زندگی کو ارتفاع بخشتی ہے۔اس لیے ایک نظر میں اس کے رویوں کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔اردو میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔سعادت حسن منٹو کی کہانیوں کو پڑھیے تو آپ کو منٹو کے فن کی عظمت کا راز معلوم ہوگا۔ایک عورت بازاری، داشتہ،طوائف اور بکاؤ ہونے کے باوجود اپنی تمام تر نسائیت میں زندہ رہتی ہے۔ایک معصوم فساد زدہ لڑکی عصمت دری کی منزلوں سے گزرتی ہوئی اپنے ہوش و حواس کھو دیتی ہے۔اس کے کان صرف آواز کو سننے کے عادی ہیں، کھول دو۔اس کے ذہنی رویہ کی پرکھ کے لیے صرف ظاہری حقیقت کو جاننا ضروری نہیں بلکہ لاشعور اور شعور میں چھپے ہوئے سینکڑوں سوالات کو کریدنا ضروری ہے۔

عصمت کے افسانوں کو بھی اسی نقطۂ نظر سے دیکھیے تو دلچسپ حقائق سامنے آئیں گے۔

افسانوی ادب سے ہٹ کر شاعری کا جائزہ بھی مفید ہوگا۔گذشتہ پچاس سال کے شعری ادب کا ایک تجزیاتی مطالعہ اس وقت تک غیر جانبدارانہ اور سائنسی نہیں ہوگا، جب تک ان شاعروں کے رویوں سے بحث نہ کی جائے اور جائزہ نہ لیا جائے۔ترقی پسند ادب کے سیاسی اور انتہا پسندانہ رویہ کی تنقید محض نظریاتی تعصبات کے سہارے مفید نہیں بلکہ اس دور کی انتہا پسندی، جذباتی سیاست گری کے تناظر میں فن کاروں کے ذہنی اور عملی رویوں کے ذریعہ چھان بین کی جانی چاہیے۔تاکہ جمع

کیے گئے data کو جب ترتیب و تنظیم کی شکل دی جائے تو مبالغہ آمیزی، تعصبات اور تنگ نظری کے ساتھ ساتھ حقیقت بھی اپنی شکل میں دکھائی دے۔

اس لیے سماجی سائنس کے ریسرچ اسٹوڈنٹس کے لیے یہ ضروری ہے کہ رویوں کے ذریعہ جو Data جمع کیا جائے اُس کی پرکھ میں غیر جانب داری برتیں۔ شخصیتوں کے رویوں کو جاننے کے لیے جب استفسار کی نوبت آئے تو زندگی کا صرف ایک پہلو سامنے نہ ابھرے۔ بہت ممکن ہے کہ ایک قاتل اپنی زندگی کے کسی موڑ پر ادب، موسیقی کا دل دادہ رہا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے اُس نے قتل اپنی ناکام آرزوؤں کی خاطر کیا ہو اور وہ اپنی پوری زندگی میں ایک صاف ستھرا فرد ہو۔ اسی لیے رویوں کو جاننے کے لیے اسکالر کو بے حد سنجیدہ، ایمان دار اور باشعور ہونے کی ضرورت ہے۔ معلومات کی سطح بلند اور وسیع ہونی چاہیے۔ رائے عامہ سے واقفیت ضروری ہے۔ برتاؤ اور محرکات کی تلاش وتنقید کے بغیر سروے کا کام پورا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ Data Collection کے لیے یہ بے حد ضروری ہے۔ یہ ریسرچ کی اہم منزل ہے۔ کیونکہ ہر سوال کا جواب فرد کی ذہنی دنیا اور لاشعور کی کال کوٹھڑی سے اس طرح چپکا ہوا ہوتا ہے کہ چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔ ریسرچ اسکالر کو چاہیے کہ وہ سمندر میں ڈوب کر سیپوں کو تلاش کرے اور اگر صدف بے گوہر ملے تو مایوس نہیں ہو، بلکہ کوشش تیز تر کردے۔

رویہ دراصل تصور یا نظریہ کے ذریعہ بہ آسانی پہچانا جاسکتا ہے۔ اس کو بہت سے آدمی پسند کرتے ہیں، بہت سے ناپسند۔ ان دونوں حالتوں میں ریسرچ اسکالر کو معلومات حاصل کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا رویوں کی قسموں اور ان کے آپسی رشتوں کا علم بھی ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر نہ رویوں کی شناخت ہوسکتی ہے اور نہ ان سے مفید اور کارآمد نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ یہی باتیں Motive کے متعلق بھی کہی جاسکتی ہیں۔ اس کا مطالعہ اور اسے حاصل کرنے کی اُمید سروے کا سب سے زیادہ مشکل پہلو معلوم ہوتا ہے۔ اس کا تصور صرف رویوں کو طے کرنے کے لیے نہیں ہے بلکہ بتائے گئے اسباب وعلل اور افعال کے لیے بھی ہوتے ہیں۔ سروے کے ذریعہ شخص کی ذات اور اس کے حالات کا Data جمع ہوجاتا ہے اور رویوں سے اہم پہلوؤں کی شناخت ہوتی ہے۔

Sampling اور سروے کے جائزہ کے بعد اس کے فوائد اور اُس کی محدودیت پر نگاہ رکھنی ضروری ہے۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آبادی کی خصوصیات کا اندازہ بہت ہی کم وقت میں لگ جاتا ہے۔ اس نئے زمانے میں وقت کی بہت کمی ہے۔ کم سے کم وقت میں لوگ زیادہ سے زیادہ کام کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے تحقیق کے لیے بھی زیادہ طویل مدت اچھی بات نہیں سمجھی جاتی۔ ہر لمحے بدلتی ہوئی دنیا میں سینکڑوں چیزیں ایسی پیدا ہورہی ہیں یا ایجاد کی جارہی ہیں جن کے ذریعہ انسان کو کم وقت میں بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ سماجی اور سیاسی حالات کا اندازہ اس وقت تک ٹھیک سے نہیں لگایا جاسکتا، جب تک اس طریقہ سے نمونوں کی حصول یابی ممکن نہ ہوجائے۔

دوسرا فائدہ اخراجات میں کمی کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ بہت کم لوگوں کا انٹرویو لیا جاتا ہے۔ کم افراد کے ذریعہ اعداد وشمار یک جا کیے جاتے ہیں ٹیبلیشن کوڈنگ میں بھی افراد کی زیادتی نہیں رہتی۔ وہ روپے جو سینکڑوں افراد کے انٹرویو اعداد وشمار کی پروسسنگ میں خرچ ہوتے ہیں اب تحقیق کے دوسرے اہم مرحلے میں خرچ کیے جاسکتے ہیں۔

جب نمونوں کا استعمال ہوتا ہے تو اسکالر کا سارا دھیان ان پر لگا رہتا ہے۔ وہ ان کی صداقت کی تصدیق بھی کرسکتا ہے۔ اس سے مقالہ کے معیار کو تقویت ملتی ہے۔ ادبیات میں بھی اس تکنیک سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ وہ شعری ادب ہو یا افسانوی ہر صنف میں اسی تکنیک کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم اس تکنیک کی ناواقفیت کی وجہ سے ضروری اطلاعات حاصل نہ کرپائیں۔

کیس اسٹڈی

شاعروں اور افسانہ نگاروں کی شخصیت اور اُن کی تخلیقات کے تقابلی وتجزیاتی مطالعہ کا فن ان دنوں اُردو تحقیق کا ایک محبوب موضوع بن گیا ہے۔ مجھے اس کی محبوبیت پر اعتراض نہیں۔ لیکن میں اپنے اسکالرز اور اُن کے نگران کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ تحقیق کی یہ قسم سماجی علوم سے واقفیت کا براہ راست مطالبہ کرتی ہے۔ سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی یا ممتاز مفتی کے افسانوی کرداروں کا تجزیہ بغیر گہرے سماجی اور نفسیاتی شعور کے نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح میراجی، ن۔م۔ راشد، اور پھر جدید شاعری کی خصوصیات اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتیں، جب تک علامتوں کا زندگی کے نئے نظام سے کوئی معنوی رشتہ نہ جوڑا جائے۔ شاعرانہ تصور اسی وقت حسین، خوبصورت اور نادر معلوم ہوتا ہے جب وہ الفاظ کی سواریوں کے مناسب اور برمحل استعمال کے ذریعہ پڑھنے والوں کے پاس پہنچے۔ عام فہم الفاظ عوامی زندگی کی روزمرہ کی دین ہوتے ہیں۔ لیکن جب کوئی شاعر ان الفاظ کو علامتوں کا روپ دینے کی کوشش کرتا ہے تو نہ صرف قطرے کو دجلہ میں سموتا ہے بلکہ تجربات وحوادث کو نئی تخلیقی شکل میں بھی پیش کرتا ہے۔ ان کا یہ تخلیقی عمل اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ تحقیق کے دوران علامتوں، تشبیہوں اور الفاظ کے

خزانوں میں پوشیدہ حقائق کا تجزیہ کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ ان مخصوص الفاظ اور علامتوں کو شاعر نے کیوں استعمال کیا اور ان کے مترادفات کو ترک کس لیے کیا۔ غالب اور اقبال کی شاعری اس کی بے حد عمدہ مثالیں ہیں۔ غالب کے یہاں بعض حرف صرف صوتیاتی حسن کی خاطر پیش نہیں ہوئے بلکہ انھیں اگر یکجا کر دیا جائے اور تشریح و تجزیہ کی نازک ترین منزلوں سے گذارا جائے تو اُن میں ایک خاص ذہنیت پوشیدہ نظر آئے گی، ایک ایسی آرزومندی دکھائی دے گی جس کا غالب کی شکست و فتح سے گہرا رشتہ ہے۔ اسی طرح اقبال کے یہاں بھی الفاظ کا تجزیہ ایسے جہانِ معنی پیدا کرے گا جس کی طرف ابھی لوگوں نے سوچا بھی نہیں۔ ان شعراء پر تحقیق کرنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ سوانحی خاکوں اور تاریخی حالات کی روشنی میں ان کی شاعری کا مطالعہ کریں اور زبان کی شیرینیت، روانی اور دوسری خصوصیات کو تھوڑی دیر کے لیے بھول کر یہ دیکھیں کہ کیا ان کے ذریعہ کوئی کیس اسٹڈی بھی بنتی ہے۔ مثلاً غالب کیوں اکثر و بیشتر ''اندیشہ ہائے دور دراز'' کی بات کرتے ہیں۔ کیوں حسرتوں کی تکرار ہوتی ہے، کیوں شکستِ نالۂ دل کی صدا سناتے ہیں۔ یہ سب محض محرومیت اور ناقدری یا محبوب کی بے التفاتی سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ اس طرح کے اشعار کے مدد سے ہم اپنے کلاسیکی اور جدید شاعروں کی کیس اسٹڈی تیار کر سکتے ہیں، ان کے ذہن کو سمجھ سکتے ہیں۔ ان کی خوشیوں اور غموں کا زیادہ بہتر تجزیہ اور ان کی عظمتوں کا ادراک کر سکتے ہیں۔

یہی باتیں افسانوی ادب کا جائزہ لیتے وقت بھی ضروری سمجھی جانی چاہییں کیونکہ افسانوی ادب میں کرداروں کے ذریعہ تجربات و حوادث بیان ہوتے ہیں۔ کرداروں کا عمل منفی اور مثبت دونوں ہوتا ہے۔ ایک ہی آدمی عالمانہ گفتگو بھی کرتا ہے اور رکشا والوں کی طرح گالیاں بھی بکتا ہے۔ ایک مولوی ممبر رسول پر بزرگوں کے فضائل بھی بیان کرتا ہے اور خلوتوں میں اپنی جنس زدگی کے ایسے کرتب بھی دکھاتا ہے کہ آنکھیں حیران و ششدر رہ جاتی ہیں کہ ''دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں'' اب افسانہ میں اگر ایسے کردار موجود ہیں تو ان کی کیس اسٹڈی دلچسپ اور معلوماتی ہوگی۔ یہاں افسانوی ادب کے تحقیقی اور تنقیدی جائزہ کی راہ نمائی سماجی علوم کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

کیس اسٹڈی کا مطلب یہ ہوتا ہے کسی شخص، خاندان، برادری یا قوم کی زندگی کے متعلق ان تمام پوشیدہ اور غیر پوشیدہ خصوصیتوں کی دریافت کی جائے، ان کا تجزیہ کیا جائے جن کی وجہ سے ان کی شناخت ممکن ہوتی ہے۔ یہ شناخت زیادہ تر اُن رویوں کے ذریعے ہوتی ہے جو اشخاص کی طرز زندگی، حسن سلوک، عمل اور رد عمل کے ذریعے ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ اور ان کا ماحول سے ربط بڑا گہرا ہوتا ہے۔ اس کے لیے جو ڈاٹا جمع کیا جاتا ہے اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ کسی شخص یا اکائی کی فطری تاریخ مرتب کی جائے۔ اُس کی سماجی اسباب اور واقعات سے رشتہ جوڑا جائے، جو اس کے مخصوص ماحول پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ Burgess کیس اسٹڈی کے طریقۂ کار کی اہمیت بیان کرتا ہے اور اُس کے ذریعہ جو ڈاٹا حاصل کیے جاتے ہیں انھیں Social Microscope کے نام سے پکارتا ہے۔

کیس اسٹڈی کا سماجی تحقیق میں سب سے پہلی بار Fredrick Leplay نے استعمال کیا۔ مشہور فلسفی Herbert Spencer بھی اسے کلچر کے تقابلی مطالعہ کی خاطر طریقۂ کار میں لایا تھا۔ دوسرے ماہر نفسیات نے اعصابی اور ذہنی امراض کے مریضوں کی شفا کی خاطر کیس اسٹڈی تیار کرنا شروع کیا تھا۔ خاص کر William Healay نے اس کی اہمیت کو عام کیا، پھر ماہر بشریات اور سماجیات نے اس کارآمد طریقہ میں مضمر تحقیق کی خوبیاں تلاش کیں۔ کلچر کے مطالعہ کے لیے بھی اب اس کا استعمال عام ہو گیا ہے۔ لیکن اُردو ادب میں ابھی تک اس کا آغاز بھی نہیں ہوا ہے۔ یہی نہیں بہت سے ذہنوں کو تحقیق اور کیس اسٹڈی کے درمیان ربط کی تلاش بھی مہمل معلوم ہوگی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اُردو کے اساتذہ کرام کا وہ مزاج ہے جس پر ایک طرح کی غزلی ذہنیت اور دقیانوسی طرز فکر حاوی ہے۔

اس وقت تمام سماجی علوم کے ماہرین کیس اسٹڈی کو تحقیق کے کارآمد اور مفید نتائج حاصل کرنے کے لیے بے حد مؤثر ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ مغرب کے مشہور ادیب و شاعر خاص کر ڈرامہ نگار اور ناول نگار اپنے موضوع کے پیش نظر کرداروں کی ساخت، فطرت اور اُن کی جبلتوں کے پیش نظر افراد کے کیس اسٹڈی میں اتنی ہی دلچسپی لے رہے ہیں جتنی ایک ڈاکٹر اپنے بیماروں میں لیتا ہے۔ تحقیق کا یہ طریقۂ کار علم سماجیات میں اُس وقت مقبول ہوا جب The Polish Peasant شائع ہوئی۔ اسے دو افراد نے تخلیق کیا۔ یہ Thomas/Znaneiki تھے۔ یہ لوگ اپنی تحقیق کے دوران، افراد کی نجی زندگی کا مطالعہ، سوانحی خاکوں، سوانح عمری، تاریخی دستاویز کے ذریعے افراد کے حقیقی اعمال تک پہنچے۔ انھوں نے فرد اور افراد کا انفرادی اور مجموعی جائزہ لیا اور مختلف النوع انسانوں کے کیس اسٹڈی تیار کی۔ اس میں خطوط اور ڈائری کے ذریعہ بھی مدد لی گئی۔ تاکہ حقیقت اپنی اصلی شکل و صورت میں نظر آئے۔ ان دونوں نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان تجربات کی روشنی میں مختلف افراد پر مخصوص تحریروں کے ردِعمل کا بھی مطالعہ کیا۔ اُن کی جذباتی زندگی کے تاروں کو چھیڑا اور جن نتائج سے وہ دوچار ہوئے انھیں نہایت دیانت داری سے قلم بند کیا۔ اور یہ رائے ظاہر کی کہ کیس اسٹڈی کے ذریعے صرف حقیقی اشیاء کا ہی علم ہو سکتا ہے۔ اس میں کسی قسم کی مبالغہ آمیزی کی گنجائش نہیں۔ اس لیے سماجی علوم کی تحقیق میں اس کی شمولیت بے حد ضروری ہے۔ چنانچہ اس کیس اسٹڈی کی بنیاد پر مشہور ماہر علم بشریات Frnaz Boas نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ انسان

کی فطرت خواہ وہ کہیں کا ہو ایک جز ہے اُس کل کا، جو ساری کائنات میں پھیلا ہوا ہے۔
انسان خواہ کسی ملک کا یا قوم کا ہو، ذہنی تناؤ میں مبتلا رہتا ہے۔ کہیں اس کی نوعیت معاشی ہوتی ہے، کہیں سیاسی، کہیں علمی، کہیں جنسی۔ کوئی شخص آج تناؤ سے آزاد نہیں ہے۔ اب ماہر علم الانسان کے نزدیک اس تناؤ کی نوعیت کا جاننا ضروری ہے تاکہ وہ اپنی تحقیقی منزلوں سے آگے بڑھ کر نتائج کی حدود میں داخل ہو۔ اس لیے ماہر نفسیات G.W.Allport کہتا ہے کہ انسان کے اندر پوشیدہ چھپے ہوئے انسان کو جاننے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کی کیس اسٹڈی ترتیب دی جائے۔
اب اس کیس اسٹڈی کو ترتیب دینے یا اس طریقۂ کار کو کام میں لانے کے مختلف طریقے ہیں۔ Nel Anderson نے Hobos قبیلہ سے وابستہ افراد کی نجی زندگی سے آشنائی حاصل کرنے کے لیے شاعری، نغموں، گیتوں اور دوسرے بہترین وسیلوں کا انتخاب کیا۔ اس نے ہوبوس کی تصویریں چھاپیں، ان کی زندگی کو غور سے دیکھا، ان کے کلچر اور تہذیبی اداروں کی شناخت کی اور اس کی تمدنی زندگی کو بے نقاب کیا، جس کے متعلق ابھی تک لوگوں کی واقفیت واجبی تھی۔
John Dollard نے حسب ذیل معیار اور اصول وضوابط کی روشنی میں کیس اسٹڈی کی ضرورت پر زور دیا ہے:

(۱) کلچر تہذیب اور ادبی موضوعات کی تحقیق ایسی حقیقت کا مطالبہ کرتی ہو جس میں افراد، برادری یا جماعت کے انفرادی یا مجموعی رویوں اور برتاؤ کا تجزیہ بہ آسانی کیا جا سکے۔ اقدار کی بازیافت، تعین قدر کے مسائل اور تمدنی زندگی کے نظام کی پرکھ بھی مقصود ہو تو کیس اسٹڈی کی ضرورت ہو سکتی ہے۔

(۲) اس کے ذریعہ حاصل کی گئی اطلاعات سماجی زندگی کے لیے معنویت رکھتی ہو اور مخصوص سماجی زندگی کے رویوں اور سلوک کا مطالعہ پیش نظر ہو۔

(۳) خاندان اور برادری کی حیثیت کا جائزہ مخصوص افراد کے کیس اسٹڈی کے ساتھ ابھرتا ہے۔

(۴) افراد کی کیس اسٹڈی کے ذریعہ صحت مند نتائج کی توقع رہتی ہے۔

(۵) عالم طفولیت سے عمر کی آخری منزل تک کا مطالعہ ضروری سمجھا گیا ہو اور اس کے تمام تجربات نتائج کے لیے ضروری تصور کیے گئے ہوں۔ اس اسٹڈی کے ذریعے تواتر سے واقعات اور سانحات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ تاکہ شخصیت کے ارتقا اور نشوونما میں جو اسباب وعلل کارفرما رہے ہوں ان کی پہچان کی جا سکے۔

(۶) فرد کی سماجی حیثیت اور نوعیت کا مقابلہ کرتی ہو۔

(۷) سوانح عمری، سوال نامہ، ڈائری، خطوط غرض تمام ذرائع اس طرح کیس اسٹڈی کے سلسلے میں استعمال کیے جائیں تاکہ کسی واضح تصور، مفروضہ یا نظریہ کی تصدیق یا تردید ہو سکے۔

Dollard نے مذکورہ بالا شرائط کو کیس اسٹڈیز کی ضرورت کے سلسلے میں ضروری تصور کیا۔ لیکن ان پر عمل کرنا سو فیصدی ممکن نہیں۔ انسان اس قدر پیچیدہ مخلوق ہے کہ اس کے نظریوں، تصورات اور عمل کی دنیا میں وحدانیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ اگر کوئی اسٹڈی حاصل کی جائے تو انسان کی تہذیبی، مذہبی، سیاسی اور سماجی زندگی کے نہاں خانوں تک محقق کی رسائی ہو سکتی ہے اور یہ رسائی ایک ذہین اسکالر کو اتنا مواد فراہم کر سکتی ہے کہ وہ بہت آسانی کے ساتھ عصمت، منٹو، بیدی، کرشن چندر، قرۃ العین حیدر، ممتاز مفتی جیسے افسانہ نگاروں کے کرداروں کا تجزیہ بخوبی کرے۔ یہ تجزیہ صرف کرداروں کی زندگی تک محدود نہ ہوگا بلکہ ان مصنفوں کے ذہنوں کو بھی سمجھنے میں معاون ثابت ہوگا۔ ماہر نفسیات Gardon Allport نے کیس اسٹڈی کے سلسلے میں ان اعداد وشمار سے بھی بحث کی ہے جو اسکالر کی دشواریوں کو اور آسان بنا سکتے ہیں۔ دراصل ان اطلاعات کے ذریعے معلومات کی وہ دنیا حاصل ہو جاتی ہے جسے ہم Codified Knowledge کہہ سکتے ہیں۔
اردو ادب میں ابھی اس کی ابتدا نہیں ہوئی۔ لیکن جن دانش گاہوں میں اردو ادب سماجی علوم کے تناظر میں پڑھایا جاتا ہے، وہاں کا نصاب یقینی طور پر ایسا ہونا چاہیے جس کے ذریعے تقابلی تحقیق کے مسائل سامنے آسکیں اور جدید سماجی علوم میں تحقیق کن منزلوں سے گزر رہی ہے اور اس کے طریقۂ کار کیا ہیں، اردو ادب کے استاد اور طالب علموں کو اس کی خبر ہونی چاہیے۔ اگر اس کی طرف غفلت برتی گئی تو ہماری ساری توجہ داغ کی شاعری میں دال کی اہمیت پر مرکوز رہے گی اور تحقیق کی نئی روشنی سے ہم فیض یاب نہ ہو سکیں گے۔

❖❖❖❖❖

(۱) تحقیق کے طریقۂ کار، ش۔ اختر، ڈاکٹر، گیا، ۱۹۸۵ء، ص ۹۵ تا ۱۲۶۔

مقالہ کی پیش کش[1]

پروفیسر عبدالستار دلوی

تحقیقی عمل کا آغاز

تحقیقی عمل کے طریقہ ہائے کار مختلف ہو سکتے ہیں لیکن اس کے متعلق کچھ عام خیالات اور آرا پیش کی جا سکتی ہیں۔ حالانکہ اس بارے میں کوئی مقررہ فارمولا تو پیش نہیں کیا جا سکتا، تاہم کچھ عام قسم کے مشورے محقق کے لیے کارآمد ہو سکتے ہیں۔

تحقیقی عمل کے دوران موضوع کے انتخاب سے لے کر نتائج اخذ کرنے اور اصولوں کی تدوین و توضیح تک کے سارے مراحل کا عکس موجود رہتا ہے۔ یہ سارے مراحل تحقیق کی مدت تک مشینی انداز میں خود بخود ڈھلتے ہوتے رہتے ہیں۔

تحقیق کا موضوع کتنا ہی اہم ہو، اگر اس کی مناسب انداز میں پیش کش نہ ہو سکے تو تحقیقی عمل نامکمل ہی رہتا ہے۔

تحقیقی عمل کو احاطۂ تحریر میں لانا

جب مطالعے اور تجزیے کا عمل مکمل ہو جاتا ہے تو اس کو مقالے کی شکل میں پیش کرنے کا مرحلہ آتا ہے۔ اصول یہ ہے کہ مطالعہ ختم ہونے کے بعد ہی مقالے کا تحریری کام شروع ہوتا ہے۔ مطالعے اور مقالے میں ایک بالواسطہ تعلق ہوتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں ایک نہیں ہوتیں۔ مقالہ مطالعے کے ذرائع کا اظہار کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ محقق اس کے ذریعے سے اپنے مطالعے کے نتائج دوسرے علماء تک پہنچاتا ہے۔ اس کے ذریعے وہ اپنے عملی طریقۂ تحقیق اور جمع شدہ دلائل کا مظاہرہ بھی کرتا ہے۔

مقالے کی تحریر کا مقصد تفریح نہیں ہے۔ اس نقطۂ نظر سے مقالے، افسانے، یا انشائیے لطیف کی صنف سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ اس کا ایک ہی کام ہے۔ مواد، طریقۂ کار اور نتائج کے بارے میں اطلاعات بہم پہنچانا۔ اس کے ذریعہ علم کا دائرہ وسیع ہوتا ہے لیکن اس بات کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ مقالے کی تحریر کا کام اکتا دینے والا، بے لطف اور بے جان ہوتا ہے۔ وہ متعلقہ قاری کے لیے دلچسپ ہی ہوتا ہے۔ البتہ لفظی صنائع بدائع، پُرتکلف عبارت اور مقفیٰ و مسجع نثر کے لیے مقالہ نگاری میں کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

محقق کو مقالہ نگاری کے ذریعے اپنے تبحر علمی کا اظہار کرنا بھی مقصود نہیں ہوتا۔ تحقیق کا موضوع خشک اور ایک مخصوص مزاج کا ہو سکتا ہے، لیکن محقق کو چاہیے کہ وہ اپنی تحریر کے ذریعے اسے اور زیادہ بے لطف اور غیر دلچسپ نہ بنا دے۔ مقالے کی زبان دلچسپ، رواں دواں، عام فہم اور پُرکشش ہونی چاہیے۔ اس کا طرزِ تحریر، تکمیل اور اختصار کا حامل ہونا چاہیے۔ محقق کو بغیر کسی الجھاوے کے یہ بات واضح طور پر بتا دینی چاہیے کہ اس نے اپنا تحقیقی عمل کس مقصد سے کیا ہے اور اس نے کیا کیا نتائج اخذ کیے ہیں۔

تحریری کام کا آغاز

کچھ اصول:

مقالے کی تحریر کا آغاز براہِ راست اپنے موضوع سے کرنا ہی اچھا سمجھا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں ایک طویل تمہید اور تبصرے کے ساتھ مقالے کی ابتدا کرنے کا طریقہ رائج تھا۔ اب براہِ راست اپنے موضوع پر آ جانا ہی سائنسی طریقۂ کار سمجھا جاتا ہے کیونکہ مقالے کی قدر و قیمت اس بات سے نہیں جانچی جاتی کہ محقق نے اپنے موضوع کے بارے میں کتنا کہا ہے۔ بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس نے کیا کہا ہے اور کس انداز سے کہا ہے۔ بعض محققین بظاہر خوبصورت لیکن موضوع سے غیر متعلق بیانات اور غیر ضروری معلومات مقالے میں شامل کر کے اس کا حجم تو بڑھا دیتے ہیں، لیکن واضح طور پر کسی اہم نتیجے پر پہنچتے ہوئے معلوم نہیں ہوتے۔ اس لیے

براہِ راست موضوع سے شروع کرنا مقالہ نگاری کا پہلا اصول ہے۔

حقیقتاً کوئی بھی محقق اپنے تحقیقی عمل کے شعبے کے متعلق ساری معلومات رکھتا ہے۔اسی پر وہ اپنے موضوع اور تحقیقی کام کی بنیاد رکھتا ہے۔لیکن ان ساری معلومات کا مقالے میں شامل کیا جانا ضروری نہیں۔ان کی بنیاد پر محقق نے اپنا جو نقطہ نظر بنایا ہے صرف اسی کی وضاحت کی جانی چاہیے اور اپنے اخذ کردہ نتائج اور تاثرات کو پورے خلوص اور اختصار کے ساتھ پیش کر دینا چاہیے۔اپنے مفروضات کی تائید میں اسے ثبوت پیش کرنے چاہییں۔اس طرح مقالے کی پیش کش کے لیے اپنے موضوع کا مکمل، صحت مند اور غیر کتابی علمیت کا حاصل ہونا ضروری ہے۔اس طرح مقالے میں غیر ضروری ضخامت نہیں آئے گی۔

مقالہ نگاری کا تیسرا اصول ہے، جمع شدہ مواد کی تدوین اور اس کی تنظیم۔محقق کو چاہیے کہ وہ اپنے خیالات اور علم کی ایک شکل مقرر کر لے۔اس عمل میں اس کی سوچی سمجھی منصوبہ بندی اور متعلقہ دلائل کا دخل رہتا ہے۔متعلقہ مواد سے پیدا شدہ دلائل کی روشنی میں اپنے موضوع یا مسئلے کا حل تلاش کیا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں یہ مفید ہوتا ہے کہ محقق پہلے تحریری شکل میں ایک خاکہ تیار کر لے۔اس طرح مطالعے کی صورتِ حال اس کے ذہن میں واضح ہو جائے گی اور اس کے مطابق وہ اس کو خوبصورت انداز میں پیش کر سکے گا۔اس تحریری خاکے میں یہ چیزیں شامل رہنی چاہییں کہ جمع شدہ مواد کی تنظیم کس طرح کی گئی۔اس مواد سے کون کون سے دلائل کس انداز میں پیدا ہوئے اور ان دلائل سے کون کون سے نتائج نکلتے ہیں۔اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ مقالے کے مختلف اجزاء کا ربط واضح ہو جاتا ہے۔مقالے کا ہر ایک حصہ باہم مربوط ہونا چاہیے۔تبھی اس کو صحیح معنوں میں مقالہ کہا جا سکتا ہے۔

مقالے کا حجم

اس سلسلے میں کوئی مقررہ اصول نہیں ہے۔اس کے مختصر یا ضخیم ہونے کا انحصار زیادہ تر موضوع کی نوعیت پر ہوتا ہے۔اگر موضوع تاریخی، تجزیاتی یا تقابلی انداز کا ہے تو مقالے کی ضخامت زیادہ ہوگی۔اس کے برخلاف تجزیاتی یا تقابلی انداز کا ہے تو مقالے کی ضخامت زیادہ ہوگی۔اس کے برخلاف تجرباتی یا تخلیقی موضوع والا مقالہ مقابلتاً چھوٹا ہوگا۔حجم کو محدود رکھنے کا شعور محقق کو ہونا چاہیے۔اسے چاہیے کہ وہ اپنے مقالے کو زیادہ سے زیادہ مختصر اور زیادہ سے زیادہ مکمل بنانے کی کوشش کرے۔کسی ادبی مقالے کی طوالت کے اسباب مندرجہ ذیل ہو سکتے ہیں:

۱۔ زیادہ اور طویل حوالے پیش کرنا۔

۲۔ حوالے کی کتابوں کے زیادہ سے زیادہ اقتباسات پیش کرنا۔

۳۔ علماء کے اقوال اور آرا کو طویل شکل میں پیش کرنا۔

۴۔ سارے جمع شدہ مواد کو کسی نہ کسی شکل میں مقالے میں نمائندگی دینا۔

۵۔ تاریخی اور معاشرتی حالات کی طویل تفصیلات جمع کر دینا۔

۶۔ ضروری تجزیہ کیے بغیر ادبی اصولوں یا مکاتیب فکر کے متعلق تفصیلی بیان پیش کرنا، محقق کو ان باتوں سے بچنا چاہیے۔

مقالے کے حجم کو محدود رکھنے کے لیے مندرجہ ذیل اصولوں پر عمل کرنا لازمی ہے:

۱۔ طویل حوالے دینے کی بجائے اپنے الفاظ میں ان کا خلاصہ پیش کر دیا جائے اور مآخذ کی کتاب کا نام صفحے کے آخر میں نیچے کی جانب دے دیا جائے۔

۲۔ طویل حوالوں کے بجائے جدولوں، خطی تصاویر، گراف یا اعداد و شمار کے طریقے استعمال کیے جائیں۔

۳۔ عصرِ حاضر کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے دیگر بیرونی شہادتوں کی بجائے ادب کی اندرونی شہادتوں سے زیادہ مدد لی جائے۔

۴۔ کتابوں، رسالوں یا حوالہ جات کا اختصار وہیں پیش کیا جائے جہاں ضروری ہو۔محقق کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ مقالے کی قدر و قیمت کا انحصار مقالے کے صفحات کی تعداد پر نہیں ہوتا بلکہ تحقیقی مواد کے انداز اظہار اور نتائج کے مسلم الثبوت ہونے کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

بیانات یا اظہار حقائق

مقالے میں عام طور پر چار قسم کے بیانات دیئے جاتے ہیں:

۱۔ حقائق کا بیان

۲۔ بنیادی مفروضات

۳۔ ذمے داران شعبہ کی رائے

۴۔ محقق کی خود اپنی رائے

اگر حقائق کے بارے میں بتانا ہے تو یہ واضح کر دینا چاہیے کہ وہ نکتہ کہاں سے حاصل ہوا۔ ذاتی طور پر جائزہ لینے سے، کسی کتاب سے، کسی انٹرویو سے، قلمی کتاب سے یا تجربے سے، صفحے کے آخر میں اس نکتے کے حصول کا ذریعہ بھی بتا دینا چاہیے۔ ذرائع کی بنیاد پر ممتحن یا قاری حقائق کے باوزن ہونے کا اندازہ کر سکتا ہے۔ محقق کو کسی حقیقت یا کسی رائے کے فرق کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ کسی حقیقت کو اپنے مقالے میں پیش کرتے وقت اسے لکھنا چاہیے۔ ''فلاں عالم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ۔'' اور کسی رائے کو پیش کرتے ہوئے اسے لکھنا چاہیے، ''فلاں عالم کا یہ خیال ہے کہ''۔

بنیادی مفروضے کی حیثیت ایک منظور شدہ حقیقت یا اصول کی ہوتی ہے۔ اس کی قبولیت اس قدر عام ہو جاتی ہے کہ پھر اس کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت چنداں نہیں رہتی مثلاً یہ قول کہ ''ادب الفاظ کا ایک خصوصی کاروبار ہے'' کسی ثبوت کا محتاج نہیں ہے۔ یہ ایک عام طور پر تسلیم شدہ حقیقت یا اصول ہے۔ اس کی صداقت کو شک و شبہے کی نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اس قسم کے بنیادی مفروضات ہر ایک مقالے میں استعمال کیے جاتے ہیں۔

یہ خیال رہنا چاہیے کہ تحقیق کے شعبے میں حقائق کی ہی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی کے قول یا رائے کی اہمیت بہت کم ہوتی ہے۔ کسی رائے کے قابل یقین ہونے کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ اس رائے کا پیش کرنے والا کتنا قابل اعتماد ہے۔

جہاں تک محقق کی اپنی رائے کا سوال ہے، زیادہ بہتر یہ ہوتا ہے کہ اسے نہ دیا جائے۔ اگر ضروری ہو تو اس کو مختصر شکل میں Notes کے طور پر دیا جا سکتا ہے۔ آرا کی بنیاد عام طور پر کسی تاثر پر ہوتی ہے، کسی ٹھوس ثبوت پر نہیں۔ اور ''تاثر'' کے لیے تحقیقی مقالے میں کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس کی بنیاد پر قابلِ اعتماد نتائج اخذ نہیں کیے جا سکتے۔ محقق کی ذاتی رائے پیش کرنے سے مقالے میں انفرادی پن آ جاتا ہے۔ اس سے مقالے کو بچانا چاہیے۔ محقق کی اپنی آرا کا ایک ہی فائدہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کی بنیاد پر مقالے کی منصوبہ بندی کی جا سکتی ہے۔

مقالہ اور قاری

محقق کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ مقالہ لکھتے وقت اپنے ممکنہ قاری کو ہمیشہ ذہن میں رکھے۔ اس طرح اس کو اپنے کام میں منظم رہنے کی تحریک ملتی ہے اور وہ یہ سوچتا رہتا ہے کہ ایک ذہین اور سنجیدہ قاری اس کے مقالے سے کیا توقعات رکھتا ہے۔ محقق کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ اس کا قاری ایک اوسط اور عام شخص نہیں ہوگا۔ وہ یقیناً علم و فضل کے اعتبار سے ایک ممتاز شخصیت ہوگا۔ وہ اس شعبے کے متعلق کافی معلومات بھی رکھتا ہوگا۔ وہ اس موضوع کا صرف ایک واقف کار ہی نہیں بلکہ ماہر خصوصی بھی ہو سکتا ہے۔ وہ پیش کردہ مقالے کو انتہائی باریک بینی سے پڑھے گا۔ وہ مقالے کے معیار کے بارے میں کوئی فیصلہ بھی دے سکتا ہے۔ محقق کو قاری کے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالات اور اس کے تجسس کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے اور کوشش کرنی چاہیے کہ اس کے مقالے میں ان سوالات اور اس تجسس کا شافی جواب بھی اس کو مل سکے۔

ادبی مقالات کے بعض عام نقائص

بعض تحقیقی مقالات میں ایک بہت بڑا نقص یہ ملتا ہے کہ ان میں کچھ ایسے وقیع بیانات دے دیے جاتے ہیں جن کے بارے میں ضروری شواہد و دلائل پیش نہیں کیے جاتے۔ ایسے بیانات سے قاری اور محقق دونوں پس و پیش میں پڑ سکتے ہیں۔

دوسرا نقص یہ ہو سکتا ہے کہ پیش کردہ بیانات بے ربط ہوں۔ اس سلسلے میں محقق کو یہ چاہیے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ نیز یہ کہ وہ اپنی بات کو صحیح طریقے سے کہہ سکا ہے یا نہیں۔

تیسرا نقص دلائل اور مواد کی تنظیم سے متعلق ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں محقق کو اپنے مقالے کی تشکیل کے سلسلے میں پوری پوری منصوبہ بندی پہلے سے کر لینی چاہیے۔ پیشگی منصوبہ بندی کے بغیر مقالہ لکھنا نامناسب ہے۔

ایک اور نقص کبھی کبھی یہ ملتا ہے کہ محقق اپنے قاری کو مقالے کی تشکیل کے طریقۂ کار سے پوری طرح باخبر نہیں کرتا۔ اسے چاہیے کہ وہ قاری کو اپنے طریقہ

کار کے بارے میں مشکوک نہ ہونے دے۔

اس کے علاوہ اپنے موضوع اور اس کے مقصد کو صحیح انداز میں نہ سمجھ پانے کے نتیجے میں بعض نقائص پیدا ہو سکتے ہیں۔ محقق کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کا کوئی نقص اپنے مقالے میں نہ آنے دے۔

مقالے کے مختلف اجزا اور ان کی تشکیل

مقالے کے اجزاء کا تعین موضوع کے اعتبار سے کیا جاتا ہے۔ پھر بھی اس کی ایک عام صورت یہ ہو سکتی ہے۔

۱۔ ابتدائی حصہ
(الف) سرورق
(ب) تمہید اور اظہار تشکر
(ج) ترتیب
(د) فہرست اشارات و تصاویر وغیرہ

۲۔ تحقیقی مقالہ
(الف) موضوع کا تعارف
(ب) وضاحتِ موضوع کے مختلف ابواب
(ج) نتائج

۳۔ آخری حصہ
(الف) فہرست معاون کتب
(ب) دیگر معاون مواد۔ تصاویر وغیرہ
(ج) اختتام

ابتدائی حصہ

سرورق اور عنوان

سرورق پر سب سے اہم چیز عنوان ہوتا ہے۔ عنوان کے علاوہ یہ اطلاعات بھی سرورق پر مندرج رہتی ہیں۔

۱۔ یونیورسٹی کا نام جس میں مقالہ پیش کیا گیا ہے۔
۲۔ سال کا ذکر جس میں مقالے کی تکمیل اور پیش کش ہوئی ہے۔
۳۔ ڈگری یا سند جس کے لیے اس کو پیش کیا گیا ہے۔
۴۔ محقق کا نام۔
۵۔ راہ نما کا نام۔

ان چیزوں کے بارے میں کسی تفصیل کو پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف عنوان کے بارے میں مختصر طور پر اظہار خیال کیا جاتا ہے۔

عنوان سرورق کے اوپری حصے میں جلی حروف کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ اگر عنوان مختصر ہے تو وہ ایک سطر میں آ سکتا ہے۔ اگر طویل ہے تو اس کو ایک سے زائد سطور میں بھی لکھا جا سکتا ہے۔ عام طور پر اصول یہ ہے کہ عنوان کی پہلی سطر کچھ بڑی اور دوسری سطر کچھ چھوٹی رہنی چاہیے۔ اس میں ذرا خوبصورتی رہتی ہے۔ بعض مقالات میں عنوان سرورق پر اوپر کی جانب بائیں کنارے پر بھی ملتا ہے۔ لیکن اس کا درمیان میں رہنا ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مقالے کا عنوان موضوع یا مسئلے کا اظہار کرتا ہے۔ اس کی دو خصوصیات ہونی چاہییں۔ وہ زیادہ سے زیادہ مختصر ہو اور مسئلے کو پوری طرح واضح کردے۔ عنوان موضوعِ تحقیق کا خلاصہ ہوتا ہے۔ چھ سے دس الفاظ تک پر مشتمل عنوان اچھا سمجھا جاتا ہے۔ یہ ضروری نہیں عنوان ایک جملے کی شکل میں ہو۔ عنوان عام طور پر جملے کی شکل میں نہیں ہوتا۔ یعنی اس میں فعل شامل نہیں ہوتا۔ عنوان کے ذریعے موضوع کی وضاحت تو ہوتی ہی ہے، اس کے ذریعے حسبِ ضرورت موضوع کی حد بندی بھی کی جاتی ہے۔ عنوان سے تحقیقی عمل کے طریقۂ کار کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ......'' اور...... کا تقابلی مطالعہ''۔......'' کا تنقیدی مطالعہ''......'' کا تجزیاتی مطالعہ''......'' ...... کا تاریخی مطالعہ'' وغیرہ۔

تمہید

مقالے کے اصل حصے سے پہلے تمہید کا مقام آتا ہے۔ اس میں محقق ان تحریکات کا ذکر خاص طور پر کرتا ہے جن کے تحت اس نے مقالہ تحریر کیا ہے اس کے ساتھ ہی وہ مقالے کے ابواب کی تقسیم اور اس کی وجوہات بھی بتاتا ہے اور اس کے بعد وہ اظہار تشکر کی رسم ادا کرتا ہے۔ یہ حصہ بہت مختصر ہوتا ہے۔ اس سلسلے کے ذیلی عنوانات پر آگے غور کیا جا رہا ہے۔

منبع تحریک

محقق اپنے تحقیقی عمل کے لیے کسی موضوع کا انتخاب کسی مضبوط تحریک کی بنیاد پر کرتا ہے۔ تحریک کے ذرائع مندرجہ ذیل ہو سکتے ہیں۔

۱۔ موضوع کا بالکل نیا یا ایک حد تک نیا ہونا۔ اس موضوع پر ابھی تک کام نہ کیا گیا ہو۔

۲۔ اگر موضوع پر کچھ کام ہوا ہے تو اس کام کو آگے بڑھانے کی ضرورت، امکان اور افادیت ہو۔

۳۔ اس موضوع پر اب تک کیے جانے والے کام میں اشتبہات ہوں، ان کے ازالے کا عزم ہونا۔

۴۔ منتخبہ موضوع سے متعلق کافی مقدار میں خام مواد کے حصول کا امکان اور اس پر تحقیق کیے جانے کی ضرورت کا احساس اور تجربہ ہو۔

۵۔ کسی طے شدہ یا مسلم الثبوت حقیقت یا اصول کا ازسرِ نو تجزیہ کرنے کی ضرورت کا احساس ہونا۔

تنظیم ابواب۔ مقالے کا اختصار:

تمہید میں منبع تحریک کا ذکر کرنے کے بعد مقالے کے اختصار کی کوشش کا بیان کیا جاتا ہے۔ ہر ایک باب کی جانب اشارے کے ساتھ اس میں جس چیز کا تجزیہ کیا گیا ہے اس کا مختصر ذکر ہوتا ہے اور ہر ایک باب میں اخذ کردہ نتائج کی جانب بھی مختصر طور پر اشارہ کر دیا جاتا ہے۔

یہ تمہید کا مقصد قاری اور ممتحن کو مقالے کی مجموعی ہیئت سے متعارف کرانا ہوتا ہے۔

اظہار تشکر:

یہ تمہید کا آخری اور اہم حصہ ہوتا ہے۔ اظہار تشکر کی دو شکلیں ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ نام کے ساتھ کسی کا شکریہ ادا کیا جائے۔ دوم یہ کہ بغیر نام لیے ہوئے عام انداز میں اظہار تشکر کیا جائے۔ عام طور پر محقق کے راہ نما اور شعبے کے سربراہ کے لیے ممنونیت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ باقی اشخاص کا شکریہ مقالے کی اشاعت کے وقت مقالے میں شامل کر دیا جاتا ہے۔ مختلف لائبریریوں اور ان کے منتظمین کے لیے اظہار تشکر کیا جاتا ہے۔ اگر کسی سے تکنیکی تعاون ملا ہے تو اس کا شکریہ اس کے نام کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے اور عام طور پر اپنے معاونین، اطلاع کاروں اور دوستوں کو بھی اس رسم میں شریک کر لیا جاتا ہے۔

تمہید میں ہی اپنی غلطیوں، خامیوں یا فروگزاشتوں کے لیے طلب عفو کی رسم بھی ادا کی جاتی ہے۔

ترتیب:

مقالے کے آخر میں ناموں یا موضوعات کے بارے میں کوئی اشاریہ نہیں دیا جاتا۔ اس لیے شروع میں ہی فہرست موضوعات پیش کر دی جاتی ہے، جس سے مقالے میں استعمال شدہ ماٰخذ کی نشاندہی ہو جاتی ہے اور اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے پورے مقالے کی بنیادی ساخت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ فہرست

موضوعات پوری تفصیل کے ساتھ پیش کی جانی چاہییں۔

ابواب کے موضوعات کی فہرست جہاں سے شروع ہوتی ہے، وہاں سے صفحات کے نمبر اعداد میں لکھے جانے چاہییں اور اس سے پہلے پیش کیے ہوئے مواد میں صفحات کی تعداد حروف الف۔ب۔ج۔د۔ وغیرہ کی شکل میں دی جانی چاہیے۔

فہرست اشارات:

اپنے موضوع کی نوعیت کے اعتبار سے محقق اپنی تحریر میں کچھ نشانات، اشارات یا علامات کا استعمال کرتا ہے۔ ان کی ایک فہرست مقالے کے شروع میں دے دینی چاہیے۔ اس کے بغیر قاری یا ممتحن مقالے میں استعمال شدہ اشارات سے واقف نہیں ہو سکتا۔ اور اس کی عدم واقفیت میں وہ مقالے کی مختلف باریکیوں اور تفصیلات سے کما حقہ، متعارف نہیں ہو سکتا۔

مقالے کا خصوصی حصہ

موضوع کی وضاحت:

اس حصے میں محقق اپنے اندازِ کار سے قاری کو متعارف کراتا ہے۔ اپنے تحقیقی عمل کی حدود اور اپنے موضوع کی وسعت کا تعارف کرانے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اختیار کردہ طریقۂ کار کا بھی ذکر کر دیتا ہے۔ موضوع کی وضاحت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ممتحن یا قاری کے سامنے محقق اپنے کام کے سلسلے میں ایک زاویۂ نگاہ پیش کر دے۔ اسی کی بنیاد پر ممتحن یا قاری اس کے مقالے کا جائزہ لیتا ہے۔ موضوع کی وضاحت کر دینا محقق کے دفاع کے لیے ایک سپر کا کام بھی کرتا ہے۔ قاری یا ممتحن اس کی بنیاد پر مقالے میں ضروری مواد کا تصور کرتا ہے۔ محقق کو پوری صفائی کے ساتھ اپنے مفروضات و عقائد کا بیان اس میں کر دینا چاہیے۔

خاص طور سے مقالے کی اصولی ہیئت و تشکیل کی وضاحت یہاں بہت اختصار کے ساتھ کر دینی چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی مقالے میں استعمال شدہ مفروضات و عقائد کا ذکر بھی کر دیا جاتا ہے۔ مقالے کے اس حصے کو مختصر اور جامع ہونا چاہیے اور اس کو پڑھنے کے بعد قاری یا ممتحن ذہنی اور اصولی طور پر مقالہ پڑھنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر سکے۔ یہاں پر محقق اپنی ان ساری تیاریوں کا ذکر بھی کر دیتا ہے جن کے ساتھ اس نے اپنے مقالے کو لکھنا شروع کیا تھا، تاکہ ممتحن یا قاری یہ سمجھ لے کہ محقق نے اپنے کام کے سلسلے میں ضروری اور مناسب تیاریاں کر لی تھیں۔

موضوع کا بیان

تحقیقی مقالے کا خصوصی اور اہم ترین حصہ یہی ہوتا ہے۔ شروع میں ہی قاری کے سامنے مقالے کا بنیادی موضوع واضح ہو جانا چاہیے۔ مقالے کا عنوان اس کے موضوع کی جانب اشارہ تو کر دیتا ہے، لیکن اس کا تفصیلی ذکر مقالے کے شروع میں ہی کر دینا چاہیے۔ موضوع کا بیان اتنا واضح اور مکمل ہونا چاہیے کہ قاری کے ذہن میں کسی قسم کا اشتباہ پیدا نہ ہو۔

موضوع کی وضاحت کے ساتھ اپنے موضوع کی وسعت کا تذکرہ بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس کا بیان متاثر کن انداز میں پوری خود اعتمادی کے ساتھ ساتھ کیا جانا چاہیے۔ موضوع کے بیان سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس مسئلے کے لیے کون سا مواد مفید اور ضروری ہوگا۔ مسئلے کے حل کا طریقۂ کار بھی اس میں واضح کر دیا جاتا ہے۔ مسئلے کا تذکرہ براہِ راست انداز میں کیا جانا چاہیے۔ اور واضح طور پر بتا دینا چاہیے کہ اس میں کون سا مواد استعمال کیا گیا ہے اور کون سا مواد نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

اپنے مسئلے کو جن بنیادی معروضات کی روشنی میں حل کیا گیا ہے، ان کا ذکر بھی ہونا چاہیے۔ بنیادی مفروضات مسئلے کے حل کی بنیادوں کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ آخر میں قاری یا ممتحن پر یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ اس موضوع کی اہمیت کیا ہے اور اس کو منتخب کیے جانے کا جواز کیا ہے۔

گذشتہ کاموں کا جائزہ

مقالے کے شروع میں اس موضوع پر پہلے کیے جانے والے کاموں یا کام کا ایک جائزہ بھی پیش کیا جانا چاہیے۔ اس جائزے کی روشنی میں زیر نظر مقالے

کے موضوع کا ارتقاء اور اس کے ساتھ ہی زیر نظر مقالے کی ضرورت اور اہمیت نیز اس موضوع پر کام کرنے کے نقطہ نظر کو سمجھایا جاسکتا ہے۔

اس جائزے کو بھی مطالعے کے مراحل کے مطابق ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح مقالے کی تشکیل کی وضاحت ہو جائے گی۔ مطالعہ شدہ کتابوں کی ان کے مختلف ادوار کے مطابق فہرست پیش کر دینے سے ہی یہ جائزہ مکمل نہیں ہوتا۔ اس کام کو زیادہ سے زیادہ تجزیہ کاری اور تبصرہ نگاری کے ساتھ کیا جانا چاہیے۔ تبصرہ کا نقطۂ نظر ان مقالات کی خامیوں یا باہمی طور پر ان کی تکمیل کو واضح کرتا ہے۔ گذشتہ مطالعے کی افادیت اور جواز کی قدر و قیمت صحیح اور مختصر انداز میں متعین کی جانی چاہیے۔ پھر محقق کو چاہیے کہ وہ اپنے استعمال شدہ ذرائع کا تذکرہ بھی تفصیل کے ساتھ کر دے تاکہ اس کی روشنی میں ممتحن یا قاری اس مقالے کو صحیح طور پر پرکھ سکے۔

ایک احتیاط ملحوظ رہنی چاہیے۔ مقالے کا یہ حصہ فطرتاً تفصیل پسند ہوتا ہے۔ خیال یہ رکھنا چاہیے کہ تفصیل بہت زیادہ نہ ہو۔ صرف بنیادی نکتے واضح طور پر سامنے آجائیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس سے پہلے لکھے جانے والے سارے مقالات کا مطالعہ اور تذکرہ کیا جائے ان میں سے صرف چند نمائندہ مقالات کو سامنے رکھ کر ان پر ایک تبصرہ کارانہ نظر ڈال لی جائے اور انھیں کا تذکرہ یہاں کر دیا جائے۔ اس حصے میں محقق اپنی علمیت کے اظہار کی طمع میں پڑ سکتا ہے۔ لیکن اس ذہنیت سے بچ کر اس حصے کو زیادہ مفصل ہونے سے بچا لیا جائے۔

مسئلے کے حل کا بیان

مسئلے کو واضح طور پر بیان کر دینے کے بعد اس کے حل کا تذکرہ آنا چاہیے۔ مقررہ منصوبہ بندی کا کچھ حصہ مسترد یا نظر انداز کر دیا گیا ہو تو اس سلسلے میں اگر بعض دلائل کا پیش کیا جانا ضروری ہو تو اختصار کے ساتھ ان کی جانب اشارہ کیا جاسکتا ہے۔ مواد کو پیش کرنے سے قبل ہی حل یا فیصلے کا تذکرہ کر دیا جانا مفید ہوتا ہے۔ مسئلے اور اس کے حل کی روشنی میں قاری دلائل کے طریقہ کار کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ حل کو آخر تک مخفی یا پوشیدہ رکھ کر محقق اپنے قاری کو زیادہ دیر تک تجسس میں مبتلا نہیں رکھنا چاہتا۔ اس کو اپنے حل کا تذکرہ اسی لیے پہلے ہی کرنا پڑتا ہے کہ قاری اس کی رفتار خیال اور توضیح دلائل سے کماحقہ واقف ہو سکے۔

حل کا تذکرہ منصوبہ بندی سے شروع کیا جاتا ہے۔ اسی منصوبہ بندی کو محقق نے اپنی تحقیق کے مختلف طریقوں اور عمل کے ذریعے اپنے مقالے میں ثابت کیا ہے۔

طریقہ کار کا ذکر

مقالے کے تمہیدی حصے میں طریقہ کار کا بھی واضح تذکرہ ہونا ضروری ہے۔ اگر طریقہ کار خام اور غیر سائنسی ہوگا تو نتائج بھی ناقص اور ناقابل اعتماد ہوں گے۔ مقالے کا ممتحن یا ایک ذہین قاری اس بات پر سنجیدگی سے غور کرتا ہے کہ جو طریقہ کار استعمال کیا گیا ہے وہ سائنسی ہے یا نہیں اور اس مسئلے اور موضوع کی مناسبت سے اس کی اہمیت کیا اور کتنی؟ طریقہ کار کے تذکرے میں سب سے پہلے ایک عمومی اشارہ ہونا چاہیے مثلاً تاریخی طریقہ کار، تفصیلی طریقہ کار، یا عملی طریقہ کار وغیرہ۔ اس کے بعد اختیار کردہ طریقہ کار کے مراحل کا تذکرہ کر دینا ضروری ہے۔ طریقہ کار مقالے کی قدر و قیمت کے تعین کی ایک بنیاد ہے۔

طریقہ کار کے تذکرے کے ساتھ ہی مواد اور معلومات کے ذرائع کا ذکر کر دینا چاہیے کہ اس مواد کو کس طرح فراہم کیا گیا؟ جمع شدہ مواد کی درجہ بندی اور اس کا تجزیہ کس طریقہ کار سے کیا گیا ہے؟ اس قسم کے سوالات کا جواب مقالے کے تمہیدی حصے میں ہی مل جانا چاہیے۔ واضح انداز میں یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ منصوبہ بندی کی جانچ کس طرح کی گئی ہے۔ مختصر یہ کہ موضوع کے انتخاب سے لے کر اس کا حل تلاش کرنے تک محقق نے جو کچھ کیا ہے، اس کا مکمل تذکرہ اسی حصے میں آجانا چاہیے۔

تحقیقی عمل کا مقصد:

یوں تو موضوع یا مسئلے کی وضاحت کے ساتھ ہی اس کا مقصد بھی واضح ہو جاتا ہے۔ لیکن مقصد کا تذکرہ علیحدہ سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ مقصد کے تذکرے میں خاص طور سے مستقبل پر نظر رہتی ہے۔ پیش کردہ تحقیقی عمل کی جذباتی افادیت ایک اہم عنصر ہے۔

غرض و غایت کا مقصد اس سبب یا تحریک سے ہوتا ہے جس کے تحت محقق نے اس کام کو کیا ہے۔ اس سے مطالعے کی اہمیت اور ضرورت دونوں چیزیں

واضح ہو جاتی ہیں۔ افادیت بھی اس حصے میں آجاتی ہے۔ ان حصوں میں کسی قسم کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ سرسری اور مختصر طور پر ان کی جانب اشارے کر دینا چاہیے۔

خصوصی ذخیرۂ الفاظ

مقالے میں خصوصی طور پر استعمال کیے جانے والے اصطلاحی الفاظ کا ذکر بھی تمہیدی حصے میں وضاحت سے کر دینا چاہیے۔ اگر بعض الفاظ دیگر زبانوں سے لے کر ان کا ترجمہ استعمال کیا گیا ہے تو حسب ضرورت اس کی وضاحت کی جا سکتی ہے۔ یہ بھی ایک اختیاری کام ہے اس کی ضرورت کا احساس صرف محقق ہی کر سکتا ہے۔

بعض الفاظ ایسے بھی ہو سکتے ہیں کہ جن کو خود محقق نے وضع کیا ہے یا ان کو ایک مخصوص مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ ان کا تعارف قاری کو شروع میں ہی کرا دیا جانا چاہیے۔ ان کی وضاحت مقالے میں ان کی پہلی مرتبہ استعمال ہونے کے وقت صفحے کے زیریں حصے میں نوٹ کی شکل میں بھی کی جا سکتی ہے۔ ایسے الفاظ اگر تعداد میں زیادہ ہوں تو تمہیدی حصے میں ہی ان کی وضاحت کر دینا بہتر ہوتا ہے۔ کچھ ایسے مخصوص الفاظ ہوتے ہیں جن کا تجزیہ مختلف شکلوں میں کیا جا سکتا ہے۔ ان کی وضاحت اور استعمال کی خصوصیت کا تذکرہ لازمی طور پر کیا جانا چاہیے جن کی خصوصی طور پر تعریف ضروری ہو جائے۔ تاہم کبھی کبھی ان کا استعمال ناگزیر ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں ان الفاظ کی تعریفات تمہیدی حصے میں ہی بیان کر دینا بہتر ہوتا ہے۔

شواہد

تمہیدی حصہ مکمل ہو جانے کے بعد مقالے کا خصوصی حصہ شروع ہوتا ہے۔ اس حصے میں مکمل مواد، مواد کا تجزیہ اور مواد سے پیدا شدہ دلائل شامل رہتے ہیں۔ صرف مواد کی تفصیل پیش کر دینا بے معنی ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی تجزیے کے ذریعے واضح ہو جانا چاہیے کہ مواد کی بنیاد پر کیا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ مواد کی بنیاد پر محقق کے اخذ کردہ دلائل مضبوط ہونے چاہییں۔ دلائل کا تعلق منصوبہ بندی سے ہونا چاہیے۔

تشکیل ابواب:

مقالے کا مرکزی حصہ ابواب میں منقسم رہتا ہے۔ ان ابواب میں مواد اور دلائل کے تعلقات کے مختلف مراحل پیش کیے جاتے ہیں۔ ان ابواب کے درمیان بھی ایک ربط رہنا چاہیے۔ ایک باب جس نکتے پر ختم ہوتا ہے اسی نکتے سے آئندہ باب کی ابتدا ہونی چاہیے۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی مقالے کی تنظیم کسی رزمیہ نظم کے مختلف حصوں کی طرح ہوتی ہے۔ ہر ایک باب کو گزشتہ باب سے ایک تحریک ملنی چاہیے اور اس کو آئندہ باب کے لیے تحریک ہونا چاہیے۔

ابواب کی ترتیب کا تعین موضوع کے مطابق کیا جاتا ہے۔ مختلف ابواب میں موضوع کے مختلف فارموں کا ارتقاء بالترتیب انداز میں ہوتا ہے۔ ہر ایک فارمولا بطور خود مکمل بھی ہوتا ہے اور دوسرے سے مشابہت بھی رکھتا ہے۔ ابواب کی تنظیم اور ترتیب کا تعین اس انداز میں کیا جاتا ہے کہ دلائل کے مراحل خود بخود مرتب ہوتے چلے جائیں۔ ایک باب کا مواد اور دلائل اس انداز میں ترتیب دیے جائیں کہ ان کی ترتیب آئندہ باب میں پہلے ہی مناسب معلوم ہو۔ مثال کے طور پر اگر کسی شاعر کے بارے میں تحقیق کی گئی ہے تو اس کے ابواب کی ترتیب اس طرح ہونی چاہیے دور، شخصیت، تخلیقات۔ مقصد یہ ہے کہ ابواب کی ترتیب ایک طے شدہ اصول کے مطابق ہونی چاہیے۔ اسے فطری ہونا چاہیے۔ ہر ایک باب کو اپنی جگہ مکمل تو ہونا ہی چاہیے لیکن اس میں ایک ایسا تجسس بھی موجود رہنا چاہیے جو آگے کے مطالعے کا متحرک بن سکے۔

ابواب کی صحیح ترتیب پر مقالے کی جامعیت کا انحصار ہوتا ہے۔

آخری حصہ

نتائج کا تعین:

یہ مقالے کا آخری حصہ ہوتا ہے۔ اس میں سارے مطالعے کے اہم شعبوں کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس جائزے کی بنیاد پر ہی تحقیقی عمل کے نتائج کا تعین

کیا جاتا ہے۔ مقالے میں اس حصے کو بہت احتیاط سے لکھا جانا چاہیے۔ یہ حصہ ممتحن کو مقالے کا معیار جانچنے میں مدد دیتا ہے اور اس قاری کو بھی جو کم وقت میں مقالے کا خلاصہ جان لینا چاہتا ہے۔

جن نتائج کا ذکر اس حصے میں کیا جاتا ہے، ان سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ علم کو وسعت دینے میں ان نتائج کا ذکر کس قدر تعاون رہا ہے۔ اس حصے کو بہت ہی جامع اور مختصر ہونا چاہیے۔ نتائج بتانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس تحقیقی عمل نے کیا ایجاد کیا ہے۔ موضوع کا ذکر کرتے وقت جو سوالات اٹھائے گئے تھے، ان کا جواب اس حصے میں ملتا ہے۔

نتائج کی تعداد اگر زیادہ ہو تو ان کی درجہ بندی کر کے ہر ایک حصے کو واضح شکل میں پیش کر دینا چاہیے۔ ہر ایک نتیجے کو اپنے سے پہلے اور بعد والے نتیجے سے مربوط ہونا چاہیے۔ اس حصے میں کسی قسم کی تعویق نہیں ہونی چاہیے۔ الجھے ہوئے نتائج بے معنی ہوتے ہیں۔ اگر نتائج کو پیش کرنے میں دشواری کا احساس ہو تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ محقق خود اپنی ہی تلاش کے بارے میں واضح اور مطمئن نہیں ہے اور ان نتائج پر نظر ثانی کیے جانے کی ضرورت ہے۔

اپنے اخذ کردہ نتائج کے بارے میں باہمی ربط تو ہونا ہی چاہیے لیکن دوسرے محققین کے ذریعے اخذ کردہ نتائج سے بھی ان کا تعلق حسب ضرورت دکھانا چاہیے۔

محقق کو اپنے ذاتی تجزیے اور تلاش تک ہی محدود رہنا چاہیے۔ نتائج کی شکل میں ایسی باتیں کبھی نہیں دینی چاہئیں جن کا تجزیہ مقالے میں نہیں کیا گیا ہے۔ اسے ہر وقت اپنے مقالے کی حدود کا علم رہنا چاہیے۔

محقق کو خود اپنے آپ سے سوال کرنا چاہیے کہ ان نتائج کو پیش کرتے وقت اس کی خود اعتمادی کمزور نہیں پڑ رہی ہے۔ اگر ایسا ہو تو اسے اپنے کام پر نظر ثانی کر لینی چاہیے۔

مقالے کے آخری حصے میں نتائج پیش کرتے ہوئے اس بات کا خیال رہنا چاہیے کہ اس میں کوئی نئی بات نہ کہی گئی ہو۔ جو بات پورے مقالے میں پوری تفصیل کے ساتھ کہی گئی ہے اس کا خلاصہ مقالے کے اس حصے میں اختصار کے ساتھ کہہ دیا جانا چاہیے۔

اس حصے کو پڑھنے سے یہ واضح ہو جانا چاہیے کہ پیش کردہ مقالے نے کیا ثابت کیا ہے۔ یہ حصہ کس قدر طویل ہو، اس بارے میں کوئی اصول وضع نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی حدود موضوع اور مقالے کی وسعت پر منحصر ہوتی ہیں۔ عام طور پر ادبی مقالات میں یہ حصہ دس صفحات سے زیادہ مشتمل نہیں ہوتا۔

تحریر کے اعتبار سے مقالے کی تشکیل

ابواب کے عنوانات:

مقالے کے عنوان کی خصوصیات ابواب کے عنوانات میں بھی ہونی چاہئیں کیوں کہ عنوان پورے باب کا علامتی نمائندہ ہوتا ہے۔ عنوان سے پہلے باب کا نمبر شمار ہوتا ہے۔ ابواب کا نمبر شمار تمہید یا مقدمے سے پہلے بھی دیا جا سکتا ہے۔

عنوان کو صفحے کے اوپر والے حصے سے دو تین انچ نیچے لکھا جانا چاہیے۔ اس کے بعد ٹائپ کی تین چار سطروں کا فاصلہ چھوڑ کر باب کا متن شروع کرنا چاہیے۔

ابواب کے ذیلی عنوانات:

ابواب کا متن بھی مختلف عنوانات کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ عنوانات کے نیچے لکیر کھینچ دینی چاہیے۔ ویسے اچھا تو یہی رہتا ہے کہ اصل عنوان کے نیچے لکیر کھینچ دی جائے اور اس لائن کو چھوڑ کر نیچے والی لائن سے متن شروع کرنا چاہیے۔ ذیلی عنوان کے نیچے لکیر کھینچنا ضروری نہیں ہے اور ذیلی عنوان کے بعد بچی ہوئی جگہ میں اسی سطر پر متن لکھنا چاہیے۔ سارے عنوانات کی ترتیب اور مقام تحریر پورے باب میں ہی نہیں بلکہ پورے مقالے میں یکساں ہونا چاہیے۔

حاشیہ

دائیں طرف ایک انچ اور بائیں جانب ایک انچ کا حاشیہ چھوڑنے کا اصول ہے۔ صفحے کی آخری سطر صفحے کے نیچے سرے سے ایک انچ اوپر تک ہونی چاہیے۔ باب کے عنوان والے صفحے پر صفحہ نمبر نہیں دیا جاتا۔ بقیہ صفحات پر صفحہ نمبر صفحے کے دائیں کنارے پر اوپر کے حصے سے عام طور پر ایک انچ نیچے رہنا چاہیے۔ صفحہ نمبر دائیں سرے سے ۱/۴ ا انچ اندر کی طرف لکھا جانا چاہیے۔

صفحات کی نمبر شماری

شروع کے صفحے سے لے کر آخر تک صفحات کا نمبر مستقل گنتی میں نہیں ہونا چاہیے۔ آج کل تمہیدی حصے اور خاص حصے کے صفحات کو الگ الگ رکھنے کا طریقہ مروج ہے۔ ان کو الگ کرنے کے لیے تمہیدی حصے میں صفحے نمبر الفاظ میں ایک، دو، تین وغیرہ ہونا چاہیے۔ اور باقی صفحات پر اعداد میں یعنی ۱، ۲، ۳، ۴ وغیرہ کی شکل میں دیا جانا چاہیے۔ باب کے عنوان والا صفحہ اس اصول سے مستثنیٰ ہے۔ اس پر صفحہ نمبر نہیں دیا جاتا، لیکن اس کو شمار میں لایا جاتا ہے۔ مقالے کا سرورق نہ تو شمار کیا جاتا ہے اور نہ اس پر نمبر لکھا جاتا ہے۔

حوالہ جاتی کتب کی فہرست

معاون کتابوں کی فہرست کا مقالے میں ایک بہت اہم مقام ہوتا ہے۔ قاری اور ممتحن کو اس کے ذریعے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ محقق کے لیے حقائق اور معلومات حاصل کرنے کا ذریعہ کیا تھا۔ ہر ایک مقالے میں معاون کتابوں کی فہرست لازمی طور پر ہوتی ہے۔ اس میں ان ساری کتابوں کے نام شامل ہونے چاہییں، جن کا اس مقالے سے براہِ راست تعلق ہے۔

معاون مواد کی فہرست عام طور پر دو حصوں میں منقسم ہوتی ہے۔ کتابیں اور رسائل۔ ضروری ہو تو قلمی نسخے کے نام سے تیسرا حصہ بھی بنایا جاسکتا ہے۔ ان حصوں کو زبان کے اعتبار سے ذیلی حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اگر تقابلی مقالہ ہے تو مقابل زبان کی معاون کتابوں کی فہرست سے ایک چوتھا حصہ بھی قائم کیا جاسکتا ہے۔

بعض امدادی کتابوں کی فہرست مقالے کی شروع میں دے دی جاتی ہے۔ بعض مقالات میں ہر ایک باب کے آخر میں ان کتابوں کی فہرست لکھ دی جاتی ہے، جن کے حوالے اس باب میں استعمال کیے گئے ہیں۔ لیکن ایک عام اصول یہی ہے کہ معاون کتابوں کی فہرست مقالے کے آخر میں ہی دی جائے۔

فہرست کتب میں پہلے مصنف کا نام، پھر کتاب کا نام، پھر مقام اشاعت اور سنہ اشاعت کا ذکر ہوتا ہے۔ مصنف یا مؤلف کے ناموں کے اعتبار سے فہرست کتب کو حروف تہجی کی ترتیب سے لکھنا چاہیے۔

رسائل کی فہرست میں سال، شمارہ، ماہ اور مضمون کے عنوان کا ذکر ہونا چاہیے۔ سال اور شمارے کا نمبر شمار بریکٹ میں دیا جاسکتا ہے، یا ماہ و سال کا ذکر بریکٹ میں دیا جاسکتا ہے۔

ضمیمہ:

ضمیمے کے تحت عام طور پر اس مواد کا ذکر کیا جاتا ہے، جو پیش کردہ مقالے سے متعلق اور اس کے لیے مفید تو ہوتا ہے، لیکن اگر مقالے کے متن میں اس کو شامل کر دیا جاتا تو مقالے کے انداز پیش کش کے لیے نامناسب ثابت ہوتا۔ فرض کیجیے کہ کوئی مقالہ کسی ہم عصر شاعر یا مصنف کے بارے میں پیش کیا جا رہا ہے۔ محقق نے اس مصنف یا شاعر سے انٹرویو کر کے اپنے سوالات کے جوابات حاصل کر لیے تو ان سوالات اور جوابات کو ضمیمے میں دیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح کا زائد اور موضوع سے متعلق مواد بھی ضمیمے میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ اختصارات، نقشہ جات اور ضروری تقابلی جدولیں بھی ضمیمے کے طور پر دی جاسکتی ہیں۔ جو مقالے کے تجزیے کے لیے اہم ہوتی ہیں۔ ضمیمے سے پہلے بھی ایک خالی صفحہ رہنا چاہیے، جس پر لفظ ضمیمہ لکھا ہوا ہو۔

ذیلی اشارات(FOOT NOTES)

اصول یہ ہے کہ جس ذریعہ سے مواد حاصل کیا گیا ہے، اس کا ذکر کیا جانا چاہیے، چاہے وہ مواد بدستور لے لیا گیا ہو یا اس کا خلاصہ ہی مقالے کے اندر استعمال کیا گیا ہو۔ اس کا تذکرہ ضروری ہے۔ ذرائع کے متعلق یہ تذکرہ ذیلی اشارات کی شکل میں کیا جاتا ہے۔ متن میں ایسے مقامات پر نمبر لکھ دیے جاتے ہیں اور ان کے اعتبار سے صفحے کے نچلے حصے میں اس حوالے کو تحریر کر دیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی ہر ایک صفحے کے اشاروں کا نمبر الگ رہتا ہے۔ اور پھر اس کے بعد دوسرے صفحے پر نمبر بدل جاتا ہے۔ لیکن بعض مرتبہ پورے باب میں نمبروں کی ترتیب ایک ہی رہتی ہے اور دوسرے باب میں یہ نمبر پھر ایک سے شروع کیے جاتے ہیں اور کبھی کبھی پورے مقالے میں نمبر ایک ہی ترتیب میں ہوتے ہیں۔ ان میں سے دوسرا طریقہ زیادہ آسان ہے۔

ذیلی اشارات دیے جانے کے سلسلے میں بھی طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اول یہ کہ ہر صفحے کے متن میں آئے ہوئے اشاروں کی وضاحت اسی صفحے کے نچلے حصے میں کر دی جاتی ہے اور کبھی کبھی پورے باب کے اشارات کی وضاحت باب کے آخر میں کی جاتی ہے۔ بعض مرتبہ پورے مقالے کے اشارات کی وضاحت مقالے کے آخر میں باب اور صفحہ نمبر کے حوالے سے کی جاتی ہے۔

ذیلی اشاروں کی وضاحت میں صرف مصنف کا نام، کتاب کا نام اور صفحہ نمبر دیا جاتا ہے۔ مقام اشاعت اور سالِ اشاعت دیے جانے کی ضرورت اس لیے نہیں ہے کہ معاون کتب کی فہرست میں یہ معلومات دی ہوئی ہوتی ہیں۔

کبھی کبھی اپنے مقالے میں کسی غیر مطبوعہ مقالے یا قلمی کتاب کا حوالہ بھی دینا پڑتا ہے۔ تو ایسی صورت میں مقالے کے مصنف، مقالے کا نام، (غیر مطبوعہ) یونیورسٹی کا نام اور اس کو پیش کیے جانے کے سال کا تذکرہ کر دینا کافی ہے۔ قلمی کتاب کے بارے میں اس لائبریری کا نام جہاں وہ مل سکتی ہے اور لائبریری میں اس کتاب کے نمبر کا تذکرہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔

ذیلی اشارات کی وضاحت کا ایک جدید ترین طریقہ بھی ہے۔ اپنی ساری معاون کتابوں کی فہرست نمبر شمار کے اعتبار سے مقالے کے شروع یا آخر میں دے دی جاتی ہے اور پھر اس میں سے ایک مخصوص کتاب کے حوالہ جات پورے مقالے میں جس جس مقام پر لیے گئے ہوں، وہاں اس کتاب کا نمبر شمار اور صفحہ نمبر درج کر دیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ بہت آسان اور باسہولت ہے۔

اقتباسات:

مقالے میں کسی کتاب کے طویل اور مکمل اقتباسات درج کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اقتباسات پیش کرنے کی ضرورت اور جواز ان صورتوں میں پیدا ہوتا ہے۔

۱۔ جب کسی مصنف کے نقطۂ نظر کا تجزیہ کر کے اس کی تردید کرنا مقصود ہو۔

۲۔ جب دو متضاد خیالات کا جزوی موازنہ کرنا ہو۔

۳۔ جب کوئی اقتباس اتنا خوبصورت ہو کہ اس سے مقالے کا صوری حسن بڑھ جانے کی توقع ہو۔

بہر حال اگر اقتباس پیش کرنا ناگزیر بن جائے تو ان کو جہاں تک ہو مختصر شکل میں دینا چاہیے۔ اس کے شروع اور آخر میں...... (اس طرح کے نقطوں) کا استعمال کرنا چاہیے اور اقتباس کے مآخذ کا تذکرہ ذیلی اشارات کی شکل میں کرنا چاہیے۔

اندازِ تحریر

اثرات:

اندازِ تحریر ہر ایک شخص اور موضوع کے اعتبار سے تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ لیکن یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ مقالے کا طرزِ تحریر زیادہ سے زیادہ غیر انفرادی ہونا چاہیے۔ اس میں ایک سائنس داں جیسی انفرادیت ہونی چاہیے۔ اپنا ایک الگ امتیاز ہونا چاہیے۔ اس طرزِ تحریر کی عام خصوصیات میں تکمیل، وحدت اور وضاحت وغیرہ

کو شامل کیا جاسکتا ہے لیکن اس میں دو خصوصیات ہونی ہی چاہئیں، سنجیدگی اور تاثر۔ ایک کمزور طرز تحریر میں بندھ کر صداقت کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ صداقت ایک طرز تحریر کی وساطت سے مؤثر بنتی ہے۔ صداقت کی غیر مشکوک وضاحت کے لیے طرز تحریر میں وضاحت کا وصف ہونا بھی ضروری ہے۔ انبوہِ الفاظ، طرز تحریر کو خراب کر دیتا ہے۔ الفاظ کے استعمال میں محقق کو جزرسی سے کام لینا چاہیے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ موضوع کو عام فہم بنانے کے لیے ضروری الفاظ کو بھی ترک کر دیا جائے۔ الفاظ کو اس طرح ناپ تول کر استعمال کرنا چاہیے کہ اس میں غیر ضروری الفاظ نہ آنے پائیں۔ تحقیقی مقالے کی زبان اصولی قواعد کی ثقالت کی متحمل کبھی نہیں ہو سکتی۔

مقالے کی زبان کو صنائع بدائع سے بچانا چاہیے۔ مرصع زبان مقالے کی ضرورت کے پیش نظر بے اثر ہوتی ہے۔ وہ مقالے کے سائنسی اور ذہنی عمل کا ساتھ نہیں دے سکتی۔

طرز تحریر کے باب میں محقق کو خود ہی ہوشیار اور محتاط رہنا چاہیے۔ یہ وہ شعبہ ہے جس میں اس کا راہ نما بھی اس کی مدد نہیں کر سکتا۔ مدد کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ اس مقالے کو ایک بار پھر لکھ دیا جائے۔ جہاں پر پیش کش کا انداز کمزور ہوگا وہاں پر راہ نما اس حصے کو دوبارہ تحریر کرنے کا مشورہ دے گا۔ حقیقت میں اصلاح پھر بھی محقق کو ہی کرنی پڑے گی۔

اپنا مقالہ تحریر کرنے سے قبل محقق کو دیگر علما کی کتابیں پڑھنے کا موقع مل چکا ہوتا ہے اور وہ ان کتابوں کے طرز تحریر سے لازمی طور پر متاثر ہوتا ہے۔ اس رابطہ سے محقق کا اپنا ذاتی طرز تحریر نادانستگی میں متاثر ہوتا ہے اور اس میں خود بخود اصلاح ہو جاتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے محقق دیگر مشہور مقالہ جات کو دیکھ بھی سکتا ہے۔

زبان کے متعلق کچھ عام تجاویز ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ مقالہ عام طور پر زمانہ ماضی یا ماضی قریب میں لکھا جاتا ہے۔

۲۔ نتائج کا تذکرہ زمانہ حال میں کیا جاسکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا تعلق آخر میں ایک مخصوص عنصر سے نہیں رہ جاتا۔ ایک عام تخلیق کا ذکر دور حاضر کی مناسبت سے ہی کیا جانا چاہیے۔

۳۔ ضمائر متکلم (میں، ہم، میں، ہمارا وغیرہ) کا استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ ان کے استعمال سے مقالے کی غیر انفرادیت اور امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔

۴۔ صیغہ فاعل کا استعمال صیغہ مفعول کے مقابلے میں زیادہ ہونا چاہیے۔

۵۔ گنتی کے اعداد اگر سو تک ہوں تو ان کو حروف میں لکھا جانا چاہیے۔ سو سے زائد گنتی کو اعداد میں لکھا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر جملے کی ابتدا گنتی سے ہوتا ہے تو اس کو حروف میں ہی لکھنا چاہیے۔

۶۔ زیادہ تر ایک ہی فعل کے ساتھ دو سے زائد مسلسل جملوں کا اختتام نہیں ہونا چاہیے۔

۷۔ مرکب اور معطف جملوں کا استعمال صرف ناگزیر حالات میں ہی کرنا چاہیے۔

ذخیرۂ الفاظ

زیادہ طویل، مرکب، غیر مستعمل اور فرسودہ الفاظ کے استعمال سے مقالے کا مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ مقالات میں کچھ ایسے مقامات بھی ہو سکتے ہیں جہاں اصطلاحی الفاظ کا استعمال ضروری ہوتا ہے۔ اصطلاحی الفاظ کے انتخاب میں مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔

۱۔ اگر ایک سے زائد اصطلاحی الفاظ کا استعمال ہو رہا ہو تو ان میں سے اسی لفظ کا انتخاب کرنا چاہیے جو زیادہ تر لوگوں کے لیے تسلیم شدہ ہو۔

۲۔ مقالے کے شروع میں جن اصطلاحی الفاظ کا استعمال ہوا ہے، اس مفہوم میں انھی الفاظ کا استعمال پورے مقالے میں کیا جانا چاہیے۔

۳۔ اگر انگریزی یا کسی دوسری زبان کے اصطلاحی الفاظ کا ترجمہ کیا گیا ہو، تو بریکٹ میں یا تمہیدی حصے میں ان کی بنیادی شکل کا اظہار کر دینا مناسب ہوتا ہے۔

۴۔ اگر اصطلاحی الفاظ کا استعمال کیے بغیر کسی خیال کا اظہار ممکن ہو تو اصطلاحی الفاظ سے احتراز کرنا ہی بہتر ہوگا۔

الفاظ کے استعمال کے بارے میں یہ مشورہ بھی دیا جاتا ہے کہ جدید انداز میں وضع کیے ہوئے الفاظ تخلیقی ادب میں چاہے کتنی ہی اہمیت رکھتے ہوں، لیکن تحقیقی مقالے میں ان کا استعمال ایک نقص ہی سمجھا جائے گا۔ مقالے میں مقامی یا بازاری الفاظ کا استعمال بھی ناپسندیدہ ہوتا ہے۔ ان کے استعمال سے زبان کی سنجیدگی ختم ہو جاتی ہے۔

(۱) ادبی ولسانی تحقیق اصول اور طریق کار، عبدالستار دلوی، بمبئی، ۱۹۸۴ء، ص ۵۶ تا ۷۳۔

مقالہ کی تسوید[1]

عبدالرزاق قریشی

مواد کی ترتیب:

سارا ممکن الحصول مواد اکٹھا کر لینے کے بعد اب ضرورت ہے کہ اسے ترتیب دیا جائے، یعنی آغاز کار سے اب تک جو نوٹ لیے گئے ہیں انھیں ان کے عنوانات کے تحت مرتب کیا جائے۔ ان کو مرتب کرتے وقت اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ جو غیر اہم یا غیر ضروری نوٹ آ گئے ہیں انھیں الگ کر دیا جائے۔ نوجوان محقق کو اپنے جمع کیے ہوئے تمام نوٹ عزیز ہوتے ہیں اس لیے غیر ضروری نوٹوں کو الگ کرنے میں وہ ہچکچاہٹ محسوس کر سکتا ہے۔ لیکن مقالہ کی اہمیت کے پیش نظر اسے یہ بہر حال کرنا ہو گا[1]۔ جس طرح نوٹ لیتے وقت باقاعدگی اور احتیاط کا خیال رکھا گیا تھا اسی طرح انھیں ترتیب دیتے وقت بھی باقاعدگی اور احتیاط ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ جس کام میں تنظیم و ترتیب ہوتی ہے اس کا نتیجہ خاطر خواہ و خوشگوار ہوتا ہے۔

مقالہ کی تسوید:

مواد کی ترتیب کے بعد مقالہ لکھنے کا کام شروع ہوتا ہے۔ مواد کی تلاش، چھان بین اور ترتیب میں جس محنت، دیانت اور دقت نظر کا ثبوت دیا گیا ہے، مقالہ کی تسوید میں بھی اس کا اہتمام ضروری ہے۔ واضح فکر، مواد کی منطقی ترتیب، صحیح ترجمانی اور مؤثر طرز تحریر میں ایک قطعی رشتہ ہے[2]۔ چونکہ مقالہ علمی ہے اس لیے اس کے پیش کرنے کا انداز بھی علمی ہونا چاہیے، یعنی تحریر میں عالمانہ وقار و تمکنت ہو۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے بلاوجہ خشک بنایا جائے۔ علمی انداز تحریر کے باوصف اسلوب بیان شگفتہ ہو سکتا ہے۔ افلاطون کے فلسفیانہ مکالمے انشا پردازی کے حسن سے خالی نہیں، گبن کی تاریخ، زوال سلطنت روما، اپنی تاریخی اہمیت کے ساتھ ساتھ انشا پردازی کا بھی ایک کارنامہ سمجھی جاتی ہے۔ اُردو میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں، مثلاً (مولانا) شبلی، (مولانا) سید سلیمان ندوی، وغیرہ کی تصانیف۔ مولوی عبدالحق کی تحریریں اپنی سادگی کے باوجود دلکش ہیں۔

اچھے اور مؤثر اسلوب بیان کے لیے محنت کی ضرورت ہے۔ دنیا میں جتنے بڑے بڑے مصنف اور انشاء پرداز ہوئے ہیں، ان کا موضوع ادب رہا ہو یا فلسفہ، افسانہ رہا ہو یا تاریخ، ناول رہا ہو یا سوانح عمری، سب نے اپنی تحریروں پر بار ہا نظر ثانی کی ہے۔ ولیم جیمز نے اپنی مشہور کتاب سائیکولوجی، کا تقریباً ہر صفحہ چھ مرتبہ لکھا[3]۔ ٹالسٹائی نے اپنا ناول War and Peace سات مرتبہ اپنی بیوی سے نقل کرایا۔ اناطول فرانس آٹھ بار پروف دیکھتا تھا اور بالزاک تو ناقابل یقین حد تک پہنچ گیا تھا، یعنی ستائیس بار۔ رسوا اپنے کمرے سے دوڑ کر پریس جاتا اور اپنے مسودوں کے بعض حصوں پر نظر ثانی کرتا[4]۔ میکالے انگریزی کے بہترین انشا پردازوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کا ایک مسودہ لندن میوزیم میں رکھا ہے۔ اس میں...... جا بجا کاٹ چھانس اور حک و اصلاح پائی جاتی ہے، یہاں تک بعض فقرے دس دس دفعہ کاٹے گئے ہیں[5]۔ (مولانا) شبلی کی عبارت میں جو رعنائی و برنائی پائی جاتی ہے اس کا سبب یہی ہے کہ وہ اپنی کوئی تحریر متعدد بار کی کاٹ چھانٹ کے بغیر کتابت کے لیے نہیں دیتے۔ اسی بار بار کی نظر ثانی اور حک و اصلاح کا نتیجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں شگفتگی کے علاوہ اختصار عبارت صحیح معنوں میں پایا جاتا ہے، یعنی کوئی جملہ غیر ضروری نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اسلوب بیان کی ایک دوسری اہم شرط، وضاحت بیان کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ وہ بات کو پوری تفصیل کے ساتھ کہتے ہیں۔ ابہام کا ان کے یہاں گذر نہیں۔ یہی صحیح معنوں میں ایجاز ہے۔ ایسی ہی عبارت پڑھنے والے کو مستفیض بھی کرتی ہے اور محظوظ بھی۔ اُردو میں ایجاز کی بہترین مثالیں (مولانا) شبلی اور (مولوی) عبدالحق کے یہاں ملتی ہے۔

آکسفورڈ یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی نے آٹھ صفحوں کا ایک رسالہ پی ایچ ڈی کے طلبہ کی عملی ہدایت کے لیے شائع کیا ہے۔ اس میں پہلی بات یہی کہی گئی ہے کہ ایجاز مقالہ کا اہم ترین وصف ہے[6]۔ پروفیسر لوکس ایجاز کو خوش اخلاقی کا ایک روپ بتاتے ہیں کیونکہ اس کی وجہ سے کتاب پڑھنے والے کا وقت ضائع نہیں ہوتا[7]۔ ان کی یہ رائے صائب ہے کہ ایجاز کا مقصد کم لکھنا نہیں ہے بلکہ بہتر لکھنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایجاز سے عبارت میں حسن، زور اور روانی پیدا ہوتی ہے[8]۔ ان خوبیوں کے علاوہ ایجاز کی وجہ سے جملے معنی خیز ہوتے ہیں[9]۔ ایک پانچویں خوبی یہ ہے کہ بات میں کسی قسم کا جھول نہیں رہ جاتا بلکہ وہ بالکل واضح ہو جاتی ہے[10]۔ ایک

اچھا مصنف صرف یہی نہیں جانتا کہ اسے کیا کیا لکھنا چاہیے بلکہ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اسے کیا نہیں لکھنا چاہیے۔ اس کا ایجاز وضاحت پیدا کرتا ہے اور وضاحت ایجاز کا باعث ہوتی ہے[11] اور یہی انشا پردازی کا کمال ہے۔

لیکن ایجاز اور ابہام کی سرحدیں آپس میں ملتی ہیں، اس لیے بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اگر خیالات کا اظہار واضح طور پر نہ ہوسکا تو اسلوب ناقص کہلائے گا۔ بقول مڈلٹن مرے، اسلوب کا دار و مدار واضح اظہار خیال پر ہے۔ جہاں یہ نہیں وہاں اسلوب نہیں[12]۔ شاید اس لیے اناطول فرانس نے صرف وضاحت ہی کو اسلوب کے لیے سب کچھ کہا ہے، پہلے وضاحت، پھر وضاحت اور آخر وضاحت[13] اور یہ وضاحت صرف محنت کے ذریعہ حاصل ہوسکتی ہے[14]۔ انگریز نقاد نے واضح نثر کو موسم بہار کی خوشگوار ہوا سے تشبیہ دی ہے[15]۔ اسلوب بیان سے متعلق (مولانا) حالی نے صحیح کہا ہے کہ "جو لوگ تصنیف کے درد سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ کلام میں لذت اور قبولیت پیدا نہیں ہوسکتی جب تک کہ اس کے ایک ایک لفظ میں مصنف کے خون جگر کی چاشنی نہ ہو اور جس قدر اس میں زیادہ صفائی اور گھلاوٹ پائی جائے اسی قدر سمجھنا چاہیے کہ اس کی درستی اور کاٹ چھانٹ میں زیادہ دیر لگی ہوگی[16]"۔

تحقیقی مقالہ چونکہ واقعات و حقائق پر مبنی ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں لفاظی یا افسانہ طرازی، خطابت یا شاعرانہ رنگین بیانی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ یہ باتیں مقالہ کی عظمت کو کم کرتی ہیں۔ اگر مواد (حقائق) کی کمی ہے تو رنگین بیانی، لفاظی یا خطابت اس کی تلافی نہیں کرسکتی[17]۔ جذباتی طرز استدلال اور ناصحانہ انداز بیان کے لیے بھی تحقیقی مقالہ میں کوئی جگہ نہیں[18]۔ غیر متعلق بات کو ذکر کرکے یا غیر ضروری تفصیلات دے کر مقالہ یا کتاب کا حجم نہ بڑھایا جائے۔ عبارت میں یکسانی برقرار رکھنا بھی ضروری ہے۔ ابوالکلام لکھتے لکھتے آزاد لکھ دینا یا دہلی لکھتے لکھتے شاہ جہان آباد، یا کہیں دہلی لکھ رہے ہیں اور کہیں دلی، مناسب نہیں۔ اس غیر یکساں انداز بیان سے پڑھنے والے کو الجھن ہوسکتی ہے۔

لفظوں کا غیر ضروری استعمال انشاء پردازی پر برا اثر ڈالتا ہے۔ لفظوں میں توانائی ہوتی ہے اور توانائی کو ضائع نہیں کیا جاتا ہے۔ اس توانائی کا صحیح استعمال عبارت میں حسن پیدا کرتا ہے[19]۔ "گلستان میں جو مضامین اور خیالات ہیں، ایسے اچھوتے اور نادر نہیں، لیکن الفاظ کی فصاحت اور تناسب نے سحر پیدا کردیا ہے"۔

لفظوں کا صحیح استعمال چینی فلسفی کون فیوشس کے نظام اخلاق میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے ایک شاگرد زانو نے اس سے کہا کہ:

> فرض کیجیے کہ ایک ریاست کا والی آپ کو دعوت دیتا ہے کہ آپ اس کے نظام حکومت کو چلانے میں اس کی مدد کریں اس وقت آپ سب سے پہلے کیا قدم اٹھائیں گے؟ کون فیوشس نے جواب دیا، سب سے پہلا کام یہ ہوگا کہ الفاظ کا صحیح استعمال شروع کیا جائے۔ زانو نے مذاق سمجھا اور پھر سوال کیا۔ اس پر کون فیوشس کو غصہ آگیا اور اس نے ترش لہجہ سے کہا، تم کتنے بداخلاق ہو۔ اگر الفاظ صحیح نہ ہو تو زبان واقعات کے تابع نہیں ہوسکتی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زندگی کے تمام معاملات درہم برہم ہوجائیں گے، اخلاق ناپید ہوگا، انصاف دنیا سے مٹ جائے گا، معصوم لوگ سزا پائیں گے اور گناہ گار اور مجرم آزادی سے لوگوں کو اپنے ظلم کا تختۂ مشق بنائیں گے۔ اس لیے ایک مصلح کا سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہیے کہ وہ صحیح الفاظ کا استعمال کرے[20]۔

تحقیقی مقالہ میں پیش پا افتادہ فقروں، فرسودہ ادبی مثالوں یا مثلوں، عامیانہ محاوروں، بول چال کے محاوروں، خطابات اور ڈگریوں، واحد متکلم اور مدبرانہ جمع متکلم کے استعمال سے بچنا ضروری ہے[21]۔ 'میں' یا 'ہم' کے بدلے مرتب، راقم سطور، مضمون نگار یا اس قسم کا کوئی دوسرا لفظ استعمال کیا جاسکتا ہے۔

رائے قائم کرنے اور اس کے اظہار میں محتاط ہونا چاہیے۔ اُردو میں صفات کا استعمال بہت ہوتا ہے۔ اس میں بھی احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔ بے انتہا دلچسپ، نہایت ہی عمدہ، بالکل بے کار، ناقابل یقین وغیرہ قسم کی رائے زنی سے بچنا چاہیے۔ اگر کسی پیش رو یا ہم عصر محقق کی کسی غلطی کی نشاندہی کی جائے تو طنز و حقارت کا اظہار نہ ہونے پائے۔ بلکہ سنجیدہ اور نرم لہجہ میں اس کی طرف اشارہ کیا جائے۔ اسی طرح مبالغہ آمیز مدح سرائی (یا اس کے برعکس دل آزار تنقید) سے پرہیز کیا جائے۔ تنقید کی حالت میں لہجہ تند و تیز نہ ہو بلکہ نرم اور ہمدردانہ ہو، یہاں تک کہ تلخ حقائق کو بھی سنجیدگی اور نرمی سے پیش کیا جائے۔

مقالہ کو ابواب پر تقسیم کیا جائے۔ ہر باب کی سرخی جلی حروف میں صفحہ کے وسط میں لکھی جائے۔ ثانوی سرخی (اگر ہے) اس کے نیچے کسی قدر خفی قلم سے ہو۔ ذیلی سرخیاں کتاب کے عام قلم سے یا ذرا جلی لکھی جائیں اور پیراگراف کی شکل میں لکھی جائیں۔ سرخیاں، جہاں تک ممکن ہو، مختصر ہوں۔

عبارت میں پیراگراف ضرور بنایا جائے۔ ایک پیراگراف میں حتی المقدور ایک ہی بات کہی جائے۔ پیراگراف نہ بہت چھوٹے ہوں اور نہ بہت لمبے لمبے۔ لمبے پیراگراف پڑھنے والے کے لیے تکلیف کا باعث ہوتے ہیں۔

اقتباس کی عبارت احتیاط سے نقل کی جائے اور اسے واوین " " میں رکھا جائے تاکہ وہ محقق کی عبارت سے نمایاں ہوسکے۔ اگر عبارت مختصر ہے، تین

چار سطروں تک کی، تو اسے متن کے ساتھ اور متن کے قلم سے لکھنا چاہیے۔ لیکن اگر طویل ہے، چار سطروں سے زیادہ کی، تو اسے متن سے الگ کر کے لکھنا ہوگا۔ اور اس کا قلم متن کے قلم سے نمایاں طور پر خفی ہوگا۔ اس کی سطریں نسبتاً مختصر ہوں گی، یعنی دائیں بائیں جگہ چھوٹی رہے گی۔ اس طرح وہ متن کی عبارت سے نمایاں ہوگی۔ یورپ، امریکہ وغیرہ میں اقتباس کی عبارت کو واوین کے استعمال کے بغیر لکھنے اور سطر کو متن کے برابر لکھنے کا چلن ہے۔ اردو میں بھی یہ طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر سطریں نسبتاً چھوٹی ہوں گی تو عبارت نمایاں رہے گی۔ لیتھو کی طباعت میں، یہی صورت بہتر معلوم ہوتی ہے۔

اقتباس کی عبارت میں محذوف جملوں یا فقروں یا لفظوں کا اظہار تین نقطے... لگا کر کیا جاتا ہے۔ اگر جملہ یا پیراگراف کا آخری حصہ محذوف کرنا ہو تو چار نقطے.... لگائے جائیں۔ اگر پورا پیراگراف محذوف ہے تو لفظوں کی پوری سطر سے اس کا اظہار کیا جائے۔ اقتباس کی عبارت میں کوئی اضافہ یا توجیہی شرح کرنے کی ضرورت پڑے تو اسے بریکٹ [ ] میں لکھا جائے تاکہ وہ اصل عبارت سے ممتاز رہ سکے۔ مصنف سے کوئی لفظ چھوٹ گیا ہے اور اس کا اضافہ ضروری ہے تو اسے بھی بریکٹ [ ] میں رکھا جائے۔ اگر عبارت میں کوئی ناقابل فہم غلطی ہے تو قیاساً اس کی تصحیح نہ کی جائے بلکہ اس لفظ یا فقرہ کے آگے قوسین میں (کذا) لکھ دیا جائے۔

بعض اوقات کسی دوسری زبان مثلاً عربی یا انگریزی کی عبارت کا ترجمہ کر کے اقتباس کے طور پر دیا جاتا ہے۔ اقتباس کسی دوسرے کی عبارت یا کلام کو اپنی تحریر میں نقل کرنے کو کہتے ہیں۔ ترجمہ کی صورت میں خیالات تو دوسرے کے ہوتے ہیں لیکن زبان اس کی نہیں ہوتی۔ اس لیے اصل اور ترجمہ میں فرق کرنے کے لیے مناسب یہ ہے کہ ترجمہ کی عبارت کو بغیر واوین کے نقل کیا جائے۔ باقی تمام شرائط وہی ہوں گی جو اصل عبارت کے لیے ضروری ہیں۔

مقالہ میں مخففات کا استعمال نہیں ہونا چاہیے۔ یہ قاری کو الجھن میں ڈال دیتے ہیں۔ لیکن فٹ نوٹ میں ان کا استعمال ہوسکتا ہے۔

انگریزی میں سو سے کم نمبر ہندسے کے بدلے لفظوں میں لکھا جاتا ہے۔ اسی سیکڑے کے نمبر، مثلاً دو سو، تین سو وغیرہ لفظوں میں لکھے جاتے ہیں۔ اگر جملہ کے شروع میں نمبر آتا ہے تو اسے بھی لفظ میں لکھا جاتا ہے۔ یہ طریقہ اچھا ہے اور اسے اردو میں بھی اختیار کرنا چاہیے۔

حاشیہ اور حوالہ:

تحقیقی مقالہ بڑی حد تک دوسرے مصنفین کی کتابوں اور تحریروں، دستاویزوں، روندادوں وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے اس لیے حاشیہ میں ان کا اعتراف کرنا اور انھیں اہمیت دینا ضروری بلکہ محقق کا اخلاقی فرض ہے۔ یہ اعتراف صرف عبارت کی حد تک نہ ہو، بلکہ اگر مصنف کے خیالات سے استفادہ کیا گیا ہے تو اس کا اقرار بھی ضروری ہے [۲۲]۔ دوسرے کی محنت کو بغیر اعتراف و اقرار کے اپنا لینا علمی و تحقیقی دیانت کے خلاف ہے۔

فٹ نوٹ کے ذریعہ جہاں مختلف مصنفوں اور کتابوں سے استفادہ کا اعتراف ہوتا ہے وہیں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ محقق کے استعمال کیے ہوئے مواد کے مستند ہونے کا بھی پتا چلتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص اسی موضوع پر یا موضوع کے کسی خاص پہلو سے متعلق زیادہ تفصیل سے جاننا چاہتا ہے تو آسانی سے وہاں تک اس کی رسائی ہوسکتی ہے۔

فٹ نوٹ کا ایک مقصد اور ہے اور وہ یہ کہ متن میں جو بات کہی گئی ہے اس کے متعلق مزید معلومات بہم پہنچانا یا کسی اصطلاح کی تشریح کرنا یا بیان کے کسی خاص پہلو کی مزید وضاحت کرنا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسروں کی یہ ہدایت نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ تشریحی فٹ نوٹ کم سے کم ہوں اور زیادہ سے زیادہ مختصر ہوں اور جو بات متن میں جگہ پانے کی مستحق نہ ہو اسے حاشیہ میں بھی دینے کی ضرورت نہیں [۲۳]۔

حوالہ یا فٹ نوٹ عموماً صفحہ کے آخر میں ہوتا ہے۔ حوالہ نمبر ختم ہونے پر علامت وقفہ (–) کے بعد اور سطر سے ذرا اوپر یا اس مخصوص لفظ پر جس کی وضاحت مقصود ہے، دیا جائے۔ متن کی عبارت اور حوالہ یا حاشیہ کی عبارت میں فرق کرنے کے لیے بیچ میں ایک لکیر کھینچ دینا ضروری ہے۔ حوالہ یا فٹ نوٹ کی عبارت کے حروف متن کی عبارت کے حروف سے نمایاں طور پر خفی ہوں۔ ہر تشریحی نوٹ پیراگراف کی شکل میں شروع ہو۔ فٹ نوٹ لکھنے یا حوالہ دینے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ متن میں نمبر دیے جاتے ہیں اور باب کے آخر میں تمام نوٹ نمبر وار درج کیے جائیں۔ کبھی کبھی تمام حوالے اور نوٹ کتاب کے خاتمہ پر درج کیے جاتے ہیں۔ موجودہ دور میں مسودہ تیار کرتے وقت فٹ نوٹ کی عبارت (اگر پہلا طریقہ اختیار کرنا ہے) متن کی عبارت کے ساتھ ہی لیکن بریکٹ (__) میں لکھ دی جاتی ہے۔ عبارت یا جملہ یا حوالے سے پہلے ف (فٹ نوٹ) سرخ روشنائی سے لکھ دینا چاہیے۔ اس سے کمپوزیٹر کو سہولت ہوگی۔ مگر اس کی پابندی صرف اس صورت میں ہوسکتی ہے کہ کتاب ٹائپ میں چھپنے والی ہو۔ کتابت کی صورت میں یہ طریقہ مفید ثابت ہوگا۔

اگر حاشیہ میں اقتباس دیا جائے تو واوین "..." میں ہو اور اس کے خاتمہ پر قوسین میں اس کا ماخذ بتا دیا جائے۔

اگر ایک صفحہ پر دو یا دو سے زیادہ حوالے ہوں تو ایک حوالے کے نیچے دوسرا حوالہ دیا جائے، مسلسل نہ دیا جائے۔ لیکن اگر ایک ہی بیان یا دعوے کے دو یا اس سے زیادہ حوالے دینا ہوں تو سب کو ایک قطار میں دینا چاہیے۔ بیچ بیچ میں سیمی کولن (؛) لگاتے جائیں۔

ثانوی مآخذ کی شکل میں پہلے اس مآخذ کا حوالہ دیا جائے جو محقق کے پیش نظر ہے اور پھر اصل مآخذ بتایا جائے۔ اصل مآخذ بتانے سے پہلے ''بحوالہ'' یا ''منقول از'' لکھ دیا جائے۔

حوالہ دینے کا کوئی مخصوص طریقہ یا اصول معین نہیں ہے، لیکن جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے اس کی پابندی شروع سے آخر تک کی جائے۔ بہتر طریقہ یہ ہے کہ جب کسی کتاب کا پہلی بار حوالہ دیا جائے تو اس کی تھوڑی سی تفصیل دے دی جائے۔ مکمل تفصیل کتاب کے آخر میں کتابیات یا فہرست مآخذ کے تحت ہوگی۔ لیکن مضمون کی صورت میں مکمل تفصیل اسی موقع پر دینی ہوگی۔ مکمل حوالہ میں مندرجہ ذیل اطلاعات کا ہونا ضروری ہے:

مصنف یا مرتب کا نام، کتاب کا نام، اڈیشن (اگر ہے)، مقام اشاعت، ناشر، سال اشاعت، جلد (اگر ہے)، باب (اگر ہے)، صفحہ یا صفحات۔

ظاہر ہے کہ یہ حوالہ بہت طویل ہے اس لیے اسے مختصر کر کے اس طرح دیا جا سکتا ہے:

محمد حسین آزاد، آب حیات، طبع یازدہم، ص: ۱۰۱۔

یا

محمد حسین آزاد، آب حیات، طبع یازدہم (لاہور، ۱۹۱۱ء)۔ ص ۱۰۱۔

پھر جب اسی کتاب کا حوالہ دینے کی ضرورت پیش آئے تو یوں دے سکتے ہیں:

محمد حسین آزاد، آب حیات، ص: ۲۰۸۔

یا

محمد حسین آزاد، کتاب مذکور، ص: ۲۰۸۔

اگر فوراً اسی مصنف اور اسی کتاب کا حوالہ دینا ہو تو وہ حسب ذیل ہوگا:

ایضاً، ص ۲۱۵۔

اور اگر صفحہ بھی وہی ہو تو حوالہ یوں ہوگا:

ایضاً۔

جو کتاب دو یا دو سے زیادہ جلدوں میں ہو تو اس کے حوالہ میں جلد کا نمبر دینا ضروری ہے۔ مثلاً:

ڈاکٹر محی الدین قادری زور، فہرست مخطوطات ادارہ ادبیات اُردو، جلد دوم، ص ۴۴۔

اگر کتاب مختلف ابواب پر تقسیم ہے تو باب کا ذکر ضروری ہے۔ جیسے

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، کیفیہ، بار دوم، تیرھواں باب، ص ۲۷۱۔

اگر کتاب کا صرف ایک ہی باب یا مضمون موضوع تحقیق سے متعلق ہے تو اس کا حوالہ اسی طرح دیا جائے کہ مصنف یا مرتب کے نام کے بعد پہلے باب یا مضمون کا عنوان واوین میں لکھا جائے اور پھر کتاب کا نام اور صفحہ کا نمبر۔ جیسے:

پنڈت برج نرائن چک بست، ''اودھ پنچ''، مضامین چک بست، ص ۲۳۵۔

مرتبہ کتاب کا حوالہ:

عبدالنبی فخر الزمانی قزوینی، تذکرہ میخانہ، مرتبہ محمد شفیع، ص ۴۵۰۔

(مولوی) مہیش پرشاد، مرتبہ، خطوط غالب، ص ۱۱۸۔

کسی کتاب کے مقدمہ کا حوالہ:

بیگم مہدی حسن، مرتبہ، مکاتیب مہدی، مقدمہ از (مولانا) سید سلیمان ندوی، ص ۵۔

جس کتاب پر مصنف یا مرتب کا نام نہ ہو:

علی گڑھ تاریخ ادب اردو، ص ۲۲۴۔

کلاسیکی کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے مصنف کا نام دینا ضروری نہیں، مثلاً

باغ و بہار، جامعہ اڈیشن، سیر پہلے درویش کی، ص ۳۴۔

انسائیکلوپیڈیا کے مضمون کا حوالہ:

عبدالمجید سالک، ''آزاد''، اُردو دائرۂ معارف اسلامیہ، جلد ا، ص ۱۱۲۔

لغت کا حوالہ:

سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، جلد دوم۔

لغت کے حوالے میں صفحہ کا نمبر بتانے کی ضرورت نہیں۔

روئداد:

انجمن اسلام، سالانہ رپورٹ انجمن اسلام، بمبئی، بابت ۴۱-۱۹۴۰ء ص ۳۵۔

خطوط، انٹرویو، سوالنامہ وغیرہ:

سید مسعود حسن رضوی (لکھنؤ) مکتوب بنام مؤلف (مرتب مضمون نگار) مورخہ یکم جون ۱۹۶۰ء۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ذاتی انٹرویو، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد ۶ جولائی ۱۹۶۵ء۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (دہلی) بجواب سوالنامہ مرتبہ مؤلف (مرتب، راقم مضمون)

اگر کسی کتاب کا حوالہ بار بار دینا پڑے تو ہر بار اس کا نام لکھنے کے بدلے، کتاب مذکور لکھا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ پڑھنے والے کے لیے کسی اُلجھن یا غلط فہمی کے پیدا ہونے کا امکان نہ ہو۔ مثلاً ایک مصنف کی دو یا دو سے زیادہ کتابوں کے حوالہ کی صورت میں 'کتاب مذکور' کا استعمال اس کے لیے اُلجھن کا باعث ہو سکتا ہے۔ ایسی حالت میں ہر کتاب کا نام لکھنا بہتر ہوگا۔

رسالہ کے مضمون کا حوالہ کتاب کے حوالے سے کسی قدر مختلف ہوگا۔ اس کے مختلف اجزاء حسب ذیل ہوں گے:

مضمون نگار، عنوان مضمون (واوین میں)، رسالہ کا نام، جلد اور شمارہ۔ (بریکٹ میں سال دے دینا بھی مناسب ہوگا) صفحہ مثلاً

نصیرالدین ہاشمی، ''دکھنی مرثیوں کا ایک نایاب مجموعہ'' نوائے ادب، جلد ا، شمارہ ۴ (۱۹۵۹ء)، ص ۱۶۔

اسی مضمون کا دوسری بار حوالہ: نصیرالدین ہاشمی، ''دکھنی مرثیوں کا ایک نایاب مجموعہ''، ص ۱۸۔

اگر فوراً اسی مضمون کا حوالہ دینے کی ضرورت پڑے تو یوں دے سکتے ہیں۔

ایضاً، ص ۲۲۔

اور اگر صفحہ بھی وہی ہو تو حوالہ یوں ہوگا۔

ایضاً

ان مثالوں کی روشنی میں محقق نئے نئے حوالے خود بنا سکتا ہے۔

پی ایچ ڈی کا مقالہ

پی ایچ ڈی کا مقالہ "۱۱×"۱/۲ ۸ سائز کے عمدہ کاغذ پر لکھا یا ٹائپ کرایا جائے۔ دائیں طرف ڈیڑھ انچ کا اور بائیں طرف ایک انچ کا حاشیہ چھوڑا جائے۔ اوپر ۱/۲ "۱ اور نیچے ۱/۲ "۱ کا حاشیہ ہونا چاہیے۔ ہر صفحہ پر نمبر دیا جائے۔ نمبر صفحہ کے سرے پر چاہے بیچ میں ہو چاہے بائیں طرف۔ مقالے سے پہلے دیباچہ، فہرست وغیرہ کے نمبر لفظ میں دیے جائیں۔ مقالہ کے خاتمہ پر ضمیمہ، کتابیات وغیرہ کے نمبر مقالہ کے صفحات کے نمبر کے ساتھ مسلسل ہوں۔ لکھنے والے کا خط اچھا ہو۔ کاربن پیپر سیاہ رنگ اور عمدہ قسم کا استعمال کیا جائے۔

مسودہ (خواہ تالیف ہو یا پی ایچ ڈی کا مقالہ) مکمل ہونے کے بعد مقالے کی شکل حسب ذیل ہوگی:

۱۔ ٹائیٹل کا صفحہ: کتاب کا نام واضح اور دلکش مگر مختصر ہو۔ مبہم یا طویل نام سے بچنا چاہیے۔ اگر پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے تو اس پر مقالہ کا عنوان، طالب علم کا

نام، ڈگری، یونیورسٹی کا نام اور مقالہ پیش کرنے کی تاریخ، (مہینہ اور سال) درج ہوگی۔

۲۔ دیباچہ: جہاں تک ممکن ہو مختصر لکھا جائے۔ اس میں سبب تالیف یا نقطۂ نگاہ، اظہار ممنونیت وغیرہ ہو۔ اگر کسی سے یا کچھ لوگوں سے غیر معمولی مدد ملی ہو تو اس کے لیے ''اظہار تشکر'' کے عنوان سے الگ صفحہ رکھا جا سکتا ہے۔ اظہار ممنونیت میں مبالغہ سے کام نہ لیا جائے۔ اپنے راہ نما اور کتب خانے کے ناظم کا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ محقق کی راہ نمائی یا مدد کرنا ان کے فرائض میں داخل ہے۔ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کا شکریہ ادا کرنا بھی غیر ضروری ہے۔

۳۔ فہرست مندرجات۔

۴۔ نقشوں، تصویروں وغیرہ کی فہرست۔

۵۔ مقالہ مختلف ابواب پر تقسیم ہوگا۔

۶۔ ضمیمہ: ایسا مواد جو متن کے لیے ضروری نہ ہو یا متن کے حسن کو مجروح کرتا ہو، لیکن جس سے مصنف کے بیان یا بیانات کے مزید تائید ہوتی ہو، کتاب کے آخر میں ضمیمے کے طور پر دیا جائے۔ بعض اوقات کتاب کی طباعت کے دوران میں مفید مواد حاصل ہوتا ہے۔ اسے بھی ضمیمے کے طور پر شامل کیا جائے۔ مقالہ یا کتاب کے مختلف پہلوؤں کی مناسبت سے ایک سے زیادہ ضمیمے ہو سکتے ہیں۔ نقشے، ڈائگرام وغیرہ بھی ضمیمے کے طور پر دیے جا سکتے ہیں۔

۷۔ کتابیات یا فہرست مآخذ۔

۸۔ اشاریہ: (پی ایچ، ڈی کے مقالے میں اس کی ضرورت نہیں)۔

کتابیات یا فہرست مآخذ

کتابیات یا مقالہ کے خاتمہ پر مآخذ کی فہرست دینا آج کل کا عام دستور ہے۔ اس فہرست سے قاری کو کتاب کے مآخذ معلوم ہونے کے علاوہ مواد کے استناد، اہمیت وافادیت وغیرہ کا اندازہ نام گنانے کے لیے نہ ہو۔ جو کتاب بھی ہو براہِ راست موضوع سے تعلق رکھتی ہو اور اس سے مصنف یا مقالہ نگار نے اپنی تصنیف یا مقالہ میں استفادہ کیا ہو۔ ایک کتاب موضوع سے متعلق تو ہے لیکن گھٹیا قسم کی ہے اور مقالہ نگار یا مصنف کو اس سے کوئی نئی بات نہیں معلوم ہوئی، ایسی کتاب کا نام فہرست میں شامل کرنے کی ضرورت نہیں۔ فہرست مآخذ منتخب ہونا چاہیے۔

کتابیات تیار کرنے میں وہی طریقہ اختیار کیا جائے جو نوٹ لینے میں اختیار کیا گیا تھا، یعنی تراشے پر مصنف کا نام، کتاب کا نام اور دوسری ضروری معلومات نوٹ کی جائیں تاکہ انھیں حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دینے میں سہولت ہو۔ کتابیات کا کارڈ عموماً "۵×۳ سائز کا ہوتا ہے۔

کتابیات پیش کرنے میں اگر چند موٹی موٹی باتوں کا خیال رکھا جائے تو بہتر ہے۔ مثلاً مخطوطات کی فہرست مطبوعات کی فہرست سے الگ ہو۔ اسی طرح رسائل وجرائد بھی مطبوعات سے الگ رکھے جائیں۔ سب سے آخر میں ذاتی خطوط، سوالنامے وغیرہ ہوں۔ اس طرح فہرست مآخذ (کتابیات) چار حصوں پر تقسیم ہوتی ہے۔

۱۔ مخطوطات

۲۔ مطبوعات

۳۔ رسائل وجرائد واخبارات

۴۔ ذاتی خطوط، سوالنامے وغیرہ

اگر فہرست مختصر ہے تو اسے مختلف حصوں میں تقسیم کرنے کی ضرورت نہیں۔

مخطوطات ومطبوعات کی فہرست مصنف وار حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دی جائے۔ مخطوطے کی شکل میں اس لائبریری کا نام اور پتا بتانا بھی ضروری ہے جس میں وہ مخطوطہ محفوظ ہے۔ مثلاً:

سعادت ناصر خان، تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا، کتب خانہ لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ۔

اگر سن کتابت نسخہ پر درج ہو تو وہ ضرور دیا جائے۔

اگر مخطوطہ مصنف کا ذاتی نسخہ ہے یا کسی اور فرد کی ملکیت ہے تو اس کا مختصر سا تعارف کرا دینا مناسب ہوگا۔

اگر مطبوعات کی فہرست طویل ہے اور کتابیں مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں تو انھیں موضوع کے اعتبار سے تقسیم کر دینا بہتر ہوگا۔ اسی طرح اگر کتابیں مختلف زبانوں میں ہیں تو انھیں زبان کے لحاظ سے تقسیم کر دینا مناسب ہوگا۔ ہر کتاب کے لیے مندرجہ ذیل اطلاعات کا بہم پہنچانا ضروری ہے:

مصنف یا مرتب کا نام، کتاب کا نام، اڈیشن (اگر ہے)، مقام اشاعت، ناشر (اگر کتاب پر ناشر کا نام نہیں ہے تو مطبع کا نام)، سال اشاعت۔

مصنف یا مرتب کے نام لکھنے کا طریقہ اس طریقے سے الگ ہوگا جو حوالہ میں استعمال کیا گیا ہے۔ اگر اس کا کوئی تخلص ہے تو پہلے تخلص لکھا جائے گا اور پھر نام۔ یا اگر اس کے نام سے پہلے ڈاکٹر یا مولوی یا اس قسم کا کوئی اور لفظ ہے تو پہلے نام ہوگا اور پھر وہ لفظ۔ اس طرح کتابیات اس نہج پر تیار کی جا سکتی ہے:

تصنیف

اختر جوناگڑھی، قاضی احمد میاں، اقبالیات کا جائزہ، کراچی، اقبال اکیڈیمی، ۱۹۵۵ء۔

نور الٰہی و محمد عمر، ناٹک ساگر، لاہور، شیخ مبارک علی تاجر کتب، ۱۹۲۴ء۔

مرتبہ کتاب:

قاسم، میر قدرت اللہ، مجموعۂ نغز، مرتبہ محمود شیرانی، لاہور، کریمی پریس، ۱۹۳۳ء۔ یا

محمود شیرانی، مرتبہ، مجموعۂ نغز، مصنفہ میر قدرت اللہ قاسم، لاہور، کریمی پریس، ۱۹۳۳ء۔

انتخاب:

کول، پنڈت کشن پرشاد، گلدستہ، پنج، لکھنؤ: ہندوستانی پریس، ۱۹۱۵ء۔

میر، میر تقی میر، انتخاب کلام میر، منتخبہ مع مقدمہ از مولوی عبدالحق، پانچواں اڈیشن، دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۴۵ء۔

یا

عبدالحق، مولوی، منتخبہ مع مقدمہ، انتخاب کلام میر، پانچواں اڈیشن، دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۴۵ء۔

ترجمہ:

یوسف کوکن، محمد، مترجمہ، مختصر تاریخ ہند، مصنفہ ڈبلیو، ایچ مورلینڈ، مدراس: مدراس یونیورسٹی، ۱۹۵۲ء۔

جس کتاب پر مرتب یا مصنف کا نام نہ ہو:

نوائے آزادی، بمبئی: ادبی پبلشرز، ۱۹۵۷ء۔

اگر دیباچہ یا کسی اور مستند ذریعہ سے مصنف یا مرتب کا پتا چل سکتا ہو تو اسے بریکٹ ( ) میں دے دینا چاہیے۔ مثلاً (عبدالماجد دریابادی، مولانا)، زود پشیماں، لکھنؤ: الناظر پریس، ۱۹۱۷ء۔

مخصوص اڈیشن یا مجموعہ:

حالی، خواجہ الطاف حسین، مسدس حالی، صدی اڈیشن، مرتبہ ڈاکٹر سید عابد حسین، دہلی: حالی پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۳۵ء۔

عبداللہ، ڈاکٹر سید، مرتبہ، ارمغان علمی، لاہور: مجلس ارمغان علمی، ۱۹۵۵ء۔

پبلک رپورٹ:

مہدی علی خاں، نواب محسن الملک مولوی سید، روئداد محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس، علی گڑھ: مطبع احمدی، ۱۹۰۴ء۔

انسائیکلوپیڈیا، لغت وغیرہ:

اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد۴، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۵۹ء

نیز، نورالحسن، نوراللغات، جلد۴، لکھنؤ: اشاعت العلوم پریس، ۱۹۳۱ء۔

غیر مطبوعہ مقالہ:

ڈاکٹر میمونہ، بمبئی میں اردو، پی ایچ ڈی کا غیر مطبوعہ مقالہ بمبئی یونیورسٹی، ۱۹۶۱ء۔

رسالہ و اخبار:

اورینٹل کالج میگزین، لاہور، جلد۲۴، (۴۸۔۱۹۴۷ء)۔

معارف، اعظم گڑھ، جلد۱۹ (۱۹۲۶ء)۔

اودھ اخبار، لکھنؤ، جلد۳۷ (۱۸۹۵ء)۔

ذاتی خطوط، سوالنامہ وغیرہ:

مہر، مولانا غلام رسول، لاہور، مکتوب (مکاتیب) بنام مؤلف (مرتب مضمون نگار)، مورخہ یکم ستمبر ۱۹۵۷ء۔

صدیقی، ڈاکٹر عبدالستار، الہ آباد، جواب سوالنامہ مرتبہ مؤلف (مرتب، راقم مضمون)۔

اشاریہ:

کتابیات کی طرح اشاریہ بھی علمی و تحقیقی کتابوں میں لازمی طور پر ہونا چاہیے۔ اس کی وجہ سے محقق کو فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ کتاب میں اس کے کام کی چیز یا چیزیں ہیں یا نہیں۔ اس طرح وہ پوری کتاب کی ورق گردانی سے بچ جاتا ہے۔ اشاریہ کا مقصد اشخاص، مقامات وغیرہ کے نام گنانا نہیں ہے بلکہ ان سے متعلق کتاب میں کوئی (اطلاع یا اطلاعات بہم پہنچائی گئی ہوں۔ اگر کتاب ضخیم ہے تو اشاریہ کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ اشخاص کے نام

۲۔ مقامات کے نام

۳۔ کتابوں کے نام

اشاریہ کا انحصار دراصل موضوع یا مضمون کتاب پر ہے۔ مثلاً کتاب باغبانی کے موضوع پر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں پودوں اور پھولوں کا ذکر کثرت سے ہوگا۔ اس لیے ان کا اشاریہ بنانا ہوگا۔ کتاب میں پرندوں کا ذکر کثرت سے ہوا ہے تو ان کا بھی اشاریہ بنایا جائے۔ تاریخ کی کتاب میں اہم واقعات کا بھی اشاریہ ہوگا۔ مختصراً یوں کہا جاسکتا ہے کہ اشاریہ کتاب کے متن کے مطابق ہونا چاہیے، یعنی جن جن چیزوں کا ذکر زیادہ ہوا ہے ان کا اشاریہ بنایا جائے۔

موجودہ دور میں اشاریہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور یہ بھی ہے حقیقتاً نہایت مفید اور کام کی چیز۔ اس سے عام قاری کو بھی فائدہ پہنچتا ہے اور تحقیق کرنے والے کو بھی، خصوصاً نئے محقق کو۔ اس کے ذریعہ اس کی راہ نمائی بھی ہوتی ہے اور وقت بھی بچتا ہے۔ اس لیے اشاریہ بہت محنت اور دلچسپی سے تیار کرنا چاہیے اور جتنے اہم موضوع کتاب میں ہوں، سب کا اشاریہ بنانا چاہیے۔

❖❖❖❖

مبادیات تحقیق، عبدالرزاق قریشی، بمبئی، ادبی پبلشرز، ۱۹۶۸ء، ص ۵۳ تا ۶۷۔

حواشی

(۱) A.H.Cole and K.B.Bigelow کتاب مذکورہ، باب۲،ص۲۲۔

(۲) C.V.Good and D.E.Scates کتاب مذکور، باب۱،ص۸۳۳۔

(۳) C.V.Good and D.E.Scates کتاب مذکور، باب۱،ص۸۷۷۔

(۴) F.L.Lucas Style، باب۱۱،ص۲۳۲۔

(۵) خواجہ الطاف حسین حالی، حیات سعدی، دوسرا باب،ص۸۹۔

(۶) Notes on the Presentation of Theses on Literary Subjects ص:۳۔

(۷) F.L.Lucas، کتاب مذکور، باب۲،ص۶۵۔

(۸) ایضاً،ص۷۳۔

(۹) ایضاً،ص۸۷۔

(۱۰) F.L.Lucas، کتاب مذکور، باب۴،ص۸۸۔

(۱۱) ایضاً۔

(۱۲) The Problem of Style. Middleton Murry باب۴،ص۶۶۔

(۱۳) F.L.Lucas، کتاب مذکور باب۳،ص۵۵۔

(۱۴) ایضاً،ص۶۲۔

(۱۵) ایضاً،ص۵۵۔

(۱۶) خواجہ الطاف حسین حالی، حیات سعدی، دوسرا باب،ص۷۹۔

(۱۷) C.V.Good and D.E.Scates کتاب مذکور، باب۱۰،ص۸۷۶۔

(۱۸) F.L.Witney، کتاب مذکور، باب۱۶،ص۴۱۷۔

(۱۹) (مولانا) شبلی، شعر العجم، طبع سوم، جلد چہارم، باب اول،ص۷۳۔

(۲۰) بشیر احمد ڈار، ''حکیم کون فیوشس اور چینی فلسفۂ اخلاق''، حکمائے قدیم کا فلسفۂ اخلاق،ص۱۴۔

(۲۱) C.V.Good and D.E.Scates، کتاب مذکور، باب۱۰،ص۸۷۶۔

(۲۲) C.B.Williams and A.H.Stevenson کتاب مذکور، ترمیم شدہ ایڈیشن، باب۸،ص۱۱۹،۱۲۰۔

(۲۳) Notes on the Presentation of Theses on Literary Subjects ص۴۔

❖❖❖❖

تدوین اور تحقیق کے رجحانات

رشید حسن خان

اس مضمون کا مقصد یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد تحقیق اور تدوین میں جو رجحانات نمایاں ہوتے ہیں، اختصار کے ساتھ ان کا جائزہ لیا جائے۔ ایک جگہ ضمناً ۱۹۴۷ء سے پہلے کا بھی ذکر آ گیا ہے اور یہ محض اس وجہ سے ہوا ہے کہ اس کے بغیر بعض باتوں کی وضاحت مشکل تھی۔ اصل مضمون سے پہلے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تدوین اور تحقیق، ان دونوں الفاظ کی کچھ وضاحت کر دی جائے۔

حقائق کی بازیافت، صداقت کی تلاش، حقائق کا تعین اور ان سے نتائج کا استخراج ادبی تحقیق کا مقصود ہے یا ہونا چاہیے۔ تدوین یعنی متن کی تصحیح و ترتیب، اس سے الگ چیز ہے، جس کے اپنے مسائل و مطالبات ہیں۔ تحقیق اور تدوین بجائے خود دو مستقل موضوع ہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کی حدیں کہیں کہیں مل جاتی ہیں۔ تحقیق کا لفظ عام طور سے ان دونوں پر حاوی سمجھا جاتا رہا ہے، مگر یہ اچھا خاصا خلط مبحث ہے۔

اگر ایک شخص صحیح طریقے سے حقائق کا کھوج لگانے، مناسب انداز سے واقعات و ترتیب دینے اور خالص منطقی ڈھنگ سے نتائج نکالنے کی صلاحیت رکھتا ہے، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ متن کو بھی پورے آداب کے ساتھ مرتب کر سکتا ہے۔ اس سے اس کی تحقیقی صلاحیت پر حرف بھی نہیں آتا۔ تحقیقی کام کرنے والے کے لیے یہ لازم نہیں کہ وہ ترتیب متن پر بھی اسی طرح دسترس رکھتا ہو، البتہ تدوین کا کام کرنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کو آداب تحقیق سے بھی اسی قدر واقفیت ہو اور لگاؤ بھی ہو۔ اس کے بغیر، تدوین کے تقاضوں کو پورا نہیں کیا جا سکتا۔ حواشی، مقدمہ، متن کا زمانہ تصنیف، مصنف اور اس کے عہد سے متعلق ضروری معلومات، داخلی شواہد کا تعین اور ایسی بہت سی متعلقہ باتیں ہوں گی جن سے ایسا کوئی شخص عہدہ برآ نہیں ہو سکتا جو تحقیق سے کما حقہ، آشنا نہ ہو اور طبعاً اس سے مناسبت نہ رکھتا ہو۔ جو شخص تحقیقی مزاج نہیں رکھتا، وہ تدوین کا کام انجام نہیں دے سکتا۔ ہمارے سامنے تدوین کے جو اچھے نمونے ہیں، ان کو دیکھ کر بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تدوین کے لیے اصول تحقیق سے پوری طرح واقف ہونا، اس کا عملی تجربہ اور تحقیقی مزاج کیوں ضروری ہے۔ اس لحاظ سے تدوین، تحقیق سے آگے کی منزل ہے۔ اس مضمون میں تدوین اور تحقیق کے الفاظ اسی امتیاز کے ساتھ استعمال کیے گئے ہیں۔ مضمون کے پہلے حصے میں تدوین سے متعلق اور دوسرے حصے میں تحقیق سے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔

اس زمانے میں تدوین کی ضرورت اور اس کی اہمیت کا احساس عام ہوا ہے۔ اس بات کو بھی محسوس کیا گیا کہ تحقیق کی طرح، اس کے بھی مخصوص مسائل، آداب اور ضابطے ہیں۔ ورنہ اس سے پہلے کچھ یہ خیال دلوں میں بیٹھ گیا تھا کہ تحقیق اصل چیز ہے اور تدوین، اسی کی ایک شق ہے۔ اس کو نسبتاً معمولی کام سمجھا جاتا تھا۔ مختصر یہ کہ تحقیق کے مقابلے میں اس کی حیثیت ضمنی اور ثانوی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شیرانی صاحب کے کارناموں میں تنقید شعر العجم کا جس انداز سے ذکر کیا جاتا تھا مجموعہ نغز کا نام اس انداز سے نہیں لیا جاتا تھا اور خالق باری کا ذکر محض اس کے تحقیقی حصے (مقدمے) کی بنا پر کیا جاتا تھا، تصحیح متن کی اہمیت ذہن میں نہیں آتی تھی۔ گویا خالق باری پر جو مقدمہ لکھا گیا ہے (جس میں امیر خسرو سے اس کے انتساب کو غلط بتایا گیا ہے) وہ تو سب کچھ ہے اور اس کے متن کی ترتیب و تنقید میں جو جگر کاوی کی گئی ہے، وہ اس سے کم درجے کی چیز ہے۔

اب اس بات کو بھی عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ جب تک قدیم متنوں کو، اصول تدوین کی مکمل پابندی کے ساتھ مرتب نہیں کیا جائے گا اس وقت تک نہ تو تحقیق کی بہت سی گتھیاں سلجھیں گی اور نہ زبان کے ارتقا کا بالکل صحیح سلسلہ سامنے آ سکے گا۔ اس زمانے میں لسانی مباحث کی طرف خاص طور پر توجہ کی جانے لگی ہے، لسانیات کو ایک مستقل فن کی حیثیت سے ضروری حیثیت دی گئی ہے اور لسانی جائزوں کے لیے صحیح متنوں کا ہونا لازم ہے ورنہ غلط اندیشوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوگا۔ لسانیات اور صوتیات کے فروغ نے بھی اس زمانے میں تدوین کی اہمیت کو نمایاں کیا ہے۔ اہمیت کے ساتھ اس کی ناگزیر ضرورت کو بھی۔

ایک جدید مفصل لغت کی کمی کا احساس بھی بڑھا ہے اور اس احساس نے بھی تدوین کی طرف ذہنوں کو بطور خاص متوجہ کیا ہے۔ یہ بات کہی جانے لگی ہے کہ اگر سودا، میر، میر حسن اور ایسے ہی دوسرے اہم شعرا کے دواوین کو اور اسی طرح اہم نثری تصانیف کو صحیح طور پر مدون نہیں کیا گیا، تو لغت کیسے تیار ہوگا؟ یہی ہوگا کہ مختلف نسخوں میں سے جو نسخہ جس کے ہاتھ لگ جائے وہ اس کے مندرجات کو نقل کرتا رہے۔ یہ دیکھے بغیر کہ وہ مندرجات مصنف کے ہیں یا کاتب اور ناقل کے۔ یہی

صورت صرفی یا نحوی مباحث کی ہے۔ صحیح متن سامنے نہ ہوں تو ایسے مباحث کے سلسلے میں کوئی بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی اور یہی حال تذکیرہ و تانیث اور متروکات کی بحثوں کا ہے۔ لغت، قواعد اور تذکیر و تانیث (وغیرہ) کے مباحث کی طرف جس نسبت کے ساتھ ذہن منتقل ہوتے گئے ہیں، اسی نسبت سے صحت کے متن کے مسائل بھی سامنے آتے گئے ہیں اور تدوین کی ضرورت کا احساس بڑھتا گیا ہے۔

یہ مسلمات میں سے ہے کہ مستند نسخے کو مآخذ بنائے بغیر، کسی اقتباس کو اس اعتماد کے ساتھ نہیں پیش کیا جا سکتا کہ اس سے جو نتیجہ نکالا گیا ہے، وہ درست ہے۔ اس احساس نے صحت متن کی اہمیت کو ذہن نشین کیا۔ اس زمانے کا یہ قابل ذکر رجحان ہے، جس نے تدوین کی مستقل اور منفرد حیثیت کو تسلیم کرایا۔ محض یادداشت یا سماعت پر بھروسا کر کے اشعار پیش کر دینا یا کسی بھی سہل الحصول ثانوی مآخذ سے عبارتوں کو نقل کر دینا عام بات تھی۔ (اس کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں) تحقیق کے فروغ نے احتیاط کی عادت پیدا کی اور اعتراض کرنا سکھایا اور اس بات کو ضروری سمجھا جانے لگا کہ شعر ہو یا عبارت، اس کو معتبر ترین مآخذ سے منقول ہونا چاہیے۔ اس طرح مآخذ کی حقیقی اہمیت نمایاں ہوئی۔ حوالہ اصل مآخذ سے منقول نہیں، تو پیش کرنے والا کتنا ہی معروف شخص ہو اور کتنا ہی پڑھا لکھا ہو، اس کو قبول نہیں کیا جاتا ہے۔ اس طرح اہم بات یہ ہوئی کہ "شخص" کے بجائے، مآخذ کو اہمیت حاصل ہوئی ورنہ اب سے پہلے شخص کی اہمیت کا زیادہ عمل دخل رہا کرتا تھا۔

شخص کی طرح، ذوق کا مسئلہ بھی بہت اہم رہا ہے۔ جس چیز کو ذوق کہا جاتا ہے اور جو پسند و ناپسند کے ذاتی معیار کا دوسرا نام ہے: اس کی کارفرمائی کا دائرہ وسیع رہا ہے۔ خصوصاً شاعری میں یہ شاید سب سے زیادہ پریشان کن چیز رہی ہے تدوین و تحقیق کے سلسلے میں۔ انسانی ذہن کچھ اس طرح ایمان لے آتا ہے اپنے ذوق اور اپنی یادداشت پر کہ چھان بین کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ مفروضہ پسندیدہ شکل کے خلاف کچھ کہا جائے تو ذہن اس کو قبول کرنے کی طرف بہ آسانی مائل نہیں ہو پاتا۔ اس کے اثرات ہماری کتابوں میں اور مضامین میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اشعار کے متن میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان میں سے اکثر اسی فریب خوش مذاقی کا کرشمہ ہیں۔ تدوین کو تقاضائے خوش مذاقی سے علاقہ نہیں۔ کتنا ہی بڑا شخص کیسے ہی پُر زور انداز سے ذوقِ سخن یا خوش مذاقی کی وکالت کرے یا اس کی رعایت کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے، لیکن اس کی اس خوش گفتاری کو کسی بھی طرح قابل قبول نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اب سے پہلے اس بات کو اس صفائی اور قطعیت کے ساتھ تسلیم نہیں کرایا جا سکتا تھا اور اب شخص یا ذوق، دونوں کی تنقید میں نہ جھجک محسوس ہوتی ہے، نہ تکلف ہوتا ہے اور نہ اس کو خلاف وضع داری یا خلاف حدِ ادب سمجھا جاتا ہے۔

تحقیق اور تدوین میں جو فرق ہے، وہ جس طرح نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا: اس سے ایک یہ نقصان بھی پہنچا کہ تحقیق کے مسائل اور آداب پر تو کچھ نہ کچھ لکھا گیا، لیکن تدوین کے مسائل اور ضابطے تشنۂ بیان رہے۔ چونکہ ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے اس کے مسائل اور طریقۂ کار پر گفتگو نہیں کی گئی، اس لیے ان ذمے داریوں کا بھی عام طور پر اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا جو مدون پر عائد ہوتی ہیں اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تدوین کو نسبتاً آسان کام سمجھ لیا گیا تھا (اس وہم نے بہتوں کو گناہ گار کیا ہے)۔ پندرہ بیس سال کے عرصے میں اس طرف بطور خاص توجہ کی گئی ہے۔ اگرچہ ابھی تک اس موضوع پر کوئی ایسی تصنیف سامنے نہیں آئی ہے جس میں سارے مسائل کا احاطہ کر لیا گیا ہو، لیکن مختلف مضامین اور بعض تبصروں میں جو اس پہلو کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے؛ ان سب کی مدد سے ایک خاکہ سا ضرور بن گیا ہے۔

اس زمانے میں قدیم کتابوں کو مرتب کرنے کی طرف کچھ زیادہ توجہ کی گئی ہے۔ لیکن ان میں ایسی کتابیں کم بلکہ بہت کم ہیں جن کو بلحاظ اصول تدوین، معیاری کہا جا سکے۔ بیشتر کام گھٹیا درجے کا ہے۔ صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ اکثر مرتبین تحقیقی مزاج سے محروم ہیں، اس کے ساتھ ساتھ ضروری معلومات سے بھی تہی داماں ہیں اور ان دونوں سے بڑھ کر یہ کہ دیانت کے قائل نہیں معلوم ہوتے۔ زندگی کے اور شعبوں میں جس طرح کاموں کو جلد سے جلد نپٹانے کا رجحان پیدا ہوا ہے اور آسان پسندی نے ذہنوں پر جس طرح قبضہ جمایا ہے، اس نے اس قدر جری بنا دیا ہے کہ لوگ شرائط کو پورا کیے بغیر، کام کرنے کو برا نہیں سمجھتے اور نہ اس پر پشیمان ہونے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اس کے بنیادی اسباب دو ہیں: معلومات کی کمی، بددیانتی۔ باقی اثرات انھی دو اسباب میں سے کسی ایک سبب کے پیدا کیے ہوئے ہوتے ہیں۔

تدوین کے لیے، جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، مزاج کا تحقیق آشنا ہونا ضروری ہے۔ اس کے بعد، یہ ضروری ہے کہ تدوین کی شرائط سے اور اس کے اصولوں سے آدمی کما حقہ، واقف ہو اور عملی مسائل سے بھی کم آشنا نہ ہو۔ یعنی اسے یہ معلوم ہو کہ تدوین کا طریقہ کیسا ہے، صحت متن کا مفہوم کیا ہے، اختلافِ نسخ کا مطلب کیا ہے اور ایسے ہی دوسرے متعلقات۔ وہ زبان، قواعد زبان، قواعد شاعری (وغیرہ سے بھی) بہ خوبی واقف ہو۔ فارسی اچھی طرح جانتا ہو۔ جس عہد کی تصنیف کو مرتب کرنا چاہتا ہے، اس عہد کی زبان کا خاص طور پر اس نے مطالعہ کیا ہو۔ اس کے علاوہ، اس عہد کے عام مصنفین کے کلام کا مفصل مطالعہ کیا ہو اور اس طرح کہ اس

عہد کے مصنفین کے یہاں زبان و بیان کی جو خصوصیات پائی جاتی ہیں، وہ سب سامنے آجائیں۔ خاص طور پر یہ کہ لفظوں کے استعمال، جملوں کی ترکیب، تذکیر و تانیث اور متروکات کے لحاظ سے اس خاص مصنف اور پھر اس کے ہم عصروں کے یہاں، خاص خاص الفاظ کے متعلق کیا خاص باتیں ملتی ہیں، کیا طرزِ عمل تھا ان لوگوں کا۔ املا کے مسائل سے اچھی طرح باخبر ہو۔ یہ واضح کر دیا جائے کہ باخبری سے مراد یہ نہیں کہ سنی سنائی پر قناعت کی جا چکی ہو۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ تدوین کا کام کرنے والے اکثر حضرات ان امور سے بے خبر ہوتے ہیں اور ان میں سے ایسے لوگ تو کم تر ہوتے ہیں جن کو تحقیق سے مناسبت طبعی ہو اور اس کے حدود سے بھی واقف ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں تدوین کی ضرورت پر تو بہت گفتگو کی گئی ہے، مگر عملی سطح پر اُس کی بہت کم اچھی مثالیں سامنے آپائی ہیں اور برے نمونوں کی بہتات ہے۔ پریشانی کی بات یہ ہے کہ صورتِ حال کچھ ایسی بنتی جارہی ہے کہ اگر یہی کم معیاری، آئندہ معیاری بن جائے تو کچھ زیادہ تعجب نہیں ہوگا۔

معلومات کی کمی، بڑی رکاوٹ ہوتی ہے اچھے کام کے راستے میں لیکن اس سے بھی زیادہ بڑی رکاوٹ ہے، ایمان داری کا مسخ شدہ تصور۔ معلومات سے بہرہ ور ہونے کے باوصف، اگر دیانت کی روشنی سے آنکھیں محروم ہوں، تو سب کچھ بے کار ہے، کبھی اچھا کام نہیں ہو سکتا۔ تحقیق ہو یا تدوین، ان کو جب دوسرے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا جائے گا تو معیار تباہ ہو جائے گا اور علمی طریق کار، غارت گری یا سوداگری کے آداب میں تبدیل ہو جائے گا۔ اس زمانے میں یہ رجحان بہت بڑھا ہے کہ تدوین یا تحقیق کو مادی فوائد کے حصول کا ذریعہ بنایا جائے ظاہر ہے کہ اس صورت میں اندازِ فکر کو بدل جانا چاہیے اور علمی معیار کو ثانوی سے بھی کم حیثیت اختیار کر لینا چاہیے۔ یہ اس زمانے کا سب سے زیادہ تباہ کن لیکن عام پسند رجحان ہے۔

وہ جو کہتے ہیں کہ کریلا اور نیم چڑھا، سو مزید تباہ کن صورت یہ پیدا ہوئی ہے کہ بعض سرکاری یا نیم سرکاری اداروں کی طرف سے مالی امدادوں نے کچھ لوگوں کے لیے بوالہوسی کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ دس پندرہ سال کے عرصہ میں ایسی امدادوں کو حاصل کرنے کے لیے یا پھر ان کا حساب چکانے کے لیے، بہت سے کام کیے گئے ہیں۔ کچھ کتابیں بھی مدون کی گئی ہیں اور ایسی بیش تر کتابیں ہر لحاظ سے خدر درجہ پست ہیں۔ صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ کام کو کیا نہیں گیا ہے، بھگتایا گیا ہے۔ اس حصول امداد کے پھیر میں ان لوگوں نے بھی تحقیق و تدوین کے کوچے میں قدم رکھا ہے، جو نا آشنائے رسم و رہ منزل ہیں۔ اسے طواف کوے ملامت کہیے۔ غرض یہ کہ امدادوں کے سہارے پر تیار کی گئی ایسی کتابیں، تدوین کے بدترین نمونوں کی حیثیت رکھتی ہیں اور یہ کتابیں علم و ادب کو مال تجارت بنا دینے والوں کے کرتبوں کے اشتہارات ہیں۔ اچھے خاصے مردِ معقول اس میں کچھ قباحت نہیں سمجھتے کہ چند ہزار روپوں کی خاطر، تحقیق و تدوین کی بے حرمتی پر آمادہ ہو جائیں۔

اس رجحان نے آسان پسندی کو بہتوں کا مستقل رفیق بنا دیا ہے اور بد دیانتی کو مزاج میں شامل کر دیا ہے۔ کام کرنے کی سچی لگن، جس سے ریاضت کی امنگ پیدا ہوتی ہے، اس صورت میں پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ البتہ ہوتا ہے کہ ریاضت کے معنی بدل جاتے ہیں اور آسان پسندی اس کے مترادف کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ اس آسان پسندی نے اپنے آپ کو کئی صورتوں میں نمایاں کیا ہے۔ ان میں سے دو صورتیں بہ طور خاص قابل ذکر ہیں:

الف: تدوین کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ کسی متن کے جتنے اہم نسخے ممکن الحصول ہوں، ان سب سے استفادہ کیا جائے۔ اس کے بغیر تدوین کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ یہ صبر آزما کام ہے۔ اس سلسلے میں عجلت پسندی اور آسان طلبی، دونوں سے قطع تعلق کرنا پڑے گا۔ لیکن ایمان داری کے معنی بدل چکے ہوں اور آسان پسندی کی رفاقت حاصل ہو تو اس صورت میں مجرمانہ ذہانت، کئی عذر تراش لے گی اور صرف ایک نسخے یا محض سہل الحصول نسخوں پر قناعت کے فائدے ذہن نشین کرانا چاہے گی۔ اس طرح ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا جواز نکل آئے گا۔

(ب) دوسرا سستا نسخہ یہ ہے کہ متن تو بُرا بھلا جیسا بھی ہو، ٹھیک ہے: اس پر ایک مقدمہ ایسا لکھ دیا جائے جس میں تحقیق سے زیادہ، سماجی پس منظر اور تجزیے کے بجائے، انشا پردازی ہو۔ انداز نگارش ایسا پر فریب ہو جیسے اس شخص نے برسوں آنکھوں کا تیل ٹپکایا ہے کتاب کی تصحیح و ترتیب میں اور حال یہ ہو کہ مقدمے میں بھی جو کچھ کہا گیا ہو، اس کا بیشتر حصہ، مانگے کا اجالا ہو، متن تو لوگ بعد کو دیکھیں گے، جو لوگ پڑھیں گے تو ان میں سے بیشتر اس کے خاص مسائل سے واقف کب ہوں گے۔ مقدمہ سب کی سمجھ میں آجائے گا، بس، مقصد پورا ہو گیا۔ اب اسے آپ ہاتھ کی صفائی کہہ لیجیے یا استادی کا کرشمہ۔

اس زمانے میں قدیم نثری تصانیف کو مرتب کرنے کی ضرورت کے احساس کے ساتھ ساتھ، اس کی بھی ضرورت سمجھی گئی ہے کہ نسبتاً جدید تصانیف کو بھی آداب تصحیح و ترتیب کی پابندی کے ساتھ شائع کیا جائے۔ یہ رجحان بجائے خود مفید ہے، مگر اس سلسلے میں جو نئی صورت حال پیدا ہوئی ہے، اس کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ لازم نہیں کہ اچھا محقق یا مدون، اچھا نقاد بھی ہو، اگر چہ تنقیدی شعور اس کے یہاں کارفرما ضرور رہو گا۔ اب اگر غیر مناسب طور پر ان دونوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی جائے گی، تو اس کا قوی امکان رہے گا کہ مجموعی طور پر عدم توازن پیدا ہو جائے۔ ایسی کتابیں سامنے آئی ہیں جن کو بلحاظ تدوین خواہ برا نہ کہا جا سکے، مگر تنقیدی مقدمے نے پوری کتاب کو عدم تناسب کا مجموعہ بنا دیا ہے۔ کیونکہ مرتب کو تنقیدی مسائل سے اس قدر آگہی نہیں، اس کے مزاج کو

بھی اس سے بس یونہی سا ربط ہے اور قلم بھی ان کے آدابِ نگارش سے کم آشنا ہے۔

یہی صورت لسانی جائزے کی ہے۔ جس طرح یہ ضروری نہیں کہ مدون اُسی پائے کا ناقد بھی ہو، اُسی طرح یہ بھی لازم نہیں کہ وہ ماہرِ لسانیات بھی ہو۔ لسانیات ایک مستقل علم ہے۔ اُس کا حق وہی ادا کرسکتا ہے جو اس سے صحیح معنی میں باخبر ہو۔ اس بنا پر، لسانیات سے ناآشنا مرتب اگر اس کا التزام کرے گا کہ تدوین کے ساتھ ساتھ لسانیاتی جائزے پر بھی طبع آزمائی کی جائے تو وہ بھی اُسی غلطی کا مرتکب ہوگا۔ ایسے شخص کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ لفظیات، قواعد صرف ونحو، تذکیر و تانیث، متروکات اور انھی سے متعلق دوسری باتوں کا مفصل جائزہ پیش کر دے۔ یعنی قواعدِ زبان اور قواعدِ بیان تک اپنے جائزے کو محدود رکھے۔ ایک دو ایسی کتابیں بھی سامنے آئی ہیں جن کو مرتب کیا گیا محنت کے ساتھ، لیکن مرتب نے اپنی حدود کا لحاظ نہیں رکھا ہے یعنی لسانیات اور صوتیات سے پوری طرح باخبر نہ ہونے کے باوصف، اُن کے متعلقات پر بھی گفتگو کی ہے۔ ایسی کم احتیاطی دو غلطیوں کو نمایاں کر دیا کرتی ہے: ایک تو یہ کہ ایک ایسا غیر مناسب کام کیا گیا جس کو آدابِ احتیاط کے خلاف کہا جائے گا اور یہ خیال کیا جائے گا کہ مرتب، فرقِ مراتب سے اور ذمے داریوں کے حقیقی تصور سے کم آشنا ہے۔ عدمِ احتیاط کے ایسے احتمالات اگر کسی شخص کے ساتھ وابستہ ہوکر رہ جائیں تو اس کے علمی وقار اور اعتبار پر حرف آجاتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ لفظیات سے (لفظ شماری یا لفظی جائزہ) صرف ونحو اور دوسرے متعلق اور ضروری مسائل پر توجہ خود بہ خود کم ہو جائے گی۔ اس طرح ایک غیر متعلق پہلو پر زورِ طبع صرف کرنے سے، وہ حصہ بھی ناتمام رہ جائے گا جس کا حق ادا کیا جاسکتا تھا۔

ایسی کتابیں بھی دیکھنے میں آئی ہیں جن میں جائزۂ زبان کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے یا پھر بے حد ناتمام گفتگو کی گئی ہے۔ یہ دوسری انتہا ہے ان میں قابلِ ذکر ہیں، قدیم دواوین۔ اصل متن کو پورے آداب کے ساتھ مرتب کرنے کے ساتھ، اس کے متعلقات کو بھی تفصیل کے ساتھ قلم بند کرنا چاہیے۔ چونکہ مدون کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ زبان، قواعدِ زبان، قواعدِ بیان، قواعدِ شاعری اور اصلاحِ زبان کی مختلف تحریکوں سے بہ خوبی واقف ہو؛ اس لیے ایسا شخص اگر ان امور کو ناتمام چھوڑ دے گا یا نظر انداز کر دے گا، تو بہ صورت، اُس کتاب کو مجموعی حیثیت سے ناتمامی سے آلودہ کر دے گی اور مرتب کے متعلق بھی کچھ اچھی رائے قائم کرنا مشکل ہوگا۔

ہاں یہ ضروری ہے کہ جو کچھ لکھا جائے، وہ بجائے خود مکمل ہو۔ یہ نہ ہو کہ کچھ باتیں اِدھر اُدھر سے لکھ دی جائیں۔ ایسی بھی بعض کتابیں دیکھنے میں آئی ہیں جن میں مرتبین نے دو چار لفظوں کی تذکیر و تانیث کا ذکر کر دیا ہے، دو چار جگہ سے چار چھ جملے لے کر، مبتدا خبر اور فاعل مفعول کے نام گنا دیے ہیں اور دو چار باتیں بعض الفاظ کے محلِ استعمال کے متعلق لکھ دی ہیں۔ یہ بھی جرم ہے۔ کام بالکل نہ کیا جائے تو ایک عیب ہوا لیکن ناتمام کام کو سو عیبوں کا مجموعہ سمجھا جائے گا۔

(۲)

اس زمانے میں اہم ترین بات یہ ہوئی کہ تحقیق کی اہمیت کا اور اس کی ضرورت کا احساس بڑھا۔ سمجھا یہ جاتا تھا کہ جن سے کچھ اور نہیں ہو پاتا، وہ یہ گورکنی کیا کرتے ہیں۔ یہ خیال بھی ذہنوں میں رہا کرتا تھا کہ تنقید کے مقابلے میں تحقیق کم درجے کی چیز ہے۔ اب سے پہلے اس بات کا یقین دلانا بہت مشکل تھا کہ تحقیق کے فراہم کیے ہوئے مواد اور اس سے نکالے ہوئے نتائج اور اس کے متعین کیے ہوئے حقائق کو سامنے رکھنا اکثر صورتوں میں تنقید نگار کے لیے لازم ہوگا اور اُس کے بغیر کچھ کہا جائے گا تو وہ قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ اب اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا گیا ہے کہ تحقیق کا کام بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ حقائق اور شواہد کا تعین تحقیق ہی کرے گی اور ناقد کے لیے لازم ہوگا کہ وہ ان کو ملحوظ رکھے اس دائرے کی حد تک نقاد، تحقیق کا احترام کرنے اور اس کو بنیادی چیز سمجھنے پر مجبور ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ بہت سے موضوعات پر تنقید، تحقیق کی مدد کے بغیر کچھ نہیں کرسکتی اور اس کا مطلب یہ ہے کہ متعین حقائق سے آگاہی کے بغیر اور ان کو بنیاد بنائے بغیر، تنقیدی سطح پر قابلِ قبول نتائج کو پیش نہیں کیا جاسکتا۔ ہوا میں گرہ لگانا اور ریت پر دیوار کھڑی کرنا، دوسری بات ہے۔

مثال کے طور پر عرض کروں گا کہ اگر کوئی شخص، غالب کی کتاب مہر نیمروز کے مندرجات کی بنا پر یہ دعویٰ کرے کہ اُن کے یہاں تاریخ نویسی کا شعور بھی کار فرما تھا اور اس مفروضے کو بنیاد بنا کر، بہ حیثیت تاریخ نگاران کے مرتبے کا تعین کیا جائے اور اُن کے علم و آگہی کے متعلق سخن طرازی کے جوہر دکھائے جائیں، تو یہ مطالبہ کیا جائے گا کہ پہلے اس کتاب سے متعلق سارے حقائق کا تعین کیا جائے۔ یہ دیکھا جائے کہ یہ غالب کی تصنیف ہے یا وہ دوسروں کے فراہم کیے ہوئے مواد کو اپنی عبارت میں لکھنے کے ذمے دار ہیں۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ غالب محض عبارت آرائی کے ذمے دار ہیں، تاریخی مواد دوسروں نے فراہم کیا ہے تو اس صورت میں ان کا تاریخ نویس ہونا ناقابلِ قبول قرار پائے گا اور جن لوگوں نے غالب کے تاریخی شعور کے متعلق گل افشانیاں کی ہوں گی، اُن سب کو ہوا میں گرہ لگانے کے مترادف قرار دیا جائے گا۔ (اس طرح کی گل افشانیاں کی جاچکی ہیں)۔

میں اپنے مفہوم کی وضاحت کے لیے ایک اور مثال پیش کرنا چاہوں گا۔ باغ و بہار کو میر امن کا شاہکار کہا جاتا ہے، لیکن سوال یہ ہے، کہ کس لحاظ سے؟

دوسرے الفاظ میں یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ کیا میر امن اس قصے کے خالق تھے۔ انھوں نے پہلے سے موجود مختلف اجزاء کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ حسن ترتیب نے پرانے قصے میں نیا پن پیدا کر دیا یا وہ محض مترجم تھے اور ان کا سارا کمال محض انداز بیان کی حد تک محدود ہے۔ جب تک اس بنیادی سوال کا فیصلہ نہ ہو جائے اس وقت تک اس سلسلے میں کوئی رائے نہیں قائم کی جاسکتی۔ اب یہ دیکھا جاتا ہے کہ متعدد حضرات نے اس اہم ترین سوال سے سروکار رکھے بغیر، بہت سی باتیں کہی ہیں۔ کوئی صاحب میر امن کو داستان گو مانتے ہیں، کوئی صاحب ان کو اچھا قصہ گو سمجھتے ہیں اور باغ و بہار میں جن چیزوں اور جن باتوں کا بیان آ گیا ہے، اُن کی بنا پر میر امن سے اور بھی بہت کچھ منسوب کیا جاتا ہے لیکن ایسی کوئی بات بھی اُس وقت تک قابل تسلیم نہیں جب تک کہ تحقیق کے نقطۂ نظر سے بنیادی امور کا فیصلہ نہ کر لیا جائے۔ میر امن نے صراحت کی ہے کہ نو طرز مرصع اور فارسی کا قصۂ چہار درویش، دونوں اُن کے پیش نظر رہے ہیں، اب پہلے یہ طے کیا جانا چاہیے کہ کیا باغ و بہار، میں کچھ ایسے عناصر موجود ہیں جو اُن دونوں میں نہیں ملتے اور جن کو واقعتاً 'میر امن' کا اضافہ کہنا چاہیے؟ اس لیے یہ ضروری ہوگا کہ پہلے کوئی شخص متعلقہ نسخوں کا مقابلہ کرے اور مکمل جائزہ لے کر، ایسے عناصر کا تعین کرے۔ اس تعین کے بعد اور اس کی بنیاد پر کچھ کہا جاسکتا ہے۔ جب تک یہ جائزہ مکمل نہ ہو، اس وقت تک اس سلسلے میں کوئی مثبت یا منفی دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔ نیز اب تک اس سلسلے میں جو دعوے کیے گئے ہیں، اُن میں سے کسی کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔

اس نے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ تنقید میں بغیر دلیل کے دعوے کرنے اور ایسے دعووں کی بنا پر مفروضہ نتائج نکالنے کا جو رجحان نشو و نما پا رہا تھا، اُس کی ہمت شکنی ہوئی ہے۔ تنقید، تحقیق اور تدوین کی جو ناگزیر اہمیتیں ہیں اور ان اہمیتوں کے جو دائرے ہیں، ان کو کسی خیالی تفریق یا مفروضہ تقسیم کے بغیر، واقعی اہمیت کی روشنی میں دیکھا گیا اور یہ محسوس کیا گیا کہ ان میں ہر ایک بجائے خود اہم ہے اور ایک دوسرے کا معاون۔ ان میں تناسب کا تعلق ہے، تضاد کی نسبت نہیں اور پست و بلند کی اضافت کے ساتھ ان کو مقابل رکھنا، گمراہی ہے۔

ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ تحقیق میں استخراج نتائج کی اہمیت پر زور دیا گیا۔ عام طور سے اس بات پر اتفاق کیا گیا کہ تحقیق میں اعداد و شمار اور مطلق حقائق کا تعین بنیادی چیز ہے، لیکن یہی سب کچھ نہیں، یہ اس کا ابتدائی حصہ ہے، بے حد اہم، بے حد ضروری، لیکن اہم کام یہ بھی ہے کہ جن حقائق کا تعین کیا گیا ہے اور جن حقائق کی بازیافت کی گئی ہے، دیکھا جائے کہ اُن سے کیا نتائج نکلتے ہیں اور اُن سے علم و آگہی میں کس نوعیت کا اضافہ ہوتا ہے۔

یہاں پر یہ صراحت ضروری ہے کہ اگر کوئی شخص صرف چند حقائق یا شواہد کا تعین کر دیتا ہے اور اس سے آگے کچھ نہیں کرتا، تو یہ بھی بجائے خود اہم ہے کیونکہ ایک دوسرا شخص جو استخراج نتائج کی زیادہ اچھی صلاحیت رکھتا ہے، وہ اس سے فائدہ اٹھا کر، دوسرے رُخ کی تکمیل کرے گا۔ کبھی کبھی صلاحیتوں کی کمی بیشی کا فرق بھی بعض ناتمامیوں کا باعث ہوا کرتا ہے، اس بات کو پیش نظر رہنا چاہیے اور اس سے بنیادی کام کی اہمیت کسی طرح کم نہیں ہوتی۔

استخراج نتائج کی طرف زیادہ توجہ مبذول ہونے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ سماجی اور سیاسی واقعات کے اثرات کی نشاندہی کی طرف بھی توجہ کی گئی اور سمجھا گیا کہ کسی مصنف کے ساتھ تنقیدی سطح پر انصاف کرنے کے لیے، صرف اُس کے ذاتی خالات سے واقفیت کافی نہیں، وہ جس زمانے میں تھا اور اُس کے گرد و پیش جو حالات چھائے ہوئے تھے اور وہ حالات جن خاص اسباب کا نتیجہ تھے، ان کا بھی جائزہ لیا جائے۔ اس کے لیے سب سے پہلے خالص تحقیقی انداز سے سارے واقعات کا بالکل صحیح صحیح تعین کیا جائے، پھر تحقیق کی روشنی میں، خالص منطقی انداز سے نتائج نکالے جائیں، تب تنقید اپنا کام شروع کرے۔

ہاں، اس کا اظہار بھی ضروری ہے کہ جس طرح برائی، ہر اچھائی میں اپنے کام کے عنصر تلاش کر لیا کرتی ہے اور ان عناصر کو چمکا کر، اُس کو اپنے ڈھب کی چیز بنانے کی کوشش کیا کرتی ہے، وہی بات یہاں بھی رونما ہوئی۔ ہوا یہ کہ سماجی یا سیاسی پس منظر کے نام سے ایک سستا اور آسان نسخہ یار لوگوں کے ہاتھ آ گیا۔ تحقیق کے لیے اولین شرط یہ ہے کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں، اس سے حقیقی معنی میں واقف بھی ہوں۔ یہ نہ ہو کہ دوسروں کی کہی ہوئی باتوں کو بغیر سوچے سمجھے دہرایا جائے یا اُن میں کچھ کتر بیونت کر کے، ایک نئے قالب میں ڈھال لیا جائے۔ اگر ایک شخص عہد میر یا عہد غالب کے سیاسی اور سماجی اثرات کی نشاندہی کر رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان موضوعات سے واقف بھی ہوگا اور اصل مآخذ سے کام لے کر، ایک خاکہ بنائے گا۔ لیکن ہوا یہ کہ تاریخ کی بعض معروف کتابوں کے نوٹس تیار کر کے یہ سمجھ لیا گیا کہ سیاسی اور سماجی پس منظر کو سمجھنے سمجھانے کا حق ادا کر دیا گیا۔ یہ طرز عمل آداب تحقیق کے منافی ہے۔ یہ اس زمانے کا سب سے زیادہ گمراہ کن رجحان یا انداز ہے اور ضروری یہ ہے کہ اس کی ہمت شکنی کی جائے۔

اس کی دوسری صورت یہ ہوئی کہ سماجی پس منظر پر اس قدر توجہ صرف کی گئی کہ اصل موضوع کا حق ادا نہیں ہو پایا۔ بہت سے تحقیقی مقالے اور کتابیں ایسی ملیں گی جن میں یہ مانگے کا اُجالا زیادہ سے زیادہ جگہ گھیرے ہوئے ہے اور مصنف یہ سمجھتا ہے کہ اگر سماجی پس منظر دکھا دیا تو پھر سب کچھ دکھا دیا۔ اصل موضوع کا حق ادا نہیں ہو پاتا اور جہاں تک اُس سیاسی پس منظر کا تعلق ہے، وہ تو محض نقل قول کا مجموعہ ہوا کرتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص ہر موضوع کا حق ادا کر سکے اور اس سے اُس

کے کام پر یا اُس کی شخصیت پر حرف بھی نہیں آتا۔ غلطی سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ جب تک سب کچھ نہیں ہوگا، اُس وقت تک کسی چیز کا حق ادا نہیں ہوگا۔ اگر ایک شخص صرف حقائق و واقعات کا تعین کر دیتا ہے تو اس نے اس موضوع کا حق ادا کر دیا۔ اب اگر اس کے اندر استخراج نتائج کی بھی صلاحیت ہے یا وہ سیاسیات و سماجیات سے بھی واقف ہے تو سبحان اللہ، نورٌ علیٰ نور۔ یہ درجہ تکمیل ہے۔ لیکن یہ لازم نہیں کہ خواہ صلاحیت ہو یا نہ ہو۔ ہر موضوع پر یا ہر عنوان پر خامہ فرسائی کی ضرور جائے۔

اصل میں بات ہوتی ہے فرصت اور صلاحیت کی۔ اگر کسی کے پاس اتنا وقت اور صلاحیت ہے کہ وہ ضروری مدت تک صبر کے ساتھ محنت کر کے اور اصل مآخذ کو پڑھ کر، سماجی اور سیاسی حقائق کا تعین کر سکے تب تو ٹھیک ہے۔ اگر اتنا وقت اور وقت کے ساتھ ساتھ صلاحیت موجود نہیں اور صلاحیت سے یہاں میری مراد تعلق خاطر سے ہے، یعنی کسی موضوع سے ذہن کی مناسبت اور اس سے دلچسپی، تو پھر اس پھیر میں نہیں پڑنا چاہیے۔

اس زمانے میں علاقائی ادب کی شیرازہ بندی کی ضرورت کو بھی محسوس کیا گیا۔ مختلف علاقے اور شہر، زبان و ادب کی ترقی کے اہم مرکز رہے ہیں۔ ان علاقوں اور شہروں میں جس ادب کی تخلیق ہوئی، اس میں علاقائی اثرات کی آمیزش ہے۔ یہ بات مسلم ہے کہ علاقائی ادب میں مخصوص ذخیرۂ الفاظ، علاقائی تہذیبی عناصر اور اندازِ بیان کے اہم نمونے محفوظ ہوتے ہیں۔ اگر اُردو کا اچھا لغت تیار کرنا مقصود ہو تو اس کو علاقائی زبان و ادب کے جائزے کے بغیر مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ ارتقائے زبان کے لحاظ سے بھی علاقائی اثرات کی اہمیت ہے۔ تاریخ ادب کی تکمیل تو علاقائی جائزے کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر اہم علاقوں کے ادیبوں اور شاعروں کی اہم تخلیقات کا جائزہ مکمل کر لیا جائے تو تاریخ ادب اور تاریخ زبان کے نقطۂ نظر سے یہ بڑا کام ہوگا۔ اس طرف خاصی پیش رفت ہوئی ہے، خصوصاً دکنیات پر سب سے زیادہ کام ہوا ہے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ علاقائی مصنفوں کے ساتھ اسی صورت میں انصاف کیا جا سکتا ہے، جب پہلے علاقائی سطح پر اُن سے متعلق ساری ضروری معلومات کو یک جا کر دیا جائے اور پھر ان متعین حالات میں سے، ضروری اجزاء کو لے کر شامل کر لیا جائے۔ علاقائی جائزے کی تکمیل کے بغیر، متعدد اُمور میں تاریخ ادب کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکتا۔

یہ صحیح ہے کہ ایسے بیش تر جائزے جذباتیت اور جانب داری سے مبرا نہیں، لیکن اس سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ علاقائی ادب اب تک جس طرح نظر انداز رہا تھا، اس کا ردِ عمل کچھ تو ہونا ہی چاہیے تھا۔ اس کی امید رکھنا چاہیے کہ جلد ہی یہ خامی بھی نکل جائے گی اور پھر یہ بھی ہے کہ جو لوگ ان جائزوں سے کام لیں گے، وہ اس کا لحاظ رکھیں گے اور بڑھتا ہوا تحقیقی شعور بھی اس کی اصلاح کرتا رہے گا۔ ایک بار ابتدائی کام ہو جائے تو پھر اس کی چھان بین بھی آسانی کے ساتھ ہو سکے گی۔

ایک قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ اس زمانے، میں پہلے کے مقابلے میں زیادہ صفائی اور زیادہ شدت کے ساتھ احتساب کی ضرورت کو محسوس کیا گیا اور اُس پر عمل بھی کیا گیا۔ اس کا لازمی اثر یہ ہوا کہ شخصیتوں کا جادو ٹوٹا اور تحقیق و تدوین کی دنیا میں جھوٹی وضع داری اور مصنوعی حدِ ادب کے چلن کو غلط سمجھا گیا۔ اس لحاظ سے گویا تحقیق نے شیرانی صاحب کی روایت کو پھر سے زندہ کیا۔ جنھوں نے سب سے پہلے تحقیق کی سچائی کو، ساری وضع داریوں، مروتوں، مصلحتوں اور سخن گسترانہ اسالیب سے بالکل الگ رکھنے پر زور دیا تھا اور اس کے بہترین علمی نمونے پیش کیے تھے۔ درمیان میں یہ روایت کچھ مدہم پڑ گئی تھی، اس زمانے میں قاضی عبدالودود صاحب نے اُس کو پھر سے اور زیادہ اہتمام کے ساتھ زندگی نو بخشی اور اس انداز سے اس کو تازہ کیا کہ اب احتساب، ایک مستقل ضرورت اور ایک لازمی جز بن گیا ہے تحقیق و تدوین کی شریعت کا۔ احتساب کے اس بے لاگ انداز نے بے حد مفید کام انجام دیا ہے۔ اس کا سب سے بڑا اور مفید اثر یہ ہے کہ شخصیت کا جادو ٹوٹا۔ شخصیت کے بجائے کام کو دیکھا جاتا ہے اور اس ہر بات کو جانچے پرکھے بغیر محض کہنے والے کی ذات یا اُس کے مرعوب کن اندازِ بیان کی وجہ سے قابلِ قبول نہیں سمجھا جاتا۔

ظاہر ہے کہ احتساب سے خفیف الحرکاتیاں ختم نہیں ہو سکتیں، ہاں یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ اُن کو ہر صورت میں برا سمجھا جائے اور کسی تکلف کے بغیر برا سمجھا جائے۔ وہ مثال و معیار نہ بننے پائیں اور کوئی شخص ایک گھٹیا کام سے مادی فائدہ کتنا ہی اٹھا لے، ادب کی شریعت میں اُس کو قابلِ نفرین سمجھا جاتا رہے اور یہ ہوا ہے۔ اس سے بہت سے نئے لوگوں کی تربیت بھی ہوئی ہے اور ان کو عملی طور سے لفظ احتیاط کے صحیح صحیح معنی معلوم ہوئے ہیں۔

چور بازاری کا کاروبار کرنے والے کو یا کسی اسمگلر کو آپ برا کہیں یا اس کے راستے میں روڑے اٹکائیں تو ظاہر ہے کہ وہ اس کو برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ تو یہ ثابت کرے گا کہ وہ حق پر ہے۔ کچھ دن ہوئے میں نے ایک ناول میں ایک ایسے شخص کا حال پڑھا تھا جو افریقہ کے دور دراز علاقوں سے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو پکڑ کر، غلاموں کی حیثیت سے فروخت کیا کرتا تھا۔ اُس میں کشت و خون بھی ہوتا تھا۔ اُس نے ایک بار ایک اجتماع میں کہا تھا کہ لوگ مجھ کو خونی اور مجرم کہتے ہیں، لیکن یہ بے وقوف میرا احسان نہیں مانتے کہ میں نوجوانوں کو افریقہ کے تاریک علاقوں سے نکال کر، دنیا کے روشن اور مہذب حصوں میں بھیجتا ہوں۔ یہی صورت ہے اُن لوگوں کی جن کے گھٹیا کام اور غیر ایماندارانہ روش کا احتساب کیا جاتا ہے۔ ان لوگوں نے ایک اصطلاح وضع کی ہے۔ ''منفی اندازِ نظر'' اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ

غلط کام کو، غلط کہتے ہیں، وہ ادب کو نقصان پہنچاتے ہیں اور معقول لوگوں کے کام میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ یعنی جھوٹ بولنا اور تحقیق و تدوین کے نام پر تجارت تو تعمیری کام ہے، پرانے دواوین کو تدوین کے نام پر مسخ کرنا بھی تعمیری کام ہے، اور یہ کہنا کہ یہ باتیں غلط ہیں، تخریبی انداز ہے۔ لوگ غلط کام اور گھٹیا کام اس سے پہلے بھی کرتے تھے، لیکن اس پر ڈھٹائی سے اس طرح فخر نہیں کر پاتے تھے۔ یہ انداز خاص اسی زمانے کی پیداوار ہے کہ ادب و تحقیق کے نام پر ہر قسم کی بے عنوانی کی جائے گی اور اس پر ٹوکا جائے گا تو اس کو منفی انداز نظر اور تخریبی عمل کہا جائے گا۔

میرے ایک فاضل دوست نے ایک بار دوران گفتگو میں اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ اس زمانے کی ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ تنقید و تحقیق کا درمیانی فاصلہ کم ہوا ہے اور ان دونوں کی سرحدیں ملنے لگی ہیں۔ یہ بات اس حد تک تو صحیح ہے کہ اب تنقید نے تحقیق کی واقعی اہمیت کو محسوس کیا ہے، لیکن چونکہ بنیادی طور پر یہ دو مختلف موضوع ہیں، اس لیے ان میں اس طرح کی نزدیکی کبھی نہیں ہوسکتی کہ ان کی سرحدیں مل جائیں، جس دن ایسا ہوگا اس دن تحقیق پر حرف آجائے گا۔

بات یہ ہے کہ تنقیدی رائیں، تحقیق کے فراہم کیے ہوئے مواد پر مبنی ہوسکتی ہیں، لیکن تنقیدی سطح پر استخراج نتائج میں ہمیشہ اختلاف رائے رہے گا، کیونکہ تنقیدی سطح پر نتائج کا جس طرح تعین اور استخراج عمل میں آتا ہے، اس کا بڑا حصہ تعبیری ہوتا ہے اور مسلّم ہے کہ تعبیر کا اختلاف ہمیشہ کارفرما رہے گا اور اُسی کے اثرات سے ایک ہی بات کے متعلق مختلف ناقدین، مختلف زاویوں کا اظہار کرتے ہیں، جب کہ تحقیق میں اس طرح کے اختلاف کی گنجائش نہیں کیونکہ وہاں تعبیرات دخیل نہیں ہوتیں۔ تحقیق میں اختلافات، حقائق کے تعین پر ہوتے ہیں اور ان نتائج کے استخراج پر، جو غیر متعین حقائق کی بنا پر اخذ کیے گئے ہوں، اگر حقائق متعین ہیں، تو تحقیقی حدود کے اندر جو نتائج اخذ کیے جائیں گے وہ بھی متعین ہوں گے۔ جب اخذ نتائج میں تنقیدی تعبیر کا اثر شامل ہوگا تو اختلاف کی کرنیں پھوٹنا شروع ہوجائیں گی۔ یہیں سے تنقید و تحقیق کے راستے الگ ہوجاتے ہیں۔ اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ تنقید جن موضوعات کو اپناتی ہے اور جن امور کی نشاندہی کرتی ہے اور اس کے لیے جس اسلوب کو اختیار کرتی ہے۔ یہ سب چیزیں تحقیق کے دائرے سے باہر ہیں۔ نقاد اور محقق دو مختلف راہوں کے راہی ہوتے ہیں۔ نقاد تحقیق کے نتائج کے بغیر، بہت سی صورتوں میں اپنا کام انجام نہیں دے سکتا، لیکن محقق تنقید کے نتائج سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اس فرق کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ظن، قیاس، تعبیر، تاویل اور ذوق، یہ سارے اجزا تنقید کے لیے اہم حیثیت رکھتے ہیں، جب کہ تحقیق میں یہ اظہار احتمال کے سوا اور کسی کام نہیں آسکتے۔

یہاں پر ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا تدوین اور تحقیق کا سارا عمل دخل ۵۰ء کے بعد ہوا ہے اور کیا اس سے پہلے ایسے لوگ تھے ہی نہیں، جن کے کارنامے معیار کا کام دیتے اور اُن کے اثر سے تدوین و تحقیق کی طرف بالکل صحیح انداز سے توجہ منعطف رہتی؟ اور یہ کہ جن عناصر کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ وہ رجحانات ہیں جو ۴۷ء کے بعد نمایاں نظر آتے ہیں، کیا واقعی ایسا ہی ہے اور اس سے قبل ان کا اثر تھا ہی نہیں؟ اور اگر اُن کی کارفرمائی تھی، تو پھر ان کا اثر برابر اپنا کام کیوں نہیں کرتا رہا؟

اردو میں ادبی تحقیق کا آغاز بیسویں صدی کے آغاز سے ہوتا ہے اور کسی تکلف کے بغیر، شیرانی صاحب کو اُردو میں تدوین و تحقیق کا معلم اول کہا جاسکتا ہے۔ شیرانی صاحب نے قدیم مشرقی انداز تعلیم اور جدید مغربی انداز نظر دونوں سے فیض پایا تھا۔ مزاجاً ان کو تحقیق سے مکمل مناسبت تھی اور اُن کے یہاں وہ منطقی انداز نظر موجود تھا جس کے بغیر، انداز گفتگو میں صحت اور استخراج نتائج کا سلیقہ آ ہی نہیں سکتا۔ زود یقینی، آسان پسندی اور کم نظری سے انھیں گویا علاقہ نہیں تھا، نہ پرستاری وہم سے سروکار تھا۔ تحقیق اور تدوین دونوں موضوعات پر اُن کا بیش تر کام، مثال و معیار کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اگرچہ ان کے کام کی اہمیت اور افضلیت کو برابر تسلیم کیا گیا، لیکن عملی سطح پر مدت تک اُن کے طریقۂ کار کا اثر قبول نہیں کیا گیا۔ مستثنیات سے بحث نہیں، عمومی حیثیت سے یہی صورت حال رہی۔

اس کی ایک اہم وجہ بہ ظاہر یہ نظر آتی ہے کہ انیسویں صدی کا آخری حصہ اور بیسویں صدی کا ابتدائی حصہ، دراصل حالی و شبلی کا عہد تھا۔ اُس زمانے میں ادبیات کی دنیا میں ان دونوں کے اثرات شریک غالب کی حیثیت سے کارفرما رہے اور ان کے انتقال کے کچھ دن بعد تک یہ اثرات اسی طرح کام کرتے رہے۔ مولانا شبلی کی خوش مذاقی، انشاپردازی اور آگہی سے کون انکار کرسکتا ہے؟ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے مزاج پر رومانیت کا غلبہ تھا، جس کا اثر اُن کے انداز استدلال میں نمایاں ہے۔ بات پر اصرار اور بت گری و پرستش کا جذبہ اُن کے یہاں ہمیشہ کارفرما رہا۔ اُن کی عبارت میں بھی ان عناصر کی جلوہ گری ہے۔ اُن کے یہاں جو خطیبانہ انداز ہے اور تخاطب میں جس طرح وہ 'تم' کی ضمیر کو کثرت سے استعمال کرتے تھے، وہ انھیں عناصر کا نتیجہ ہے۔ اُن کے یہاں تحقیقی سطح پر شک کرنے اور چھان بین کرنے کا رجحان کم تھا۔ مختصر یہ کہ وہ ناقد تھے، انشاپرداز تھے، خوش مذاق تھے اور اس صفت خاص میں بہت کم لوگ ان کے شریک نکلیں گے؛ لیکن وہ محقق نہیں تھے۔ تحقیق جس کم یقینی، غیر جذباتی انداز فکر و انداز اظہار اور صحیح معنوں میں سنگ دلی کی طلب گار ہے؟ وہ مولانا کا حصہ نہیں تھی۔

مولانا حالی کی شرافت، وضع داری، پردہ پوشی، تحمل اور درمیانہ روی سے سب واقف ہیں۔ اُن کی عبارت کی سادگی تحقیق کے کام کی چیز ہو سکتی ہے لیکن اُن کے مزاج میں جس میانہ روی کا عمل دخل تھا، تحقیق کو اس سے علاقہ نہیں ہو سکتا۔ حالی و شبلی کے یہاں جو عناصر کارفرما ہیں عام سطح پر اُن میں قبول کیے جانے بلکہ لبیک کہہ جانے کی بڑی طاقت ہے، ان میں قبولِ عام کی کشش پنہاں ہے۔ اسی لیے اس عہد میں شیرانی صاحب کا خشک و بے رنگ اور کافر طبیعتی کا مرادف انداز، عام طور پر اپنا اثر نہیں ڈال سکا۔ لوگ حالی اور شبلی ہی کے اسیر رہے۔

حالی و شبلی کے اثرات کے بعد، سب سے طاقتور اثر تھا بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کا۔ اُن کی خدمات سے کوئی کافر ہی انکار کر سکتا ہے۔ ایسے بے لوث اور ان تھک کام کرنے والے کبھی کبھی سامنے آیا کرتے ہیں۔ وہ بیک وقت کئی محاذوں پر کام کیا کرتے تھے بلکہ لڑا کرتے تھے۔ اُن کا بیش تر وقت انجمن کے تنظیمی کاموں اور اُردو کے سلسلے میں مدافعت و مقابلے میں صرف ہوا کرتا تھا۔ اس زمانے کے ہنگامے جو اُردو ہندی کے نام سے برپا ہوتے رہتے ہیں، اُن پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ مولوی صاحب کا کتنا وقت اُن کی نذر ہوا کرتا تھا۔ انھوں نے تحقیق کی طرف بھی توجہ کی اور تدوین کا کام بھی کیا اور یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے نہایت اہم تذکروں اور قدیم متنوں کو شائع کیا اور اس طرح کام کرنے کا ڈول ڈالا کہ لوگوں کو ان امور سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ لیکن بات وہی ہے کہ تحقیق، شرکت کو گوارا نہیں کرتی۔ آدمی اگر چو مکھی لڑے گا تو اور موضوعات کا حق چاہے ادا ہو جائے تحقیق کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے جس انہماک، یک سوئی اور ڈوب جانے والی کیفیت کی ضرورت ہوتی ہے، ہنگامہ آلود زندگی اس کے منافی ہے۔

مولوی صاحب کی تحریروں میں سادگی، مولانا حالی کے اثر سے آئی تھی، لیکن اس میں ایک خاص دلکشی کی چمک، ان کی اپنی چیز ہے، کچھ تو ان کے دلکش اندازِ نگارش کی بنا پر اور کچھ اس بنا پر کہ تحقیق کے آثار نسبتاً کم روشن تھے، مولوی صاحب مرحوم نے تحقیق میں جو کام کیا، اُس کو پوری طرح قابلِ ذکر سمجھا گیا۔ تدوین و تحقیق دونوں موضوع اس میں شامل رہے اور اس سے بھی دونوں موضوعات کو نقصان پہنچا۔ مولوی صاحب کے پاس اتنا وقت تھا ہی نہیں کہ وہ چھان بین کا حق ادا کر سکتے۔ یہ بھی سنا گیا ہے کہ وہ اکثر دوسروں سے بھی اپنے کام میں مدد لیا کرتے تھے لیکن کتابوں پر نام انھی کا ہوتا تھا۔ یہ سچ ہو یا جھوٹ، لیکن یہ واقعہ ہے کہ جن متنوں پر اُن کا نام بہ حیثیت مدون درج ہے، ان میں آدابِ تدوین کی پابندی بہت کم نظر آتی ہے۔ یہی حال تحقیقی مقالات کا ہے۔ اس کا سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ اُن کی تقلید میں، تدوین اور تحقیق دونوں کو آسان کام سمجھا گیا۔

ضمنی طور پر یہ عرض کروں کہ ان کے باوجود، مولوی صاحب کی خدمات بہت زیادہ ہیں۔ تذکرے انھوں نے جیسے بھی چھاپے، آج ہم سب انھی سے کام لینے اور انھی کا حوالہ دینے پر مجبور نظر آتے ہیں۔ یہ ''ناتمام کام'' اگر وہ نہ کر جاتے تو شاید سرے سے ہو ہی نہ پاتا۔ اس کا اندازہ یوں بھی کیا جا سکتا ہے کہ اُن کے بعد ان کے جانشینوں نے اس روایت کو مرحوم بنا دیا۔ اس کے علاوہ مرحوم کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے حافظ محمود خاں شیرانی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مولوی وحیدالدین سلیم جیسے اساطینِ ادب سے کام کرایا۔ یہ کام کرنے والے جس پائے کے تھے، اُس سے سبھی واقف ہیں اور مرحوم کے سوا، کوئی دوسرا شخص ان لوگوں سے اپنی فرمائشوں کو اس طرح پورا نہیں کرا سکتا تھا۔ اس لحاظ سے مولوی صاحب کو اپنے زمانے کا گل کرائسٹ کہنا چاہیے۔ یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ مولوی صاحب چلے گئے اور سارے بڑے لوگوں کی طرح، اپنی جگہ خالی چھوڑ گئے۔ اُن کے جانشینوں نے اور جو بھی کیا ہو مگر اس علمی روایت کو زندہ نہیں رکھ سکے جس کو مرحوم نے فروغ دیا تھا۔ شاید یہ اُن لوگوں کے بس کی بات تھی بھی نہیں۔ اسی ایک بات سے مولوی صاحب کی عظمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ ضمنی بات ختم ہوئی۔

شبہ کرنا، اس زمانے کا بڑا اہم رجحان ہے، جس نے تحقیق کی افادیت کو اور تحقیقی طریقۂ کار کو فروغ بخشا۔ اسی طرح انکار کی جرأت بھی بڑھی۔ ان دونوں عناصر نے یہ بڑا کام کیا کہ آسانی سے واقعات کو تسلیم کرنے اور سادگی کے ساتھ نتائج کو قبول کر لینے کی ذہنیت پر کاری ضرب لگی۔ مزاجاً ہم لوگ روایت پرست ہیں اور دعوے کے بغیر چیزوں کو بہ آسانی مان لینا، قومی مزاج سا بن کر رہ گیا ہے۔ تصوف نے اس کمزوری کو بہت بڑھاوا دیا اور خوش عقیدگی نے اس کو موسوم کرنا سکھایا۔ سوال جواب، جرح و تعدیل، اسباب کی تلاش اور منطقی اندازِ نظر کو گمراہی کا مترادف بنایا گیا اور زود یقینی کو اچھی چیز سمجھا جانے لگا۔ خاص طور پر پرانے لوگوں اور پرانے واقعات کو تقدس کے حصار میں گویا محفوظ کر دیا گیا۔ روایتوں کو حقیقتوں کا ہم معنی سمجھ لینا قومی مزاج سا بن گیا ہے۔ اب تک یہ صورت ہے کہ اکثر لوگ ہر طرح کی روایتوں کو بہ آسانی تسلیم کر لیتے ہیں۔ امیر خسرو نے موسیقی میں بہت سے اضافے کیے، فلاں فلاں راگ ایجاد کیے، فلاں ساز انھی کی دین ہے؛ ایسی باتوں کو روایت پرستانہ مزاج خوب خوب مانتا ہے اور جب کوئی یہ کہتا ہے کہ اس کا ثبوت موجود نہیں یا وہ خسرو کے صوفی صافی ہونے کو مشتبہ سمجھتا ہے تو تحقیق کے اصولوں کے تحت ایسی باتوں پر گفتگو کرنے کے بجائے ایسے لوگوں کی طرف سے روایت کا سہارا لے کر اس شخص کو جھٹلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اب سے پہلے روایت پرستی کا اثر بہت زیادہ تھا، مگر پندرہ بیس سال کے عرصے میں بہت کچھ تبدیلی ہوئی ہے اور اب جرح کرنے کو پہلے کی طرح برا نہیں سمجھا جاتا اور قابلِ قبول دلائل کے بغیر

دعووں کو قبول کرنے کا رجحان بھی کم ہوا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اس میں بہت بڑا حصہ ہے قاضی عبدالودود صاحب کی تحریروں کا ہے۔ قاضی صاحب کی تحریروں نے ۱۹۵۰ء کے بعد اپنے اثرات کو نمایاں کیا ہے۔ یوں کہیے کہ ان کے اکثر اہم مضامین اسی زمانے میں لکھے گئے ہیں۔ ان تحریروں نے تحقیق کے اصول و آداب سکھائے، شک کرنا سکھایا، انکار کرنے کی جرأت بخشی، منطقی انداز نظر اور جرح و تعدیل کی اہمیت کو ذہن نشین کیا اور ان کے تبصروں نے احتساب کی اس روایت کو فروغ بخشا جس کی بنیاد شیرانی صاحب نے رکھی تھی۔ اس طرح اس زمانے میں روایت پرستی پر کاری ضرب لگی۔ چونکہ معاشرے میں ابھی تک تبدیلی بروئے کار نہیں آسکی ہے اور روایتوں کا اثر ذہنوں پر اب بھی چھایا ہوا ہے اس لیے اکثریت اب بھی ان ہی لوگوں کی ہے جو احتساب کو اور منطقی انداز نظر کو کچھ اچھا نہیں سمجھتے، مگر پہلے کے مقابلے میں اب ایسے لوگوں کی تعداد بھی بڑھ گئی ہے جو تحقیق کے اصول و آداب کو برتنا ضروری سمجھتے ہیں اور منطقی طور پر استخراج نتائج کے قائل ہیں۔

❖❖❖❖

حواشی

(۱) ''کسی شخص کا قول ہے کہ ہر قوم کو اسی طور کی حکومت ملتی ہے جس کی مستحق ہے۔ یہی بات تحقیق کے متعلق بھی کہی جاتی ہے۔ کسی ملک کے باشندوں کا معیار اخلاق پست ہو اور وہ کام سے جی چراتے ہوں، تو وہاں بالعموم تحقیق کا درجہ پست ہوگا''۔

قاضی عبدالودود (سہ ماہی ساغر، پٹنہ، شمارہ ۱، جولائی ۱۹۶۰ء)۔

(۲) ادبی تحقیق، مسائل و تجزیہ، رشید حسن خان، علی گڑھ ۱۹۷۸ء، لاہور ۱۹۸۹ء، ص ۸۸ تا ۱۱۵۔

❖❖❖❖

قیاسی تصحیح

ڈاکٹر خلیق انجم

متنی نقاد تمام دستیاب مخطوطوں کی مدد سے جو متن تیار کرتا ہے، اُسے ہم مصنف کے متن سے قریب ترین تصور کریں گے۔ لیکن ابھی یہاں ہمارا کام ختم نہیں ہوتا۔ ابتدا میں اس پر بحث کی جا چکی ہے کہ متنی نقاد کا اصل مقصد اُس متن کی بازیافت ہے جو مصنف لکھنا چاہتا تھا۔ فرض کیجیے ہم نے تصحیح کے لیے اُس متن کا بھی استعمال کیا ہے جو خود مصنف کا دستخطی نسخہ ہے یا اس کی نگرانی میں لکھا گیا ہے اور مصنف نے خود اس نسخے پر نظر ثانی کی ہے۔ لیکن پھر بھی ہمارے تیار کیے ہوئے متن میں بعض قرأتیں ایسی رہ گئی ہیں جو مشکوک ہیں۔ کیا ہم ان قرأتوں کو جوں کا توں رہنے دیں؟ یہ بات پہلے بھی بتائی جا چکی ہے کہ ہمیں مصنف کا جو دستخطی نسخہ ملتا ہے، یہ عام طور پر پہلا مسودہ نہیں ہوتا۔ مصنف اپنا اصل مسودہ جو غیر مرتب اور خام حالت میں ہوتا ہے اور جس میں ترمیم، کاٹ چھانٹ، اضافے اور حذف ہوتے ہیں، ضائع کر دیتا ہے۔ گویا متنی نقاد کو مصنف کا جو دستخطی نسخہ ملا ہے، وہ بھی نقل در نقل ہے۔ اس لیے خود مصنف سے اُن غلطیوں کا احتمال ہے، جو متنی نقاد یا کاتب سے سرزد ہوتی ہیں۔ یہاں میں دیوانِ غالب کے ایک نسخے کی مثال دینا چاہتا ہوں، امتیاز علی خاں صاحب عرشی نے دیوان کے نسخۂ لاہور، کا تعارف کراتے ہوئے نسخۂ عرشی کے مقدمے میں لکھا ہے کہ:

> ''اندرونی شہادت ثابت کرتی ہے کہ اسے اول سے آخر تک میرزا صاحب نے پڑھا ہے اور اکثر جگہ اغلاطِ کاتب کی اصلاح بھی کی ہے...... تاہم بہت سی خطی غلطیاں اب بھی موجود ہیں''۔ ۱۷۔ الف مثلاً

۱۔ کیا رہوں غربت میں خوش، جب ہو حوادث کا خیال

یہاں ''حوادث کا یہ حال'' ہونا چاہیے۔

۲۔ نہ سنو گر بُرا کہے کوئی۔ نہ کہو گر بُرا کہے کوئی

دوسرے مصرع میں ردیف ''کرے کوئی'' ہونی چاہیے۔

۳۔ رہ گیا خط چھاتی پر کھلا۔

یہ مصرع یوں ہونا چاہیے:

رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

۴۔ شاہ آگے دھرا ہے آئینہ

مصرع یوں ہے:

شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ

یہ نسخہ غالب کی نگرانی میں اُن کے خاص کاتب نواب فخر الدین محمد خاں دہلوی کا لکھا ہوا ہے۔ اور پھر غالب نے نظر ثانی بھی کی ہے۔ اس کے باوجود اوپر دی گئی غلطیوں کے علاوہ بھی بہت سی خطی غلطیاں موجود ہیں۔ اب فرض کیجیے دیوانِ غالب کا صرف ایک ایسا نسخہ ملتا ہے جس کا غالب سے تعلق رہا ہے اور وہ نسخۂ لاہور ہے۔ ایسی صورت میں جو متن تیار ہوگا اُس میں وہ تمام غلطیاں رہ جائیں گی جو نسخۂ لاہور میں ہیں۔ اب ہمارے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو متن تیار ہوا ہے، اس کو آخری سمجھ کر بعض بے معنی شعروں میں مطلب ڈالنے کی کوشش کریں۔ جن مصرعوں میں الفاظ کا اضافہ یا حذف ہوا ہے اُن کے آگے سوالیہ نشان لگا کر حاشیہ دے دیں کہ مصنف نے یوں ہی لکھا تھا۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ ہم وہ متن حاصل کرنے کی کوشش کریں جو مصنف کے ذہن میں تھا اور جو وہ لکھنا چاہتا تھا۔ ہمیں یہ ہرگز نہیں بھولنا چاہیے کہ ہم جن لوگوں کے لیے یہ متن تیار کر رہے ہیں، اُن میں مشکل سے ایک فی صدی لوگ ہمارے حاشیوں میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور باقی صرف اُس مصنف کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ اگر متن میں جگہ جگہ نقطے ہوں گے یا کذا لکھا ہوگا یا سوالیہ نشان بنا ہوگا تو بوجھ سا بن جائے گا اور قاری مطالعے سے لطف اندوز نہیں ہو سکے گا۔ دوسرا طریقہ اگرچہ مشکل ہے لیکن مفید ہے اور وہ ہے قیاسی تصحیح، جس کے پانچ مدارج ہیں۔

۱۔شک۔تمام دستیاب نسخوں کی مدد سے جو نسخہ تیار ہوا ہے، متنی نقاد اس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک فقرے اور مصرع پر شک کرے گا کہ یہ مصنف کا ہو سکتا ہے یا نہیں۔

۲۔اس شک کے دو نتائج ہوں گے۔یا تو وہ ایک قرأت کو قبول کرے گا۔

۳۔یا پھر رد کرے گا، یعنی وہ یہ فیصلہ کرے گا کہ یہ قرأت اصل مصنف کی نہیں ہو سکتی۔

۴۔انتخاب۔اگر نقاد فیصلہ کرتا ہے کہ یہ قرأت مصنف کی نہیں تو تصحیح کے دوران اُس نے جتنے متن استعمال کیے تھے انھیں پھر دیکھے گا۔اور زیر بحث قرأت کی جتنی بدلی ہوئی شکلیں ملیں گی ایک ایک کر کے ان سب پر غور کرے گا۔فرض کیجیے تصحیح شدہ متن میں ایک قرأت 'طور' ہے۔جو معنی اور سیاق و سباق کے لحاظ سے غلط معلوم ہوتی ہے تو متنی نقاد اُن تمام متنوں کو دیکھے گا جو اُس نے تصحیح کے دوران استعمال کیے تھے۔فرض کیجیے اُن میں دو قرأتیں اور ملتی ہیں۔'نور' اور 'حور' اب گویا نقاد کو 'توں 'طور'، 'نور' اور 'حور' میں سے ایک ایسی قرأت انتخاب کرنی ہے جو ہر لحاظ سے قابلِ ترجیح ہے متنی نقاد 'نور' کو مناسب سمجھتا ہے۔تو وہ یہ قرأت انتخاب کرلے گا۔اور متن میں 'طور' کی جگہ 'نور' لکھ کے حاشیے میں اس انتخاب کے وجوہ بیان کردے گا۔ایک مثال ملاحظہ ہو۔دیوانِ یقین کے ایک نسخے میں یہ شعر ہے:

اگر رستم ہو عاشق، دم نہ مارے یار کے آگے

کہ اس کا جی نکل جاوے گا اس کی ایک ٹھنکن میں

ہم فرض کر لیتے ہیں کہ یہ شعر ہمارے تصحیح شدہ متن میں ہے۔اب اس کے قافیے کے بارے میں مرزا فرحت اللہ بیگ کا بیان ملاحظہ ہو:

''دامن، گلشن، قافیہ ہے۔اب ملاحظہ ہو کہ اس شعر کا قافیہ قلمی نسخوں میں اس طرح ہے:

(۱)لٹکن (۲)سنکن (۳)لٹکن (۴)ٹھنکن (۵)ٹھن کن (۶)ٹھوکن (۷)پھکین

مجھے تو لٹکن کا قافیہ سب سے بہتر معلوم ہوا کیوں کہ پہلے زمانے میں پہلوانوں کی اصطلاح میں لٹکن مدِ مقابل کے جانگیے میں ہاتھ ڈال کر پلٹ دینے کو کہتے تھے۔اب اس پیچ کو قلا جنگ کہتے ہیں۔پھینکن بھی آسکتا ہے۔کیونکہ تلوار پھینکنے کو پھیکن کہتے ہیں بقیہ الفاظ کے اگر کچھ معنی ہوں تو ہوں، میں نے بہت سی لغت کی کتابیں دیکھ لیں، مجھے تو کہیں نہیں ملے''۔۱۸

بعض متنی نقاد بنیادی نسخے کی قرأت کو متن میں دیتے ہیں۔اور اختلافِ نسخ حاشیے میں۔وہ اس کا بالکل خیال نہیں رکھتے کہ وہ جس قرأت کو محض بنیادی نسخے کی بنا پر ترجیح دے رہے ہیں اس نے پوری عبارت کو بے معنی کردیا ہے۔مثلاً دیوانِ فدوی میں ایک شعر ہے:

فدوی کہے تو کس سے کہے دل ہی خالی ہے

جو بے کلی گذرتی ہے یارو تمام شب

پہلے مصرع میں لفظ 'خالی' نے شعر کو بے معنی کردیا ہے۔دیوان کے مرتب نے حاشیے میں دوسری قرأت 'جانے' دی ہے جسے ترجیح دے کر متن میں دینا چاہیے تھا۔فدوی کا ایک اور شعر ہے:

وہ ستاوے ہمیں، سمجھ لیں گے

وقت جب ہوئے گا کہو اپنا

اس غزل کا قافیہ لہو، جستجو اور مو وغیرہ ہے۔ظاہر ہے کہ 'کہو' میں دوسرے قافیوں کے ساتھ مکتوبی مماثلت تو ہے صوتی آہنگ نہیں لہٰذا حاشیے میں ایک اور نسخے کی قرأت 'کھو' دی گئی ہے۔جو مکتوبی اور صوتی دونوں اعتبار سے درست ہے، اسے متن میں ہونا چاہیے تھا۔دیوانِ تاباں میں ایک شعر ہے:

لگتی وہ تجلی شرر سنگ کے مانند

موسیٰ تو اگر دیکھتا دیدار بتاں کا

مولوی عبدالحق نے حاشیے میں 'سنگ' کی دوسری قرأت 'طور' دی ہے۔تجلی اور موسیٰ کی رعایت سے 'طور' ہی درست ہے۔اور اسے متن میں ہونا چاہیے تھا۔اور 'سنگ' حاشیے میں۔

۵۔ فرض کیجیے ہمارے تیار کیے ہوئے متن میں ایک قرأت مشکوک ہے جس کی وجہ سے عبارت بے معنی ہوگئی ہے۔ہم پہلے انتخاب کے اصول پر کام کریں گے۔یعنی اُن تمام نسخوں کا ایک بار پھر مطالعہ کریں گے۔جن سے ہم نے تنقیدی اڈیشن تیار کرنے میں مدد لی تھی۔اُس مقام پر جتنی قرأتیں ملیں گی، اُن سب پر غور کریں گے۔فرض کیجیے ہمارے تنقیدی اڈیشن میں قرأت 'طور' ہے جو سیاق و سباق کے مطابق درست نہیں۔ہم نے دوسرے نسخے دیکھے ان میں دو اور

قرأتیں 'نور' اور 'حور' ملتی ہیں۔ لیکن یہ بھی عبارت کو بے معنی رکھتی ہیں۔ اب ہم یہاں قیاسی تصحیح سے کام لیں گے۔ یعنی ہم خود قرأت تلاش کریں گے۔ جو ہمارے خیال سے سیاق وسباق کے مطابق ہوگی۔ اور جو مصنف نے لکھی ہوگی۔ فرض کیجیے ہم سمجھتے ہیں اس مقام پر 'صور' سب سے بہتر اور بامعنی قرأت ہے۔ ہم متن میں یہی قرأت دیں گے اور اپنے اس انتخاب کی وجہ حاشیے میں بیان کریں گے۔

جو متن ہم مرتب کر رہے ہوں۔ اگر اس کے بہت سے نسخے ملتے ہیں تو عام طور پر تنقیدی اڈیشن کی مشکوک قرأتوں کا مسئلہ انتخاب کے ذریعے حل ہو جاتا ہے۔ لیکن اصل مشکل اُس وقت ہوتی ہے جب ہم ایسا متن مرتب کر رہے ہیں جس کا صرف ایک نسخہ ملا ہے۔ ایسے نسخے میں قیاسی تصحیح کی تعداد اچھی خاصی ہو جاتی ہے۔ ہمیں ہر حال میں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ہمارے تنقیدی اڈیشن میں کوئی قرأت ایسی نہ آنے پائے جو مصنف کے اصل مفہوم کو بدل دے یا جو عبارت کو بے معنی کر دے۔ مالک رام اور پروفیسر مختار الدین احمد نے ''کربل کتھا'' میں کہیں قیاسی تصحیح کو متن میں دیا ہے۔ اور کہیں حاشیے میں جب کہ قیاسی تصحیح ہر حالت میں متن میں ہونی چاہیے۔ کربل کتھا سے دو مثالیں ملاحظہ ہوں۔ ایک جگہ عبارت ہے:

> 'اس فکر میں تھا کہ نانا محمد مصطفےٰ مجھ پاس آ کہے:... کوشش کر کہ آج رات مجھ ساتھ افطار کرے۔ اور دادا کے ساتھ ایک فرشتہ تھا اور اوس ہاتھ ایک شیشہ سبز۔ دادا نے کہا''۔

یہ الفاظ حضرت حسینؓ کے ہیں۔ اور عبارت میں حضرت محمد مصطفےٰ کے لیے ایک بار 'نانا' اور دو بار 'دادا' استعمال ہوا ہے۔ 'نانا' پر مرتبین نے حاشیہ دیا ہے کہ یہاں 'دادا' کاٹ کر 'نانا' بنایا گیا ہے۔ گویا کاتب نے غلطی سے نانا کی بجائے دادا لکھ دیا تھا جسے کسی نے درست کر دیا۔ اس لیے مرتبین کا فرض تھا کہ بعد میں دو جگہ جو 'دادا' استعمال ہوا ہے اُسے بھی 'نانا' کر دیتے اور حاشیے میں اس کا ذکر کر دیتے۔ کربل کتھا میں ایک قرأت یہ ہے:

> ''اے بھائی خضر راہ میرا ہوا اور ظلمات کفر سے سرچشمۂ حیات کون پہنچایا ہے''۔

اس پر حاشیہ دیا گیا ہے۔ ''اصل میں یوں ہی ہے۔ محل 'ہوا' کی جگہ 'ہو' اور 'پہونچایا' کی جگہ 'پہونچا' کا ہے''۔ قیاسی تصحیح متن میں ہونی چاہیے۔ اور اس کا ذکر حاشیے میں۔ اگرچہ قیاسی تصحیح کا کام بہت مشکل ہے لیکن جس متنی نقاد نے مصنف کے عہد کی زبان، اس کا طرز بیان، بعض لفظوں کے بارے میں مصنف کی پسند یا ناپسند اور مصنف کے اندازِ فکر کا گہرا مطالعہ کیا ہوگا اُس کے لیے یہ کام قدرے آسان ہو جاتا ہے۔ سنسکرت کے ایک بڑے اسکالر دی۔ ایس۔ سُکتھانکر نے ''آدی پرون'' کا تنقیدی اڈیشن تیار کیا تھا۔ اس میں سات اور آٹھ ہزار کے درمیان بند تھے۔ پورے اڈیشن میں چھتیس مقامات پر انھیں قیاسی تصحیح کرنی پڑی۔ وہ کام مکمل کر چکے تھے کہ ''آدی پرون'' کا ایک قدیم اور معتبر نسخہ نیپال سے مل گیا۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ انھوں نے پچاس فیصدی قیاسی تصحیح بالکل درست کی تھی۔(۱)

❖❖❖❖

(۱) متنی تنقید، خلیق انجم، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۶ء، ص ۵۸ تا ۵۹۔

تحقیق و تصحیح متن کے مسائل[1]

ڈاکٹر نذیر احمد

تاریخی تحقیق میں سب سے زیادہ اہمیت ''متن'' کی ہوتی ہے۔ ماضی کے افراد کے افکار و خیالات جو ہمارے سامنے آتے ہیں، وہ تحریری شکل میں ہوتے ہیں اور جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ یہ تحریر ہر طرح کے سقم سے پاک ہے، اس وقت تک ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ جو کچھ ہمارے سامنے ہے وہ بعینہٖ فلاں شخص کے افکار و خیالات ہیں اور جب تک کسی شخص کے متعلق یہ تحقیق نہ ہو جائے کہ یہ اسی کے خیالات ہیں، اس وقت تک ان کے بارے میں دیانت داری سے کسی گفتگو کا آغاز ہی نہیں ہو سکتا۔ ادبی تحقیق کا معاملہ اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔ ادبی امور کی تحقیق کرنے والا صرف نفسِ مضمون اور افکار ہی کی تحقیق و تصدیق نہیں کرتا بلکہ ان کی اصل زبان بھی متعین کرتا ہے۔ تاریخی امور کے سلسلے میں محقق کو اگر یہ بات قابلِ وثوق حد تک معلوم ہو جائے کہ یہ فلاں شخص کے خیالات ہیں جو ہر طرح کی آمیزش سے پاک ہیں، تو اسے بڑی حد تک اطمینان ہو جاتا ہے۔ لیکن ادبی معاملات میں محقق کو صرف خیالات ہی کے تحقیق و تعین پر اطمینان نہ ہوگا۔ وہ یہ دیکھنا چاہے گا کہ مصنف نے اپنے خیالات کے اظہار میں جو زبان استعمال کی ہے وہ وہی ہے جو ہماری پیش نظر کتاب کی ہے یا اس میں ترمیم ہوئی ہے، بلکہ بسا اوقات تو وہ اس کتاب کا طرزِ املا بھی وہی دیکھنا چاہتا ہے جو مصنف کے دور میں رائج تھا۔

ممکن ہے بعض لوگ اس طرح کی کاوش کو غیر ضروری اور دور از کار سمجھیں، لیکن ایسا سمجھنا نادانی ہے، کیونکہ اگر کسی مصنف کا مطالعہ مقصود ہے اور اس کے خیالات و افکار سے استفادہ ضروری ہے تو پھر جو خیالات اس نے پیش کیے ہیں اور جس انداز میں پیش کیے ہیں ان کا مطالعہ لازمی ہے، اس لیے کہ خیالات اور انداز بیان و زبان ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں۔ ممکن ہے کسی مصنف کے خیالات کو غلط طور پر سمجھنے یا اس کی زبان و طرز فکر بدلے ہوئے انداز کے مطالعے سے کوئی ایسا فوری اور وقتی نقصان نہ ہو جس کا احساس کیا جا سکے لیکن اگر کسی طب کی کتاب کو غلط پڑھ لیا اور اس کے مطابق علاج کر لیا گیا تو مریض پر اس کا اثر فوراً مرتب ہوگا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک طبی کتاب کے قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں ایک جگہ ''پنج درم'' اور ''بیخ وی'' کا فرق تھا۔ معلوم نہیں کہ اس فرق اور اس طرح کے اور دوسرے اختلافات کی وجہ سے مریضوں پر کیا کیا ستم نہ ڈھایا گیا ہوگا۔ یا مثلاً کسی قانون کی کتاب سے نتیجہ استنباط کرنا ہو اور اس میں ''زحمت'' کو ''رحمت'' اور ''سزا'' کو ''جزا'' پڑھ لیا جائے تو اس کے عواقب ظاہر ہیں، غرض کسی کتاب کے متن کو غلط پڑھنے میں طرح طرح کے نقصانات کا احتمال ہے۔

اس تمہید سے ایک طرف تو تحقیق متن کی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے اور دوسری طرف یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ تحقیق کی راہیں کتنی دشوار گذار، اس کے معیار کس قدر بلند اور اس کے اصول و شرائط کس قدر سخت ہیں۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ شاید ہی ایسی کوئی کتاب ہو جو تحقیق متن کے سارے اصولوں پر بعینہٖ پوری اُترتی ہو، جس میں مصنف کے خیالات میں کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ نہ ہوئی ہو۔ جس کے انداز بیان اور زبان میں کسی قسم کی ''اصلاح'' نہ کی گئی ہو اور جس کا املا بھی وہی ہو جو مصنف کے دور میں تھا۔ اس کا نتیجہ ہے کہ محقق لازمی طور پر متشکک ہوتا ہے جب اس کے سامنے کوئی متن آتا ہے تو معاً طرح طرح کے سوال اس کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں اور جن کا خاطر خواہ جواب نہ پا کر اس کے شکوک بڑھ جاتے ہیں۔ اگر قلمی کتاب سامنے ہے تو اس کا ذہن سوال کرتا ہے کہ کیا یہ مصنف کے ہاتھ کا نسخہ ہے۔ اگر مصنف کے ہاتھ کا نسخہ ہو تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ نسخہ مصنف کے اوائل زندگی کا ہے یا اواخر زندگی کا۔ اگر اوائل زندگی کا ہے تو اس کا کیا ثبوت کہ اس نے اپنے اس خیال میں ترمیم نہیں کی، اگر اواخر کی ہے تو اس کی کیا دلیل ہے کہ اس کے بعد تا زیست اس کے یہی خیال رہے اور اس نے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور یہ سب مشروط ہے اس شرط کے ساتھ کہ ہم مصنف کا دستخط پہچانتے ہوں اور اس کے خط کو دوسرے اور خطوں سے ممتاز کر سکتے ہوں جب مصنف کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخوں کی صداقت بغیر چند شرطوں کے پورے ہوئے، مسلم نہیں ہو سکتی تو پھر دوسرے نسخے جو اس کے زمانے سے لے کر صدیوں بعد تک نہ جانے کن حالات میں اور کن کاتبوں کے توسط سے تیار ہوتے ہیں، ان تمام نسخوں کی صداقت مشکوک رہتی ہے اور جب کوئی کتاب مطبوعہ ہو تو پھر شکوک کی تہیں اور بڑھ جاتی ہیں۔ ترجمے کی منزل اس سے بھی آگے ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں محقق اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ حقیقت ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ کوئی متن ایسا نہ ہوگا کہ جو ہر قسم کے سقم سے پاک ہو۔ ایسی حالت میں ایک سوال یہ اٹھتا ہے کہ پھر محقق تحقیق متن میں اپنا سر کیوں کھپاتا ہے جب اس کو معلوم ہے کہ اصل حقیقت تک اس کی رسائی ممکن نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ محقق کی کوشش محض اس امر پر مرکوز ہوتی ہے کہ مصنف کے قریب تک پہنچے اور وہ خلیج جو اس کے اور مصنف کے درمیان حائل ہے، وہ زیادہ سے زیادہ پر

ہو۔ اگر چہ وہ جانتا ہے کہ مصنف تک پہنچنا کس قدر دشوار ہے، لیکن اس کی مخلصانہ کوشش دراصل اس کا مقصدِ عمل ہے۔ وہ اپنے سارے وسائل کو کام میں لا کر انتہائی دیانتداری سے نتیجہ نکالتا ہے، لیکن جو بات کہتا ہے مشروط کہتا ہے اور ہر لحظہ قوی دلائل کے سامنے جھکتا اور اپنے نتیجے میں ترمیم کرتا رہتا ہے۔ اگر چہ وہ ناکام رہتا ہے لیکن اس کا احساسِ محرومی قابلِ داد ہے۔ ع۔

لے اسی ظلمت کدے میں اُس سے محرومی کی داد

اس سے آگے اے دلِ مضطر، حجاب نور ہے

یہاں پر تحقیق متن کے عالم کے ایک معجزے کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ صحتِ متن کی بے پناہ دشواریوں اور اس کی کسوٹی کی سختی کا خیال آتے ہی قرآن کی مثال ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ یہ کتاب صحت متن کے لحاظ سے بھی اعجاز ہے، کیونکہ قرآن کریم کا وہ نسخہ جو حضرت رسالت مآبؐ کے دور میں رائج تھا اور جو آج رائج ہے، ان دونوں میں سرمو فرق نہیں۔ خیالات و زبان کا کیا ذکر اس کے حرکات اور اوقاف و رموز تک وہی ہیں، جو حضرت محمد ﷺ کے دور میں تھے۔ حافظ قرآن کو وہ تمام مقام معلوم ہیں جن پر رسول اکرم وقف فرماتے اور جتنا وقف فرماتے اور یہ ایسے حقائق ہیں جن سے زیادہ با آسانی تصدیق کیے جانے والے دوسرے امور نہیں۔ آپ قرآن کے اس نسخے جو حضرت عثمانؓ یا حضرت علیؓ کی طرف منسوب ہے یا کوئی اور نسخہ جو پہلی صدی ہجری کا ہو، اس کا مقابلہ حافظ قرآن کے سینے میں محفوظ نسخے سے کر لیں تو آپ یقین کر سکیں گے کہ اختلاف نسخ کا کیا ذکر، اختلافات اوقاف و رموز، اختلافات رکوع (پیراگراف) تک کا نام و نشان نہیں۔ جو حضرات تحقیق متن میں مصروف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ جو کتاب جتنی زیادہ متداول ہوگی، اس کے متن میں اتنا ہی زیادہ اختلاف ہوگا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ایک لفظ کی دس دس دوسری شکلیں سامنے آجاتی ہیں۔ ایسے حالات خود مصنف اگر زندہ ہو تو وہ بھی عالم حیرت میں پڑھ کر اپنی تصنیف سے برأت کا اظہار کرے۔ لیکن قرآن کروڑوں بار لکھا گیا، لاکھوں بار چھپا، اربوں انسانوں نے اس کا مطالعہ کیا، ہزاروں ملکوں میں مختلف نسلوں اور زبانوں کے لوگوں میں متداول رہا۔ مگر پوری کتاب کے ایک نقطے میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا اور مقابلے (Collection) کی نئی اور حیرت انگیز شکل یعنی قدیم ترین نسخے کا مقابلہ انسان کے سینے میں محفوظ کتاب سے یقیناً دنیائے علم کے لیے اعجوبہ ہے اور چونکہ حفظ قرآن کا لامتناہی سلسلہ قائم ہو چکا ہے جو حضرت رسول اکرم ﷺ کے زمانے سے لے کر آج تک ملکوں ملکوں میں اس طرح پھیلا ہے کہ اب قرآن کے متن میں کسی قسم کے الحاق یا تغیر و تبدل کا امکان نہیں۔ اس سے زیادہ حیرت خیز بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اگر قرآن کے متن میں سارے نسخے خدا نخواستہ غرق دریا کر دیے جائیں تو صرف ہندوستان میں ایک ہی دن کے اندر کئی ہزار نسخے تیار ہو جائیں جن میں اختلاف نسخ سرے سے غائب ہوں۔ تحقیق کی دنیا کا یہی ایک زندہ معجزہ ہے۔

اب میں تحقیق متن کے ان مسائل کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن سے ہر محقق دوچار ہوتا اور جن کا حل وہ اپنے مقدور بھر پیش کرتا ہے اور چونکہ ہماری زبانوں کے مسائل دوسری اور زبانوں سے مختلف ہیں اور بدقسمتی سے ان مسائل کو جمع اور ان کو حل کرنے کی طرف میری دانست میں کوئی بڑی کوشش نہیں ہوئی اس لیے میں اپنے ذاتی تجربے کو ذیل کی سطور میں قلم بند کرنا چاہتا ہوں۔

(الف) عربی رسم خط سے تحقیق متن میں مزید دشواریاں

جن جن زبانوں نے عربی رسم خط اپنایا ان کے یہاں متن کی تحقیق و تصحیح کا مسئلہ زیادہ پیچیدہ ہو گیا ہے اور میرا ذاتی خیال ہے کہ ان زبانوں کی کتابیں دوسری اور زبانوں کے مقابلے میں اپنی اصل سے زیادہ دور ہیں۔ اس کے چند در چند وجوہ یہ ہیں۔

۱۔ اس رسم خط میں نقطے دار حرفوں[۱] کی تعداد زیادہ ہے یا یوں کہیے کہ نقطوں سے حرفوں کی مزید شکلیں معین ہوئی ہیں۔ ب، پ، ت، ث، ایک شکل کے ج، چ، ح، خ، دوسری شکل کے ہیں د ذ سے، ر ز ژ سے، س ش سے، ص ض سے، ط ظ سے، ع غ سے صرف نقطوں کی بنا پر متمایز ہوئے ہیں۔ ف، ق بھی ایک ہی قسم کے ہیں۔ ن، ی بھی نقطے دار ہیں۔ فارسی میں علامت نفی (ن) اور یائے زینت بھی نقطے سے ظاہر کی جاتی ہے۔ اُردو میں ٹ، ڈ اور ڑ وغیرہ کی قدیمی شکلیں نقطوں کے اضافے سے ظاہر ہوتی تھیں۔

۲۔ ایک سے زیادہ نقطے ہونے اور نقطے دار حرفوں کے پے در پے آنے سے تحقیق متن کا مسئلہ دشوار ہو جاتا ہے۔

۳۔ نقطوں کو ملا کر لکھنے سے نقطوں کا تقدم و تاخر مشکل اور پھر لفظوں کا تعین دشوار ہو جاتا ہے۔

۴۔ اگر حروف الگ الگ ہوں تو نقطوں سے اتنی دشواری نہ ہو، لیکن جب پورے حروف کی نشاندہی صرف شوشے اور ان پر کے نقطے کرتے ہوں اور نقطوں کا

باقاعدہ اہتمام نہ ہوتا ہو تو پھر لفظوں کے تعین میں کیا کیا قباحتیں نہ پیدا ہوتی ہوں گی اور شکستِ تحریر میں نہ نقطوں کا التزام ہوتا ہے اور نہ شوشوں اور مفرد حرفوں کی شکل باقی رکھی جاتی ہے تو صرف قیاس ہی کی بنا پر سارا فیصلہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ایک عالم کے قیاس پر سو فیصدی بھروسہ نہیں کیا جاسکتا تو ایک کاتب جس نے کسی شکستہ تحریر کے نسخے کی نقل کی ہو، اس کے قیاس پر کیوں کر اعتماد کیا جائے۔

۵۔ حرفوں کے اختصار یعنی شوشوں اور تشدید کے لفظ کے املا میں جگہ نہ پانے پر لفظ کی ہجاؤں (Syllables) کا تعین عام طور پر دشوار ہو جاتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ فارسی کی ضمیر متصل کی تین علامتیں (ش، ت، م) بھی حرف کی شکل میں ہیں اور یہ جب اصل لفظ سے مل جاتی ہیں تو ہجاؤں کے تعین میں اشکال پیدا کر دیتی ہیں۔ اس اشکال سے متن کے تعین میں بڑی دشواری پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً منّت اور منت (من ترا) بالکل ایک سے لکھے جاتے ہیں مگر پڑھنے اور معنی کے لحاظ سے دونوں میں کتنا تفاوت ہے۔

۶۔ کوئی رسم خط خواہ کتنا ہی دقیق اور کامل کیوں نہ ہو، ہر طرح کی آواز کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے صوت (Vowel) اور صامت (Consonant) کی حد تک آوازوں کے باریک سے باریک فرق واضح ہو سکیں لیکن (Intonation) جو خیالات کی ترجمانی کی نہایت بلیغ شکل ہے، رسم خط کے حیطۂ تصرف میں نہیں آ سکتا۔ بسا اوقات جملے کے بعض لفظوں کو ایک خاص انداز میں پڑھنے سے نئے معانی پیدا ہو جاتے ہیں، مگر اس ''انداز'' کی نہ ''تعریف'' کی جاسکتی ہے اور نہ تحریر میں لانے کی کوئی مخصوص علامت مقرر ہوتی ہے۔ فارسی اور اردو میں استفہام اقراری اور انکاری کو مثال میں پیش کر سکتے ہیں۔

''خوب آئے''، کہہ کر ''نہیں آئے'' مراد لینے یا ''نہیں جاؤ گے'' سے معنی مثبت پیدا کرنے کے لیے کوئی مخصوص علامت نہیں ہے۔ غالب کا یہ شعر ملاحظہ کریں۔

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

اس میں پہلا مصرعہ دو طرح پر پڑھا جاسکتا ہے اور اسی اعتبار سے دو معنی پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح عرفی کا یہ شعر ہے:

منکہ باشم عقل کل را ناوک انداز ادب
مرغ اوصاف تو از اوج بیان انداختہ

اس کے پہلے مصرعے میں حرف 'کہ' کاف بیان اور کاف علت دونوں طرح سمجھا جاسکتا ہے، چنانچہ عرفی کے شارحین میں اس اعتبار سے بڑا اختلاف رہا ہے، غالب نے بھی اپنے ایک خط میں اس بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ ایک مخصوص صورت کی عدم موجودگی سے متن کے مفہوم کے تعین میں کتنی دشواری لاحق ہوتی ہے۔

۷۔ حرفوں کی صوری اور صوتی یکسائی التباس کا سبب بن جاتی ہے، د، و، ذ، ز، وغیرہ کا التباس اتنا عام ہے کہ ایک ایک لفظ کی تین تین چار چار املائی شکلیں بن جاتی ہیں۔ ہ، ح، ش، س، ص، ث، ط، ت، ض، ظ، ز، ذ، ژ کی ایک دوسرے میں تبدیلی صوری اور صوتی یکسانی کا نتیجہ ہے۔ بعض اوقات کاتب کسی دوسرے سے پڑھواتا اور خود کتابت کرتا ہے تو اس یکسائی سے بڑی بڑی غلطیاں سرزد ہو جایا کرتی ہیں۔

۸۔ ہماری زبان کے وہ حروف تہجی جو ایک دوسرے سے پیوست نہیں ہوتے، ان سے تعین متن میں دشواری پیدا ہوتی ہے۔ ایک لفظ کے آخری حرف دوسرے لفظ کے ابتدائی حرف تصور ہوتے ہیں، اسی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ لفظ کہاں پر ختم اور دوسرا لفظ کہاں شروع ہوتا ہے۔ کبھی ایک ہی مفرد لفظ دو لفظ متصور ہونے لگتا ہے کردبیان اور کرد بیان کا لطیفہ یا مثلاً عراقی کے ایک مصرعے میں پسرا، رہ قلندر زن کو بشر زہ' قلندر زن پڑھنا اسی نقص کی غمازی کرتا ہے۔ اس طرح کے صدہا لطیفے زبان زد خواص ہیں۔

۹۔ بائے فارسی، جیم فارسی، زائے فارسی، کاف فارسی مدتوں ب، ج، ز، ک کی شکل میں لکھے جاتے تھے اس کی وجہ سے متن کی تحقیق میں دشواری ہوتی تھی۔

۱۰۔ زیر، زبر، پیش (حرکات) کے لفظ کے املا میں شامل نہ ہونے کی وجہ سے دو لفظوں کے درمیان صوری فرق بہت کم رہ جاتا ہے۔ اس کے برخلاف ہندی اور انگریزی میں زبر (A) زیر (I,E) اور پیش (O,U) سے ظاہر کیے جاتے اور لفظ کے املا میں داخل ہوتے ہیں اور اس کی وجہ سے لفظوں میں شکلاً بین فرق ہوتا ہے اور التباس کا موقع نہیں رہ جاتا۔ لیکن ہماری زبانوں میں یہ فرق اتنا کم ہوتا ہے کہ ایک لفظ کا التباس دوسرے لفظ سے جو معناً مختلف ہے عام

طور پر ہوتا رہتا ہے۔

۱۱۔ فارسی علامت اضافت جو اردو میں بھی رائج ہے، اگر ہمیشہ لکھی جاتی یا املا میں شامل ہوتی تو متن کا تعین قدرے آسان ہو جاتا۔ چونکہ الفاظ کا باہمی رشتہ اضافتوں ہی سے قائم ہوتا ہے اور اس کی علامتیں حرکات کی طرح اکثر نظر انداز ہو جاتی ہیں، تو اس رشتے کے قائم کرنے میں دشواری اور کبھی کبھی غلطی ہو جاتی ہے اور یہی غلطی پھر بڑے نتائج پیدا کرتی ہے۔

۱۲۔ اردو رسم خط میں قدیم میں ہائے مخلوط اور ہائے ہوز میں بہت کم فرق کیا جاتا تھا۔

۱۳۔ شاید ہی کسی زبان کے رسم خط میں متضاد معنی پیدا کرنے کے لیے صرف نقطے سے کام لیا گیا ہو جیسا کہ فارسی میں ہے۔ اسی کی بنا پر فارسی کا متن اس اعتبار سے جتنا اپنے اصل سے دور ہے شاید ہی کوئی دور ہو جائے۔ زینت کا فعل میں اضافہ التباس کے مواقع اور بڑھا دیتا ہے۔

۱۴۔ اُردو کے قدیم رسم خط میں یائے معروف و مجہول کا املائی فرق نہ تھا۔ البتہ صوتی فرق تھا۔ اگر چہ واؤ معروف و مجہول کے درمیان یہ فرق نہیں تھا لیکن اس سے تحقیق متن کا کوئی مسئلہ وابستہ نہیں۔ فارسی میں یائے معروف و مجہول بھی اسی ضمن میں آتے ہیں یعنی ان سے متن کی صحت میں کوئی دشواری نہیں۔ لیکن اُردو کا یہ اہم مسئلہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یائے معروف و مجہول کا تعلق براہ راست زبان سے ہے۔ اکثر یائے مجہول سے مذکر اور جمع اور یائے معروف سے مونث اور واحد کا کام لیا جاتا ہے لیکن ان دونوں کی الگ الگ املائی شکلیں مقرر نہ تھیں۔ یائے معروف ''ے'' کی شکل میں اور یائے مجہول ''ی'' کی طرح بھی لکھی جاتیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان دونوں ''ی'' سے پیدا ہونے والے سارے مسائل محض قیاس کی بنا پر حل ہوئے ہیں۔ مگر بعض مقامات ایسے ہیں جہاں قیاس کو کوئی دخل نہیں ہو سکتا اور جملے دونوں طرح پڑھے جا سکتے ہیں مثلاً جب میں پہنچا تو میری بیٹی آئی۔ یہ جملہ اس طرح بھی پڑھا جا سکتا ہے: جب میں پہنچا تو میرے بیٹے آئے۔ تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ محقق متن نے ایسی حالت میں کیا کیا ہوگا: یہاں تو قیاس بھی ساتھ نہیں دیتا۔ بظاہر انکل پچو سے کام لیا گیا ہوگا۔ غرض یہ انتہائی پیچیدہ مسئلہ ہے اور اسی بنا پر میرا خیال ہے کہ اُردو کی وہ کتابیں جو سو سوا سو سال پہلے کی ہیں، ان میں ''ی'' سے پیدا ہونے والے تذکیر و تانیث اور جنس کے سارے مسائل قابل وثوق حد تک حل نہیں ہوئے ہیں۔

(ب) قدیم متنوں میں تصرفات تحریفات کے وجوہ

متنوں میں تصرفات دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک الحاق کی شکل میں، دوسرے متن کی زبان میں تغیر، ترمیم و اصلاح کی صورت میں۔ اول الذکر کی حالت میں دوسروں کا کلام شامل ہو جاتا ہے اور آخر الذکر صورت میں مصنف کی زبان میں طرح طرح کی ترمیمیں دانستہ اور بے دانستہ طور پر عمل میں آتی ہیں۔ محقق دونوں طرح کے تصرفات کا تعین کرتا ہے اور متن کو کانٹ چھانٹ کر اصل متن متعین کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ متن میں تصرفات مختلف اسباب کی بنا پر عمل میں آتے ہیں جن کا احاطہ مشکل ہے پھر بھی بعض قابل ذکر اسباب حسب ذیل ہیں:

۱۔ ہماری زبان کی املائی دقتیں اور رسم خط کی بعض خصوصیات بڑی حد تک متن میں تصرفات کی ذمے دار ہیں۔

۲۔ کاتب کا جہل جو لاعلمی کی بنا پر ہوتا ہے جب اس کی سمجھ میں کوئی لفظ نہیں آتا تو وہ کچھ کا کچھ لکھ جاتا ہے اور جو لفظ بغیر سمجھے بوجھے لکھا جاتا ہے وہ معمار ہو جاتا ہے۔

۳۔ کاتب کا جہل جو عمداً ہوتا ہے، اس سلسلے کی بہترین مثال خرموسیٰ اور خرعیسیٰ والی ہے۔

۴۔ قدیم متنوں میں نامانوس الفاظ کی کثرت ہوتی ہے، کاتب اکثر پرانے لفظوں کی جگہ نئے لفظ رکھ دیتا ہے۔ فارسی کے مشہور محقق مرزا محمد قزوینی نے دیوان حافظ کے قدیم اور جدید نسخوں میں جو غیر معمولی فرق و اختلاف ملتا ہے اسے اکثر انھیں کاتبوں کی ''اصلاح'' کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں متعدد مثالیں دی ہیں۔ مثلاً خوش وقت بوریا کو خوش فرش بوریا میں، طامات وسطح کو طامات و زرق میں، جانداری کو سرداری میں، راہی بدہست کو راہی بدنیست میں تبدیلی اسی شوق ''اصلاح'' کی بدولت عمل میں آئی ہے۔

۵۔ کبھی کبھی مختلف شاعروں کی ایک ہی زمین والی غزلوں اور ان کی متنوں میں غلط ملط ہو جاتا ہے۔ عبدالرحیم خلخالی نے مقدمۂ دیوان حافظ میں ایسی بہت سی ابیات کی نشاندہی کی ہے جو دیوان حافظ کے اس وقت کے دریافت شدہ نسخوں میں سب سے قدیم نسخے (مکتوبہ ۸۲۷ء) میں شامل ہیں۔ اس طرح کا الحاق صنف غزل میں زیادہ ہوا ہے۔

۶۔ ایک ہی تخلص کے شاعروں کے کلام میں التباس عام ہے۔ظہیر فاریابی کے کلیات میں غزلیات کا تقریباً تمام حصہ صاحب کے ایک شاگرد ظہر تخلص کی ہیں۔ جو مصنف سے تقریباً پانچسو برس بعد میں ہوا ہے۔

۷۔ قدما کے یہاں تخلص کا استعمال کم ہوتا ہے۔اگر کل دیوان، خصوصاً منتخب کا سرورق جس پر شاعر کا تخلص صراحتہً درج ہوتا تھا، الگ ہو جاتا تو سہل پسندی یا جعل غلط فہمی کا راستہ ہموار کردیتا۔

۸۔ بیاضوں کے دار، منہ، ایضاً جیسی علامتوں کے غلط لگ جانے سے ایک شاعر کا کلام دوسرے کی طرف باآسانی منسوب ہو جاتا، کبھی کبھی نسخوں کے اوراق کی بے ترتیبی اور اوراق پر ہندسوں کے نہ ہونے سے طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

۹۔ ایک شاعر جو کسی خاص صنف میں اور کسی مخصوص طرز کے لیے مشہور ہو گیا، تو اس کے مشابہ بہت سی چیزیں جو دوسروں کی ہوتی ہیں، وہ مخصوص شاعر کی طرف منسوب جاتی ہیں۔فارسی میں رباعیات میں اس طرح کا الحاق بکثرت ہے، عمر خیام اور ابوسعید ابوالخیر کا کلام اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

۱۰۔ منتخب دیوانوں کا مجموعہ بھی بڑا التباس پیدا کرتا ہے۔کبھی ایسا ہوتا ہے کہ درمیان سے وہ ورق نکل جاتا ہے جس پر شاعر کا نام درج ہوتا ہے، تو سارا کلام اس سے پہلے شاعر کے نام منسوب ہو جاتا ہے۔خصوصاً ایسا کلام جس میں تخلص کم آتا ہے۔قصیدوں اور رباعیوں میں الحاق کی بڑی وجہ یہی ہے۔

۱۱۔ کبھی کبھی باپ اور بیٹے کے کلام میں سہل انگاری کی بناء پر التباس ہو جاتا ہے۔اور یہ التباس بڑی غلط فہمی کا سبب بن جاتا ہے۔اس سلسلے کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ لطف اللہ مہندس کا ایک رسالہ ترجمۂ خلاصۃ الحساب ہے؛ اس کا ایک نسخہ ذخیرۂ سبحان اللہ (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) میں موجود ہے۔رسالے کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے: امابعد می گوید فقیر لطف اللہ بن استاد احمد معمار الخ۔لیکن رسالے کے اوپر کسی نے رسالہ استاد احمد معمار درج کر دیا ہے۔فہرست نگار نے سہل پسندی میں یہی اطلاع فہرست میں درج کر دی۔اتفاق یہ ہے کہ استاد احمد (م ۱۰۵۹ھ) معمار تاج کی حیثیت سے کافی مشہور ہو چکا ہے لیکن اب تک اس کی کسی تصنیف کا پتہ نہیں چلایا جاسکا۔

مشہور فہرست نگار اسٹوری کو جب اس کی اطلاع ملی تو اس نے اپنی مشہور کتاب ''پرشین لٹریچر'' میں استاد احمد سے متعلق جتنی اطلاعات سامنے آچکی تھیں ان سب کو اپنی کتاب میں بڑی غیر معمولی قابلیت اور کاوش سے جمع کیا اور جب نسخے کا ذکر آیا تو ذخیرۂ سبحان اللہ کے فہرست نگار کا حوالہ دے کر لکھا: Detail Lacking غور فرمایئے کہ ایک غلط اطلاع سے نہ جانے کتنی مزید غلط فہمیوں کا دروازہ کھل گیا۔

۱۲۔ کبھی کبھی کسی خاص مقصد کے ماتحت الحاق عمل میں آتا ہے۔مثلاً مقدمۂ دیوان حافظ میں مدح رسول ﷺ کے بعد کے نسخوں میں یہ عبارت بڑھائی گئی ہے۔

''خصوصاً امام المشارق والمغارب، جامع اصناف حقائق و معارف، قایل کلمۂ انا کلام اللہ الناطق، اسد الغالب، علی ابن ابی طالب الخ''

اس سلسلے میں مرزا محمد قزوینی لکھتے ہیں:

''دلی در، ہیچ یک از نسخ قدیمہ ہیچ وجہ من الوجوہ از جملۂ مزبور اثری نیست و بدون شک الحاقی می باشد از متاخرین در عہد صفویہ بقصد این کہ خواجہ را در نظر بعضی مصالح شیعہ قلمداد کنند''۔

۱۳۔ کبھی کبھی محبوب ہستی کے مرتبے کے پیش نظر بعض دوسری کتابیں ان کی طرف منسوب کر دی جاتی ہیں۔اس سلسلے میں یوسف زلیخائے فردوسی، بعض مثنویات عطار، دیوان خواجہ معین الدین چشتی بطور نمونہ مشتے از خروارے پیش کیے جاسکتے ہیں۔

۱۴۔ انسانی طبائع کی کمزوری جس کی بہترین مثال ایک ہی کتاب کے دو نسخے ہیں جو کسی حال میں یکساں نہیں ہو سکتے دونوں میں کچھ نہ کچھ فرق لازمی ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ ان کی نقلوں اور نقلوں کی نقلوں میں اتنا فرق آجاتا ہے کہ وہ الگ الگ کتابیں معلوم ہونے لگتی ہیں۔اسی لیے کہا جاتا ہے کہ تحقیق کے اعتبار سے مطبع کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ ایک مرتبہ کی چھپی ہوئی کتاب میں اختلاف نسخ ختم ہو جاتا ہے۔گو غلطیوں سے پاک نہیں ہوتی۔اس کے برخلاف ایک کتاب کے اگر ۵۰۰ قلمی نسخے جمع کر لیے جائیں تو ان سے ۵۰ زائد مختلف کتابیں تیار کی جاسکتی ہیں جو ہر لحاظ سے ایک دوسرے سے الگ ہوں گی۔

(ج) محقق متن کی ضروری صلاحیت

تحقیق متن کی پیچیدگیوں کے پیش نظر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ متن کی تصحیح کرنے والے کو مخصوص صلاحیتوں کا مالک ہونا چاہیے۔اگر محقق متن ان

صلاحیتوں سے آراستہ نہ ہوگا تو اس کا مرتب کیا ہوا متن ہرگز قابل توجہ نہیں قرار پا سکتا۔ فارسی متنوں کی تحقیق میں جن صلاحیتوں کی سخت ضرورت ہے ان کو اجمالاً اس طرح بیان کر سکتے ہیں:

۱۔ طرز املا و تاریخ خط سے واقفیت:

متن کی تحقیق و تصحیح میں نسخوں کی قدامت کا تعین نہایت اہم مسئلہ اور جب طرز خط و املا سے واقفیت نہ ہو، یہ مسئلہ خاطر خواہ طور پر حل نہیں ہو سکتا۔ ایسے مخطوطے جن پر تاریخ کتابت درج اور وہ ہر طرح کے شک وشبہ سے پاک ہوں، بہت محدود ہوتے ہیں۔ بغیر تاریخ اور مشکوک نسخوں کے بارے میں کوئی رائے اس وقت تک قائم نہیں کی جا سکتی جب تک مختلف دور میں املا اور خط کا جو طرز رائج تھا، اس سے کما حقہ، شناسائی نہ ہو۔ لیکن ان دونوں چیزوں کی طرف سے برابر غفلت برتی جا رہی ہے اور اب ان کے جاننے والے عنقا ہوتے جا رہے ہیں، اس بنا پر چند باتیں درج ذیل کی جاتی ہیں۔

یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ فارسی میں دال اور ذال دو الگ حرف نہیں بلکہ آوازیں تھیں جو حرف ضرورت بدلا کرتی تھیں۔ اگر دال کے پہلے کا حرف متحرک ہے تو دال نہیں ذال اور اگر حرف ساکن (سوائی و، الف، ی) ہے تو دال ہے۔ اس اعتبار سے آید، شود، روذ، باذ، بوذ، وغیرہ میں ذال ہے اور آیند، شوند، روند، بودند وغیرہ میں دال ہے، دال اور ذال کا یہ فرق نویں صدی کے آخر تک برتا جاتا گو اس پر عمل کی سختی نویں صدی کی ابتداء سے کچھ کم ہونے لگی تھی۔ رفتہ رفتہ دسویں صدی کے پہلے ربع سے یہ قاعدہ[۵] منسوخ ہو چکا ہے۔

دوسری املائی خصوصیت حرف بیان و علت ''کہ'' کی ہے جس کی قدیمی شکل ''کی'' ہے۔ میرے پیش نظر دو نسخوں کے عکس ہیں، ایک ۵۰۷ھ کا اور دوسرا ۶۶۸ھ کا مکتوبہ ہے۔ ان دونوں میں ایک جگہ بھی ''کہ'' موجود نہیں اس سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ ساتویں صدی کے اواخر تک ''کہ'' کو فارسی املا میں جگہ نہیں ملی تھی، ۸۵۸ھ کا ایک نسخہ میرے پیش نظر ہے اس میں ''کہ'' کا برابر استعمال ملتا ہے، البتہ چنانک، زیراک وغیرہ مرکب شکلوں میں ''کہ'' کے بجائے ''ک'' ہے۔ پ، چ، ژ خال خال قدیم املا میں اسی طرح مل جاتے ہیں گو عام طور پر وہ ب، ج، ز کی شکل میں لکھے جاتے تھے۔ ۵۰۷ھ اور ۶۶۸ھ کے مخطوطوں میں اگرچہ آخر الذکر شکل کثرت سے ملتی ہے مگر ایک آدھ جگہ جدید املائی صورت نظر آتی ہے۔ گ کو بارہویں صدی سے پہلے داخلہ نہیں ملتا تھا۔ علامت اضافت کی ایک قدیم شکل یہ ہے کہ وہ فارسی الفاظ جو مختوم بالف ہیں، ان میں ء کا اضافہ کر کے اس کے نیچے زیر دے کر اضافت کا کام لیتے ہیں، جیسے چیزہاءِ آن شخص، حالانکہ درحقیقت یہ درست نہیں، اس لیے کہ ء عربی حرف ہے اور عربی لفظوں کے لیے مخصوص۔ بہر حال یہ چند باتیں فارسی کے طرز املا سے متعلق ہیں۔ اگر ان باتوں کو مد نظر رکھا جائے گا تو قدیم نسخوں کی صحیح حیثیت کو سمجھا جا سکے گا، ورنہ اس معاملے میں سخت غلطی سرزد ہوگی۔ حال ہی میں ''کیمیای سعادت'' کے نسخۂ بانکی پور کے عکس کو دیکھنے کا اتفاق ہوا، اس کے متعلق دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہ امام غزالی کے ہاتھ کا مخطوطہ ہے، لیکن اس عکس کے بغور مطالعہ کے بعد یہ بات معلوم ہوئی کہ نسخہ اوائل یازدہم ہجری یا اواخر دہم ہجری سے قبل کا نہیں ہو سکتا۔ اس بنا پر کہ اس میں دال وذال کا وہ فرق جو قدیم نسخوں کا املائی خاصا تھا، ایک جگہ بھی برقرار نہیں رکھا جا سکا ہے۔ یہی حال دوسری قدیم املائی خصوصیات کا ہے۔ ایسی حالت میں اس کو پانچویں صدی ہجری یعنی امام غزالی کی حیات کا سمجھنا حقیقت کے سراسر خلاف ہے۔ گویا طرز املا سے ناشناسائی کی بنا پر پانچسو سال کے تقدم زمانی کا دھوکا ہو سکتا ہے۔

طرز خط کا معاملہ کچھ کم اہم نہیں۔ فارسی میں نسخ اور نستعلیق خطوں کا زیادہ رواج ہے، نسخ قدیم ہے جس کا موجد ابن مقلہ (متوفی ۳۲۷ھ) بتایا جاتا ہے۔ نستعلیق خواجہ میر علی تبریزی کی ایجاد، میر مذکور کو تیمور گورگانی کے دربار میں بڑی قدر و منزلت حاصل تھی اور وہ کمال خجندی (م: ۸۰۸ھ) کا معاصر تھا۔ سلطان علی مشہدی نے (م: ۹۰۹ یا ۹۱۵ یا ۹۱۹ھ) جو نستعلیق خط میں بڑا کمال رکھتا تھا، لکھا ہے[۶]:

نسخ و تعلیق اگر خفی و جلی است
واضع الاصل خواجہ میر علی است
تا کہ بود است عالم و آدم
ہرگز این خط نبودہ در عالم
وضع فرمود او ز ذہن دقیق
از خط نسخ و ز خط تعلیق

در جمیع خطوط بود شگرف
ز اوستادان شنیده ام این حرف
بد معاصر بہ مجمع الافضال
شیخ شیریں مقال شیخ کمال
آنکہ شعرش چو میوہ ہای خجند
ہست شیریں تر از نبات مو ز قند

اس سے صاف ظاہر ہے کہ نستعلیق خط آٹھویں صدی کے تقریباً اواخر کی ایجاد ہوگی اور اس بنا پر جو مخطوطے خط نستعلیق میں ہوں گے وہ آٹھویں صدی ہجری کے پہلے کے متصور نہ ہوں گے۔ لیکن اکثر دیکھا ہے کہ معمولی نستعلیق خط میں لکھا ہوا مخطوطہ خط کی ناشناسائی کی وجہ سے ساتویں صدی کا قرار دیا گیا ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہے کہ قدیم متن کے صداقت کے تعین میں خط اور املا سے واقفیت کس قدر ضروری ہے۔

۲۔ شاعری و فن عروض:

جو شخص شاعری اور فن عروض میں حسب ضرورت دستگاہ نہیں رکھتا، وہ قدیم متنوں کی تصحیح خاطر خواہ نہیں کر سکتا۔ موزونیت کا احساس نہ رکھنے والے اور قوافی و اوزان و بحور سے ناآشنا حضرات کو شعری ادب کی طرف توجہ نہ کرنا چاہیے کیونکہ متن کی تصحیح میں قدم قدم پر انھی کا سہارا لینا پڑتا ہے، ذوق شعر اور مذاق سلیم کے بغیر تصحیح متن کا کام نہیں ہو سکتا۔ اکثر لفظوں پر نقطے نہیں ہوتے وہ کئی طرح پر پڑھے جا سکتے ہیں۔ ان کی صحیح قرأت دوسرے اور لفظوں کی مدد سے متعین کی جا سکتی ہے۔ مثلاً ''لک'' کو بیک نیک، پیک، ننگ، تنگ، بنگ، تنک، ننک، منگ، سب پڑھ سکتے ہیں۔ اب اگر اس کے ساتھ دہن، دل، یا دامن ہے تو اسے تنگ پڑھنا چاہیے۔ اگر خو، بو ہے تو نیک پڑھیں گے، اگر ناموس یا نام ہے تو ننگ صحیح قرأت ہوگی۔ جو لوگ تحقیق متن کا کام کرتے ہیں، ان کو روز اس طرح کے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس قسم کی بیسیوں مثالیں وہ ہر وقت پیش کر سکتے ہیں۔

۳۔ عہد بعہد زبان سے واقفیت:

فارسی ادب کا جو سرمایہ ہمارے سامنے ہے وہ ہزار برس سے زیادہ کی طویل مدت کے درمیان فراہم ہوا ہے۔ فارسی کی سب سے قدیم مکشوف کتاب فقہ حنفی پر ہے جو ابوالقاسم سمرقندی (م: ۳۴۲ھ) کی تصنیف ہے، یہ کتاب ۳۲۵ ہجری کے قریب مرتب ہوئی ہوگی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اوائل قرن چہارم میں فارسی زبان ارتقاء کی کافی منزلیں طے کر چکی تھی۔ بہر حال اس ہزار سال کی طویل مدت میں نہ جانے کتنی تبدیلیاں ہوئیں چنانچہ ہر دور کی زبان دوسرے دور کی زبان سے بعض لحاظ سے کافی مختلف ہے، اس بنا پر محقق متن کے لیے لازم ہے کہ وہ زبان کی ہر دور کی مخصوص خصوصیات کو جانتا ہو تا کہ مصنف کے دور کے تعین میں آسانی ہو، اس کے اس علم سے فائدہ یہ بھی ہوگا کہ وہ نامانوس اور ناآشنا لفظوں کا صحیح تعین کر سکے گا۔

۴۔ کاغذ اور سیاہی کا علم:

کاغذ و سیاہی تحقیق متن کے امور ہیں جن سے واقفیت سے تحقیق میں مدد ملتی ہے۔ سیاہی کی تیاری بڑا مشکل کام خیال کیا جاتا تھا۔ اس کام میں برسوں تجربہ اور آزمائش کی جاتی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ۸ سو ۹ سو سال کے پرانے نسخے آج بھی اسی طرح دعوت نظارہ دیتے ہیں۔ ان پرانی سیاہیوں کا مقابلہ آج کل کی سیاہی سے کیا جائے تو ان قدیم فنکاروں کی دقت نظری کی داد دینا پڑتی ہے۔ یہی حال پرانے کاغذوں کا ہے۔ بعض کاغذ ایسے اچھے ہوتے تھے کہ ہزار سال کی مدت کے بعد آج وہ نئے معلوم ہوتے ہیں۔ کاغذ و سیاہی کی مختلف اقسام کی واقفیت نسخے کی قدامت و اہمیت متعین کرنے میں بڑی مفید ہوتی ہے۔

۵۔ خطاطوں کے تذکروں سے استفادہ:

اہم قلمی کتابوں کے لکھنے والے اکثر مشہور خطاط ہوتے ہیں۔ خطاطوں سے واقفیت نسخے کی اہمیت کے تعین کی ضامن ہے۔ اگرچہ خطاطوں کے تذکرے کم ہیں اور جو ہیں ان میں صرف مشہور خطاطوں کا ذکر ملتا ہے۔ غیر خطاط ہزاروں کی تعداد میں ایسے ہیں جن کا احاطہ کسی تذکرے میں نہیں ہو سکا ہے۔ پھر بھی ضمناً مشہور خطاطوں کے ضمن میں بعض غیر معروف خطاطوں کا ذکر آ جاتا ہے۔ بہر حال یہ تذکرے بہت سود مند ہوتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ معمولی کاتب کا لکھا

ہوا نسخہ مشہور کاتب کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے۔ اگر ہم خطاطوں کے دور اور ان کے طرزِ خط سے آشنا ہوں گے تو اس طرح کے جعل کا پردہ فوراً چاک ہو جائے گا۔ غرض قلمی نسخے کی قدر و قیمت کے تعین میں خطاطوں کے تذکروں سے مدد مل سکتی ہے۔

(د) تحقیق متن کے اسناد

متن کی تصدیق کے سلسلے میں مختلف اسناد و مدارک ہوتے ہیں اور جب یہ سارے اسناد کو کام میں لا کر متن کی تصحیح ہوتی ہے تو وہ بڑی حد تک بھروسے کے قابل ہوتے ہیں۔ یہ اسناد حسب ذیل ہیں:

۱۔ منثور و منظوم متون:

جب کسی متن کی تحقیق منظور ہو اس کے قدیم اور معتبر نسخوں کی تلاش کرنا چاہیے۔ قدامت و اعتبار کے لیے جو معیار اوپر بیان ہوئے ہیں، ان پر نسخوں کو جانچنا چاہیے۔ اس طرح کے معتبر نسخے پھر ایسے نسخے جو مصنف یا اس کے شاگرد کے نسخوں کی نقل ہوں، پھر اچھے خطاط کے لکھے ہوئے نسخے، پھر ایسے نسخے جن پر شاہی کتاب خانوں کی مہریں ہوں، پھر ایسے نسخے جو مشاہیر کے مطالعے میں رہ چکے ہیں، حاصل کیے جائیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بعد کے نسخوں میں قدیم نسخے کا ترقیمہ درج کر دیا جاتا ہے، کبھی پرانے کاغذ پر جدید قلم سے کتاب لکھ لی جاتی ہے۔ کبھی عمداً غلط تاریخ درج ہو جاتی ہے۔ کبھی کتاب کی تاریخ تحریر تاریخ کتابت سمجھ لی جاتی ہے اس بنا پر کام کرنے سے قبل ان تمام امور کی بڑی چھان بین کر لینی چاہیے۔ یہی نسخے اصل ہیں اور انھی پر تحقیق کی بنیاد رکھی جاتی ہے، دوسرے اور اسناد ان کی صحت و صداقت کے جانچنے میں کام آتے ہیں۔

۲۔ بیاضیں:

بیاضوں کے ماخذ قدیم متون ہی ہوتے ہیں، لیکن بیاضوں کا کلام منتخب ہوتا ہے اور دیوان سے بعض اوقات کسی قدر مختلف ہو جاتا ہے۔ دواوین اکثر شاعر کی حیات ہی میں مدون ہوتے ہیں، اس بنا پر شاعر کی بعد کی زندگی کا کلام شامل ہونے سے رہ جاتا ہے اور اسی لیے شاید ہی ایسا کوئی دیوان ملے جو شاعر کے تمام کلام کو حاوی ہو۔ ایسا کلام بیاضوں میں مل جاتا ہے۔ اس بنا پر بیاضوں سے ایک طرف تو گم شدہ کلام کی نشاندہی ہوتی ہے تو دوسری طرف ان سے متن کی تصدیق و تصحیح میں مدد ملتی ہے۔

بیاضوں کی ترتیب کئی طرح پر ہوتی ہے۔ بعض مضامین و مطالب کے اعتبار سے جمع ہوتی ہیں۔ ایسی بیاضیں بہت اہم ہوتی ہیں کیونکہ ان میں بہت سا اہم اور نیا مواد ہوتا ہے۔ بعض بیاضیں تاریخی ترتیب سے مرتب ہوتی ہیں، ان میں شاعروں کا کلام ترتیب زمانی کے اعتبار سے جمع ہوتا ہے۔ اس طرح کی بیاضوں سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ شاعروں کے دور کا تعین ہو جاتا ہے۔ بعض بیاضیں چند شاعروں کے منتخب کلام کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ ایسی بیاضیں اصل متون کا کام دیتی ہیں۔ بعض بیاضیں جو بغیر کسی خاص ترتیب کے مرتب ہوئی ہیں، ان میں بعض نیا اور اہم مواد مل جاتا ہے۔

بیاضوں کی اہمیت کا ایک پہلو یہ ہے کہ غیر معروف شاعروں کے کلام کا واحد ماخذ یہی مجموعے ہوتے ہیں۔ عام طور پر محض مشہور شعرا کا کلام مدون و مرتب ہوتا ہے اور وہی نسلاً بعد نسل نقل ہوتا رہتا ہے۔ اگر غیر معروف شعرا کا کلام ایک آدھ بار نقل بھی ہوا تو وہ گوشۂ گمنامی میں ایسا چلا جاتا ہے کہ اس کا نام و نشان باقی نہیں رہ جاتا۔ بیاضوں ہی کی بدولت ایسے شاعر زندہ رہتے ہیں۔ اس بنا پر ان کی اہمیت دیوان سے کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ جو حضرات متن کی تحقیق میں بیاضوں سے استفادہ نہیں کرتے ان کا مرتب کردہ متن ناقص اور ادھورا رہ جاتا ہے اور جب تک زبان کی ساری بیاضوں سے غیر معروف شعرا اور ادیبوں کا کلام یکجا نہیں کر لیا جاتا اس وقت تک زبان کی ادبی تاریخ نامکمل اور ناقص رہتی ہے۔

ہندوستان کے فارسی ادب کے سلسلے میں بیاضوں کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے۔ دورِ مغلیہ سے قبل کی فارسی شاعری کے بارے میں ہماری معلومات بہت ناقص ہیں۔ تین سو سوا تین سو سال کی طویل مدت کے صرف چند شاعروں کے دیوان اور بہت کم نثری تصانیف موجود ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ بہت سا کلام زمانے کے ہاتھوں برباد ہو چکا ہے۔ اگر سارے وسائل کو کام میں لا کر گم شدہ کلام کی بازیابی کی پوری کوشش کی جائے تو یقین کامل ہے کہ بہت سا نیا کلام دستیاب ہو جائے گا۔ یہ بات کس قدر عجیب ہے کہ اصل مواد کے جمع کرنے کے بجائے اس عہد کی تاریخ ادب لکھ ڈالی گئی جو ناقص اور ادھورے مواد پر مبنی ہونے کی وجہ سے کسی حد تک ناقابل توجہ ہے۔ ہندوستان کے اس دور کے کلام کی دریافت ان بیاضوں کی مدد سے ہو سکتی ہے جن کی نشاندہی ارمغان علمی رسالہ فکر و نظر اور پروفیسر محمود شیرانی کی تنقید پر

کتاب ''عہد مغلیہ سے قبل کی شاعری'' میں کردی گئی ہے۔

۳۔ تذکرۃ الشعرا:

تذکروں میں کافی اشعار واقوال ہوتے ہیں، جن سے متن کی تکمیل وتصحیح میں مدد لی جاسکتی ہے اور کبھی کبھی کلام کے الحاق والتباس کے دور کرنے میں یہ تذکرے بہت مفید ثابت ہوتے ہیں۔ شعرا کے تذکروں کے علاوہ ائمہ، اطبا، حکما اور صوفیا وغیرہ کے تذکروں سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے، کبھی کبھی ان کی طرف سے بے اعتنائی بڑی غلط نتائج کا موجب ہوجاتی ہے۔ حال ہی میں پروفیسر سعید نفیسی، نے انوری کا کلیات مرتب کیا ہے۔ اس میں ہندوستان کے دور التمش کے ایک شاعر تاج الدین ریزہ کا کلام شامل ہوگیا ہے۔ اگر مجمع الفصحا میں تاج الدین دہلوی کے کلام پر ان کی نظر پڑ جاتی تو یہ غلطی رونما نہ ہوتی اور وہ قصیدے جو اس شاعر کے ذیل میں درج ہیں وہ دیوان انوری میں نہ شامل ہوتے۔

تذکرۃ الشعراء کا ایک فائدہ بڑا یہ ہے کہ اس کے ذریعے غیر معروف شعرا کا کلام ہاتھ آجاتا ہے اور ظاہر ہے کہ ان شعرا کے کلام کے مطالعے کے بغیر تاریخ ادب نامکمل رہتی ہے۔

۴۔ سیاسی تاریخیں:

سیاسی تاریخوں میں اہم واقعات کے ذیل میں شعرا کا کلام گاہے گاہے درج ہوجاتا ہے اور ہنگامی واقعات سے متعلق شاعرانہ کلام کا کافی نمونہ ان تاریخوں میں مل جاتا ہے، بدیوانی کی منتخب التواریخ اس کا بہترین نمونہ ہے۔ جلد سوم سے قطع نظر جو تذکرۃ الشعرا ہی ہے، جلد اول میں تیرہویں اور چودھویں صدی کا جتنا نادر کلام محفوظ ہے، شاید ہی کسی ایک کتاب میں اتنا کلام جمع ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ تحقیق متن کے سلسلے میں ان تاریخوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

۵۔ لغات وقواعد:

لغات وقواعد میں کافی اشعار سند کے طور پر نقل ہوتے ہیں جن سے متن کی تصحیح وتطبیق میں استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ فارسی کی ایک فرہنگ معیار جمالی ہے، جس کے مرتب شمس فخری نے ہر لغت کی سند میں خود اپنے اشعار پیش کیے ہیں، وہ اس طرح کہ ایک حرف پر ختم ہونے والے سارے معانی درج کرنے کے بعد مؤلف نے میر اسحاق انجوے شیرازی کی مدح میں ایک یا چند قصیدوں کے قوافی میں وہ سارے لغت صرف کردیے ہیں۔ اس طرح حروف تہجی سے زیادہ تعداد میں قصیدے اس فرہنگ میں جمع ہوگئے ہیں۔ گویا اس لغت کو مؤلف کا دیوان سمجھنا چاہیے۔ اسی طرح ساری فرہنگ میں کچھ نہ کچھ اہم اور نایاب کلام محفوظ ہوتا ہے۔ حال ہی میں ایران میں فارسی کے قدیم لغات اور تذکروں سے چند شاعروں کا کلام گنج بازیافتہ کے نام سے جمع کیا گیا ہے جو کسی اور ذرائع سے حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔

۶۔ ملفوظات صوفیہ:

صوفیہ اور مشائخ کے اقوال ان کے مریدین جمع کرتے ہیں۔ ان میں کافی منظوم کلام بھی آجاتا ہے۔ یہ کلام اکثر انھی بزرگ کا ہوتا ہے لیکن گاہے گاہے دوسروں کے اشعار بھی شامل ہوجاتے ہیں۔ لطائف اشرفی سید جہانگیر اشرف سمنانی کے ملفوظات کا مجموعہ ہے۔ اس میں خود سید موصوف کے کلام کا معتدبہ حصہ منقول ہے، علاوہ بریں اکابر صوفیہ کے کلام کا کافی نمونہ نقل ہوا ہے۔ تاریخ ادب کا یہ یادگار واقعہ کہ خود موصوف نے حافظ شیرازی سے مل کر ان کے بہت سے اشعار نقل کیے ہیں، اسی کتاب میں موجود ہے، ان کے علاوہ نظامی، سنائی، عطار، مولانا روم، سعدی وغیرہ کے مختصر تذکرے کے ساتھ ہی ان کے کلام کا نمونہ بھی درج کیا ہے جو فارسی ادبی تاریخ میں بے حد اہم اور قابل توجہ ہے۔

۷۔ مکاتیب:

ادیبوں، شاعروں اور صوفیوں کے خطوط سے بھی متن کی تحقیق میں مدد لی جاسکتی ہے۔ غرض ان مکاتیب میں منقول کلام سے کسی شاعر یا ادیب کے کلام کی تحقیق وتدوین کے موقع پر بجا طور پر استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

(ی) تحقیق شدہ متن کی ترتیب وغیرہ

تحقیق متن کی ترتیب وغیرہ کے سلسلے میں کئی طریقے رائج ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ جو نسخہ سب سے اچھا اور معتبر ہوتا ہے اس کو بنیاد بنا کر اس کے سارے

مندرجات متن وعن متن قرار پاتے اور دوسرے تمام نسخوں کے اختلافات حاشیے میں درج کردیے جاتے ہیں، یہ اختلافات آخر کتاب بھی رکھے جاسکتے ہیں۔ بعض لوگوں نے اس میں ذراسی تبدیلی کی۔ انھوں نے ایک خاص نسخے کو بنیاد تو قرار دیا لیکن دوسرے نسخے کے اضافوں کو اصل متن میں بریکٹ [ ] کے اندر اضافہ کردیتے ہیں۔ لیکن اس طریقہ کار میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ اگر ایک نسخہ کو پورے کا پورا متن قرار دے دیا جائے اور دوسرے تمام نسخوں کے اختلافات کو حاشیے میں جگہ دی جائے تو یہ کام ایسا شخص بھی کرسکتا ہے، جو زبان متعلقہ سے بہت ہی کم واقفیت رکھتا ہو۔ دوسرے نسخوں کے اختلافات کو خواہ کتنے دقیع کیوں نہ ہوں ثانوی حیثیت دینا ایک طرف تو مصنف کے بجائے کاتب تک پہنچنے کی کوشش ہے تو دوسری طرف محقق متن کا مرتبہ گھٹ کر ایک کاتب کے درجے تک پہنچ جاتا ہے۔ محقق کو متن کے ایک ایک لفظ پر غور کرنا ہوتا ہے۔ پھر جو لفظ صحیح ہوں وہ داخل متن کیے جائیں اور صحت کا معیار محض اصل مصنف کے کلام کا تعین ہو اور کوئی چیز نہ ہو۔ اس کے پیش نظر یہ بات ہونا چاہیے کہ مصنف نے کیا لکھا ہوگا، اس میں محقق کی اپنی پسند و ناپسند اور اپنے دور کے انداز فکر کے بجائے مصنف کا انداز فکر، اس کے دور کے تقاضے اور لسانی وادبی خصوصیات کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ حال ہی میں حافظ کے اس شعر میں:

ترا صبا و مرا آب دیدہ شد غماز
وگرنہ عاشق و معشوق راز دار انند

لفظ ''صبا'' کی قرأت کے سلسلے میں بحث چھڑ گئی۔ بعض لوگوں نے ''حیا'' کو ''صبا'' سے بہتر سمجھ کر اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی، لیکن یہ بات تقریباً مسلم تھی کہ حافظ نے صبا ہی لکھا ہے، حیا نہیں۔ اس پر ایک صاحب یہاں تک لکھ گئے کہ اگر حافظ نے ''صبا'' لکھا ہے تو یقیناً غلط ہے، یہاں حیا کا محل ہے، صبا بالکل بے محل ہے۔ اس سے قطع نظر کہ ''حیا'' زیادہ برمحل ہے یا صبا، یہ بات صریحی طور پر معلوم ہے کہ مبحث یہی تھا کہ حافظ نے کیا لکھا ہے، یعنی تحقیق کلام مقصود تھی۔ تنقید نہیں۔ ہمیں حافظ کے کلام کا تعین کرنا تھا، موجودہ دور میں اُردو کے تقاضے کے پیش نظر اس کلام پر تنقید مقصود نہیں تھی۔

حاصل کلام اگر ایک نسخے کو متن قرار دیا گیا تو پھر غور وفکر کا دروازہ بند ہو جاتا ہے، اس بنا پر میرے نزدیک ایسا متن نہ قابل توجہ اور نہ ایسے محقق متن کی کوشش قابل ستائش، البتہ نسخے کی دریافت کا سہرا اس کے سر رہے گا، لیکن نسخوں کا انکشاف اور متن کی تحقیق لازم وملزوم ہونے کے باوجود دو مختلف فن ہیں اور دونوں کے لیے جداگانہ قابلیت درکار ہے۔

متن کی تصحیح کے اور بھی مراحل ہیں۔ متن کے اندر سارے حوالہ جات کی تصدیق وتوثیق تصحیح وتصدیق متن کے حدود میں شامل ہے۔ یہ حوالے آیات قرآنی، احادیث نبوی، اقوال صوفیہ، کلام مشائخ وعلماء اشعار شعرا کی شکل میں ہوتے ہیں ان کا باقاعدہ تعین اصل کتاب کے تنقیدی ایڈیشن سے مقابلے کے بعد کرنا چاہیے۔ اگر مصنف نے براہ راست کتاب یا مؤلف کا حوالہ نہ دیا ہو تو بھی کوشش کرنی چاہیے کہ مؤلف کا پتا لگ جائے اور اس کتاب سے مقابلے کی صورت نکل آئے تاریخوں اور تذکروں میں ضرورت بہت شدید ہوتی ہے۔ اس سلسلے کی بہترین مثال شاہنواز خاں کی تالیف ''مآثر الامرا'' ہے۔ اس شاندار تصنیف کے تحقیقی وتنقیدی ایڈیشن کے کتاب کے مآخذ سے مقابلہ ضروری تھا، اور اگرچہ مآخذ کی نشاندہی ہر جگہ نہیں ملتی، پھر بھی متعلقہ دور کی تاریخوں اور تذکروں کے مطالعے سے ان مآخذ کا پتا لگایا جاسکتا ہے۔ یہ ساری تفصیلات حواشی وتعلیقات کے زیر عنوان کتاب کے آخر میں درج کرنا چاہیے۔

اختلافات نسخ میں عموماً وہی اختلافات درج کرنا چاہیے جو معنی دار ہوں مہمل وبے معنی الفاظ کو داخل کرنا سعی لا حاصل ہے۔ ظاہر ہے اختلافات کے درج کرنے کا مقصد یہ ہے کہ متن کی تحقیق کے سلسلے میں غور وفکر کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہے، چونکہ مہمل لفظوں سے اس سلسلے میں کوئی مدد نہیں ملتی اس لیے ان کا حذف اولی تر ہے۔ بعض محقق اختلاف نسخ کو فضول خیال کرتے ہیں۔ یہ خیال ہرگز قابل توجہ نہیں۔ محقق کتنا ذی مرتبہ کیوں نہ ہو، اس کا دعویٰ جو کچھ اس نے درج کردیا اس پر اضافہ ممکن نہیں، اس کا فیصلہ قابل ترمیم نہیں، اس نے جو متن پیش کیا ہے وہی مصنف کی اصل تصنیف ہے محض باطل اور گمراہ کن ہے۔ تحقیق کی دنیا میں Arbitration سے زیادہ بڑا اور کوئی جرم نہیں۔ اختلافات نسخ کے درج کرنے کے مخالف دراصل Arbitrator ہیں۔ بہر حال اختلافات نسخ تحقیق متن میں حد درجہ ضروری ہیں۔ اگر یہ اختلافات ہر صفحہ پر درج ہوں تو ان سے استفادہ میں آسانی ہوتی ہے۔ آخر کتاب میں درج کرنے سے استفادے کا موقع کم ہو جاتا ہے مگر کتاب کی طباعت میں اس کی وجہ سے بڑی آسانی ہو جاتی ہے۔

متن کی تصحیح اور حواشی وتعلیقات کے بعد ضروری ہے کہ ایک مقدمے کا اضافہ کیا جائے جس میں مصنف کتاب کے بارے میں ضروری باتیں اختصار سے درج ہوں۔ پھر ان تمام نسخوں کے خصائص درج کیے جائیں جن سے متن تیار کیا گیا ہے۔ نسخوں کی خصوصیات درج کرتے وقت اس بات کا پورا لحاظ رکھا جائے کہ نسخہ کب لکھا گیا، کاتب کون ہے، خط کس قسم کا ہے، نسخہ کس حالت میں ہے۔ اور اس طرح کی دیگر ضروری باتیں درج کرکے یہ بات پوری طرح واضح کردینا چاہیے کہ تصحیح

شدہ متن کس پائے کا ہے۔ اگر نسخے ناقص اور نامکمل اور بعد کے غیر معروف و بدخط کاتبوں کے لکھے ہوئے ہوں تو متن اتنا بھروسے کے قابل نہ ہوگا اور اچھے نسخے کی مدد سے اس پر خاطر خواہ اضافہ ممکن ہو سکے گا۔ اگر متن اعلیٰ درجے کے نسخوں کی رو سے ترتیب دیا گیا ہے جس میں اور دوسرے اسناد سے پوری طرح مدد لی جا چکی ہے تو گھٹیا نسخوں کی مدد سے اس پر مزید کام کرنے کا موقع نہیں۔ بہر حال مرتب کی کوشش اس امر پر مرکوز رہنی چاہیے کہ مصنف تک پہنچنے کی کوشش کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہے۔

جو کتابیں اور نسخے بار بار مذکور ہوں، ان کے لیے علامت اختصار استعمال کرنا چاہیے، یہ علامت مقرر کرتے وقت جگہ یا مالک نسخہ یا کتاب خانہ کا نام پیش نظر رکھنا چاہیے۔ جو نام صرف چند بار آتے ہوں ان کے لیے حرفوں میں علامت اختصار موجب زحمت ہوتی ہے بعض علامات بین الاقوامی حیثیت حاصل کر لیتی ہیں ان کو ضرور باقی رکھنا چاہیے جیسے مطبوعہ کے لیے ''م''، قلمی کے لیے ''ق''، خطی کے لیے ''خ'' مقرر ہے۔ نسخوں اور کتابوں کے علاوہ بعض اور امور میں جن کے اختصار کی ضرورت پیش آتی ہے مثلاً رجوع کنید کے لیے رک، وغیرہ وغیرہ۔

یہ ہے ایک گزارش ان امور کی جن کی مدد سے تحقیقی متن تیار کیا جاتا ہے، تحقیق متن کے دوران میں ان کا جتنا خیال رکھا جائے گا اتنا ہی مرتب کیا ہوا متن وقیع اور قابل اعتنا ہوگا۔ توقع کی جاتی ہے کہ اس گزارش سے تحقیق متن کی اہمیت اور اس سے متعلقہ امور کا ایک اجمالی نقشہ قائم ہو سکے گا اور ساتھ اس راہ کی دشواریوں کا بھی بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔ ان سطور کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ قارئین کو معلوم ہو جائے کہ تحقیق کے معاملات میں تصحیح متن کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ اس مرحلے کو طے کرنے کے بعد دوسری منزلیں یعنی ترجمہ و سوانحمری اور تاریخ نویسی وغیرہ کی منزلیں آتی ہیں۔ جس ادب کے تحقیقی مراحل اسی ترتیب سے طے کیے جائیں گے اس کے ادبی امور قابل توجہ اور اطمینان بخش ہوں گے۔ افسوس ہے مشرقی زبانوں بالخصوص فارسی میں کچھ کم اور اردو میں بہت ہی کم اس ترتیب کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

❖❖❖❖

حواشی

(۱) مطبوعہ ''نقوش'' لاہور مارچ ۱۹۶۳ء ص ۵ تا ۲۰۔

(۲) فارسی اس ضرب المثل میں نقطے دار حرفوں کو بے نقطے والے حرفوں پر ترجیح دی گئی ہے۔ طمع را سہ حرف است، ہر سہ تہی

(۳) راقم نے اورینٹل کالج میگزین ۱۹۵۹ء میں یہ اطلاعات شائع کر دی ہیں۔

(۴) یہ رباعی اور قطعہ ملاحظہ ہو:

آنانکہ بفارسی سخن میرانند
در معرض دال، ذال را بنشانند
ما قبل وی ار ساکن جز وای بود
دال است وگرنہ ذال معجم خوانند

در زبانِ فارسی فرمن میان دال و ذال
باتو گویم زآنکہ آن نزد افاضل مبہم است
پیش ازو در لفظ مضرو گر صحیح ساکن است
دال باشد ورنہ باقی جملہ ذال معجم است

اس سلسلے میں ملاحظہ ہو ارمغان علمی ص ۱۳۹ تا ۱۵۸۔

(۵) عطاء اللہ بن محمود حسینی نے اپنے ایک قدیم رسالے تکمیل الصناعۃ (تالیف قبل ۹۰۳ھ) کے مقطع (خاتمہ) پر مبنی ایک رسالہ میں جو ۹۲۵ھ میں مکمل ہوا، لکھا ہے: ''امادریں شہرا کثر والہای معجمہ را بدل مہملہ میگویند و متعارف شدہ و قاعدۂ مذکور منسوخ شد''۔ اس رسالے کا نسخہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی کے کتاب خانے میں ہے۔

(۶) دیکھیے تذکرۃ الخطاطین جلد اول:

(۷) اس کتاب کے دو نسخے دریافت ہوئے ہیں، ڈاکٹر مہدی بیانی نے ان کا تعارف کرایا ہے، دیکھیے نمونۂ سخن اور ارمغان علمی ص: ۲۲۱، ۲۳۰۔

❖❖❖❖

تیاری اور مواد کی فراہمی[۱]

ڈاکٹر خلیق انجم

تیاری:

اصل متن پر کام شروع کرنے سے پہلے متنی نقاد کو جو تیاری کرنی ہوتی ہے یہاں اس کا تفصیلی جائزہ لیا جاتا ہے۔

۱۔ متنی نقاد کا فرض ہے کہ مختلف عہد کے کچھ منتخب نسخے پڑھے تاکہ اُسے مختلف تحریروں پر پورا عبور حاصل ہو سکے۔ فرض کیجیے ہمیں انعام اللہ خان یقین کا دیوان مرتب کرنا ہے۔ یقین کی ولادت ۱۱۴۰ھ میں ہوئی، ان کی ادبی زندگی کا آغاز کم از کم پندرہ برس کی عمر یعنی لگ بھگ ۱۱۵۵ھ میں ہوا ہوگا۔ متنی نقاد کو اس عہد سے قبل کے کچھ نسخے پڑھنے چاہییں۔ اس انتخاب کے باقاعدہ اصول تو نہیں ہیں لیکن یہ خیال رکھنا چاہیے کہ یقین کی ادبی زندگی کے آغاز سے پہلے خان آرزو اور ان کے شاگرد میدانِ ادب پر چھائے ہوئے تھے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس اسکول کے کچھ نمایاں شاعر منتخب کر لیے جائیں۔ جن شعرا کا دیوان ملتا ہے، ان کے دیوان حاصل کیے جائیں اور باقی شعرا کا مطالعہ تذکروں کی مدد سے کیا جائے۔ اگر یقین نے کچھ ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو خان آرزو کے عہد میں رائج تھے لیکن بعد میں متروک ہو گئے تو انھیں صحیح پڑھنے میں مدد ملے گی۔

اب عہدِ یقین پر آئیے، اس عہد کے جتنے زیادہ نسخوں کا مطالعہ کیا جائے گا اتنا ہی مفید ہے۔ خاص طور پر مرزا مظہر کا کلام اور ان کے جتنے شاگردوں کے دیوان ملتے ہیں اُن سب کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس عہد کے باقی شاعروں کا ایک انتخاب ہی کافی ہے۔ اب تک گویا دیوانِ یقین پڑھنے کی تیاری کی گئی تھی۔ اب یقین کے جتنے بھی نسخے ملتے ہیں، اُن سب کا بڑی احتیاط سے مطالعہ کیا جائے۔ ایک نسخہ پڑھنے میں باقی نسخوں سے مدد ملتی رہتی ہے۔ جب تک ایک ایک لفظ سمجھ میں نہ آ جائے ان نسخوں کا مطالعہ جاری رکھنا چاہیے۔

۲۔ متنی نقاد کو عہدِ یقین کی زبان پر پوری قدرت حاصل ہونی چاہیے۔ جب وہ مختلف نسخے پڑھنے کی مشق کرے گا تو یقیناً ایسے الفاظ ملیں گے جن کا وہ مطلب نہیں جانتا اور جو متروک ہو گئے ہیں، ایسے الفاظ بھی ملیں گے جو اُردو میں اب تک مستعمل ہیں لیکن جن کا مفہوم بدل گیا ہے۔ ایسے الفاظ کی بھی کمی نہ ہوگی جن کا تلفظ اس عہد میں کچھ اور تھا اور جدید اُردو میں کچھ اور ہے۔ ان تمام الفاظ کے لیے ہندی، اُردو، فارسی اور عربی کی لغتوں کا استعمال ضروری ہے۔ ایسے الفاظ کی مثالیں آگے دی جائیں گی۔

۳۔ اس عہد کی ادبی تاریخ پر پورا عبور حاصل ہونا چاہیے ایک تو اس لیے کہ کہیں دوسرے شعراء کا کلام دیوانِ یقین میں شامل نہ ہو گیا ہو۔ دوسرے نسخہ نقل کرتے ہوئے کاتب جو تحریف کرتا ہے اسے سمجھنے کے لیے اُس عہد کی ادبی اور لسانی تحریکیں سمجھنا بہت ضروری ہے۔ مثلاً خانِ آرزو کے شاگرد اور ان کے بعض ہم عصر شعرا ایہام گو تھے۔ اسی لیے اُن کے عہد کو ''دورِ ایہام گویان'' کہا جاتا ہے۔ کچھ تو برج بھاشا کے اثر سے اور کچھ ایہام پیدا کرنے کے لیے انھوں نے کچھ ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو اُردو زبان کے مزاج کے مطابق نہیں تھے اور جنھیں بعد میں متروک قرار دیا گیا۔ مرزا مظہر جان جاناں نے ایہام گوئی کے خلاف تحریک شروع کی تھی۔ جسے ''سادہ گوئی'' کہا جاتا تھا۔ اس تحریک کا اثر تھا کہ انھوں نے اور ان کے ساتھیوں اور ہم عصروں نے بہت سے الفاظ کو متروک قرار دیا اور بہت سے الفاظ کا تلفظ اور املا بدلا۔ مثلاً: نواب صدرالدین محمد خان فائز دہلوی نے یہ الفاظ اپنے کلام میں استعمال کیے ہیں جو عہدِ مظہر میں نہیں ملتے اور اگر ملتے ہیں تو بہت کم:

ابکم : گونگا

ابھوکن : زیور

اپچھرا : اندر کی سبھا میں ناچنے والی حسین عورت

اتیت : سادھو، سنیاسی، جوگی، فقیر

انوپ : بے مثل

انیک : بہت سے

باہو : بازوبند

برن : رنگ

بر : بدن، سینہ

پران : جان، روح، دم، سانس

کربل کتھا میں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو بعد میں متروک قرار دیے گئے۔

اچرج : حیرت

تنگ آنا : تنگ آنا

بندی خانہ : جیل خانہ

بھاکسی خانہ : کال کوٹھڑی، اندھا کنواں

پدر مردہ : جس کا باپ مرگیا ہو

لوتھ : لاش

بھنڈ پیری : منحوس

چیرا : پگڑی

بعض ایسے الفاظ ملاحظہ ہوں جن کا عہد مظہر میں تلفظ بدل گیا۔

سوں : سے

کوں : کو

تا : تھا

تی : تھی

بی : بھی

تیں : تو

پچھانا : پہچانا

پچھان : پہچان

ایدھر : ادھر

جیدھر : جدھر

اینچنا : کھینچنا

عہد مظہر میں جو شعرائے اُردو نے زبان کی صفائی کی طرف توجہ دی تھی، اس کی شہادت شاہ حاتم کے اُس بیان سے بھی ملتی ہے، جو دیوان زادہ کے دیباچہ میں دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''وقت جن کا ریختہ کی شاعری میں صرف ہے
اُن سبّی (سے) کہتا ہوں بوجھو حرف میرا اشرف ہے
جو کہ لاوے ریختے میں فارسی کے فعل و حرف
لغو ہیں گے فعل، اُس کے ریختے میں حرف ہے''

ودریں ولا ایں تربیت طلب از دہ دوازدہ سال سوائے آں اکثر الفاظ را از نظر انداختہ۔ لسان عربی و زبان فارسی کہ قریب الفہم و کثیر الاستعمال باشد،

وروزمرہ دہلی کہ میرزایانِ ہند وفصیح گویان رندودرمحاورہ (مہاورہ) دارند منظور داشتہ۔ سوائے آں زبان ہر دیار تابہ، ہندی کہ آں را بھا کا گویند موقوف نمودہ۔ فقط روز مرہ کہ عام فہم وخاص پسند بود اختیار کردہ۔ وشمۂ ازاں الفاظ کہ تقید دارد بہ بیان می آرد۔ چنانچہ عربی وفارسی مثلاً تسبیح راتسی۔ وصحیح راصحی وبیگانہ رابگانہ ودیوانہ رادوانہ و مانند آں بطور عامہ۔ یا متحرک راساکن وساکن رامتحرک چنانچہ مرض رامرض وغرض راغرض ومانند آں۔ یا الفاظ ہندی کہ نین وجگ ونت وبسر وغیرہ انچہ باشند یا لفظ ماروموادازیں قبیل کہ برخود قباحت لازم آید یا بجائے سے ستی یا سیتی یا اُدھر رادوھر وکدھر راکیدھر کہ دراں زیادتی حرف باشد یا بجائے پر پہ وتیری راتجہ (حاشیہ پر: ولفظ تجہ بعضے جامناسب وبعضے جاغیر مناسب چنانچہ تجھے وتجکو بہتر است۔ وتجہ چشم نے وتجہ نگاہ نے محاورہ (مہاورہ) نیست بجائے ایں تیری چشم نے وتیری نگاہ نے می تواں گفت) کہ باختصار آید یا یہاں رایاں وہاں راواں (حاشیہ پر: وہر ایک راہر یک) کہ درمخرج تنگ بود یا کسر (کثر وفتح وضم درقافیہ یا قافیہ رافارسی باراہ ہندی چنانچہ گھوڑا وبورا، وسرو دھڑ ومانند آں۔ مگر ہاء ہوز رابدل کردن بہ الف کہ از عام تا خاص درمحاورہ (مہاورہ) دارند۔ بندہ دریں امر بمتابعت جمہور مجبور است۔ چنانچہ بندہ رابندا وشرمندہ راشرمندا وانچہ ازیں قبیل باشد۔ وایں قاعدہ راتا کجا شرح دہد۔ غرض کہ خلاف محاورہ (مہاورہ) وغیرہ مصطلح وغلطی روزمرہ ونقصان فصاحت را (حاشیہ پر: دخل نباشد العاقل مکفی الاشارہ ودریں مختصر الفاظ مذکورہ انشاء اللہ تعالیٰ نخواہد بود......[۲]۔

جیسا کہ ابھی بتایا گیا ہے کہ مرزا مظہر وہ پہلے شاعر ہیں ''جنھوں نے سادہ گوئی'' کی بنیاد رکھی۔ اور زبان کو خراد پر چڑھایا۔ چونکہ انعام اللہ خاں یقین دبستان مظہر کے علم بردار ہیں اس لیے اگر دیوانِ یقین میں ایسے اشعار ملیں، جن میں ایہام ہو یا جن میں متروک الفاظ کا استعمال کیا گیا ہو، تو متنی نقاد اُن اشعار کو اُس وقت تک اپنے متن میں شامل نہیں کرے گا جب تک دوسرے ذرائع سے یہ ثابت نہ ہو جائے کہ ان کے مصنف یقین ہی ہیں۔ پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی صاحب کے پاس ایک قدیم بیاض ہے جس میں مرزا مظہر کے یہ اشعار بھی شامل ہیں:

حسن تیرا مثالِ دریا ہے
کیوں نہ میں کل لگا لیوں مچھیاں!
سویا پڑا ہے کیا رے نازک بدن اکیلا
کس بیر کا وہ سویا جامہ اسے اٹھالا
کبھو اہیر کے سیں تج کو گئو دہائی
کب لگ رہے گا لچر آ تک مل مرے کسائی؟ (کذا)
برچھی کو پکڑ ہاتھ میں آتے ہو اکیلے
کیا راج بہادر ہو سجن روپ نگر کے
ہم سیں کمان ابرو میداں پکڑ گیا ہے
قبضے میں تب وہ آوے گوش میں کھینچوں چلے؟ (کذا)

مرزا مظہر کی تحریک، ان کے اور شاگردوں کے کلام کی روشنی میں ہرگز یہ اشعار ان کی تصنیف قرار نہیں دیے جا سکتے۔ پھر یہ اشعار صرف ایک ہی بیاض میں ملتے ہیں۔ ممکن ہے کہ بیاض کے کاتب کو غلط فہمی ہوئی ہو۔ اس کا بھی امکان ہے کہ مظہر تخلص کا کوئی اور شاعر ہو۔ بہر حال جب تک دوسرے ذرائع سے تصدیق نہ ہو جائے یہ اشعار کلامِ مظہر میں شامل نہیں کرنے چاہییں۔ میرے محترم عبدالرزاق قریشی نے مرزا مظہر کا کلام مرتب کیا ہے اور یہ اشعار متن میں شامل کر دیے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اگر ایک شاعر ایہام گوئی کے خلاف ہے تو اُس کے ہاں ایہام کے اشعار قطعی نہیں ملیں گے۔ ایسا نہیں ہے۔ ممکن ہے شاعر پہلے ایہام پسند کرتا ہو اور بعد میں ترک کیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اُس نے صرف منہ کا مزا بدلنے کے لیے ایہام میں کچھ شعر کہہ دیے ہوں۔ مرزا محمد رفیع سودا اُن شاعروں میں ہیں جنھوں نے ابتدا ہی سے ایہام کی مخالفت کی۔ لیکن اُن کے ہاں ایہام میں اشعار مل جاتے ہیں۔ مثلاً سودا کا شعر ہے:

پوج مجھے، اس دیر کہن میں کیا پوجے ہے پتھر کو
مجھ وحشی کو سنا برہمن، بتوں نے اپنا رام کیا

بلکہ سودا نے تو پوری ایک غزل ایہام میں کہی ہے۔ لیکن محض تفنن طبع کے لیے، کیونکہ اس غزل کا مقطع ہے:

اسلوب شعر کہنے کا تیرے نہیں ہے وابہ
مضمون و آبرو کا یہ سودا ہے سلسلہ

مختصر یہ کہ ادبی تحریکوں کا گہرا مطالعہ ہی تنقید نگار کی رہنمائی کرسکتا ہے۔

۴۔ اس عہد کی سیاسی، سماجی اور مذہبی تاریخ کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ خالق باری ایک طویل زمانے تک امیر خسرو سے منسوب رہی ہے امیر خسرو کا انتقال ۱۳۲۵ء میں ہوا۔

جب کہ محمود شیرانی کی تحقیق ہے کہ خالق باری ۱۰۳۱ھ یعنی عہد جہانگیری میں لکھی گئی اور اس کے اصل مصنف ضیاء الدین خسرو ہیں۔ شیرانی مرحوم نے اپنے دعوے کے ثبوت میں بہت سی شہادتیں پیش کی ہیں۔ ان میں خالق باری کا ایک شعر یہ بھی ہے:

دانگ فلوس جو آہے پیکا جیتل دمڑا جان
دام وانچہ کیسہ کھیسہ جان میکش تان

اس شعر میں ''دام اور دمڑا'' الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ان کے متعلق شیرانی صاحب لکھتے ہیں۔ ''یہاں دام اور دمڑا جن کا رواج اکبری عہد میں شروع ہوتا ہے، قابل غور ہیں۔ اکبر کے ہاں مالیہ کی وصولی چاندی کے روپے کے بجائے تانبے کے جدید الرائج سکے ''دام'' کے ذریعے سے ہوتی تھی۔ سلطنت کے تمام صوبوں کی آمدنی منصب داروں اور ملازموں کی تنخواہ، اجناس کا نرخ وغیرہ داموں میں مقرر تھے۔ دام کا وزن ایک تولہ آٹھ ماشے اور سات رتی یا پانچ ٹانک تھا۔ ایک روپیہ کے چالیس دام شمار ہوتے تھے۔ ذیلی تقسیم میں آدھا، چوتھائی، پانچواں، آٹھواں، دسواں، بارہواں اور سولہواں حصہ شامل تھے ان کے علیحدہ علیحدہ سکے ہوتے۔ آدھے کو نصفی، ادھیلہ یا نیم دام۔ چوتھائی کو دمڑا یا پاولہ اور آٹھویں حصے کو دمڑی کہتے تھے۔ دام کا مضاعف تنکہ تھا^{۱۳}۔ مصنف کے عہد کی سیاسی، سماجی اور مذہبی تاریخ کی اہمیت کا اندازہ ان دلائل سے ہوتا ہے جو پروفیسر محمود شیرانی نے فریدالدین عطار سے منسوب مظہر العجائب کو جعلی ثابت کرنے کے لیے دیے ہیں۔ اس عبارت سے یہاں کچھ اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

''......(مظہر العجائب کا مصنف) کوئی بہروپیا ہے۔ جس نے خاص مقاصد کو مدنظر رکھ کر شیخ عطار کا سوانگ بھر لیا ہے چونکہ اس کے پاس نہ عطار کا دماغ ہے نہ ان کی طبیعت اور نہ علمیت، اس لیے یہ تمام اضمحلال ہے اور اسی لیے خیالات میں اس قدر ابتذال اور عبارت میں خامیاں ہیں۔ جس کے پڑھنے سے طبیعت متنفر ہو جاتی ہے۔ ایک شخص عطار کا تخلص اختیار کرنے اور اس تخلص کی رٹ لگانے سے (جیسا کہ مصنف اس تصنیف کے دوران میں دیکھا جاتا ہے) عطار نہیں بن سکتا (۲) تاریخی لحاظ سے نظر ڈالتے ہوئے متعدد خامیاں اور پائی جاتی ہیں۔ مشاہیر کے زمانوں اور ان کے سنین وسال سے بے خبر معلوم ہوتا ہے۔ شیخ نوری کو عطار کا ہم عصر خیال کر کے ایک حکایت تراشتا ہے۔ جس میں شیخ نوری اس کے گھر آتے ہیں اور حرب صفین و نہروان کی تاریخ سناتے ہیں...... حالانکہ شیخ نوری جنید کے ہم عصر ہیں اور سنہ ۲۹۴ ہجری یا سنہ ۲۹۵ ہجری میں وفات پاتے ہیں اور پھر لطف یہ ہے کہ شاعر ان کو ایک حکایت میں شیخ شبلی کے وعظ میں حاضر مانتا ہے۔

حسین منصور کا اس نے نیا نام رکھا ہے یعنی منصور حسینی...... عطار، حسین بن منصور کے خیالات ایک معقول پیرائے میں اپنے تذکرے میں لکھ چکے ہیں۔ جس میں انھوں نے حسین کے متعلق صوفیوں کی تمام روایات کو جمع کر دیا ہے لیکن عطار کا یہ مثنی جو تذکرۃ الاولیا کی تصنیف کا مدعی بھی ہے، تذکرے کے بیانات کے بالکل برعکس ایک طویل حکایت منصور سے متعلق لکھتا ہے۔ جس میں شقیق بلخی جا کر خلیفہ ہارون الرشید کو سمجھاتے ہیں کہ تم نے چونکہ منصور کو قتل کروا دیا ہے اور وہ حضرت موسیٰ کاظم کا آدمی تھا اس لیے تمھیں چاہیے کہ اب جا کر حضرت امام سے اس قتل کی معافی مانگو۔ ہارون الرشید پر شیخ کی نصیحت کا اس قدر اثر ہوتا ہے کہ سیدھا حضرت موسیٰ کاظم کی خدمت میں پہنچتا ہے۔ معذرت خواہ ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ اب تک آپ کی طرف سے غافل رہنے کی معافی مانگتا ہوں۔ آئندہ آپ جو حکم دیں گے بسروچشم بجالاؤں گا۔ آپ حقیقت میں ہمارے پیشوا ہیں۔ کیونکہ آپ ہی خیر المرسلین ہیں اور میرا ملک درحقیقت آپ کا ملک ہے۔ جس طرح منصور کے الفاظ آپ کے الفاظ تھے...... دشمن آپ کی تاک میں تھے اور منصور کو بھی اسی لیے لپیٹا گیا کہ وہ آپ کے محبت کیشوں میں تھا اور آپ کی درگاہ پر سجدے کیا کرتا تھا۔ وہ برابر ۵ سال میرے کان بھرتے رہے کہ جب منصور امام کے آستانے پر پہنچتا ہے۔ سیکڑوں

سجدے کرتا ہے...... میں طرح دیتا رہا کہ اُس میں کیا حرج ہے خود شیخ بایزید بسطامی جب عیدین میں امام جعفر صادق کے ہاں جاتے تو آستانے پر سجدہ کرتے۔ معاملات کی ابھی یہی صورت تھی کہ منصور نے نعرہ انا الحق بلند کیا۔ علمانے اس کے قتل کا فتویٰ دیا۔ چنانچہ وہ قتل کر دیا گیا۔ میرا اگر چہ اس معاملے میں کوئی قصور نہیں ہے۔ لیکن التجا کرتا ہوں کہ آپ میرے اس جرم سے درگزر کریں۔ امام نے فرمایا! اگر چہ باطن میں تم کو میرے ساتھ عداوت تھی۔ مگر اس مرتبہ تم کو معاف کرتا ہوں کیونکہ تمہارا اعتراف گناہ اخلاص مندانہ ہے۔ مگر آئندہ محتاط رہنا اور اہل دین کے ساتھ مخلصانہ پیش آنا۔ ذرا ادھر کونے میں تو دیکھو کون کھڑا ہے؟ خلیفہ نے کونے میں نگاہ ڈالی۔ دیکھا تو منصور حلاج کھڑا تھا۔ ہارون الرشید نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا۔

اس قصے کی لغویت ناظرین میری مدد کے بغیر معلوم کر سکتے ہیں۔ کیونکہ منصور حلاج اور ہارون الرشید کے زمانوں میں ایک صدی سے زیادہ کا فرق ہے خلیفہ ہارون الرشید ۱۹۳ھ میں وفات پاتا ہے اور منصور ۳۰۹ھ میں دار پر چڑھایا جاتا ہے (۳) سب سے اہم مصنف کے مذہبی عقائد ہیں جو عطار کے معتقدات سے بشرق ومغرب کا فرق رکھتے ہیں۔ عطار اپنی اصل تصنیفات میں سنی معتقدات کے متبع ہیں۔ اصحاب اربعہ وائمہ اربعہ کے مداح وثناخواں ہیں۔ یہ شخص اس اقرار سے کہ سنی ہے، شروع کرتا ہے اور ایسے جذبات اور معتقدات کا اظہار کرتا ہے بلکہ ہر ایسے عقیدے کو جو سنیوں کے نزدیک قابل احترام ہے تحقیر وتذلیل کرتا ہے[۴] جو شیعہ جماعت سے بالخصوص تعلق رکھتے ہیں"۔ یہ اور ان کے علاوہ مختلف شواہد پیش کرنے کے بعد محمود شیرانی صاحب لکھتے ہیں۔ "الغرض شاہ اسمٰعیل صفوی سنہ ۹۰۷ ہجری سنہ ۹۳۰ ہجری کا عہد اس تصنیف کے لیے بہت موزوں معلوم ہوتا ہے۔ جب کہ مذہبی لحاظ سے ایران نئی کروٹ لے رہا تھا۔ جدید سیاسی انقلاب نے مذہب اثناعشری کو صدر میں جگہ دے دی تھی۔ سنی بزور شمشیر شیعہ بنائے جا رہے تھے۔ ان کے علاقتل کیے جا رہے تھے...... جب زندہ سنیوں کو بزور شمشیر شیعہ بنایا جا رہا تھا تو کوئی تعجب نہیں اگر مردہ سنی مشاہیر کو بزور قلم ذاتی یا مذہبی اغراض کی بنا پر اسی مذہب کے دائرے میں لانے کی کوشش کی گئی ہو۔ چنانچہ مظہر العجائب اور لسان الغیب اسی قسم کی کوشش کا نتیجہ ہیں۔

عطار اگر چہ[۵] کسی نئے مذہب کے بانی نہیں اور نہ کسی جدید فرقے کے پیشوا ہیں۔ لیکن دیکھا جاتا ہے کہ ان کی سیرت سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے مختلف فرقوں نے ان کو اپنی اپنی اخوت کا رکن بنانے کی کوشش کی ہے، جوہر الذات[۶] میں فنافی المنصور کی حیثیت سے دکھائے گئے ہیں۔ مظہر العجائب میں ایک اثنا عشری شیعہ کے لباس میں پیش کیے گئے ہیں۔ حیدر نامہ میں انھیں حیدری بنانے کی کوشش کی گئی ہے"۔ (۸)

متنی نقاد کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اصل کام شروع کرنے سے پہلے متن کے مصنف کے حالاتِ زندگی پر پورا پورا عبور حاصل کرے۔ اس سلسلے میں اس عہد کی کتابوں، مصنف کے معاصرین کے بیانوں کا مطالعہ ضروری ہے۔ یہ مطالعہ کئی مقامات پر متنی نقاد کو گمراہ ہونے سے بچائے گا۔ مالک رام صاحب نے دیوانِ غالب میں ایک نئی غزل شامل کی ہے جس کا مقطع یہ ہے:

پیرانہ سال غالبِ بے کس کرے گا کیا
بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو

اس غزل کے بارے میں ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں: "بھوپال میں غالب کی آمد کا کوئی ثبوت نہیں۔ میں نے جناب مالک رام کو لکھا کہ یہ غزل الحاقی ہے لیکن وہ اپنے نو دریافت مایۂ عزیز کو گنوا دینے پر آمادہ نہ ہوئے۔ ان کا اصرار تھا کہ یہ غزل غالب ہی کی ہے۔ حال میں اس غزل کا ازسر نو راز سر بستہ وا ہو گیا، یہ غزل سب سے پہلے ماڈل اسکول بھوپال کے رسالہ "گوہر تعلیم" بابت اپریل ۳۷ء میں شامل ہوئی۔ اس مذاق کے مصنف اسکول کے ہیڈ مولوی جناب محمد ابراہیم خلیل تھے۔ اپریل فول کا عنوان دے کر نیچے نوٹ دیا تھا:

ماخوذ از کتب خانہ نواب یار محمد خان

بوسیدہ اوراق میں غالب کی یہ غیر مطبوعہ غزل ملی ہے جسے آخری تبرکات کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔

وہاں سے لے کر اوائل ۳۸ء میں رسالہ ہمایوں نے اسے شائع کر دیا اور ہمایوں سے لے کر خواجہ حسن نظامی نے اخبار منادی کی زینت بڑھائی۔ اس طرح اس مذاق نے بڑے بڑے ادیبوں کو اپریل فول بنا دیا[۹]۔

مصنف کے جن رشتہ داروں، دوستوں اور شاگردوں کی تصنیفات ملتی ہیں ان کا مطالعہ ضروری ہے۔ ان کتابوں سے مصنف کی زندگی اور اس کے ادب پر روشنی پڑتی ہے۔ بعض اوقات مصنف کے متعلق اہم ترین معلومات کا ذریعہ یہی کتابیں ہوتی ہیں۔ میں اس سلسلے میں مفتی صدر الدین آزردہ کا ذکر کروں گا۔ بنیادی

طور پر وہ ایک عالم اور مدرس تھے۔ اگرچہ انھوں نے شعر وشاعری بھی کی لیکن کبھی اس فن کو اہمیت نہیں دی اور کبھی اپنا دیوان مرتب نہیں کیا۔ ان کے تھوڑے بہت اشعار جو ملتے تھے اُن سے اندازہ ہوتا تھا کہ اگر وہ اُردو کے صفِ اول کے نہیں تو صفِ دوم کے شاعر ضرور تھے۔ میں ان کے تمام اشعار مرتب کرنا چاہتا تھا۔ اُن کا سب سے زیادہ اُردو، فارسی اور عربی کلام ان کے شاگرد سرسید کی آثار الصنادید میں ملتا ہے۔ تذکروں اور آثار الصنادید میں جتنے اُردو اشعار ملتے تھے میں نے وہ سب جمع کر لیے۔ اگر قاضی عبدالودود اطلاع نہ دیتے تو آزردہ کی ایک پوری غزل رہ جاتی۔ آزردہ کی اس غزل کا مطلع ہے:

اگر ہم نہ تھے غم اٹھانے کے قابل

تو کیوں ہوتے دنیا میں آنے کے قابل

یہ غزل کہیں نہیں ملتی۔ ذوق کے ایک شاگرد ظہور علی ظہور نے اسے نقل کیا تھا اور یہ تضمین اُن کے مطبوعہ دیوان میں موجود ہے جسے قاضی عبدالودود نے نقوش لاہور جون ۱۹۵۶ء میں شائع کرا دیا۔

(۶) اگر ہمارے مصنف کے عہد میں پریس رائج ہوگیا ہے اور اخبارات و رسائل شائع ہونے لگے ہیں تو ان اخبارات اور رسائل کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ بہادر شاہ ظفر، غالب اور ذوق وغیرہ کا اچھا خاصا کلام اس عہد کے اخبارات میں شائع ہوا تھا۔ ان اخباروں سے بعض بالکل نئی تحریریں مل جاتی ہیں یا نیا متن مل جاتا ہے ورنہ کم از کم زمانۂ تصنیف کے تعین میں ہمیں مدد ملتی ہے۔

(۷) مصنف کے عہد کی سرکاری دستاویزوں کا مطالعہ بھی مفید ہوسکتا ہے۔ غالب نے محمد حسین کی برہان قاطع پر جو اعتراضات کیے تھے وہ قاطع برہان کے نام سے شائع ہوئے۔ اس کتاب کا شائع ہونا تھا کہ ایک طوفان برپا ہوگیا اور مخالفوں کی طرف سے محرق قاطع، ساطع برہان، قاطع قاطع اور موید برہان شائع ہوئیں، غالب نے نامۂ غالب اور تیغ تیز نام سے دو کتابیں لکھیں۔ دافع ہذیان، لطائف غیبی اور سوالاتِ عبدالکریم غالب کے موافقین کی طرف سے شائع ہوئیں۔ قاطع کے مصنف مولوی امین الدین تھے۔ غالب اور اُن کے موافقین نے اس کتاب کا کوئی جواب نہیں دیا کیوں کہ اس میں بہت فحش اور ناشائستہ الفاظ کا استعمال ہوا تھا۔ ۲۳ دسمبر ۱۸۶۷ء کو غالب نے مولوی امین الدین پر ازالہ حیثیت عرفی کی نالش کر دی۔ اتفاق سے اس مقدمے کی پوری مسل مل گئی ہے جسے مولوی عبدالحق نے شائع کر دیا ہے۔

مواد کی فراہمی:

متن کے جتنے نسخے دنیا میں موجود ہیں اور جن کا متنی نقاد کو علم ہے، وہ نسخے، ان مائیکروفلم یا فوٹو سٹیٹ کاپی حاصل کرنا ضروری ہے۔ جب تک تمام ممکن نسخے فراہم نہ ہو جائیں، متنی نقاد کو کام شروع کرنے کا حق نہیں۔ کیونکہ ممکن ہے متنی نقاد نے بغیر مطالعہ کیے جو نسخہ صرف اس لیے نظر انداز کیا ہے کہ اس کا حاصل کرنا مشکل ہے وہ سب سے بہتر نسخہ ہو۔ یا کم از کم وہ متن کی کئی قراتوں کی تصحیح میں ہماری مدد کر سکتا ہو۔

۱۔ جن لائبریریوں کا کیٹلاگ چھپا ہوا ہے ان کے کیٹلاگ کا مطالعہ کافی ہے۔ دوسری صورت میں ذاتی طور پر اُس لائبریری میں جانا چاہیے جہاں مطلوبہ نسخے ملنے کا امکان ہو۔ بعض ایسی مشہور و معروف لائبریریوں میں ہمارے کام کا مواد نکل آتا ہے جہاں اُس کی ہرگز اُمید نہیں کی جاسکتی۔ مثلاً مفتی صدرالدین آزردہ کے ہم عصروں کے بیانات سے ہمیں علم تھا کہ انھوں نے اُردو شاعری کا ایک تذکرہ لکھا تھا۔ لیکن وہ تذکرہ ناپید تھا اور بظاہر دنیا میں اس کا کوئی نسخہ محفوظ نہیں تھا۔ کیا کوئی شخص تصور کر سکتا ہے کہ ہزاروں میل دور انگلینڈ میں کیمبرج یونیورسٹی لائبریری میں اس کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔

اس سے زیادہ اہم واقعہ فضل علی فضلی کی کربل کتھا کا ہے۔ اشپرنگر ایک جرمن اسکالر تھے۔ انھیں عربی، فارسی اور اُردو پر بڑی اچھی مہارت تھی۔ وہ ہندوستان میں دلی کالج کے پرنسپل بھی رہ چکے تھے۔ کچھ عرصے انھوں نے اودھ کے شاہی کتب خانے کی فہرست مرتب کی۔ کچھ عرصہ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل رہے اور پھر واپس اپنے وطن چلے گئے۔ ان کے ذاتی کتب خانے کی کیٹلاگ میں کربل کتھا بھی موجود تھی۔ اشپرنگر ہندوستان سے جاتے ہوئے اپنی تمام کتابیں بھی ساتھ لے گئے تھے۔ اب سوال تھا کہ یہ کتابیں کہاں گئیں۔ اشپرنگر نے اپنا ذخیرہ برلن کے سرکاری کتب خانہ کو دے دیا تھا۔ وہاں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران کتب خانے کی کتابیں نسبتاً محفوظ مقامات ماربرگ اور ٹوبنگن بھیج دی گئی تھیں، ان دونوں مقامات پر تلاش شروع کی گئی۔ اُردو ادب کی خوش قسمتی ہے کہ نایاب نسخہ دستیاب ہوگیا۔ اس دریافت کا سہرا بھی پروفیسر مختار الدین احمد کے سر ہے۔

نیشنل میوزیم نئی دلی میں فارسی، عربی اور اُردو کے کچھ نسخے ہیں جن کا کوئی باقاعدہ کیٹلاگ نہیں چھپا۔ میں نے مرزا مظہر جانجاناں کے فارسی خطوط

مرتب اور ترجمہ کیے تھے۔ اس سلسلہ میں ہندوستان کی مختلف لائبریریوں سے استفادہ کا موقع ملا۔ تمام مواد اکٹھا کر کے میں کام مکمل کر چکا تھا۔ ایک دن ایک دوست نے بتایا کہ نیشنل میوزیم میں کچھ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابیں ہیں۔ قطعی اُمید نہیں تھی کہ میوزیم میں میرے موضوع پر کچھ مواد ہو سکتا ہے پھر بھی احتیاطاً چلا گیا۔ وہاں کوئی کیٹلاگ نہیں تھا۔ ایک معمولی سے رجسٹر پر انتہائی بے ترتیبی اور بے قاعدگی سے کتابوں کی فہرست بنائی گئی تھی۔ میں نے وہ رجسٹر دیکھا تو اس میں مرزا مظہر کے خطوط کے مجموعے کا نام تھا۔ میں نے وہ کتاب نکلوا کر دیکھی معلوم ہوا کہ ۱۸۵۴ء میں چھپی تھی۔ اس میں دو ایسے خط بھی شامل تھے جو مجھے اس سے پہلے کہیں نہیں ملے تھے۔ اب تک جتنے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مجموعے ملے تھے، ان میں اچھی خاصی تعداد ایسے خطوں کی تھی، جن میں مکتوب الیہ کا نام نہیں تھا، اس مجموعے کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ہر خط پر مکتوب الیہ کا نام تھا۔ مرزا مظہر کی زندگی اور اس عہد کی سیاسی وسماجی زندگی پر کام کرنے والا محقق ہی ان ناموں کی اہمیت کا صحیح اندازہ لگا سکتا ہے۔

۲۔ پہلے زمانے میں بیشتر ریاستوں کے راجہ اور نواب اپنا ذاتی کتب خانہ رکھتے تھے۔ ریاستی نظام ختم ہونے کے بعد بعض نوابوں اور راجاؤں نے اپنی لائبریری کو پبلک لائبریری بنا دیا ہے۔ جیسے رضا لائبریری رام پور یا آصفیہ لائبریری حیدر آباد یا اپنا ذخیرہ بڑی لائبریری کو دے دیا ہے۔ جیسے لوہارو اور ٹونک کے کتب خانے رضا لائبریری رام پور میں آ گئے ہیں۔ لیکن اب بھی بے شمار کتب خانے بے اعتنائی اور لاپرواہی کی نذر ہو رہے ہیں۔ اس کا پورا امکان ہے کہ ان کتب خانوں میں ایسے بیش بہا نسخے موجود ہوں جو ہماری ادبی تاریخ کو بدل دیں۔ مثلاً دیوانِ ضاحک ہی کا معاملہ ہے۔ مرزا محمد رفیع سودا سے ادبی معرکوں نے میں ضاحک کو اُردو ادب کی تاریخ میں اچھی خاصی اہمیت دی ہے۔ ضاحک کا دیوان اتنا نایاب تھا کہ شاید کوئی ایسا تذکرہ نگار ہو جو اس کے دیکھنے کا مدعی ہو۔ بلکہ محمد حسین آزاد نے اس دیوان کے متعلق ایک دلچسپ قصہ بیان کیا تھا۔ وہ آبِ حیات میں لکھتے ہیں: ''میر حسن مرحوم ان (ضاحک) کے صاحبزادے سودا کے شاگرد تھے۔ میر ضاحک کا انتقال ہوا تو سودا فاتحہ کے لیے گئے اور دیوان اپنا ساتھ لیتے گئے۔ بعد رسم عزا پرسی کے...... فرمایا تم فرزند ہو جو کچھ اس روسیاہ سے گستاخی ہوئی معاف کرو۔ بعد اس کے نوکر سے دیوان منگا کر جو ہجویں ان کی کہی تھی سب چاک کر ڈالیں۔ میر حسن نے بہ مقتضائے علوحوصلہ وسعادت مندی اسی وقت دیوان باپ کا گھر سے منگایا اور جو ہجویں اُن کی تھیں وہ پھاڑ ڈالیں[۱۱]۔''

لیکن دیوانِ ضاحک مل گیا ہے۔ یہ کس طرح ملا ہے اس کی پوری تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔ اس میں سودا پر بہت ہجویں موجود ہیں جن سے محمد حسین آزاد کے بیان کی تردید ہوتی ہے۔

۳۔ اکثر مصنفوں کا ذاتی کتب خانہ ہوتا ہے۔ مصنف کی وفات کے بعد کبھی تو یہ کتب خانہ نسلاً بعد نسل چلتا رہتا ہے۔ لیکن اکثر و بیشتر دست بردِ زمانہ کی نذر ہو جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ ذخیرہ کسی لائبریری میں محفوظ کر دیا جاتا ہے لیکن عام لوگوں کو اس کی خبر نہیں ہوتی۔ اگر ہم کسی ادیب کی تصنیف میں اپنی مطلوبہ کتاب کا ذکر دیکھیں تو ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیے کہ اس ادیب کی کتابیں کہاں ہیں۔ اُردو کے بعض مشہور مصنفین کے کتب خانے آج بھی ہندوستان کی مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ مثلاً مولانا محمد حسین آزاد کی کتابیں پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور کی نذر کر دی گئی تھیں۔ اردو شاعروں کا ایک بیش قیمت تذکرہ ''مجموعۂ نغز'' جس کے مصنف میر قدرت اللہ قاسم تھے، آزاد کی ملکیت تھا اور اب پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔ اگرچہ اس تذکرے کے کم از کم دو نسخے اور ملتے ہیں۔ لیکن مولانا آزاد کے نسخے کو بنیادی نسخہ بنایا۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے ذاتی کتب خانے آزاد لائبریری علی گڑھ میں بہت سلیقے سے محفوظ ہیں۔ اسی طرح سری رام مصنف خمخانۂ جاوید اور علامہ دتاتریہ کیفی کے کتب خانے بنارس یونیورسٹی لائبریری کی زینت ہیں۔

۴۔ مصنف کے رشتہ دار، دوست، شاگرد یا ان سب کی اولاد سے تنقید نگار کا ملنا بہت ضروری ہے۔ عام طور سے ان لوگوں کے پاس مصنف سے متعلق اہم دستاویزیں ہوتی ہیں۔ میرے دوست فضل حق کامل قریشی پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے کے لیے میر اثر کا دیوان مرتب کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں خواجہ میر درد و میر اثر کے خاندان کے ایک صاحب ڈاکٹر ناصر الدین سے ملے۔ ان کے پاس میر اثر کے دیوان اور مثنوی کے بیش بہا نسخے تھے۔ جن سے انھوں نے اپنے کام میں بہت مدد لی۔ حال ہی میں عبدالرزاق قریشی صاحب نے مکاتیب میرزا مظہر کے نام سے مرزا کے فارسی خطوط مرتب کیے ہیں۔ یہ کل ۱۴۷ خط ہیں اور چند کے سوا سب کے سب قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے نام لکھے گئے ہیں۔ قریشی صاحب کو یہ خطوط ابوالحسن زید صاحب فاروقی سے ملے تھے اور فاروقی صاحب کو نواب زادہ لئیق احمد خاں کے ذخیرے سے ملے تھے۔ اور نواب زادہ کا سلسلۂ نسب سات واسطوں سے قاضی ثناء اللہ پانی پتی سے ملتا تھا۔ مولانا ابوالحسن زید صاحب فاروقی کو یہ خطوط کیسے ملے تھے۔ اس کی داستان خود ان کی زبانی سنیے:

''نواب زادہ لئیق احمد خاں صاحب پانی پت میں محلہ قاضیاں میں رہتے تھے۔ حضرت قاضی ثناء اللہ قدس اللہ سرہٗ العزیز کا

خاص رہائشی مکان ۱۹۴۰ء تک اسی حالت میں موجود تھا...... میری منجھلی بہن...... نواب زادہ لئیق احمد صاحب کی اہلیہ ہیں اور اس طرح مکان کے دیکھنے بلکہ اس میں قیام کرنے کا موقع مجھے بار ہا ملا۔ اس مکان کے ایک کمرہ میں تقریباً پچاس سال سے کتابوں کا انبار زمین پر پڑا تھا۔ کیا قیمتی ذخیرہ تھا جو برباد ہوا۔ ردی کاغذ کی شکل میں پھٹے اوراق یقیناً ڈیڑھ دو من تھے جو سب ضائع ہوئے۔ بیس دن تک ایک عالم کو میں نے وہاں رکھا اور انھوں نے ایک ایک ایک ورق دیکھا صرف پانچ سات کتابیں ہاتھ لگیں۔ یہ مکاتیب ایک تھیلے میں تھے۔ یہ ہے ان کا قصہ [۱۲] "۔

اس سلسلے میں غالب کے خطوط بہترین مثال ہیں۔ ان کے ایک دو خط تو اب بھی ہر سال مل ہی جاتے ہیں۔ لیکن دار الانشا، رامپور سے مولانا امتیاز علی خاں عرشی کو ایک سو پندرہ خطوط ملے تھے۔ جو غالب نے نواب یوسف علی خاں ناظم، نواب کلب علی خاں اور دوسرے لوگوں کو لکھے تھے۔ ان خطوط کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۷ء میں کتاب خانہ ریاست رامپور سے شائع ہوا۔ اس سے زیادہ دلچسپ معاملہ نادراتِ غالب کا ہے۔ منشی نبی بخش حقیر کو غالب سے تلمذ تھا اور دونوں میں خط و کتابت تھی۔ میر مہدی حسن مجروح اور میر افضل علی میرن نے منشی نبی بخش حقیر کے نام غالب کے خطوط مرتب کیے تھے۔ وہ یہ مجموعہ چھاپنا چاہتے تھے۔ لیکن کسی وجہ سے چھاپ نہ سکے۔ غیر مطبوعہ خطوط کا یہ مجموعہ میرن صاحب کے نواسے آفاق حسین آفاق کو ورثے میں ملا اور انھوں نے ۱۹۴۹ء میں ادارۂ نادرات، کراچی سے شائع کر دیا۔ اس مجموعے میں ایک فارسی اور تہتر اردو خطوط ہیں۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کو غالب کے سات فارسی خط ملے تھے۔ جو غالب نے میر سید علی بن سید محمد قادری المتخلص بہ غمگین کے نام لکھے تھے۔ یہ خط اردوئے معلّٰی، دہلی غالب نمبر حصہ دوم میں شائع ہو گئے ہیں۔

۵۔ پرانی کتابوں کی تجارت کرنے والوں سے بھی رابطہ رکھنا ضروری ہے۔

بعض تاجر فہرستیں باقاعدگی سے اس طرح بناتے ہیں کہ ہر کتاب کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ جب کہ کچھ تاجر کم پڑھے لکھے ہوتے ہیں یا تو وہ فہرستیں بناتے ہی نہیں اور اگر بناتے ہیں تو اس طرح کہ کتاب کے متعلق پوری معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔ متنی نقاد اور محقق کو خود ایسی دکانوں پر جاتے رہنا چاہیے۔

❖❖❖❖

حواشی

(۱) متنی تنقید، از ڈاکٹر خلیق انجم، الجمعیۃ پریس، دہلی، مارچ ۱۹۶۷ء۔

(۲) سید محی الدین قادری زور، سرگزشتِ حاتم، حیدرآباد، ۱۹۴۴ء، ص: ۱۲۶۔۱۲۸۔

(۳) محمود شیرانی۔ مرتب، خالق باری، مصنفہ ضیاء الدین خسرو، دہلی، ۱۹۴۴ء، ص: ۵۷۔

(۴) محمود شیرانی، تنقید شعر العجم، دہلی، ۱۹۴۳ء، ص ۴۵۷۔۴۶۱۔

(۵) جب کہ عطار کا زمانہ تقریباً ساتویں ہجری کے نصف آخر سے آٹھویں ہجری کے ابتدائی برسوں تک ہے۔ (خ۔ا)۔

(۶)(۷) فرید الدین عطار سے منسوب دوسری تصنیفات۔

(۸) تنقید شعر العجم، ص ۴۵۸۔۴۷۰۔

(۹) گیان چند، غالب اور بھوپال، اُردوئے معلّٰی، دہلی، فروری ۱۹۶۰ء، ص ۹۲۔

(۱۰) ملاحظہ ہو: عبدالحق، روئداد مقدمہ مرزا غالب، احوالِ غالب، مرتبہ مختار الدین احمد آرزو، علی گڑھ، ۱۹۵۳ء، ص ۱۳۹۔۱۷۱۔

(۱۱) محمد حسین آزاد، آبِ حیات، بار ۸، لاہور، ۱۹۱۳ء، ص ۱۸۲۔۱۸۳۔

(۱۲) عبدالرزاق قریشی۔ مرتب، مکاتیب مرزا مظہر، بمبئی ۱۹۶۶ء، ص: ۹۔۱۰۔

❖❖❖❖

متن اور روایت متن[1]

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

متن (Text) کسی ایسی عبارت "تحریر" یا نقوشِ تحریر کو کہتے ہیں جن کی قرأت یا معنوی تفہیم ممکن ہو۔ لغوی طور پر ٹیکسٹ یا متن کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

"مصنف کے اصل الفاظ، کتاب کی اصل عبارت (شرح وغیرہ سے قطع نظر کر کے) (۲) کتاب الٰہی انجیل (وقرآن) وغیرہ کی آیت یا آیات جو کسی وعظ یا مقالے کے موضوع یا سند کے طور پر استعمال کی جائیں (۳) متن کتاب کا مضمون۔ (حواشی تصاویر وغیرہ سے قطع نظر کر کے)۔ (۴) جلی خط۔ نصاب کی کتاب، درسی کتاب (Standard Urdu English Dictionary)[2]۔

ان میں سے بنیادی اہمیت خط کشیدہ جملوں کی ہے، باقی متن کی مختلف نوعیتوں سے تعلق رکھنے والی کچھ وضاحتیں ہیں جو اس سلسلے کے متنوع مباحث کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

پروفیسر ایس۔ ایم کاترے نے اپنی کتاب Textual Criticism میں متن کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

By a text we understand a document written in a language known more or less to the inquirer and assumed to have a meaning which has been or can be ascertained. Since a text implies a written document the knowledge of writing has to be presumed the basis of our study.[3]

مختلف متنوں کے درمیان تقسیم منقول و معقول کے اعتبار سے بھی ہو سکتی ہے۔ وسائل تحفظ کے اعتبار سے بھی رسم تحریر و املا نیز زبان و بیان کو بھی متن کے درجات کے تعین (Gradation of Text) میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ بریں تالیفی نوعیت کے لحاظ سے بھی مختلف متون کی درجہ بندی ممکن ہے۔ یہ سب اضافی صورتیں ہیں مگر کسی متن پر تنقیدی و تحقیقی گفتگو میں یہ امور اپنے مختص پہلوؤں کے ساتھ سامنے آ سکتے ہیں۔ مثلاً کتب ساوی پر ایسی کسی بحث میں ان کے متن کی الوہی یا الہامی نوعیت کو بہر حال پیش نظر رکھنا ہوگا۔ منقوش عبارتیں جو پتھر کی سلوں، دھات کے پتروں، پکی مٹی کی لوحوں یا ہاتھی دانت وغیرہ کے ٹکڑوں پر ملتی ہیں وہ اگر شکست و ریخت کے عمل سے بچ گئی ہوں تو ان کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ اصل صورت میں ہیں اور جو کچھ یہاں لکھا ہوا ہے وہ Original حالت کی نشاندہی کرتا ہے لیکن نسبتاً کم دیرپا وسائل حفظ تحریر کے بارے میں یہی بات اتنے وثوق سے نہیں کہی جا سکتی۔ وہاں آب و ہوا اور فضا و موسم کے اثرات کے علاوہ انسانی ارادے سے بھی متن کے اجزاء و علامات میں تبدیلیاں آ جانے کا امکان رہتا ہے۔ خط اور املا کا مصنف کے زمانے اور ذہن سے بہت گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ بہت سی تحریروں کے زمانے کا فیصلہ بہت کچھ انھی امور کے سہارے کیا جانا ممکن ہے۔ متن کی تالیفی نوعیت کو بھی متن کے مسائل سے الگ کر کے دیکھنا مشکل ہے۔ بعض متن ایک سے زیادہ زبانوں میں ترتیب دیئے جاتے ہیں۔ بعض ایک سے زیادہ علوم اور ہیئتوں کی پابندی کے ساتھ موضوع گفتگو بنتے ہیں اور کچھ عبارتیں یا متون ایسے ہوتے ہیں جن کے الفاظ اپنی مختلف جہتوں کے ساتھ اپنے معانی کے اعتبار سے مختلف الموضوع ہو جاتے ہیں۔ بعض تصانیف میں متن کے ساتھ تشریحی اور توضیحی انداز کی عبارتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ کبھی وہ خود صاحب متن کی نگارشات ہوتی ہیں اور کبھی بعد کے اضافی نگارشوں کا درجہ رکھتی ہیں لیکن متن کے استناد اور روایت متن کے تعین سے ان کا گہرا واسطہ ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ مصنف کے اپنے یا اس کے قریبی دور کے تعلیقے بھی اضافی حیثیت سے سامنے آنے کے باوصف اپنی تحقیقی اہمیت کے اعتبار سے کبھی متن کے لیے ایک جزو لاینفک بن جاتے ہیں۔

بنا بریں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ بعض اوقات متن دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ "اصل متن" اور "اضافی متن"۔

کچھ "املائی متن" ہوتے ہیں، ایک شخص بولتا جاتا ہے اور دوسرا لکھتا جاتا ہے۔ اب اگر وہ جو کچھ سنتا جاتا ہے وہی لکھتا بھی جاتا ہے تو اسے "تقلیدی متن" کہنا زیادہ مناسب ہے اور اگر اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق وہ املا کیے ہوئے متن میں الفاظ کو پس و پیش اور مضمون کو کم و بیش کر رہا ہے تو وہ املائی متن نہ رہ کر "نیم تقلیدی متن" ہو جائے گا۔ یہ صورت کبھی مصنف کی کسی معذوری کے باعث پیش آتی ہے اور کبھی متن کو براہ راست ترجمہ یا ترجمانی کی شکل میں کسی دوسری زبان میں پیش کیا

جاتا ہے اور مصنف اسی سعی میں شریک ہوتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب India wins Freedom اسی نوعیت کی تصنیف ہے جسے پروفیسر ہمایوں کبیر نے ترتیب دیا ہے۔ اول الذکر تالیفی صورتوں کی مثالیں ملفوظات کی شکل میں ملتی ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک دوسری نوعیت کی مثال عجائب القصص مصنفہ شاہ عالم ثانی کو قرار دیا جاسکتا ہے۔

بعض متون ''سماعی متن'' ہوتے ہیں اور کبھی کبھی صدیوں تک سینہ بہ سینہ اور زبان بہ زبان ہوتے ہوئے تحریری شکل میں سامنے آتے ہیں ''الہا اودل'' اس کی ایک معروف مثال ہے۔ عام طور پر جو متن ملتے ہیں وہ ایک شخص کی سعی تحریر و تالیف سے نسبت رکھتے ہیں لیکن کچھ ایسے متون بھی ہیں جو بہت سے معلوم و نامعلوم افراد کی تالیف یا تخلیق ہیں اور جن کا زمانہ بھی ایک طویل عرصہ پر پھیلا ہوا ہوتا ہے اور کبھی کبھی تو یہ عرصہ قرنوں اور صدیوں پر محیط ہوتا ہے۔ لوک ساہتہ (Folk Literature) بالعموم اسی نوعیت کا ہوتا ہے۔ اہل ہند کی بعض قدیم کتابیں اسی صورت حال کی عظیم مثالیں ہیں جن کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر کاترے نے لکھا ہے:

When we deal with texts we have to consider two different possibilities; as in the case of early Indian literature produced not as much by individual authors as by definite schools and transmitted orally, the reduction to writing must have taken place at different centres of learning or Culture at different periods. Between this reduction to writing and the actual composition of the text lies a number of generations of reciters and scholars who have left their impression on the text as a whole. Thus we shall not be in a position to cite any particular copy as the original text.[۷]

ایسے متون میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ و ترمیم کا عمل بھی جاری رہتا ہے اور اصل و فرع میں بہت کچھ فرق ہو جاتا ہے۔ ایسی شکلوں میں Basic Text قدیم تر قلمی نسخہ ہی کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ ایسے کسی متن میں وہ باقاعدگی ترتیب اور انضباطی کیفیت مشکل ہی سے مل سکتی ہے جو انفرادی طور پر ترتیب دیے ہوئے متون کی ایک خصوصیت ہوتی ہے۔

قدیم مشرقی و مغربی زبانوں کا کلاسیکی لٹریچر زیادہ تر مخطوطات کی صورت میں ملتا ہے اور انھی قلمی نسخوں کی مدد سے ان کی ہیئت اور حدود تک رسائی ممکن ہے بعض متن اب اپنی اصل شکل میں نہیں ملتے، بعض کی زبان بدل گئی ہے اور بعض کا رسم الخط۔ اس لیے ان کی اصل صورت اور حدود و مشتملات کا فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ اس نوع کے کسی متن کی قدیم تر معلوم و منضبط روایت ہی کو اس کی ممکن الحصول شکل قرار دیا جاسکتا ہے جو زمانی اعتبار سے اپنی اصل سے نسبتاً قریب تر ہو۔

مصادر کے لحاظ سے بھی متن مختلف الحیثیت ہوتے ہیں۔ بعض متون کی قلمی یا مطبوعہ صورت میں صرف ایک ہی روایت دستیاب ہوتی ہے۔ بعض کے متعدد قلمی نسخے ملتے ہیں اور کئی بار یہ کثیر التعداد ہوتے ہیں۔

بعض متون کے قلمی نسخے مختلف خطوط (Scripts) میں ملتے ہیں مثال کے طور پر اودھی بھاشا کے ایسے بہت سے عشق ناموں یا پریم کتھاؤں کا ذکر کیا جاسکتا ہے جن کے پرانے نسخوں میں کچھ فارسی رسم الخط میں ہیں اور کچھ ہندی دیوناگری لپی میں۔

معلومہ قلمی نسخوں میں سب سے اہم وہ قلمی نسخے ہو سکتے ہیں جو خود مؤلف کے اپنے دست و قلم کے مرہون منت ہوں اور جن کے بارے میں اس امر کی کافی و شافی شہادت (داخلی یا خارجی سطح پر) موجود ہو کہ یہ صاحب تصنیف کا اپنا خطی نسخہ ہے۔ ایسے کسی نسخے یا نسخوں میں موجود متن کو ''اساسی متن'' قرار دیا جانا چاہیے۔ دوسرے درجے پر ایسے قلمی نسخے آسکتے ہیں جو مصنف کی نظر سے گزر چکے ہوں۔ اس کا فیصلہ نہایت احتیاط کے ساتھ کیا جانا چاہیے کہ واقعتاً کوئی نسخہ مصنف کی نظر سے گزرا ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں بطور خاص وہ نسخے رکھے جاسکتے ہیں جو مصنف کے ایما سے بڑے اہتمام کے ساتھ تیار کیے گئے ہوں یا جن کی تیاری میں اس کے کسی عزیز شاگرد، مرید یا دوست کا ہاتھ رہا ہو۔ ایسے کسی متن کو فرق مراتب کے ساتھ ''استنادی متن'' کہہ سکتے ہیں (ایسے ہی کچھ نسخوں میں وہ مطبوعہ نسخے بھی شامل کیے جاسکتے ہیں جن کے اصل مخطوطے بصورت عکس ان کے ساتھ موجود ہوں)۔ اس کے مقابلے میں دوسرے ایسے قلمی نسخوں کے متن کو جنھیں مستند قرار دیا جائے، استشہادی متن کہنا مناسب ہوگا۔

مطبوعہ نسخوں میں بھی قدیم و جدید اور درجہ استناد کے اعتبار سے اہم اور غیر اہم کا فیصلہ انھی اور ایسے ہی کچھ باوثوق شواہد کی روشنی میں کیا جاسکتا ہے۔ جن متون کی کتابت شدہ روایت اور پروف کاپیوں کی تصحیح خود مصنف نے کی ہو، اسے مطبوعہ روایتوں میں اساسی متن کا درجہ دیا جانا چاہیے۔

لیکن احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اس بارہ خاص میں ضروری چھان بین، اگر کسی وسیلے سے ممکن ہو، تو ضرور کرلی جائے۔ اس لیے کہ ضروری نہیں کہ مطبع کے

کارپردازوں نے بھی مصنف کی اصلاح زادہ روایتوں کو پوری احتیاط کے ساتھ درست کر دیا ہو۔ اس کے ساتھ مطبوعہ روایتوں میں ان روایتوں کی اہمیت زیادہ ہوگی جو صاحب متن کے قریب تر افراد یا زمانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ ان کو مطبوعہ سطح پر استنادی روایت قرار دیا جانا چاہیے۔ اس کے مقابلے میں مطبوعہ شکل میں نسبتاً زیادہ معتبر متن کو اشتہادی روایت کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔

متن کی مختلف جہتوں اور نوعی صورتوں کا استحصاء مشکل ہے۔ ہر متن ایک مستقل وجود ہے اور اپنی مختلف روایتوں کی شکل میں اپنے ایک سے زیادہ ذیلی وظلی وجود رکھتا ہے۔ اس طلسم خانے میں اتر کر متون کی صحیح ہیئت اور حدود روایت کا تعین ایک نہایت اہم مشکل مگر نتیجہ خیز کام ہے، جس کے لیے غیر معمولی سطح پر ذہنی کاوش اور اہتمام تلاش جزئیات ضروری ہوتا ہے۔ اس کے بغیر حقیقت تک رسائی ممکن نہیں۔

یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کسی متن کی تصحیح اور ترتیب کا مسئلہ اصولِ تحقیق و تنقید کے بنیادی مسائل میں سے ہے۔ اس کے بغیر نہ تحقیق کا قدم آگے بڑھ سکتا ہے اور نہ تنقید کو صحیح جہت میسر آ سکتی ہے۔ اس لیے کہ تحقیق اور تنقید کی اساس بہر حال ان متون پر ہے جن سے حقائق کے تجسس، مسائل کی تفہیم اور معیاروں کے تعین میں مدد لی جاتی ہے۔ اب اگر یہ بنیادی وسائل ہی باوثوق سطح پر قابل استناد نہ ہوں تو اخذ نتائج کے عمل کو کیسے مبنی بر حقیقت قرار دیا جا سکتا ہے۔

روایتیں تقریری بھی ہو سکتی ہیں اور تحریری بھی۔ دونوں صورتوں میں یہ جاننا اور اس امر کا امکانی فحص کرنا ضروری ہے کہ روایت کو نقل کرنے والا شخص کوئی معتبر آدمی ہے یا نہیں اور اگر کسی روایت کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے تو بڑھ کر کن واسطوں سے کہاں تک پہنچتا ہے اور جو وسائل یا واسطے درمیان میں آتے ہیں، انھیں صحت بیان یا روایت کے اعتبار سے کیا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ ان میں کوئی ایسا شخص یا روایت نگار تو نہیں ہے جس کی قوت تفہیم یا نگارش قلم پر پوری طرح بھروسہ نہ کیا جا سکے یا جسے بات کو اس کے اپنے انداز میں کہنے کے بجائے خود اپنے رنگ میں پیش کرنے کا شوق ہو۔ یا پھر جس کی قوت حافظہ پر اعتماد نہ کیا جا سکے۔ جس کا قلم لغزشوں سے محفوظ نہ ہو یا جو زبان کی نزاکتوں سے عدم واقفیت اور اسلوب تحریر کی کشش و روش سے مناسبت نہ ہونے کے سبب سے غلطیاں کر سکتا ہو۔ غرض امکانی سطح پر تجسس و تحقیق کے بعد ہی روایت کی صحت و عدم صحت کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا جا سکتا ہو۔

زبانی تقریر کے مقابلے میں "تحریر" روایت کی اصل صورت کے تحفظ کا ایک بڑا ذریعہ ہے، لیکن یکے بعد دیگرے نقل روایت کی صورت میں جب الفاظ و عبارات زبانِ خامہ سے گزرتے ہیں تو صاحب تحریر کی ذہنی روش اور نفسیاتی حالتوں کے باعث جانے ان جانے طریقوں سے ان میں بہت سی تبدیلیاں راہ پا جاتی ہیں۔ مختلف زبانوں میں ایسے بے شمار متون ملتے ہیں جن میں گونا گوں اختلافات موجود ہیں۔

یہ اختلافات ہر سطح اور ہر موقع پر یکساں طور سے اہم نہیں ہوتے، اپنی نوعیت اور اساس کے اعتبار سے کہیں غیر معمولی اور بہت اہم ہوتے ہیں اور کہیں غیر اہم، کہیں حقیقت سے ان کا رشتہ قریب کا ہوتا ہے اور کہیں بہت دور کا اور ایسے بھی کچھ اختلافات ہو سکتے ہیں جن کو تحقیق و تنقید کے معیار سے درخور اعتنا بھی قرار نہ دیا جا سکے۔

کسی روایت کی تسوید کے وقت تو ہر مصنف اپنی عبارتوں یا کسی عبارت کے مختلف اجزاء میں تبدیلیاں کرتا ہے لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ابتدائی یا ثانوی روایت کی تکمیل اور مبیضہ کی تیاری کے بعد بھی صاحب تصنیف اس میں نئی معلومات کی روشنی یا ذہن کے نئے طریق رسائی کے مطابق تبدیل کرتا ہے اور گاہ گاہ ایک زمانے تک اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے جس کے باعث اس کی مختلف روایتوں میں اختلاف نسخ پیدا ہو جاتا ہے اور کبھی جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا، نقل روایت کے وقت یہ تبدیلیاں کہیں عبارت اور کہیں اجزائے عبارت میں در آتی ہیں، جو اختلاف روایت کا سبب بنتی ہیں۔ زمان و مکان کا اختلاف بھی بیشتر اس کے پس منظر میں موجود ہوتا ہے جو لفظ و معنی اور املا و تلفظ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ بنیادی رسم خط Original script کی تبدیلی بھی اس کے موجبات میں سے ہے۔

اس ضمن میں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہ کیا جانا چاہیے کہ کبھی خود مصنف بھی اضطراری یا غیر ارادی طور پر کچھ سے کچھ لکھ جاتا ہے جو اس کا مقصد نہیں ہوتا یہی صورت کاتب کے ساتھ بھی پیش آ سکتی ہے۔

نظر ثانی میں ایسی فروگزاشتوں کی بالعموم تصحیح ہو جاتی ہے۔ لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ نظر ثانی کی نوبت ہی نہیں آتی یا پھر طائرانہ نظر اور سہو فکر کے باعث ان تبدیلیوں پر جو نا معلوم اور غیر محسوس طور سے ہو جاتی ہیں، نظر بھی نہیں جاتی اور یہ صورتیں باقی رہ جاتی ہیں۔

کہیں ان کی نوعیت نسخہ بدل کی سی ہوتی ہے اور کہیں یہ خامہ غلط نگار کی روش کا "زہ آورد" ہوتی ہیں۔ کبھی املائی صورتوں کی مشابہت اس کا سبب بنتی ہے، کبھی متوازی ہیئت یا لفظ کی معنوی مناسبت ذہن کو اس طرف مائل کرتی ہے۔ کبھی لاعلمی، تساہل اور کم نظری کے سبب سے ایسا ہوتا ہے اور کبھی دیدہ دانستہ عبارت میں قطع و برید کر کے اپنے خاص عقیدے، خیال اور مقصد کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے۔ کبھی اس طرح کی کوئی تبدیلی عوام کی زبان پر جاری و ساری متن میں نا معلوم

طور پر ہو جاتی ہے۔ کبھی غلطی خود روایت نگار کرتا ہے اور کبھی وہ کسی دوسری روایت یا نسخے سے ماخوذ ہوتی ہے۔ جس کے باعث یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک ہی قسم کی تبدیلی یا غلطی ایک سے زیادہ روایتوں میں ملتی ہے۔ نسخوں کے ''شجراتی سلسلہ'' میں ان امور کی بہت اہمیت ہے۔

مختلف النوع متنی تبدیلیوں کو ان کی نسبتی نوعیت کے پیش نظر کئی حلقوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔

ترمیم: نامعلوم اسباب کے تحت ہونے والی تبدیلیاں، جن میں سہو نظر اور لغزش قلم کو بھی داخل سمجھنا چاہیے۔

تعبیر: جس میں مبہم لفظ کی وضاحت کے لیے کسی عبارت کو بڑھایا گیا ہو۔

تنسیخ: جس میں جان بوجھ کر کسی متن یا اجزائے متن کو منسوخ کیا گیا ہو۔

تصحیح: صاحب متن نے خود اپنی خواہش اور مقصد کے مطابق عبارت میں کوئی تبدیلی کی ہو۔

تصحیف: صاحب متن کے علاوہ کسی دوسرے شخص نے متن یا اجزائے متن میں دانستہ کوئی تبدیلی کی ہو۔

غلط انتساب ایک دوسری صورت ہے، جس کے اپنے کچھ اسباب و وجوہ ہو سکتے ہیں۔ کبھی یہ خواہش اور ارادے کے تحت ہوتا ہے اور اپنی تصنیف از راہ عقیدت و خلوص دوسرے کے نام کر دی جاتی ہے اور کبھی نقل بردار کی لاعلمی، خیالات کی یکسانیت، بحور و اوزان کی یک رنگی اس کا سبب بن جاتی ہے۔ کبھی مختلف تصانیف کی ہم رشتگی کے باعث ایسا ہوتا ہے۔ کبھی مصنفین یا کتابوں کے ناموں کی مشابہت اس کا موجب بن جاتی ہے اور کبھی اس سلسلے میں کچھ خاص مقاصد و مرادات کے زیر اثر نوبت جعل و دغل تک پہنچ جاتی ہے۔

یہ صورت حال ہو یا وہ صورت حال، متنی حقائق کی جستجو کی طرف بہر نوع ذہن کو مائل کرتی ہے اور اس کا مقصد متن کی صحیح حدود اور روایتوں کا تعین ہے خواہ وہ متن طویل الذیل ہو یا مختصر۔

اس کا فیصلہ کرنے کے لیے کہ متن میں کہاں، کس نوعیت کی غلطی موجود ہے، غیر معمولی استقرا اور خوئے احتیاط کی ضرورت ہے (اس لیے کہ بعض اوقات ایسے مسائل میں تصفیے کے وقت ایک شخص خود اپنے ذہن کے پیچ و پیچاک اور فکر و نظر کی بھول بھلیوں کا بھی شکار ہو سکتا ہے)، گہری چھان بین، تقابلی مطالعہ اور بالاستیعاب نظر داری کو بھی اس کے لیے ایک ناگزیر صورت سمجھنا چاہیے، جس کے بغیر کسی صحیح نتیجہ تک پہنچنا آسان نہیں ہوتا۔ ترتیب متن کا اساسی مقصد ہی عبارت کی صحیح قرأت کا تعین، اجزائے عبارت کی صحیح ترتیب اور اس کے وسیلے سے کسی روایت کو اس کی صحیح شکل میں پیش کرنا ہے۔ اس میں اس کی زبان، اس کے ترکیبی اجزاء اور اس کا املا سبھی باتیں شامل ہیں۔ قدیم متون کی صورت میں الفاظ کے قدیم املا کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں مصنف کا اپنا املا مرجع حیثیت رکھتا ہے۔ یہ املا متن کی صوری ہیئت کا ایک لازمی جزو ہوتا ہے۔

کسی متن کی اصل اور صحیح صورت وہی ہو سکتی ہے جس کے ساتھ خود صاحب متن نے اسے پیش کیا ہو۔ اپنی اصلی شکل میں مصنف کا اپنا مسودہ یا مبیضہ اگر مل جائے اور باوثوق سطح پر اس کے بارے میں یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ یہ صحیح ہے تو اسی روایت کو اصل متن قرار دیا جانا چاہیے، لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مصنف کے قلم سے اس کی ایک سے زیادہ روایتیں موجود ہوں۔ ایسی صورت میں بالعموم آخری روایت کو مستند روایت کا درجہ دیا جاتا ہے لیکن تخلیقی متون میں جہاں زبان، املا اور تلفظ کے بہت سے مسائل متن سے وابستہ ہوتے ہیں وہاں اولین متن کو اساسی روایت قرار دینا اور موخر روایات کو اضافی حیثیت سے شامل کرنا زیادہ بہتر صورت ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ اس سے پیشتر بھی اشارہ کیا جاچکا ہے، خطی نسخے یا نسخوں کی عدم موجودگی میں استنادی اور استشہادی متون کو ان کی جگہ رکھا جاسکتا ہے۔ یہ ہی بات مختلف مطبوعہ نسخوں کے سلسلے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ اگر کسی روایت کے ایک سے زیادہ قلمی اور مطبوعہ ماخذ موجود ہوں اور ان کے زمانۂ تحریر کا تعین داخلی اور خارجی شہادتوں کی مدد سے ممکن ہو تو Gradation of Text کے اصول پر ان کے درجۂ استناد کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ تصحیح متن کا کام قدیم قلمی یا مطبوعہ نسخوں کی مدد سے ان کے تقابلی مطالعے کی روشنی میں کیا جانا چاہیے۔ اس کے لیے مصنف یا مصنف کے زمانے کے رسم خط، زبان، املا اور تلفظ کی صورتوں سے علمی سطح پر واقفیت ضروری ہے۔ اس زمانے کے لغات اور فرہنگوں سے بھی حسب ضرورت استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

: مختلف روایتیں اپنی باہمی مناسبتوں اور مماثلتوں یا اختلافی نوعیتوں کے باعث ایک دوسرے سے بالواسطہ اور بلاواسطہ طور پر وابستہ ہوتی ہیں اور کبھی ایک روایت کا کاتب یا نقل بردار اس کا واضح طور پر اظہار کر دیتا ہے کہ اس کی موجودہ روایت فلاں روایت سے منقول ہے۔ یہ سلسلہ ایک سے زیادہ روایتوں تک جاسکتا ہے۔ کبھی یہ سلسلہ روایت خارجی شواہد کی بنا پر قائم نہیں ہوتا بلکہ داخلی شہادتیں اس کی طرف ذہن کو مائل کرتی ہے۔ زمانی تقدیم و تاخیر کے ساتھ آنے والی روایتیں ایسے سلسلوں میں اصل و فرع کو ظاہر کرتی ہیں۔

ترتیبِ متن کا کام سائنسی نہ ہوتے ہوئے بھی ایک سائنسی طریق کار کا تقاضا کرتا ہے، اس کے لیے ذہنی تربیت کی ضرورت ہے۔ جو لوگ اہتمام تلاش جزئیات نہ کرسکیں اور جن کی طبیعت مسلسل محنت، ذہنی کاوش اور دیدہ ریزی پر آمادہ نہ ہو، انھیں اس کام سے دلچسپی کا اظہار نہ کرنا چاہیے۔

اردو میں ترتیب متن کے کام پر اب تقریباً ایک صدی بیت رہی ہے۔ جس میں ہر نوع کے نمونے سامنے آئے ہیں۔ کچھ قلمی نسخے بہت سلیقے سے مرتب ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر حافظ محمود شیرانی، مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور پروفیسر مسعود حسن رضوی وغیرہ اکابر کے مرتبہ بعض متنوں کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ ترتیب متن کی ایک دلچسپ مثال مولانا محمد حسین آزاد کا دیوان ذوق بھی ہے۔ لیکن ایسے کچھ نسخوں کے مقابلے میں بڑی تعداد ایسے متنوں کی ہے جن کی ترتیب میں متن اور ترتیب متن کی بنیادی شرائط کو تقریباً نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ قدیم مخطوطوں اور نایاب قلمی نسخوں کو ان کی اصل شکل میں چھاپ دینا بھی بڑی بات ہے لیکن اس ''عمل خیر'' سے ترتیب متن کے تقاضے پورے نہیں ہوتے اور متن کے بارے میں (ذہن کی سطح پر ابھرنے والے) بہت سے امور تحقیق وتنقید کی روشنی سے محروم رہتے ہیں۔

جہاں تک اصول تحقیق وترتیب متن کا سوال ہے، اب تک اس موضوع پر ڈاکٹر عبدالودود، ڈاکٹر نذیر احمد اور رشید حسن خان جیسے اہل تحقیق کے مضامین کے علاوہ ڈاکٹر خلیق انجم کی کتاب ''متنی تنقید'' بھی سامنے آچکی ہے۔ ڈاکٹر انصار اللہ نظر نے بھی تدوین متن پر مضامین لکھے ہیں۔ ان حضرات کی توجہ دہی کی بدولت اب اس موضوع کی اہمیت اور اس ضمن میں کارکردگی کی ضرورت کو محسوس کیا جارہا ہے، جس کے باعث یہ موضوع زیادہ توجہ، تحقیقی مطالعے اور تنقیدی کاوش کا تقاضا سنج نظر آتا ہے۔ یہی ذہنی تقاضا راقم الحروف کی اس علمی کاوش کا محرک ہے۔

علاوہ بریں سالہا سال تک ترتیب متن کے کام میں مشغول رہنے اور اس سلسلے میں گوناگوں مشکلات سے گزرنے کے باعث بہت سے مسائل میرے سامنے آئے ہیں اور اپنی معمولی صلاحیت کے مطابق میں نے ان پر غور وفکر کیا ہے۔ میں نے جو اصول وضوابط وضع کیے ہیں وہ بہت کچھ میرے ذاتی مطالعے اور تجربے کا حصہ ہیں۔ اس میں بیشتر اچھے تحقیقی اور تدوینی نوعیت کے کاموں کے علاوہ قدیم مخطوطوں اور مطبوعہ نسخوں سے بھی مدد لی گئی ہے اور مختلف مواقع پر ادبی مآخذ کے علاوہ غیر ادبی مآخذ کو بھی سامنے رکھا گیا ہے۔ بایں ہمہ اخذ نتائج اور استنباط نظائر کے لیے جگہ جگہ قوت استقرا کا سہارا بھی لیا گیا ہے جو اس سلسلۂ کار کی ایک مجبوری تھی۔ بعض انگریزی کتابوں سے بھی رجوع کیا گیا مگر ان سے کوئی بڑا فائدہ اٹھانے کی نوبت نہیں آئی۔ اس میں میری کم نظری کو بھی دخل ہوسکتا ہے۔

یہ مقالہ اپنی موجودہ صورت میں اردو زبان میں اس موضوع پر یہ پہلا مبسوط کام ہے، جس کے لیے بہت سی اصطلاحیں بھی راقم الحروف کو وضع کرنی پڑی ہیں۔ اسی کے ساتھ بعض اصطلاحوں کو ان کی نئی تعبیر کے ساتھ پیش کیا گیا۔ یہ سب کس حد تک صحیح یا غلط ہیں نیز اس کام کی انجام دہی میں مجھے کس قدر کامیابی ہوئی ہے، اس کا فیصلہ اہل علم ہی کرسکیں گے۔ خاص طور پر وہ افراد جو اس کام کو زیادہ صحیح سمت کے تعین کے ساتھ آگے بڑھائیں گے۔

❖❖❖❖

حواشی

(۱) اُصول تحقیق وترتیب متن، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، دہلی، ۱۹۷۷ء، ص ۱۷ تا ۳۰۔

(۲) اسٹینڈر، اُردو انگلش ڈکشنری، ص ۱۲۰۸۔

(۳) Introduction to Indian Textual Criticism: by Prof. S.M.Katre Page 27.

(۴) Introduction to Indian textual criticsm. P-20.

❖❖❖❖

تنقیدِ متن [۱۸]

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

تنقیدِ متن (Textual Criticism) جیسا کہ اس کے اصطلاحی نام سے ظاہر ہے، اپنی نوعیت اور مقصد کے اعتبار سے اس تنقید سے مختلف ہے جسے ادبی تنقید (Literary Criticism) کہا جاتا ہے۔ ادبی تنقید میں ادب اور مقصدِ ادب سے متعلق مختلف زاویہ ہائے نگاہ کے تحت کسی شعری یا ادبی تصنیف کی فکری اور فنی قدر و قیمت کے تعین کی کوشش کی جاتی ہے اور اس کے خوب و ناخوب کے بارے میں فیصلہ دیا جاتا ہے۔ لیکن تنقیدِ متن کی صورت میں کسی غیر تحقیقی نقطۂ نظر کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ذاتی یا جماعتی پسند و ناپسند سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔ یہاں تو متن سے متعلق مختلف خارجی و داخلی حقائق سے گفتگو کی جاتی ہے اور اس متن کی تحقیقی اہمیت اور ترتیبِ متن کے نقطۂ نظر سے اس کی افادیت پر کوئی فیصلہ دیا جاتا ہے۔

تنقیدِ متن کے کام کو ہم اساسی طور پر دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

معروضی مطالعہ (Objective Study)

موضوعی مطالعہ (Subjective Study)

یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ معروضی یا موضوعی مطالعہ بھی اپنے مفہوم اور معانی کے اعتبار سے ادبی تنقید کی خارجیت یا داخلیت سے بہ وجوہ مختلف ہے۔

معروضی مطالعے میں آنے والے امور کو ہم دو عنوانات کے تحت رکھ سکتے ہیں۔

(۱) متنی معارض

(۲) متنی مواقف

متنی معارض میں کسی نسخے کی ہیئت، اس کی تقطیع، مسطر، تعداد اوراق یا صفحات، خالی ورق یا صفحے (اگر ہوں)، کاغذ، قلم، روشنائی، رسم کتابت، تزئین، مہریں، دستخط جیسے امور موضوعِ گفتگو بنتے ہیں۔ نو دریافت متون کی صورت میں ان کی دریافت کی کہانی اور اس سے متعلق ضروری باتیں بھی (جن میں افسانوی اندازِ فکر، جذباتی لب و لہجہ اور تاثراتی طرزِ گفتار سے امکانی طور پر بچنے کی ضرورت ہے) اس ضمن میں آ سکتی ہے۔

کم یاب کتب و رسائل کے سلسلے میں ان کے مخازن کا ذکر اور اگر وہ کسی باقاعدہ لائبریری کی زینت ہیں تو نشانِ فہرست یا کیٹلاگ نمبر، مطبوعہ نسخوں کی صورت میں مطبع، مقام اور سالِ اشاعت کا حوالہ بھی متنی معارض پر گفتگو کے ضمن میں آتا ہے۔

متنی مواقف میں نسخہ کے مشتملات اور شعری متون کی صورت میں مختلف اصنافِ سخن کا ذکر، (اس موقع پر تعداد اشعار بھی اگر دے دی جائے تو بہتر ہے) غیر تصنیفی حواشی (اگر موجود ہوں)، اصلاحات قلم زد سطور یا منسوخ اشعار (بشرطیکہ ایسی کوئی صورت موجود ہو)، نیز زمانۂ تالیف، تاریخ کتابت، تکملہ، خاتمہ، تتمہ، ترقیمہ، تعلیقات، قطعات وغیرہ میں سے جو بھی اس متن میں شامل ہو، اس پر مناسب حدود کے ساتھ بحث وغیرہ امور آتے ہیں۔ مؤخر الذکر اصطلاحات میں فرقِ معانی و مراتب ضروری ہے جس پر ہنوز مناسب توجہ نہیں دی گئی ہے۔ راقم الحروف کے نزدیک تکملہ وہ ضمیمہ یا اجزائے متن ہیں جو متن کی تکمیل کے بعد اضافے کے طور پر شامل کیے گئے ہوں۔ اس کے مقابلے میں خاتمہ وہ اختتامی عبارت ہے جو مصنف یا مرتب نے سپردِ قلم کی ہو۔ (مطبوعہ کتب و رسائل میں خاتمے کے عنوان سے مصححین یا ناشرین کی عبارتیں بھی ملتی ہیں جو نسخے کی اشاعت سے متعلق بعض امور نسخے کے بارے میں ہوتی ہیں)۔

ترقیمہ نقل کرنے والے شخص کی عبارت کو کہنا چاہیے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ یہ نسخہ کہاں اور کب نقل کیا گیا اور نقل برداری کا فرض کس نے انجام دیا اور اس کے محرکات کیا تھے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر ترقیمے میں یہ تمام باتیں موجود ہوں۔

تعلیقات کا اطلاق دوسری نوعیت کی عبارتوں پر ہونا چاہیے جو بعض مطبوعات یا مخطوطات کے آخر میں شامل رہتی ہے۔

متنی مواقف سے متعلق بعض امور کا تذکرہ متنی معارض کے ذیل میں آ جاتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اب تک تنقید متن کے مختلف ضوابط کو مدون نہیں کیا جا سکا۔ علاوہ بریں یہ نسخے کی اپنی نوعیت اور اس پر گفتگو کی مناسب حدود کا سوال ہے، جس کا انحصار بہت کچھ مراتب کی صواب دید پر ہوتا ہے۔

معروضی مطالعے کے مقابلے میں موضوعی مطالعے کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

(۱) متنی معارف

(۲) متنی مصادر

(۳) متنی محاسن

متنی معارف کے ذیل میں متنی شواہد اور عصری معلومات کو رکھا جا سکتا ہے۔ متنی شواہد سے واضح طور پر یہ مراد ہے کہ کیا اس زیر بحث متن میں کسی دوسرے متن سے متعلق کوئی شہادت یا شواہد موجود ہیں۔ عصری معلومات میں تاریخی حقائق، سوانحی حصے، تمدنی ماحول اور اس عہد کے تنقیدی میلان کو جگہ دی جا سکتی ہے۔

متنی مصادر میں ان کتب و رسائل اور وسیلہ ہائے معلومات کا ذکر کیا جا سکتا ہے جن کے حق میں کسی متن میں داخلی یا خارجی شواہد ملتے ہیں۔ تخلیقی متون میں مصادر کی نوعیت دوسری ہے اور یہ جاننے کی کوشش تحقیقی حدود میں کی جاتی ہے کہ مصنف کے اکتسابی حد تک سرچشمہ ہائے فکر و فن کیا ہیں۔

متنی محاسن میں اسلوب نگارش پر خالص علمی نقطۂ نظر سے گفتگو کی جاتی ہے جس کا تحسین یا تعریض سے کوئی تعلق نہیں۔ صرف متنی حقائق کے ذیل میں اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہوتا ہے۔ قدیم متون کے سلسلے میں لسانی نقطۂ نظر سے متن کے محاسن پر بحث بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں جہاں تک لفظیات کا تعلق ہے، لغوی حقائق اور لسانی حقائق میں فرق کرنا ضروری ہے۔

متن کے معروضی مطالعے کے حصہ اول و دوم (متنی معارض و متنی مواقف) سے متعلق ہماری زبان کی تحقیقی ادبیات میں مختلف و متنوع مثالیں سامنے آتی ہیں جن میں سے بعض کو یہاں پیش کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔

کلیات میر حسن کا تعارف یا مختصر معروضی مطالعہ مولوی حبیب الرحمان خاں شیروانی (مرحوم) نے تذکرۂ شعرائے اُردو، مؤلفہ میر حسن کے مقدمے میں ان الفاظ کے ساتھ پیش کیا ہے:

''.....لکھنؤ سے کلیات میر حسن کا نسخہ ہاتھ آیا جو ۱۲۵۶ھ کا لکھا ہوا ہے مطلا اور مذہب ہے اور اس اہتمام سے لکھا گیا ہے جس اہتمام سے فارسی شعرا کے دواوین لکھے جاتے تھے۔ تعجب بالائے تعجب یہ کہ قدرت اللہ خاں قاسم کا قول بھی اس پر صادق آتا ہے۔ انواع سخن سے لبریز ہے۔ چار سو صفحہ کا حجم ہے۔ تقریباً سات ہزار شعر ہیں۔ غزل کے اشعار تقریباً چار ہزار ہیں۔ چھوٹی بڑی گیارہ مثنویاں ہیں۔ سات قصیدے ہیں۔ مخمس، مسدس، مثلث، رباعی بھی ہیں۔ وہ ترکیب بند بھی واسوخت کے نام سے موجود ہیں جن کا ذکر تذکرے میں میر حسن نے کیا ہے۔ مرثیے نہیں ہیں حالانکہ میر حسن نے مرثیوں کا لکھنا تذکرے میں لکھا ہے[۱]''۔

اس کی ایک اور مثال مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے قلم سے کلیاتِ میر کے ایک نادر نسخے کے تعارف میں ملتی ہے:

''رضا لائبریری'' رام پور، میر تقی میر کے کلیات کا ایک بہت اچھا نسخہ محفوظ ہے۔ اس میں نکات الشعراء کے علاوہ ان کی نظم و نثر کا سارا کام، دیوان اُردو ۱ تا ۶، دیوان فارسی، فیضِ میر اور ذکر میر شامل ہیں۔

اس کی کتابت نہایت اہتمام سے کی گئی ہے، چنانچہ ذکرِ میر کو چھوڑ کر اور سب کتابوں کے شروع میں طلائی لوح اور پوری کتاب میں رنگین جدول کھینچی گئی ہے۔ پوری کتاب کے اوراق کی تعداد ۸۳۲ ہے اور فل اسکیپ ناپ کا ۱۷ اسطری مسطر کام میں لایا گیا ہے۔

دیوان اول کے خاتمہ پر ورق ۲۴۷ ب میں کاتب نے لکھا ہے:

دیوان اول میں تصنیف میر محمد تقی صاحب بتاریخ بست و نہم شہر رمضان سنہ یک ہزار و دو صد و چہل و پنج ہجری بخط بدربط حقیر فقیر پر تقصیر بندہ شیخ لطف علی حیدری، قلندری حسب فرمائش مرزا صاحب کرم گستر مرزا قنبر علی صاحب دام اشفاقہ، اختتام پذیرفت۔۔۔

کلیات کے آخر (ورق ۸۳۲ ب) میں لکھا ہے:

الحمد للہ کہ بفضل ایزد مستعان و عنایات ائمہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کہ کلیات میر محمد تقی صاحب غفر اللہ ذنوبہ، بتاریخ سلخ شہر رمضان المبارک سنہ یک ہزار و دو صد و چہل و شش ہجری بروز دوشنبہ یک پاس روز باقی ماندہ از خط بدربط احقر العباد شیخ لطف علی حیدری بپاس خاطر فرمائش مرزا قنبر علی صاحب زاد اشفاقہ صورت اختتام پذیرفت۔

ان دونوں تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ لطف علی حیدری (غالباً بمعنی شیعی) نے مرزا قیصر علی کے لیے ایک برس اور دو یا تین دن میں اسے لکھا اور ۲۹ رمضان سنہ ۱۲۴۶ھ اس کی تاریخ اختتام تھی......

کسی صاحب ذوق نے اس نسخہ کے ابتدائی تین دیوان، دیوان سوم کی ردیف م تک بغور پڑھے ہیں، چنانچہ جگہ جگہ بین السطور اور حاشیوں میں الفاظ اور محاورات کے معنی، مصرعوں اور شعروں کی تشریح اور متبادل الفاظ درج کیے ہیں جن میں سے اکثر اختلاف نسخ کی حیثیت رکھتے ہیں[۵۲]......''۔

اس تعارف کا پہلا حصہ متنی معارض سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا حصہ متنی مواقف سے، جن کو دو الگ الگ عنوانوں کے تحت رکھ کر زیادہ سہولت سے سمجھا جاسکتا ہے۔ ان کی تفصیلات اور جزئی امور سے متعلق بحث کا انحصار نسخہ کی اپنی نوعیت پر ہوتا ہے۔

بیاض آزاد:

''کلام ذوق پر مشتمل یہ نادر بیاض آغا محمد باقر، نبیرۂ آزاد (لاہور) کی ملکیت ہے۔ اس کو ہلکے مٹیالے رنگ کے کاغذ پر تیار کیا گیا ہے۔ اس دور کی بیاض سازی کی عام روش کے برعکس اس کی شکل کچھ رجسٹر جیسی ہے۔ یہ کل ۹۸ اوراق پر مشتمل ہے، اس کی تقطیع ۹x۱۲ ہے۔ دونوں جانب کے پشتے خستہ ہو چکے ہیں۔ لیکن بیاض کا کاغذ ہنوز اچھی حالت میں ہے اور اس کے آثار کہنگی نے شکستگی کی شکل اختیار نہیں کی، اگرچہ سواد خط روشن نہیں ہے اور خط بھی شروع سے آخر تک ایک نہیں، نیز غزلوں کی تسطر و تحریر میں بھی کوئی خاص سلیقہ یا طریقہ نہیں برتا گیا۔ بعض غزلوں کے مسودے پہلی بار اس بیاض کے اوراق پر ہی تیار کیے گئے ہیں۔ یہ ذوق کی اپنی تحریریں معلوم ہوتی ہیں۔ ان میں جگہ جگہ اصلاحیں بھی ذوق کے اپنے قلم سے ہیں۔ جہاں غزلیں نقل کی گئی ہیں وہاں بھی سواد خط کچھ زیادہ روشن نہیں ہے۔ کچھ غزلیں ایسی بھی ہیں جو ہلکے سرمئی یا زعفرانی رنگ کی روشنائی سے لکھی ہوئی ملتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مختلف وقفوں میں ذوق کا جو کلام ان کی زندگی میں یا اس کے بعد دستیاب ہوتا رہا وہ اس بیاض میں نقل کیا جاتا رہا۔ بعض جگہوں پر خالی صفحات بھی چھوڑے گئے ہیں، شاید اس امید پر کہ اور غزلیں بھی ہو جائیں یا مل جائیں۔ اس کی بعض غزلیں ذوق کے مشہور شاگرد مولوی دلدار علی مذاق کی نقل کردہ ہیں۔ ان کے ساتھ میاں ذوق سلمہ لکھا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ ان غزلوں کی نقل کے وقت ذوق حیات تھے۔ اس سے ان غزلوں کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے''۔[۵۳]

نو دریافت متون کے سلسلے میں احوال دریافت کی بھی اہمیت ہے۔ اس کی کچھ دلچسپ مثالیں گل رعنا مرتبہ مالک رام، مطبوعہ علمی مجلس، دہلی اور کربل کتھا ترتیب دادہ مالک رام اور ڈاکٹر مختار الدین آرزو کے دیباچوں میں مل سکتی ہیں۔ اس کی بعض اور مثالیں بھی سامنے آئی ہیں۔ اس ضمن میں زیادہ اہم بات اس رشتے کا پتہ چلانا ہوتا ہے جو اس نسخے اور اس کے مالک یا مخزن کے مابین ہوتا ہے جس سے اس کے سفر حیات کا کچھ حال معلوم ہو جاتا ہے اور ان رشتوں کا علم اس کی تحقیقی اہمیت کو بڑھا دیتا ہے۔ مثلاً مالک رام صاحب نے اپنے دریافت کردہ نسخۂ گل رعنا کے سلسلے میں صاحب نسخہ سید علی بلگرامی کے خاندان کا بھی ذکر کیا ہے اور اس ضمن میں لکھا ہے:

''(سید علی نقی بلگرامی کے جد بزرگوار) نواب عماد الملک (سید حسین بلگرامی) کے دادا مولوی سید کرم حسین تھے۔ ان کا خاندان بلگرامی سادات کا ہے...... مولوی کرم حسین کو عربی اور فارسی میں عالمانہ دستگاہ حاصل تھی۔ جس زمانے میں غالب کلکتے گئے ہیں، یہ وہاں شاہ اودھ کی طرف سے گورنر جنرل کے دربار میں سفیر تھے...... سید کرم حسین کا اپنے علم و فضل اور دنیاوی وجاہت کے اعتبار سے کلکتے کے عمائد میں شمار ہوتا تھا۔ عین ممکن ہے کہ غالب کی ان سے ملاقات مولوی سراج الدین احمد کے ذریعے ہوئی ہو...... رفتہ رفتہ مولوی کرم حسین کے غالب سے تعلقات بہت دوستانہ ہو گئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ جب غالب نے گل رعنا مرتب کی ہے تو مولوی کرم حسین نے انھی ایام میں اس کی نقل حاصل کر لی ہوگی[۵۴]''۔ اس موقع پر یقین کا اظہار ضروری نہ تھا۔

مالک رام صاحب ہی کے قلم سے اس کے متن کا تعارف ملاحظہ فرمائیے:

''گل رعنا کا یہ نسخہ مکمل ہے۔ کاغذ کا سائز ۲/۱ ۲۴x۱۴ سم ہے اور حوض ۲/۱ ۱۹x۲/۱ ۹.۱۴ سم۔ کاغذ باریک ولایتی ہلکے بادامی رنگ کا ہے۔ کہیں کہیں کرم خوردگی کے آثار ملتے ہیں۔ لیکن اس سے نہ کتاب کو کوئی نقصان پہنچا ہے نہ متن ہی کا کوئی حصہ ضائع ہوا ہے۔ پوری کتاب کی نظم و نثر ایک ہاتھ میں سیاہ روشنائی سے نستعلیق خط میں لکھی گئی ہے۔ کاتب کو اگرچہ بہت خوشخط تو نہیں کہا جاسکتا لیکن بدخط بھی نہیں ہے۔ غلطی بھی کم کرتا ہے...... ہر جگہ تخلص، عنوان، ولہ وغیرہ الفاظ شنجرفی روشنائی سے لکھے ہیں۔ ہر ایک صفحے پر دو جدولیں ہیں۔ باہری جدول صفحے کے کنارے سے کچھ ہی اندر کی طرف اکہرے نیلے خط کی ہے۔ اس سے تین سم اندر حوض کے عین اردگرد جدول تین خطوط پر مشتمل ہے۔ باہر نیلا خط ہے اور اندر کی طرف شنجرفی رنگ کے دو خط۔ غزلوں کے درمیان کے خطوط بھی شنجرفی ہیں...... ہر ایک صفحے

پر تیرہ سطریں ہیں۔ صفحہ ایک خالی ہے۔۔۔۔ پوری کتاب ۷۹ صفحات پر مشتمل ہے۔

ص ا سے فارسی دیباچہ شروع ہوتا۔ اس کے عنوان میں صرف یہ لفظ لکھے ہیں: لاموثر فی الموجود الا اللہ۔

ص ۸ سے اُردو حصۂ انتخاب شروع ہوتا ہے اور یہ ص ۷۲ تک چلا گیا ہے۔ آخری پانچ شعر اسی صفحے پر چھ سطروں میں درج ہیں اور اسی کے بعد فارسی نثر اور فارسی انتخاب شروع ہو جاتا ہے۔۔۔۔ اردو انتخاب ۱۹۶ غزلوں سے لیا گیا ہے اور اس میں کل ۴۵۵ شعر ملتے ہیں[۵]۔"

اتنے ہی شعر فارسی کے بھی مالک رام صاحب نے ردیف وار درج کیے ہیں جو نسبتاً زیادہ صحیح صورت ہے۔

متن کے معروضی مطالعے کے سلسلے میں پیش آنے والے بعض اہم امور کی جانب اوپر کی سطور میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اس ضمن میں جو مثالیں پیش کی گئی ہیں ان سے کسی متن کے معروضی مطالعے کی قیاسی حد بندی مقصود نہیں بلکہ بعض اہم پہلوؤں پر توجہ دلانا پیش نظر ہے۔ سچ یہ ہے کہ ایسے امور کا احاطہ متن کی اپنی نوعیت اور مرتب متن کی تفہیمی صلاحیت اور دیدہ و دریافت پر منحصر ہے۔ بہر حال متن کے مطالعے کی اہمیت وافادیت کا جتنا تعلق متن کے خارجی حقائق کے مطالعے سے ہے اس سے زیادہ اس کا تعلق متن کے داخلی کوائف کے مطالعے اور حقائق کی جستجو سے ہے، جسے سطور بالا میں متن کے موضوعی مطالعے کا نام دیا گیا ہے۔

جیسا کہ اس سے پیشتر بھی مختصراً اشارہ کیا جا چکا ہے، موضوعی مطالعے کے اعتبار سے ہم متنی حقائق کو تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

الف متنی مواقف

ب متنی معارف

ج متنی محاسن

متنی مواقف کے ذیل میں تاریخی کوائف، سوانحی حقائق، جس میں سیرت نگاری کو بھی شامل سمجھنا چاہیے، عصری معلومات، تہذیبی ماحول اور ادبی وتنقیدی رجحانات کو رکھا جا سکتا ہے۔

متنی معارف میں متنی مصادر، متنی شواہد اور اس سے متعلق امور زیر بحث آتے ہیں جن پر معلومہ حقائق کی روشنی میں گفتگو کی جا سکتی ہے۔

متنی محاسن میں متن کی ادبی اور لسانی خرابیاں آتی ہیں۔ ادبی خوبیوں سے مراد طرز نگارش سے متعلق ایسے حقائق ہیں جو متن کے بارے میں معلومات کا ضروری حصہ ہوں۔ اس ضمن میں حسب ضرورت تراکیب تراشی، الفاظ وفقرات کی استخوان بندی اور جملوں کی ساخت کی جانب تنقیدی اشارے کیے جا سکتے ہیں۔ لسانی مطالعے میں متن کی اپنی نوعیت کے پیش نظر اس کی زبان اور لفظیات وحروف وغیرہ کا وہ تنقیدی جائزہ شامل ہے، جس کی اساس لسانیاتی حقیقتوں پر ہو۔

ادبی کتب ورسائل کا اگرچہ براہ راست موضوع تاریخ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن بالواسطہ طور پر ان میں ایسے حقائق مل جاتے ہیں جو بعض تاریخی کوائف اور وقوعات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ تذکروں، قدیم دواوین اور بعض دوسرے رسائل اور خطوط کے مجموعوں میں ایسے واقعات وحالات کہیں اختصار اور کہیں بعض تفصیلات کے ساتھ سامنے آئے ہیں۔ ان واقعات کو بغیر چھان بین یا تحقیق کے تاریخ میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ان سے جہاں ایک تاریخ نگار بعض وقت اہم جزئیات اور نتائج اخذ کر سکتا ہے وہاں ان کی روشنی میں بعض تخلیقات کی شانِ نزول کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے اور اس سے زیادہ یہ کہ ان سے اس عہد کے تمدنی مزاج کو سمجھنے اور متن کی اپنی تاریخی حیثیت کو متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔ مثال کے طور پر یہاں ہم اس واقعہ کو پیش کر سکتے ہیں جسے میر نے ہوا کے ترجمے میں درج کیا ہے:

"در وقت محمد شاہ بادشاہ سنکرن (کذا) نام جوہری جوتے فروشی راکشت بحمایت اور بلوا شد چنانچہ جوتے فروشان در جامع مسجد مانع خطبہ گشتند۔ ظفر خاں روشن الدولہ کہ بطرہ باز شہرت دارد جوہری مذکور را پناہ داد۔ آخر ہنگامہ برپا شد وجنگ عظیم درمیان امرایان (کذا) عظام افتاد۔ بسیار از طرفین بقتل رسیدند۔ ظفر علی خان تاب نیاورد و گریخت۔ از بن سانحہ این قسم خفت کشید کہ از آن باز از خانہ بدر نیامد این قصہ را شاعر مسطور در مخمس بست کہ ہنوز بر السنہ مذکور است[۶]۔"

اس سے نہ صرف یہ کہ مخمس کی شانِ نزول کا پتہ چلتا ہے بلکہ عہد محمد شاہ میں امرائے سلطنت کے باہمی اختلافات اور اختلالِ احوال پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے۔

موسوی خاں فطرت ومعز کے ترجمے میں قائم نے لکھا ہے:

"روزی حضرت بادشاہ در اقتضای مہمی متردد بودند۔ صورت واقعہ بر سبیل مشورت بر دو نوع بخان مذکور تقریر فرمودند۔ بعد تامل بعرض اقدس رسانید کہ باعتقاد غلام حرف ثانی معقول است۔ بہ استماع این کلمہ رای حضرت برنا معقول بودن سخن اولی انتقال نمودہ روی توجہ ازین بی گناہ گردانیدہ بطرف دیگر مشغول شدند۔ چون این عزیز بہ مغز سخن ذا رسید خجالت بسیاری کشید۔ بعد برخاست دیوان کہ بہ خانہ، خود آمد بیماری بہم رسانید۔ اطبا بموجب امر حضور بہ معالجت وی حاضر

شدند۔ پس از تشخیص معلوم شد کہ زہرہ اش آب شدہ است۔ فی الجملہ آن روز را شام نکردہ کہ زو بہ مقر اصلی آوزد ک''۔

یہ واقعہ صرف موسوی خان کے سانحہ وفات ہی سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ عہد اورنگ زیب کے درباری آداب اور سطوت شاہی کی نمائندگی بھی کرتا ہے۔

ترتیب متن کے سلسلے میں ایسے تمنی مواقف کا مناسب حدود کے ساتھ تذکرہ یا ان کی طرف ضروری اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ ایسے ہی بعض بیانات اور تراجم سوانحی نقطۂ نظر سے بڑے اہم ہوتے ہیں اور خود صاحب متن کے سلسلے میں تو ان کی اہمیت اور بھی زیادہ ہوتی ہے۔ قائم نے اپنے ترجمے کے ضمن میں لکھا ہے:

''ہر چند از باشندگان قصبۂ چاند پور است اما از بدو شعور تا این حال بہ توسل نوکری بادشاہی بہ دار الخلافہ شاہجہان آباد گزراندہ دلیل و نہار بہ مقتضای مناسبت بہ صحبت سخن سنجان عالی مقدار بسر بردہ در این ایام کہ رشتہ سلک انتظام مردم بادشاہی بہ صدمۂ انقلاب سلطنت از ہم گسیخت دہر یکی چون لالی آب دار بر خاک نذلت افتادہ رو بہ ہر سو نہادہ، چارو ناچار بلکہ بی اختیار ارادۂ سفر برای اقامت غالب آمد[8]''۔

اختصار کے باوجود اس میں مؤلف کے سوانح اور اس عہد سے متعلق اہم اشارے موجود ہیں۔

میر حسن نے اپنے ترجمے میں لکھا ہے:

''اصل این فقیر این غلام حسین ولد میر عزیز اللہ بن میر امامی ہرویست۔ میر امامی نور اللہ مرقدہ ہفت قلم و فاضل تبحر بودند۔ بہ سبب فضیلت در شاہجہان آباد آمدہ بین الاقران ممتاز گردیدند۔ گاہ گاہ شعر ہم می فرمودند۔ پس این عاجز سخن را سر رشتہ شاعری اجدادی است نہ امروزی۔ حاصل کہ از صغر سن میلان طبیعت این فقیر بہ طرف سخن بیشتر بود...... اصلاح سخن از میر ضیا گرفتہ ام لیکن طرز او شان از من کما حقہ سرانجام نیافت۔ بر قدم دیگر بزرگان مثل خواجہ میر درد و میرزا رفیع سودا و میر تقی پیروی نمودم۔ شروع جوانی از گردش روزگار بدہنجار کہ ہرگز بہ کسی وفا نکردہ است بہ طرف لکھنؤ و فیض آباد رسیدم باری کم و بیش از قدردانی نواب فلک جناب سالار جنگ بہادر بہ لب نان رسیدہ...... تا حال بر نوع زندگانی می نمایم[9]''۔

کسی متن پر تنقید کے سلسلے میں مصنف کی اپنی ذات کے علاوہ جو سوانحی مواد ملتا ہے اس پر تفصیل سے گفتگو کرنا بسا اوقات ممکن نہیں ہو سکتا، لیکن بعض اہم تراجم کے ضمن میں تقابلی مطالعے کے بعد جو نئی باتیں سامنے آئیں ان کی جانب اشارہ کر دینا ضروری ہے۔

سوانحی مواد کے علاوہ اس امر پر بھی اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی جا سکتی ہے کہ صاحب متن نے مختلف تراجم کے ذیل میں سیرت نگاری کے کیسے نمونے پیش کیے ہیں اور معاندانہ سیرت نگاری کی بھی کوئی صورت ان کے یہاں ملتی ہے یا نہیں۔ مثلاً میر نے اکثر شعرا کے تراجم میں ان کی سیرت کے نمایاں پہلوؤں کو فراموش نہیں کیا اور مختصر الفاظ میں ان کی انسانی شخصیت کے خد و خال کو پیش کر دیا ہے۔ میر محتشم علی خاں کے بارے میں لکھا ہے:

شاعر خوب فارسی و ریختہ، فہمیدہ، سنجیدہ، با ہمہ بعجز و انکسار پیش می آید۔ جنسی بود کہ در دل ہمہ کس جای او خالیست[10]''۔

لیکن بعض ہم چشموں کی سیرت نگاری میں میر نے طنز و تعریض کے نشتروں سے بھی کام لیا ہے، چنانچہ شیخ محمد حاتم کے لیے لکھا ہے:

''مرد یست جاہل و متمکن و مقطع وضع، دیر آشنا[11]''۔

عصری معلومات کا دائرہ اپنے آثار و احوال کے لحاظ سے بے حد رنگا رنگ ہو سکتا ہے۔ اس رنگا رنگی کی طرف بحیثیت مجموعی ضروری اشارات بھی کیے جا سکتے ہیں اور بعض کوائف کو من و عن بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ ایسے کوائف کی متعدد و متنوع مثالیں ہمارے تذکروں میں مل جاتی ہیں۔ قائم نے ولی کے ترجمے میں لکھا ہے۔

''در سنہ چہل و چہار از جلوس عالمگیر بادشاہ ہمراہ میر ابو المعالی نام سید پسری کہ دلش فریفتۂ او بود، بہ جہان آباد آمد۔ گاہ گاہ بزبان فارسی در وصف خط و خالش می گفت[12]''۔

میر نے ولی کی، شاہ سعد اللہ سے ملاقات کے ضمن میں جس کا ذکر خود قائم کے یہاں بھی موجود ہے، ایک اہم بات یہ لکھی ہے:

''میاں صاحب فرمود این ہمہ مضامین فارسی کہ بیکار افتادہ اند در ریختۂ خود بکار ببر۔ از تو کہ محاسبہ خواہد کرد[13]''۔

میر حسن نے فضائل علی بے قید کے ترجمے میں ان کے افسانۂ عشق کو بھی بیان کر دیا ہے:

''با یکی از بتان ہند تعشق پیدا کردہ بود۔ از گردش روزگار ہمراہ نواب عمدۃ الملک بہ الہ آباد رفت۔ از فراق محبوب چون ماہی بی آب و آہوان بی صحرا می تپید و وحشت می نمود۔ روزی از برای دل بری او نواب موصوف جمعی از اہل نشاط جمع نمودہ بہ آن طوائف اشارہ کرد کہ این را از ناز دلربایانہ بہ دام آرید۔ شاید کہ دل

این عزیز دا شود و اندوہ و غم فراموش کند۔ غرض از آن جمع یک نازنین آمدہ ایشان را بہزار فریب و عشوہ رام کرد...... لیکن تماشا در آن جاہست کہ چون ایشان کام دل حاصل نمودہ بہ سزانوی آن پری رو سر گذاشتند و بہ خواب رفتند در خواب محبوبۂ اولین خود را دیدند[۱۴]''۔

اسی طرح انھوں نے تاباں کے ذکر میں لکھا ہے:

''تمام عالم فریفتۂ حسن او بود...... بلکہ گرمی بازار ریختہ از آن شعلہ رو دو بالا شد۔ اکثر اشخاص این فن را وسیلہ ساختہ دخیل صحبت اومی شدند[۱۵]''۔

عصری معلومات کے ضمن میں ایسے حقائق کو بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً میر نے سید عبدالولی عزلت کے ترجمے میں لکھا ہے:

''تازہ وارد ہندوستان کہ عبارت از شاہجہان آباد است، شدہ اند[۱۶]''۔

عزیز اللہ کے ترجمے کے ضمن میں یہ اطلاع سامنے آتی ہے:

''غزل گفتہ است کہ تمام اولیاء را در دو ذکر کردہ است[۱۷]''۔

محمد یار خاکسار کے ترجمے میں اپنے تذکرے کے جواب میں ان کے تذکرے کا ذکر کیا ہے:

علی الرغم این تذکرہ تذکرۂ نوشتہ است بنام معشوق چہل سالہ، خود و احوال خود را اول از ہمہ نگاشتہ[۱۸]''۔

میاں کمترین کے ذکر میں مجلس مراختہ کا تذکرہ آیا ہے:

گاہ گاہ در مجلس مراختہ کہ این لفظ بوزن مشاعرہ تراشیدہ اند......[۱۹]''

میاں عبدالرسول نثار کے ترجمے میں لکھا ہے:

''در عصر فرخ سیر بادشاہ کہ ہنگامۂ نیکو سیر در اکبر آباد گرم شدہ بود بزرگان این با قتدار بسر می بردند[۲۰]''۔

اس طرح کہ آثار و احوال اپنے اندر مطالعے کے لیے ایک سے زیادہ اہم اور دلچسپ پہلو رکھتے ہیں۔ تہذیبی ماحول کا تعلق معاشرہ اور معاشرت کے کسی ایک پہلو سے نہیں ہوتا۔ اس کا دائرہ تو قوس قزح کے دائرے کی طرح ہفت رنگ ہوتا ہے۔ اس کے حلقۂ شام و سحر میں ذہنی رویے، بے تکلف محفلیں، شعر و شعور اور علم و ادب بھی کچھ آ جاتا ہے۔ شعرا کے دواوین، نثری قصوں اور خود تذکروں میں تہذیبی کوائف ستاروں کی طرح بکھرے نظر آتے ہیں۔

کسی تصنیف میں تہذیبی ماحول کا جو عکس ملتا ہے، اس کے لیے بعض باتوں کا ذکر بطور خاص بھی کیا جا سکتا ہے اور اس ماحول پر مجموعی تبصرہ بھی ممکن ہے غالب نے اپنے ایک خط میں دہلی کی تہذیبی زندگی کی مختصر کہانی ان الفاظ میں پیش کی ہے:

''دہلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی، قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز بازار جامع مسجد کا، ہر ہفتہ سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا[۲۱]''۔

میر نے نجم الدین علی خاں سلام کے ذکر میں لکھا ہے:

''اکثر اوقات اتفاق با ہم فکر شعر کردن و گپ زدن و مزاح نمودن می افتد[۲۲]''۔

فغاں کے ترجمے میں اس طرح کی باتیں آئی ہیں:

''طبع او مائل بسیار است چنانچہ ناگر مل را کہ دیوان تن و دخیل بادشاہت (گھی منڈی کا سانڈ) گفتہ و حکیم معصوم را در دربار معلیٰ (گاؤ گجراتی) نام کردہ[۲۳]''۔

اس سے عہد محمد شاہی میں اور اس کے کچھ بعد تک دہلی کے لوگوں کی خوش مزاجی اور خوش باشی کا پتہ چلتا ہے۔

کسی تصنیف میں اس عہد کی معاشرت اور تہذیبی ماحول کی جو جھلکیاں یا تصویریں ملتی ہیں، ان کی طرف جیسا کہ اس سے پیشتر عرض کیا جا چکا ہے، حسب ضرورت بلا واسطہ طور پر بھی اشارہ کیا جا سکتا ہے اور ان پر بحیثیت مجموعی بھی گفتگو ہو سکتی ہے۔ چنانچہ میر حسن کے تذکرے میں جو تہذیبی فضا ملتی ہے، اس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا حبیب الرحمان شیروانی نے لکھا ہے:

''طبقۂ شعرا میں کثیر حصہ ایسے کاروباری آدمیوں کا تھا، جن کا معیار اخلاق بلند تھا اور جو شعر گوئی کو زندہ دلی کا سامان اور ادب کی خدمت تصور کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ اور کمالات انسانی میں بھی قدرت و کمال پیدا کرتے تھے[۲۴]''۔

فاضل مرتب نے اس ضمن میں مختلف شعرا کے تراجم سے ان اشارات وفقرات کو نقل کیا ہے جن سے صاحب ترجمہ کے افکار وکردار پر فی الجملہ روشنی پڑتی ہے۔

تذکرہ نگار ایک دوسرے کی روشِ فکر سے فائدہ اٹھاتے اور تذکرہ نگاری کی عمومی روایات کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔ پھر بھی ایک کے بعد دوسرے تذکرے میں کچھ باتیں ایسی مل جاتی ہیں جن سے بدلتے ہوئے تہذیبی وتاریخی حالات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ بعض مرتبین تذکرہ نے ان حالات کی طرف توجہ دی ہے اور اپنے مقدموں میں ان کی طرف اشارے کیے ہیں۔ مثلاً پروفیسر محمود شیرانی نے لکھا ہے:

''تذکرہ کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ اگرچہ مشغلہ شعر کے خلاف تھا اور سیاست کے مطلع پر فتنہ وآشوب کی گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ احمد شاہ ابدالی کی آمد اور بعد کے سیاسی واقعات نے مغلیہ سلطنت کے شیرازہ کو درہم برہم کر دیا ہے۔ دہلی ویران ہو رہی ہے اور اس کے فرزند تلاش معاش میں دربدر اور خاک بسر پریشان حال پھرتے ہیں۔ لیکن راجہ سے پرجا تک جس کو دیکھو شوق شعر میں ڈوبا ہوا ہے۔ ذکور واناث اور عامی وعالم (غرض کوئی بھی) اس چینک سے خالی نہیں۔ مسلمان اور ہندو بلکہ فرنگی زادوں تک میں یہ ذوق سرایت کر گیا ہے[۲۵]''۔

اس سلسلے میں پروفیسر شیرانی نے بعض شعرا کے پیشوں کا بھی ذکر کیا ہے جس سے مختلف طبقات انام میں ادبی وشعری ذوق کی سرایت کا پتہ چلتا ہے۔ ان طبقوں کو سامنے رکھ کر اس دور کے ادبی وشعری میلان کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

کسی عہد کے ادبی مزاج اور تنقیدی معیار کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے تنقید متن میں اس مطالعے کی بنیادی اہمیت ہے اور اس سے صرف نظر ممکن نہیں۔ اس سے متنی حقائق کی تفہیم میں بھی مدد ملتی ہے اور کسی تصنیف کی علمی یا ادبی حیثیت کے تعین میں بھی اس سے روشنی اور رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

اہلِ تذکرہ نے جگہ جگہ اپنے تنقیدی نقطۂ نظر اور صاحب ترجمہ کے بارے میں اپنے ناقدانہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً میر نے میر سجاد کی شعر گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''تہ درائی شعر او نمایاں است ہر کہ واقف موشگافی طبع اوست می داند کہ شعر سوختۂ پیچ دارش بموئے آتش دیدہ می ماند[۲۶]''۔

عارف علی خاں عاجز کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''زبانش بزبان اوباشان است۔ اکثر ریختہ در بحر کبت می گوید[۲۷]''۔

میر خود شاعری کے بارے میں کیا سوچتے ہیں اور اپنے اشعار کو کس رنگ میں پیش کرنا چاہتے ہیں، اس کا اندازہ ''انداز'' سے ہو سکتا ہے جس کی طرف انھوں نے ریختہ کی قسمیں گناتے ہوئے اشارہ کیا ہے:

''ششم انداز است کہ ما اختیار کردہ ایم۔ و آن محیط ہمہ صنعتہا است۔ تجنیس ترصیع تشبیہ، صفای گفتگو، فصاحت، بلاغت، ادابندی، خیال وغیرہ این ہمہ در ضمن ہمین است وفقیر ہم ازین وتیرہ محظوظم[۲۸]''۔

قائم اپنے تذکرے میں جب طبقۂ دوم کے شعرا کے تراجم داخل کرتے ہیں تو تعارفی عبارت میں ایہام گوئی کی مذمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''این ستم کہ بعضی از شعرای ابتدای زمانہ محمد شاہ باعتقاد خود تلاش لفظ تازہ وایہام نمودہ شعر را از مرتبۂ بلاغت انداختہ تا بہ معنی چہ رسد۔ غرض ناگفتہ بہ[۲۹]''۔

پروفیسر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے (دانش کدۂ دہلی کے شائع کردہ) تذکرۂ عمدۂ منتخبہ کے مقدمے میں صاحب تذکرہ کے تنقیدی نقطۂ نظر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''سرور کے مذاق شعر میں ان کے ذاتی رجحانات کے علاوہ اس دور کے اثرات کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے صحت محاورہ پر زور دیا ہے۔ غزلہائے طولانی کی مذمت کی ہے اور لکھا ہے کہ ایہام گوئی کا دور ختم ہو چکا اور شاعروں کی اہمیت کو واضح کیا ہے جہاں نقادانِ فن جمع ہوتے تھے اور شعر کے حسن وقبح پر بحث کرتے تھے[۳۰]''۔

متنی مواقف کے ضمن میں جن امور کی طرف توجہ دلائی گئی ہے وہ کسی ادبی یا علمی متن کے تنقیدی مطالعے میں بطور خاص اہمیت رکھتے ہیں لیکن ضروری نہیں

کہ ہر متن میں یہ تمام باتیں مل جائیں۔تذکروں میں ان مباحث کو آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔شعری متون اور خطوط کے مجموعوں میں بھی ان کی تلاش ممکن ہے۔بعض تصانیف کے دیباچوں میں بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر یہ امور روشنی میں آتے ہیں۔مثلاً ''دیوان زادہ'' کے دیباچے میں حاتم نے اپنے زمانے کے مذاق شعری پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''سرخی غزلیات مہ سنہ بہ سہ قسم بقید آورد: یکی طرحی، دوم فرمایشی، سوم جوابی تا تفریق آن معلوم کردد[۳۱]''۔

اسی کے ساتھ انھوں نے غزل کے شروع میں اس کی بحور و اوزان کو بھی درج کر دیا ہے جس سے اس زمانے کے ادبی مذاق اور شعری مزاج پر روشنی پڑتی ہے۔حاتم نے یہ بھی لکھا ہے:

''در شعر فارسی پیرو مرزا صائب است و در ریختہ ولی را استادی داند۔اول کسی کہ درین فن دیوان ترتیب نمود او بود[۳۲]''۔

اس سے قدیم اُردو شاعری پر (جہاں تک اس کا تعلق دہلی سے ہے) ولی کے شعری و ادبی اثرات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ متن کے اپنے مسائل اور جزئیات کا احاطہ محض چند عنوانات کے تحت نہیں کیا جا سکتا۔اس کا تعلق بہت کچھ مرتب متن کی صوابدید پر ہے اسی کے ساتھ مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اس کے اپنے کون سے مسائل اہم ہیں، کن امور پر تفصیلی یا قدرے تفصیل کے ساتھ گفتگو ضروری ہے اور کن پہلوؤں کی جانب محض اشارہ کر دینا کافی ہے۔

معارف متن:

دراصل تنقید کا تحقیقی نقطۂ نظر سے سب سے اہم پہلو یہی ہے۔اس کے ذیل میں متنی شواہد، متنی مآخذ یا مصادر اور تقابلی مطالعہ جیسے امور آتے ہیں۔

متنی شواہد سے مراد وہ شہادتیں ہیں جو کسی متن کے بارے میں کسی دوسرے متن یا مآخذ میں ملتی ہیں۔اس سے متن کے حدود، اس کے زمانۂ تالیف یا اس کے نسخ مختلفہ کے بارے میں ہمیں بنیادی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

تذکروں میں متنی شواہد کی بہت سی مثالیں مل جاتی ہیں، تذکروں کے علاوہ دیگر تصانیف، خطوط اور دواوین۔نیز سوانح عمریوں میں بھی اس طرح کے شواہد کی جستجو ممکن ہے۔اپنے سے متعلق متنی شواہد کو صاحبانِ تالیف اپنے ترجمے کے ضمن میں پیش کر جاتے ہیں۔کہیں دیباچے میں ان کا ذکر آ جاتا ہے، کہیں کسی شعری تخلیق میں ان کا حوالہ موجود ہوتا ہے۔میر حسن نے اپنے تذکرے میں جہاں خود اپنا ترجمہ قلم بند کیا ہے وہاں اپنی تصانیف کے سلسلے میں بھی کچھ ضروری معلومات فراہم کی ہیں۔

''فقیر در این مدت ہفت ہشت ہزار بیت گفتہ باشد و یک ترکیب بند و یک رموز العارفین گفتہ است کہ مقبول دلہا گردیدہ[۳۳]''۔

مصحفی کا بیان ہے:

''و آنچہ درین مدت تصنیف و تالیف کردہ این است: دو دیوان فارسی، یکی در جواب مولانا نظیری نیشاپوری و یکی بطور خود و سہ دیوان ہندی و دو تذکرۂ فارسی و ہندی و یک دو جزو شاہنامہ تا نسب نامہ حضرت شاہ عالم بہادر و یک دیوان ہندی کہ در شاہجہاں آباد گفتہ مع مسودۂ دیوان فارسی اول کہ زبان آن بطور جلال و اسیر و ناصر علی بود بدزدی رفتہ[۳۴]''۔

اس طرح کی معلومات اہلِ تذکرہ نے اپنے احباب، اپنے اعزہ اور دیگر معاصرین سے متعلق بھی بہم پہنچائی ہیں۔میر نے محمد حسین کلیم کے ترجمے میں لکھا ہے:

''صاحب دیوان قصائد و مخمس و رباعی[۳۵]''۔

جعفر علی خاں زکی کے بارے میں لکھا ہے:

''بادشاہ محمد شاہ برا و فرمائشی مثنوی حقہ کردہ بود۔دو سہ شعر موزوں کرد، دیگر انجام از و نیافت۔اکنون شیخ محمد حاتم

کہ نوشتہ آمد، باتمام رسانید[۳۶]"۔

میر حسن میر ندکور یعنی محمد حسین المتخلص بہ کلیم کے ترجمے میں لکھا ہے:

"رسالہ در عروض و قافیۂ ہندی تصنیف نمودہ و فصوص را کہ کتاب عربی است بہ زبان ریختہ ترجمہ کردہ۔ کتابی در نثر ہندی نیز ایجاد نمودہ[۳۷]"۔

صاحب مخزن نکات نے یکرنگ کے بارے میں لکھا ہے:

"ابیات دیوانش ہمگی و تمامی قریب پانصد شعر خواہد بود[۳۸]"۔

حاتم نے اپنے دیوان اور اس کے انتخاب کے متعلق اپنے دیباچہ دیوان زادہ میں وضاحتیں کی ہیں:

"فقیر دیوان قدیم از بست و پنج سال در بلاد ہند مشہور دارد...... ہر رطب و یابس کہ از زبان آمدہ بود داخل دیوان قدیم نمودہ و کلیات مرتب ساختہ...... یاران نازک طبعان از فکر قدیم و جدید کہ از مذاق ماضی و حال از دخبری دہداز ہر ردیف دوسہ غزلی و ہر غزلی دوسہ بیتی ورای مناقب و مرثیہ و مخمس و مثنوی وغیرہ موقوف داشتہ...... بطریق اختصار سواد بیاض نمودہ بہ دیوان زادہ مخاطب ساختہ[۳۹]"۔

حاتم کے اس دیوان سے متعلق لچھمی نرائن شفیق کے تذکرے میں یہ ذکر موجود ہے:

"بوقت تحریر این چند ابیات دیوانی ضخیم از دبدست آمد[۴۰]"۔

جس کے معنی ہیں کہ شفیق کے پیش نظر دیوان قدیم تھا۔

متنی شواہد دوسری طرح کے متون میں بھی مل جاتے ہیں۔

متنی معارف کا دوسرا اہم حصہ متنی مآخذ ہیں۔ تنقید متن کے ضمن میں جس پر گفتگو ضروری ہے۔ کبھی متن مآخذ کی نشاندہی واضح طور پر کتاب کے دیباچے یا سبب تالیف کے ضمن میں ہو جاتی ہے۔ کبھی متن میں اس کے شواہد موجود ہوتے ہیں اور کبھی اس کی طرف ذہن کی رہنمائی تقابلی مطالعے کے ذریعے ہوتی ہے جو تحقیق متن کا حصہ ہے۔

پہلی صورت کی ایک مثال لچھمی نرائن شفیق کے ہاں موجود ہے جس نے اپنے تذکرے کی بنیاد میر اور گردیزی کے تذکروں کو بنایا ہے اور اس سلسلے میں لکھا ہے:

"درین اثنا نکات الشعرا من تصنیف میر تقی میر و تذکرہ فتح علی خاں تازہ از ہندوستان وارد نمودہ شوری در عالم انداخت[۴۱]"۔

اگرچہ اس موقع پر شفیق نے انھی دو تذکروں کا ذکر کیا ہے لیکن تذکرے کے متن کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ حاکم لاہوری کا تذکرہ مردم دیدہ بھی اس کے مطالعے میں رہا ہے اور بعض دوسرے مصادر سے بھی اس نے استفادہ کیا ہے۔ تذکرۂ مردم دیدہ کا حوالہ میاں نور العین واقف کے ترجمے میں اس طور پر آیا ہے:

"با راقم سطور اخلاص دلی دارد چنانچہ تذکرۂ مردم دیدۂ شاہ عبدالحکیم حاکم کہ سہ ہزار بیت کسری زیادا ست از دستخط خود رقم نمودہ براقم سطور عنایت فرمود[۴۲]"۔

میر نے اپنے تذکرے کے سلسلے میں اس کا بالکل اقرار نہیں کیا کہ ان کی رہنمائی کسی دوسرے وسیلے سے ہوئی ہے، لیکن دکنی شعرا کے تراجم انھوں نے عبدالولی عزلت کی بیاض کے مطالعے اور ان سے زبانی استفادے کے ساتھ لکھے ہیں۔ اس کا اندازہ خود ان کے تراجم سے ہو جاتا ہے۔ حبیب تخلص کے ترجمے میں انھوں نے لکھا ہے:

"از بیاض سید صاحب مذکور نوشتہ شدہ[۴۳]"۔

مرزا داؤد کے ترجمے میں ان کی زبانی جو کچھ تحقیق ہوا اس کا اظہار کیا ہے:

"این قدر ہم از زبانی سید صاحب بہ تحقیق رسیدہ[۴۴]"۔

عمدۂ منتخبہ کے مآخذ کے سلسلے میں اس کے فاضل مقدمہ نگار پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے لکھا ہے:

''سرور نے میر، میر حسن، مصحفی، لطف اور ذکاء کے تذکروں کا ذکر کیا ہے اور اس کا قرینہ غالب ہے کہ ان سے فائدہ اٹھایا ہو[۴۵]''۔

لیکن جب کسی متن میں اس کے مآخذ کے سلسلے میں ایسے ضمنی حوالے بھی موجود نہ ہوں ان کی طرف اشارہ نہ کیا جائے تو مآخذ کا پتہ چلانے کے لیے تحقیقی اور تقابلی مطالعے سے کام لینا ہوتا ہے اور بات تنقید متن کے دائرے سے نکل کر تحقیق متن کے دائرے میں آ جاتی ہے جس پر گفتگو کی نوعیت دوسری ہوتی ہے، خطوط اور دواوین جیسے ادبی متون میں مآخذ کی بات اس طور پر نہیں کی جا سکتی۔ وہاں ان کے تخلیقی سرچشموں کی کھوج کی جا سکتی ہے جو دراصل نفسیاتی مطالعے کا موضوع ہے۔ لیکن بہت سے دواوین میں تراجم، تلخیص یا تضمین وغیرہ ایسی صورتیں موجود ہوتی ہیں جو قدرے مختلف نوعیت کے ساتھ متنی مآخذ کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔

متنی محاسن تنقیدی متن کی تیسری شق ہے۔ اس میں سب سے پہلی بات متن کا ادبی اسلوب ہے جس کا ذکر تنقید متن میں آ سکتا ہے۔ ایسے مواقع پر متنی تنقید کی نوعیت حقائق متن کی جانب واضح اشاروں سے زیادہ نہیں ہوتی اور متنی نقاد اس کے حسن و قبح پر کوئی رائے نہیں دیتا۔ بحیثیت متن اس کے لیے سادہ و پیچیدہ عبارت کی اہمیت یکساں ہے، بشرطیکہ اس کی قرأت ممکن ہو اور کہیں سے متن ضائع نہ ہو گیا ہو۔ مثلاً میر کے تذکرے کی زبان پر گفتگو اس انداز میں ممکن ہے۔ اس تذکرے کی زبان سادہ و سلیس ہے اور بیشتر مقامات پر عبارت ہر طرح کے جھول جھال اور پیچ و خم سے آزاد ہے۔ لیکن کہیں کہیں میر نے بھی قدیم انداز عبارت آرائی سے کام لیا ہے جس کا ایک نمونہ ہم ذیل کی عبارت کو قرار دے سکتے ہیں (یہ خواجہ میر درد کے ترجمے سے لی گئی ہے):

''جوش بہار گلستان سخن، عندلیب خوش خوان چمن این فن، زبان گفتگویش گرہ کشامی زلف شام مدعا، مصرعۂ نوشتہ اش برصفحۂ کاغذ از کاکل صبح خوش نما طبع سخن پرداز او سرد مائل چمنستان انداز است[۴۶]''۔

بعض مؤلفین اپنے انداز نگارش یا اسلوب گفتار کے متعلق خود بھی کبھی ادعا، کبھی اظہار عجز اور کبھی حقیقت حال کی جانب اشارے کے طور پر کچھ نہ کچھ لکھ جاتے ہیں۔ مثلاً فضلی نے کربل کتھا کے سبب تالیف کے ضمن میں لکھا ہے:

''بندۂ حقیر، پرتقصیر حسب الارشاد اوس قبلہ گاہ کے خاص روضۃ الشہدا کا...... سوناتا تھا لیکن معانی اوس کے نساء وعورات کی سمجھ میں نہ آتے تھے اور فقرات پرسوز و گداز اوس کتاب مذکورہ کے بسبب لغات فارسی اون کوں نہ رولاتے تھے۔ اکثر اوقات بعد کتاب خوانی کے سبب بہ مذکور کرتے کہ صد حیف وصد ہزار افسوس جو ہم کم نصیب عبارت فارسی نہیں سمجھتے اور رونے کے ثواب سے بے نصیب رہتے۔ ایسا کوئی صاحب شعور ہووے کہ کسی طرح من وعن ہمیں سمجھاوے اور ہم بے سمجھوں کو سمجھا کر رولاوے۔ مجھ احقر کی خاطر میں گزرا کہ اگر ترجمہ اس کتاب کا برنگینی عبارت وحسن استعارات ہندی قریب الفہم عامۂ مومنین و مومنات کیجیے......[۴۷]''۔

اس سے ظاہر ہے کہ بہ تقاضۂ ضرورت مترجم بات کو من وعن سمجھاتا اور ایسی عبارت لکھنی چاہتا تھا جو قریب الفہم عامۂ مومنین و مومنات ہو لیکن رنگینیٔ عبارت اور حسن استعارات کے ساتھ۔

غرض تنقید متن کے ضمن میں ایک مرتب متن کے لیے اس پر اظہار خیال مناسب حدود کے ساتھ ضروری ہوتا ہے کہ متن میں کس طرح یا کس کس کا انداز نگارش ملتا ہے۔ غالب نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے:

''مرزا صاحب، میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے[۴۸]''۔

لیکن مرزا غالب کے تمام خطوط میں یہ انداز نگارش موجود نہیں۔ کہیں کہیں تو القاب و آداب میں بھی وہ تمام تکلفات برتے گئے ہیں جن سے ابا کا دعویٰ خود ان کے یہاں اور ان سے زیادہ ان کے بعض نقادوں کے یہاں نظر آتا ہے۔

قدیم تحریروں میں تنقید متن کا سب سے اہم پہلو یا دوسرے الفاظ میں متنی محاسن پر گفتگو کا اساسی مسئلہ لسانی مطالعہ ہے۔ لسانیاتی مطالعے کے اپنے کچھ اصول و ضوابط ہیں لیکن قدیم زبان کو جاننا اس کی بنیادی شرط ہے۔ لسانیاتی مطالعے میں املائی خصوصیات کو بھی داخل سمجھنا چاہیے۔ اس لیے کہ املا زبان کے چلن، تلفظ اور صوتیاتی حقائق کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ہماری زبان میں جو دوررس اور تیز رفتار تبدیلیاں زمانہ بہ زمانہ ہوتی رہی ہیں قدیم متون سے ان کی نشاندہی ہوتی ہے اور اس عہد کی زبان کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ علاوہ بریں لسانیات کے وسیلے سے ادب کے رشتے سماجیات اور تاریخ سے استوار ہوتے ہیں۔ اس لیے اس مطالعے کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے۔ خود کسی تصنیف کے اپنے زمانے کے تعین میں لسانی مطالعے سے بڑی مدد ملتی ہے۔ بالعموم اہل تصنیف نے اپنی یا اپنے زمانے کی لسانی خصوصیات پر کوئی روشنی نہیں ڈالی لیکن اردو شاعری کی تاریخ میں ایک ایسی مثال موجود ہے جہاں خود مصنف نے لسانی اعتبار سے اپنی زبان کے بعض پہلوؤں پر گفتگو کی ہے۔ یہ مثال شاہ حاتم کے (دیوان زادہ) میں سامنے آئی ہے جس کے مختصر دیباچے میں مصنف نے اس کا اظہار کیا ہے۔

''......ولفظ (در) و (بر) و (از) و (او) کہ فعل وحرف باشد...... بندہ در دیوان قدیم خود تعقید دارد و دراین ولا از دہ دوازدہ سال[1] اکثر الفاظ را از نظر انداختہ لسان عربی و زبان فارسی کی قریب الفہم وکثیر الاستعمال باشد و روزمرہ دہلی کہ میرزایان ہند وفصیحان زند در مہاورہ[2] (؟) دارند منظور داشتہ[3] زبان ہر دیار تا بہ ہندوی کہ آن را بھاکھا گویند موقوف کردہ[4]۔ محض[5] روزمرۂ کہ عام فہم وخاص پسند بود اختیار نمود[6]۔ شمۂ از آن الفاظ کہ تقید دلد بہ بیان می آرد۔ چنانچہ عربی وفارسی مثلاً تسبیح را تسبی وصحیح را صحی وبیگانہ را بگانہ و دیوانہ را دوانہ و مانند آن بطور عامہ، یا متحرک را ساکن وساکن را متحرک، چنانچہ مرض را مرض وغرض را غرض و مانند آن؛ یا الفاظ ہندی[7] کہ نین وجگ ونت[8] وغیرہ آنچہ باشد[9]؛ یا لفظ (مار) و (موا) وازین قبیل کہ برخود قباحتی[10] لازم آید، یا بجای سے سی، یا اُدھر را اودھر وکدھر[11] را کیدھر کہ در آن زیادتی حرف باشد؛ یا بجای پر بہ[12،13،14] یا یہاں رایاں ووہاں راواں[15] کہ در مخرج تنگ بود؛ یا کسر وفتح وضم در قافیہ، یا قافیہ رائے فارسی بارائے ہندی چنانچہ گھوڑا و بوراودھڑ[16] وسرو مانند آن، و ہای ہوز[17] را بدل کردن بہ الف کہ از عام تا خاص در مہاورہ[18] (؟) دارند۔ بندہ درین امر بمتابعت جمہور مجبور است چنانچہ (بندہ) را (بندا) و (پردہ)[19] را (پردا) وآنچہ ازین قبیل باشد، واین قاعدہ را تا کجا شرح دہد[49]''۔

اگرچہ ان حقائق کی طرف حاتم نے اپنے زمانے کے ادبی معیاروں کے پیش نظر اشارے کیے ہیں لیکن دیکھا جائے تو یہ لسانی مسائل ہیں۔

میر نے اپنے زمانے کے ادبی وشعری معیار کے سلسلے میں ریختے کی جو قسمیں گنائی ہیں اس سے بھی بعض لسانی حقائق کی جانب ذہن کی رہنمائی ہوتی ہے:

''......اول آنکہ یک مصرعش فارسی ویک ہندی......، دوم اینکہ نصف مصرعش ہندی ونصف فارسی؛ سوم آنکہ حرف وفعل فارسی بکاری برند واین قبیح است؛ چہارم آنکہ ترکیب فارسی می آرند......وترکیبی کہ نامانوس ریختہ باشد آن معیوب است[50]''۔

شعرا کے دواوین میں بھی بعض لسانی حقائق کی طرف اشارے مل جاتے ہیں ان کو سامنے رکھ کر ان پر گفتگو کی جا سکتی ہے۔ خود لسانی مطالعے کی حدیں کافی وسیع ہیں۔ اس کے دائرے میں اسم۔ فعل، حروف ضمائر، تذکیر وتانیث، جمع بنانے کے طریقے غرض کہ زبان کے بنیادی ڈھانچے کو سمجھنے سے متعلق تمام ضروری امور آ جاتے ہیں جن کا اس متن کی اپنی نوعیت اور ادبی، لسانی اور لغوی ضروریات کے پیش نظر مناسب حدود کے ساتھ مطالعہ ضروری ہے۔

❖❖❖❖

نوٹ: جناب خلیق انجم اور جناب ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اپنے مقالات میں شاہ حاتم کے (دیوان زادہ) کے دیباچے سے اقتباسات درج کیے ہیں۔ تاہم ان دونوں اقتباسات کی عبارت میں نمایاں فرق ہے۔ غالباً دونوں حضرات کے ذرائع معلومات مختلف ہیں اور انھوں نے دو الگ الگ مخطوطات سے استفادہ کیا ہے۔ محولہ بالا اقتباس اور جناب خلیق انجم کے مقالے میں مندرجہ اقتباس میں جو لفظی اختلافات پائے جاتے ہیں وہ قوسین میں درج کر دیے گئے ہیں۔

۱۔ (سوائے آں) ۲۔ (محاورہ) ۳۔ (سوائے آں) ۴۔ نمودہ ۵۔ محض کی بجائے فقط ۶۔ اختیار نمود کی جگہ اختیار کردہ۔ ۷۔ ہندی کی بجائے ہندوی ۸۔ نت کے بعد بر کا اضافہ۔ ۹۔ باشد کی بجائے باشند۔ ۱۰۔ قباحتی کی جگہ قباحت۔ ۱۱۔ کدھر کی بجائے کہ بر۔ ۱۲۔ عبارت کا اضافہ (وتیری راتجہ)۔ ۱۳۔ (حاشیہ پر: ولفظ تجہ بعضے جا مناسب وبعضے جا غیر مناسب۔ چنانچہ تجھے وتجھ کو بہتر است وتجہ نگاہ نے محاورہ نیست۔ بجائے ایں تیری چشم وتیری نگاہ نے می تواں گفت)۔ ۱۴۔ کہ بااختصار آید (کا اضافہ)۔ ۱۵۔ (حاشیہ پر وہر ایک راہر یک) ۱۶۔ دھڑ وسر کی بجائے سرو دھڑ ۱۷۔ دہائی ہوز کی جگہ مگر ہا ہوز۔ ۱۸۔ (محاورہ) ۱۹۔ (پردہ را پردا کی بجائے شرمندہ را شرمندا) لکھا گیا ہے)۔

حواشی

(ا) اصول تحقیق وترتیب متن، دہلی، ۱۹۷۷ء۔

(۱) تذکرۂ شعرائے اُردو، مقدمہ، ص۹۔

(۲) کلیاتِ میر کا ایک نادر نسخہ، دہلی کالج اردو میگزین، میر نمبر، ۱۹۶۲ء، ص ۶۸ تا ۳۶۷۔

(۳) مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو کلیاتِ ذوق مرتبہ راقم الحروف مطبوعہ مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۷ء۔

(۴) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو گلِ رعنا مرتبہ مالک رام، مقدمہ، ص۱۵ تا ۱۸۔

(۵) گل رعنا، مقدمہ، ص۱۹ تا ۲۲۔

(۶) نکات الشعرا، ص۲۹۔

(۷) مخزن نکات ص۲۹۔

(۸) مخزن نکات، ص۲۔

(۹) تذکرہ شعرائے اُردو، ص۵۴۔

(۱۰) نکات الشعراء، ص۶۳۔

(۱۱) نکات الشعرا، ص۷۵۔

(۱۲) مخزن نکات، ص۲۲۔

(۱۳) نکات الشعراء، ص ۹۰ (۱۴) تذکرۂ شعرائے اُردو، ص۱۱۸ (۱۵) تذکرہ شعرائے اُردو، ص۳۵۔ (۱۶) نکات الشعرا، ص ۹۲ (۱۷) نکات الشعراء، ص۱۰۳۔

(۱۸) نکات الشعرا، ص۱۱۳۔

(۱۹) نکات الشعرا، ص۱۴۷۔

(۲۰) نکات الشعرا، ص۱۳۵۔

(۲۱) اردوئے معلیٰ، ص۴۰۔

(۲۲) نکات الشعرا، ص۱۳۲۔

(۲۳) نکات الشعرا، ص۴۷۔

(۲۴) تذکرہ میر حسن، ص۱۴۔

(۲۵) مجموعہ نغز، دیباچہ، ص۷۔

(۲۶) نکات الشعرا، ص۶۱۔

(۲۷) نکات الشعرا، ص۸۔

(۲۸) نکات الشعرا، ص۱۰۸۔

(۲۹) مخزن نکات، ص۳۲۔

(۳۰) عمدۂ منتخبہ، ص۲۰۔

(۳۱) دیباچہ دیوان زادۂ خاتم (مخزونہ رضا لائبریری رام پور)۔

(۳۲) ایضاً۔

(۳۳) تذکرہ شعرائے اُردو، ص ۵۲۔

(۳۴) تذکرہ ہندی، ص ۲۴۸۔

(۳۵) نکات الشعرا، ص ۴۲۔

(۳۶) نکات الشعرا، ص ۱۳۶۔

(۳۷) تذکرۂ شعرائے اُردو، ص ۱۲۸۔

(۳۸) مخزن نکات، ص ۴۲۔

(۳۹) دیباچہ دیوان زادہ حاتم (مخزونہ رضا لائبریری، رامپور)۔

(۴۰) چمنستان شعرا، ص ۱۳۴۔

(۴۱) چمنستان شعرا، ص ۳۔

(۴۲) چمنستان شعرا، ص ۱۱۴۔

(۴۳) نکات الشعرا، ۱۰۳۔

(۴۴) نکات الشعرا، ص ۱۰۵۔

(۴۵) عمدۂ منتخبہ، ص ۲۱۔

(۴۶) نکات الشعرا، ص ۴۹۔

(۴۷) کربل کتھا، مرتبہ مالک رام ومختار الدین احمد، دیباچہ، ص ۳۷ و ۳۸۔

(۴۸) اُردوئے معلیٰ، ص ۳۴۔

(۴۹) دیباچۂ دیوان زادۂ حاتم (مخزونہ رضا لائبریری، رام پور)۔

(۵۰) نکات الشعرا، خاتمہ، ص ۱۷۹۔

❖❖❖❖

متن کے سنہ تصنیف کا تعین[1]

ڈاکٹر خلیق انجم

اس کا امکان ہے کہ متنی نقاد جس متن کو مرتب کر رہا ہے، اس پر سنہ تصنیف نہیں دیا گیا ہو اور اس سلسلے میں کسی اور بیرونی ذریعہ سے بھی متنی نقاد کی راہ نمائی نہ ہوئی ہو۔ ایسی حالت میں ''متن کی آزمائش'' کے تحت جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ اس مقصد کے لیے بھی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ بہت کم متن ایسے ہوتے ہیں جن میں اس عہد کے اہم تاریخی اور ادبی واقعات کا ضمناً ذکر نہ آ جائے۔ اگر نقاد ان تاریخی اور ادبی واقعات کے سنین معلوم کرلے تو زمانہ تصنیف کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اکثر کتابوں کے آخر میں قطعہ تاریخ دیا جاتا ہے جس سے سنہ تصنیف نکلتا ہے۔ لیکن عام طور پر یہ اس تصنیف کا سنہ اختتام ہوتا ہے، ان تاریخی اور ادبی واقعات کے ذریعہ تصنیف کے سنہ کا آغاز کا بھی علم ہو جاتا ہے۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے دستور الفصاحت میں کئی تذکروں کے زمانہ تصنیف کا تعین کیا ہے۔ میر تقی میر کے نکات الشعرا کا سنہ تصنیف ۱۱۶۵ھ بتایا جاتا ہے۔ عرشی صاحب اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''کتاب کے مطالعے سے اس کے آغاز و انجام پر حسب ذیل روشنی پڑتی ہے۔

۱۔ جعفر علی خاں زکی کے ذکر میں میر نے لکھا ہے:

بادشاہ محمد شاہ، براو فرمائش مثنوی حقہ کردہ بود۔ دو سہ شعر موزوں کرد۔ دیگر سرانجام از و نیافت۔ اکنوں شیخ محمد حاتم، کہ نوشتہ آمد، باتمام رسانیدو آں مثنوی خالی از مزہ نیست''۔

حاتم نے دیوانِ زادہ حاتم میں اس مثنوی کے عنوان پر لکھا ہے کہ:

حسب الحکم محمد شاہ بادشاہ، معرفت جعفر علی خان صادق'' یہ مثنوی نظم کی گئی ہے...... اگر لفظ ''اکنوں'' خود میر صاحب ہی کا لکھا ہوا ہے اور کاتبوں نے اپنی طرف سے اس کا اضافہ یا کسی دوسرے لفظ کی جگہ اس کی نشست کا ارتکاب نہیں کیا ہے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ نکات الشعرا کی یہ عبارت محمد شاہ متوفی ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) کی زندگی میں یا اس کے انتقال سے کچھ بعد لکھی گئی تھی۔ چونکہ حاتم کے منتخب کلام میں میر صاحب نے صرف ایک شعر اس غزل کا چنا ہے جو ۱۱۶۱ھ کے کسی مشاعرے کی طرح میں لکھی گئی تھی۔ اس بنا پر قرینِ قیاس یہ ہے کہ زکی اور حاتم کا حال اسی سنہ میں تحریر کیا ہے۔ اگر میر صاحب نے حاتم کا حال زیادہ بعید زمانے میں لکھا ہوتا تو ان کی بعد کی کہی ہوئی غزلوں کے شعر بھی چنتے۔ جو دلی کے مشاعروں میں برابر پڑھی جاتی رہی تھیں۔

۲۔ دلاور خان بیرنگ کو میر صاحب نے زندہ بتایا ہے...... گردیزی لکھتا ہے کہ ''سالے چند ازیں پیش' مراحل راہ مرگ پیمود''۔ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ گردیزی نے بیرنگ کا حال آخر ۱۱۶۵ھ میں لکھا ہے اور ''چند'' سے صرف ۳ سال مراد ہیں تو اس کا انتقال ۱۱۶۲ھ قرار پائے گا اور اس صورت میں میر صاحب نے اُس کا حال ۱۱۶۲ھ سے قبل یا اسی سال انتقال سے پہلے لکھا ہوگا۔

تین مقامات پر میر صاحب نے خان آرزو کے تذکرے کا حوالہ دیا ہے۔ آرزو کا یہ تذکرہ ۶۴۔۱۱۵۷ھ...... میں تمام ہوا تھا۔ اسی طرح دکنی شاعروں کے حال میں سید عبدالولی عزلت سورتی کے حوالے نظر آتے ہیں۔ خود ان کے ذکر میں میر صاحب نے لکھا ہے کہ یہ تازہ وارد ہندوستان ہیں۔ آزاد بلگرامی نے سرو آزاد...... میں اور عاشقی نے نشتر عشق...... میں تحریر کیا ہے کہ ان کا دہلی میں ورود ۲۰ رجمادی الاول سنہ ۱۱۶۴ھ (۱۷ اپریل ۱۷۵۱ء) کو ہوا تھا۔ ان دونوں باتوں کو پیش نظر رکھ کر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ میر صاحب نے اس سنہ و ماہ کے بعد تذکرہ مکمل کیا[2]''۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ نکات الشعرا کا سنہ تصنیف ۱۱۶۵ھ بتایا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ ۱۱۶۱ھ میں شروع ہوا۔ کیوں کہ اس میں ۱۱۶۱ھ، ۱۱۶۲ھ اور ۱۱۶۴ھ کے واقعات ''اکنوں'' اور ''حالا'' جیسے الفاظ کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں عرشی صاحب نے جعفر علی خان زکی، محمد شاہ بادشاہ، دلاور خاں بیرنگ کی وفات کے سنین اور دیوان زادۂ حاتم، تذکرۂ خان آرزو، سرو آزاد، نشترِ عشق جیسی ادبی کتابوں اور سید عبدالولی عزلت کے دہلی میں ورود سے فائدہ اٹھایا ہے۔ متن کے سنہ کتابت کا تعین قدرے مشکل کام ہے کیونکہ ضروری نہیں کہ جو نسخہ ہمیں ملا ہے وہ مصنف کے عہد کا ہو۔ اس کے لیے:

۱۔ متنی نقاد کو اُردو رسم الخط سے واقفیت حاصل کرنی چاہیے۔ خاص طور سے اسے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ط، ڈ، اور ڑ کی مختلف عہد کے اُردو رسم خط میں کیا کیا شکلیں رہی ہیں۔

۲۔ متن کے کاغذ کا کیمیائی تجزیہ بھی اس کی عمر ثابت کرنے میں ہماری مدد کر سکتا ہے۔

۳۔ اس طرح متن میں استعمال کی گئی سیاہی کا بھی کیمیائی تجزیہ کرایا جا سکتا ہے۔

مآخذ:

اگر مصنف نے کچھ کتابوں سے استفادہ کیا ہے تو متنی نقاد کو اُن کی نشاندہی کرنی چاہیے۔ یہ استفادہ کئی طرح کا ہوتا ہے۔

۱۔ ممکن ہے جو متن ہم مرتب کر رہے ہیں وہ کسی دوسری زبان سے ترجمہ ہو۔ ایسی صورت میں متنی نقاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اصل کتاب سے متن کا مقابلہ کرے۔ اگر ہمارے مصنف نے ترجمے میں کچھ عبارت بڑھا دی ہو یا کم کر دی ہو، کچھ غلطیاں کی ہوں، تو ان پر حاشیے لکھنے چاہییں بعض اوقات متن میں کچھ الفاظ نہیں پڑھے جاتے یا ایسے متروک الفاظ استعمال ہوتے ہیں جو عام طور سے لغتوں میں بھی نہیں ملتے۔ تو ایسے موقعوں پر اصل کتاب ہماری مدد کرتی ہے۔

مثلاً فضل علی فضلی کی کربل کتھا کے متنی نقاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اصل کتاب یعنی ملا حسین واعظ کاشفی کی روضۃ الشہداء کو پیش نظر رکھے۔

۲۔ بعض اوقات مصنف خود بتاتا ہے کہ اس نے اپنی تصنیف میں کس کس کتاب سے استفادہ کیا ہے۔ مثلاً لچھمی نرائن شفیق نے چمنستان شعرا میں نکات الشعرا اور تذکرہ ریختہ گویان کا ذکر کیا ہے۔

قیام الدین حیرت نے اپنے تذکرے ''مقامات الشعرا'' کے دیباچے میں لکھا ہے کہ انھوں نے والہ داغستانی کے ریاض الشعرا، خان آرزو کے مجمع النفائس اور رائے رتن سکھ رائے کے سفینہ شوق سے استفادہ کیا ہے۔ متنی نقاد کو چاہیے کہ ان مآخذ کا اچھی طرح مطالعہ کرے۔ کبھی کبھی مصنف جن کتابوں سے استفادہ کرتا ہے، اُن میں بیان کیے بعض واقعات اپنی مرضی کے مطابق توڑ مروڑ کر پیش کرتا ہے۔

مثلاً آب حیات میں محمد حسین آزاد نے مرزا مظہر کے قتل کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ''عجب مشکل ہے۔ حکیم صاحب (حکیم قدرت اللہ قاسم)......خوش اعتقاد سنت جماعت تھے۔ وہ کہتے ہیں، سنی نے مارا، لوگ کہتے ہیں شیعہ نے مارا۔ خیر سنی شیعہ آپس میں سمجھ لیں۔ میرا کام اتنا ہی تھا جو کچھ پایا کاغذ کے حوالے کیا''۔ یہاں دراصل اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے آزاد نے قدرت اللہ قاسم کا سہارا لیا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ قاسم نے ہرگز یہ نہیں کہا۔ انھوں نے البتہ یہ ضرور کہا ہے کہ ''قاتل سمجھا کہ مرزا مظہر حضرت علیؑ کے دشمن ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا''۔ متنی نقاد کو ایسے تمام واقعات پر حاشیے دینے چاہییں۔ اگر مصنف نے کچھ اقتباسات پیش کیے ہیں تو اصل کتاب سے ان کا مقابلہ کر لینا چاہیے۔

۳۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ مصنف جن کتابوں سے استفادہ کرتا ہے، ان کا ذکر نہیں کرتا۔ متنی نقاد کو اُن کتابوں تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے، بقول عرشی صاحب ''شاہ محمد حمزہ مارہروی نے ''قص الکلمات'' میں دو چار جگہ نکات الشعرا سے اور دو چار جگہ اپنی معلومات سے کچھ لکھا ہے بقیہ حالات گردیزی کے تذکرے سے خود اسی کے لفظوں میں نقل کر دیے ہیں''۔

۴۔ بعض کتابیں دوسری کتابوں کے جواب میں لکھی جاتی ہیں۔ مثلاً قطب الدین باطن نے اپنا تذکرہ ''گلستان بے خزاں'' شیفتہ کے تذکرے ''گلشنِ بے خار'' کے جواب میں لکھا تھا۔ تذکرہ باطن مرتب کرتے ہوئے ''گلشنِ بے خار'' کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

مقدمہ:

متن کے تنقیدی ایڈیشن کے تیار ہونے کے بعد اُس کا مقدمہ لکھنا چاہیے۔ جس میں مندرجہ ذیل پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے۔

۱۔ متن کا موضوع، اس موضوع اور اس موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں کا اجمالی جائزہ۔

۲۔ اگر متن سے مصنف یا کسی مشہور شخصیت کے سوانح پر روشنی پڑتی ہے۔ تو اُس کا ذکر۔

۳۔ تنقیدی ایڈیشن تیار کرنے میں جتنے متن استعمال کیے ہیں، اُن کا اجمالی ذکر۔

۴۔ ان متنوں کی املا کی خصوصیات۔

۵۔ اگر ادبی کتاب ہے اور قدیم ہے تو اس کی لسانی خصوصیات۔

متن کی فرہنگ اگرچہ کتاب کے بالکل آخر میں دی جاتی ہے۔ لیکن یہ دراصل مقدمہ ہی کا حصہ ہے۔ اس میں وہ الفاظ دینے چاہییں۔

۱۔ جو متروک ہو گئے ہوں۔ ان کے معنی بھی دینا ضروری ہے۔

۲۔ وہ الفاظ جن کا مفہوم بدل گیا ہو۔

۳۔ جن کا تلفظ بدل گیا ہو۔

۴۔ جن کا املا بدل گیا ہو۔

❖❖❖❖

حواشی

(۱) متنی تنقید، الجمیعۃ پریس، دہلی، مارچ، ۱۹۶۷ء۔

(۲) امتیاز علی خاں عرشی مرتب، دستور الفصاحت، مصنفہ، احد علی خاں یکتا، رام پور، ۱۹۴۳ء، ص ص ۴۳۔۴۵۔

❖❖❖❖

متون کی تصحیح وتنقید میں تخریج وتعلیقات کی اہمیت

ڈاکٹر نذیر احمد

کسی متن کی تحقیق وتصحیح کے سلسلے میں متعدد امور قابلِ توجہ ہوتے ہیں، اور ان امور کا جس حد تک اہتمام کیا جاتا ہے، اسی کے اعتبار سے متن انتقادی قرار پاتا ہے۔ انھی میں تخریج وتعلیق بھی ہیں۔

''تخریج'' کے معنی ''بیرون آوردن، بتفکر بیرون آوردن'' کے ہیں، اور فنِ تحقیق کی اصطلاح میں وہ عمل ہے جس کے ذریعے کسی ادیب یا شاعر کے کلام میں دوسرے، اور کلام کی، نشان دہی کی جاتی ہے۔ اکثر مصنف اپنے بیان کو زیادہ دلچسپ، مستند اور دقیع بنانے کے لیے آیاتِ قرآنی، احادیثِ نبویؐ، اقوالِ معروف، ضرب الامثال، اشعار وغیرہ کا استعمال کرتے ہیں۔ نظم کے مقابلے میں نثری تصانیف میں اس کا عمل زیادہ ہوتا ہے۔ رقعات، ملفوظات، لغات اور کتبِ تاریخ میں، خصوصیت سے، دوسرے کے کلام سے مدد لی جاتی ہے۔ انھی اقوال و اشعار کی نشاندہی اور ان کے منابع کا تعین، تخریج کے حدود میں شامل ہے۔ عربی، فارسی، اُردو، ترکی زبانوں کی کتابوں کی تصحیحِ متن میں یہ امر خصوصی توجہ چاہتا ہے، اور یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ دورِ جدید میں اس امر کی طرف مستشرقین نے توجہ کی۔ چناں چہ یورپ میں ان زبانوں سے متعلق جو متون شائع ہوئے، ان میں اس کا بڑا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ان کے تتبع میں، مشرق میں جو متن شائع ہو رہے ہیں، ان میں بھی اب اس امر کی طرف خصوصیت سے توجہ دی جا رہی ہے۔ اُردو میں ابھی جتنی توجہ ہونی چاہیے، اب تک نہیں ہوسکی ہے، لیکن اب اس ضرورت کا احساس دھیرے دھیرے ہو رہا ہے اور امید کی جاتی ہے کہ جلد، اس لحاظ سے، اُردو کے انتقادی متن؛ فارسی اور عربی متون کے ہم پلہ ہو جائیں گے۔ مولانا آزاد کے خطوط کا مجموعہ ''غبارِ خاطر''، جو مالک رام کے اعتنا سے شائع ہوا ہے؛ اس میں تخریج کا عمل اور تعلیق نویسی، بڑے سلیقے سے انجام پذیر ہوئے ہیں۔

تخریج نہایت مفید عمل ہے۔ اس سے انتقادی متن کی افادیت میں ''کئی اعتبار سے'' اضافہ ہوتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کی وجہ سے متن کی صحت کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ متون کی بنیاد مخطوطات پر ہوتی ہے، اور ایک مخطوطہ، دوسرے مخطوطے سے نقل ہوتا ہے۔ اس نقل میں زیادہ احتیاط اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ کاتب پیشہ ور ہوتا ہے۔ وہ عجلت سے کام کرتا ہے۔ پھر اس کا علم کم ہوتا ہے۔ اس لیے جو چیز اس کی سمجھ میں نہیں آتی، اس کو وہ بدل دیتا ہے۔ پرانی کتاب کے مخطوطے میں کاتب ایسے لفظات وفقرات سے دوچار ہوتا ہے جن کو وہ نہیں سمجھتا۔ وہ ان کو غلط ٹھہرا کر زیادہ رائج الفاظ سے بدل دیتا ہے۔ میرزا محمد قزوینی نے ''دیوان حافظ'' کے مقدمے میں، کاتبوں کے اس عمل کی، بڑے دلچسپ انداز میں صراحت کی ہے۔

ایسے نسخے، جو خود مولف یا شاعر کے معاصر یا قریب العصر ہوتے ہیں؛ چوں کہ قربِ زبان ہونے کی بنا پر مولف یا شاعر کی زبان میں تغیر یا تحویل واقع نہیں ہوتا اور کاتبوں کی زبان بھی وہی ہوتی ہے، لہٰذا قدرتی بات ہے کہ ایسے قدیم العہد نسخے، بے شمار تغیرات سے محفوظ رہتے ہیں، جو بعد کے زمانے میں، متاخر نسخوں میں، کاتبوں کے تصرفات کی وجہ سے، داخل ہو جاتے ہیں۔ ان تغیرات سے مراد وہ اصلاحات وتصحیحات ہیں جو بعد کے کاتبوں اور قاریوں کے واسطے سے قدیم متون میں ہوتی رہتی ہیں۔ کسی قدیم شاعر یا مصنف کے بعض کلمات وتعبیرات، متاخر کاتب کے زمانے میں غیر مستعمل و نامانوس ہونے کی بنا پر نئے الفاظ اور تعبیرات سے بدل دیے جاتے ہیں، جو اس زمانے میں متداول اور اہلِ عصر کے لیے قابلِ فہم ہوتے ہیں۔ کاتبوں کی اصلاح کی یہ مثال تو سب کو معلوم ہے کہ کسی کاتب کو قرآنِ مجید نقل کرنے کا کام سپرد ہوا اور اس کو ہدایت دی گئی کہ خدا کے کلام کو نہایت احتیاط سے نقل کرے اور اپنی طرف سے کسی طرح کا تغیر وتبدل نہ کرے۔ کاتب نے جب نسخہ تیار کرکے پیش کیا تو متعلقہ آدمی کے سوال پر کہ اس میں کسی طرح کی اصلاح تو نہیں ہوئی ہے، جواب دیا کہ صرف ایک جگہ قرآن میں سہو تھا، اس کی اصلاح کر دی ہے۔ اس کے علاوہ کہیں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ دراصل اس میں خرِ موسیٰ تھا، اس کو میں نے خرِ عیسیٰ کر دیا ہے۔ ہندوستان میں بھی یہ قصہ مشہور ہے اور طوسی کے سیاست نامہ کے مقدمے میں سید عبدالرحیم خلخالی نے یہی قصہ لکھا ہے۔

مرزا محمد قزوینی نے متاخر کاتبوں کے اس تغیری عمل کی دیوان حافظ سے چند مثالیں دی ہیں۔ مثلاً قدیم نسخے میں ایک بیت اس طرح ہے:

خوش وقت بوریا و گدائی و خواب امن
کاین عیش نیست در خور اورنگ خسروی

جدید نسخوں میں ''خوش وقت بوریا'' ''خوش فرش بوریا'' میں تبدیل ہو چکا ہے۔ یا مثلاً اس بیت میں:

دانی کہ چنگ و عود چہ تقریر می کنند - پنہاں خورید بادہ کہ تعزیری کنند

کلمہ تعزیر کو تکفیر سے بدل دیا گیا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ کاتبوں کی بے توجہی اور بے علمی سے متن میں جو اغلاط راہ پاتے ہیں، ان کی نشاندہی میں تخریج کا عمل نہایت موثر ثابت ہوتا ہے۔ ثانیاً، بسا اوقات مصنف ثانوی منابع سے دوسرے اقوال نقل کر لیتا ہے، اور اگر محقق متن کی رسائی ان کے اصل منابع تک ہو تو ایک طرف متن زیادہ وقیع قرار پاتا ہے اور دوسری طرف مصنف کے بعض تسامحات کی نشاندہی ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں صرف دو تین مثالوں پر اکتفا کیا جائے گا۔ ان سے اس بات کا اندازہ ہوگا کہ یہ امر کتنی دیدہ ریزی و بصیرت و مطالعے کا متقاضی ہے۔ راقم حروف نے ''فرہنگِ قواس'' کا انتقادی متن، تہران سے ۱۹۷۴ء میں شائع کیا۔ اس فرہنگ کے صرف ایک ناقص الطرفین نسخے کا علم ہے۔ اس کے مقدمے میں ہے:

دوستی بمن روی آورد و گفت

گویای جہاں چرا خموش است برجوش کنون کہ جاے جوش است

یہی مقدمہ دستور الافاضل میں درج ہے۔

(کتاب راقم کے اعتنا سے ۱۳۵۲ شمسی میں تہران سے شائع ہو چکی ہے) جس میں بیتِ مذکور کے مصرعے بالعکس منقول ہیں، یعنی: برجوش کنون کہ جای جوش است گویای جہاں الخ۔

مثنوی کے اس شعر کا تعین نہایت دشوار تھا۔ اس سلسلے میں صرف ایک قرینے کا وزن ہے، لیکن اس وزن میں متعدد مثنویاں پائی جاتی ہیں۔ اس کو محض اتفاق کہیے کہ راقم، نظامی گنجوی کی لیلیٰ مجنوں کا مطالعہ کر رہا تھا کہ اس میں یہ بیت نظر آ گئی۔ اس سے مجھے جو خوشی حاصل ہوئی، اس کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جس کو اس طرح کی چیز سے سابقہ پڑا ہو۔ مثنوی مذکور میں، بیتِ مندرجہ بالا میں، دونوں مصرعے اسی طرح بالعکس ہیں جیسے دستو الافاضل میں۔ فرہنگِ قواس کے مصنف کا دعوا ہے کہ اس نے اصل منابع سے استفادہ کیا ہے، لیکن مجھے اس پر شک ہے، اس لیے کہ بظنِ قوی، یہاں کاتب کی کرشمہ سازی نہیں معلوم ہوتی۔

ثانیاً، اگر متن میں درج دوسرے کے اشعار یا اقوال کا اصل سے مقابلہ کیا جائے تو مصنف کے بیان کی توثیق یا تکذیب اور اس سے متن کی صحت ہو جاتی ہے۔ راقمِ حروف نے ''فرہنگِ قواس'' کی تصحیح میں کم از کم ۳۹ جگہوں پر شعرا کا نام غلط مندرج دیکھا۔ ان کی فہرست مصحح فرہنگِ قواس کے مقدمے، ص ۲۲-۲۳ پر درج کر دی گئی ہے۔ یہ غلطیاں مصنف نے کی ہیں، کاتب کی نہیں ہیں۔

دوسرے، اور منابع کے ذریعے مصنف کے تسامحات بھی دور ہو سکتے ہیں، البتہ اس کے لیے بڑی دیدہ دری درکار ہے۔

رابعاً، بعض اوقات مصنف، دوسرے شاعر یا مصنف، جن سے اس نے اپنے کلام کو مزین کیا ہے، نظر انداز کر دیتا ہے۔ اصل منابع کے مطالعے سے ان کے نام کا تعین ہو جاتا ہے۔ فرہنگِ قواس کی تصحیح کے سلسلے میں راقم متعدد مقام پر اس حالت سے دوچار ہوا ہے اور اکثر شاعروں کے ناموں کے تعین میں کامیاب بھی ہو گیا ہے۔ اس طرح کی چند مثالیں راقم کے مقدمے، ص ۲۴-۲۵ پر مل جائیں گی۔

خامساً، اس طرح کی کاوش میں محقق کی نظر سے سیکڑوں کتابیں گذرتی ہیں۔ وہ کثرتِ مطالعہ کا عادی ہو جاتا ہے اور اس کے علم و نظر میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی ایک فائدہ، تخریج کی اہمیت کے اثبات کے لیے کافی ہے۔

تخریج کے اعتبار سے میرے نزدیک راحۃ الصدور راوندی کا بریل اڈیشن، جس کے مرتب ڈاکٹر اقبال لاہوری ہیں، ایک قابلِ تقلید نمونہ ہے۔ اس اڈیشن میں مرتب نے راحۃ الصدور میں مندرج بیشتر اشعار کی تخریج کر دی ہے، اور اس میں انھوں نے بڑی غیر معمولی لیاقت و ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔ اس میں مختلف مثنویوں کے صدہا اشعار درج ہیں اور یہ بات واضح ہے کہ مثنوی کے اشعار کے ماخذ کا پتا چلانا نہایت دشوار ہے، لیکن ڈاکٹر اقبال، حیرت انگیز طور پر، اس سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ علامہ محمد قزوینی نے بیست مقالہ قزوینی میں اس اڈیشن پر ایک مقالہ شامل کیا ہے اور اس میں مرتب کے کارنامے کو بہت سراہا ہے۔ تخریج کے اعتبار سے یہ کتاب ایک مثالی کتاب ہے۔

آخر میں تخریج کے سلسلے کی ایک عدیم المثال پیش کرتا ہوں۔ ابنِ بطوطہ کے سفرنامے میں ایک واقعہ درج ہے کہ ابنِ بطوطہ اپنے رفقا کے ساتھ امیر قرطاے (چین) کے دربار میں پہنچا۔ شام کو امیر کا بیٹا اس کے ساتھ سمندر کی سیر کو گیا۔ ایک کشتی میں ابنِ بطوطہ اور اس کے ساتھی تھے، دوسری میں امیر کا بیٹا۔ بیٹے نے

کہا کہ مجھے فارسی موسیقی سے دلچسپی ہے اور قوال کو گانے کا اشارہ کیا۔ ان میں سے ایک شعر، جو قوال نے بار بار گایا تھا، ابن بطوطہ کے ذہن میں محفوظ رہ گیا۔ وہ اس طرح پر ہے:

تا دل بہ محنت دادیم در بحر فکر افتادیم
چن در نماز استادیم قوی بمحراب اندری

اس شعر کی تصحیح سفرنامۂ ابنِ بطوطہ کے مرتبین و شارحین کے لیے مدت سے ایک مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ ۱۹۳۰ء میں، شدالازار کی تصحیح میں، محمد قزوینی نے اس بیت کا تعین کر دیا ہے۔ یہ سعدی کی ایک غزل (بدائع) کا شعر ہے جو اس طرح پر ہے:

تا دل بہ محنت دادہ ام، در بحرِ فکر افتادہ ام
چون در نماز استادہ ام، گوئی بمحراب اندری

غزل کا مطلع یہ ہے:

آخر نگاہی باز کن وقتی کہ برما بگذری
یا کبر منعت میکند کز دوستان یاد آوری

(رک: حواشی شدالازار بقلم محمد قزوینی۔ ص ۵۰۵)

....

اُردو متون کی تصحیح میں تخریج کی روش ابھی عام نہیں ہوئی ہے، اور یہ تو معلوم ہے کہ غالب کے کلام میں تخریج و تعلیق کے سلسلے کے اتنے امور ہیں کہ ان کی توضیحات کے لیے کئی جلدیں درکار ہوں گی، اور غالباً اسی امر کے پیشِ نظر عبدالودود صاحب نے جہانِ غالب کے نام سے غالب انسائیکلوپیڈیا کا کام شروع کر دیا تھا[۱]، لیکن بعض وجوہ سے یہ کام زیادہ آگے نہیں بڑھا، ورنہ اس میں شبہ نہیں کہ غالب کے اُردو و فارسی کلام کا ناقدانہ ایڈیشن، اُردو انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب کا پیش خیمہ ثابت ہوتا، لیکن اس کے کلام کی تصحیح و تنقید میں اس امر کی طرف صحیح طور پر توجہ نہیں ہو سکی۔ گو یہ بات ضرور ہے کہ یہ کام کسی ایک محقق کے بس کی بات نہیں۔ مجھے تو ان محققین و ناقدین کے خیال پر تعجب ہوتا ہے جو کہتے ہیں کہ غالب پر اب کام کرنے کی گنجائش بہت کم ہے۔ غالب کا شمار دنیا کے عظیم شاعروں میں ہوتا ہے، لیکن ہمارے نقاد بھول جاتے ہیں کہ دنیا کے بڑے شاعروں پر، جن سے ہر ایک پر پچاسوں کتابیں لکھی گئیں، ان پر اب بھی کام ہو رہا ہے۔ شیکسپیر کو کون نہیں جانتا۔ اس کے تعلق سے تو اتنی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ ان سے ایک کتاب خانہ تیار ہو سکتا ہے، لیکن شیکسپیر پر سیمی نارز کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم صاحب غالب کے خطوط بڑے سلیقے سے مرتب کر رہے ہیں[۲]، لیکن اس قابلِ وصف ایڈیشن میں بھی تخریج کی طرف توجہ نہیں ہوئی ہے۔

غالب کے خطوط میں شامل دیگر شعرا کے اشعار کی تخریج ضروری کام ہے، اس کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔ جب تک یہ کام نہیں ہوتا، غالب کے خطوط کا انتقادی متن اتنا وقیع قرار نہیں پا سکتا۔

....

فرہنگ معین میں تعلیق کے حسبِ ذیل معانی درج ہوئے ہیں:

۱۔ آویختن، آویزان کرد، درآویختن۔

۲۔ یادداشت کردن، نوشتنِ مطالب در ذیلِ رسالہ و کتاب۔

۳۔ یادداشت ضمیمۂ کتاب و رسالہ (تعلیقات جمع)

تحقیق کی اصطلاح میں تعلیقات وہ یادداشت ہیں جو بہ طورِ ضمیمۂ کتاب درج کیے جاتے ہیں اور ان مندرجات کے امور تاریخی، ادبی، لغوی، فرہنگی وغیرہ ہوتے ہیں۔ دراصل متنِ کتاب میں بعض ایسے امور مذکور ہوتے ہیں جن کی توضیحات سے کتاب کی اہمیت و افادیت میں بڑا اضافہ ہوتا ہے۔ بسا اوقات عدم توضیحات کی وجہ سے اصل مفہوم تک رسائی نہیں ہوتی۔ اسی بنا پر جدید تحقیق میں تعلیقات نگاری، تنقیدِ متن کا لازمہ سمجھی جاتی ہے۔ اس سے گوناگوں فوائد حاصل ہوتے ہیں، جن کو بہ طور خلاصہ اس طرح بیان کر سکتے ہیں۔

۱۔ تعلیقات سے متن زیادہ انتقادی اور پُر از معلومات قرار پاتا ہے۔ بعض اوقات کتاب سے اتنا فائدہ نہیں ہوتا جتنا تعلیقات سے۔ فارسی کے محققوں

میں، اِس لحاظ سے، مرزا محمد قزوینی سب سے زیادہ ممتاز ہیں اور اپنے میدان میں منفرد، بلکہ ایران میں تعلیقات نویسی کے موجد بھی یہی ہیں۔ ان کے تعلیقات، جو چہار مقالہ، نظامی عروضی یا لباب الالباب عوفی اور شدالازار جنید شیرازی پر لکھے گئے ہیں، وہ تعلیقات نویسی کے قابلِ تقلید نمونے ہیں۔ ان سے تعلیقات کے اصول مرتب ہوسکتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ علومِ اسلامی، تاریخ، ادب، لغت، دستورِ زبان وغیرہ کے متعلقہ مسائل میں ان کی دقیقہ رسی اور نکتہ سنجی بلا کی تھی۔

۲۔ مطالبِ کتاب کی تفہیم و تنقید میں ان سے بڑی مدد ملتی ہیں اور کتاب کی غرض و کتابت کما حقہ، انھی سے پوری ہوتی ہے۔

۳۔ ان سے کتاب کی تاریخی، ادبی و فرہنگی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ گویا یہ کتابوں کی پرکھ کے ایک پیمانے کے مثل ہے۔

۴۔ ان سے مصنفِ کتاب کے علم و فضل کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

۵۔ کبھی کبھی تعلیقات نگاری، جداگانہ تالیف کے وجود کا موجب ہوتی ہے۔ قدیم زمانے میں ''حاشیہ'' کے نام سے الگ الگ رسالے ملتے ہیں۔ یہی حاشیہ یا اس کی جمع ''حواشی'' تعلیقات کے مترادف کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔

۶۔ تعلیقات نویسی، علوم پر غیر معمولی دسترس کی متقاضی ہے؛ چناں چہ تعلیقات نویسی بذاتِ خود عمیق مطالعے کی دعوت دیتی ہے، تعلیقات نویس ذوالفنون ہوتا ہے۔ اسی بنا پر تعلیق نویسی بڑا مشکل فن تصور ہوتا ہے۔

۷۔ تعلیقات نویسی، مصنف کی کوتاہیوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ اگر یہ نہ لکھے جائیں تو مدتوں، تسامحات کا شمار علم کے درجے میں ہوتا رہے گا؛ گویا تعلیقات؛ علم اور جہل میں حدِ متقاس قائم کرتے ہیں۔

تعلیقات نویسی، مسلسل مطالعے کی متقاضی ہوتی ہے۔ مرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی نے ''چہار مقالے'' پر نہایت عالمانہ تعلیقات لکھے۔ یہ تعلیقات کئی تاریخ کا نچوڑ تھے۔ انؔ کے مطالعے سے ایران کی ثقافتی تاریخ کا ایک واضح نقشہ قائم ہوجاتا ہے۔ مرزا محمد نے بعد میں ان پر مفید اضافے کیے۔ ان کے کئی سال بعد ڈاکٹر محمد معین نے ''چہار مقالے'' کا نیا ایڈیشن نشر کیا، جن پر مرزا محمد کے مطالعات پر سود مند اضافے ملتے ہیں۔ مرزا محمد کا ایک دوسرا تحقیقی کارنامہ لباب الالباب کا انتقادی متن تھا۔

مرزا صاحب نے اس پر نہایت جامع تعلیقات کا اضافہ کیا، جو کئی سال کے مسلسل مطالعے کا نتیجہ تھا۔ اس کے کافی دنوں بعد سعید نفیسی نے ان تعلیقات پر نئے سرے سے روشنی ڈالی۔ راقم جب ۱۹۵۷ء میں علی گڑھ آیا تو نفیسی صاحب بطورِ وزٹنگ پروفیسر، اس یونیورسٹی میں مامور تھے۔ اسی درمیان انھوں نے لباب الالباب کے عنوان سے ایران کے مجلۂ ایران شناسی میں، عرصہ ہوا، ایک مضمون شائع کیا تھا۔ ناشکری ہوگی اگر میں پروفیسر نفیسی کے دو کارناموں کو نظر انداز کردوں جو تعلیقات نویسی کے اعتبار سے بے مثال ہیں۔ ان میں ایک اشعارِ رودکی اور دوسری تاریخِ مسعودی ہے۔ ان کے مطالعے سے محققِ مذکور کی دقتِ نظری اور وسعتِ مطالعہ کا صحیح اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ افسوس کہ اُردو میں اب تک اس معیار کا کام نہیں ہوا ہے، اس لیے محققینِ متن کو میرا مشورہ ہے کہ ان چار پانچ کتابوں پر ایک نظر ڈال لیں۔ ان سے ان کو بصیرت حاصل ہوگی۔

راقم حروف نے مکاتیب سنائی کا متن، مع مفصل تعلیقات کے، ۱۹۶۲ء میں شائع کیا تھا۔ یہ کتاب حکیم سنائی کے ۱۷ خطوط پر مشتمل ہے، جن پر کئی سو صفحے بطورِ تعلیقات اضافہ ہوئے ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ اب تک جاری ہے اور حال ہی میں راقم نے اپنے مطالعات کے نتیجے تعلیقاتِ جدید کے نام سے اشاعت کے لیے بھیجے ہیں۔ ان کی رُو سے کتابِ مذکور میں کافی ردو بدل ہوا۔ بعض امور کی تصحیح ہوئی اور بعض امور، جو واضح نہیں ہوئے، وہ واضح ہوئے۔ یہی حال میری ایک اور کتب دیوانِ سراجی خراسانی کا ہے۔ سراجی، مملوک خاندان کا سب سے پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہے۔ اس کے دو نسخے راقم نے حاصل کیے اور ان کی مدد سے اس کا ایک انتقادی متن ۱۹۷۲ء میں علی گڑھ سے شائع کیا۔ اس میں بھی دو سو سے زائد صفحے پر مشتمل تعلیقات ہیں۔ اس میں دیوان سے متعلق تاریخی، لغوی فرہنگی، مسائل پر مفصل گفتگو ملے گی۔

ان امور سے اس امر کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ اکثر کتاب کی تعلیق نویسی کا سلسلہ جاری رہتا ہے، نئے نئے مواد کی روشنی میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

غالب، اُردو کا وہ ادیب ہے جس کے یہاں ایسے امور کا سب سے زیادہ ذکر ہے، جو تعلیقات نویسی کے موضوع ہیں؛ اور یہ امور: تاریخ، تہذیب، زبان، املا، انشا، شعریات، دستورِ فارسی و اردو سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ اتنے ہیں کہ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضخیم مجلد درکار ہوں گے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ نام در محقق قاضی عبدالودود نے ''جہانِ غالب'' نام سے متعدد مضامین، انھی امور کی وضاحت کے سلسلے میں سپردِ قلم کیے تھے، لیکن بعض وجوہ سے یہ مفید سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ غالب کا ذہن بہت خلاق تھا۔ ان کا کلام ایک انسائکلو پیڈیا کی ترتیب کا متقاضی ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ اب تک اس سلسلے میں کوئی بڑا اقدام نہیں

ہو سکا ہے، اور سب سے زیادہ افسوس اس امر کا ہے کہ اس کے منظوم اور منثور کلام کی تصحیح و تنقید میں ان اہم امور کا زیادہ لحاظ نہیں رکھا گیا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ محمد حسین آزاد کے علاوہ کوئی ایسا اُردو ادیب نہیں جسے قدیم ایران کی زبانوں تک کا صحیح نام معلوم ہو۔ اس لحاظ سے غالب کے کلام کی جتنی تعریف کی جائے، بجا ہے؛ اور اگر چہ ان کی بعض اطلاعات صحیح نہیں، لیکن ان کی ذہانت وطباعی قابلِ داد ہے۔

ایرانِ قدیم کی تاریخ اور زبانوں کے بارے میں، دوسرے اور فرہنگ نویسوں کی طرح، غالب کو بھی کافی دھوکا ہوا ہے۔ سب سے بڑی غلطی دساتیر کی صداقت کا اقرار تھا۔ ایک طرف اس جعلی کتاب کے سارے مندرجات بے بنیاد تو دوسری طرف اس کی زبان مصنوعی اور جعلی۔ غالب نے اس کے مطالب اور اس کی زبان؛ دونوں کی صداقت پر مہرِ اثبات ثبت کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قدیم ایران کی تاریخ، مذہب، پیغمبروں، حتیٰ کہ زرتشت کے بارے میں ان کی معلومات بے بنیاد ہیں۔ یہی حال قدیم ایران کی زبانوں کا ہے۔ وہ اوستا کی حقیقت سے واقف نہ تھے۔ اس وجہ سے اس کی زبان کے بارے میں ان کی اطلاع بے حقیقت تھی۔ اسی طرح وہ ہخامنشیوں کے عہد کے کتبات اور ان کی زبان سے مطلقاً ناواقف تھے۔ پہلوی زبان کا نام جانتے تھے، لیکن اس کی خصوصیات سے ناآشنا تھے۔ ہزوارش کی حقیقت کا انھیں تصور نہ تھا۔ زند و پازند کو وہ کتاب سمجھتے تھے، حالاں کہ ان کا تعلق نہ کتاب سے ہے اور نہ زبان سے۔ دراصل زند؛ اوستا کی تفسیر و شرح ہے، جو ساسانیوں کے دور میں پہلوی زبان میں بھی لکھی گئی۔ پازند؛ اوستا کی شرح ہے، جو پہلوی زبان میں تھی، لیکن وہ ہزوارش سے پاک تھی، بہ خلاف زند کے، جس میں ہزوارش کی آمیزش تھی۔ ادبیاتِ فارسی میں زند اوستا؛ اوستا کے معنوں میں آتا ہے۔ غالب؛ زند اور پازند کو زا‌ے فارسی سے لکھتے ہیں۔ یہ بھی سہو ہے، لیکن ایرانِ قدیم کے بارے میں یہ غلطی بہت پہلے سے چلی آرہی تھی اور لطف کی بات یہ ہے کہ صاحبِ برہانِ قاطع کے یہاں بھی یہی ساری غلطیاں پائی جاتی ہیں، جن کو غالب اس مصنف کا سب سے بڑا کارنامہ خیال کرتے ہیں۔ غالب کی قاطع برہان میں ایرانِ قدیم کے مسائل زیادہ ہیں، لیکن ان کے رقعات میں بھی ان کی جھلک پائی جاتی ہے۔ مثلاً ص ۲۸۲ پر تفتہ کے خط میں لکھتے ہیں:

''اب ایک امر سنو! میں نے آغازِ یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے سی و یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک روداد شہر اور اپنی سرگذشت، یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے اور التزام اس کا کیا ہے کہ دساتیر کی عبارت، یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے۔ جو نظم اس نثر میں درج ہے، وہ بھی آمیزشِ لفظِ عربی ہے''۔

عرض ہے کہ دساتیر کا قدیم فارسی سے کوئی تعلق نہیں۔ قدیم ایران کی تین زبانیں تھیں، جن کا شجرہ یہ ہے:

قدیم ایرانی	متوسط ایرانی	جدید ایرانی
اوستا — فارسی قدیم	پہلوی اشکانی — پہلوی ساسانی	یعنی فارسی عہدِ اسلامی
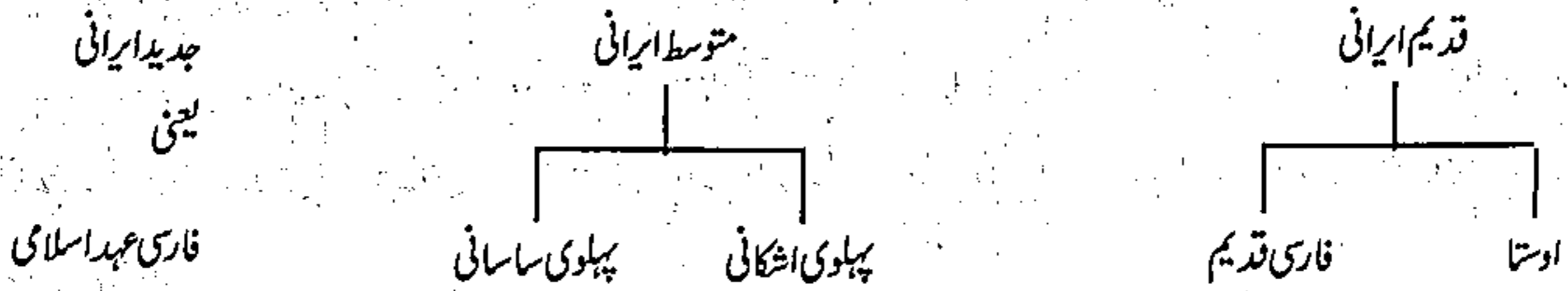
غالب ان قدیم ایرانی اور متوسط ایرانی زبانوں اور ان کے باہمی رشتوں سے ناواقف تھے۔ دساتیر کے چکر میں پھنس کر ان کی تحریریں بے بنیاد الفاظ سے مزین ہوئیں۔ یہ ان کا کارنامہ نہیں بلکہ نقص ہے اور اس سے فارسی کو سخت دھکا پہنچا ہے۔ ان کے دفاع میں صرف اتنی بات کہی جاسکتی ہے کہ ان سے پہلے کے ادیبوں اور فرہنگ نویسوں کے یہاں دساتیری الفاظ بڑی کثرت سے ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں راقم کی تالیف، نقد قاطع برہان کا مطالعہ سودمند ہوگا۔ غالب کے کلام کی تصحیح اور ان کے انتقادی متن کی ترتیب میں دساتیر کی حقیقت کا علم ناگزیر ہے، لیکن افسوس ہے کہ دساتیر کا کیا ذکر، دورِ اسلامی کی فارسی سے بھی ہماری واقفیت ختم سی ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ سے یہ بات طے ہے کہ غالب کے کلام کا تنقیدی اور لسانی مطالعہ تقریباً ناممکن سا ہوگیا ہے۔ اگر دیانت داری سے سوچا جائے تو ایک مدت تک، غالب کے کلام کا اس زاویۂ نگاہ سے مطالعہ، ضروری قرار پائے گا۔ زند، پازند اور اوستا کی حقیقت نہ معلوم ہونے سے لسانی اعتبار سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ یہ صرف تاریخ کی بات ہوگی، لیکن دساتیر کے ہزاروں جعلی اور بے سند الفاظ کا فارسی اور پھر کسی قدر اُردو میں استعمال جتنا تباہ کن ہے، اس کا بہ خوبی اندازہ، اہلِ علم لگا سکتے ہیں۔ فارسی میں دساتیری الفاظ کی آمیزش، غالب سے کئی سو سال پہلے شروع ہو چکی تھی، لیکن اُردو میں ان کا استعمال غالب کی جدت طرازی ہے۔ ان کی نظم و نثر میں خال خال دساتیری الفاظ مل جاتے ہیں، مثلاً تفتہ کے ایک خط میں (ص ۲۸۵) ''چادر گردش'' بہ معنی تغیرِ حال ہے۔ یہ لفظ محض دساتیری اور جعلی ہے۔ دنیا کی کسی زبان سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ درج بالا امور کے علاوہ غالب کے خطوط کے امور تعلیقات کو حسب ذیل حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

ا۔ شعرا: ان میں اکثر نام اس طرح ہیں:

ظہوری، جلال امیر، حافظ، صائب، غنیمت، حکیم سنائی، انوری، شوکت بخاری، شرف جہاں قزوینی، نظیری نیشاپوری، عرفی، خسرو، نظامی، فردوسی، سعدی، ظہیر فاریابی، خاقانی، عصری، رشید و طواط، رودکی، حزیں، کلیم، فیضی، ناصر علی سرہندی، بیدل عظیم آبادی، ملا شیدا، فقیر، منت، مسکین، فغانی، جامی، ہلالی، سلیم، حکیم شفائی، نعمت خان عالی، سرمد، مرزا مظہر جانِ جاناں، عمر خیام، موسوی خاں، طالب آملی، مغربی، عراقی، قدسی، میر تقی میر، آتش، ناسخ وغیرہ۔ ان میں سے ہر ایک کے بارے میں نہایت مختصر مگر ضروری یادداشت ایک دو سطر میں اضافہ کرنا چاہیے تاکہ ان کے زمانے کا اندازہ ہو سکے۔

ب۔ ادیب اور فرہنگ نگار وغیرہ:

غیاث الدین رام پوری مولف غیاث اللغات، عبدالواسع ہانسوی، حکیم محمد حسین دکنی مولف برہان قاطع، خانِ آرزو مولف سراج اللغہ، وارستہ مل سیالکوٹی مولف مصطلحات الشعرا، ٹیک چند بہار مصنف بہار عجم، میاں انجوے شیرازی مولف فرہنگِ جہانگیری، عبدالرشید مولف فرہنگ رشیدی، ملا طغرا، ابوالفضل، عبدالقادر بدایونی، واقف، قتیل وغیرہ۔ ان میں ہر ایک کے بارے میں نہایت مختصر یادداشت، جن سے ان کے زمانے کا علم ہو سکے، ضروری ہے۔

ج۔ کتب:

مامقیمان، دیوان حافظ، زبدۃ الاخبار، دساتیر، حدیقہ، چار شریت، غیاث اللغات، شرف نامہ، مصطلحات الشعرا، برہانِ قاطع، بوستان، سکندر نامہ، یوسف زلیخا، سہ نثر ظہوری، رسائلِ ابوالفضل، رسائل ابوحنیفہ، گروگرنتھ وغیرہ کے بارے میں اتنی مختصر یادداشت ضروری ہے جن سے ان کے مصنف کے بارے میں کچھ ضروری باتوں کا علم ہو سکے۔

۲۔ تاریخی اشخاص وامور:

ہوشنگ، جمشید، لہراسپ کیخرو، یزدجرد، بنی اسرائیل، خلیفۂ روم، حضرت علیؓ، امام اعظمؒ، مسیلمہ کذاب، حسن بصری، مہدیٔ موعود، جنگ ہفتاد ودوملت وغیرہ کے بارے میں مختصر اطلاع بہم پہنچانا لازمی امر ہوگا۔

۳۔ علوم اور قواعدِ زبان وغیرہ کی اصطلاحات:

واؤ معدولہ، صرف، نحو، اسمِ جامد، جمع الجمع، نون معنی فاعلیت، افادۂ معنی سلب، یاے مجہول ومعروف، یاے تحتانی، یائے نسبتی، صفت مشبہ، ہائے ہوز، حاصل بالمصدر، تقمیہ، تخرجہ، معما، تاریخ گوئی، تصحیف، تعریب، تفریس، ذوالقافیتین، تضمین، مقطع، مطلع، مقفا، مرجز، مسجع، استعارہ، سہلِ ممتنع، قافیہ، ردیف، مستزاد، اشباع، تحویلِ آفتاب، کف الخضیب وغیرہ۔

ان میں سے اکثر کے بارے میں یادداشت درج ہونی چاہیے۔

ان امور کے علاوہ متون میں محلِ نظر امور کی توضیح بھی ہوتی ہے۔

تعلیقاتِ متن کے متنوع امور میں یہ بھی شامل ہے اگر متن کے اشعار کے بارے میں سرقے یا توارد کی صورت ملتی ہے، تو اس کے ذکر سے متن کے مطالعے میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور اس سے متن زیادہ انتقادی قرار پاتا ہے۔ اس سلسلے میں ''دیوانِ سراجی'' سے دو ایک مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ سراجی کا ایک قصیدہ بطلع ذیل ہے:

طرب مجموی کی از روز گار نتوان ز روزگار دل شاد خوار نتوان یافت

یہ قصیدہ مجیر بیلقانی کے حسب ذیل قصیدے سے بہت متاثر ہے:

مراکہ کار غم عشق یار خواہد بود بیابسیں کہ ازاں بہ چہ کار خواہد بود

ذیل میں دونوں قصیدوں کے مشابہ ابیات، بالمقابل درج کیے جاتے ہیں: سراجی

کدام دست کہ درما تمش بہ سینہ زدن ہزار پنچہ چو دست چنار نتواں یافت

چو مار کوفتہ سرکیست و ثمنش کورا   بشکل مورچہ زنار دار نتوان یافت

تجیر

زبہر ریزش خوانش دو دست روح اللہ   ہزار پنجہ چو دست چنار خواہد بود
چومارناکس و زنہار خوارم ار نہ عدوش   بشکل مورچہ زناردار خواہد بود

اسی طرح کے دونوں کے ملتے جلتے اشعار کافی پائے جاتے ہیں، جو دیوانِ سراجی میں بطورِ تعلیق جمع کردیے گئے ہیں۔ یہ نقادِ فن کا کام ہے کہ وہ فیصلہ کرے کہ یہ اشعار سرقے میں آتے ہیں یا توارد میں، یا کسی اور چیز میں۔

غالب کے خطوط میں بعض واقعات مذکور ہیں جن کے مشابہ واقعے اور جگہ ملتے ہیں۔ ان مشابہ واقعات کا شمول، متن کے زیادہ وقیع و دلچسپ بنانے میں موثر ہوتا ہے۔ ذیل میں محض ایک واقعہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مرزا غالب نے چودھری عبدالغفور سرور کے [نام] ایک خط میں لکھا ہے:

''پیرومرشد کو سلام نیاز پہنچے۔ کف الخضیب، صورِ جنوبی میں سے ایک صورت ہے۔ اس کے طلوع کا حال مجھ کو کچھ معلوم نہیں۔ اختر شناسانِ ہند کو اس کا کچھ حال معلوم نہیں اور ان کی زبان میں ان کا نام، یقین ہے کہ نہ ہوگا۔ قبولِ دعا وقتِ طلوع، منجملہ مضامینِ شعری ہے، جیسے کتان کا پرتو ماہ میں پھٹ جانا اور زمرد سے افعی کا اندھا ہو جانا۔ آصف الدولہ نے افعی تلاش کر کر منگوایا اور قطعاتِ زمرد اس کے محاذی چشم رکھے، کچھ اثر ظاہر نہ ہوا۔ ایران و روم و فرنگ سے انواع کپڑے منگوائے، چاندنی میں پھیلائے، کوئی مسکا بھی نہیں''۔ (غالب کے خطوط۔ جلد دوم۔ ص ۶۳)۔

اس سلسلے میں حسب ذیل امور قابلِ ذکر ہیں:

۱۔ خط کا یہ حصہ حضرت صاحب عالم کے نام سے ہے۔

۲۔ کف الخضیب کے بارے میں فرہنگِ معین میں ہے:

ستارۂ سرخ رنگ جو شمال کی جانب ہے۔ قدما کا عقیدہ تھا کہ جب یہ ستارہ نصف النہار پر پہنچتا ہے تو وہ وقت اجابتِ دعا کا ہے۔ انوری کہتا ہے:

براستقامت حال تو بر بسیط زمین   برآسمان کف کف الخضیب کردہ دعا

البیرونی کی کتاب التفہیم سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روشن ستارہ ذات الکرسی کے منبر پر ہے، جسے کوہانِ شتر بھی کہتے ہیں۔ (بحوالہ ''لغت نامۂ دہخدا۔ ''جز'' ''کف'')۔

کواکب ذات الکرسی، صورِ شمالی میں ہیں۔ نہ جانے کیوں غالب نے انھیں صورِ جنوبی میں بتایا ہے۔

۳۔ قدیم معتقدات کو تحقیق پر پرکھنے کی جو کوشش آصف الدولہ نے کی ہو، قابلِ صد ستایش ہے۔ ضروری تھا کہ غالب کے اس بیان کا ماخذ معلوم ہوتا۔ بہر حال اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ آصف الدولہ سے کئی سو سال پہلے البیرونی نے زمرد کے اثر کے سلسلے میں اہم تجربات کیے تھے۔ وہ کتاب الجماہر (ص ۱۶۷، ۱۶۸) میں لکھتا ہے:

''منجملہ اور افسانوں کے، افسانہ نویس جس پر متفق ہیں، وہ زہریلے سانپ (افعی) کی آنکھ پھوٹنے کی روایت ہے، جب وہ زمرد کے روبرو ہو، اور یہ بات اتنی مشہور ہے کہ خواص کی کتابوں میں بھی شامل ہوگئی ہے اور عام لوگوں کی زبان پر بھی کثرت سے ہے، اور شعرا نے بھی اپنے اشعار میں اس کا ذکر کیا ہے۔

لوگوں کا اس پر اتفاق ہے کہ زمرد کی یہ خاصیت ہے کہ اس کے دیکھنے سے سانپ اندھا ہو جاتا ہے، یا اس کی آنکھ کی پتلی بہ جاتی ہے۔ تجربے سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی اور میں نے کئی بار اس کی آزمایش کی ہے، اور اس میں ضرورت سے زیادہ توجہ کی ہے، یہاں تک کہ افعی کی گردن میں زمرد کی پٹی ڈال دی، سانپ دان کا فرش زمرد کا بنا دیا، اور نو ماہ تک برابر زمرد کی لڑی، گرمی سردی میں، سانپ کی آنکھ کے مقابل رکھے رہا۔ سب کچھ کر ڈالا، سوائے اس کے کہ زمرد کا سرمہ افعی کی آنکھ میں لگا دوں۔ قطعاً کوئی اثر اس کی آنکھ میں، از قسم اندھا پن یا پتلی کا بہنا، ظاہر نہ ہوا۔ ہاں، اگر اس کی بینائی بڑھ گئی ہو تو اور بات ہے''۔

عبداللہ کاشانی نے عرائس الجواہر میں مزید ایک اور تجربے کا اضافہ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ چند قسم کے زمرد کو مختلف قسم کے زہریلے سانپوں پر آزمایا گیا،

کوئی اثر نہ ہوا۔ پھر زمرد کو ان کی آنکھوں سے، عرصے تک، چھواتا رہا؛ کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کے بعد گھس کر ان کی آنکھوں میں لگایا، اس کا مطلق کوئی اثر نہ ہوا۔ پس تحقیق سے یہ بات معلوم ہوئی کہ باوجود شہرت اور ضرب المثل ہونے کے، اس میں کوئی اصلیت نہیں۔ تواتر کا بھی کوئی اعتبار نہیں۔

(تعلیقاتِ تنسوخ نامہ۔ ص ۲۷۲، یادبود نامۂ بیرونی۔ ص ۵۶)

لیکن متاخرین فضلا البیرونی کی رائے سے اتفاق نہیں رکھتے۔

(رک: تعلیقات تنسوخ نامہ ایلخانی، بقلم مدرس رضوی۔ ص ۲۷۲، ۲۷۳)۔

مثلاً صاحب معرفۃ الجواہر نے جابر بن حیان کے حوالے سے لکھا ہے کہ افعی کی نظر زمرد پر پڑے، وہ اندھا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح محمد بن مبارک قزوینی نے جواہرنامے میں حکیم تیغاشی کے تجربے کی بنا پر ابوریحان کے قول کی تکذیب کی ہے۔ حکیم مذکور نے جب افعی کی آنکھ پر سرمہ لگا ہوا تیر چھوایا تو وہ آنکھ پھٹ کے باہر نکل پڑی، پھر مولف جواہرنامہ نے اضافہ کیا ہے کہ ابوریحان نے جس زمرد کو سانپ کی آنکھ پر آزمایا تھا، وہ اصیل نہ رہا ہوگا۔

(یہ بھی تعلیقاتِ ''تنسوخ نامہ''، ص ۲۷۳ سے لیا گیا ہے۔ زمرد اور چشمِ افی کے سلسلے میں دیکھیے: تعلیقات ''دیوانِ عمید اویکی''۔ بقلمِ نگارندۂ ایں سطور۔ ص ۴۰۸ تا ۴۱۲)

میری اس گزارش سے امید ہے کہ تحقیقِ متن کے سلسلے میں تخریج اور تعلیق کی اہمیت و افادیت کسی قدر واضح ہو سکے گی، اور یہ بھی اندازہ ہوگا کہ انتقادی متن کے دقار میں، ان امور کے برتنے سے، کتنا اضافہ ہوگا۔ اُردو تحقیق میں ابھی ان امور کی طرف کما حقہٗ توجہ نہیں دی جا سکی ہے۔ یہاں تک کہ غالبؔ، جن کے کلام میں تخریج و تعلیق کے متعلقہ مسائل بہت زیادہ ہیں، ان کے کلام کے انتقادی متن میں بھی ان امور کا جتنا لحاظ رکھنا چاہیے، نہیں رکھا گیا ہے۔

❖❖❖❖

حواشی

(۱) جہانِ غالبؔ کی قسطیں پاک و ہند کے مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوئیں۔ ۱۹۹۵ء میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے عکسی اشاعت کے ذریعے، کتابی صورت میں، یہ اقساط شائع کر دی ہیں۔

(۲) ''غالبؔ کے خطوط'' چار جلدوں میں غالبؔ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی سے ۱۹۸۴ء تا ۱۹۸۹ء میں اور انجمنِ ترقی اُردو پاکستان، کراچی سے ۱۹۸۹ء تا ۱۹۹۵ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ پانچویں جلد اشاریے کو محیط ہے جو بالترتیب نئی دہلی اور کراچی سے ۱۹۹۹ء اور ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی۔

(بشمولہ تحقیق شناسی، ترتیب و حواشی، رفاقت علی شاہد، لاہور، ۲۰۰۳ء)

❖❖❖❖

اُردو ادب میں تحقیق کی روایت

ڈاکٹر سلطانہ بخش

ادبی تحقیق ایک ایسی اہم دستاویز ہے جس میں انسان کے ذہنی ارتقا کے وہ تمام کارنامے محفوظ ہوتے ہیں جو فن کے حوالے سے اپنے تخلیقی حسن کے ساتھ اپنے عہد کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی تاریخ کے آئینہ دار ہوں۔ کوئی بھی ادبی کارنامہ، زمانے اور مقام سے اپنا رشتہ نہیں توڑ سکتا۔ ہر ادبی کارنامے میں اپنے عہد کی آواز کی گونج ہوتی ہے اور یہی آواز محقق اور نقاد کے لیے اہم ہوتی ہے۔

اردو ادب کی تاریخ میں ادبی تحقیق کی روایت کے مبہم آثار اٹھارویں صدی میں ملتے ہیں۔ اُردو کے اس ارتقائی دور ہی میں دوسری اصنافِ ادب کی طرح تاریخ و تحقیق کے تجربے کا آغاز ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں شعراء نے جو تذکرے مرتب کیے یا لکھے، وہ اردو میں ادبی تحقیق کے ابتدائی نقوش ہیں۔ یہ تذکرے دراصل بیاضوں ہی کی ایک بہتر شکل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تذکرے معاصرین کے مختصر سوانحی خاکوں پر مشتمل ہیں۔ بعض تذکروں میں تو صرف شاعر کا نام یا ایک آدھ سطر اور اس کے بعد کلام کے انتخاب میں چند اشعار کا اندراج ملتا ہے۔ یہ مختصر معلومات بھی غیر مستقیم ماخذ پر مبنی ہیں، اسی لیے ان کی صحت پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔

اٹھارویں صدی میں لکھے گئے تذکرے انیسویں صدی کے تذکروں کے مقابلے میں مختصر ہیں۔ انیسویں صدی کے ربع اول تک ''مرزا علی لطف کا تذکرہ گلشن ہند'' مرقومہ ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۱ء اور حیدر بخش حیدری، مولفہ ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ء'' (۱) کے علاوہ سارے کے سارے تذکرے فارسی زبان میں لکھے گئے اور یہ سلسلہ کسی نہ کسی طور پر میر تقی میر کے نکات الشعراء ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء (۲) سے لے کر تذکرہ آبِ حیات یعنی ۱۸۸۰ء تک برابر قائم رہا۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال کے اس عرصے میں کم و بیش پچاس ساٹھ تذکرے لکھے گئے۔ ان میں شعراء کے حالات اور سیرت پر توجہ نہیں دی گئی۔ عدم احتیاط اور دیگر خامیوں کے باوجود ان تذکروں کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وہ بنیادی آثار ہیں جن سے اردو زبان وادب کی ارتقائی کڑیوں کا سراغ ملتا ہے اور شعر وادب کی قدامت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اٹھارویں صدی کی ایک اہم شخصیت سراج الدین علی خان آرزو (ف ۱۷۵۶ء) (۳) کا ذکر ضروری ہے۔ تحقیق کے میدان میں ان کی توجہ زیادہ تر لغات پر رہی۔ انھوں نے عبدالواسع ہانسوی کی غرائب الغات کی اغلاط کی نشاندہی کی۔ یہ ان کا بڑا قابل قدر کام ہے۔ ان کی کتاب نوادر الالفاظ بجا طور پر اُردو کی ابتدائی لغت کہی جا سکتی ہے۔ اس کی تاریخی اہمیت تسلیم شدہ ہے۔ خان آرزو کے بعد کئی سو سال تک سناٹا چھایا رہا۔ اس دور میں شاعری پر زیادہ توجہ دی گئی۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں سرسید کی تحریک نے اردو ادب کی کئی جہتوں کو متاثر کیا۔ یہ تحریک ایک اعتبار سے روایت اور تقلید کے خلاف احتجاج اور علمی سطح پر خود سرسید کی آثار الصنادید پہلی تحقیق تھی جس کے دوسرے ایڈیشن میں مواد کو اسناد کے ساتھ درج کیا گیا اور ادارت میں بھی علمی و تحقیقی انداز روا رکھا گیا۔ اگرچہ اس کا تعلق ادبی تحقیق سے نہیں ہے مگر اس وقت کے تحقیقی رجحان کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اس تحریک کے نئے علمی اور سائنسی رویے نے اس دور کے اردو ادب کے مصنفین کو متاثر کیا اور ادب میں تحقیق کے رجحان کو تقویت حاصل ہوئی۔ سرسید اور ان کے رفقاء خصوصاً شبلی نعمانی، الطاف حسین حالی اور محمد حسین آزاد کی تحریروں میں تحقیق کے ابتدائی دھندلے نقوش قدرے واضح انداز میں ظاہر ہوئے۔ ان مصنفین کی کاوشوں سے تحقیق کی روایت میں وسعت پیدا ہوئی اور ادب کے مختلف پہلوؤں پر کام ہوا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ تذکرہ نگاری کا سلسلہ اٹھارویں صدی کے وسط سے لے کر انیسویں کے ربع آخر تک جاری رہا۔ مولانا محمد حسین آزاد کا تذکرہ آبِ حیات (۱۸۸۰ء) پہلی مرتبہ ۱۹۱۰ء میں وکٹوریہ پریس لاہور سے شائع ہوا تو معلوم ہوا کہ آزاد نے اس تذکرے میں اپنے پیش رُوؤں کی متعدد کمیوں کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ شعراء کے سوانحی کوائف کو تفصیل سے بیان کیا ہے، ان کے کلام پر تبصرہ کیا ہے اور تاریخ ادب میں ان شعراء کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ آزاد نے بھی اس تذکرے میں ''تاریخی واقعات کے بارے میں غلطیاں کیں۔ جانب داری کے باعث بعض شعراء کو ناحق دوسروں پر فوقیت دی اور بعض مشہور شعراء کو بالکل نظر انداز کر دیا، وغیرہ کے الزامات درست ہیں۔ اس کے باوجود اس سے آبِ حیات کی تاریخی اہمیت کم نہیں ہو جاتی۔ بے شبہ یہ اُردو کا پہلا تذکرہ ہے جس میں کچھ تحقیق و تنقید سے کام لیا گیا ہے۔ کسی حد تک اُردو زبان کی تاریخ بھی پہلی مرتبہ اسی کتاب میں لکھی گئی''۔ (۴) اُردو زبان کی تاریخ کے سلسلے میں آزاد نے آبِ حیات کے مقدمے میں اُردو زبان کی ابتداء کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔ اور آئندہ لکھنے والوں کے لیے ایک راستہ وا کر دیا۔ آزاد کی آبِ

حیات تذکرہ نویسی اور باقاعدہ تاریخ نویسی کے درمیان میں ایک مضبوط کڑی ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کرنا چاہیے کہ آب حیات میں تمام خامیوں کے باوجود تنقید کے ساتھ تحقیق کا عنصر بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ ابتدائی دور کے تذکروں کے بعد آزاد کی آب حیات تحقیق کی راہ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

سرسید تحریک کی ایک اور شخصیت مولانا الطاف حسین حالی کی ہے۔ انھوں نے تین سوانح عمریاں لکھیں۔ جن میں تحقیق کے زاویہ نگاہ سے حیات سعدی کا درجہ افضل ہے۔ اس کی فضیلت کی دلیل یہ ہے کہ پچھلے پچاس برس میں کئی نئے ماخذ دریافت ہوئے، فکر ونظر کے زاویے تک بدل گئے لیکن حیات سعدی میں حالی جو کچھ لکھ گئے ہیں اس پر اضافہ نہ ہوسکا۔ اس کے علاوہ حیات جاوید بھی ایک کامیاب تصنیف ہے۔ ان شخصیات پر اگر کچھ اضافہ ہوگا تو حالی کے تحریر کردہ مواد کے حوالے سے ہوگا۔ اس کے علاوہ حالی کی عبارت کی سادگی، تحقیق کے انداز کی غماز ہے۔ لیکن حالی کا کام محدود سطح پر تھا۔ ان کے ہم عصر شبلی نعمانی نے تحقیق کے میدان میں دیرپا اثرات چھوڑے ہیں۔ شبلی کی سوانح عمریاں ان کے تحقیقی کام کی اچھی مثالیں ہیں۔ ان سب میں اور خصوصاً سیرۃ النبی اور الفاروق میں سوانحی حالات کو بڑی تحقیق اور جستجو کے بعد احتیاط سے ترتیب دیا گیا ہے۔ یہ دونوں سوانح عمریاں موضوع کے اعتبار سے بہت نازک ہیں۔ ان سب کتابوں میں واقعات کی تحقیق، ترتیب اور ان سے اخذ کردہ نتائج قابل تعریف ہیں۔ رشید حسن خان کے مطابق "شبلی کے ہاں تحقیقی سطح پر شک کرنے اور چھان بین کا رجحان کم تھا۔ تحقیق جس کم یقینی، غیر جذباتی، انداز فکر وانداز اظہار اور صحیح معنوں میں سنگ دلی کی طلبگار ہے وہ مولانا کا حصہ نہیں تھی"۔ (۵) تاہم اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ ادب میں تحقیق کے رجحان کی ابتداء ان ہی مصنفین کی کاوشوں سے ہوئی۔ تحقیق کے اس ابتدائی رجحان کو آگے چل کر تقویت حاصل ہوئی۔ تحقیق کا کام زبان وادب کے جس شعبے اور جس دائرے میں بھی کیا جائے، دوسرے کام کرنے والوں کے لیے روشنی ورہنمائی کا باعث بنتا ہے۔

ادبی تحقیق کے سلسلے کا آغاز صحیح معنوں میں بیسویں صدی میں شروع ہوتا ہے اور روایت مختلف سمتوں میں آگے بڑھتی نظر آتی ہے۔ مغربی تعلیم کے فیضان نے اس روایت کو جدید خطوط اور سائنسی انداز فکر سے آشنا کیا۔ اس حوالے سے ادب میں تحقیق کی روایت کو استحکام بخشنے میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع اور حافظ محمود شیرانی نے بڑا اہم کردار ادا کیا اور اُردو ادب میں جدید تحقیق کا آغاز کیا۔ ان ارباب اہل نظر نے اُردو زبان کی کئی سو سالہ تاریخ کے متعدد گوشوں کی تلاش اور مواد کو نئے علمی اور ادبی تحقیق کے حوالے سے منظر عام پر لانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ "انھوں نے اُردو فارسی اور عربی کے سرمایے کو بند الماریوں سے نکالا، متون کی ترتیب وتصحیح کی، تاریخ ادب کی گم شدہ کڑیوں کو دریافت کیا، زبان کے آغاز وارتقاء کی نشاندہی کی، ادباء اور شعراء کے حالات وواقعات کو متعین کیا اور وہ سرمایہ فراہم کیا جس سے تاریخ ادب کی تدوین کا کام ممکن نظر آنے لگا" (۶) ان صاحبان تحقیق کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ جدید سائنٹیفک اصولوں پر متون کو درست کیا جائے تاکہ تاریخ ادب کی داستان مرتب کرنے کے لیے خام مواد فراہم ہو اور ادب کے تخلیقی عمل اور تنقیدی شعور کے لیے بنیادیں مہیا ہوں۔ تحقیق میں بنیادی کام متون کو صحت کے ساتھ پیش کرنا ہے۔ اگر اُردو کے بڑے ادیبوں کی تصانیف میل اور کھوٹ سے پاک ہو کر سامنے آجائیں تو تاریخ ادب کے راستے میں لغزش کا امکان کم ہو جاتا ہے۔ انھیں اس امر کا احساس تھا کہ اُردو ادب کی بے شمار شخصیتیں گوشہ گم نامی میں ہیں، اُردو زبان کی ابتداء اور ارتقاء کے کئی مسائل توجہ طلب اور محتاج تحقیق ہیں، ادب کی کئی جہتوں پر پردہ پڑا ہوا ہے، مصنفین کے سوانحی حالات وواقعات پردۂ اخفا میں ہیں۔ چنانچہ ان کی اولین کوششیں یہ تھیں کہ ادبی ذخائر کو دریافت کیا جائے اور انھیں منظر عام پر لا کر، حقائق کی تاویل وتوجیہ کے عمل کا راستہ وا کیا جائے۔

برصغیر پاک وہند میں اس نئی ادبی تحقیق کی روایت کئی علمی مراکز میں نظر آتی ہے۔ اعظم گڑھ، پٹنہ، لاہور، دکن اور لکھنؤ کے تحقیقی دبستانوں میں مختلف نوعیت کے کام کیے گئے۔ اعظم گڑھ تہذیبی اور تاریخی تحقیق کے لیے وقف ہوگیا۔ ان کے یہاں متن کی ترتیب وتحشیہ کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی بلکہ اخذ وترجے پر زور دیا گیا۔ سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریا آبادی، صباح الدین، عبدالرحمن، عبدالسلام ندوی اور عبدالحی کے نام دارالمصنفین کے اس مرکز میں کی جانے والی علمی وادبی تحقیق کے حوالے سے اہم ہیں۔ اس مرکز کی تالیفات کی خاکے میں ادب کو ضمنی حیثیت حاصل ہے۔

ادبی تحقیق کے لحاظ سے دکن اور لاہور کے مراکز نے نہایت قابل قدر تحقیقی کام کیا۔ دکن کے ادبی مرکز میں ڈاکٹر محی الدین زور اور اُن کی رفقاء سید محمد، ڈاکٹر عبدالقادر سروری اور نصیر الدین ہاشمی نے دکنی ادب کے متن کی تصحیح کا کام شروع کیا اور لسانی لحاظ سے اُردو زبان کے ارتقاء کا جائزہ لیا۔ لیکن ان ابتدائی کاموں میں ترتیب متن کے ان اصولوں کو پیش نظر نہیں رکھا گیا اور وہ تقاضے پورے نہیں کیے گئے۔ جن کا آج مطالعہ کیا جاتا ہے۔ "اس تحقیقی روایت میں یہ کمی رہ گئی کہ متن کی تصحیح میں مرتبین نے قلمی نسخوں کے تمام اختلاف کو اپنے ہاں درج کرنے کا جھگڑا نہیں پالا" (۷) اختلاف نسخ تحقیق متن میں حد درجہ ضروری ہیں۔ ان اختلافات کو درج کرنے کا مقصد یہ ہے کہ متن کی تحقیق کے سلسلے میں غور وفکر کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہے۔ دوسرا یہ کہ انھوں نے ادباء وشعراء کے حالات اور نظری مباحث میں اس دور کی تاریخ کے مواد کو ادبی مواد سے مطابقت دینے کی زیادہ کوشش نہیں کی، جس کے سبب ان کے تحقیقی کاموں میں واقعات اور سنین کی غلطیاں رہ گئیں۔

تاہم اس تحقیقی مرکز کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اہلِ علم و ادب کو دکن کے ادبی ذخیرے سے روشناس کیا، خطی متن کی اشاعت کا اہتمام کیا، قدیم متنوں کی وضاحتی فہرستیں شائع کیں اور تحقیق کرنے والوں کے لیے نئے مصادر فراہم کیے۔

لسانیات کے سلسلے میں انیسویں صدی ہی میں مشرقی زبانوں پر تحقیق کے کام کا آغاز ہو چکا تھا۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے جریدے میں فلالوجی کے اصولوں پر مشرقی زبانوں اور خاص طور پر سنسکرت اور آریائی زبانوں کی جانچ پرکھ کا کام جاری تھا۔ تحقیق کی لسانی روایت بیسویں صدی کے اداروں میں سرایت کر گئی اور مقامی ضرورتوں کے مطابق لسانی بنیادوں پر اُردو زبان کا تحقیقی مطالعہ ہونے لگا۔ دکن کے ادبی مرکز نے لسانیات پر جو اہم کام کیا اسے فلالوجی کے حدود سے نکال کر صوتیات کے علم سے ملا دیا۔ اس جدید علم کی حیثیت سے اُردو لسانیات کے موضوع پر کام کرنے والوں میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور قابلِ ذکر ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی کتابیں ہندوستانی لسانیات اور دکنی ادب میں اہم ہیں۔ دیگر ادبی شخصیات میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی تحقیقی کاوشیں قابلِ قدر ہیں۔ ان صاحبانِ تحقیق نے لسانیات پر نہایت اہم کام کیے اور اس علم کو توانائی بخشی۔ ان ہی خطوط پر آگے چل کر ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر مسعود حسین خان نے لسانیات کو اپنا مستقل موضوع بنالیا اور سائنسی اندازِ فکر کو فروغ دیا۔

اُردو لسانیات کے علاوہ ادبی تحقیق میں اردوئے قدیم کی بازیافت اور اس سے روشناس کرانے کے سلسلے میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق کا نام قابلِ ذکر ہے۔ مولوی عبدالحق کی پوری زندگی علمی و تحقیقی مطالعے تالیف و تصنیف اور اس کے ساتھ قومی محاذ پر اُردو کے لیے ایک مسلسل جہاد میں صرف ہوئی۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ اردوئے قدیم اور کلاسیکی ادب کی بازیافت ہے۔ ان میں تذکرے اور قدیم متن شامل ہیں۔ جنھیں مرتب کر کے شائع کیا گیا۔ ان کی اشاعت سے اُردو کے ارتقا کی مختلف منازل اور مدارج کا تعین اور تحقیق کے لیے راستہ ہموار ہو گیا۔

ادبی تحقیق کے حوالے سے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے اُردو میں بعض تحقیقی مقالات اہم ہیں۔ ان کا خاص موضوع تحقیق ہے اور انھوں نے اپنے مقالات میں تحقیق کا ایک اعلیٰ معیاری نمونہ پیش کیا ہے۔ دراصل یہ ان محققین میں سے ہیں جنھیں خالص پسند کہہ سکتے ہیں۔

لاہور کا ادبی مرکز اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی میں قائم تھا۔ ابتدا میں اس مرکز نے عربی فارسی سنسکرت کو تحقیقی کام کے لیے منتخب کیا۔ مگر بعد ازاں اُردو زبان و ادب پر بھی کام شروع کیا۔ اس مرکز نے اُردو ادب کی تحقیقی روایت کو نہایت مضبوط بنیادیں عطا کیں۔ لاہور کے ادبی مرکز کی تحقیقی روایت ''ادبی تحقیق میں حزم و احتیاط کا بہترین معیار پیش کرتی ہے۔ یہاں سے وابستہ اہلِ تحقیق نے فراموش شدہ مصنفین کے حالات کی تلاش، عام اور مسلمہ ادبی مفروضوں کی بے رحمانہ چھان بین، تمام معلومہ مواد کو جرح اور تعدیل کی کسوٹی پر کسنا، حوالے کے قلم بند کرنے میں کامل احتیاط' (۸) کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ ان کا قابلِ فخر اور اہم کام یہ ہے کہ ادبی تحقیق میں محنت کو تحقیق کے لیے ایمان کا درجہ دیا۔ سہل انگاری کو سرے سے رد کیا۔ اصل مآخذ سے رجوع کرنے اور ان کے استعمال پر زور دیا۔ اس کے علاوہ ادبی تحقیق میں ادب کے مواد کو تاریخی مواد سے مربوط کرنے کے رجحان کو تقویت اور تاریخ کو تحقیق ادب کی بنیاد بنایا۔ نیز مختلف علوم اور مختلف زبانوں کے مطالعے کو تحقیق کے لیے ضروری قرار دیا۔ مصنفین کے سوانحی حالات کے بارے میں صحیح اسناد کے حصول کے لیے ان کے ہم عصر مصنفین کے بیانات اور شہادتوں پر توجہ دینے کو ترجیح دی اور سب سے بڑھ کر داخلی شہادتوں سے مصنف کے بارے میں مواد فراہم کرنے کو اولیت دی۔ تحقیقی کام میں غفلت، سہل انگاری اور عدم احتیاط کو جرم قرار دیا۔ اس مرکز کے صاحبانِ تحقیق نے ادبی تحقیق کا جو معیار متعین کیا تھا اُسے عملی طور پر تحقیقی کاموں میں پیش کر کے تحقیق کا اعلیٰ معیار قائم کیا۔

جن محققین نے اس مرکز میں اُردو ادب میں تحقیق کی راسخ روایت قائم کرنے اور ادبی تحقیق کا معیار بلند کرنے میں اپنا کردار ادا کیا، ان میں مولوی محمد شفیع اور حافظ محمود شیرانی نہایت اہم شخصیات ہیں۔

ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کا زیادہ کام فارسی میں ہے۔ اُردو میں محمد حسین آزاد، ذوق اور داغ پر ان کے مقالے تحقیق کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ ان کی تحقیق کا اہم پہلو ریاضت ہے۔ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کا بیشتر کام بعض پرانے متنوں کی ترتیب و تحشیہ تک محدود رہا۔ ان کا سب سے اہم اصول یہ تھا کہ کوئی بات بے ثبوت نہ کہی جائے، ہر ایک بیان کو دلیل کے ساتھ ہونا چاہیے۔ ان کے نزدیک ماخذ اور مصادر کی اہمیت اولیت حیثیت رکھتی ہے۔ ''انھوں نے جس محنت اور تندہی سے ابن عبدربہ کی کتاب عقد الفرید کے تفصیلی اشاریے تیار کیے وہ ترتیب، تحقیق اور تحشیہ کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۹''۔

ادبی تحقیق کے معمارِ اول حافظ محمود شیرانی اُردو اور فارسی علوم و ادبیات کے ایک ممتاز عالم اور عظیم محقق ہیں۔ ان کی تحقیقات کے میدان متنوع اور وسیع ہیں۔ انھوں نے لغات، قواعد، رسم الخط، عروض، شعر، ادب، تذکرہ، سوانح یا تاریخ لسانیات کے بارے میں گراں قدر تحقیقی اور تنقیدی مضامین لکھے۔ قدیم و جدید علوم اور علمی و ادبی تحقیقات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ''انھوں نے اپنی تحقیقات و تصنیفات کے ذریعے اُردو فارسی علوم و ادبیات کے ذخیرے میں گراں بہا اضافے

کیے۔ تحقیق وتنقید کو سنجیدگی، بصیرت اور وقار عطا کر کے ان علوم کی ایک عظیم الشان اور استوار روایت قائم کی ہے[۱۰]،،۔ حافظ محمود شیرانی کی تحریروں نے اہل علم وادب میں تحقیق کا شعور پیدا کیا ہے۔ انھیں اُردو میں تدوین وتحقیق کا معلم اول کہا جا سکتا ہے۔ شیرانی صاحب نے قدیم مشرقی انداز تعلیم اور جدید مغربی انداز نظر دونوں سے فیض پایا تھا۔ مزاجاً ان کو تحقیق سے مکمل مناسبت تھی اور ان کے ہاں وہ منطقی انداز نظر موجود تھا جس کے بغیر انداز گفتگو میں صحت اور استخراج نتائج کا سلیقہ آ ہی نہیں سکتا، زود یقینی، آسان پسندی اور کم نظری سے انھیں علاقہ نہیں تھا۔ تحقیق اور تدوین دونوں موضوعات پر ان کا بیشتر کام مثال ومعیار کی حیثیت رکھتا ہے[۱۱]،،۔

شیرانی صاحب کے تحقیق کاموں کی خصوصیت یہ کہ وہ جب کسی مسئلے کے متعلق تحقیق شروع کرتے تھے، تو اس کے تمام گوشوں کو چھان پھٹک کر اپنا اطمینان کر لیتے تھے اور اپنے دعوے کے ثبوت میں دلائل وشواہد کا انبار لگا دیتے۔ ان کی کتاب ''پنجاب میں اُردو'' میں انھوں نے اُردو زبان کے آغاز کے بارے میں اپنا نظریہ تمام مستند اور معتبر تاریخی، علمی، ادبی اور لسانی دلائل وشواہد کے ساتھ پیش کیا ہے۔

صحیح متن، ادب کی بنیادی اساس ہوتا ہے۔ اس کے بغیر تشریح، تنقید، تجزیہ اور تبصرہ سب ہی باتیں بے کار محض ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اُردو میں صحیح متن حاصل کرنا بہت دشوار ہے۔ خاص طور پر جو کتابیں بار بار چھپتی ہیں ان کے ہر ایڈیشن میں اغلاط میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ایسے متن کو تنقید کی بنیاد بنا لیا جائے تو اس کی حیثیت مشکوک ہو جاتی ہے۔ حافظ محمود شیرانی کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اُردو دانوں میں متن کی صحت کا احساس اور شعور پیدا کیا۔ انھوں نے نہ تو ہر چھپی ہوئی چیز کو مستند مانا اور نہ مشاہیر کو تحقیق وتنقید سے بالا سمجھا۔ ''محمود شیرانی نے ادبی دنیا میں اوہام اور مفروضات کے پچاسوں بت توڑے ہیں۔ فردوسی کی طرف یوسف زلیخا کا انتساب، فردوسی کی ہجو محمود، فارسی دیوان کا حضرت شیخ معین الدین چشتی کی طرف انتساب، پرتھی راج رسا منسوب بہ چند برادئی، امیر خسرو کی طرف منسوب خالق باری وغیرہ موضوعات پر انھوں نے جس دقیق نظری سے بحث کی ہے اور جعلی انتساب کا پردہ چاک کیا ہے، وہ تحقیقی دنیا کے شاہکار ہیں۔ ان کے علاوہ بعض متداول کتابوں پر عادلانہ محاکمہ کیا اس سلسلے میں ان کی تنقید شعر العجم، ترجمہ خزائن الفتوح اور تنقید آب حیات سر فہرست ہے[۱۲]،،۔ انھوں نے تحقیق کے توسط سے تنقید کا معیار متعین کیا۔ ان کے مقالات میں زبان وبیان کی سادگی وسلاست دلائل وشواہد کی پختگی کے ساتھ ربط وتنظیم پائی جاتی ہے، جس سے نتائج کا استخراج ازخود ہوتا ہے۔ انھوں نے تمام امور کو حیثیت کی کسوٹی پر پرکھ کر ماحول، تاریخ اور زمانے کے جائزے کے ساتھ حقائق کو بے کم وکاست غیر جانب دارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اس طرح انھوں نے اردو دانوں کو تحقیق اور تنقید کی راہوں سے آشنا کیا۔

شیرانی مرحوم نے اُردو فارسی زبان وادب کے سینکڑوں موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور ہر موضوع پر جتنا نیا اچھوتا مواد فراہم کیا ہے، اس سے ادبی تاریخ مالا مال ہو گئی ہے۔ ان کی حیثیت اُردو ادب کی تحقیق کی روایت میں تاریخ ساز محقق اور نقاد کی ہے۔ بلاشبہ ''شیرانی مرحوم کی تحقیق راہ ہدایت کی شمع ہے۔ انھوں نے موجودہ نسل کے لیے بہت کافی سامان اکٹھا کر دیا ہے۔ ان کے اور ان کے رفقا کے ذریعے تحقیق کی ایک زبردست روایت قائم ہو چکی ہے[۱۳]،،۔

حافظ محمود شیرانی کا کارنامہ یہ ہے کہ اُردو کے تمام مستند اور معتبر محققین کے ہاں شیرانی کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں اور ان حضرات نے شیرانی کی قائم کردہ روایت تحقیق میں قابل قدر اضافے کر کے اسے جان دار اور تابناک بنا دیا ہے اور اس کا حلقہ اثر وسیع کیا ہے۔

ادبی تحقیق کی یہ پختہ روایت درمیان میں کچھ مدھم پڑ گئی تھی۔ شیرانی مرحوم کی روایت کو حیات نو بخشنے میں پٹنہ کے ادبی دبستان کے سرخیل نامور محقق قاضی عبدالودود قابل ذکر ہیں۔ قاضی صاحب تحقیق میں نہایت بلند معیار کے طالب ہیں۔ انھوں نے تحقیق میں ذمے داری اور سخت ڈسپلن کا احساس پیدا کیا۔ انھوں نے اپنے مضامین میں صرف اعتراضات ہی نہیں کیے بلکہ نکتہ چینی کے ساتھ ساتھ غلط بیانیوں یا نیم صداقتوں کے مقابلے میں نہایت عرق ریزی اور دیدہ وری سے صحیح حقائق کو پیش کر کے تحقیقی کام کی ایک نئی سطح پیش کی ہے۔ اس کا نتیجہ صحت مند تحقیقی رجحان کی شکل میں آیا۔ قاضی عبدالودود کی ادبی تحقیق میں سخت گرفت اور تیز وتند لہجے نے اُردو تحقیق کا مذاق اور معیار بلند کیا۔ تحقیق میں ذمے داری کا عرفان پیدا ہوا۔ ادب کے محققین اور ناقدوں کی توجہ دو باتوں کی طرف مبذول ہوئی، ایک صحیح متن کی ترتیب، دوسرے تنقید کا خارجی اور سائنٹیفک معیار۔۔۔ قاضی صاحب کی تحقیق کے بارے میں کچھ اہل تحقیق کا خیال ہے کہ ان کی تحقیق اعداد وشمار کی تحقیق تک محدود ہو کر رہ گئی ہے اور کچھ کے خیال میں یہ منفی طرز تحقیق ہے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ تحقیق کا مقصد سچائی کی تلاش ہے اور حق سے غیر حق کو الگ کرنا ہی تحقیق کا بنیادی مقصد ہے۔ ''اس کام کے لیے بڑے مبلغ علم کی ضرورت ہے اور قاضی صاحب اس فن میں ماہر ہیں۔ ان کے دو مجموعوں عیارستان اور اشتر وروزن میں یہی کچھ ہے[۱۴]،،۔

قاضی صاحب نے کوئی مستقل تصنیف پیش نہیں کی لیکن تیس چالیس برس میں بیسیوں مقالات قلم بند کیے ہیں۔ ان میں اُردو شعراء اور ادباء کے حالات لکھے ہیں۔ بعض کتابوں کی تلخیص کی اور کئی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے بعض کتابوں کو مفید اور معلوماتی حواشی کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا۔ مثلاً دیوان شورش، تذکرہ ابن امین اللہ طوفانی وغیرہ۔ تحقیق کے میدان میں ان کا اصلی کارنامہ یہ ہے کہ شیرانی مرحوم کی روایت کو توانائی بخشنے کے ساتھ ساتھ نئے

لکھنے والوں میں احتیاط اور محنت کی مثال قائم کی۔

ان صاحبانِ علم و تحقیق کی شب و روز محنت اور تحقیقی لگن نے ادبی تحقیق کی روایت کو قابلِ اعتبار بنایا اور تحقیق کی اہمیت کا احساس دلا کر، حقائق کی جستجو اور تلاش، اس کی چھان بین اور کھوج کے رویے کو عام کر کے تحقیق کے مزاج کو سائنسی خطوط پر استوار کیا۔

آزادی کے بعد برصغیر پاک و ہند کی یونیورسٹیوں میں اور یونیورسٹیوں سے باہر ادبی تحقیق کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ ۱۹۴۲ء سے یونیورسٹیوں میں اُردو کی اعلیٰ تعلیم کی ضرورت اور اہمیت کو تسلیم کیا گیا، ان کے مناسب انتظام اور اہتمام سے تعلیمی درجہ بندی میں اُردو کے طالب علم اور اُستاد کو اعتبار نصیب ہوا۔ طلبا اور اساتذہ جو جدید علوم و فنون سے آگاہ اور علمی تحقیق و طریقہ کار میں تربیت یافتہ تھے، جدید سائنسی اصولوں پر تحقیقی کاموں میں مصروف ہو گئے۔ نتیجتاً برصغیر پاک و ہند میں اُردو ادب میں تحقیقی کاموں کی رفتار نہایت تیزی سے بڑھی۔ کئی تاریخ ساز دریافتیں عمل میں آئیں۔ قدیم ادبی ثقافتی ورثے کو کھنگالا گیا اس کی قدر و قیمت متعین کی۔ نئی معلومات اور نیا تاریخی مواد اکٹھا ہوا اور اُردو زبان و ادب کے بارے میں کئی نئے انکشافات عمل میں آئے۔ ادبی تحقیق کی روایت کے اس سفر میں تدوین کی اہمیت اور ضرورت کا احساس عام ہوا۔ نادر و نایاب نسخوں کی بازیافت کے ساتھ ان کی ترتیب و تدوین کا اہتمام بھی پابندی کے ساتھ تدوین کے اصولوں کی روشنی میں کیا جانے لگا۔ صحتِ متن کی اہمیت پر زور دیا جانے لگا اور اس کے ساتھ ساتھ متن کی تصحیح کا سوال بھی اہمیت اختیار کر گیا۔ تحقیق میں نہ صرف حقائق کا تعین ضروری خیال کیا گیا بلکہ استخراجِ نتائج کی اہمیت پر بھی زور دیا گیا کہ جن حقائق کا تعین کیا گیا ہے ان کے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں اور ان سے علم و آگہی میں کس نوعیت کا اضافہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ محقق کا کام صرف حقائق معلوم کرنا ہی نہیں بلکہ ان کی تشریح و تعبیر بھی کرنا ہے اور ان کی صحت و درستی کا خیال رکھنا ضروری ہے اور ہر معاملے میں آخری فیصلہ کرنا ہے۔ مثلاً اگر ایسے اشعار ملیں جو سودا اور قائم دونوں کے کلیات میں درج ہیں تو محقق کی حیثیت سے صرف یہ بتا دینا کافی نہیں ہوتا بلکہ تمام شہادتوں کی روشنی میں فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ یہ اشعار کس کے ہیں۔ اگر شہادتیں ناکافی ہوں اور مواد دسترس میں نہ ہو تو اس حالت میں نا تمام تحقیق کو ہی پیش کر دینا چاہیے تاکہ کوئی اور محقق نیا راستہ نکالے۔ تحقیق میں کوئی بات بھی حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ تشریح اور تعبیر کے سلسلے میں حقائق کی مدد سے مصنف کی روح اور ذہن تک پہنچنے کی کوشش مستحسن ہوتی ہے۔

لسانیات کو ایک مستقل فن کی حیثیت حاصل ہو گئی، جدید سائنسی آلات کے ذریعے زبان کی قدامت کا اندازہ لگانے کے طریقے علم میں آئے۔ تحقیق میں نئی معلومات یا نئی ترجمانی کو اہمیت دی گئی، معروضی ذہن اور متنازعہ مسائل میں تمام پہلوؤں کو محفوظ رکھنے کے بعد ایک واضح فیصلے کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا۔ ادب میں تحقیق کے رجحان کے فروغ نے احتیاط کی عادت پیدا کی اور احتساب کی ضرورت کو محسوس کیا گیا اور اس پر عمل بھی کیا گیا۔ حقائق کی تفہیم و تحلیل میں فن پارے کے حسن کو برقرار رکھنے کی طرف توجہ دلائی گئی۔

ادبی تحقیق میں ہمارے بعض محققین کا نقطۂ نظر روایتی ہے۔ تاہم نئی نسل کے نقادوں اور محققین میں مغرب کی فکری، سماجی اور تہذیبی تحریکات، میلانات اور رجحانات کا واضح شعور ملتا ہے اور اندازِ فکر میں تبدیلی محسوس ہوتی ہے۔ وہ بدلتے ہوئے معاشرے، عصرِ حاضر کے تقاضوں اور نئی اقدار کی روشنی میں ادبی تنقیدی اور تحقیقی اقدار متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہماری یونیورسٹیوں سے منسلک اور یونیورسٹیوں سے باہر ان محققین کی تعداد زیادہ ہے، جنھوں نے اُردو زبان و ادب کی تحقیق میں نہایت معیاری کام پیش کیے ہیں۔ اور تحقیق کی اعلیٰ روایتوں کو برقرار رکھا اور اپنے تحقیقی کاموں سے نئی نسل کی رہنمائی کی۔

ان محققین کی تحقیقی کاوشوں نے اردو ادب کے تحقیقی ذخیرے میں قابلِ قدر اور گراں بہا اضافہ کیا ہے۔ گزشتہ چالیس پینتالیس برسوں میں اُردو زبان و ادب پر تحقیق کا کثیر سرمایہ جمع ہو گیا ہے۔ اُردو زبان و ادب کے مختلف شعبوں پر تحقیقی کام ہوا۔ خطی نسخے بڑی تعداد میں پہلی بار ترتیب و طباعت سے آراستہ ہوئے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے نثری ادب میں اضافہ ہوا۔ مناسب تحشیہ کے ساتھ لاتعداد تذکرے مرتب کر کے شائع کیے گئے۔ تواریخِ اُردو ادب مرتب کی گئیں۔ علاقائی ادب پر توجہ دی گئی۔ اصنافِ ادب پر تحقیق کی گئی۔ مشاہیرِ ادب کی خدمات پر قابلِ اعتماد تحقیقی کام ہوا۔ اُردو کی لسانی روایت کو آگے بڑھایا گیا۔ لغات ترتیب دی گئیں۔ مخطوطات کی متعدد فہرستیں مرتب کی گئیں جن میں نسخوں کی کیفیت کو جدید اصولوں پر لکھا گیا۔ غرض یہ کہ اُردو ادب میں تحقیق کے سلسلے میں جو کاوشیں کی گئیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو تحقیق کا معیار برابر بڑھتا جا رہا ہے۔ یوں تو تحقیق میں مثال اور معیار تک رسائی ممکن نہیں، بعض اوقات منزل پر پہنچنے پر احساس ہوتا ہے کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ ساقط المعیار کاموں کے انبار میں معیاری تحقیقی کاموں کی تعداد کم ضرور ہے لیکن قابلِ قدر ہے۔

ہمارے ہاں تحقیق کی راہ میں بڑی مشکلات ہیں۔ مسائل کی زیادتی اور وسائل کی کمی ہے۔ ان بے شمار کوتاہیوں، نارسائیوں اور خامیوں کے باوجود ہم نے ادبی تحقیق کی روایت کو پروان چڑھایا، آگے قدم بڑھایا ہے۔ اگر ہماری تحقیقات میں کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ ہم نے کچھ کام نہیں کیا۔

آج اُردو زبان وادب میں مختلف اور متنوع موضوعات پر جس رفتار سے کام ہو رہا ہے اس میں ایک بہتر روشن مستقبل کے امکانات موجود ہیں۔

❖❖❖❖

حواشی

(۱) اُردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۲ء، ص ۶۹۔

(۲) ایضاً، ص ۲۵۔

(۳) اُردو میں تحقیق، مالک رام، رہبر تحقیق، لکھنؤ، لکھنؤ یونیورسٹی، ۱۹۷۶ء، ص ۵۷۔

(۴) ایضاً، ص ۵۸۔

(۵) تدوین اور تحقیق کے رجحانات، رشید حسن خان، اُردو میں اصول تحقیق، مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص ۳۰۱۔

(۶) کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ، ڈاکٹر وحید قریشی، لاہور، مکتبہ ادب جدید، ۱۹۶۵ء، ص ۹۔

(۷) ایضاً، ص ۱۰۔

(۸) ایضاً، ص ۱۱۔

(۹) اُردو میں تحقیق، مالک رام، ص ۷۲۔

(۱۰) اُردو میں تحقیق کا اولین معلم حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر حکیم چندیر، کراچی، سہ ماہی اُردو، جلد ۵۶، شمارہ ۴، ۱۹۸۰ء، ص ۱۲۸۔

(۱۱) تدوین اور تحقیق کے رجحانات، ص ۲۷۔

(۱۲) فارسی زبان وادب سے متعلق شیرانی کی تحقیقات، پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد، کراچی، سہ ماہی اُردو، شمارہ ۴۵، ۱۹۸۰ء، ص ۴۲۔

(۱۳) ایضاً، ص ۱۲۵۔

(۱۴) اُردو میں تحقیق کا معیار، ڈاکٹر گیان چند رہبر تحقیق لکھنؤ، لکھنؤ یونیورسٹی، شعبہ اُردو، ۱۹۷۶ء، ص ۱۴۷۔

❖❖❖❖

حصہ دوم

(الف)

ادبی تحقیق، تحقیقات کی رفتار اور جائزہ

ڈاکٹر سلطانہ بخش

ہم جس معاشرے میں سانس لے رہے ہیں وہ ایک مہذب اور متمدن معاشرہ ہے۔ اپنے معاشرے کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی، جب تک ہمارے پاس اپنے اسلاف کی فکری، جذباتی اور ذہنی کارناموں کی مکمل تاریخ نہ ہو۔ ادبی تاریخ کی ترتیب میں ادبی کارنامے ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں اور ارتقا کی گمشدہ کڑیوں کو یکجا کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔ ادبی کارناموں کو مرتب کرنے کے لیے صرف حقائق کی تلاش، پوشیدہ خزانوں کی بازیافت اور ان کی تشریح وتعبیر کا نام ہی تحقیق نہیں بلکہ اس میں تخلیقی ذوق اور تنقیدی شعور کا ہونا بھی ضروری ہے۔ ورنہ تحقیقی حقائق صرف واقعات کی کھتونی بن کررہ جائیں گے اور تفہیم وتحلیل موضوع کو پارہ پارہ کرکے فن پارے کا حسن ضائع کردے گی۔

ہندو پاکستان کی ادبی تحقیق میں تحقیق کی دو واضح صورتیں ملتی ہیں، ایک قدیم متون کی تصحیح وترتیب اور دوسری حقائق کی بازیافت اور ان کی تفہیم وتحلیل۔

تحقیق کی پہلی صورت جس میں نظم ونثر کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ متون کی ترتیب وتدوین اور نئے مآخذ کی دریافت ہے۔ قدیم مشرقی زبانوں کا کلاسیکی ادب زیادہ تر مخطوطات کی شکل میں ملتا ہے اور انھی قلمی نسخوں کی مدد سے ان کی ہیئت اور حدود تک رسائی ممکن ہے۔ اس لیے کہ ہر متن ایک مستقل وجود ہے اور اپنی مختلف روایتوں کی شکل میں اپنے میں ایک سے زیادہ ذیلی وجود رکھتا ہے۔ ایسی صورت میں متون کی صحیح ہیئت اور حدود روایت کا تعین ایک نہایت اہم، مشکل مگر نتیجہ خیز کام ہے، جس کے لیے غیر معمولی سطح پر ذہنی کاوش اور اہتمام تلاش جزئیات ضروری ہوتا ہے۔ اس کے بغیر حقیقت تک رسائی ممکن نہیں۔ اس میں بہت سوجھ بوجھ سے کام لینے کی ضرورت ہے اور روایۃً اور درایۃً نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔ ترتیب متن کا کام سائنسی نہ ہوتے ہوئے بھی ایک سائنسی طریقۂ کار کا تقاضہ کرتا ہے۔ جس سے مآخذ کی جستجو اور معیار بندی ہوسکے۔

تحقیق کی دوسری صورت مروجہ حقائق کی تفہیم یا حقائق کی کسی نہفتہ پہلو کی بازدید ہے۔ حقائق کی بہ نسبت تحقیقی مواد پر غور وخوض اور اس کی تدوین محقق کی نظر میں ایک اہم چیز ہوتی ہے۔ اس عمل کے ذریعے شاعر یا مصنف کی زندگی، ذہنی نقطۂ نظر اور اسلوب کو تفہیم وتجزیے کے ذریعے، غیر جانب دارانہ رویہ کے ساتھ خالص تحقیق کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ اس قسم کی تحقیق میں عقائد ونظریات کی نئی اقدار کی نشاندہی ہوتی ہے۔ تخلیق کار کو اپنے عہد کے مطالعے سے بھی مدد حاصل کرنا پڑتی ہے اور ہم عصر تخلیقی کاموں کا موازنہ اور تقابل بھی ہوسکتا ہے۔

کسی عہد کے ادبی مزاج اور تنقیدی معیار کو ایک دوسرے سے الگ کرکے دیکھنا مشکل ہوتا ہے، اس لیے تنقید وتفہیم میں اس مطالعے کی بنیادی اہمیت ہے اور اس سے صرف نظر ممکن نہیں۔ اس سے حقائق کی تفہیم میں مدد ملتی ہے اور کسی تصنیف کی علمی اور ادبی حیثیت کے تعین میں بھی اس سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔

اُردو کی چھ سو سالہ تاریخ کے کئی گوشے اور کئی پہلو ابھی نظروں سے پوشیدہ ہیں اور نئی علمی اور ادبی تحقیق ان کو ایک ایک کرکے منظرِ عام پر لا رہی ہے۔ زبان کی نشوونما، ارتقاء اور ادب کی کئی جہتوں پر جو پردہ پڑا ہوا تھا آہستہ آہستہ اٹھتا جارہا ہے۔ اُردو زبان کے خدمت گزاروں اور ان کے کارناموں سے روشناس کرانے کا کام اٹھارویں صدی عیسوی میں ہی شروع ہوگیا تھا لیکن اس کی بنیاد جدید تحقیق کے اصولوں پر استوار نہیں تھی اور نہ ہی ان کی حیثیت معاصرین کے سوانحی حالات سے زیادہ تھی۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کہ اُردو کے ارتقائی دور ہی میں دوسری اصناف کی طرح تاریخ وتحقیق کے تجربے کا آغاز ہوگیا تھا۔ اس زمانے میں جو تذکرے لکھے گئے وہ اُردو تحقیق کے ابتدائی نقوش ہیں۔ تذکروں کے بعد محمد حسین آزاد کی ''آبِ حیات''، تحقیق کی راہ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے ''آبِ حیات'' تذکرہ نویسی اور باقاعدہ تاریخ نویسی کے درمیان ایک مضبوط کڑی ہے۔ اگرچہ اس پر بہت اعتراض کیے گئے اور اس کی بعض معلومات کو غیر مستند قرار دیا گیا تاہم آبِ حیات کی بنیادی حیثیت کے بارے میں کلام نہیں۔

سرسید تحریک کے زیر اثر جو نیا علمی اور سائنسی رجحان پیدا ہوا اس سے تحقیق کو بھی تقویت پہنچی۔ بیسویں صدی میں اس روایت کی مزید توسیع محمود شیرانی، ڈاکٹر عبدالحق، مولوی محمد شفیع، قاضی عبدالودود، مسعود حسن رضوی اور امتیاز علی عرشی جیسے بلند پایہ محققین ادب کے ہاتھوں ہوئی۔

آزادی سے پہلے ہی ہندو پاک میں نئی آگہی کے احساس کے ساتھ ساتھ تحقیق کی ضرورت کا احساس بھی روز بروز بڑھنے لگا اور تحقیق کی مضبوط اور مسلسل

روایات اسی وقت قائم ہوئیں جب تعلیم کی اعلیٰ جماعتوں میں اُردو کو بار دیا گیا۔ یونیورسٹیوں میں نہ صرف اُردو بلکہ دوسری زبانوں اور دوسرے مضامین میں بھی تحقیق پر زور دیا گیا۔ ان مضامین میں تحقیق کے اصول مغرب سے لیے گئے۔ ان کے ساتھ ساتھ اُردو زبان و ادب کی تحقیق نے بھی مغربی طریقہ کار سے استفادہ کیا۔

آزادی کے بعد ہندو پاک میں ادبی تحقیق کو اتنا فروغ حاصل ہوا ہے کہ اسے تحقیق کا زریں دور کہا جا سکتا ہے۔ گزشتہ پینتیس چالیس سالوں میں درس گاہیں تحقیق کا مرکز بن گئیں۔ درس گاہوں سے باہر بھی کئی عظیم اور قد آور محققین نے اپنی تحریروں سے تحقیق کے طالب علموں کی رہنمائی کی اور اردو میں تحقیق کے اصول وضع کیے۔

برصغیر پاک و ہند میں اُردو کے مختلف شعبوں میں ہر سطح پر بکثرت تحقیقی کام ہوا ہے، جن میں لسانیاتی تحقیق، قدیم متون کی دریافت، متون کی تصحیح و ترتیب، اصناف، عہد اور مشاہیر ادب پر تحقیق، حوالے کی کتابوں کی فہارس، نادر مخطوطات کی فہارس، ادبی تاریخیں اور تبصرے تصنیف ہوئے۔ اس عرصے میں تحقیق کا اتنا زیادہ کام ہوا ہے کہ ان کا اجمالی جائزہ لینا مشکل ہے۔ تاہم اپنی سہولت کے لیے اس عرصے کے تحقیقی سرمائے کو نوعیت کے اعتبار سے چار شقوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱۔ اصل مآخذ کی اشاعت یعنی بنیادی تحقیق
۲۔ نتائج کی پیش کش یعنی اطلاقی تحقیق
۳۔ لسانی تحقیق
۴۔ کتب حوالہ کی تیاری

۱۔ اصل مآخذ کی اشاعت

تحقیق میں بنیادی کام متون کو صحت کے ساتھ پیش کرنا ہے اور اس سلسلے میں ہندو پاک کے محققین نے قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ پاکستان میں قدیم اور دکنی ادب کی دریافت، ترتیب و تدوین کے سلسلے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے نہایت اہم کام کیے، جن میں فخر الدین نظامی کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، دیوان حسن شوقی اور دیوان نصرتی اُردو ادب کی اہم دریافت ہیں۔ دکنی ادب کی دریافت کے سلسلے میں مولوی عبدالحق کی مرتبہ نصرتی کی مثنوی ''گلشن عشق''، سخاوت مرزا کی مرتبہ قاضی محمود بحری کی مثنوی ''من لگن''، رستمی بیجاپوری کی مثنوی ''خاور نامہ'' مرتبہ چاند حسین شیخ، شاہ تراب کا ''دیوان تراب'' مرتبہ ڈاکٹر سلطانہ بخش اور شاہ قاسم اورنگ آبادی کا ''دیوان'' مرتبہ سخاوت مرزا پہلی بار ترتیب و طباعت سے مزین ہوئے۔ ان کے علاوہ ایک نایاب بیاض، دکنی شعرا کے چند نایاب مرثیے، مثنوی ''برہ بھبھوکا''، مثنوی ''مثل خالق باری'' اور ''ارشاد نامہ'' دیوان ولی کا غیر مطبوعہ کلام اور مثنوی ''معنوی'' پاکستان کے مختلف علمی و ادبی رسالوں میں شائع ہوئے۔

دکنی ادب کے سلسلے میں ہندوستان میں ڈاکٹر خلیق انجم نے خواجہ بندہ نواز کی معراج العاشقین کو اس طرح ترتیب دیا کہ اس میں ان کا اُردو کلام بھی شامل کر دیا۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے ان کے شکار نامے کو ایک نہایت مفصل مقدمے کے ساتھ مرتب کیا۔ جاوید وشسٹ نے سب رس کی تلخیص قصہ حسن و دل کے نام سے ترتیب دی۔ دکنیات کے کچھ اہم نسخے عثمانیہ یونیورسٹی کے سہ ماہی رسالے قدیم اُردو میں شائع ہوئے۔ اس کی جلد اول میں سب سے اہم غواصی کی مثنوی مینا ستونتی مرتبہ ڈاکٹر غلام عرفان ہے۔ فیروز بیدری کی مختصر مثنوی ''پرت نامہ'' مرتبہ ڈاکٹر مسعود حسین خان قدیم اُردو کا اہم نسخہ ہے۔ دکنی ادب کا ایک قابلِ قدر کام ''کلیات شاہی'' جسے علیحدہ علیحدہ مبارز الدین رفعت اور زینت ساجدہ نے مرتب کیا۔ دیوان ہاشمی ''کلمۃ الحقائق''، مثنوی چندر بدن و مہیار، قصہ رضوان شاہ و روح افزا، مثنوی طالب و موہنی، علی نامہ، گلشن عشق، مثنوی تصویر جاناں، پنچھی باچھا، کلیات غواصی اور من سمجھاون بھی بڑے سلیقے سے مرتب کر کے شائع کیے گئے۔

پاکستان میں شمالی ہند کی منظومات کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں جو اہم کام ہوئے اور پہلی مرتبہ شائع ہوئے ان میں نگار دہلوی کا کلام، اسمٰعیل امروہوی کی دو مثنویاں ''وفات نامہ بی بی فاطمہ اور معجزہ انار''، ''مسدس رنگین''، شاہ حاتم کا ''دیوان زادہ'' مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، شاہ عالم ثانی کے فرزند جہاں دار شاہ کا دیوان مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی (ضمیموں کا اضافہ ڈاکٹر صاحب کے تحقیقی مزاج کا آئینہ دار ہے)، خلیفہ معظم کی مثنوی جنگ نامہ آصف الدولہ و نواب رام پور، دیوان حیدری، شکوہ فرنگ لاہور اور کراچی سے شائع ہوئے۔ ان کے علاوہ آدینہ بیگ کامل کے حالات اور کلام، ارمغان دل، جعفر علی حسرت کا شہر آشوب پاکستان کے مختلف علمی و ادبی رسالوں میں شائع ہوئے۔

شمالی ہند کے متون کے ساتھ ان چند متون کو بھی درج کیا جاتا ہے جو بلوچستان اور پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں۔ بلوچستان کے ایک شاعر ملا محمد حسین براہوی کا اُردو کلام مرتبہ ڈاکٹر انعام الحق کوثر، لاہور سے اور شاہ شرف الدین اشرف بیابانی کی قدیم ترین مثنوی ''نوسرہار'' مرتبہ افسر امروہوی، سید ساجد علی فنائی کی

مثنوی ''عاقبت بخیر'' مرتبہ افسر امروہوی کراچی سے شائع ہوئی۔ ''دیوان مبتلا'' اور مولانا عابدی کی مثنوی ''فقۂ ہندی'' ادبی رسالوں میں شائع ہوئے۔ اس سلسلے میں ضمنی طور پر اس غیر مطبوعہ کلام کا ذکر بھی کیا جاتا ہے جو دریافت ہوا لیکن ابھی تک متعلقہ شاعر کے دیوان یا کلام میں شامل نہیں ہوا۔ جن میں انعام اللہ یقین کا کلام مرتبہ محمد اکرام چغتائی، میر حسن کا کلام مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی، نظیر اکبر آبادی کی نظم ''ایک رقاصہ کا عروج و زوال'' مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق، نواب الٰہی بخش خان معروف کی غزلیں مرتبہ ڈاکٹر ایوب قادری، امیر مینائی کا کلام مرتبہ کریم الدین احمد، مولانا آزاد کا کلام مرتبہ ابوسلمان شاہجہان پوری، ثاقب لکھنوی کی چھ بیاضیں مرتبہ مشفق خواجہ اہم ہیں۔

ہندوستان میں شمالی ہند کی منظومات کے متون کی ترتیب میں امتیاز علی عرشی کا مرتب کردہ ''دیوانِ غالب'' ایک اعلیٰ اور معیاری کام ہے۔ ''دیوان فائز'' مرتبہ مسعود حسن رضوی اور ڈاکٹر مسعود حسین خان، ''بکٹ کہانی'' مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن بھی ترتیب متن کی اچھی مثالیں ہیں۔ ان کے علاوہ مثنوی گوہر جوہری، مثنویات راسخ، اندر سبھا، خطوط غالب، داستان امیر حمزہ، دیوانِ اثر، دیوان جرأت، دیوان یقین، طلسم ہوش رُبا، کلام ممنون، کلیاتِ ولی، کلیاتِ سودا، کلیاتِ غالب، گل رعنا اور نوطرز مرصع اس سلسلے کی اہم تصنیفات ہیں جن کے متون ترتیب دیے گئے۔

متون کی ترتیب کے سلسلے میں ایک اہم کام تذکروں کی ترتیب کا ہے جو بڑی تعداد میں شائع کیے گئے۔ ان میں سے کئی ایسے ہیں جن کے دنیا میں ایک یا دو تین ہی نسخے ہیں۔ بعض تذکروں کو مناسب تحشیہ کے ساتھ شائع کیا گیا اور بعض کو محض چھپوا دیا گیا۔ ہر دو صورتوں میں ان کی افادیت سے انکار نہیں۔

پاکستان میں جن تذکروں کو مرتب کیا گیا ان میں عقد ثریا، نکات الشعراء، ہمیشہ بہار، خوش معرکہ زیبا، گلشن ہمیشہ بہار، بہارستان ناز، گلستان سخن، مخزن نکات، گلشن بے خار، سراپا سخن، ارمغان گوکل پرشاد، مدائح الشعراء، عروس الاذکار، ریاض الفردوس وغیرہ اہم ہیں۔

ہندوستان میں پاکستان کی نسبت بہت زیادہ تذکرے مرتب ہو کر شائع ہوئے۔ جن میں تحفۃ الشعراء، مسرت افزا، تذکرۃ الشعراء، سفینہ ہندی، سفینہ خوش گو، دو تذکرے، دیوان جہان، گلشنِ سخن، تذکرہ نادر، عمدہ منتخبہ، گلشنِ ہند، طبقات الشعراء، تلخیص سراپا سخن، خوش معرکہ زیبا، مقالات الشعراء، تذکرہ مسرت افزا، بہار بہ خزاں، نکات الشعراء، تذکرہ آزردہ، تذکرہ قطعہ منتخب، تذکرہ شعرائے ہندی، تذکرہ شورش، تذکرہ شعرائے رام پور اور سخنوران گجرات قابلِ ذکر اور اہم ہیں۔

نثری ادب کے متون کی ترتیب و تصحیح کے سلسلے میں پاکستان میں تقریباً ساٹھ کے قریب نثری تصانیف کو متعارف کروایا گیا جن میں فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی نگارشات، غالب کے نثری متون، سرسید کے مقالات، خطبات، مکاتیب اور سفرنامے، سرسید کے معاصرین کی تصنیفات اور مکاتیب اقبال کے متن تصحیح و ترتیب کے بعد پاکستان میں شائع ہوئے۔ ان نثری متون میں ترتیب کا شاہکار ڈاکٹر وحید قریشی کا مرتب کردہ مقدمہ شعر و شاعری ہے۔

ہندوستان میں بھی اُردو نثر کے بیش بہا خزانوں کو منظر عام پر لایا گیا جن میں غالب کا نسخہ بھوپالی اور فضلی کی کربل کتھا اہم ہیں۔ ترتیب متن کے لحاظ سے مالک رام اور مختار الدین احمد کی مرتبہ ''کربل کتھا'' اُردو کے بہترین کارناموں میں سے ہے۔ قدامت اور ادبی خوبیوں کے لحاظ سے عیسوی خان کا ''قصہ مہر افروز و دلبر'' مرتبہ ڈاکٹر مسعود حسین رضوی ایک تاریخ ساز دریافت ہے۔ دیگر نثری متون میں قدیم داستانیں، غالب کی تحریریں، خطوط اور ابوالکلام آزاد کی غبار خاطر اہم ہیں۔

۲۔ اطلاقی تحقیق

جہاں تک اطلاقی تحقیق کا تعلق ہے سب سے اہم کام تاریخ ادب اُردو ترتیب دینا ہے۔ اس سلسلے میں اصل مآخذ کا شائع کرنا اتنا ہی اہم ہے جتنا ان سے صحیح نتائج اخذ کرنا اور ان کی مدد سے تاریخ مرتب کرنا ہے۔ تاریخ میں دلکشی تبھی آتی ہے جب ادب کو معاشرے کی زندگی کے تسلسل کے طور پر پیش کیا جائے، اس کے تہذیبی و ثقافتی محرکات پر نظر رہے اور ادب کو ملک و قوم کی ذہنی تاریخ کے پس منظر میں رکھ کر دیکھا جائے۔

تاریخ ادب اُردو کے سلسلے میں پاکستان میں سب سے وقیع کام ڈاکٹر جمیل جالبی کر رہے ہیں۔ اب تک انہوں نے تاریخ کی تین جلدیں مرتب کر لی ہیں جو لاہور سے شائع ہو چکی ہیں۔ یہ تاریخ کل چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ دوسری قابل ذکر تاریخ ادب جامعہ پنجاب کے شعبہ تاریخ ادبیات کی مرتبہ ہے جو انیس جلدوں پر مشتمل ایک مبسوط تاریخ ہے۔ تاریخ ادب کے مرتبین میں ڈاکٹر عبدالقیوم جن کی مرتب کی ہوئی صرف ایک جلد شائع ہوئی۔ ان تاریخوں کے علاوہ کچھ طویل اور مختصر تاریخیں بھی مرتب کی گئیں۔ تاریخ ادب کے سلسلے میں وہ کام جو زبان و ادب کی علاقائی حدود کے لحاظ سے کیا گیا اہم ہے، اس ضمن میں بیس کے قریب تحقیقی کتابیں شائع ہوئیں جن میں بلوچستان، سندھ، سرحد، پنجاب اور کشمیر میں زبان و ادب کی خدمات کو منظرِ عام پر لایا گیا۔ نیز تاریخ ادب اُردو کے متنوع موضوعات کے

تعلقات سے متعدد تحقیقی مقالے پاکستان کے ادبی رسالوں کی زینت ہیں۔

ہندوستان میں تاریخ ادب پر اہم ترین کام علی گڑھ تاریخ ادب اُردو جلد اول ہے۔اس تاریخ میں کمی یہ ہے کہ یہ مضامین کا مجموعہ ہے، ایک مسلسل منسلک تصنیف نہیں۔ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کا تحقیقی مقالہ ''اُردو نثر کا آغاز وارتقاء'' دکنی نثر کی مستند تاریخ ہے اور نثار الحق کی کتاب ''میر وسودا کا دور'' بھی اہم ہے۔علاقائی تاریخوں کے ضمن میں لکھنؤ کا دبستان شاعری اور دلی کا دبستان شاعری کے علاوہ دیگر اہم مقالے تصنیف ہوئے جن میں میسور، بھوپال اور جے پور کی خدمات قابلِ ذکر ہیں۔

پاکستان میں اصناف ادب پر بکثرت تحقیقی کام ہوا ہے۔جن اصناف پر توجہ دی گئی ان میں مرثیہ نگاری، ڈراما، داستان، افسانہ، ناول، سفرنامہ، انشائیہ، مثنوی، غزل، نظم، گیت اور رباعی ہے۔شاعری کے حوالے سے ادبی، ثقافتی، سیاسی رجحانات اور تحریکات سے متعلق متعدد تحقیقی مقالے لکھے گئے جن میں سے بہت کم زیورِ طبع سے آراستہ ہوئے۔

مشاہیر ادب جن کے فکر وفن کے چراغ سے کاشانۂ ادب روشن ہے، اصناف ادب کی نسبت ان پر کام زیادہ ہوا ہے۔تاہم اب بھی متعدد مشاہیر کے علم وفن کے کارنامے ہماری بازیافت کے منتظر ہیں۔جن مشاہیر پر تحقیقی کام ہوا ان میں غالب، میر حسن، حاتم، میر تقی میر، سودا، مومن، مرزا دبیر، رنگین، حسرت، شاہ نصیر، مصحفی، اکبر، صوفی تبسم، اقبال، قائم چاند پوری، امیر مینائی، جگر، ظفر علی خان، میر سوز، اصغر گونڈوی، حالی، آزاد، جعفر علی حسرت، پریم چند، رسوا، نذیر احمد، سرسید، شرر، آغا حشر، میر امن، رجب علی، محی الدین زور، مسعود حسن رضوی، نساخ، حامد حسن قادری، عبدالقادر اور حمید احمد خان اہم ہیں۔ان میں بعض تحقیقی کام اعلیٰ معیار کے ہیں۔خصوصاً ڈاکٹر وحید قریشی کا مقالہ ''میر حسن اور ان کا زمانہ'' تحقیق کا قابلِ قدر کارنامہ ہے۔

ہندوستان میں بھی اصناف اور مشاہیر ادب پر بے شمار تحقیقی کام کیا گیا جن میں بعض مقالے اعلیٰ معیار کے ہیں۔جن اصناف ادب پر کام ہوا ان میں گیت، غزل، مرثیہ، قصیدہ، مثنوی واسوخت، رباعی، شہر آشوب، نظم، افسانہ، ناول، داستان، ڈراما، سوانح، ادب لطیف، انشائیہ، میلاد نامہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ان اصناف کی تاریخ ترویج وترقی کا نہ صرف محققانہ جائزہ لیا گیا بلکہ ان ادبی سانچوں کی تعمیری اور صنفی خصوصیات کا محاکمہ بھی کیا گیا۔

مشاہیر ادب کی خدمات پر بے شمار تحقیقی کام ہوا۔تقریباً ۱۵۰ تحقیقی مقالے لکھے گئے۔جن مشاہیر پر کام ہوا ان میں اثر، آتش، آرزو، آزاد، اسماعیل میرٹھی، افسوس، اکبر، اقبال، امیر مینائی، بیدی، پریم چند، تسلیم، چکبست، حالی، میر حسن، حسرت، آغا حشر، جوش، جگر، جرأت، داغ، درد، ذوق، راسخ عظیم آبادی، راشد الخیری، رسوا، رشک، رشید احمد، ریاض خیرآبادی، سرور جہان آبادی، سرشار، سرسید احمد، سرور، رجب علی، سید احمد دہلوی، سلیمان ندوی، سیماب، شاد، شبلی، شرر، شیفتہ، صہبائی، بہادر شاہ ظفر، عبدالحق، عشق دہلوی، عصمت چغتائی، غالب، فانی، قائم چاند پوری، کرشن چندر، کنہیا لال کپور، منٹو، مصحفی، مومن، نیاز، نذیر احمد، نظیر اکبر آبادی، نصیر الدین ہاشمی، واجد علی شاہ اور یگانہ چنگیزی اہم ہیں۔تحقیقی کاموں کی فراوانی کے باوجود اب بھی متعدد ہستیاں موجود ہیں جن کی حیات اور ادبی خدمات کو منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے۔نیز شعری اور نثری اسالیب پر مزید کام کی ضرورت ہے۔غزل ہماری مقبول ترین صنف ادب ہے۔یوں تو اس پر مختلف حوالوں سے کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں لیکن تحقیقی اعتبار سے غزل کی تاریخ کا حق ابھی ادا نہیں ہوا۔اس کے علاوہ بہت سی قدیم اور جدید اصناف ابھی تحقیق کی منتظر ہیں۔

۳۔لسانی تحقیق

اُردو ادب کے علاوہ اُردو زبان بھی محققوں پر اپنا حق رکھتی ہے۔اُردو لسانیات پر ابھی کام کی ابتدا ہے۔اُردو میں لسانی تحقیق کا آغاز حافظ محمود شیرانی اور مولوی عبدالحق نے کیا۔پاکستان میں ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے نام اہم ہیں کہ ڈاکٹر سبزواری نے اُردو کے ارتقاء کو علمی اور سائنسی بنیادوں کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی ہے اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے جدید علم لسانیات کی روشنی میں اُردو کی لسانی تشکیل کا جائزہ لیا۔لسانی تحقیق کے سلسلے میں پاکستان میں جو کام ہوا ان میں ڈاکٹر سبزواری کے تحقیقی مقالے اُردو زبان کا ارتقاء اُردو لسانیات اور داستان زبان اُردو، اور اُردو الفاظ کی تحقیق کے سلسلے میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے چند قدیم لغات اور ہندوستانی گرامر اہم ہیں۔اس کے علاوہ اُردو اور دیگر پاکستانی زبانوں کے لسانی روابط، اُردو زبان کی اثر پذیری کے ساتھ ساتھ اثر اندازی کا محققانہ جائزہ لیا گیا ہے جن میں اُردو سندھی کے لسانی روابط، ملتانی زبان اور اس کا اُردو سے تعلق، سندھی، پشتو اور اُردو کے لسانی روابط، اُردو اور راجستانی بولیاں اہم ہیں۔اُردو اور علاقائی زبانوں کے تقابلی جائزے بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے، جن میں کشمیری اور اُردو کا تقابلی مطالعہ، ہندکو اور اُردو کا تقابلی مطالعہ، اُردو اور سندھی کا تقابلی مطالعہ، براہوی اور اُردو کا تقابلی مطالعہ اور قدیم دکنی اور اُردو کا تقابلی مطالعہ اہم ہیں۔

لسانیات کی تحقیق میں سب سے اہم چیز لغت کی ترتیب و تدوین ہے۔ پاکستان میں اُردو لغت کے ضمن میں مولوی عبدالحق کی لغت کبیر کی دو جلدیں، اُردو لغت بورڈ کی چھ جلدیں، نسیم اللغات، فرہنگ اقبال، علمی اُردو لغت، ہفت زبان لغت، لغت اُردو، قدیم لغت، ترکی اُردو لغت اور جامع الامثال وغیرہ پاکستان سے شائع ہوئیں۔ اُردو لغت بورڈ کراچی کا اصل منصوبہ انگریزی آکسفورڈ لغت کے انداز پر مبسوط لغت کی ترتیب واشاعت ہے۔ یہ کام قریب قریب مکمل ہو چکا ہے اور ابھی چھ جلدیں شائع ہوئی ہیں۔ اُردو میں جامع لغت کی ضرورت کی تکمیل میں بورڈ کا یہ ایک اہم اور قابل قدر اقدام ہے۔ اس تاریخ ساز شاہکار کی تکمیل کے بعد اُردو فخر کر سکے گی۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں اُردو کی لسانی تحقیق کو آگے بڑھایا گیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر مسعود حسین رضوی کا انگریزی رسالہ ''اُردو لفظ کا صوتی و صوتیاتی مطالعہ''، گوپی چند نارنگ کی انگریزی کتاب ''اُردو کی کرخنداری بولی'' ''اُردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو اور مولوی امتیاز علی عرشی کی اُردو اور افغان اہم ہیں۔ اس کے علاوہ اُردو کی صوتی اور صوتیاتی ساخت، اُردو قواعد نویسی، دکنی اُردو کے قواعد کا تجزیاتی مطالعہ، اُردو عروض اور فنِ تحریر کی تاریخ اہم مقالے ہیں۔ لغت کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں چند اہم لغات سامنے آئی ہیں۔ لغات گجری، اُردو ہندی لغت، مہذب اللغات (چار جلدیں)، فرہنگ امثال، فرہنگ غالب، اُردو و ہندی لغت (انجمن ترقی اُردو)، روسی اُردو لغت اور اُردو روسی لغت، تلگو اُردو لغت اور اُردو تلگو لغت (یہ لغات مختصر ہیں) مرتب ہو کر شائع ہوئیں۔

۴۔ کتب حوالہ کی تیاری

کتب حوالہ کی تیاری کو بعض لوگ ناسمجھی سے فہرست سازی کا نام دیتے ہیں۔ اس کے ذیل میں کام نہ ہونے کا جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ کسی زبان کی اس سے بڑی بدنصیبی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کے پاس اپنے ادبی سرمایہ کا کوئی جامع کیٹلاگ نہ ہو اور تحقیقی کاموں میں ایسے کیٹلاگ کی اہمیت ریڑھ کی ہڈی کی سی ہے۔

تحقیق کرنے والوں کے لیے مختلف کتب خانوں کے مخطوطات کی وضاحتی فہرستیں اولیں ضروریات میں سے ہیں۔ پاکستان میں نادر مخطوطات کے ذخیرے ہیں لیکن ابھی تک ان میں سے بیشتر کی فہرستیں شائع نہیں ہوئیں۔ جو فہرستیں شائع ہوئیں ہیں ان میں ''جائزہ مخطوطات اُردو''، مشفق خواجہ کا تحقیقی کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ کتب خانہ جامعہ پنجاب، پنجاب پبلک لائبریری، ذخیرہ محمود شیرانی، ذخیرہ محمد شفیع، مائیکروفلم اور آٹوگراف (لائبریری جامعہ پنجاب) سندھ میں اُردو مخطوطات، مخطوطات پیرس، مخطوطات انجمن ترقی اُردو، شاہان اودھ کے مخطوطات، اُردو ادب کا دورِ اول (دکنی)، مآخذات احوال شعرا اور مشاہیر، فہرست مخطوطات دیال سنگھ لائبریری اور قاموس الکتب کی تین جلدیں اہم ہیں۔ ان کے علاوہ غالب اور اقبال پر موجود کتابوں کی وضاحتی فہرستیں بھی مرتب کر لی گئیں ہیں۔

ہندوستان میں مخطوطات کے بہت اچھے ذخیرے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی فہرستیں مرتب ہو کر شائع ہوں تاکہ محققین استفادہ کر سکیں۔ جو فہرستیں شائع ہوئیں ان میں سے آصفیہ لائبریری کی وضاحتی فہرست، ادارہ ادبیات اُردو کے مخطوطات و مطبوعات کی فہرست، مخطوطات خدا بخش لائبریری، اسٹیٹ لائبریری رام پور (عربی مخطوطات)، اُردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست انجمن ترقی اُردو، قاموس الکتب کی ایک جلد اور نیشنل لائبریری کلکتہ کی فہرست کتب وغیرہ اہم ہیں۔ تاہم یہ شعبہ محققین کی خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ چند لائبریریوں کے کیٹلاگ ضرور موجود ہیں لیکن کئی ذخیرے صندوقوں اور عجائب گھروں میں بند پڑے ضائع ہو رہے ہیں۔ ان سے استفادہ کے دائرے کو وسیع کرنے کے لیے نہایت ضروری ہے کہ ان کی وضاحتی کیٹلاگ جدید اصولوں کی روشنی میں مرتب کر کے شائع کی جائیں۔

اس جائزے سے ایک بات سامنے آئی کہ اُردو میں کوئی ایسی رہنما کتاب موجود نہیں جو اُردو ادب سے متعلق جملہ اقسام کی لائبریریوں کے سلسلے میں معاون ہو۔

مجموعی طور پر تحقیقی کاموں کا جائزہ لینے سے جو موضوعات زیادہ مقبول نظر آئے ہیں وہ مشاہیر ادب اور شخصیاتی تحقیقی مقالوں کی فہرست ہے۔ اکثر مقالوں کی تکمیل میں محقق کا طریقہ کار سوانح نگار کا ہوتا ہے جو عموماً میکانکی انداز سے انجام پاتا ہے۔ مثلاً حالاتِ زندگی اور عصری نقوش تو اجاگر ہو جاتے ہیں اور غیر مطبوعہ کلام یا نگارشات کا انتخاب درج کر دیا جاتا ہے مگر شاعر یا ناثر کے فکر و فن کے خدوخال نمایاں نہیں ہوتے۔

تحقیقی ادب میں جتنے کام ہوئے ہیں ان میں اصناف ادب کا دوسرا نمبر ہے۔ مغرب کی روشنی میں ہمیں ادبی و غیر ادبی ساخت اور ان کی قدر و قیمت کے تصور کا اندازہ ہوا۔ اُردو تنقید جس روایتی ڈگر پر چل رہی تھی اس میں تبدیلی آئی۔ یہ مقالے تحقیقی ہی نہیں بلکہ ان میں تنقیدی شعور ضوفشاں ہے۔

پھر مراکز علم و ادب پر بے شمار مقالے لکھے گئے۔ ان مقالوں کے ذریعے ملک کے وہ منتشر علاقے سامنے آگئے جن کا اُردو زبان کی ترویج و اشاعت میں

اہم حصہ رہا ہے۔ سب سے کم لسانیاتی مقالے لکھے گئے۔ یہ تفاوت اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارے ہاں شخصیت پرستی اور واقعاتی ریسرچ کا رجحان تیز ہے۔

یہ آزادی کے بعد اُردو تحقیق کی رفتار اور سمت کا مختصر خاکہ ہے۔ یقین ہے کہ میری کم نظری کے باعث کچھ اہم کاموں کا تذکرہ نظر انداز ہو گیا ہو گا تاہم اس عرصے میں اُردو میں تحقیق کی جو کاوشیں ہمارے سامنے آئی ہیں وہ نہ صرف اطمینان بخش ہیں بلکہ تحقیق کا یہ پھیلاؤ امید افزا بھی ہے۔ ساقط المعیار کاموں کے انبار میں معیاری کارناموں کی تعداد کم ضرور ہے لیکن قابلِ قدر ہے۔ محققین اور تحقیقی ادارے اپنے محدود وسائل کے باوجود اُردو کے تحقیقی اور ادبی سرمائے میں قابلِ قدر اضافہ کر رہے ہیں اور بعض ایسے منصوبے عمل میں آئے ہیں جو عملی اور تحقیقی لحاظ سے مثالی اور وقیع ہیں۔

''اُردو میں اصولِ تحقیق'' کی جلد دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں ادبی تحقیق، اصول اور طریق کار اور دوسرا حصہ تحقیقات کے جائزے پر مشتمل ہے جس میں ہندو پاک کے اُردو زبان و ادب کے نامور علماء اور محققین کی گراں قدر نگارشات شامل ہیں۔ ان میں کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی مقام پر موضوعات اور مسائل کا توارد اور تکرار ملتی ہے۔ تاہم حتی الامکان یہ کوشش کی ہے کہ اس مجموعے میں ایسے مقالات پیش کیے جائیں جو آج سے پہلے کسی ایک مجموعے میں ایک مقام پر یکجا نہ ہوئے ہوں۔

آخر میں میں ان علماء اور محققین کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جنھوں نے ازراہِ ادب نوازی اپنے گراں قدر مقالات کو اس مجموعے میں شامل کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

❖❖❖❖

حواشی

(۱) ہندو پاک کے محققین کے کارناموں کے سلسلے میں ڈاکٹر گیان چند کے مضمون، ڈاکٹر خلیق انجم کی فہرست، ڈاکٹر معین الدین عقیل کے مضمون اور ڈاکٹر معین الرحمٰن کی تحقیق سے استفادہ کیا گیا ہے۔

(۲) اردو تحقیق آزادی کے بعد، پروفیسر گیان چند جین، مشمولہ ادبی اور لسانی تحقیق اصول اور طریقہ کار، مرتبہ عبدالستار دلوی، بمبئی یونیورسٹی، بمبئی، ۱۹۸۴ء

❖❖❖❖

اصولِ تحقیق

قاضی عبدالودود

اصولِ تحقیق پر کوئی باقاعدہ مقالہ لکھنا مدِنظر نہیں۔ چند سرسری باتیں جس ترتیب سے ذہن میں آئیں قلم بند کردی جائیں گی۔ یہ بھی واضح کردوں کہ میں اس وقت وطن سے باہر ہوں اور بہت کم کتابیں میرے پاس ہیں۔ مجھے بڑی حد تک حافظے پر بھروسا کرنا پڑے گا۔ اس کے لیے میں ناظرین سے عذرخواہ ہوں۔

۱۔ تحقیق کسی امر کو اس کی اصلی شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے۔ کوشش کا لفظ ارادتاً مستعمل ہوا ہے، وجہ یہ کہ دیکھنا اور دیکھنے کی کوشش ایک نہیں۔ کوشش کامیاب بھی ہوتی ہے اور ناکام بھی۔ ناکامی کبھی جزوی ہوتی ہے کبھی کلی۔ ایک امریکی مصنف نے مسٹریل کی طرف یہ قول منسوب کیا ہے کہ خارجی حقیقت (Objective Reality) کا وجود نہیں۔ مجھے اس سے انکار ہے۔ یہ حقیقت موجود ہے، یہ دوسری بات ہے کہ ہمارے پاس اس کے دریافت کرنے کے ناکمل ذرائع ہوں۔

۲۔ موضوعِ تحقیق کے انتخاب میں اپنی صلاحیتوں کا لحاظ ضروری ہے اور یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ جس سامان کی حاجت ہوگی اس کی فراہمی لکھنے والے کے لیے ممکن ہے یا نہیں۔

۳۔ بعض موضوعات ایسے ہیں کہ ان پر آزادی سے کچھ لکھنا ضرر رساں ہوسکتا ہے۔ اگر اس کے لیے آمادہ نہیں تو ایسے موضوع پر قلم اٹھانا مناسب ہے۔ کسی کے لیے یہ نہایت نازیبا بات ہے کہ اسے خوف راست گفتاری سے باز رکھے۔

۴۔ ہر بات یکساں اہمیت نہیں رکھتی لیکن بات اہم ہو یا غیر اہم، محقق کو حقِ تحقیق ادا کرنا چاہیے۔ بعض اوقات کوئی بات جو محض جزئی معلوم ہوتی ہے، معمولی اہمیت اختیار کرلیتی ہے۔ مزید یہ کہ اگر بے احتیاطی عادت بن گئی تو ان امور میں بھی جو خود لکھنے والے کی نظر میں اہم ہیں اس سے گریز نہیں۔ جونسن کا قول ہے کہ معاملہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو اس کی تفاصیل کے بیان میں حقیقت سے جزوی انحراف بھی روا نہیں۔ بچوں کو اس کا خوگر بنانا چاہیے مگر بہت احتیاط سے کام لیں۔ مثلاً یہ کہ کوئی امر اگر ایک کھڑکی کے پاس ظہور میں آیا ہے اور بچہ یہ کہے کہ دوسری کے پاس ہوا تو اسے فوراً ٹوکنا چاہیے۔ پتا نہیں حقیقت سے تجاوز کہاں پہنچادے۔ قائم کے نام سے بحث کرتے ہوئے ایک کرم فرمانے لکھا کہ اس کا کوئی خاص نام اگر نہ ہوا تو اس سے قیامت نہ ٹوٹ پڑے گی، یہ بالکل صحیح ہے لیکن قیامت تو قائم پیدا نہ ہوتے یا ہوتے ہی مرجاتے جب بھی نہ ٹوٹتی۔

۵۔ محقق کو خطابت سے احتراز واجب ہے اور استعارہ و تشبیہ کا استعمال صرف توضیح کے لیے کرنا چاہیے، آرائش گفتار کی غرض سے نہیں۔ اسماء کے ساتھ صفات اسی وقت لانے چاہئیں جب کوئی صفت لکھنے والے کی اصل رائے کو ظاہر کرتی ہو۔ تناقض و تضاد اور ضعفِ استدلال سے بچنا چاہیے اور مبالغہ کو تحقیق کے لیے سم قاتل سمجھنا چاہیے۔ تحقیق کا مطمع نظر یہ ہونا چاہیے کہ کم سے کم الفاظ میں پڑھنے والے پر اپنا مافی الضمیر ظاہر کردے۔ یہ غلط ہی کیوں نہ ہو لیکن اسلوب بیان ایسا ہو کہ شبہے کی گنجائش نہ رہے۔ اس سلسلے میں ناظرین سے روبرٹ گریوز اور ایلن ہوج کی کتاب ''دی ریڈر اوور یور شولڈر'' کے مطالعے کی سفارش کروں گا۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

(الف): شبلی کی جو کتاب عالمگیر پر ہے اس کا آغاز اس جملے سے ہوتا ہے: فلسفہ تاریخ کا ایک راز ہے کہ جو بات جتنی مشہور ہوتی ہے، اتنی ہی غلط ہوتی ہے۔ یہ صریحاً غلط ہے اور شبلی یہ کہنا چاہتے ہوں گے کہ شہرت صحت کی ضامن نہیں۔

(ب): محمد حسین آزاد آبِ حیات کے ترجمہ مظہر میں اُردو لکھتے لکھتے یکایک فارسی پر اتر آتے ہیں جس سے پڑھنے والے کو یہ گمان ہوتا ہے کہ فارسی عبارت کہیں سے نقل ہوئی ہے، حالانکہ وہ خود انھیں کی زائیدہ فکر ہے۔ اس سے قطع نظر فرماتے ہیں کہ ''قاتل صبیح و ملیح بود'' کوئی شخص یک وقت صبیح و ملیح نہیں ہوسکتا اور یہ اس کا محل نہیں کہ ملیح خوبصورت کے معنی میں آسکے۔

(ج): یہی بزرگ دبیر کے حال میں ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ''خاندان کے بارے میں نہ یقین ہے نہ شک''۔ اگر یقین نہیں تو شک ہونا لازم ہے۔

(د): بحث یہ ہے کہ اسدی نے لغت لکھی تھی یا نہیں۔ غالب فرماتے ہیں: ''اگر اسدی طوسی نے فرہنگ لکھی ہوتی تو محمود غزنوی کے عصر سے آج تک

سب فرہنگ نگاروں کا مآخذ وہی ہوتا اور اختلاف لفظ و معنی کسی لغت میں راہ نہ پاتا۔ لیس ملیس، (تیغ تیز طبع ۲ ص ۲۶۸) اس سے قطع نظر کہ فرہنگ مذکور محمود غزنوی کے بعد کی تالیف ہے وہ ایک مختصر سی کتاب ہے جس میں خاص خاص لغات درج ہیں اور عموماً حرکات و سکنات سے بحث نہیں ہوئی۔ اگر جامع فرہنگ بھی ہوتی اور اس میں نہج جدید کے مطابق فرہنگ نگاری کا حق ادا کیا گیا ہوتا جب بھی الفاظ کی شکل و معنی میں اختلاف بعد کو پیدا ہو سکتے تھے۔ میں نے اس معاملے میں طویل تر بحث ''غالب بہ حیثیت محقق''، طبع ثانی میں کی ہے۔ اس کی طرف رجوع کیا جائے۔

(ہ): ''امیر تخلص نام محمد یار خاں بن محمد علی خاں روہیلہ'' یہ عبارت گلشن ہند مؤلفہ حیدری کی ہے۔ اس کے مرتب ڈاکٹر مختار الدین احمد نے اس پر حاشیہ لکھا ہے: ''صحیح نام علی محمد خاں ہے۔ سال وفات بعد از ۱۱۸۸ھ۔ صفحہ ۳۰'' پڑھنے والا اگر اس نتیجے پر پہنچے کہ مرتب نے علی محمد خاں کا سال وفات دیا ہے تو وہ بالکل حق بجانب ہے۔ مگر یقین ہے کہ مرتب نے امیر کا سنِ رحلت بتایا ہے۔ باپ کا انتقال ۱۱۸۸ھ سے کم و بیش ۳۰ سال قبل ہوا تھا۔ خود امیر کا بھی سال وفات یہ ہے یا اس سے کسی قدر مختلف، اس کے متعلق کتابوں کی طرف رجوع کیے بغیر کچھ کہنے سے قاصر ہوں۔

(و): ''لکھنؤ سے چند میل کے فاصلہ پر علماء، فضلا کا ایک بہت بڑا مرکز کاکوری رہا ہے''۔ (تحریر شمارہ ا۔ ص ۱۲۹) بہت بڑا محض برائے آرائش ہے، صرف مرکز لکھنا تھا۔

(ز): تحریر ص ۱۳۰ میں ساحر کاکوری کے مشہور اور قابل شاگردوں کے جو نام دیے ہیں، ان میں اصحاب ذیل بھی ہیں: مومن علی خاں مفتون، محی الدین خاں ذوق، حیدر بیگ کاکوری۔ یہ مسلم ہے کہ بعض باتوں میں ان کے نام آئے ہیں مگر اس کی بنا پر انھیں مشہور کہنا اس لفظ کا سوا استعمال ہے۔

(ح): آب حیات میں ایک جگہ یہ مرقوم ہے کہ ضاحک بقول صاحب ''گلزار ابراہیم'' ۱۱۹۶ھ میں زندہ تھے اور دوسری جگہ بقول اس کے کہ قول مذکور کی طرف اشارہ بھی ہو، بے تکلف لکھا گیا ہے کہ سودا ان کی موت کے بعد زندہ تھے۔ یہ آزاد کے مسلمات میں سے ہے کہ سودا ۱۱۹۵ھ میں فوت ہوئے اور یہ صحیح بھی ہے۔

(ط): غالب بہ مستثنائے خسرو کسی ہندوستانی فارسی گو کو نہیں مانتے اور کسی کی فارسی دانی کے قائل نہیں لیکن تیغ تیز کے آخر میں جو سوالات ہیں ان کے جوابات کے طالب ہندوستانیوں سے ہیں۔ جواب شیفتہ نے دیے ہیں اور حالی وغیرہ وسعادت علی نے ان کی تصدیق کی ہے۔ پہلے تین شخص خود غالب کے شاگرد اور چوتھے آج بالکل گمنام ہیں اور ان کی فارسی دانی کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔ اس میں جو معنوی تناقض ہیں اس پر غالب کی نظر نہیں پڑی۔

۶۔ اگر کوئی کتاب مصنف کی زندگی میں ایک بار سے زائد چھپی ہو تو اس کی صحیح شکل وہ ہے جو آخری بار چھپی ہے، بشرطیکہ اس میں اگر تغیرات ہوئے ہیں تو اس کا ذمے دار خود مصنف ہو۔ کسی دوسرے شخص کے لیے مناسب نہیں کہ اس کتاب کی رد کردہ اشاعتوں کے اقتباسات بطور سند پیش کرے۔ کتاب کا مفصل حال بیان کرنا اور اس کی مختلف اشاعتوں سے بحث ہو تو یہ اور بات ہے۔ میرے ایک کرم فرما نے میری توجہ اس طرف منعطف کرائی ہے کہ میں نے معاصرین فضلی کی کربل کتھا کے بارے میں جو گارساں دتاسی کی تاریخ ادبیات ہندوی اور ہندوستانی کے حوالے سے جو ایک بات لکھی تھی وہ خواجہ احمد فاروقی کے بیان کے بموجب اس میں بالکل مختلف طور پر ہے۔ اس کتاب کی دو اشاعتیں ہیں اور میرا مآخذ اشاعت ثانی ہے۔ مگر مضمون کے پیش نظر نہ ہونے کی وجہ سے میں یہ نہیں بتا سکتا کہ صراحتاً یہ مذکور ہے یا نہیں۔ میں دونوں اشاعتوں کے اختلافات سے متعلق ایک مقالے میں بحث کر چکا ہوں اور خود ڈاکٹر فاروقی کی فرمائش پر دلی کالج اُردو میگزین کے لیے میں نے ''کریم الدین اور گارساں دتاسی'' کے عنوان سے جو مقالہ تحریر کیا تھا اس میں اس کتاب کی جلد ثالث کا حوالہ بھی ہے جو صرف اشاعت ثانی میں ہے۔ میں نے اپنے کرم فرما کو دتاسی کی فرانسیسی عبارتیں بھیج دیں اور یہ لکھا کہ آپ خود دیکھ لیں کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے، صحیح ہے یا غلط۔ مجھے اب تک اس کا موقع نہیں ملا کہ اشاعت کی عبارت متعلقہ کو دیکھوں۔ لیکن قرائن اس پر دلالت کرتے ہیں کہ انھیں کسی شخص نے اُس کا ترجمہ دیا ہے اور وہ اسی کی بنا پر معترض ہوئے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھ سے انھیں یہ توقع کیوں تھی کہ میں اشاعت ثانی کو چھوڑ کر اشاعت اول کے مطالب پیش کروں گا۔

۷۔ کتابوں کے قلمی نسخوں میں بڑے شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ شاہنامہ فردوسی کے بعض نسخوں میں ''گرشاسب نامہ اسدی'' کل نہیں تو اس کا معتد بہ حصہ داخل ہو گیا ہے۔ ایسے نسخے بھی موجود ہیں جن میں برزونامہ کے ہزاروں شعر شامل ہیں۔ یہ تو الحاقی کلام ہے۔ اشعار کا متن بھی مختلف نسخوں میں اس قدر متفاوت ہے کہ کسی نے مبالغے کے ساتھ یہ کہا ہے کہ کسی شعر کے متعلق یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا وہ اپنی اصل شکل میں ہے۔ کاتبوں نے اشعار کو اپنے عہد کی زبان کے مطابق بنانے کی کوشش کی ہے اور اپنے مذہبی عقائد بھی اس کے سر تھوپے ہیں۔ کلیات انوری طبع ہند میں ایک ہندوستانی شاعر کے قصائد داخل ہو گئے ہیں۔ اس کے بعض اشعار اس کے ہندوستانی ہونے پر بھی مشعر ہیں اور اس کی بنا پر الحاق کے امکان کو نظر انداز کر کے ظفر علی خاں نے انوری کے ہندوستانی ہونے کا دعویٰ کیا۔ ظہیر فاریابی کے دیوان کے جو نسخے ایران میں چھپے ہیں، الحاقی کلام سے خالی نہیں اور نول کشوری کلیات کے آخر میں جو دیوان غزلیات ہے وہ تو یک قلم بہت

بعد کے ایک شاعر ظہیر اصفہانی کا ہے۔ دیوان حافظ کے کم نسخے ہیں جن میں دوسروں کا کلام شامل نہ ہو۔ اُردو میں سودا کے کلیات مطبوعہ میں میر سوز کی سو سے زیادہ غزلیں داخل ہیں اور ناقدین کرام کلام سودا کی خصوصیات کے بیان میں بے تکلف ان سے کام لیتے رہے ہیں۔ نثر پر بھی کاتبوں کا کرم رہا ہے۔ دبستان مذاہب کے نول کشوری نسخوں میں ایک جگہ ایک عبارت ہے جس سے قبل ''فقیر آرزو می گوید'' مرقوم ہے۔ آرزو نے کسی نسخے کے حاشیے یا بین السطور میں وہ عبارت لکھ دی ہوگی۔ کاتب اسے کتاب کا جزو سمجھا۔

خود مصنف بھی (رجوع ب ٦) ردوبدل کرتا رہتا ہے۔ اس کی مستند شکل آخری شکل ہے جس کی کتابت کے بعد مصنف نے کسی قسم کا تغیر نہیں کیا۔

حاصل بحث یہ ہے کہ اس آخری شکل کی تلاش ہونی چاہیے۔ یہ نہ ملے تو اس نسخے سے کام لیا جائے جس میں الحاق کا احتمال مقابلتاً کم ہو۔

۸۔ میں نے معیار پٹنہ میں جس کا میں خود مدیر تھا، ادارہ معیار کی طرف سے کسی شخص کے اس قول پر اعتراض کیا تھا کہ محمد عابد، دل عظیم آبادی برادر محمد روشن جوشش کے باپ جسونت رائے ناگر تھے۔ اس وقت جو امور میرے پیش نظر تھے، وہ یہ تھے۔ تذکرہ میر حسن میں ولدیت کا مطلقاً ذکر نہیں۔ علی ابراہیم خاں خلیل کی ''گلزار ابراہیم'' میں دونوں بھائیوں کے نام سے قبل لفظ ''شیخ'' مرقوم ہے اور ولدیت یا دونوں کے نومسلم ہونے کی طرف اشارہ بھی نہیں۔ خلیل عظیم آبادی تو نہ تھے لیکن بہاری تھے اور عظیم آباد سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ عشقی عظیم آبادی کے تذکرے میں بھی ولدیت اور تبدیلیِ مذہب کے متعلق کچھ مرقوم نہیں اور دونوں بھائیوں یا ان میں سے ایک کے نام سے پہلے لفظ ''شیخ'' لکھا ہے۔

لطف نے وہی کہا ہے جو علی ابراہیم خاں خلیل نے کہا ہے۔ یہ بات کہ جوشش جسونت رائے ناگر کے بیٹے تھے، اس وقت تک کی معلومات کے مطابق مصحفی کے تذکرہ ہندی کے سوا کہیں اور نہ تھی اور مصحفی کی واقفیت کا یہ حال ہے کہ اس نے جوشش کا نام محمد روشن کے بجائے محمد عابد بتایا ہے۔ گلشن سخن (مؤلفہ مبتلا) کے اقتباسات ایک ماہ نامے میں نظر سے گزرے اور ان میں یہ عبارت جوشش کے متعلق ملی کہ ''احوال ایشان مفصل از بھگوت رائے، خلف جسونت رائے کے فیما بین خصوصیت باددو ستیہا است معلوم نمود'' تو خیال یہ ہوا کہ مصحفی نے جوشش کا ترجمہ اسی تذکرے میں دیکھا ہوگا، کچھ زمانے کے بعد خود لکھنے لگے تو حافظے نے دھوکا دیا اور خود جوشش کو جسونت رائے کا بیٹا بنا دیا۔ میں اب بھی سمجھتا ہوں کہ اس معاملے میں مصحفی کی شہادت قطعاً ناقابلِ قبول ہے اور نام سے پہلے لفظ ''شیخ'' کا ہونا اور ولدیت اور تبدیل مذہب کا خلیل وغیرہ کے ہاں ذکر نہ ہونا، بجا طور پر اس کے ماننے سے مانع ہوسکتا ہے کہ دل جسونت رائے ناگر کا بیٹا تھا۔ لیکن مجھے شورش وابوالحسن امراللہ کے تذکروں کی طرف رجوع کیے بغیر قطعی طور پر اس کی تردید نہ کرنی تھی۔ ان تذکروں سے دونوں بھائیوں کا ولد جسونت رائے ناگر ہونا ثابت ہے اور لطف یہ کہ خود مبتلا کے تذکرے میں یہ عبارت ہے جو اپنی اہمیت کے باوجود اقتباسات مذکور میں قلم انداز ہوگئی تھی۔ ''از فرزندان جسونت رائے ناگر است چون بحد تمیز رسید اشرف دین احمد مشرف گشت''۔ کل اہم مآخذ کی طرف رجوع کیے بغیر قطعی طور پر رائے قائم نہ کرنی چاہیے۔

۹۔ اس بحث سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ بات کتنی ہی قابلِ ذکر کیوں نہ ہو اگر کوئی مصنف اس کے بارے میں خاموش ہے تو اس سے لازماً وہ بات غلط نہیں سمجھی جائے گی۔ مزید یہ کہ اگر کسی شخص کے سامنے کوئی بات کہی جائے اور وہ شخص اس کی تردید نہ کرے تو لازماً اس کی تصدیق نہیں۔ میرے ایک دوست بمصالح شیعہ تھے۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں کسی مذہب کو نہیں مانتا حتیٰ کہ خدا کا بھی قائل نہیں۔ اسے دو چار دن گزرے تھے کہ بعض شیعی اصحاب کے سامنے انھوں نے مجھ سے اس کی تصدیق چاہی کہ وہ تبرائی شیعہ ہیں اور میں خاموش رہا۔

۱۰۔ آقائے پورداؤد نے قزوینی کی یادداشتوں کے مجموعے کا دیباچہ لکھا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں کہ قزوینی نے زبان نامے کی ترتیب وتصحیح میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔ لیکن ان کا مرتبہ نسخہ ایران پہنچا تو بہت سی غلطیاں نکالی گئیں۔ قزوینی کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے عہد کیا کہ سورہ اخلاص کی آیت بھی آئندہ نقل کرنی ہوگی تو دیکھ لوں گا کہ قرآن میں کس طرح ہے۔ ظاہراً سب یا بیشتر اغلاط کا ذمے دار ان کا حافظہ تھا۔ انھوں نے اس پر اعتماد کیا اور اس نے دھوکا دیا۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی دیوان بیان کی ترتیب میں مصروف تھے۔ میں نے انھیں لکھا کہ اس کے دو نسخے کتب خانہ انڈیا آفس لندن (آجکل دوسرا نام) میں ہیں۔ انھوں نے تفاصیل طلب کی۔ میں نے ایک کرم فرما کو زحمت دی کہ وہ اس کتب خانے کی فہرست میں دیکھ کر تفاصیل سے مطلع کریں۔ ان کا جواب آیا کہ اس فہرست میں دیوان بیان کے کسی نسخے کا ذکر نہیں۔ میں اس سے مطمئن نہیں ہوا اور میں نے ڈاکٹر مختار الدین احمد سے جو اس زمانے میں مقیم انگلستان تھے، اس کے بارے میں دریافت کیا۔ انھوں نے جواب دیا بیان تو نہیں لیکن بیدار کے دیوان کے دو نسخے وہاں ہیں۔ احمد کی پگڑی محمود کو پہنا دینا حافظے کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

میں نے اپنے ایک مضمون ''سال وفات مصحفی'' میں لکھا تھا کہ اسیر کے دیوان فارسی میں مصحفی کی وفات کا قطعہ تاریخ ہے۔ مگر جہاں تک مجھے یاد ہے یہ اضافہ

کر دیا تھا کہ یہ قول حافظے پر مبنی ہے۔ بہر حال بعد کو جب دیوان کی طرف رجوع کیا تو قطعہ مذکور اس میں نہ ملا۔

میں نے مدیر "نقوش" کی فرمائش پر نقوش کے آپ بیتی نمبر کے لیے اپنے خالات لکھے تھے اور اپنے بزرگوں کے ذکر میں حافظے پر اعتماد کیا تھا۔ مجھ سے ایک فاش غلطی یہ ہوگئی کہ میں نے نسب نامے میں ایک نام ہی چھوڑ دیا۔ میر حسن نے جو مختصر نسب نامہ دیباچہ کلیات اور تذکرہ شعرا میں دیا ہے، وہ اس باب میں متفاوت ہے کہ ایک میں ایک نام زیادہ ہے حالانکہ دونوں جگہ خاتمہ میر امامی پر ہوتا ہے۔ کسی کا ذمے دار حافظہ معلوم ہوتا ہے۔ غبار خاطر شائع کردہ ساہتیہ اکیڈمی کے حواشی نوشتہ جناب مالک رام میں دکھایا گیا ہے کہ ابوالکلام آزاد کے نقل کردہ متن بکثرت غلط ہیں۔ ظاہر ہے کہ حافظے نے دھوکا دیا۔ اسی کتاب میں مرقوم ہے: مظہر اور درد فن موسیقی کے ایسے ماہر تھے کہ وقت کے بڑے بڑے کلاونت اپنی چیزیں بغرض اصلاح پیش کرتے اور ان کے سر کی ایک ہلکی سی جنبش کو بھی اپنے کمال فن کی سند تصور کرتے۔ (ص ۲۷۲)

درد کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں، اس سے اس وقت بحث نہیں۔ مظہر کی مہارت موسیقی کا ذکر غبار خاطر کے سوا کہیں اور میری نظر سے نہیں گزرا۔ وہ بات جو صرف ایک کے متعلق کسی حد تک صحیح تھی وہ حافظے نے دو پر چسپاں کر دی۔ درد و مظہر میں شاعری اور درویشی مشترک تھیں۔ حافظے نے ایک اور امر میں اشتراک پیدا کر دیا۔

نوائے کیمبرج نام کا ایک اُردو رسالہ کیمبرج سے نکلا تھا اور مسٹر بشیر حسین زیدی اس کے بانیوں میں تھے۔ میں ۱۹۲۳ء میں کیمبرج پہنچا تو اس وقت تک اس کے دو شمارے شائع ہو چکے تھے۔ زیدی صاحب سے اس کے متعلق گفتگو ہوئی تو یہ معلوم ہوا کہ تیسرے کی فکر ہے۔ اس کے چند ماہ بعد وہ ہندوستان واپس آ گئے اور نوائے کیمبرج بند ہو گیا۔ مدتوں بعد مجھے اس کا شمارہ اول ملا اور میں نے اس پر ایک مضمون لکھا جس میں زیدی صاحب کے ایک مضمون کا طویل اقتباس شامل تھا۔ یہ مضمون ان کی نظر سے گزرا اور اس کے بعد میری ان کی بات چیت بھی ہوئی۔ اس وقت تو نہیں لیکن بعد کو نہ جانے کس طرح وہ مجھے اپنے ساتھ اس رسالے کے بانیوں میں سمجھنے لگے۔ میں نے اس کی تردید کر دی لیکن لاحاصل۔ ابھی چند روز ہوئے اس کا ذکر آیا تو انھوں نے پھر وہی بات کہی۔ ظاہر ہے کہ یہ حافظے کا دھوکا ہے۔

۱۱۔ حافظہ دھوکا دیتا ہے لیکن کسی حد تک اس پر بھروسا کیے بغیر چارہ نہیں ورنہ آپ کو اپنا نام بتاتے وقت اپنا شناختی کارڈ جس پر آپ کا عکس بھی ہو، دیکھ لینا پڑے گا۔

سوال یہ ہے کب بھروسا کیا جائے اور کب نہیں۔ اس کا اطمینان بخش جواب مجھے معلوم نہیں۔ دو باتیں اس سلسلے میں البتہ کہہ سکتا ہوں۔ ایک یہ کہ ہر شخص کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا حافظہ کن معاملات میں قوی اور کن معاملات میں ضعیف ہے۔ مجھے سینکڑوں سنین جن کا تعلق ادب اُردو سے ہے، یاد ہیں۔ لیکن ایک کے سوا کوئی ٹیلی فون نمبر مجھے یاد نہیں اور وہ خود میرا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جن امور کے لیے حوالہ ضروری ہے وہاں بھروسا نہیں کرنا چاہیے اور کوئی بات ماخذ کی طرف رجوع کیے بغیر نہ کہی جائے۔ یہ ممکن نہ ہو تو یہ صراحت کر دی جائے کہ حافظے پر اعتماد کیا گیا ہے۔

۱۲۔ اگر کسی دوسرے کی نظم و نثر نقل کی جائے تو صحت متن کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔ اگر ایک ہی کتاب میں بلاوجہ کوئی شعر یا عبارت نثر مختلف طور پر ملے تو بہت برا معلوم ہوتا ہے۔ میر ضمیر کا ایک شعر "تحریر" کے ایک ہی مقالے میں دو طرح نظر آتا ہے۔

دس میں کہوں سو میں کہوں یہ درد ہے میرا
اس طرز میں جو کہوے سو شاگرد ہے میرا
(ص ۴۴)

دس میں کہوں سو میں کہوں یہ درد ہے میرا
اس طرز میں جو جو کہے شاگرد ہے میرا
(ص ۴۱)

دانش گاہ علی گڑھ کے شعبہ اُردو کی طرف سے تاریخ ادبیات اُردو کی جو پہلی جلد شائع ہوئی تھی اس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی تھی کہ عبارت نثر ہو یا شعر اگر ایک سے زیادہ مقام پر نقل ہوا ہے تو منشیات سے قطع نظر اختلاف متن ضروری ہے۔

۱۳۔ بعض اصحاب کو حوالوں سے چڑ ہے۔ ہماری زبان کے ایک تبصرے میں اس پر اظہار مسرت کیا گیا تھا کہ کتاب حوالوں سے گرانبار نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہر بیان کے لیے حوالوں کی ضرورت نہیں۔ مثلاً یہ بتائیں کہ برطانیہ کی راجدھانی لندن ہے یا یہ کہیں کہ چند سال قبل پاکستان و ہندوستان میں لڑائی ہوئی تھی اور سند میں کسی

کتاب کا حوالہ دیں تو یہ مضحکہ خیز فعل ہوگا لیکن اگر آپ کوئی نئی بات کہیں تو مآخذ کا ذکر ضروری ہے۔

تحقیقی مقالات میں ایسے امور معروف سے جو موضوع سے تعلق نہیں رکھتے اور جن کا ذکر مجملاً آ گیا ہے، ہر دعوے کی سند لازم نہیں۔ مثلاً یہ کہ آپ غالب کے حالاتِ زندگی پر مفصل تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں تو نام ولدیت، جائے پیدائش جیسی معمولی باتوں کی سند دینی ضروری ہے۔ بعض اصحاب ان امور کی تو سند دیتے ہیں لیکن نئی باتیں حوالے کے بغیر لکھنے میں انھیں قباحت نظر نہیں آتی۔ اس پر اعتراض کر چکا ہوں لیکن لوگ اب بھی اس سے باز نہیں آتے۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد نے وفا کے بارے میں کچھ باتیں سند کے ساتھ لکھنے کے بعد یہ بات بدون حوالہ بتائی ہے کہ وہ ۱۱۹۲ھ میں فوت ہوا تھا (گلشن ہند۔ ص ۹۶) کم از کم میرے علم میں تو اس کی کوئی سند نہیں۔ ان کے علم میں ہے تو اسے قلم انداز نہ کرنا تھا۔

۱۴۔ معاصرانہ شہادت کی بڑی اہمیت ہے لیکن معاصرین بھی غلطیاں کر سکتے ہیں۔

(الف) دہلی سے ایک رسالہ ''ہما'' نکلتا ہے۔ اس کے ایک شمارے میں مرقوم ہے:

''جناب ڈاکٹر ذاکر حسین جس زمانے میں دانش گاہ برلن کے متعلم تھے، ایک استاد سے ٹکرا گئے۔ اس کی زبان سے صرف ایک لفظ ''گدھا'' کو سن کر موصوف نے (ان کی مدّعا کے خلاف اس کا یہ غلط مطلب لیا کہ وہ اپنا تعارف کرا رہا ہے اور گدھا اس کا نام ہے) فوراً کہا ''ذاکر حسین'' وہ بہت خوش ہوا اور ان کا دوست بن گیا'' مسٹر نور الدین احمد مجھ سے کہنے لگے کہ میں نے موصوف سے اس کے متعلق دریافت کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ یہ جرمنی کا ایک پرانا لطیفہ ہے، میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

(ب) ڈاکٹر مختار الدین احمد نے پٹنہ کی ادبی صحبتوں پر مقالہ نقوش میں تحریر کیا تھا۔ اس میں جناب شاہ محمد حسن نے بسمل کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ داغ کے شاگرد تھے۔ ان سے ان کی ملاقات ہوگی اور مشاعروں میں بھی دیکھا ہوگا لیکن وہ نظر تو نہیں آتے کہ داغ کے شاگرد سمجھے جا سکیں۔ وہ میرے رشتہ دار ہیں اور کسی زمانے میں ہم محلہ بھی تھے۔ داغ کی وفات کے وقت وہ چار سال کے ہوں گے۔ استادی شاگردی کا کیا سوال ہے۔ قیس مرحوم نے شاد عظیم آبادی پر جو کتاب لکھی ہے اس میں انھوں نے شاگرد شاد بتایا ہے اور یہی صحیح ہے۔

(ج) اسی دوران میں شاہ ولی الرحمٰن ولی مرحوم کی نسبت لکھا ہے کہ اختتام ملازمت کے بعد اپنے وطن کاکوری میں مقیم ہیں۔ وقت اشاعت سے دو تین سال قبل ان کی وفات ہو چکی تھی اور اختتام ملازمت سے بہت قبل وہ پٹنہ میں توطن گزیں ہو گئے تھے۔

(د) اس مضمون میں شیدا شاگرد شاد کو مادرزاد اندھا لکھا گیا ہے۔ آخر میں اندھے ہو گئے ہوں گے، ہرگز مادرزاد اندھے نہ تھے۔

(ہ) انھوں نے میرے متعلق جو مضمون نقوش میں لکھا ہے، اس میں بکثرت غلط باتیں درج ہیں۔ ان میں سے بعض کی تردید کر چکا ہوں۔

(و) دبدبہ امیری میں جو پٹنہ میں لکھی گئی ہے ریاض احسن خاں خیال کو جو اس کی اشاعت کے وقت زندہ اور مقیم پٹنہ تھے، مرحوم کہا ہے اور شاگرد امیر بتایا ہے۔ وہ خود مجھ سے کہتے تھے کہ میں امیر نہیں، داغ کا شاگرد ہوں۔ واضح رہے کہ وہ کسی طرح غیر معروف نہ تھے اور مختلف طبقات کے بکثرت اصحاب ان سے واقف تھے لیکن مصنف دبدبہ امیری سے عظیم آبادی ہونے کے باوجود ان کے بارے میں فاش غلطیاں سرزد ہوئیں۔

(ز) کہا جاتا ہے کہ گھر والے گھر کا حال بہتر جانتے ہیں مگر کچھ ضروری نہیں کہ وہ اپنے یا اپنے بزرگوں کے متعلق جو کچھ لکھیں وہ صحیح ہو۔ غالب اپنے کو ترک ایبک کہتے ہیں لیکن ایبک ترکوں کی کوئی قسم ہی نہیں۔ شاد عظیم آبادی نے اپنا سلسلۂ نسب حسین فیروزی شاہ شیراز معاصر حافظ سے ملایا ہے۔ اس نام کا کوئی بادشاہ نہیں گزرا۔ وہ ذاتی اور خاندانی آوازہ گری میں کہاں تک جا سکتے ہیں اس کا اندازہ ان اصحاب کو ہوگا جنھوں نے میری کتاب اشتر وسوزن دیکھی ہے۔ ایک بزرگ کے متعلق ان کے بیٹے نے لکھا ہے کہ انھوں نے ۱۵ جلدوں میں ایک کتاب تصنیف کی تھی جس کی بدولت وہ عالم اسلامی میں مشہور ہو گئے۔ شہرت اگر اس کا نام ہے کہ بیٹا ان سے واقف ہو تو اور بات ہے، ورنہ یہ بات کسی اور نے نہ دیکھی ہے اور نہ کسی شخص نے جو ناقل شخص نہیں، اس کا ذکر کیا ہے۔

۱۵۔ غالب نے قاطع برہان طبع ثانی میں لفظ آتش کے مفتوح التا ہونے کی سند میں ایک رباعی اور چار فردیات پیش کیے ہیں۔ رباعی کے آخر میں آتشی بطور قافیہ آیا ہے اور اس بیت اول کی قوافی شیردسی اور اعصا کشی ہیں۔ افراد میں سے ایک مصرع آخر یہ ہے ''ولیکن ولم از تو در آتش است'' مصرع اول کا قافیہ خوش ہے، ایک اور فرد کی ردیف است ہے اور قوافی آتش و ہیزم کش۔ باقی دو میں سے ایک کے قوافی عمکشی اور آتشی اور دوسرے کے ملکوش اور آتش ہیں (قاطع برہان مرتبہ راقم۔ ص ۱۶) فرد آخر کے علاوہ کوئی بیت فتحہ تا کی سند نہیں ہو سکتی۔ وجہ یہ ہے کہ ادبیات میں صرف ردی ش متحرک ہو کر حرف وصل سے مل گیا ہے اور یہ فن قوافی کی مسلمات سے ہے کہ اس صورت میں حرف ماقبل ردی کی حرکت وہ حرکت نہیں جس کی تکرار واجب ہے۔ غالب نے گرفت کے فتحہ را کے ثبوت میں ایک ایسا

شعر بھی دیا ہے جس میں گرفتہ رفتہ کا قافیہ آیا ہے۔ اس میں بھی ت (حرف ردی) حرف وصل سے مل کر متحرک ہو گئی ہے اور اس شعر سے یہ بات ثابت کرنے میں مدد مل نہیں سکتی کہ حرف ماقبل ردی یعنی ر کی حرکت کیا ہے (قاطع برہان۔ ص ۱۶۷) ہدایت صاحب مجمع الفصحا سے بھی اس قسم کی غلطی سرزد ہوئی ہے اور میں نے اپنے کسی مضمون میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ محققین کے لیے فن قافیہ سے واقفیت ضروری ہے۔

۱۶۔ غالب نے ''تیغ تیز'' میں جو آغا احمد علی کی ''موید برہان'' کا رد ہے، لکھا ہے کہ یہ مصرع استاد کا جو حضرت نے لکھا ہے اس کا وزن آپ سے پوچھتا ہوں۔ جس طرح حکم ہو اس طرح پڑھوں۔ جانتا ہوں کہ کاپی نگار کی شامت آئے گی اور غلطی اس سے منسوب ہو جائے گی لیکن مجھے مدرس صاحب سے استفادہ منظور ہے۔ مصرع یہ ہے اور مدرس صاحب اس کو استاد فرخی کا بتاتے ہیں: ''چشم مخالفاں بپازن''۔ (منیر طبع ۲۔ مرتبہ راقم۔ ص ۲۷۴)

آغا نے ''شمشیر تیز تر'' میں مصرع زیر بحث کی موزونی ثابت کی ہے اور میں نے ایک مضمون میں جسے ڈھاکہ کے ایک ماہنامے نے شائع کیا تھا، دکھایا تھا کہ اس کا وزن آج کل نامانوس سہی لیکن کتب عروض میں بکثرت اشعار ایسے ہیں جو عروضیوں کے نزدیک قطعاً صحیح ہیں لیکن ہمارے کانوں کو ناخوش گوار معلوم ہوتے ہیں۔

جناب ڈاکٹر ذاکر حسین ایک مشہور نقاد و محقق کے متعلق فرماتے تھے کہ ایک صحبت میں شعر پڑھے جا رہے تھے اور وہ شعر کی تکرار کرتے تھے لیکن موزوں اشعار کو ناموزوں کر دیا کرتے تھے۔ یاس ٹونکی مرحوم کی نوبت آئی تو انھوں نے ان سے کہا کہ آپ مجھ پر کرم فرمائیں اور میرے اشعار کی تکرار نہ کریں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں اس زمانے میں کم سن تھے لیکن مجھ سے کہتے تھے کہ میں بھی اس صحبت میں موجود تھا۔ ان بزرگ کی مرتبہ کتابوں میں ناموزوں اشعار بہت کثرت کے ساتھ ہیں اور ان سے متعلق مطلقاً (مستثنیات سے قطع نظر) یہ صراحت نہیں کہ غلط ہیں۔ تحریر کے شمارہ اول میں متعدد اشعار ناموزوں ہیں اور ان کے غلط ہونے کی طرف اشارہ نہیں ہے۔ مثلاً

گو کہ تو میر سے ہوا بہتر مصحفی پھر میر ہی ہے

از سر درد مصحفی نے کہا حق میں اس کے تا ہوا نظیری آج

(ص ۸۹)

آمد بزبان مصرعہ تاریخ وفاتش داماں زجہاں چیدہ سوئے دار جناں رفت ۱۲۲۔ ناموزوں شعر نقل ہو تو یہ صراحت ضرور کر دی جائے کہ اس میں سقم ہے ورنہ پڑھنے والا اگر یہ سمجھے کہ ناقل کے نزدیک شعر میں کوئی عیب نہیں تو یہ اس کا قصور نہ ہوگا۔ وہ اصحاب جو موزوں اور ناموزوں میں تمیز نہیں کر سکتے، دواوین وغیرہ کی ترتیب کا کام اپنے ذمے نہ لیں۔ دنیا میں اور بھی بہت سے کام ہیں۔ ایک نہ ہو سکا تو کیا ہوا۔

۱۷۔ فنون ادبیہ کے مصطلحات سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ غالب عمر بھر یہ سمجھتے رہے کہ تقریظ خاتمہ کتاب کو کہتے ہیں، خواہ وہ خود مصنف ہی کے قلم سے کیوں نہ ہو۔ چنانچہ قاطع برہان طبع اول کے خاتمہ کو جو خود ان کا لکھا ہوا ہے، انھوں نے تقریظ کہا ہے اور ''باغ دودر'' میں بھی اسے اسی نام سے یاد کیا ہے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ اپنے کسی خط میں غالب نے تقریظ کو خاتمہ کتاب کہا ہے۔

۱۸۔ فن تاریخ گوئی کے قواعد سے واقفیت ضروری ہے۔ اس سلسلے میں امر ذیل کی طرف پڑھنے والوں کی توجہ منعطف کرائی جاتی ہے۔

(الف) سنین صرف ہجری، عیسوی اور فصلی نہیں اور بھی ہیں۔ یہ دیکھنا چاہیے کہ تاریخ گو نے کس سے کام لیا ہے۔

(ب) حروف ابجد کے اعداد مشہور (الف ۔۱، ب ۔۲، تا غ ۔۱۰۰۰) کے علاوہ اور بھی اعداد ہیں۔ مثلاً ایک قاعدے کے مطابق ہر حرف کا عدد وہ ہے جو ان حروف کے اعداد کا مجموعہ ہے جن سے وہ بنتا ہے۔ اس طرف الف ا نہیں، ۱۳۱ ہے۔

(ج) معمولی قاعدے کے مطابق بھی اختلاف ہیں۔ مثلاً یہ کہ عربی ''تا'' کے کس صورت میں ۴۰۰ لیے جائیں اور کس صورت اسے ۵ سمجھ کر صرف پانچ۔ ہمزے کے متعلق بعض اصحاب کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انشا وغیرہ عربی الفاظ کے آخر میں جو ہمزہ ہے اس کا عدد ایک ہے اور اس کی بنا پر ایک کتاب میں جو انشاء اللہ خاں انشا سے متعلق ہے۔ مجھ پر اعتراض بھی ہوا ہے۔ یہ ہمزہ بالکل حساب میں نہیں آتا۔

(د) تاریخ گو کن قواعد و املا کا پابند ہے اس کا خیال ضروری ہے۔ حافظ نے مادہ تاریخ میں ''امید'' کو ''امیذ'' (ذال معجمہ کے ساتھ۔ پرانے قاعدے کے مطابق) لکھ کر اسے ۷۵۱ قرار دیا ہے۔ بعض ایرانی کتابوں میں ''امیذ'' بھی ہے۔ یہ لفظ تاریخ گو نے واو کے ساتھ لکھا ہے تو ۷۵۱ میں ۶ کا اضافہ ہو جائے گا۔ اُردو کا قدیم املا یہ بتاتا ہے کہ ہندوستانی الفاظ اس، ان وغیرہ میں اظہار ضمہ کے لیے الف کے بعد واو آئے گا۔ اگر کسی پرانے تاریخ گو کا مادہ تاریخ جس میں اس طرح کا کوئی لفظ ہے، جدید املا کے مطابق بدون واو نقل ہوا ہے تو ۶ کا فرق ہو جائے گا۔

(ہ) تاریخ گو تعمیہ داخلی و خارجی سے اکثر کام لیتے ہیں۔ بعض اوقات ہنر نمائی کے لیے عجیب عجیب طریقے اختیار کرتے ہیں۔ سودا نے حافظ الملک رحمت خاں کے جنگ میں مقتول ہونے کی تاریخ یوں کہی ہے: ''حافظ نے سر دیا نہ دیا زر''۔ اسباب جنگ میں دشمن کی طرف سے مطالبہ زر بھی تھا اور یہ بھی کہ واقعہ ۱۱۸۸ھ کا۔ ورنہ بہت کم لوگوں کا ذہن عدد مطلوب کی طرف جا سکتا ہے۔ حافظ ۹۸۹ ہے۔ اس پر زر کا عدد ۲۰۷ بڑھایا جائے تو ۱۱۹۶ ہو جاتا ہے۔ اس میں سر حافظ یعنی ح کا ۸ نکالا جائے گا تو ۱۱۸۸ بچ جاتا ہے۔

(و) بعض تاریخ گو عدد مطلوب صرف بعض الفاظ سے نکالتے ہیں لیکن ظاہر میں ایسا ہوتا ہے کہ پورا مصرع مادہ تاریخ ہے۔ یہ عیب ہے۔ بعض اصحاب کا خیال ہے کہ ایک کا فرق ہو تو مضائقہ نہیں، تعمیہ ممکن ہے تو اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔

(ز) مادہ تاریخ کے ساتھ سن مطلوب درج بھی ہو تو اس پر اعتبار کرنا ٹھیک نہیں۔ بطور خود حساب کرنا چاہیے کہ مادے سے عدد مطلوب نکلتا بھی ہے یا نہیں۔

❖❖❖❖

---

(۱) اصولِ تحقیق، قاضی عبدالودود، آج کل، نئی دہلی، اگست ۱۹۶۷ء (اُردو تحقیق نمبر)، ص ۵ تا ۱۰۔

تحقیق اوراس کا طریقِ کار

ڈاکٹر عندلیب شادانی

ہواخواہانِ اُردو کے لیے یہ امر یقیناً اطمینان و مسرت کا باعث ہے کہ پاکستان[1] کے وجود میں آنے کے بعد ناساز گار حالات کے باوجود اُردو ادب کے مختلف شعبوں میں تحقیق کا کام نہایت سرگرمی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ پچھلے بائیس سال کی قلیل مدت میں تحقیقی مقالات کی ایک معقول تعداد وجود میں آچکی ہے اور دنیائے ادب کے بہت سے تاریک گوشے تحقیق کی روشنی میں جگمگا اٹھے ہیں۔

اگرچہ تحقیق اور مقالہ یہ دونوں لفظ ہماری زبان میں قدیم الایام سے رائج چلے آتے ہیں لیکن ہمارے زمانے میں انھوں نے ایک ادبی اصطلاح کی حیثیت اختیار کرلی ہے اور اب اپنے قدیم معنی کے علاوہ ایک نئے مفہوم کے حامل ہیں۔ تحقیق دراصل ریسرچ کا اور مقالہ تھیسس کا ترجمہ ہے اور یہ دونوں لفظ اپنے اصطلاحی معنی میں مقبول عام سند حاصل کرچکے ہیں۔

تحقیق کے لغوی معنی تو سبھی کو معلوم ہیں، رہے اصطلاحی معنی تو تحقیق یعنی ریسرچ کا یہ مطلب ہے یا تو نئے حقائق دریافت کیے جائیں یا پھر معلومہ حقائق کی کوئی ایسی نئی تفسیر پیش کی جائے کہ اس سے ہماری معلومات میں معتدبہ اضافہ ہوجائے۔ بعض لوگوں نے ریسرچ کی تعریف اس طرح کی ہے کہ فکر کی پوری جدوجہد کے ساتھ حقیقت کی جستجو کا نام ریسرچ ہے اور غایت اس کی حق الیقین کا درجہ حاصل کرنا ہے۔

ہمارا دور علم وفن کے ہر شعبے میں تخصص کا دور ہے اور تخصص کے حصول کا ایک خاص ذریعہ ریسرچ ہے۔ اس محل پر یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ کیا پرانے زمانے میں تخصص کی ضرورت نہ تھی؟ آخر اگلے وقتوں میں بھی تو لوگ اپنے اپنے فن میں استاد کامل ہوا کرتے تھے۔ کیا وہ تخصص نہ تھا؟ جواب اس سوال کا یہ ہے کہ کاملانِ فن تو ہر زمانے میں گزرے ہیں لیکن ان کا کمال فن ایک عمومیت رکھتا تھا۔ مثلاً پرانے زمانے میں ہر ایک ماہر طبیب کے یہ معنی تھے کہ وہ ہر مرض کا علاج ایک حد تک کامیابی کے ساتھ کرسکتا تھا لیکن جب کوئی مرض مزمن اور پیچیدہ ہوجائے تو پھر وہ عام قسم کے ڈاکٹر کے بس کا نہیں رہتا۔ اس وقت اسپیشلسٹ کی ضرورت پڑتی ہے۔

آج کوئی دق کے علاج میں کامل ہے، کوئی امراضِ قلب کا ماہر ہے، کسی کو جراحی میں کمال حاصل ہے، کوئی آنکھوں کا بہترین علاج کرسکتا ہے، ایسی صورت میں ہمیں اسپیشلسٹ کی طرف رجوع کیے بغیر چارہ نہیں۔ یہ بات اگلے وقتوں میں نہ تھی۔ وجہ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں علم کا دائرہ نہایت محدود تھا۔ اس زمانے میں ایک شخص کسی علم یا فن کے جملہ شعبوں پر حاوی ہوسکتا تھا، بلکہ اس وقت کے تمام مروجہ علوم وفنون کو اچھی طرح سیکھ سکتا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج سے چند سو سال قبل ایک شخص بیک وقت علوم دین کا ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ طب، ریاضی، ہندسہ، نجوم، فلسفہ اور ادب سبھی کچھ جانتا تھا لیکن آج اس کا امکان نہیں۔ علم کا دائرہ اتنا وسیع ہوچکا ہے کہ علم وفن کے کسی ایک شعبہ میں بھی کامل دستگاہ بہم پہنچانا دشوار ہے۔ جملہ شعبوں میں کمال حاصل کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

چند سو سال قبل نہ سائنس کی لیبارٹری اس درجہ ترقی یافتہ تھی، نہ ایسے مطبعے تھے جو اتنی کثیر التعداد کتابیں چھاپ کر مہیا کردیتے۔

آج علوم وفنون کی اشاعت کثیر کا ذمے دار وہ شخص نہیں جو علوم وفنون کو جاننے کا دعویٰ کرتا ہے بلکہ وہ شخص ہے جو خوب غور وفکر کے بعد اپنے مطالعے کے لیے چند مخصوص مضامین کا انتخاب کرلیتا ہے اور بقدر امکان ان کے مطالعے کو درجہ کمال تک پہنچاتا ہے۔ ان حالات میں یہ ضروری ہے کہ انسان کسی ایک فن میں تخصص حاصل کرے اور یہی ریسرچ کی غرض وغایت ہے۔

پچھلے تیس سال کے دوران میں ایک ممتحن کی حیثیت سے مجھے ایسے کتنے ہی تحقیقی مقالات کے دیکھنے کا اتفاق ہوا، جو ہندو پاکستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے پیش کیے گئے۔ یونیورسٹی کے آئین کے مطابق پی ایچ ڈی کی ڈگری کے حاصل کرنے کے لیے تحقیقی مقالہ لکھنے والے کو کم سے کم دو سال کسی ماہر استاد کی نگرانی اور راہنمائی میں کام کرنا پڑتا ہے لیکن ان مقالات کے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ان مقالہ نگاروں میں سے بیشتر کو اپنے رہنما کی رہنمائی سے مستفید ہونے کا ذرا بھی موقع نہیں ملا اور استاد کی رہنمائی رسمی سرپرستی سے آگے نہ بڑھ سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں سے بعض اپنی طبع سلیم کی مدد سے منزل

---

(۱) تقسیم برصغیر کے بعد ہندوستان میں بھی ادبی تحقیق کا کام اتنی ہی سرگرمی کے ساتھ اطمینان بخش رہا ہے۔ (مرتب)

مقصود پر پہنچ گئے اور اکثر و بیشتر گمراہ ہو کر مصیبتوں اور ملامتوں کا نشانہ بنے۔

میرا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ خدانخواستہ ان رہنماؤں میں رہنمائی کی صلاحیت نہ تھی۔ ہماری یونیورسٹیوں کے اساتذہ میں بحمد اللہ ایسے ایسے جوہر قابل موجود ہیں جو اپنے فن میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ وہ علم وفضل کا سمندر ہیں لیکن وہ اپنی گوناگوں مصروفیتوں میں کچھ ایسے الجھے رہتے ہیں کہ انہیں تلامذہ کے تحقیقی کام پر ایک سرسری نظر ڈالنے کا بھی موقع نہیں ملتا اور بعض اوقات ان کی سہل انگاری کی بنا پر ان کے وابستگان دامن کو محرومی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

یہ کیونکر ممکن ہے کہ جو مقالہ ایک فاضل استاد کی نظر سے گزر چکا ہو اس میں املا کی درجنوں غلطیاں موجود ہوں، مطالب کی تکرار اور اقتباسات کی غیر ضروری بھرمار ہو، عبارت میں طرح طرح کی اسقام پائی جائیں، واقعات اور حقائق مسخ کر دیے گئے ہوں اور قدم قدم پر مقالہ نگار کی کم مائیگی کا پردہ چاک ہوتا ہو۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ڈاکٹریٹ کے لیے پیش کیے جانے والے مقالات کو جانچتے وقت مجھے بارہا اس قسم کا تجربہ ہوا ہے۔

راہ نماؤں کی اس کم التفاتی کا عموماً یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ مقالہ نگار بعض اوقات دو دو برس تک کامیابی اور ناکامی کے درمیان لٹکا رہتا ہے اور کبھی کبھی یہ ناکامی دائمی محرومی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس صورت نے ہمیشہ مجھے یہ سوچنے پر مجبور کیا ہے کہ آخر یہ گتھی کس طرح سلجھائی جائے اور ریسرچ کرنے والوں کی یہ مشکل کس طرح حل کی جائے۔

اس میں شک نہیں کہ جس طرح دوسرے فنون کو حاصل کرنے کے لیے استاد کی مدد ضروری ہوتی ہے، اسی طرح تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے بھی کسی ماہر فن کی راہ نمائی ناگزیر ہے۔ لیکن تحقیق کے میدان میں خود راہ رو جب تک اپنے لیے کچھ نہ کرے، راہ نماوی کی ہدایت چنداں مفید ثابت نہیں ہو سکتی۔ راہ نما صرف راہ دکھا سکتا ہے، سفر کرنا خود راہ رو کا کام ہے اور تحقیق کا طریق کار اس درجہ قطعیت کے ساتھ متعین بھی نہیں کہ اس سے سر مو تجاوز نہ کیا جا سکے۔ تحقیق کے دوران میں ایک ہوش مند طالب علم پر تحقیق کی راہیں خود بخود کھلتی چلی جاتی ہیں۔ البتہ طلب صادق اور سعی تمام کی ضرورت ہے۔ بایں ہمہ تحقیق کے کچھ بنیادی اصول ہیں جنھیں تحقیقی کام کرنے والوں نیز تحقیق کے راہ نماؤں نے عملی تجربوں کے بعد مفید پایا ہے۔ سطور ذیل میں انھی بنیادی اصولوں سے اختصار کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔

منطقی نظم و ترتیب قائم رکھنے اور زیادہ سے زیادہ مفید نتائج حاصل کرنے کی غرض سے ریسرچ کے کام کو پانچ شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

اول: موضوع کا انتخاب اور اس کی حد بندی۔

دوم: مآخذوں کا تعین اور ان کی فہرست مرتب کرنا۔

سوم: مقالے کا خاکہ تیار کرنا۔

چہارم: مآخذ کا مطالعہ اور ان سے مفید مطلب مواد کا انتخاب۔

پنجم: مقالہ نگاری۔

ریسرچ میں موضوع کا انتخاب حد درجہ اہمیت رکھتا ہے۔ موضوع کے انتخاب میں طالب علم کو پوری پوری آزادی ہونی چاہیے تاکہ وہ اپنے فطری میلان، رجحان اور اپنی دلچسپی اور پسند کے مطابق کوئی مناسب موضوع اپنے لیے چن سکے۔ موضوع کا انتخاب کرتے وقت اپنے راہ نما سے یا اس فن کے دوسرے اساتذہ سے مشورہ لینے میں کوئی مضایقہ نہیں بلکہ فائدہ ہی ہے لیکن آخری فیصلہ خود طالب علم کے اپنے ذوق کے مطابق ہونا چاہیے۔

کسی کو نظم زیادہ پسند ہے کسی کو نثر، کسی کو تاریخ ادب کا مطالعہ مرغوب ہے، کسی کو انتقادیات کا۔ اب جس کو جس شعبۂ ادب سے زیادہ دلچسپی ہو اس میں اپنے لیے ایک اچھا سا موضوع منتخب کر لے۔ لیکن موضوع کا انتخاب کرتے وقت اس امر کا لحاظ بھی نہایت ضروری ہے کہ اس پر مقالہ لکھنے کے لیے کافی مواد مل سکتا ہے یا نہیں۔ اگر مواد بہت کمیاب ہے تو ایسے موضوع سے صرف نظر ہی بہتر ہے۔ بنجر زمین میں ہل چلانے سے کوئی فائدہ نہیں۔

اسی طرح اگر کسی موضوع پر مواد کثیر مقدار میں آسانی سے میسر آ سکتا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ یا تو آپ کا موضوع بہت وسیع ہے یا پھر دوسرے لوگ اس موضوع پر ریسرچ کر چکے ہیں۔ اگر آپ کسی گھسے پٹے یا نہایت روشن راستے پر جا رہے ہیں تو پھر یہ ریسرچ نہیں اور اگر موضوع نہایت وسیع ہے تو مدت مقررہ کے اندر اس کا سمیٹنا آپ کے لیے از بس دشوار ہوگا۔

جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا، موضوع کا انتخاب کرتے وقت اپنے راہ نما سے مشورہ لینا یقیناً مفید ہے، لیکن خود اپنے ذوق و میلان اور ذاتی دلچسپی کو نظر انداز کر کے استاد کے بتائے ہوئے موضوع کو صرف اس لیے اختیار کرنا کہ استاد بہر حال ایک پختہ کار ماہر فن ہے، بڑی نادانی ہے۔ ایک امریکی پروفیسر نے اس ضمن میں بعض بڑی دلچسپ اور مفید باتیں کہی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ:

''تحقیق کے لیے موضوع بے شمار ہیں۔ ہمیں اپنی پسند اور دلچسپی کے مطابق کوئی موضوع چن لینا چاہیے۔ اب ہم اگر کوئی ایسا موضوع اختیار کر لیں جس سے ہمیں دلچسپی نہیں، تو یہ ہمارا اپنا قصور ہے۔ جس طرح ہم تحقیقی ادب میں کسی خاص ظاہری وجہ کے بغیر اپنا موضوع منتخب کر لیتے ہیں، اسی طرح ریسرچ میں بھی ہمیشہ ہم پر اس بات کا واضح ہونا ضروری ہے کہ ہم نے فلاں موضوع کا انتخاب کس بنا پر کیا۔ انتخاب موضوع کے لیے یہی جواز کافی ہے کہ اس سے ہمیں غیر معمولی دلچسپی ہے۔ آپ کسی نوجوان سے کہہ سکتے ہیں کہ میاں! تم فلاں لڑکی سے محبت کرو اور اپنی اس تجویز کے بہت سے فائدے بھی اسے بتا سکتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ وہ آپ کے اس مشورے سے مطمئن ہو کر اس خاص لڑکی کو چاہنا شروع کر دے، کیونکہ انتخاب تو اپنے فطری میلان اور ذاتی تجربے کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ بہر حال اگر وہ آپ کے مشورے پر کار بند ہو کر اپنی ذاتی رغبت کے بغیر محض آپ کے بتائے ہوئے فائدوں کی خاطر اس لڑکی سے شادی کر لے یعنی استاد کے مشورے سے ایسا موضوع چن لے جس سے اسے قطعی دلچسپی نہیں یا بہت کم دلچسپی ہے تو پھر دورانِ تحقیق میں اسے جتنی زحمتیں اور تکلیفیں بھی برداشت کرنی پڑیں، وہ ان سب کا مستحق اور سزاوار ہے۔''

اس ضمن میں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ صرف مقالہ نگاری کے لیے موضوع کا دلچسپ ہونا کافی نہیں، بلکہ قارئین کے لیے بھی اس میں کچھ ندرت کچھ تازگی ہونا چاہیے تا کہ وہ بھی مقالے کے مطالعے سے کچھ نئی باتیں سیکھ سکیں۔

واقعہ یہ ہے کہ تحقیق کے لیے موضوعات بے شمار ہیں۔ کسی ایک ادیب یا شاعر پر مقالہ لکھا جا سکتا ہے۔ اس کی ایجاد اور تدریجی ارتقا سے بحث کی جا سکتی ہے۔ کسی دور کی ادبی تاریخ لکھی جا سکتی ہے۔ کسی خاص طور کے شعرا یا نثر نگار زیر بحث آ سکتے ہیں۔ زبان و ادب کا سیاسی، سماجی یا تاریخی پس منظر بیان کیا جا سکتا ہے۔ سوانحی اور مذہبی نثر پر بہت لکھا جا سکتا ہے۔ اُردو لغت اور اُردو قواعد بھی تحقیق کا موضوع بن سکتے ہیں۔

اُردو ادب میں ہندو کلچر، ہندی کلچر، یورپین کلچر اور اسلامی کلچر کے اثرات، اُردو کے یورپین شعرا، ہندو شعرا، اُردو شاعرات اور ادیب خواتین، ترقی پسند ادب، نیا ادب، اُردو ثقافت، تصوف، مرثیہ، اخلاق، طنز و مزاح، داستان، افسانہ، ناول، ڈراما، تنقید، مناظر قدرت، قومی و ملی شاعری، بنگال میں اُردو غرض یہ اور ایسے بے شمار دوسرے موضوعات تحقیق کے لیے اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ ان چند موضوعات کو سامنے رکھ کر تحقیق کرنے والے انھی میں سے اور سینکڑوں نئے موضوع پیدا کر سکتے ہیں۔

شق اول کے تحت انتخاب موضوع کے ساتھ میں نے موضوع کی حد بندی کا بھی ذکر کیا ہے۔ حد بندی سے میری یہ مراد ہے کہ موضوع غیر معین طور پر وسیع، ہمہ گیر اور عام نوعیت کا نہ ہو۔ مثلاً اُردو ادب ۱۸۵۷ء کے بعد ہمارا موضوع بحث ہو تو یہ ایک ایسا موضوع ہوگا جس کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے عمر دراز چاہیے۔ اُردو ادب میں سبھی کچھ شامل ہے۔ نظم بھی نثر بھی، نظم و نثر کے جملہ اصناف بھی، ہیئت کے لحاظ سے بھی اور مواد کے اعتبار سے بھی، داستان، افسانہ، ناول، ڈراما، صحافت، نظم و غزل، اُردو شاعری کا نیا دبستان، ترقی پسند ادب، سیاسی ادب، غرض کوئی چیز اس کے دائرے سے خارج نہیں۔

اختصار کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ مثلاً اگر کسی کو نظم سے دلچسپی ہے تو وہ ''اُردو ادب ۱۸۵۷ء کے بعد'' کو مختصر کر کے ''اُردو شاعری کا نیا دبستان'' میں تبدیل کر سکتا ہے۔ اس موضوع میں بھی مزید اختصار کی گنجائش ہے۔ مثلاً اُردو شاعری کا نیا دبستان پہلی جنگِ عظیم کے آغاز تک ہمارا موضوع تحقیق ہو سکتا ہے۔ یہ کام اتنا ہو کہ دو برس میں یا زیادہ سے زیادہ تین برس میں اس کی تکمیل ہو سکے۔ اس تحقیقی مقالے کے لیے تین سو ساڑھے تین سو صفحات کا حجم بالکل کافی ہے۔

ادھر چند سال سے میں دیکھ رہا ہوں کہ تحقیقی مقالوں کا حجم برابر بڑھتا جاتا ہے۔ فل سکیپ سائز کے چار سو، پانچ سو بلکہ چھ سو صفحات کے مقالے میری نظر سے گزر چکے ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے مقالہ نگاروں میں یہ بنیادی خیال کسی طرح پھیل گیا ہے کہ تحقیقی مقالے کی اہمیت اس کی ضخامت پر منحصر ہے۔ چھ چھ سو صفحوں کے طویل مقالوں کے مواد کو بڑی آسانی سے تین سو ساڑھے تین سو صفحات میں سمیٹا جا سکتا ہے اور اس شرط کے ساتھ کہ نہ کوئی اہم بات چھوٹنے پائے نہ بحیثیت مجموعی مقالے کی اہمیت اور قدر و قیمت کو ذرا برابر نقصان پہنچے۔

موضوع کے انتخاب اور اس کی حد بندی کے بعد دوسرا مرحلہ مآخذوں کے تعین کا ہے۔ چونکہ ریسرچ کا سارا دارومدار مآخذوں پر ہی ہوتا ہے اس لیے ہر نوع کے مآخذوں کی ایک مفصل اور مکمل فہرست تیار کر لینی چاہیے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں اپنے مآخذوں کا پتا کیوں کر چلے؟ اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔

سب سے پہلے اس فن کی کتابوں سے واقفیت بہم پہنچانا ضروری ہے جو ہمارے موضوع تحقیق سے تعلق رکھتا ہے۔ اس مقصد کے لیے ہمیں ان تمام کتب خانوں کی فہرستوں کا مطالعہ کرنا ہوگا جن تک ہماری رسائی ممکن ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے کتب خانے خواہ وہ یونیورسٹیوں کی ملکیت ہوں یا دوسرے علمی اداروں کی، خد ذرجہ

نامکمل ہیں۔ بعض اوقات ان میں کسی فن کی بعض امہات کتب بھی دستیاب نہیں ہوتیں۔ ایسی صورت میں کسی ایک لائبریری پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ بعض کتب خانوں میں مخطوطات کے بڑے قیمتی ذخیرے محفوظ ہیں لیکن بدقسمتی سے ان کی فہرستیں ہنوز شائع نہیں ہوئیں اس لیے بیرونی لوگ ان مخطوطات سے استفادہ نہیں کر سکتے۔

کتب خانوں کے علاوہ اپنے راہ نما کی معلومات سے استفادہ کرنا بھی ضروری ہے، بلکہ جہاں تک ممکن ہو اپنے استاد کے علاوہ دوسرے اساتذہ فن سے بھی مشورہ کر لینا چاہیے۔ جن لوگوں نے اپنی زندگیاں اسی دشت کی سیاحی میں صرف کی ہیں، ان کی یاد کے کسی نہ کسی گوشے میں ہمارے کام کی چیزیں بھی پڑی ہوئی نکل آتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے موضوع تحقیق سے تعلق رکھنے والے فن کی کتابیں ہی ہمارے لیے ضروری مواد فراہم کر سکتی ہیں، لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوسرے فنون سے تعلق رکھنے والی بعض معاصرانہ تصنیفات میں بھی ہمیں اپنے کام کی کچھ باتیں مل جاتی ہیں۔

مرزا غالب نے کسی موقع پر سرور کی ''فسانۂ عجائب'' کے متعلق یہ رائے ظاہر کی تھی کہ لاحول ولاقوۃ! اس میں لطف زبان کہاں۔ ایک تک بندی ہے اور بھٹیارخانہ جمع کیا ہے۔

قدرتی طور پر ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ غالباً مرزا غالب کی یہ رائے مولانا حالی نے ''یادگار غالب'' میں نقل کی ہوگی یا ممکن ہے مرزا نے اپنے کسی خط میں کسی بے تکلف دوست کو لکھی ہو، اس لیے اردوئے معلیٰ، عود ہندی یا مکاتیب غالب یا خطوط غالب کے کسی دوسرے مجموعے میں یہ عبارت ملنی چاہیے لیکن نام بردہ کتابوں میں سے کسی میں بھی اس کا وجود نہیں۔ ادب کے ایک طالب علم کے لیے مرزا غالب کی یہ تنقید بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ تلاش کرنے والے کو یہ عبارت غالب کے ایک ہم عصر بزرگ حضرت غوث علی شاہ کے ''تذکرۂ غوثیہ'' میں مل جائے گی۔ اس طرح بہت سے قیمتی نکتے اور اہم معلومات دوسرے فنون کی معاصرانہ تصنیفات سے ہمارے ہاتھ آ جاتی ہیں۔

بعض اوقات کتابوں کے علاوہ ادبی ماہ ناموں سے بھی نہایت قیمتی مواد مل جاتا ہے لیکن افسوس ہے کہ ہمارے یہاں مختلف ماہ ناموں میں چھپنے والے مضامین کا انڈکس (اشاریہ) شائع کرنے کا دستور نہیں۔ ادھر چند سال سے دو ایک رسالوں نے اس مفید کام کا آغاز کیا ہے۔ اس کے علاوہ رسالوں کے مکمل فائل بھی شاذ و نادر ہی کہیں میسر آتے ہیں۔ لہٰذا ریسرچ کرنے والے کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ معیاری ماہ ناموں کے جتنے شمارے جہاں کہیں مل جائیں ان کی فہرست مضامین پر نظر ڈال لے۔ اس کی یہ محنت رائیگاں نہیں جائے گی، بلکہ مفید اور قیمتی مواد ہاتھ آنے کے امکانات قوی ہیں۔

بعض فضلاء اور محققین کے مضامین پہلے ماہ ناموں میں شائع ہوتے ہیں۔ اس کے بعد کتابی صورت میں۔ لہٰذا ان کتابی صورتوں میں شائع ہونے والے مجموعوں کی فہرست مضامین پر بھی ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے۔ اس طرح ماہ ناموں کے فائل دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے جو کمی رہ جاتی ہے وہ کسی حد تک ان مجموعوں سے پوری ہو جاتی ہے۔

مآخذوں کا پتا چلانے کے لیے دو ذریعے خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک تو ان مخطوطات نیز مطبوعات کی مطبوعہ فہرستیں جو یورپ کے اکثر اور ایشیا کے بعض کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ دوسرے مآخذوں کے وہ حوالے جو کسی انسائیکلوپیڈیا میں ہر مضمون کے آخر میں درج ہوتے ہیں۔ ان حوالوں کی مدد سے بہت سے اہم اور قیمتی مآخذوں تک ہماری رسائی ہو جاتی ہے۔

مآخذوں کے سلسلے میں یہ بات ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے کہ تمام مآخذ یکساں طور پر قابل اعتبار نہیں ہوتے۔ بعض کا مستند اور معتبر ہونا مسلم ہے اور بعض ساقط الاعتبار ہیں۔ دونوں کے درمیان حد فاصل کھینچنے کے لیے پوری احتیاط لازم ہے۔ کسی غیر مستند مآخذ سے حاصل کی ہوئی اطلاع ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ اس لیے دوسرے معتبر مآخذوں سے اس کی تائید ضروری ہے۔ کسی مآخذ کا نسبتاً قدیم ہونا یا واقعات کا معاصر ہونا یقینی اہمیت رکھتا ہے لیکن یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ علمی دنیا میں اس کا کیا پایہ ہے اور اس کی روایات درایت کی کسوٹی پر کس حد تک پوری اترتی ہیں۔ کبھی چشم دیدہ واقعات بھی قابل قبول نہیں ہوتے کیونکہ عقل انھیں تسلیم نہیں کرتی یا دوسرے حالات سے ان کی تائید نہیں ہوتی۔

مآخذوں کی فہرست تیار کر لینے کے بعد ہم تیسرے مرحلے میں داخل ہوتے ہیں۔ اب ہمیں اپنے مقالے کا ایک خاکہ تیار کر لینا چاہیے۔ خاکہ بنائے بغیر مقالہ لکھنا ایسا ہی ہے جیسے نقشے کے بغیر مکان تعمیر کرنا۔ خاکہ بنا لینے کے بعد ذہنی طور پر مقالے کی ایک ہیئت متعین ہو جاتی ہے۔ اس نقشے پر عمارت بنانا آسان ہے۔ خاکے میں جو عنوانات قائم کیے جائیں، ان میں ترتیب زمانی کا لحاظ مفید ہے بلکہ ضروری ہے۔ مطالعے کے دوران میں خاکے کے جس عنوان کے متعلق مواد ہاتھ آئے اسے اسی عنوان کے تحت درج کر لینا چاہیے۔

مآخذ کی فہرست اور مقالے کا خاکہ تیار کر لینے کے بعد ہم چوتھے مرحلے میں داخل ہوتے ہیں۔ اب مآخذوں کا مطالعہ شروع ہوتا ہے۔ مطالعے کے

دوران میں مقالہ نگار اپنے مفید مطلب مواد کا انتخاب کر کے یادداشتیں لکھتا جاتا ہے۔ اس کام میں بڑی احتیاط لازم ہے۔ یادداشتیں لکھتے وقت دو بنیادی اصول پیش نظر رکھنے چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ غیر ضروری نوٹ ہرگز نہ لیے جائیں، ورنہ مقالے لکھتے وقت سخت الجھن کا سامنا ہوگا۔ دوسرے یہ کہ کوئی ضروری نکتہ چھوٹنے نہ پائے۔ مآخذوں کا مطالعہ بار بار نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کوئی چیز چھوٹ گئی ہو تو اس کا ہاتھ آنا دشوار ہے۔

یادداشتیں لکھنے کا یہ مطلب نہیں کہ کسی کتاب کا پورا خلاصہ تیار کر لیا جائے بلکہ صرف انھی مقامات کا لب لباب اخذ کرنا چاہیے جو ہمارے موضوع سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ بعض اوقات آپ کسی کتاب کے پورے پورے ابواب میں سے اس طرح گزر جائیں گے کہ ایک سطر بھی نوٹ نہ کریں گے اور بعض اوقات کسی ایک ہی صفحے سے کئی کئی نوٹ لینے ہوں گے۔

یادداشتیں کسی مقررہ اصول کے مطابق لکھی جانی چاہئیں۔ بعض لوگ دوران مطالعہ میں کسی اصول یا ترتیب کا لحاظ کیے بغیر، عجلت میں کاغذ کے متفرق پرزوں پر یا نوٹ بک پر لکھتے جاتے ہیں۔ ان یادداشتوں میں کسی اصول یا نظم و ترتیب کو دخل نہیں ہوتا اور لکھے جانے کے بعد ان کی طبقہ بندی بہت دشوار ہے۔ اس لیے ان کی افادیت گھٹ جاتی ہے اور مقالے میں بے ترتیبی اور تکرار پیدا ہو جاتی ہے۔ اس خرابی سے بچنے کا سہل طریقہ یہ ہے کہ ہر یادداشت ایک جداگانہ کارڈ یا ورق پر لکھی جائے، پھر ان اوراق کو مضمون کی مناسبت سے مختلف عنوانات کے تحت مرتب کر لیا جائے۔

یادداشتیں لکھنے کا کوئی معیاری طریقہ ہنوز متعین نہیں ہوا ہے۔ ہر شخص اپنی رائے اور فہم کے مطابق مآخذوں سے نوٹ لے سکتا ہے۔ لیکن مذکورہ بالا طریقہ مبتدیوں کے لیے ضرور مفید ثابت ہوگا۔ یادداشتیں تیار ہو جائیں تو گویا مقالے کی تعمیر کے لیے جملہ سامان فراہم ہو گیا۔ اب مقالہ نگار کو مقالہ لکھنا شروع کر دینا چاہیے۔

ہر لکھنے والے کا اپنا ایک اسلوب ہوتا ہے۔ اسے نہ بدلا جاسکتا ہے نہ بدلنے کی ضرورت ہے لیکن بعض امور ایسے ہیں جن کا لحاظ رکھنا ہر شخص کے لیے مناسب ہے اور وہ مجموعی طور پر مقالے کے حسن و خوبی میں اضافے کا باعث ہوتے ہیں۔

اول یہ کہ غیر ضروری طوالت سے پرہیز کیا جائے۔ مقالے کی خوبی اور اس کی اہمیت کا انحصار اس کے حجم پر نہیں۔ اہل نظر یہ دیکھتے ہیں کہ اس مقالے سے علم کی حدود میں کتنا اضافہ ہوا۔ کون سی نئی بات ہمیں معلوم ہوئی۔ کون سا نقطہ سامنے آیا؟ ایجاز و اختصار تحریر کی ایک بڑی خوبی ہے، بشرطیکہ اختصار کی بنا پر کوئی اہم نکتہ بیان ہونے سے نہ رہ جائے اور مفہوم میں کسی قسم کا الجھاؤ یا گنجلک پیدا نہ ہو۔

تحقیق کی دنیا میں ندرت کی بڑی قیمت ہے۔ اگر آپ نے کوئی ایسا نادر نکتہ دریافت کیا ہے جو اب تک لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ تھا تو دوسروں سے قطع نظر خود آپ کو اپنی اس دریافت سے حد مسرت ہوگی۔ تحقیقی کام کرنے والوں کو بنیادی اصول کے طور پر یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ ان کی تحقیق کی غرض و غایت اپنے کسی عقیدے یا نظریے کی تائید نہ ہو۔ اگر بلا قصد و ارادہ ان کی بے لاگ تحقیق سے ان کے کسی خیال کی تائید ہو جائے تو سبحان اللہ لیکن اگر معاملہ برعکس ہو تو تحقیق کو توڑ مروڑ کر اپنے عقیدے کے سانچے میں ڈھالنا نہ صرف منصب تحقیق کے منافی ہے بلکہ امانت و دیانت کے بھی خلاف ہے۔ تحقیق کرنے والے کو ہمیشہ کھلے دل سے تحقیق کے نتائج کی پذیرائی کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

مقالہ نگار کا یہ فرض ہے کہ جہاں جہاں سے اس نے استفادہ کیا ہے بلا پس و پیش اور کھلے دل سے اس کا اعتراف کرے۔ اس اعتراف سے اس کے کام کی اہمیت اور قیمت گھٹتی نہیں بلکہ بڑھتی ہے۔ مقالہ نگار کے قارئین صرف طلبا ہی نہیں ہوتے، پختہ کار اہل نظر اور ارباب علم و فضل بھی ہوتے ہیں۔ اگر مقالہ نگار نے دوسروں کے دریافت کیے ہوئے حقائق کو اپنے نتائج کی تحقیق کے طور پر پیش کیا تو ارباب نظر سے اصل حقیقت پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ اس طرح مقالہ نگار کا بھرم کھل جاتا ہے۔ اسے سرقے کا مجرم گردانا جاتا ہے اور اس کے مقالے کی قدر و قیمت کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔

مآخذ کے حوالے دیتے وقت بعض لوگ ایک اور حکمت سے کام لیتے ہیں، جو بالآخر نادانی ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً مولانا شبلی نے شعر العجم میں بدایونی کی منتخب التواریخ سے ایک اقتباس پیش کیا۔ اب ایک مضمون نگار صاحب اپنے مضمون میں بدایونی کی وہی عبارت شعر العجم سے نقل کرتے ہیں مگر شعر العجم کا ذکر نہیں کرتے صرف منتخب التواریخ کا حوالہ دیتے ہیں۔ گویا انھوں نے یہ عبارت براہ راست منتخب التواریخ سے لی ہے۔ حالانکہ منتخب التواریخ ان کی نظر سے نہیں گزری۔

❖❖❖❖

(۱) تحقیق اور اس کے طریقہ کار، ڈاکٹر عندلیب شادانی، لاہور، صحیفہ، جولائی ۱۹۶۵ء۔

اُردو میں لسانی تحقیق کی اہمیت

پروفیسر عبدالستار دلوی

زبان انسانی طرز معاشرت کا ایک اہم ترین اور با اوصاف جزو ہے۔ لہٰذا اس کو ہمیشہ انسانی زندگی کے تعلیمی شعبے میں ایک اہم مقام حاصل رہا ہے۔ بہر حال حالیہ دور میں اس کی حیثیت بڑی حد تک بدل گئی ہے۔ کسی زمانے میں زبان کی تدریس صرف چند مخصوص زبانوں تک محدود تھی جن میں ابتداً مغربی یورپ کی کلاسیکی اہمیت کی حامل زبانیں شامل تھیں۔ گذشتہ چند نسلوں کے دور میں انفرادی زبانوں کی تدریس کے باب میں زبان کا ایک وسیع تر تصور ذہنوں میں پیدا ہو چکا ہے۔

چونکہ سارے سماجی علوم اپنی اپنی جگہ پر ارتقا کی منزلیں طے کر رہے ہیں لیکن انھیں اپنے اپنے دائرۂ عمل میں زبان کے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ نفسیات، سماجیات اور عمرانیات وغیرہ علوم نے اپنے لیے ایک ایسی زبان ایجاد کر لی ہے جس کو انسانی طرز عمل اور شخصیت سماج اور ثقافت سے میل کھاتا ہوا طریقہ دونوں حیثیتوں سے برتا جا سکے۔ زبان تکنیکی مسائل پر بھی دخیل ہو گئی ہے اور مشینی علوم سے تعلق رکھنے والوں نے بھی انسانی طرزِ گفتگو کے بارے میں تحقیقات کرنا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ آج زبان کی تدریس کے لیے ہمارے پاس مختلف نقطہ ہائے نظر سے مسلم الثبوت تکنیکی ذرائع موجود ہیں۔ ان میں سے ہر ایک ذریعہ ان سارے طریقہ ہائے کار کی تکمیل کرتا ہے جو آج کے نظریاتی علوم اور عملی مسائل کو حل کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

بہر حال اس سلسلے میں ایک مخصوص شعبے پر ابھی تک کوئی خاص توجہ نہیں دی جا سکی ہے اور وہ ہے توضیحی لسانیات۔ یہ وہ طریقہ کار ہے جس کے تحت زبانوں کا مطالعہ ان کی داخلی ساخت کے تحت کیا جاتا ہے۔ یہ چیز ان سارے طریقہ ہائے کار سے مختلف ہے جن کے تحت انسانی طرز گفتگو کے مختلف پہلوؤں پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے۔ اس طریقہ کار کا عام تدریسی مواد اور مختلف مسائل کو حل کرنے کے لیے اس کی صلاحیت، دوسرے طریقہ ہائے کار سے اس کا ایک مضبوط رشتہ قائم کر دیتی ہے۔

زبان میں عوامی دلچسپی کو بڑھاوا دینے کے لیے مخصوص زبانوں کی تدریس میں ایک بنیادی تبدیلی آ گئی ہے۔ وہ زبانیں جن کو گذشتہ نسلوں نے خصوصی توجہ کا مستحق نہیں سمجھا تھا آج باقاعدہ جماعتوں میں پڑھائی جا رہی ہیں۔ اس سلسلے میں جن لسانیاتی طریقہ ہائے کار کو برتا جانا چاہیے ان کی اقسام میں کافی اضافہ ہو گیا ہے اور زبان کے ایک وسیع تر تصور کو اختیار کیے جانے کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ اس طرح توضیحی لسانیات ارتقا کے جدید ترین دستور العمل کا ایک اہم تلازمہ بن گئی ہے۔

اُردو زبان تشکیلی دور سے ارتقا کی اعلیٰ منزلوں تک ادیبوں اور شاعروں کی مرہونِ منت رہی ہے اگر اسے ایک طرف صوفیوں اور درویشوں نے گلے لگایا تو دوسری طرف امرا و سلاطین نے اپنے ذوق وشوق کی پذیرائی بھی اسی زبان سے کی۔ اس ذوق وشوق کا ہی نتیجہ ہے کہ ہم اس زبان کی ادبی تاریخ میں بہت آگے تک نکل گئے ہیں۔ اُردو ادب کے مختلف پہلوؤں پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اسے زبان کی چار سو سالہ تاریخ میں اہل اُردو کے شان دار کارنامے کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

اُردو ادب کی ترقی میں اُردو نے اچھا کردار ادا کیا ہے لیکن کسی بھی زبان میں ادب کی ترقی کوئی آخری منزل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زبان کے فروغ کے لیے ہماری نظر ماہر زبان پر پڑتی ہے۔ شاعر و ادیب، نقاد اور افسانہ نویسی کا کام جہاں ادب کی خدمت کرنا ہے وہیں پر ماہر زبان (Liguist) زبان کے فروغ و ترقی کا باعث ہوتا ہے۔ کسی بھی ادب کی ترقی سے پہلے زبان کی بنیادی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک زبان ترقی نہ کرے تب تک ہم ادب کی ترقی سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔ یہاں تک کہ زبان کے حال و ماضی سے متعلق گوناگوں قسم کے شکوک وشبہات میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں ایک بڑا طبقہ ادب کی ترقی کو زبان کی ترقی سے تعبیر کرتا ہے۔ مگر حقیقتاً ادب کی ترقی سے زبان کی ترقی کا جو بھی تعلق ہے، وہ اتنا معمولی ہے کہ اسے تعلق نہ ہونے سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اُردو کے لسانیاتی ادب پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی ماہرین لسانیات کو اُردو زبان کی ترقی میں بہت بڑا کردار ادا کرنا باقی ہے۔ موجودہ سیاسی کساد بازاری کے دور میں اہل اُردو کے لیے خاص طور سے اس مسئلے پر فوری طور پر نہ صرف غور کرنے کی بلکہ عملی طور پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے تحقیقی، علمی اور ادبی اداروں کو اس طرف فوراً توجہ کرنی چاہیے۔

محمد حسین آزاد اُردو میں غالباً پہلے شخص ہیں جنھوں نے اُردو کی ابتدا، اُردو کی ترقی سے متعلق اپنی استعداد بھر سائنسی لحاظ سے قلم اٹھایا۔ مقدمہ آب حیات اس لحاظ سے نہ صرف آب حیات کا مقدمہ ہے بلکہ اُردو کے سارے لسانیاتی سرمائے کے لیے بھی مقدمہ کا کام کرتا ہے۔ آزاد سے پہلے انشا اللہ خان انشا نے ''دریائے لطافت'' لکھ کر جدید لسانی اصولوں کے پیش نظر اُردو کی بولیوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی تھی۔ افسوس ہے کہ انشا کی ''دریائے لطافت'' کے بعد زبان سے متعلق سائنسی تحقیق اُردو میں معدوم ہوگئی۔ انشا اور آزاد سے لے کے اب تک جو بھی اس موضوع پر لکھا گیا ہے ان میں پنڈت کیفی، مولوی وحید الدین سلیم، ڈاکٹر عبدالحق، ڈاکٹر زور، پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر مسعود حسین، ڈاکٹر گیان چند جین اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی خدمات کا اعتراف کرنا ضروری ہے۔ تاہم ان میں سے اکثر و بیشتر حضرات نے تاریخی لسانیات پر زیادہ لکھا ہے۔ ڈاکٹر زور کی ہندوستانی صوتیات (انگریزی)، ڈاکٹر مسعود حسین خان کی A Phonetic and Phonological Study of a Word، ڈاکٹر نارنگ کی Karkhandari Urdu، اُردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو اور ڈاکٹر گیان چند کے مضامین جواب کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں، جدید اعتبار سے اُردو پر کام کرنے کی انفرادی کوششیں ہیں۔ تاہم ابھی انفرادی اور جماعتی لحاظ سے ہمیں بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ اُردو زبان کی ترقی کے سلسلے میں ماہرین زبان (Linguists) کو مندرجہ ذیل سمت و رفتار میں کام کرنا چاہیے:

۱۔ اُردو کا صوتی تجزیہ

۲۔ اُردو کا حرفی و نحوی مطالعہ

۳۔ اُردو کی مختلف بولیوں کے جائزے

۴۔ اُردو زبان کی تدریس کا مسئلہ

۵۔ اُردو کے سماجی و ثقافتی پہلو

۶۔ ذولسانیات اور اُردو

۷۔ اُردو لغت کی تدوین

مندرجہ بالا موضوعات میں زبان کے صوتی تجزیے کو میں نے پہلے نمبر پر رکھا ہے۔ کسی زبان کے لسانی مطالعوں کے سلسلے میں صوتی تجزیہ ہی بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ جب تک ہم زبان کا صوتی مطالعہ نہ کریں، زبان کے دیگر پہلوؤں پر کام نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ آواز ہی سے زبان وجود میں آتی ہے۔ حرفی (Morphological) مطالعہ میں بھی قدم قدم پر صوتی خصوصیات ہی کے تعین کے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے ہیں۔ زبان کے رسم خط کے سلسلے میں بھی صوتی مطالعہ مددگار ثابت ہوگا۔ ابھی اُردو کی بنیادی آوازوں کا صحیح تعین نہیں ہوا ہے۔ بہت سے حروف کو ہم آوازوں کا قائم مقام سمجھتے ہیں۔ صوتی تجزیے کے بعد حرف و صوت میں امتیاز پیدا ہوگا اور زبان کے مطالعے کے سلسلے میں ایک سائنسی کڑی ہمارے ہاتھ آ جائے گی۔ اسی طرح اُردو زبان کے صوتی مزاج کا بھی اندازہ ہوگا جس کے سلسلے میں ہم بھی بہت سی غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں۔

اُردو قواعد کی جدید ترتیب بھی اتنا ہی اہم کام ہے جتنا کہ اُردو کی صوتیات کا مطالعہ۔ اُردو قواعد کے سلسلے میں خاص طور سے Theory of Grammer، A Descriptive Theory of Grammer، Transformational Theory کے پیش نظر زبان کا حرفی و نحوی مطالعہ ہونا چاہیے۔ ہمارے لیے یہ افسوس کی بات ہے کہ ہم سائنسی لحاظ سے کوئی مستند قواعد کی کتاب پیش نہیں کر سکتے جو زبان کے عمل کے (Function) کو دکھا سکے۔

اُردو کی مختلف علاقائی اور سماجی بولیوں کے جائزے مثلاً دلی کی اُردو، لکھنؤ کی اُردو، پنجابی اُردو، بمبئی کی اُردو، دکنی اُردو، میسوری اُردو، مدراسی اُردو جو علاقائی اعتبار سے مقامی بولیوں کے اثرات کے تحت الگ الگ بولیوں کی شکل اختیار کر گئی ہیں، ان کے تجزیاتی مطالعے بھی ضروری ہیں تاکہ اُردو کی تمام بولیوں کو ان مطالعوں کے ذریعے محفوظ کیا جاسکے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر زور نے اپنی مختصر کتاب (Karkhandari Urdu) لکھ کر اُردو بولیوں کا جائزہ لینے کی نیو ڈالی ہے۔ ان ابتدائی کوششوں سے مدد لے کر اس کام کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ صوتی اعتبار سے اُردو کے معیار کے سلسلے میں ان بولیوں کی مشترکہ خصوصیات ہی کے پیش نظر کوئی حتمی فیصلہ کیا جاسکے اور اُردو سے متعلق ذولسانی مطالعہ (Bilingual Studies) بھی دلچسپ اور رنگارنگ موضوع ہے۔ بولیوں کے سماجی مطالعوں (Social Dialects) میں بازاری اُردو، عورتوں کی زبان، مختلف پیشہ وروں کی زبان کے مطالعے بھی سماجی و لسانی مطالعوں کا اہم موضوع بن سکتے ہیں۔

اُردو میں لغت کی تدوین بھی بنیادی اور اہم ضرورت ہے۔ گو اُردو میں لغتوں کی کمی نہیں لیکن مشکل ہی سے آپ کو کوئی ایسی لغت ملے گی جو ہماری تمام تر

ضروریات پر حاوی ہو۔ لفظ، اس کی تشکیل، اصل ونسل، اس کی قسم (اسم صفت، فعل وغیرہ)۔ تلفظ کی صحت کے سلسلے میں بھی تفصیلات ایک اچھی لغت کے ضروری اجزاء ہیں۔ اس قسم کے لغت کی ترتیب میں ''دی آکسفورڈ انگلش ڈکشنری'' کو بطور نمونہ سامنے رکھنا چاہیے۔ تلفظ کی صحت کے سلسلے میں جونس کی The English Pronouncing Dictionary کے طرز پر لغت کی تدوین ہونی چاہیے۔ لغت کی جدید ترتیب میں وہ سارے الفاظ شامل ہونے چاہئیں جو عام اُردو بول چال میں استعمال ہوتے ہیں۔ خواہ وہ کسی زبان سے ہی کیوں نہ ہوں۔

اسی طرح سولھویں، سترھویں، اٹھارویں، انیسویں اور بیسویں صدی میں مستعمل ہونے والے الفاظ پر مشتمل زمانے کے مطابق لغتیں بھی مرتب ہونی چاہئیں۔

لسانی تحقیق کے دو پہلو ہیں۔ اُردو میں اس نوع کی تحقیقات سے پہلے ان دونوں پہلوؤں کو علیحدہ رکھنا ضروری ہے۔ اولاً لسانیات (Linguistics) کا سرعت سے ترقی کرنے والے جدید علم کی حیثیت سے مطالعہ۔ تاکہ اس کے ذریعہ اُردو میں علم زبان کے طالب علم کے لیے زیادہ سے زیادہ مواد حاصل ہو۔ اس سلسلے میں علم زبان کے سارے پہلو مثلاً تجزیاتی، تاریخی، جغرافیائی (بولیوں کے مطالعوں کے ساتھ) لفظ ومعنی کا تعلق، الفاظ کی تاریخ (Etymology)، تدریس زبان، اختلاط زبان (Languages in Contact) اور اسلوبیات (Stylistics) وغیرہ پیش نظر ہونے چاہئیں۔ دوم، ہند آریائی گروہ کی تاریخی اہمیت اور اس کے پیش نظر اُردو کے ساتھ دیگر جدید ہند آریائی زبانوں کے تفصیلی مطالعے تاکہ اُردو کے جدید ہند آریائی زبانوں سے لسانیاتی رشتے بھی بیک نظر ہمارے سامنے رہیں۔

انیسویں صدی کے ربع اول میں علم زبان کی سائنسی حیثیت تسلیم کر لینے کے بعد اس نے تین تدریجی منزلیں طے کیں۔

پہلی منزل: اس دور میں زبانوں کے خاندانی رشتے اور اس کے قواعد کی تاریخی ترقی سے بحث کی گئی۔ بوپ، گریم، میکس ملر اور دہٹنے نے زبانوں کے، خاندانی رشتے اور اس کی قواعد کی عہد بہ عہد ترقی کے سلسلے میں سب سے پہلی مرتبہ اپنے مطالعے پیش کیے۔

دوسری منزل: اس عہد کے اہم علما پال بریگمین اور ریلیٹ ہیں جنھوں نے پہلے پہلی صوتی اصولوں (Phonetic Laws) اور تغیرات کے لحاظ سے زبانوں کی تاریخ اور تشکیل سے متعلق نظریے قائم کیے۔ جیسپرسن (Jesperson) اور ویندرے (Vendreya) نے جن میں اول الذکر ہالینڈ اور موخر الذکر فرانس کا رہنے والا تھا۔ اس عہد کے بنیادی نظریوں پر قائم رہتے ہوئے جنھیں پال بریگمین اور ریلیٹ نے پیش کیا تھا۔ زبان کے سماجی وثقافتی پہلوؤں پر بھی زور دیا۔

تیسری منزل: یہ علم اللسان کی جدید ترین منزل ہے جس کی ابتدا فونیم (Phoneme) کے نظریے کے بعد رکھی گئی۔ اس نے قدیم تاریخی لسانیات (Diachronic Linguistics) کے ساتھ توضیحی لسانیات (Synchronic Linguistics) پر بھی زور دیا۔ ۱۹۳۰ء کے بعد اس نے علمی اعتبار سے آزادانہ حیثیت حاصل کی اور قدیم تقابلی لسانیات (Competitive Linguistics) کی محدود دنیا سے نکل کر نئی سمتیں اختیار کیں۔ فی زمانہ اس کے پراگ، کوپن ہیگن، لندن اور امریکی چار سکول مشہور ہیں۔ اُردو کے لسانیاتی ادب کو علم زبان کے اس پس منظر میں دیکھے جانے کی ضرورت ہے۔

اُردو میں اچھے تحقیقی مقالے لکھے جا رہے ہیں۔ یہ تحقیقی مقالات کچھ اس نوعیت کے ہوتے ہیں جیسے اُردو غزل کا ارتقا، اُردو تنقید کا ارتقا، اُردو افسانے یا ناول کا ارتقا جن میں ادب کی مختلف اصناف کی تاریخ اور ترقی کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ کچھ مقالے ادبی شخصیتوں پر مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں موضوع کے اعتبار سے بھی مذکورہ بالا موضوعات پر کام کرنے کا مخالف نہیں ہوں۔ ادب میں ان کی بڑی اہمیت ہے لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے تحقیقی اداروں اور یونیورسٹیوں سے زبان کے سلسلے میں بھی تحقیقات کروائیں۔ تحقیق کرنے والوں میں کم سے کم پچاس فی صد اساتذہ اور طلبا کو لسانی تحقیق کا کام اپنے ذمے لینا ہوگا۔ اس کے لیے جدید لسانیات میں تربیت یافتہ اشخاص پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ کام طلبا اور اساتذہ کو سمر سکولوں (Summer Schools of Linguistics) میں بھیج کر بھی کر سکتے ہیں۔

لیکن اس سے کہیں بہتر ہوگا اگر ہم اپنی یونیورسٹیوں کے ایم۔اے۔ (اُردو) کے نصاب میں جدید لسانیات کی تعلیم لازمی کر دیں اور اس کے کم از کم دو پرچے ضروری ہوں۔ نصاب کی اس ترتیب میں زبان کی تاریخ مختلف نظریے، زبان کا ارتقا (Philology) اور قواعد سے متعلق جو پرچہ عام طور سے ہماری یونیورسٹیوں میں رائج ہے اسے ختم کیا جا سکتا ہے۔ وہی سارے موضوعات لازمی لسانیات کے اور تاریخ ادب کے پرچے میں بہت خوبصورتی کے ساتھ شامل کیے جا سکتے ہیں۔ اس سے ہمارے طلبا میں لسانیاتی تحقیق کی اہمیت کا احساس پیدا ہوگا اور اُردو زبان کے فروغ میں عملی طور سے وہ حصہ بھی لے سکیں گے جو اُردو زبان کی بنیادی ضرورت ہے۔

جدید لسانیات کے عروج سے زبانوں کے علمی افق زیادہ تاب ناک ہو گئے ہیں۔ غیر تحریری زبانوں کو تحریر کی دولت مل رہی ہے۔ بول چال کی یا گنوارو زبانیں علم وفن میں عملی حصے دار بن رہی ہیں۔ جس طرح جدید صنعتی تہذیب نے ذات پات اور رنگ ونسل کے فرق پر کاری ضرب لگائی ہے۔ اسی طرح جدید علم زبان نے اس مخصوص میدان سے زبانوں کو مختلف طبقاتی درجوں میں انفرادیت اور اہمیت دی بخشی۔ ممکن ہے زبانوں سے متعلق سوچنے سمجھنے کا یہ علمی وسائنسی استدلال ہی دنیا کو کوئی عالمی زبان (Universal Language) کا راستہ دکھائے جو موجودہ حالات میں ایک شاعرانہ تصور ہے۔

❖❖❖❖

(۱) ادبی ولسانی تحقیق اصول اور طریق کار، عبدالستار دلوی، بمبئی، ۱۹۸۴ء، ص ۲۵۱ تا ۲۵۶۔

تحقیق و تنقید[1]

پروفیسر ڈاکٹر نگیندر (مترجم بدیع الزماں)

الوچنا (تنقید) کے لفظی معنی ہیں ہمہ گیر مشاہدہ۔ ادب میں تنقید کا مطلب ہے کسی ادبی تخلیق کا ہمہ گیر جائزہ۔ تنقید میں تین ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے۔(۱) اثر قبول کرنا (۲) تشریح و تجزیہ اور (۳) قدر و قیمت کا تعین یا فیصلہ۔ تنقید میں نئی تحقیق کے مطالعہ سے دل میں پیدا ہونے والے تاثرات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد تنقید ردعمل کے دلکش یا غیر دلکش ہونے کے اسباب کا تجزیہ کرتی ہے، جمالیات کے مطابق ہیئت کا، نفسیات کی روشنی میں فنکار اور قاری کی ذہنی کیفیات کا اور سماجی علوم کی روشنی میں دونوں کی سماجی حالت کا تجزیہ کر کے یہ واضح کرتی ہے کہ کوئی فنی تخلیق قاری کو اچھی یا بری کیوں لگتی ہے۔ آخر میں دونوں طریق عمل کی مدد سے نئی تخلیق کی قدر و قیمت متعین کی جاتی ہے۔ تنقید کی یہ تین منزلیں ہیں جن سے نقاد کو گزرنا ہی پڑتا ہے۔ نتائج میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اچھی تنقید میں ان تینوں میں سے کسی کو بھی نظر انداز کرنا مشکل ہے۔

تحقیق اور تنقید کا باہمی تعلق

مندرجہ بالا سطور سے ظاہر ہے کہ تحقیق اور تنقید نہ صرف ہم جنس ہیں بلکہ ان کی زیر جنس بھی ایک ہی ہے۔ لہٰذا دونوں میں بہت مماثلت ہے۔ دونوں ہی کا طریق عمل بہت حد تک یکساں ہے۔ دونوں میں ہی تشریح و تجزیہ سے کام لیا جاتا ہے اور کوئی فیصلہ کیا جاتا ہے۔ تحقیق ہم جسے حقائق کا بیان کہتے ہیں وہ تنقید میں تشریح و تجزیہ ہے۔ دونوں میں بحث و اسباب و نتائج کی کھوج، باہمی تعلق، مفاہیم وغیرہ کی وضاحت یکساں طور پر ملتی ہے۔ اسی طرح موضوع کی موافقت اور مخالفت میں تمام دلائل کا موازنہ کرنے کے بعد اصل نتائج اخذ کرنا بہت ضروری ہوتا ہے، اس کے بغیر حقائق کا تجزیہ بے معنی ہوگا۔ لہٰذا نتائج اخذ کرنے اور فیصلہ دینے کی اہمیت تحقیق اور تنقید دونوں کے لیے یکساں طور پر تسلیم کی گئی ہے۔ اس کے بغیر سلسلہ فکر پورا نہیں ہوتا۔ حقائق کی بنیاد تحقیق کے لیے تو لازمی ہے ہی لیکن تنقید میں بھی اس کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ حقائق کی مضبوط بنیاد کے بغیر تنقید میں یقین کا عنصر مضبوط نہیں ہونے پاتا۔

ان سب کے باوجود تحقیق اور تنقید ایک دوسرے کے مترادف نہیں ہے۔ سنسکرت حرف و نحو میں جو نفسیات کی کسوٹی پر بھی صحیح ثابت ہوئے ہیں، یہ قاعدہ ہے کہ کوئی بھی دو الفاظ پوری طرح ہم معنی نہیں ہوتے، ان میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے۔ لفظ، انوسندھن، (تخلیق) کا اصل مادہ ''دھا'' ہے جس میں ''سم'' کا سابقہ لگا کر ''سندھان'' لفظ بنتا ہے، اس کے معنی ہوئے نشانہ باندھا اور ''الوچنا'' (تنقید) کا اصل مادہ ہے ''لوچ'' جس کے معنی ہیں دیکھنا۔ اسی اصل مادہ کے مفہوم کی بنیاد پر دونوں کے مروجہ مفہوم ہیں۔ آگے چل کر فرق ہو جاتا ہے۔ ایک کا مطلب ہے نشانہ باندھ کر اس کے پیچھے بڑھنا اور دوسرے کے معنی ہیں پوری طرح سے دیکھنا، پرکھنا۔ یہی دونوں کا بنیادی فرق ہے۔ تحقیق میں حقائق کی دریافت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور تنقید میں جانچنے پرکھنے پر۔ اگرچہ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے غیر متعلق نہیں ہیں تاہم حقائق معلوم کرنے کا کام جانچ پرکھ کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جانچنے پرکھنے کا عمل بھی پہلے حقائق کی دریافت سے شروع ہوتا ہے۔ پھر بھی تحقیق اور تنقید کے میدان کی وسعت یکساں نہیں ہے۔ تحقیق کی بعض قسمیں ایسی ہیں جو خالص تحقیق کے دائرے میں نہیں آتیں۔ مثال کے طور پر سوانح حیات کی تحقیق، متن کی تحقیق، لسانیاتی تحقیق وغیرہ تنقید کے زمرے میں شمار نہیں کی جا سکتیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان میں تنقید کا فقدان ہوتا ہے یا ان موضوعات کا محقق تنقیدی صلاحیت اور فیصلہ کرنے کی قوت سے عاری ہوتا ہے۔ دراصل ان سبھی شعبوں میں بھی جانچنے پرکھنے اور نتائج اخذ کرنے کی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی دوسرے شعبوں میں لیکن لفظ تنقید کا استعمال ہم یہاں ادبی تنقید کے مروجہ معنوں میں ہی کر رہے ہیں۔ عام معنوں میں بھی جانچنے پرکھنے کے معنوں میں نہیں۔ اسی طرح تنقید کی کچھ ایسی قسمیں بھی ہیں جیسے تاثراتی تنقید کی مختلف قسمیں۔۔۔ جو تحقیق کی متانت کی متحمل نہیں ہیں۔ لہٰذا یہ ظاہر ہے کہ تحقیق اور تنقید کی وسعت یکساں نہیں ہے۔

اپنے مطلب کو اور واضح کرنے کے لیے تنقید کے اصلاحی مفہوم کو اور واضح کرنا ضروری ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار ہمارے کسی امتحان کے پرچہ میں سوال تھا کہ ''تنقید آرٹ ہے یا سائنس''؟ مجھے یاد نہیں کہ اس وقت میں نے اس سوال کا کیا جواب دیا تھا لیکن آج میرے ذہن میں اس کا جواب واضح ہے۔

تنقید یعنی ادبی تنقید آرٹ کی سائنس ہے۔ تنقید نہ تو اس مفہوم میں اس کا ادب (تخلیقی ادب) ہے جس مفہوم میں شاعری، ناول، افسانہ وغیرہ ہے اور نہ اس مفہوم میں وہ علمی ادب ہے جس مفہوم میں فلسفہ، نفسیات یا منطق ہیں۔ یہ اپنی مستند شکل میں تخلیقی ادب کا سائنسی مطالعہ ہے۔ موضوع کا اثر اس کے اسلوب اظہار پر لازمی طور پر پڑتا ہے۔ کیونکہ موضوع کے عناصر، مقاصد وغیرہ اس کو لازمی طور پر متاثر کرتے رہتے ہیں۔ احساس اور تخیل ادب کے اجزائے ترکیبی ہیں اور جمالیات اس کی روح ہیں۔

لہٰذا ادبی جائزہ میں ادب کے اجزائے ترکیبی یعنی احساس اور تخیل اور اس کی روح یعنی رس (جمالیات) کی آمیزش ہو ہی جاتی ہے۔ اسی طرح تنقید میں آرٹ کے عناصر لازمی طور پر موجود رہتے ہیں۔ اس میں شخصیت کا اظہار کسی نہ کسی شکل میں ضرور ہوتا ہے۔ تحقیق کے متعلق یہ سوال نہیں کیا جاسکتا کہ وہ آرٹ ہے یا علم۔ وہ بلا شک وشبہ علم ہے۔ اس کو آرٹ کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ علم کو ہوسکتی ہے۔ کیونکہ علم کا بھی ایک آرٹ ہوتا ہے، ایک اسلوب ہوتا ہے جو اسے ایک امتیازی خصوصیت عطا کرتا ہے۔ تحقیق کی دفعہ نمبر ۴ میں مناسب یا تسلی بخش، شکل ووضع کا مطلب اسی قدر ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ مثال کے طور پر انشائیہ کا لطیف طرز بیان تحقیق کے لیے نہ تو مناسب ہوگا اور نہ تسلی بخش۔ اس بحث سے ہم یہی نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہیں کہ شخصیت کا اظہار یا آرٹ کا عنصر ادبی تنقید کا ضروری جزو ہے لیکن ادبی تحقیق میں اس کی اہمیت ضمنی ہے۔ اس کے برعکس حقائق کی دریافت، حقائق کی تشریح اور سائنسی طریق کار کے لیے اہم ہی نہیں ہیں بلکہ یہ اس کے خاص اجزاء ہیں۔ کسی نہ کسی کے خارجی یا داخلی حقائق کی دریافت کے بغیر تحقیق ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ان حقائق کی تشریح میں محقق کا زاویہ نگاہ خالصاً خارجی ہونا چاہیے تاکہ حقائق ہی اس کی رہنمائی کریں۔ وہ حقائق کی رہنمائی نہ کرے۔ یوں تو تنقید میں بھی ایسا زاویہ نگاہ ضروری ہے لیکن تحقیق کے لیے یہ لازمی ہے۔ تحقیق کا میدان خالصاً ریاضت کا میدان ہے۔ اس میں داخلیت کی تھوڑی بہت آمیزش سرے سے ممنوع نہیں ہے۔ اس طرح سائنسی طریق کار تحقیق کے لیے بالکل لازمی ہے۔ حوالہ وغیرہ کی پوری تفصیل، اشاریہ، ضمیمہ، فہرست کتب، حاشیہ وغیرہ اسی طریق کار کی علامتیں ہیں۔ دراصل یہ طریق کار تنقید کے لیے بھی غیر مفید نہیں ہے لیکن اس کے لیے یہ لازم نہیں ہے۔ خالص تنقید میں موضوع تنقید کی روح سے ہم کلام ہونے کے لیے نقاد اور قاری اتنا بے قرار رہتا ہے کہ اس طرح کے حقائق کو وہ نظر انداز کرسکتا ہے۔ درحقیقت ان سے اصل موضوع سے ان کی توجہ کے ہٹنے کا امکان ہوسکتا ہے۔

تحقیق اور تنقید کا مقصد براہ راست بھی ایک نہیں ہوتا جیسا کہ ہم ابھی ثابت کرچکے ہیں۔ تحقیق کا مقصد علم میں اضافہ ہے لیکن تنقید کا مقصد ہے علم کی واقفیت۔ جو تحقیق علم کی توسیع میں معاون نہیں ہوتی وہ اصولی طور پر ناکام ہے لیکن تنقید کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ جو تنقید ادب کی روح سے ہمکلام ہونے کا موقع نہیں دیتی یعنی اس کی روح کو صاحب ذوق تک منتقل نہیں کرسکتی اور فنکار اور صاحب ذوق کے درمیان ذہنی رفاقت کا رشتہ قائم نہیں کرتی، وہ اپنے بنیادی مقصد میں ناکام رہتی ہے۔ انجام کے اسی فرق کی بنا پر دونوں کے آغاز میں بھی نمایاں فرق ظاہر ہوجاتا ہے۔ نقاد کا اولین فرض ہے اثر پذیری یعنی موضوع تحقیق کی جانب جذباتی ردعمل محقق کے لیے یہ ضروری نہیں ہے۔ یہ اس کے کام میں مانع بھی ہوسکتا ہے۔ وہ اپنا کام حقائق کی فراہمی سے شروع کرتا ہے جس میں ان کا نقطہ نگاہ بے لاگ رہنا چاہیے۔ اس طرح تحقیق وتنقید کے آغاز وانجام میں ظاہری فرق ضرور ہے۔

اب تک میں نے انتہائی غیر جانب داری سے تحقیق اور تنقید کی مماثلت اور فرق پر روشنی ڈالی ہے۔ اگر آپ اعتراض نہ کریں تو میں اپنے نتائج یہاں اختصار میں لکھ دوں تاکہ آگے بحث میں سہولت ہو۔

مماثلت: (۱) تحقیق اور تنقید ایک ہی علم۔ علم وادب کی دو قسمیں۔

(۲) دونوں کا طریق کار بہت حد تک ایک سا ہے۔ دونوں میں عام طور سے حقائق فراہم کرنے، ان میں سے کچھ ترک کرنے اور کچھ قبول کرنے، ان کی تشریح اور تجزیہ کرنے اور نتائج اخذ کرنے کے طریقوں سے کام لیا جاتا ہے۔

اختلاف: (۱) لیکن تحقیق اور تنقید ہم معنی الفاظ نہیں ہیں۔ تحقیق میں کھوج پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور تنقید میں جانچنے پرکھنے پر۔

(۲) تحقیق کی مختلف قسمیں ہیں جو تنقید کے دائرے میں نہیں آتیں اور اس طرح تنقید کی بعض قسمیں تحقیق کی شرطوں کو پورا نہیں کرتیں۔

(۳) شخصیت کا اظہار یا فنی عنصر تنقید کی لازمی صفت ہے لیکن تحقیق میں اس کی ضمنی اہمیت ہے۔

(۴) بے تعلقی سائنسی نقطۂ نگاہ اور سائنسی طریق کار کی اہمیت تحقیق میں لازمی طور سے ہے۔ تنقید میں اس کی اہمیت ثانوی ہے۔

(۵) تحقیق کا سیدھا مقصد ہے علم کی توسیع اور تنقید کا ہے اصلی صداقت کی واقفیت یا احساس۔

امید ہے کہ اس بحث سے تحقیق وتنقید کے بارے میں آپ کے تصورات کچھ واضح ہوگئے ہوں گے لیکن یہ تو مسئلے کا ایک یعنی پہلا رخ ہے یا آپ یوں کہہ

سکتے ہیں کہ اس کی حیثیت ہمارے موضوع بحث کے لیے حقائق کی بنیاد کی ہے۔ دوسرے رخ کی وضاحت کرنے کے لیے میں اپنے آپ سے اور آپ سے ایک سوال کرتا ہوں۔ کیا خالص تنقید کیا اعلیٰ تنقید لازمی طور پر اعلیٰ تحقیق نہیں ہے یا کیا اعلیٰ ادبی تحقیق اپنی بلند ترین سطح پر تنقید سے مختلف رہتی ہے؟ ادب کا طالب علم ہونے کی حیثیت سے میرے پاس اس کا ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ اعلیٰ تنقید لازمی طور پر اعلیٰ تحقیق بھی ہے اور اعلیٰ ادبی تحقیق اپنی بلند ترین سطح پر تنقید سے مختلف نہیں رہتی۔

اثر پذیری تنقید کی اولین خصوصیت ہونے کے باوجود تاثراتی تنقید عام طور پر کمتر درجہ کی تنقید مانی جاتی ہے۔ شانتی پریہ جی نے جہاں متوازی انداز سے جدید شاعری خاص طور سے چھایا وادی شاعری کے حسن کو بے نقاب کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے، وہاں ان کی تنقید تحقیق کے نقطۂ نظر سے بھی اعلیٰ درجہ کی تحقیق ہے۔ چھایا واد کے جمالیاتی نقطۂ نگاہ کی دریافت اپنے آپ میں کوئی معمولی تحقیق نہیں ہے۔ اب دوسرا رخ لیجیے میں آپ سے کسی ایسے تحقیقی مقالے کا نام جاننا چاہوں گا جو تنقیدی محاسن سے عاری ہونے کے باوجود اعلیٰ تحقیق کا نمونہ ہو۔ آپ شاید لسانیات یا تاریخ سے متعلق تحقیق کی کچھ مثالیں پیش کریں گے۔ لیکن میں تو ادبی تحقیق کا ذکر کر رہا ہوں۔ ادبی تحقیق سے متعلق کچھ تحقیقی مقالوں کا بھی آپ شاید نام لینا چاہیں۔ میں اس سلسلے میں یہی عرض کروں گا کہ ایسی مثالیں بہت کم ہیں۔ ایسے مقالے جن کی حیثیت حقائق کی دریافت سے زیادہ نہیں ہے اعلیٰ تحقیق کے زمرے میں شامل نہیں ہوں گے اور ان کو محض حوالہ کے نقطۂ نگاہ سے ہی اہمیت حاصل ہوگی۔ مغرب میں اور مغرب کے اثر سے اس ملک میں بھی ایسی مثالوں کی اہمیت بڑھ رہی ہے۔ میں ان کی اہمیت سے انکار نہیں کروں گا لیکن ان کی حیثیت تو محض تحقیق کے وسائل کی ہے۔ ہندی میں ایسی کئی اہم کتابیں ہیں جن میں بہت بڑی تعداد میں نیا مواد اکٹھا کیا گیا ہے۔ ان سے ہندی ادب اور ہندی ادب کے محقق کو بلا شک وشبہ فائدہ پہنچا ہے لیکن ان کو معیاری تحقیق کا درجہ دینے پر اصرار نہ کیجیے۔ ان کی حیثیت تو معیاری تحقیق کے خاکہ کی ہے۔ اگر ہم بہت باریکی سے غور کریں تو ہمیں تمام علوم کا ایک ہی مقصد نظر آئے گا اور وہ ہے صداقت کی دریافت۔ صداقت اور حقیقت میں یہ فرق ہے کہ ایک کا تعلق ادراک سے ہے اور دوسرے کا احساس سے۔ ادراک سے مراد ایسی واقفیت سے ہے جو اس خمسہ یا عقل کے ذریعہ حاصل ہو اور احساس کا مطلب اصلیت کا مشاہدہ کرنا۔ اصلیت کا مشاہدہ کرنے کے لیے حقائق کے ادراک سے آگے بڑھ کر اس میں صداقت کی واقفیت ضروری ہے جس کا اشارہ حقائق کرتے ہیں۔ یہی تنقید کی بلند ترین سطح ہے اور میں کہوں گا کہ تحقیق کی بلند ترین سطح بھی یہی ہونی چاہیے۔ اس کے بغیر تحقیق محض حقائق کے ادراک تک محدود رہے گی، صداقت کو پالینے کا ذریعہ نہ بن سکے گی۔ ایسی صورت میں اس کا شمار علم میں نہ ہوگا بلکہ اسے فنی علم بتایا جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ مزاج اور پیشہ دونوں کے لحاظ سے محقق ہونے کی بنا پر آپ کو تحقیق کی یہ منزل منظور نہ ہوگی۔ تحقیق کے عام طور پر دو طریق کار ہیں۔ ایک فلسفہ کا اور دوسرے سائنس کا، پہلا طریقہ سیدھا ہے اور اس سے کام بھی تیزی سے ہوسکتا ہے۔ وہ براہِ راست نشانہ پر تیر پھینکتا ہے۔ دوسرے کی بنیاد زیادہ مضبوط و مستحکم ہے لیکن اس کی رفتار سست ہے۔ دونوں کے اپنے محاسن ومعائب ہیں، پہلے کے نتائج آسانی سمجھ میں تو آجاتے ہیں مگر مبہم بھی ہوسکتے ہیں۔ دوسرے میں ابہام کا احتمال نسبتاً کم ہے مگر اس میں ایک بڑا خطرہ یہ ہے کہ محقق کی نظر حقائق کے دام میں الجھ جاتی ہے اور اصل عنصر کو نظر انداز کردیا جاتا ہے۔ اجاریہ شکل کی تحقیق میں پہلے طریق کار کے محاسن وعیوب تھے۔ تقریباً اسی زمانے میں ہمارے کچھ علماء مغرب سے تحقیقی کام کرکے واپس آ گئے تھے جہاں سائنسی طریق کار سے ادبی تحقیق میں بھی کام لیا جارہا تھا۔ یہاں آ کر انہوں نے دیکھا کہ ہندی تحقیق میں اس کا سراسر فقدان تھا۔ اس کا طریق کار نامکمل اور غیر منظم تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر دھرمندر ورما وغیرہ نے ہندی میں سائنسی طریق کار کو مروج کرنے کی منظم کوشش کی اور اس کے نتیجے میں تحقیق کا نیا طریقہ معرضِ وجود میں آیا جو روایتی طریقہ سے مختلف تھا۔ سائنسی طریق کار اور روایتی طریقہ کار کی اس ٹکر نے اس نعرہ کو جنم دیا کہ تحقیق تنقید نہیں ہے اور ان دونوں کی علیحدگی سے فائدہ بھی ہوا اور نقصان بھی۔ فائدہ یہ ہوا کہ تحقیق میں حقائق تلاش کرنے کی اہمیت بڑھی۔ حقائق کی مضبوط بنیاد پر ٹکی ہونے کی وجہ سے وہ زیادہ مستند ہوئی اور اس کی ساکھ میں اضافہ ہوا۔ طریق کار عمل میں سائنسی ترتیب اور کاملیت پیدا ہوئی۔ خارجی نقطۂ نظر سے تنقید وتبصرہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ انفرادی مذاق کی رنگارنگی میں اعتدال آیا اور اس سے جو غلط نتائج نکل رہے تھے ان پر قابو حاصل کیا گیا۔ اس سے نہ صرف ہندی تحقیق کو بلکہ تنقید کو بھی فائدہ پہنچا۔ اگرچہ نقصان بھی کچھ کم نہ ہوا۔ اس سے بصیرت میں کمی آئی، حقائق پر نظر مرتکز ہوجانے کی وجہ سے اصل عنصر کی اہمیت کم ہونے لگی۔ محقق شاخوں میں الجھ کر، جڑ کو بھولنے لگا۔ تجزیہ کی جگہ اعداد وشمار کی بہتات ہونے لگی۔ دل کے لطیف رموز کے اظہار کے لیے میکانکی تنقید کا سہارا لیا گیا۔ چونکہ تخیل کو پابند کرنے پر زور دیا گیا اس لیے خیال اور فکر بھی کمزور پڑ گئے۔ بیرونی ہیئت کا اتنا بول بالا ہوا کہ ادب کی اصل روح مرجھانے لگی۔ ادب کی روح کے مشاہدہ کو نئے نقاد چھایا وادی تنقید کہنے لگے۔ ہندی تحقیق کو ایک انتہا پسندی سے تو نجات ملی مگر وہ دوسری انتہا پسندی کا شکار ہوگئی۔ یہ میلان اور بھی تشویشناک تھا اور اگر بروقت اس پر قابو نہ پایا جاتا تو ہمارے یہاں علم کا معیار یقیناً گر جاتا۔ درحقیقت اس میلان کے پس پردہ اس بنیادی نظریہ کو نظر انداز کیا گیا تھا کہ ہر موضوع کے مطالعہ کا طریق کار اس کے اپنے مزاج سے ہی اخذ ہونا چاہیے۔ مطالعہ کے اصول اور طریق کار کا اپنا علیحدہ وجود نہیں ہوتا، وہ ہمیشہ موضوع پر ہی مبنی ہوتے ہیں۔ لہٰذا جو عالم سائنس کے غیر جانبدار نقطۂ نظر اور خالصاً خارجی طریق کار کو جوں کا توں ادب میں برتنا چاہتے ہیں وہ اس بنیادی اصول کو

فراموش کر دیتے ہیں کہ خارجی شکل تو روح کا عکس محض ہے۔ لہٰذا روح ادب کی تحقیق کے لیے سائنس کا استعمال اس حد تک تو مناسب اور مفید ہے جس حد تک روح انسان کی ترقی کے لیے مختلف طبعی اور سماجی علوم کا۔ لیکن اس سے آگے بڑھنا خطرناک ہوگا۔ اس سے ادبی قدروں کے درہم برہم ہو جانے کا احتمال ہے۔ میرا مطلب اصل میں یہ ہے کہ ادبی تحقیق ادبی دائرے تک ہی محدود رہنی چاہیے۔ ایسے مواد کو جو ادب کے زمرے میں نہیں آتا یعنی جو اپنے موضوع و اسلوب بیان کے ذریعہ صاحب ذوق کا دل مسحور کرنے میں یکسر نا قابل ہے، ادبی تحقیق کے تحت قابل تعریف نہیں سمجھنا چاہیے۔

میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

(۱) تحقیق اور تنقید یقینی طور پر ایک دوسرے کے مترادف نہیں ہیں، محقق کو یہی سمجھ کر اپنا کام شروع کرنا چاہیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حقائق کی تلاش کی طرف سے وہ باخبر رہے گا اور اس کے تجزیہ کی حقائق سے متعلق بنیاد مستحکم ہو جائے گی۔ وہ دوسروں کے جمع کیے ہوئے حقائق پر انحصار نہیں کرے گا بلکہ خود بھی نیا مواد فراہم کرنے کی کوشش کرے گا یا کم از کم جو مواد فراہم ہو چکا ہے اس کے مستند ہونے کے متعلق اپنا اطمینان ضرور کرے گا۔ ہر ایک محقق کو اس میلان کو آگے بڑھانا چاہیے۔

(۲) متعدد موضوعات ایسے ہو سکتے ہیں جن میں محض حقائق کی دریافت سے بھی کام چل سکتا ہے۔ کم از کم پی۔ایچ۔ڈی کی سند کے لیے تو اتنا ہی کافی ہو سکتا ہے لیکن یہ تحقیق کا آغاز ہے انجام نہیں۔ اسی موضوع پر حقائق کی تشریح اور موزوں تنقید کے ذریعہ اور بھی گہری کھوج کے امکانات موجود رہتے ہیں۔ وہی محقق یا کوئی اور محض ان سے استفادہ کر سکتا ہے اور اس کو کرنا چاہیے۔ مثال کے لیے دھرو داس کی زندگی اور شاعرانہ سرگذشت پر کھوج کرنے کے لیے وہی یا کوئی دوسرا محقق دھرو داس کی شاعری کے محاسن فلسفیانہ پس منظر وغیرہ پر کھوج کر سکتا ہے۔

(۳) حقائق کی تلاش تحقیق کی صرف بنیاد ہے اور ابتدائی شکل میں ہونے کے سبب نسبتاً پست درجہ کی بھی ہے۔ ڈی لٹ کے لیے اس قسم کے تحقیقی کام کی جب کہ اس کا میدان بہت ہی وسیع نہ ہو۔۔۔ میں سفارش نہیں کر سکتا۔

(۴) میں ایسے اعلیٰ درجہ کے محقق کا تصور بھی نہیں کر سکتا جس میں تنقیدی صلاحیت موجود نہ ہو۔ تحقیق کے قوانین کے مطابق ممتحن کو اس کی تصدیق کرانی پڑتی ہے کہ محقق نے اپنے مقالے میں تنقیدی صلاحیت کا ثبوت دیا ہے۔ صداقت کے تین مدارج ہیں۔ حقائق جمع کرنا، فکر اور یقین اور معلوم حقیقت کو فکر میں تبدیل کیے بغیر علم میں اضافہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ حقیقت کو فکر کی شکل دینے کے لیے شدت احساس کی ضرورت پڑتی اور فکر کو یقین میں بدلنے کے لیے نظریہ لازمی ہے اور یہ دونوں ہی ادبی تنقید کے جزو لاینفک ہیں۔ لہٰذا اعلیٰ ادبی تنقید ادبی تحقیق کی بہترین شکل ہے۔

❖❖❖❖

(۱) تحقیق و تنقید، ڈاکٹر نگیندر، مشمولہ رہبر تحقیق، دہلی، ۱۹۷۶ء

اُردو میں جدید تحقیق کا آغاز[۱(الف)]

سرسید اور ان کے بعض رفقاء

ڈاکٹر محمود الٰہی

فورٹ ولیم کالج اور دہلی کالج اگرچہ اُردو شعر وادب میں زندگی کی ایک تاب ناک کرن کی نشاندہی کرتے ہیں، لیکن جہاں تک تحقیقی فتوحات کا تعلق ہے، ان کا وجود اس باب میں اہم نہیں۔ ان اداروں نے تحقیق کے میدان میں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا جس سے ایک نئے سفر کا اندازہ لگایا جا سکے۔ سنہ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد ملک کے ہر شعبے میں جو انقلاب رونما ہوا، اس کا حال سب کو معلوم ہے۔ اسی طرح سرسید نے بالخصوص اُردو دانوں کی جو رہبری کی ہے، اس کا بھی علم سب کو ہے۔ سرسید پر اگرچہ ابھی تک بہت کم لکھا گیا ہے لیکن یہ کمی اس حقیقت کے راستے میں حائل نہ ہو سکی کہ اُردو کی نشاۃ ثانیہ میں سب سے بڑا ہاتھ سرسید کا ہے نئے دور میں جامع حیثیات کی ترکیب سب سے زیادہ سرسید پر صادق آتی ہے۔ ملک وقوم اور علم وادب کی بالیدگی اور توانائی بخشنے کے لیے انھوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ ان کی سب سے بڑی دین یہ ہے کہ اُردو زبان ان کے ہاتھوں ایک ہنگامی منزل اور دور کشاکش میں آزادی رائے اور بالیدگی فکر کا مظہر بن گئی۔

جس عہد میں سرسید کا تصنیفی اور تحقیقی شعور پختہ ہو رہا تھا، وہ قدیم معیار تحقیق کے لحاظ سے کم اہم نہیں۔ آزردہ، شیفتہ، غالب اور امام بخش صہبائی علمی اور فنی رموز ونکات کے باب میں جو محققانہ بصیرت رکھتے تھے، ان سے سرسید بھی فیض یاب ہوئے اور ''آثار الصنادید'' کی تصنیف (۱۸۴۶ء) تک ان کی طبیعت میں اسلاف کی صالح تحقیقی روایات رچ بس چکی تھیں۔ ''آثار الصنادید'' کے جو دو ایڈیشن (پہلا ۱۸۴۷ء میں اور دوسرا ۱۸۵۴ء میں خود سرسید کی تہذیب وترتیب کے ساتھ شائع ہوئے تھے) ان کے درمیانی وقفے سے سرسید کی قوت تحقیق کی رفتار سفر کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ اس سے پہلے ایڈیشن نے اُردو تحقیق کو ایک نیا موضوع دیا۔ مگر اس میں نئے آداب تحقیق کے واضح نشانات نہیں ملتے۔ اس سے یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ سرسید نے اس کی تصنیف کے پیچھے کتنے ہفت خواں طے کیے ہوں گے اور کتنا خون جگر صرف کیا ہوگا۔ مگر حق بات یہ ہے کہ وہ تحقیق جدید کے مبادیات تک نہ پہنچ سکے۔ اس میں نہ تو روایت کو درایت کی کسوٹی پر پرکھنے کا رجحان ملتا ہے اور نہ استدلالی طریقہ کار اپنانے کا میلان پایا جاتا ہے۔ یہ ایڈیشن مآخذ کے حوالے اور ان کی ثقاہت کی چھان بین سے بھی خالی ہے۔ ان خامیوں کے باوجود اس ایڈیشن کو سرسید کے پہلے تحقیقی قدم سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، جو ایک نئے رخ کے تجسس میں اٹھا ہے۔ اس ایڈیشن کو مغربی عالموں نے پسندیدہ نظروں سے دیکھا اور اسی کارنامے کے توسط سے سرسید انگریزوں اور انگریزی علم وادب سے زیادہ قریب ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد مسٹر رابرٹس کے ایما پر انھوں نے ''آثار الصنادید'' پر نظر ثانی کی اور اسے ۱۸۵۴ء میں شائع کیا۔ ''آثار الصنادید'' کا دوسرا ایڈیشن مغربی آداب تحقیق کا حامل ہے۔ اس ایڈیشن کی نہ صرف زبان بدلی ہوئی ہے بلکہ مطالب ومشتملات میں اچھا خاصا فرق ملتا ہے۔ اس کی ترتیب وتہذیب، تحقیق کے ایک نئے نقطۂ نظر کی آئینہ دار ہے۔ اس ایڈیشن کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس سے وہ ساری باتیں نکال دی گئی ہیں جن پر داستانی رنگ غالب تھا اور جو ہر طرح محتاج ثبوت تھیں۔ پہلے ایڈیشن کا انداز بیان جذباتی اور داستانی تھا، دوسرے ایڈیشن کا مورخانہ اور محققانہ ہے۔ انھوں نے جو کچھ بھی کہا، اس کی کوشش کی کہ اپنے پڑھنے والوں کو اپنی معلومات کے ذرائع اور مآخذ بھی بتائیں۔ دوسرے ایڈیشن کے دیباچے میں اس کے افادی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے سرسید کہتے ہیں:

''۔۔۔ پہلی کتاب میں جو حال بیان کیا گیا تھا، اس کی سند نہ تھی۔ اب کی کتاب میں جو حال لکھا گیا ہے، اکثر اس کی سند کے لیے، نام اس کتاب تاریخ کا جس سے وہ حال لکھا گیا، حاشیے پر مندرج ہے[(ب)]''۔

اس دیباچے میں سرسید نے اپنے مآخذ اور ذرائع کی فہرست بھی دی ہے۔ پہلا ایڈیشن تاریخی اور موضوعاتی ترتیب کے لحاظ سے ناقص تھا۔ دوسرے ایڈیشن میں انھوں نے یہ نقص دور کیا اور ہر بات کا اشاریہ قائم کیا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ سرسید مغربی آداب تحقیق سے واقف ہو چکے تھے اور یہ سمجھ گئے تھے کہ مواد کو کس طرح مرتب کرنا چاہیے۔ دونوں ایڈیشنوں کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ سرسید کے انداز تحقیق نے ارتقائی منزل کتنی اور کس طرح طے کی۔ شہر دہلی کی وجہ تسمیہ بتاتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

(پہلا ایڈیشن)

''اس بات میں بڑا اختلاف ہے کہ اندر پت کو دلی کب سے کہنے لگے اور اس میں تین روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ لفظ ڈھلی ہے ہندی ذال سے اور ڈھلی ہندی میں نرم زمین کو کہتے ہیں کہ جہاں میخ نہ گڑ سکے۔ یہاں کی زمین بھی بہت نرم تھی اور میخ نہ گڑ سکتی تھی، اس واسطے اس کو بھی ڈھلی کہنے لگے۔ دوسری بات یہ کہ دہلو ایک زمین دار تھا۔ اس نے اپنے نام پر ایک گاؤں آباد کیا جب سے اس کو دہلی کہنے لگے۔ تیسری روایت یہ ہے کہ راجا دلیپ نے اپنے نام پر شہر آباد کیا۔ جب سے دلی کہنے لگے اور اب لوگوں کی زبان پر دلی بغیر ہ کے جاری ہے اور اگلی کتابوں میں دھلی، ہ کے ساتھ مشہور ہوگا اور پھر دلی بغیر ہ کے کہنے لگے ہوں گے، اس سبب سے دونوں نام بولنے اور لکھنے میں آتے ہیں''۔[۲]

(دوسرا ایڈیشن)

''اس بات میں بڑا اختلاف ہے کہ اندر پت کا نام کیسے دلی ہوگیا۔ یہ بات بہت مشہور ہے کہ راجا دلیپ نے جو سورج بنسیوں میں اور چندر بنسیوں میں کا ایک راجا ہے، اپنے نام پر دلی آباد کی لیکن یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اس واسطے کہ ہندوؤں کی اگلی پوتھیوں میں باوجودیکہ راجا دلیپ (الف) کا ذکر ہے مگر کہیں دلی کا نام نہیں بلکہ جہاں لکھا ہے، اندر پت ہی کر کر لکھا ہے اور بعضے (ب) تاریخوں میں لکھا ہے کہ ۳۰۷ھ مطابق ۹۱۹ء کے تنوروں کے خاندان میں سے ایک نے شہر اندر پت کے برابر دھلی شہر بسایا اور جو کہ (ج) وہاں کی زمین نرم تھی اور ہندی میں دھلی نرم زمین کو کہتے ہیں جہاں میخ نہ تھم سکے۔ اس سبب سے وہ بستی دھلی کر کر مشہور ہوئی۔ مگر اس سنہ میں نہ تنوروں کے خاندان میں حکومت تھی اور نہ اس سبب سے دہلی نام پڑ جانا قرین قیاس ہے، اس واسطے یہ بات قابل اعتماد نہیں۔ مشہور بات جو صحیح بھی معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ راجا دھلو (د) قنوج کے راجا نے، اس سبب سے کہ دلی کے راجا اکثر قنوج کے تابع رہے ہیں، اندر پت میں اپنے نام پر شہر بسایا جب سے اس شہر کا نام دھلی مشہور ہوا بلکہ اصلی نام دھلی کا دھلو ہے۔ چنانچہ (ہ) امیر خسرو نے جلال الدین فیروز شاہ کو خطاب کر کے دھلو کا لفظ ایک شعر میں باندھا ہے۔ شعر

باگ اسم بخش یاز آخور بفرما بارگیر
یا بفرمان دہ کہ گردوں شیئم و دھلو روم''

راجا دھلو راجا پورس یعنی خود راجا کمایوں کا ہم عصر تھا۔۔۔۔ یہ واقعہ تین سو اٹھائیس ۳۲۸ قبل مسیح ہوا کہ تخمیناً یہی زمانہ دہلی شہر بسنے کا خیال ہو سکتا ہے''۔[۳]

[(الف) مرات آفتاب نما۔ (ب) تاریخ فرشتہ (ج) نزہت القلوب (د) مرات آفتاب نما۔ (ہ) جواہر الحروف]

سرسید نے امام غزالی اور دوسرے متکلمین کے عہد کا اپنے عہد سے مقابلہ کرتے ہوئے ایک بار کہا تھا:

''ان کا زمانہ ایسا تھا کہ ''لا ادری'' (میں نہیں جانتا) کہہ کر ان کا پیچھا چھٹ گیا، مگر ہمارا زمانہ ایسا نہیں ہے۔ تمام علوم گو ہم میں نہیں، مگر دوسری قوموں میں بدرجہ اعلیٰ پہنچ گئے ہیں اور پہنچتے جاتے ہیں۔ بس اس زمانے میں کسی بات کے مدعی کو دعوا کرنا اور پھر ''لا ادری'' کہہ دینا کافی نہیں۔ ایسا کرنا خود اپنی ہنسی اڑانا ہے۔۔۔۔۔''۔[۴]

اگرچہ سرسید نے یہ بات علم کلام کے باب میں کہی تھی لیکن ان کا اصول تحقیق متعین کرنے میں یہ بات بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ ''آثار الصنادید'' کے پہلے ایڈیشن میں وہ خود ''لا ادری'' کے قائل تھے لیکن دوسرے ایڈیشن تک پہنچتے پہنچتے انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ آنے والے دور میں اس قسم کے جملوں کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ ''لا ادری'' جیسے جملوں کو محقق کا عذر لنگ اور دلیل درماندگی سمجھتے ہیں۔ انھیں یقین تھا کہ اگر دقت نظر، انہماک اور توجہ سے کام کیا جائے تو مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

دونوں ایڈیشنوں کے اسلوب بیان کا تجزیہ حالی نے بڑے دل نشین انداز میں کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''بڑی خوبی اس ایڈیشن میں یہ ہے کہ اس کی عبارت میں بہ نسبت پہلے ایڈیشن کے نہایت سادگی ہے اور اس کا بیان ایشیائی مبالغوں اور تکلفات باردہ سے بالکل پاک ہے''۔[۵]

پہلے ایڈیشن میں صرف عبارت آرائی اور مبالغہ پردازی ہی نہیں تھی۔ عمارتوں کے کھنڈر دیکھ کر ان پر رقت طاری ہو جاتی ہے اور تاریخی حقائق پیش کرتے

وقت وہ جذباتیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے پڑھنے والوں کو عبرت حاصل کرنے کی تلقین کرنے لگتے ہیں اور بے ثباتی عالم پر سلسلہ وعظ شروع کر دیتے ہیں۔ عبرت حاصل کرنے کی تلقین کرنا اور بے ثباتی عالم پر سلسلہ وعظ اپنی جگہ قابل تحسین باتیں ہیں لیکن ایک مورخ اور محقق کو اس سے کیا سروکار؟ سرسید نے پہلے ایڈیشن کی اس خامی کو دور کیا اور دوسرے ایڈیشن سے بڑی حد تک اس طرح کے بیانات خارج کر دیے۔

''آثار الصنادید'' کے دونوں ایڈیشنوں کا فرق قدرے تفصیل کے ساتھ مختصراً یہ بتانے کے لیے بیان کیا گیا ہے کہ ترتیب و تہذیب اور مطالب و مشتملات کے لحاظ سے سرسید کے تحقیقی اکتسابات کی بنیاد ''آثار الصنادید'' کا دوسرا ایڈیشن ہے، جب وہ انگریزوں سے قریب تر آئے اور ان کے علمی و فنی نکات سے متاثر ہوئے۔

تصحیح ''آئین اکبری'' (۱۸۵۵۔۵۶) سرسید کا پہلا اور آخری کارنامہ ہے جس پر انھوں نے خود فخر کیا۔ وہ کہتے ہیں:

''۔۔۔ اگر بر بخت بیدار خود صد ہزار بار نازم رواست و کلاہ گوشۂ افتخار بفلک رسالم سزاست''۔۔۔[۷]

اس وقت تک ملک میں تصحیح و ترتیب اور ایڈیٹنگ کا رجحان عام نہیں ہوا تھا۔ اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ یہاں عربی، فارسی اور اُردو کے چھاپہ خانوں کی کمی تھی۔ جب پریس کا رواج عام ہوا تو اہل علم ایڈیٹنگ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس میدان میں سرسید کو اولیت حاصل ہے۔ اس کارنامے کی انجام دہی میں خود سرسید کے الفاظ میں ''نقد روان عمر'' کے صرف ہو گیا۔ امام بخش صہبائی نے ان کی محنت شاقہ کو بجا طور پر ''دود چراغ خوردن''[۸] سے تعبیر کیا تھا۔ اس کے عمیق مطالعے کے بعد یہ نتیجہ آسانی سے نکالا جا سکتا ہے کہ سرسید نے اس کے ایک ایک لفظ پر غور و خوض کر کے اس کا صحیح مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالی سرسید کو داد دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''آئین اکبری اول تو زبان اور طرز بیان کے اعتبار سے ایک نئی طرح کی کتاب تھی۔ دوسرے جس قسم کے مضامین اس میں بیان کیے گئے ہیں، فارسی لٹریچر میں کبھی اس قسم کے مضامین بیان نہیں ہوئے تھے، اس لیے اس کے پڑھنے سے جی الجھتا تھا۔ پھر آئین اکبری کے نسخے کاتبوں کے سہو و خطا سے مسخ ہو گئے تھے۔ سرسید نے اول جہاں تک مل سکے اس کے متعدد نسخے بہم پہنچائے۔ ان میں ایک آدھ نسخہ صحیح بھی مل گیا۔ اس طرح غلط اور صحیح نسخوں کے باہمی مقابلہ کرنے سے ایک نسخہ سب سے زیادہ صحیح تیار ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے فارسی، عربی، ترکی، ہندی اور سنسکرت کے اکثر غریب الفاظ کی شرح کی۔ جو اصطلاحیں اکبر کے زمانے میں ہر ایک آئین کے متعلق مستعمل تھیں یا خود ابوالفضل نے اختراع کی تھیں، ان کی جا بجا تشریح کی۔ اس زمانے کے اوزان و نقود کی اس زمانے کے اوزان نقود سے مطابقت کی۔ جن جدولوں میں مصنف نے کچھ خانے خالی چھوڑ دیے تھے اور تمام نسخوں میں وہ خانے خالی پائے گئے، ان کو اور کتابوں سے تحقیق کر کے معمور کیا۔ کہیں کہیں جدولوں میں خود مصنف نے غلطی کی تھی، اس کو بہت کوشش سے تحقیق کر کے صحیح کیا۔ بعض جدولوں میں ہندسوں کی جگہ حروف لکھے ہوئے تھے، ان کی قیمت ہندسوں میں بھی ظاہر کر دی۔ بعض جدولیں جو تمام نسخوں میں مختلف پائی گئیں، وہ آئین کے انگریزی ترجمے کے مطابق جس میں ہر جدول نہایت صحت کے ساتھ لکھی گئی تھی، کتاب میں داخل کیں۔۔۔۔''[۹]

حالی نے ''آئین اکبری'' کی جن خوبیوں کا ذکر کیا ہے، وہ محتاج ثبوت نہیں۔ یہ موجودہ معیار تدوین کے تقاضوں کو بڑی حد تک پورا کرتا ہے۔ اگر اس میں کمی ہے تو صرف اتنی کہ اختلاف نسخ کی وضاحت نہیں کی گئی ہے لیکن اس کی دوسری خوبیاں اس خامی کا احساس نہیں ہونے دیتیں۔ سرسید نے مغرب کے آداب تدوین سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور ''آئین اکبری'' کا معیاری متن پیش کیا۔ تشریح و تحشیہ میں انھوں نے اگر ایک طرف تقویم البلدان بہادر خانی، زیج محمد شاہی، زیج الغ شاہی، غیاث اللغات، قاموس، بہار عجم، جہانگیری، تاریخ بدایونی، برہان وغیرہ سے استفادہ کیا تو دوسری طرف انھوں نے انگریزی کی بعض مستند کتابوں کو اپنا ماخذ قرار دیا۔ ایک موضوع پر مشرق و مغرب کے مستند ماخذ کے حوالے کے بعد استخراج نتائج کی یہ پہلی شعوری کوشش تھی۔ سرسید نے صرف ابوالفضل کے مطالب میں خامی نہیں نکالی بلکہ کہیں کہیں ''دانایان فرنگ'' کے حوالے سے دوسرے مشرقی محققین کی آراء کو بھی غلط قرار دیا۔ ''آثار الصنادید'' سے ''آئین اکبری'' تک کا فاصلہ کوئی زیادہ طویل نہیں ہے لیکن سرسید کے تحقیقی اکتسابات کے لحاظ سے یہ کافی اہم ہے۔ اگر ''آثار الصنادید'' کے پہلے ایڈیشن میں سرسید کے تحقیقی شعور پر جذباتیت اور افسانویت کا پردہ پڑا ہوا تھا، تو ''آئین اکبری'' تک آتے آتے ان کی رگوں میں تلاش و تفحص خون بن کر دوڑنے لگا تھا۔ ''آئین اکبری'' میں سرسید ایک مغربی محقق کے روپ میں دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا موضوع تحقیق مشرقی تھا لیکن انداز و آداب مغربی۔ اب وہ مسائل کی تہوں تک پہنچنے کا ڈھنگ جان گئے تھے اور جس فن کو ہاتھ لگاتے تھے اس کے ماہر و منتہی بن جانا چاہتے تھے۔ اب وہ روایت پرست اور مقلد نہیں رہ گئے تھے، بلکہ ہر بات پر ناقدانہ اور محققانہ نظر ڈالنے کے عادی ہو گئے

تھے، ایک اہل الرائے کی ذات میں تشکیک و تحقیق کی جو کشاکش ملتی ہے، سرسید اس کے اسیر ہو چکے تھے۔ اب وہ دنیائے تحقیق کے آشنائے راز ہو چکے تھے۔ مغربی تعلیم وتہذیب کی طرف سرسید کے انعطاف و میلان کا زمانہ غدر کے بعد بتایا جاتا ہے۔ حالانکہ ''آئینِ اکبری'' میں وہ مشرقی علوم کی بے مائیگی کا شکوہ کرتے ہوئے اور مغرب پر قدر واحترام کی نگاہ ڈالتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

غدر نے اگرچہ سرسید کو ایک نئی منزل پر پہنچا دیا تھا لیکن ان کا ذوقِ تدوین وتصحیحِ کتب ماند نہیں پڑا۔ ''آئینِ اکبری'' کے بعد ''تاریخِ فیروز شاہی'' (ضیاء الدین برنی) اور ''توزکِ جہاں گیری'' کی تصحیح کی جو ۱۸۶۲ء اور ۱۸۶۴ء میں علی الترتیب شائع ہوئیں، یہ دونوں کتابیں بھی ایڈیٹنگ کا کامیاب نمونہ ہیں لیکن ان میں وہ محنت و دقتِ نظر صرف نہیں ہوئی جو ''آئینِ اکبری'' میں ملتی ہیں۔ ''توزکِ جہاں گیری'' کا سرسید والا نسخہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے۔ ان کے زمانے میں اس کا جو انگریزی ترجمہ (مترجم پرائس) متداول تھا وہ جعلی تھا۔ سرسید نے اپنے نسخے کی بنیاد مستند مخطوطات پر رکھی اور بعد میں مغربی اور ہندوستانی مورخین نے سرسید کے نسخے کو ہی اپنے مآخذ قرار دیا۔ راجرز Rogers نے سرسید کے نسخے کا انگریزی میں ترجمہ کیا جو آج تک مستند مانا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں مشہور مورخ ڈاکٹر بنی پرشاد کہتے ہیں۔

It is now settled beyond all possibility of doubt that Major Price's manuscript represents a forgery and that the Tuzke Jahangiri as published by Syed Ahmed Khan forms the real memoirs.[10]

سرسید نے غدر کے ہنگاموں کو ایک محقق کی نگاہ اور ایک مصنف کے دل وجگر کے ساتھ جھیلا۔ ایک محقق سے جس حقیقت پسندی کی توقع کی جاتی ہے، وہ سرسید کی ذات میں تھی اور ایک مصنف جس حق گوئی اور بے باکی کا حامل ہوتا ہے، اس کے سرسید بھی علمبردار تھے۔ غدر نے ان کا موضوعِ قلم بدل دیا اور وہ سیاست و مذہب کے ایک فعال رکن بن گئے۔ رسالہ ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' ان کی اسی تبدیلیِ موضوع کا نتیجہ ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سرسید نے یہ رسالہ موت کے سایے میں لکھا۔ وہ اپنے ضمیر کی آواز نہ دبا سکے۔ انھوں نے غدر کے اسباب کا تجزیہ کیا اور اربابِ اقتدار کے سامنے ایک محقق کی طرح واقعات کی ایک ایک کڑی رکھ دی۔ غدر کے واقعات نے سرسید میں ملک وقوم کے دکھ درد کا شدید احساس پیدا کر دیا لیکن وہ کبھی، جذباتیت کا شکار نہیں ہوئے۔ جوں جوں ان کے احساس میں شدت آتی جاتی تھی، وہ عقل پسندی سے قریب تر ہوتے جاتے تھے۔ وہ قوم کا دکھ درد دور کرنا چاہتے تھے، مگر اس طرح نہیں جس طرح قوم چاہتی تھی۔ بلکہ وہ چاہتے تھے کہ قوم اپنے علوم اور اپنے معمولات کا جائزہ لے اور سختی سے اپنا احتساب کرے۔ شروع کی سطروں میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ غدر سے پہلے ہی سرسید مشرقی علوم کی بے مائیگی کا شکوہ کرتے تھے اور اہلِ مغرب کو قدر اور احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ غیر ملکی اقتدار صرف اس لیے ملک پر مسلط ہے کہ ہم علوم وفنون میں ان سے کمتر ہیں۔ سرسید قوم کو بدلتے ہوئے حالات کا احساس دلانا چاہتے تھے اور ان کے سامنے ٹھوس حقائق پیش کر کے زندگی بسر کرنے کا نیا ڈھنگ سیکھنے پر آمادہ کرنا چاہتے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ جب تک قوم علومِ جدیدہ سے مسلح نہیں ہو جائے گی، زندگی کی دوڑ میں اہلِ مغرب کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ان مقاصد کے تحت سرسید ایک قومی رہنما کی حیثیت سے قوم کے سامنے آئے اور اپنی تحریر وتقریر سے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جنھیں ایک ٹھوس حقیقت کی شکل میں ہم آج بھی دیکھ رہے ہیں۔ اب سرسید کا دائرۂ تحقیق کافی وسیع ہو چکا تھا۔ مذہب، سیاست، معیشت، شعر وادب غرض زندگی کے ہر شعبے پر انھوں نے تحقیقی نظر ڈالی۔ انھوں نے تحقیق کو حصولِ مقصد کا سب سے بڑا ذریعہ بنایا لیکن ان کی تحقیقی نگاہ زیادہ تر مذہبی مباحث پر مرتکز رہی اور در حقیقت یہی تقاضائے وقت بھی تھا۔ وہ اسلام کے اہم مباحث کو جدید علوم کی روشنی میں پرکھنا چاہتے تھے اور اس طرح یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اسلام ہر دور میں عقل کی کسوٹی پر رکھا جا سکتا ہے یا نہیں سرسید کو متکلم کہا جا سکتا ہے یہ بڑا اہم سوال ہے اور اس پر بحث کرنے کا یہ موقع نہیں ہے لیکن اتنا تو بہر حال تسلیم کرنا ہے کہ وہ متکلمین کے آداب سے واقف تھے اور ان کے اندر متکلمانہ شان موجود تھی۔ ان کی ہر ادا روایت پرستی اور جمود پسندی کے خلاف صدائے احتجاج تھی۔ اپنے متکلم اپنے زمانے کے متداول معقولات کی روشنی میں اپنے عقائد کی بازیافت اور ان کی توثیق کرتا ہے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اسی عمل کا دوسرا نام سرسید ہے۔ انھوں نے اپنے مکاتیب، خطبات اور تصانیف میں جگہ جگہ بازیافت وتوثیقِ عقائد کے اس نکتے کی وضاحت کی ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات پیش کیے جا سکتے ہیں۔

''۔۔۔ایک زمانہ ایسا آیا جس میں حکمت وفلسفہ یونان کا مسلمانوں میں رواج ہوا اور اس کے سبب سے عقائدِ مذہبی میں بہت کچھ خلل واقع ہوا یا واقع ہونے کا اندیشہ ہوا۔ اس وقت علما نے مذہبِ اسلام کی تائید پر کمر باندھی اور علمِ کلام ایجاد کیا اور اسلام کی نصرت کی۔ مگر وہ زمانہ بھی گیا اور جدید فلسفہ اور جدید حکمت اور جدید علومِ حکمیہ پیدا ہوئے اور اس کے مسائل اور جو تحقیقات علومِ طبعی کی اس میں ہوئی ہے، وہ بہت زیادہ مخالف مسائل موجودہ اسلام کی ہے اور ان جدید علوم کا روز بروز شیوع ہوتا جا رہا ہے اور کسی کے بند کرنے سے بند نہیں ہو سکتا۔

پس اس کا کیا علاج ہے؟''[11]

''مذہب اسلام اور خدا کے کلام کو دیو اور پری کے قصے مت بناؤ ورنہ جو فوقیت اسلام کو دوسرے مذاہب باطلہ سے ہے، وہ ساقط ہو جاتی ہے اور اسلام عقل انسانی کی رو سے قابل یقین نہیں رہتا''[12]

''میں صاف کہتا ہوں کہ اگر لوگ تقلید نہ چھوڑیں گے اور خاص اس روشنی کو جو قرآن اور حدیث صحیح سے حاصل ہوتی ہے، نہ تلاش کریں گے اور حال کے علوم سے مذہب کا مقابلہ نہ کریں گے تو مذہب اسلام ہندوستان میں معدوم ہو جائے گا۔ اس خیر خواہی نے مجھ کو برانگیختہ کیا ہے جو میں ہر قسم کی تحقیقات کرتا ہوں اور تقلید کی پروا نہیں کرتا۔۔۔''[13]

''اگر خدا مجھ کو ہدایت نہ کرتا اور تقلید کی گمراہی سے نہ نکالتا اور میں خود تحقیقات اسلام پر متوجہ نہ ہوتا تو یقینی مذہب کو چھوڑ دیتا.....''[14]

''اس زمانے نے جو سخت مشکل پیش آئی ہے وہ یہ ہے کہ فلسفہ اور طبیعات یونانی بھی جس کی بناء پر اس زمانے کے علمانے بہت سے مذہبی مسائل بھی قائم کیے تھے، علوم جدیدہ سے غلط ثابت ہوا ہے اور علوم جدیدہ کے دلائل صرف قیاسی اور فرضی ہی نہیں ہیں بلکہ تجربہ اور عمل نے ان کو درجہ مشاہدہ تک پہنچا دیا ہے۔ یہاں تک کہ عام طور پر یہ مسئلہ محقق مانا جانے لگا کہ علوم مذہب کے مخالف ہیں اور وہ مذہب کو اس طرح جلا دیتے ہیں جیسے چھوٹے پودے کو پالا...... میں نے بقدر اپنی طاقت کے خود قرآن مجید پر غور کیا اور چاہا کہ قرآن ہی سمجھنا چاہیے کہ اس کا نظم کن اصولوں پر واقع ہوا ہے اور جہاں تک میری طاقت میں تھا، میں نے سمجھا اور میں نے پایا کہ جو اصول خود قرآن مجید سے نکلتے ہیں، ان کے مطابق کوئی مخالفت علوم جدید میں نہ اسلام سے ہے اور نہ قرآن سے...... پھر میں نے اسی اصول پر قرآن مجید کی تفسیر لکھنی شروع کی......''[15]

مندرجہ بالا الفاظ سے سرسید کا نظریہ تحقیق اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔ میں یہاں اس بات کا ذکر چھیڑ کر کہ اپنے اس نظریہ تحقیق کی روشنی میں وہ عقائد کی بازیافت اور توثیق میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں، خلط بحث نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ فطری طور پر تقلید کے خلاف اور تحقیق کے پرستار تھے اور متکلمین کے اندر یہی شان ہوتی ہے، جیسا کہ امام غزالی نے کہا ہے اور سرسید نے بھی اس کی تائید کی ہے۔

''ہر ایک محقق کو تحقیق لازم ہے اور تقلید اس پر حرام ہے پھر کیوں کر تحقیق و تقلید ساتھ ہو سکتی ہے۔ یہ تو ایسی بات ہے کہ جیسے کہ کوئی کہے کہ تجھ کو دیکھنا واجب ہے مگر جو بتایا گیا ہے اس کے سوا مت دیکھ اور اسی کو تحقیق سمجھ اور جو چیز مشتبہ بتائی گئی ہے اس کو مشتبہ سمجھ......''[16]

''تبیین الکلام'' سے لے کر ''خطبات احمدیہ'' اور ''تفسیر القرآن'' (تصانیف احمدیہ) تک ان کا یہ نظریہ تحقیق ان کی ہر تحریر میں ملتا ہے۔ انھوں نے ایک اہل کتاب کو دوسرے اہل کتاب سے قریب تر لانے کے لیے توریت مقدس کی تفسیر اس طرح لکھی کہ آیات قرآنی سے اس کی تطبیق ہو جائے اور اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے استخراج نتائج کے اعلیٰ اصولوں کو اپنایا۔ تبیین الکلام، مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کے لیے لکھی تھی اور تفسیر القرآن کے خصوصی مخاطب مسلمان تھے۔ تفسیر کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں جو غلط عقائد راہ پا گئے ہیں انھیں دور کیا جائے۔ ان سے پہلے کے مفسرین نے جن ضعیف روایتوں کا سہارا لیا تھا، سرسید نے دلائل کے ساتھ ان کی تردید کی۔ تحریر فی اصول تفسیر اور ''مکاتبات الخلان'' میں انھوں نے قرآن کی تفصیل کے جو اصول بتائے ہیں، ان سے یہ پتا چلتا ہے کہ وہ تحقیق میں ثانوی ذرائع پر اعتماد کرنا اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ خطبات احمدیہ میں تاریخ و جغرافیہ سے لے کر عقائد تک کے مسائل زیر بحث آئے ہیں۔ سرسید نے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا اور مستشرقین یورپ نے تحقیق کی جس سطح پر جا کر اسلام اور سرور کائنات پر اعتراضات کیے تھے، سرسید نے اس سے بلند سطح پر پہنچ کر ان کے جوابات دیے اور ان کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔

سرسید کے افکار و اکتسابات پر جواب تک بحث کی گئی ہے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کی شخصیت تلاش و تفحص اور تحقیق و تدقیق سے مرتب ہوئی ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انگریزی سرکار میں ملازمت حاصل کرتے ہی وہ انگریزوں کی علمی اور تحقیقی فتوحات سے متاثر ہو چکے تھے۔ ''آثار الصنادید'' کی تصنیف اور ''آئین اکبری''، ''تاریخ فیروز شاہی'' اور ''توزک جہان گیری'' کی تصحیح و اشاعت مغرب کی علمی و تحقیقی فتوحات سے اثر پذیری ہی کا نتیجہ ہیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ سرکاری ملازمت نے ان کے ذہن کو مقید نہیں کیا تھا بلکہ اسے جلا دی تھی۔ سرسید کے یہ چاروں تحقیقی مگر غیر مذہبی اور غیر سیاسی کارنامے علمی دنیا میں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔ سرسید کے یہ کارنامے تحقیق کی اس شق کی نمائندگی کرتے ہیں جو تحفظ آثار، صحت متن اور فراہمی مآخذ سے متعلق ہوتی ہے مگر انھی کارناموں کو ان کی ہمہ گیر

شخصیت کی اساس کہا جا سکتا ہے اور یہ نتیجہ صحیح نکالا گیا ہے کہ ان کا ابتدائی علمی اور تحقیقی ذوق ہی ان کی بعد کی تصانیف میں کام آیا۔

''تبیین الکلام'' سے تفسیر القرآن تک سر سید نے تحقیق کے اس حصے کو اپنایا جو تخلیق کا درجہ اختیار کر لیتا ہے۔ تقلید اور روایت پرستی کی گرفت سے آزاد ہونا، مآخذ کی چھان بین کر کے حقائق کا دریافت کرنا، واقعات کے اسباب کو ڈھونڈنا اور ان کو ایک سلسلے میں لانا اور رائے قائم کرنا، مسلمات کی نئی تعبیر اور اس کی بنیاد پر روشن مستقبل کی تاسیس سر سید کی مذہبی تحقیقات کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ یہ ساری باتیں اس ماحول کے لیے نئی تھیں جہاں عربی کا احترام کیا جاتا تھا۔ فارسی کی قدر و قیمت کا اندازہ تھا اور اُردو بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ یہ باتیں سر سید کو متکلمین اسلام کے علم، عقائد اور مغرب کے جدید اصول تحقیق کے امتزاج کے نتیجے میں ملی تھیں، جن سے ان کے معاصرین نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

سر سید کی علمی اور ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے شبلی نے ایک بار کہا تھا۔

ملک میں آج بڑے بڑے انشا پرداز موجود ہیں جو اپنے مخصوص دائرہ مضمون کے حکمران ہیں لیکن ان میں سے ایک شخص بھی نہیں جو سر سید کے بار احسان سے گردن اٹھا سکتا ہو۔ بعض بالکل ان کے دامن تربیت میں پلے ہیں۔ بعضوں نے دور سے فیض اٹھایا ہے۔ بعض نے مدعیانہ اپنا الگ راستہ نکالا تاہم سر سید کی فیض پروری سے بالکل آزاد کو نکر رہ سکتے تھے ۱۷

جو لوگ بالکل سر سید کے دامن تربیت میں پلے ہیں ان میں چراغ علی، محسن الملک اور حالی کے نام ممتاز ہیں۔ چراغ علی اور محسن الملک کا مبلغ علم کسی طرح سر سید سے کم نہیں بلکہ بعض حیثیتوں سے یہ دونوں ان سے بڑھے ہوئے ہیں۔ ان کے اندر اگر کمی ہے تو یہ کہ سر سید کی ہمہ گیری اور عاقبت بینی انھیں نہ مل سکی اور شاید یہی سبب ہے کہ زمانہ ان کو بھلاتا جا رہا ہے۔ چراغ علی مذہبی مباحث میں سر سید کے معاون تھے اور محسن الملک مذہبی اور تعلیمی میدانوں میں ان کے دست راست تھے۔ چراغ علی مآخذ کی فراہمی، ان کی منطقی ترتیب اور استنباط نتائج میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ جب وہ کسی مسئلے پر بحث کرتے ہیں تو مستند کتابوں کا ایک ڈھیر لگا دیتے ہیں اور اپنے موقف کی تائید و توثیق میں اکثر اتنے شدت پسند ہو جاتے ہیں کہ ان کی تحریر میں مناظرانہ رنگ آ جاتا ہے۔ اسمتھ نے چراغ علی کے ذہنی میلان کے عوامل و محرکات کا پتا لگاتے ہوئے کہا تھا۔

"He had been disturbed by the missionarie's criticism of his religion. For a time before meeting Sir Syed, he was attracted to Mirza Ghulam Ahmed of Qadian and his method of counting those criticism. When he came in contact with Aligarh movement, he transferred it to his enthusiastic support"[18]

سر سید کی طرح چراغ علی کو بھی دو طرفہ مقابلہ کرنا پڑا۔ ایک طرف تو انھیں عیسائیوں کے اعتراضات کا جواب دینا تھا، جس کے لیے انھوں نے نہ صرف انگریزی بلکہ عبرانی اور سریانی زبانوں میں مہارت حاصل کی اور دوسری طرف مسلمانوں کے مقلدانہ عقائد کی بیخ کنی کرنی تھی اور ایسا ممکن نہ ہوتا اگر وہ عربی کا عمیق مطالعہ نہ کرتے۔ چراغ علی نے اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بڑی حد تک انگریزی کو بنایا۔ اُردو میں جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ تحقیق کے باب میں یہ سر سید کے خواب کی تعبیر ہے۔ سر سید کے رسالے ابطال غلامی کی تردید میں مولوی سید محمد عسکری نے ''حقیقت اسلام'' کے نام سے جو رسالہ لکھا تھا، اس کا مدلل جواب ''تہذیب الکلام فی حقیقت الاسلام'' ۱۹ کے نام سے انھوں نے لکھا تھا۔ اسی طرح مولوی محمد علی کے اعتراضات کے جواب میں ''تدبیر الاسلام فی تحریر الامت و الغلام'' ان کے استدلالی طرز تحریر کا اچھا نمونہ ہے۔

''العلوم الجدید و الاسلام'' کے عنوان سے جو مبسوط تحقیقی مقالہ انھوں نے سپرد قلم کیا تھا اس کا شمار نہ صرف ان کے اولیات میں ہوگا بلکہ اسے اُردو تحقیق کا اہم سنگ میل کہنا چاہیے۔ اس مقالے کا محرک سر سید کا یہ سوال تھا۔

''اکثر لوگوں کی رائے میں یہ مسلم ہے کہ یورپین علوم و فنون کی تعلیم عقائد اسلام سے برگشتگی پیدا کرتی ہے اور ان کی رائے میں اس کا علاج ان علوم کے ساتھ دینی علوم کے اعلیٰ درجے کی تعلیم دینا ہے۔ اگر یہ رائے صحیح ہے تو یورپین علوم و فنون کے ان مسائل اور ان کے دلائل کو جو اس برگشتگی کے باعث ہوں، بیان کرنا چاہیے اور ان کتب دینیہ اور ان کے مقالات کا نشان دینا ضروری ہے جن کے تعلیم میں داخل کرنے سے اس برگشتگی کی روک ہو سکے۔ مع اس بیان کے کس وجہ سے وہ کتابیں اور مقامات اس کی روک ہو سکیں گی۔ اگر یہ رائے صحیح نہیں ہے تو جہاں تک مفصل اور دلیل سے اس کی عدم صحت کا بیان ممکن ہو، بیان کیا جائے'' ۲۰

چراغ علی نے اپنے مقالے میں امام شافعی سے لے کر میر علی تک ان تمام علمائے دین کا ذکر کیا ہے جنھوں نے علوم معقولات کی تحصیل کی مخالفت کی

تھی۔ انھوں نے یہ بھی ثابت کیا کہ قدیم مسیحی علماء بھی معقولات کے مخالف تھے اور ہمارے علما ان کی تقلید میں مخالفت کرنے لگے۔ اس کے بعد حلیمی سے لے کر نواب صدیق حسن تک ہر اس عالم کا ذکر چراغ علی نے کیا جو تحصیل معقولات کی موافقت میں تھے۔ انھوں نے جس محنت اور دقت نظر سے یہ فہرستیں مرتب کی ہیں، وہ خود ایک اہم کام ہے لیکن انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ان اقوال کی ثقاہت کو پرکھا اور پھر آخری نتیجہ نکالا۔ انھوں نے اپنی بات کے ثبوت میں مستند احادیث کے حوالے دیئے اور یہاں تک کہا:

''غیر مذہب والوں سے یا کفار سے بلکہ ایسے کفار سے بھی جن سے جنگ قائم ہو اور وہ دشمن دینی بھی ہوں، علم سیکھنا مسنون اور مستحب ہے''۔[۲۱]

اُردو دنیا میں چراغ علی سے کہیں زیادہ محسن الملک کا نام متعارف ہے اور ایسا اس لیے نہیں کہ ان کی علمی اور تحقیقی فتوحات کا احساس عام ہو بلکہ اس کا سبب ان کی وہ سرگرمی ہے جو ایم۔ اے۔ او کالج کی تاسیس اور اس کے استحکام کے لیے انھوں نے دکھائی۔ ان کے لیکچروں نے سرسید کے مشن کو تقویت بخشی اور ان کی انتظامی صلاحیت نے کالج کو زیادہ سے زیادہ پائیدار اور نیک نام بنایا۔ ان کی علمی اور تحقیقی فتوحات کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب تہذیب الاخلاق، دوبارہ جاری ہوا اور اس میں محسن الملک کے مضامین شامل نہ ہو سکے تو لوگوں نے اسے پسند نہیں کیا۔ سرسید نے ''تہذیب الاخلاق'' کے پڑھنے والوں کی شکایات کا جواب ان الفاظ میں دیا۔

''نواب محسن الملک مولوی مہدی علی خدا کے فضل سے اب اچھے ہو گئے ہیں اور ان کے لکھے ہوئے مضامین ان تمام نقصانوں کا جو تہذیب الاخلاق میں ہوں، تلافی کر دیں گے''۔[۲۲]

علمی اور تحقیقی اکتسابات کے لحاظ سے محسن الملک کا دائرہ چراغ علی سے وسیع ہے اور وہ ہر اس شعبہ علم تک پہنچ جاتے ہیں، جہاں جہاں سرسید کی رسائی تھی۔ وہ سرسید کے مباحث کو اپنی علمیت اور اپنے ذوق تحقیق سے نئی زندگی بخش دیتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے صحیح نتیجہ نکالا کہ

''اگر سرسید کو اس عقلی تحریک کا دل کہا جائے تو محسن الملک کو یقیناً ''زبان اور دماغ'' کا درجہ حاصل ہونا چاہیے''۔[۲۳]

محسن الملک کا ذوق تحقیق اتنا نکھرا ہوا تھا کہ وہ سرسید کے نتائج فکر کو بھی من و عن تسلیم نہیں کرتے تھے۔ وہ ان پر بھی محققانہ اور ناقدانہ نظر ڈالتے تھے اور جن امور سے اختلاف کرتے تھے ان کا برملا اظہار کر دیتے تھے۔ یوں تو ڈپٹی نذیر احمد بھی سرسید کے بعض معتقدات سے اپنی بدایت کا اظہار کرتے تھے مگر ان کا اختلاف تقلیدی تھا اور محسن الملک کا محققانہ۔ محسن الملک کے اختلاف کا سبب اسلاف پرستی نہیں تھا بلکہ وہ سرسید سے زیادہ قوی عقلی دلائل پیش کرتے تھے اور اس طرح ہر ایک بحث میں سرسید سے کہیں زیادہ عقل پسندی کا ثبوت دیتے تھے۔

محسن الملک نے کوئی مبسوط تصنیف یادگار نہیں چھوڑی۔ ان کے مضامین ''تہذیب الاخلاق'' میں شائع ہوتے تھے لیکن ''تقلید اور عمل بالحدیث''، ''تفسیر بالرائے۔ تطبیق منقول یا معقول'' ''مقدمہ تاریخ ابن خلدون'' ''مسلمانوں کی ملکی اور علمی ترقیوں کی تاریخ (لکچر) خود مستقل تصنیف کا درجہ رکھتے ہیں۔ اصول تفسیر کے سلسلے میں سرسید کو جو خطوط انھوں نے لکھے، ان کی اہمیت بھی کبھی کم نہ ہوں گی۔ محسن الملک کے نزدیک تحقیق کا کیا درجہ تھا، اس کا اندازہ ان جملوں سے لگایا جا سکتا ہے۔

''تحقیق کرنے والے کو ہر چیز کی تحقیقات کے لیے ضروری ہے کہ جو کچھ لوگوں سے سنا ہو یا جو کچھ اس نے خود سمجھ رکھا ہو، اس سے اپنے دل و دماغ کو خالی کر لے اور کسی کی حقیقت اور صحت پر پہلے سے یقین نہ کرے۔ اس لیے کہ اگر وہ ایسا کرے گا تو تحقیق کرنے پر اس کی توجہ نہ ہوگی، اس لیے کہ وہ اپنے خیالات کو تعینات سمجھ کر اپنے آپ کو مستغنی سمجھے گا یا تحقیقات کرتے وقت اس کو توہمات اور خطرات ایسے پیدا ہوں گے کہ وہ اس تحقیق میں خلل ڈالیں گے۔

''ایسی تحقیقات کرنے والے کو چاہیے کہ وہ ان سب باتوں کو جو لوگوں سے سنی ہوں یا جو کچھ اس کے دل میں گزری ہوں پیش نظر رکھے اور بغیر پیدا کرنے یقین کے کسی پر، وہ ان کی تحقیق بذریعہ اس آلہ یا ذریعہ جو اس کے امتحان کے لیے ہو کرے تا کہ اس کو خود معلوم ہووے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے''۔[۲۴]

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان کے اکثر مضامین اسی اصول تحقیق کے علمبردار ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد اگرچہ براہِ راست سرسید سے متاثر نہیں ہوئے لیکن نئے علوم کی ترویج و اشاعت میں انھوں نے سرسید کی خاصی مدد کی۔ غدر کے بعد انگریزی سرکار میں ہندوستانی ملازمین کو انگریزوں سے قریب ہونے اور ان کے علوم و فنون کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ ان میں سے بعض ملازمین نے جن کو تصنیف و

تالیف سے دلچسپی تھی، اپنی تحریروں میں مغربی رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ابتدائی قصے اسی کوشش کا نتیجہ ہیں، اگرچہ نئے طرز کے قصوں میں نذیر احمد کو اولیت حاصل نہیں۔ اس سے پہلے مولوی کریم الدین کی ''خط تقدیر'' جس میں نئے ماحول کی بوباس ملتی ہے، شائع ہو چکی تھی لیکن ترتیب وتہذیب میں ان کے قصے ''خطوط تقدیر''[۲۵] سے بہتر ہیں۔ نذیر احمد نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ انگریزی سرکار ایک ٹھوس حقیقت کی شکل میں موجود ہے اور اس کے زوال کا کوئی امکان نہیں۔ انھوں نے یہ بھی سمجھ لیا کہ مذہب کی آڑ لے کر نئے علوم پر پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔ وہ بھی تقلید کے خلاف اور تحقیق کے ہم نوا بن گئے۔ ان کے لیکچرز ''اجتہاد، لمہات الامت'' اور ترجمہ قرآن اسی ہم نوائی کا مظہر ہیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ ساری خوبیوں کے باوصف سرسید کے معاصرین میں نذیر احمد کی شخصیت ایسی ہے جن کے خیالات پر تذبذب اور ابہام کی مستقل پرچھائیں ملتی ہے۔ تقلید کے خلاف انھوں نے آواز بلند کی لیکن ان کے پانو تقلید کی زنجیروں سے رہائی نہ پاسکے۔ انھوں نے نئے اور پرانے خیالات کو کچھ اس طرح مدغم کیا کہ خود ان کی شخصیت مجہول ہو کر رہ گئی۔

تہذیب الاخلاق، میں سید محمود، وقار الملک، مولوی ذکاء اللہ وغیرہ کے بعض وقیع مضامین شائع ہوئے تھے۔ مولوی ذکاء اللہ علوم وفنون میں سرسید کے تحقیقی نقطہ نظر کے حامی تھے لیکن ان کی تاریخ ہندوستان کو کوئی بڑا تحقیقی کارنامہ نہیں کہا جاسکتا۔

اب تک اُردو میں راہ پانے والے جس تحقیقی ذوق اور شعور کا تجزیہ کیا گیا ہے، اس میں شعر وادب شامل نہیں ہے۔ ان سطروں کا مقصد محض یہ واضح کرنا تھا کہ تحقیق کی جدید کرن کس طرح ہمارے علمی معاشرے میں آئی۔ اگرچہ اس کرن سے مذہب، سیاست تعلیم وتہذیب وتمدن کو سنوارا گیا لیکن شعر وادب کا اس سے متاثر نہ ہونا ممکن نہیں تھا۔ سرسید کی تصانیف اور تہذیب الاخلاق کی اشاعت نے ملک میں تقلید پرستی کے خلاف ایک حلقہ بنالیا، جس کا ایک پہلو ڈپٹی نذیر احمد کے الفاظ میں یہ تھا۔

> ''یہ اسی کے (تہذیب الاخلاق کے) تصرفات تھے کہ مسلمان انگریزی پڑھنے کو کفر اور زندقہ سمجھتے تھے۔ یا دار العلوم دہلی میں کئی مسافر طالب علموں کو میں جانتا ہوں۔ وہ مسجدوں میں رہتے ہیں علوم دین پڑھنے کے لیے اور علوم دین کے ساتھ انگریزی بھی......''[۲۶]

سرسید کو منزل پر پہنچنے میں دیر نہیں لگی وہ جوں جوں آگے بڑھتے گئے اہل مسلم کا طبقہ ان کے ساتھ ہو گیا۔

❖❖❖❖

حواشی

(۱)(الف) فکر ونظر، علی گڑھ، جولائی ۱۹۶۴ص ۷۳۔۹۳

(۱)(ب) آثار الصنادید، نامی پریس کان پور ۱۹۰۴ء ص ۳

(۲) آثار الصنادید۔ جلد چہارم، نول کشور ۱۸۹۵ء، ص ۳

(۳) آثار الصنادید، باب دوم، نامی پریس، ۱۹۰۴ء، ص ۸

(۴) مکاتیب سرسید، مرتبہ مشتاق حسین، اشاعت اول، ۸۹۔۲۸۸

(۵) حیات جاوید۔ اکادمی پنجاب، لاہور ۱۹۵۷ء، ص ۱۱۷

(۶) آئین اکبری۔ مطبع اسمٰعیلی، دہلی ۱۲۷۴ء، احوال ہندوستان، ۲۶۹

(۷) آئین اکبری، احوال ہندوستان، ص ۲۶۹

(۸) آئین اکبری، تقریظ، ص ۲۷۴

(۹) حیات جاوید، ص ۱۲۳۔۱۲۲

(۱۰) History of Jahangiri, Third Edition, Indian Press Ltd. Allahabad, 1940 p.397.

(۱۱) مکاتیب سرسید بنام مولوی محمد علی، ص ۳۳۔۲۳۲

(۱۲) سرسید بنام محسن الملک، ص ۲۰۶

(۱۳) خطوط سرسید بنام محسن الملک، ص ۵۲

(۱۴) خطوط سرسید بنام محسن الملک، ص ۶۹

(۱۵) تحریر فی اصول التفسیر، مطبع مفید عام، آگرہ ۱۸۹۲ء، ص ۳۴

(۱۶) النظر فی رسالتہ الامام حجتہ الاسلام ابوحامد غزالی "المسمی بالتفرقتہ بین الاسلام والزندقتہ" ص ۱۵، مطبع فیض عام، علی گڑھ

(۱۷) مقالات شبلی، حصہ دوم، طبع دوم، ۱۹۵۰ء، ص ۵۷

(۱۸) Modern Islam in India. Welfred Countwel Smith-Victor Gollomied. D London, p19.

(۱۹) شائع کردہ مولوی عبداللہ خان، مطبع اختر دکن، حیدرآباد، ۱۸۱۹ء

(۲۰) تہذیب الاخلاق، یکم محرم ۱۳۱۲ھ، ص ۶۵

(۲۱) تہذیب الاخلاق، یکم جمادی الاول ۱۳۱۲ھ، ص ۱۴۰

(۲۲) تہذیب الاخلاق، یکم ربیع الاول ۱۳۱۲ھ، ص ۱۰۱

(۲۳) علی گڑھ میگزین، علی گڑھ تحریک نمبر، ص ۶۲

(۲۴) تہذیب الاخلاق مرتبہ ملک فضل الدین، مطبع کریمی لاہور، جلد اول، جولائی ۳۴ء، ص ۲

(۲۵) تفصیل کے لیے دیکھیے ہماری زبان، مارچ ۱۹۶۳ء

(۲۶) تہذیب الاخلاق، یکم شوال ۱۳۱۱ھ،

❖❖❖❖

اردو میں تحقیق[1]

مالک رام

تحقیق عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مادہ ہے: ح ق ق۔ جس کے معنی ہیں کھرے کھوٹے کی چھان بین یا کسی بات کی تصدیق کرنا۔ دوسرے لفظوں میں تحقیق کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے علم و ادب میں کھرے کو کھوٹے سے، مغز کو چھلکے سے، حق کو باطل سے الگ کریں۔ انگریزی لفظ ریسرچ کے بھی یہی معنی اور مقاصد ہیں۔

دیانت داری سے دیکھا جائے تو اُردو کی پرانی روایت میں تحقیق کی کوئی مثال نہیں ملتی بل بھی نہیں سکتی تھی، آج تک ہماری تہذیب کے بازار میں بعض بندھے ٹکے سکے رائج ہیں: خطا بر بزرگان گرفتن خطاست، یعنی بزرگوں کی غلطیاں نکالنا ٹھیک نہیں، ہمارا اصول حیات رہا ہے۔ جہاں سوچنے کا یہ انداز ہو اور اس طرح کی باتیں بچپن سے انسان کے کان میں پڑتی رہی ہوں، اگر وہ بڑا ہو کر سب کو کلمہ خیر سے یاد کرے اور کسی کے خلاف بھلی بری سننے سے انکار کر دے تو اس پر کسی کو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ تحقیق کا مقصد ہی ٹھہرا کھرے کھوٹے کی پہچان اور ہماری تہذیب کہتی ہے کہ سب کھرے ہیں، کوئی کھوٹا ہے ہی نہیں، تو ظاہر ہے کہ اس پر کیوں کوئی دھیان دیتا! یہی وجہ ہے کہ ہماری زندگی کا یہ شعبہ آج تک بے توجہی کا شکار رہا ہے۔

شروع میں تصنیف کا ایک میدان ایسا تھا، جس میں مصنف اگر چاہتا تو کچھ تحقیق سے کام لے سکتا تھا۔ میری مراد تذکرہ نویسی سے ہے لیکن یہ تذکرے دراصل بیاضوں کی ترقی یافتہ شکل ہیں۔ اوائل کے جو تذکرے دستبرد زمانہ سے بچ گئے ہیں اور خوش قسمتی سے دستیاب ہو گئے ہیں، ان پر لفظ تذکرے کم کم اور بیاض کا زیادہ اطلاق ہوتا ہے۔ اس وقت ہمارے پاس سب سے پرانے تذکرے میر کا نکات الشعراء، حمید کا گلشن گفتار اور افضل بیگ قاقشال کا تحفۃ الشعرا ہیں۔ یہ تینوں ۱۱۶۵ھ/۵۲-۱۷ء میں تالیف ہوئے۔ گردیزی کا تذکرہ ریختہ گویاں اور قائم کا مخزن نکات اس سے متصل مابعد ۱۱۶۸ھ/۵۵-۱۷ء میں مرتب ہوئے اور ان کے بعد بیسیوں اور تذکرے لکھے گئے۔ ان سب کی صورت یکساں ہے۔ ایک آدھ کو چھوڑ کر سب کی زبان فارسی، حالات بہت کم، بعض اوقات صرف شاعر کا نام ایک آدھ سطر اور بس اور اس کے بعد کلام کا انتخاب لیکن یہ بھی درست ہے کہ یہ نقائص زیادہ تر اوائل کے تذکروں میں ہیں۔ جوں جوں تذکرہ نویسی کے فن میں ترقی ہوتی گئی اور بعد کے آنے والوں کے سامنے پہلے کی مثالیں آنے لگیں، انھوں نے حالات جمع کرنے کا زیادہ التزام کیا۔ بہر حال اپنی تمام خامیوں کے باوجود ان تذکروں کے مفید ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اگر یہ نہ ہوتے تو جتنے حالات ہمیں آج معلوم ہیں، یہ بھی ضائع ہو گئے ہوتے۔

نکات الشعرا کی تالیف (۱۱۶۵ھ/۵۲-۱۷ء) کے بعد تقریباً ڈیڑھ سو سال کے طویل زمانے میں کم و بیش ۵۰-۶۰ تذکرے لکھے گئے۔ جب ہم ان کا ان کے محل ترتیب و تالیف کے پہلو سے جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ تذکرے دلی میں یا اس کے گرد و نواح میں مرتب ہوئے یا کم از کم لکھنے والے دلی ہی کے تھے۔ اگرچہ انھوں نے انھیں لکھا کہیں اور جگہ۔ اس کے بعد دکن کا نمبر آتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ لکھنوی مولفوں نے اس بارے میں کوئی خاص دلچسپی یا سرگرمی نہیں دکھائی۔ گنتی کے پانچ چار تذکرے وہاں لکھے گئے اور ان میں بھی ایک سعادت خاں ناصر کے خوش معرکہ زیبا (۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء) کے علاوہ اور کوئی قابل لحاظ نہیں۔

اب تک شعرا کی سیرت اور حالات پر کما حقہ، توجہ نہیں دی گئی تھی۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ہر ایک مولف نے کم از کم اپنے معاصرین کے حالات کسی حد تک زیادہ تفصیل سے دے دیے ہیں، خاص طور پر اگر کسی شاعر سے ان کی دوستی یا تعلقات خوشگوار تھے، نیز اپنے مقامی شعرا سے بھی زیادہ اعتنا کیا ہے۔ کہیں کہیں باہمی چشمکوں اور چپقلشوں کی طرف اشارے بھی ملتے ہیں جس سے ادبی تاریخ کے لیے بھی کچھ مواد مہیا ہو گیا ہے۔

یہ صورت حال ۱۸۸۰ء تک قائم رہی، جب مولانا محمد حسین آزاد (ف ۱۹۱۰ء) کا تذکرہ آب حیات پہلی مرتبہ لاہور سے شائع ہوا (وکٹوریہ پریس لاہور)۔ آزاد نے اپنے پیشروؤں کی متعدد کمیوں کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے حتی الوسع شعرا کے حالات پوری تفصیل سے درج کیے، ان کے کلام پر تبصرہ کیا، تاریخ ادب میں ان کا مقام متعین کرنے کی بھی کوشش کی۔ متعدد نقادوں نے آب حیات کے نقائص دکھانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً یہ کہ آزاد نے تاریخی واقعات

کے بارے میں غلطیاں کی ہیں، انھوں نے جانب داری کے باعث بعض شعرا کو ناحق دوسروں پر فوقیت دی ہے، بعض مشہور شعرا کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے وغیرہ۔ یہ سب الزامات درست ہیں۔ اس کے باوجود اس سے، آبِ حیات کی تاریخی اہمیت کم نہیں ہوجاتی۔ بے شبہ، یہ اُردو کا پہلا تذکرہ ہے، جس میں کچھ تحقیق سے کام لیا گیا ہے، بلکہ کسی حد تک اُردو زبان کی تاریخ بھی پہلی مرتبہ اسی کتاب میں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کا مواد جمع کرنے میں انھیں بہت دن لگے ہوں گے اور اس میں انھیں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ ہمارا حق ہے کہ آزاد کی سہل انگاری پر نکتہ چینی کریں، ان کی ناانصافی اور کج بینی کے خلاف احتجاج کریں، ان کی افسانہ طرازیوں اور حق گوئی سے انحراف پر غم وغصہ کا اظہار کریں لیکن یہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہم اس سے آبِ حیات کی اس اہمیت کو بھی نظر انداز کر دیں جس کا یہ جائز طور پر مستحق ہے۔

اُردو تاریخ میں سب سے پہلی اہم اور انگریزی محاورے میں دیو قامت شخصیت سراج الدین علی خان آرزو (ف جنوری ۱۷۵۶ء) کی ہے۔ خان آرزو عربی اور فارسی کے جید عالم تھے اور ان کی تحریروں سے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ شاید کچھ سنسکرت بھی جانتے ہوں۔ جس شخص کے فیضِ تربیت نے اُردو کو میر (ف ۱۸۱۰ء) اور سودا (ف ۱۷۸۱ء) کے سے شاعر دیے ہوں۔ اس کی عظمت اور بزرگی سے کسے انکار ہوسکتا ہے۔ اس عہد کے کئی اور اساتذہ مثلاً شاہ مبارک آبرو (ف ۱۷۳۳ء) شرف الدین مضمون (ف ۱۷۷۱ء) آنند رام مخلص (ف ۱۷۵۰ء) غلام مصطفیٰ خان یکرنگ وغیرہ خان آرزو کے شاگرد ہیں۔ خواجہ میر درد (ف ۱۷۸۵ء) اور مظہر جانِ جاناں (فـ ۱۷۸۱ء) نے بھی ان سے فیض پایا۔ حسین قلی خان عاشقی نے نشترِ عشق (تالیف ۱۸۱۸ء) میں لکھا ہے کہ سودا پہلے صرف فارسی میں کہتے تھے اور اس میں آرزو سے مشورہ کرتے تھے۔ آرزو نے ان سے کہا کہ فارسی تمھارے لیے اجنبی زبان ہے، تم لاکھ زور مارو، اس میں اتنا کمال نہیں پیدا کر سکتے کہ اہلِ زبان تمھیں مان لیں۔ پھر اس میں وقت ضائع کرنے سے حاصل؟ اپنی مادری زبان میں کہو کہ اس میں ترقی اور کامیابی کی بہت گنجائش ہے۔ اس پر سودا نے اُردو میں کہنا شروع کیا۔

تحقیق کے میدان میں خان آرزو کی توجہ زیادہ تر لغات پر رہی ہے۔ ان کی نوادر الالفاظ یعنی تصحیح غرائب اللغات ہندی مطبوعہ موجود ہے۔ غرائب اللغات عبدالواسع ہانسوی کی تالیف ہے۔ خان آرزو نے اس کی اغلاط کی نشاندہی کی ہے۔ ان کی یہ کتاب بجا طور پر اُردو کی ابتدائی لغات کہی جاسکتی ہے اور اس کی تاریخی اہمیت مسلمہ ہے۔

خان آرزو کے بعد کوئی سو سال تک اُردو دنیا میں سناٹا رہا۔ اس دور میں لوگوں کی توجہ زیادہ تر شعر اور کمتر نثر کی طرف رہی جس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ تحقیق کی سب سے پہلی مثال مولانا الطاف حسین حالی (ف دسمبر ۱۹۱۴ء) نے پیش کی۔ انھوں نے تین سوانح عمریاں لکھیں۔ حیاتِ سعدی (۱۸۸۲ء) یادگارِ غالب (۱۸۹۷ء) اور سر سید احمد خان کے حالات میں حیاتِ جاوید (۱۹۰۱ء) ان میں تحقیقی پہلو سے حیاتِ سعدی کا درجہ سب سے افضل ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ (۱۸۸۲ء) میں شائع ہوئی تھی۔ پچھلے پچاسی برس میں کئی نئے مآخذ دریافت ہوئے، فکر ونظر کے زاویے تک بدل گئے! لیکن حیاتِ سعدی میں حالی جو کچھ لکھ گئے ہیں، اس پر اضافہ نہ ہوسکا۔ اس کے برعکس یادگارِ غالب کو لیجیے، جسے انھوں نے ۱۸۹۷ء میں شائع کیا تھا۔ اس میں حیاتِ سعدی کے برابر کاوش نہیں کی گئی۔ اس کے دو سبب خیال میں آتے ہیں۔ شاید مصنف کے ذہن میں یہ بات رہی ہو کہ مرزا مرحوم کے ملنے والے اور دیکھنے والے موجود ہیں، وہ ان کے بیشتر حالات جانتے ہی ہیں اس لیے تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں چنانچہ انھوں نے بعض اہم اور نمایاں واقعات سے تجاوز نہیں کیا اور زیادہ توجہ مرزا کے اُردو فارسی کلام نظم ونثر کی خوبیاں اجاگر کرنے پر مبذول کر دی کہ ان کے خیال میں یہی ان کی عظمت اور بزرگی کی یادگار تھی،...... جس کی بدولت ان کا نام صفحۂ ہستی پر زندہ رہنے والا تھا، اس میں شبہ نہیں کہ غالب کے کلام کی بلندی کا اصلی احساس یادگارِ غالب نے ہی دلایا، اسی بنیاد پر بعد کے شارحین نے وہ قصر فلک بوس تعمیر کیے، جو آج ہمارے سامنے ہیں۔۔۔۔ اس سے سوانح عمری کا حصہ ضرور تشنہ رہ گیا۔ حالی خود غالب کے شاگرد تھے، ان سے اکثر ملاقات کے مواقع پیش آئے، بعض کا ذکر اس کتاب میں موجود ہے۔ اگر وہ چاہتے تو ان سے تفصیلی حالات معلوم کر سکتے تھے لیکن شاید مرزا کی زندگی میں انھیں یہ خیال نہیں آیا کہ کسی دن مجھے یہ کتاب لکھنا پڑے گی، اسی لیے انھوں نے استاد سے زیادہ کرید کرید کے کچھ نہیں پوچھا۔

ایک دوسری وجہ بھی خیال میں آتی ہے۔ آج ہم مغربی تعلیم کے اثر کے تحت صاحبِ ترجمہ کے حالات کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل اور جزو کو اہمیت دیتے ہیں، وہ حالی کے زمانہ میں مسلمہ نہیں تھی، اس لیے اگر اس صنف کی کچھ باتیں ان کے علم میں تھیں بھی تو عین ممکن ہے کہ انھوں نے انھیں غیر ضروری خیال کر کے نظر انداز کر دیا ہو اس خیال کو تقویت خود ان کی اپنی ایک تحریر سے بھی ہوتی ہے۔ حیاتِ جاوید کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

''ہندوستان میں جہاں ہیرو کے ایک عیب یا خطا کا معلوم ہونا ان کی تمام خوبیوں اور فضیلتوں پر پانی پھیر دیتا ہے، ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ کسی شخص کی بائیوگرافی کریٹکل طریقہ سے لکھی جائے، اس کی خوبیوں کے ساتھ اس کی لغزشیں بھی ظاہر کی جائیں۔ چنانچہ اسی خیال سے

ہم نے جو دو ایک مصنفوں کا حال اس سے پہلے، اس میں جہاں تک ہم کو معلوم ہوسکیں، ان کی اور ان کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور ان کے پھوڑوں کو ٹھیس نہیں لگنے دی''۔

یہاں جن ''دو ایک مصنفوں'' کی طرف اشارہ ہے، وہ سعدی اور غالب ہی ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ شاید ان کے علم میں کچھ اور واقعات بھی ہوں لیکن چونکہ ان سے ان کے خیال میں غالب کے ''پھوڑوں کو ٹھیس'' لگنے کا اندیشہ تھا اس لیے وہ انھیں عمداً نظر انداز کر گئے۔ اسی وجہ سے یادگار غالب کے سوانحی حصے میں کھانچے رہ گئے ہیں اور چونکہ اب کسی اور کو وہ مواقع میسر نہیں آسکتے، جو انھیں حاصل تھے اس لیے ان کا پر کرنا بھی بظاہر محال نظر آتا ہے۔ اس کے باوجود کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یادگار غالب اپنے مقصد میں ناکام رہی۔ حالی نے اس تصنیف کا مقصد یہ قرار دیا تھا:

''اصل مقصود اس کتاب کے لکھنے سے شاعری کے اس عجیب و غریب ملکہ کا لوگوں پر ظاہر کرنا ہے جو خدا تعالیٰ نے مرزا کی فطرت میں ودیعت کیا تھا اور جو کبھی نظم و نثر کے پیرایہ میں، کبھی ظرافت و بذلہ سنجی کے روپ میں، کبھی عشق بازی اور رندو مشربی کے لباس میں اور کبھی تصوف اور حب اہل بیت کی صورت میں ظہور کرتا تھا پس جو ذکر ان چاروں باتوں سے علاقہ نہیں رکھتا، اس کو کتاب کے موضوع سے خارج سمجھنا چاہیے''۔

(دیباچہ یادگار غالب)

یہی وجہ ہے کہ انھوں نے سوانح حیات کو زیادہ اہمیت نہیں دی، بلکہ ان واقعات کو وہ ''ضمنی اور استطرادی'' حیثیت دیتے ہیں۔ ان کا اصلی مقصد مرزا کی شاعری اور انشاپردازی کی خوبیوں کو نمایاں کرنا تھا۔ پس ہمیں اس کتاب کو اسی نقطہ نظر سے دیکھنا چاہیے۔

حیات جاوید، سرسید کی سوانح عمری ہے۔ اگرچہ یہ کتاب انھوں نے سرسید کی حیات میں لکھنا شروع کر دی تھی لیکن اس کی تکمیل ان کی وفات کے بعد ہوئی۔ اپنی زندگی میں سرسید کی ذات مدتوں ملک کے مذہبی اور سیاسی حلقوں میں بحث کا موضوع بنی رہی تھی، ناممکن تھا کہ اس کے اثرات حیات جاوید تک نہ پہنچتے، یہی وجہ ہے کہ جب یہ کتاب شائع ہوئی تو ایک صاحب نے اسے ''کذب و افترا کا آئینہ'' اور ''مدلل مداحی'' کے القاب دیے۔ آج وہ ہیجانی دور نہیں، وہ بحثیں تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہو کر تقویم پارینہ بن گئیں۔ کون حق و صداقت پر تھا اور کون غلطی اور گمراہی کی طرف لے جا رہا تھا اس کا فیصلہ بھی زمانے نے کر دیا جو سب سے بڑا اور بے رحم قاضی ہے۔ اب ہم حیات جاوید کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تحقیقی نقطۂ نگاہ سے اس میں کوئی خامی نہیں، مواد نہایت محنت اور کاوش سے جمع کیا گیا ہے جو خوش اسلوبی سے قلم بند ہوا ہے اور مصنف نے پوری ایمان داری اور خلوص سے اپنے نتائج بیان کر دیے ہیں۔

غرض تحقیقی لحاظ سے یہ بہت کامیاب تصنیف ہے اور اب اس پر کسی اضافے کا امکان نہیں ہے۔

لیکن حالی کا کام محدود سطح پر تھا۔ انھوں نے سیرت سے باہر قدم نہیں رکھا، ان کی مثال زیادہ سے زیادہ اسی میدان میں لوگوں کی رہنمائی کر سکتی ہے، اس سے عام تحقیقی ذوق اور تجسس کی خواہش نہیں پیدا ہو سکتی تھی۔ یہ کام ان کے ہم عصر مولانا شبلی نعمانی (ف نومبر ۱۹۱۴ء) نے کیا۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک ایسا شخص جو پرانے ماحول میں پیدا ہوا، جس کی پوری تعلیم پرانے مکتبی انداز پر ہوئی، جسے مغربی زبانوں کی کچھ یونہی برائے نام شد بد تھی، اس نے تحقیق کے میدان میں ایسے دیرپا آثار چھوڑے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ علی گڑھ کے قیام اور سرسید کی صحبت کا فیضان تھا۔ حالی کی طرح انھوں نے بھی چند سوانح عمریاں لکھیں لیکن ان کے علاوہ انھوں نے تذکرہ نویسی اور تحقیقی مقالات میں بھی قابل قدر کام کیا۔ شعرالعجم (۱۹۰۸ء-۱۹۱۰ء) اگرچہ فارسی شعرا کا تذکرہ ہے لیکن اُردو میں لکھا گیا ہے۔ یہ اُردو داں طبقے کے لیے فارسی زبان کی عہد بعہد ترقیوں اور مختلف اصناف سخن سے تعارف کا بہت اچھا ذریعہ ثابت ہوا۔ اس کی تدوین میں ان سے بعض تاریخی غلطیاں ہوئیں، کچھ تو اس لیے کہ کئی مآخذ اور مراجع کی کتابیں شعرالعجم کے زمانہ تالیف تک شائع نہیں ہوئیں تھیں یا آسانی سے دستیاب نہیں ہو سکتی تھیں اور کچھ اس کے لیے بھی کہ خود شبلی نے سہل انگاری سے کام لیا۔ انھوں نے دوسروں کی لکھی لکھائی باتوں اور تاریخوں پر اعتماد کر کے خود جستجو کی زحمت گوارا نہ کی اور انھیں بجنسہٖ شعرالعجم میں درج کر دیا۔ شبلی بے شک مورخ تھے، ان کا تاریخ کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ حافظہ بہت اچھا پایا تھا لیکن ان میں ایک بات کی افسوسناک کمی ہے کہ وہ بالعموم اختلافی مسائل میں اپنی فیصلہ کن رائے دینے سے اجتناب کرتے ہیں۔ اگر وہ کسی نظریے کو ثابت کرنا چاہتے ہیں اور انھیں اپنی تائید میں کچھ دلائل و شواہد مل جائیں تو پھر وہ اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ زیادہ تگ و دو کر کے مخالف کے دلائل بھی دیکھ لیں یا ان کی تردید کی کاوش کریں۔ مثال کے طور پر شعرالعجم کو لیجیے اس میں انھوں نے سنین سے متعلق بیشتر یہ روش اختیار کی ہے کہ اگر مختلف تذکروں میں کسی شخص کی ولادت یا وفات کی مختلف تاریخیں ہیں، تو انھوں نے یہ سب جوں کی توں نقل کر دی ہیں اور یہ محاکمہ کرنے کی زحمت نہیں اٹھائی کہ ان میں سے کون سی درست ہے اور کون سی غلط۔ مثلاً موازنہ انیس و دبیر کو لیجیے، اس میں انھوں نے انیس کے کلام

سے مثالیں پیش کی ہیں۔ان کے مقابلے میں دبیر کے کسی ایک آدھ شعر کی مثال دے کر انیس کے لیے وجہ ترجیح پیدا کر لی ہے حالانکہ دبیر کے کلام سے اس سے بہتر مثالیں مہیا ہو سکتی تھیں لیکن چونکہ اس سے ان کے نظریے کے کمزور بلکہ غلط ثابت ہو جانے کا اندیشہ تھا اس کی طرف توجہ نہیں کی۔بے شک انیس اس سے بھی زیادہ تعظیم وتکریم کے مستحق ہیں جتنی شبلی نے کی ہے لیکن یہ دبیر کے صحیح کمالات سے چشم پوشی کے لیے وجہ جواز نہیں بن سکتی۔

شبلی کے تحقیقی کام کی بہترین مثال ان کی لکھی ہوئی سوانح عمریاں ہیں۔ المامون (۱۸۸۷ء) سیرۃ النعمان (۱۸۹۲ء) الفاروق (۱۸۹۸ء) الغزالی (۱۹۰۲ء) سوانح مولانا روم (۱۹۰۶ء) سیرۃ النبی ﷺ انھوں نے اپنی زندگی کے آخری زمانے میں لکھنا شروع کی تھی۔صرف پہلی جلد مکمل ہوئی تھی اور دوسری پر کام جاری تھا کہ خاتمہ بالخیر کا پیغام آ گیا۔یہ دونوں جلدیں ان کی وفات کے بعد ان کے تلمیذ رشید سلیمان ندوی مرحوم نے ۱۹۱۸ء میں اور اس کے بعد شائع کیں،ان سب کتابوں میں واقعات کی تحقیق،ان کی ترتیب اور دروبست،اخذ نتائج وغیرہ ہر ایک بات قابل تعریف ہے،اب ان موضوعات سے متعلق کچھ اور لکھنا محال ہے۔

ان مستقل تصانیف کے علاوہ انھوں نے کچھ خاص موضوعات سے متعلق بھی داد تحقیق دی ہے۔اس ذیل میں ان کے بعض مضامین بڑے معرکے کے ہیں۔مثلاً ایک زمانے سے یہ خیال چلا آتا تھا کہ مسلمانوں نے مصر فتح کرنے کے بعد اسکندریہ کا کتب خانہ جلا دیا تھا۔مولانا نے تحقیق سے ثابت کر دیا (۱۸۹۲ء) کہ یہ مسلمانوں پر افترا و اتہام ہے۔یہ کتب خانہ فتح مصر سے مدتوں قبل رومیوں کے زمانے میں جل چکا تھا۔اسی طرح ان کے مضامین ''مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم'' (۱۸۸۷ء) اسلامی کتاب خانے (۱۸۹۲ء) اسلامی حکومتیں اور شفا خانے (۱۸۹۵ء) الجزیہ (۱۸۹۵ء) وغیرہ بڑی دیدہ وری اور محنت سے لکھے گئے ہیں۔ان میں بعض مضامین دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ ہو کر مقبول ہوئے۔

شبلی کی ایک اور قابل ذکر خصوصیت ان کے اسلوب بیان کی شگفتگی اور دلکشی ہے۔وہ فصاحت وبلاغت کے اصول جانتے ہیں۔انھوں نے ہر موقع پر اس کی مناسبت سے زبان استعمال کی ہے۔اسی باعث ان کی بیشتر کتابیں انشا کا بھی بہت اچھا نمونہ ہیں اور آج بھی اسی ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہیں جس طرح جب وہ پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھیں۔

اُردو کی خوش قسمتی شبلی کو شاگرد بھی ایسے میسر آ گئے جنھوں نے ان کے کام کو آگے بڑھایا،دارالمصنفین کا منصوبہ ان کے ذہن میں پہلی مرتبہ ۱۹۱۰ء میں آیا تھا لیکن اس کی تجویز کی اشاعت انھوں نے اپنی وفات سے چند مہینے پہلے ۱۹۱۴ء میں کی اور تکمیل موت سے شاید دو ہفتے قبل ہوئی،بارے،ان کے تلامذہ نے ان کا کام جاری رکھا۔اسلامی تاریخ پر بہت بلند پایہ کتابیں یہاں سے شائع ہو کر قبول عام کا مقام حاصل کر چکی ہیں۔خود سید سلیمان ندوی مرحوم (ف نومبر ۱۹۵۳ء) نے ارض القرآن،عرب وہند کے تعلقات،سیرۃ عائشہ،خیام وغیرہ کی سی تحقیقی کتابیں لکھیں ہیں۔انھوں نے اپنے استاد کی مفصل اور مستند سوانح عمری بھی حیات شبلی کے عنوان سے لکھی۔شبلی کے ایک دوسرے شاگرد مولانا عبدالسلام ندوی (ف اکتوبر ۱۹۵۶ء) نے بھی اس سلسلے میں مفید کام کیا۔ان کی کتابیں سیرت عمر بن عبدالعزیز،امام رازی،سیر الصحابہ کے پہلے دو حصے وغیرہ محنت سے لکھی گئی ہیں۔انھوں نے شعر العجم کے تتبع میں شعر الہند بھی لکھی تھی،مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی،دارالمصنفین کا فیضان اب بھی جاری ہے۔

شبلی کے ساتھ معاً خیال حافظ خان محمود شیرانی کا آتا ہے۔شبلی کی طرح شیرانی نے بھی انگریزی تعلیم نہیں پائی تھی۔وہ ۱۸۸۰ء میں ریاست ٹونک میں پیدا ہوئے،ان کے والد محمد اسمٰعیل خان وہاں کے اچھے باحیثیت جاگیردار تھے۔ظاہر ہے کہ ایسے گھرانے میں انگریزی پڑھنے پڑھانے کا کیا سوال تھا چنانچہ سب سے پہلے انھیں قرآن حفظ کرایا گیا اور اس کے بعد فارسی سے تعلیم کا آغاز ہوا۔تکمیل کے لیے لاہور بھیجے گئے۔انیس برس کی عمر تھی،جب یہاں کے اورینٹل کالج سے منشی فاضل کی سند لے کر وطن واپس آئے۔معلوم نہیں کیوں کر ۱۹۰۱ء میں یہ فیصلہ ہوا کہ یہ بیرسٹری کی سند لینے کے لیے ولایت جائیں،انگریزی جانتے نہیں اور بیرسٹری کی تعلیم کے لیے ولایت کی روانگی،ان سے کچھ بعد سر شیخ عبدالقادر اور ڈاکٹر سر محمد اقبال بھی اپنی تعلیم کے سلسلے میں ولایت پہنچے اور شیرانی کے ان سے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے جن سے آگے چل کر شیرانی کو بہت مدد ملی۔ولایت میں انھوں نے پہلے انگریزی سیکھی اور اس کے بعد قانون کا ایک آدھ امتحان پاس کیا لیکن تعلیم ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ٹونک میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور اس کے بعد بھائیوں نے یہاں سے خرچ کے لیے روپیہ بھیجنا بند کر دیا۔اس سے ان کا ہاتھ بہت تنگ ہو گیا۔بارے،پہلے سر ٹامس آرنلڈ نے کچھ مدد کی اور یہ معمولی وظیفے پر ان کے علمی کاموں میں مدد کرتے رہے پھر لندن کی مشہور مشرقی کتابوں کی فرم لوزک کمپنی سے معاملہ ہو گیا۔یہ ان کے لیے مشرقی علوم وفنون کی نادر قلمی اور مطبوعہ کتابیں جمع کرنے لگے۔اس پر انھیں معقول کمیشن ملتا تھا۔رفتہ رفتہ یہ اس کمپنی کے حصے دار بن گئے۔۱۹۱۳ء میں وہ ہندوستان آئے۔ارادہ یہ تھا کہ بھائیوں سے والد کے ترکہ کی تقسیم کا معاملہ طے کر کے واپس انگلستان چلے جائیں گے۔ایک آدھ برس اس ادھیڑ بن میں گزرا،اتنے میں پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴ء۔۱۹۱۸ء) شروع ہو گئی۔اب سمندری سفر ناممکن تھا اور مجبوراً یہیں کے ہو کے رہ گئے۔اگلے سات آٹھ برس بیکاری میں

ٹونک میں بسر ہوئے، جب یہاں بسر اوقات کی کوئی سبیل نہ نکل سکی تو ۱۹۲۱ء میں وہ لاہور پہنچے۔ یہاں اپنے پرانے دوست شیخ عبدالقادر کی وساطت سے انھیں اسلامیہ کالج لاہور میں فارسی اور اُردو پڑھانے کا کام مل گیا۔ مشاہرہ اگرچہ قلیل، صرف ڈیڑھ سو روپیہ تھا لیکن انھوں نے اسے صبر وشکر سے منظور کر لیا۔ اسلامیہ کالج میں وہ ۱۹۲۸ء تک رہے۔ اسی سال وہ یہاں سے اورینٹل کالج میں اُردو کے مدرس ہو کر چلے، جہاں سے بارہ برس بعد ۱۹۴۰ء میں سبکدوش ہوئے۔ ان کا فروری ۱۹۴۲ء میں بعارضہ دمہ ٹونک میں انتقال ہو گیا۔

شیرانی فارسی کے فاضل تو تھے ہی لیکن جو وقت انھوں نے انگلستان میں آرنلڈ اور لوزک کمپنی کے ساتھ گزارا، اس نے انھیں فاضل یگانہ بنا دیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ان کی علمی صلاحیتوں اور قابلیتوں کی تکمیل ہوئی جس سے گویا ان کی آئندہ زندگی کا رخ مقرر ہو گیا۔ کاروبار کے لیے ضرورت تھی کہ جو کتاب انھیں دستیاب ہو، وہ اس کی علمی حیثیت، اس کے زمانہ تالیف وکتابت، مصنف کے حالات وغیرہ سے متعلق پوری معلومات بہم پہنچائیں۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے لیے انھیں کتنا وسیع مطالعہ کرنا پڑا ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں نہ صرف فارسی ادب کی مختلف اور گوناگوں شاخوں میں استادانہ مہارت حاصل ہو گئی بلکہ اسی سلسلے میں تمام اسلامی ممالک کی تاریخ اور اس کی تفصیلات اور جزئیات بھی ان کی گرفت میں آ گئیں۔ خطاطی، مصوری، نقاشی، تو گویا ان کے ثانوی موضوع تھے، ان میں بھی پوری مہارت پیدا ہو گئی، ان کی بصیرت اور ژرف نگاہی کا یہ عالم تھا کہ بسا اوقات وہ قلمی کتاب دیکھ کر بتا دیتے تھے کہ اس کا کاغذ کس زمانے کا ہے، عہد کون سا ہے، کاتب کس مدرسہ کتابت کا فرد ہے اور بیشتر کاتب کا نام تک بتا دیتے تھے۔

اسلامیہ کالج لاہور، کی ملازمت کے آخری زمانے میں ان کی توجہ اُردو زبان کے آغاز کے مسئلے کی طرف منعطف ہوئی۔ آج تک لوگ اُردو کی ابتداء کو مغلوں سے خصوصاً اکبر یا شاہجہان کے عہد سے منسوب کرتے آئے تھے، حالانکہ کوئی زبان کسی خاص تاریخ یا معین زمانے میں وجود میں نہیں آیا کرتی، اس کا خمیر لمبے عرصے تک یکتار ہتا ہے۔ اُردو بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتی۔ اس کا ہیولیٰ بھی اس ملک کی مختلف زبانوں کے میل جول سے تیار ہو رہا تھا اور وہ اس منزل پر پہنچ چکا تھا کہ اب کسی بیرونی زبان سے تعلق پیدا ہوتے ہی وہ نئی زبان کی شکل اختیار کر جاتا۔ اتفاق سے یہ بیرونی زبان مسلمانوں کے اس ملک میں پہنچ جانے سے فارسی ثابت ہوئی۔ گویا زبان کی بنیادی خصوصیات ملکی یا مقامی رہیں۔ بیرونی اثر صرف سطح پر پڑا جس کی ظاہری شکل فارسی، عربی، ترکی، الفاظ یا رسم الخط قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ شیرانی کا نظریہ مختصراً یہ تھا کہ مسلمانوں کا یہاں کے لوگوں سے پہلا واسطہ پنجاب میں پڑا اور پھر صدیوں یہ اختلاط یہیں قائم رہا۔ اس لیے اُردو کی موجودہ شکل وصورت بھی اسی علاقے میں متعین ہوئی، وہ فرماتے ہیں:

''جس زبان سے اُردو ارتقا پاتی ہے وہ برج ہے، نہ ہریانی اور قنوجی ہے بلکہ وہ زبان ہے جو صرف دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی'' (پنجاب میں اُردو، ص ب)۔

پھر لکھتے ہیں:

''ہم دیکھتے ہیں کہ اُردو اپنی صرف ونحو میں ملتانی زبان کے بہت قریب ہے'' (ایضاً ص ب)۔

یا پھر

''پنجابی اور اُردو میں ساٹھ فیصدی سے زیادہ الفاظ مشترک ہیں'' (ایضاً)۔

اپنے اس دعوے کے ثبوت میں انھوں نے اتنے بڑے دلائل پیش کیے کہ وہ لوگ تک جو شروع میں اسے سننے تک کے روادار نہیں تھے، مجبور ہو گئے کہ اس پر سنجیدگی سے غور کریں، شیرانی نے تاریخ کے علاوہ پرانی کتابوں سے شواہد کا ایک انبار مہیا کر دیا۔ اس سے کئی ایسے قدیم مصنف نمایاں ہو گئے جو گمنامی کا شکار ہو چکے تھے، میں نہیں کہتا کہ ان کا یہ نظریہ اپنی تمام تفصیلات میں بھی ہر طرح درست ہے یا اس کے خلاف کوئی دلیل نہیں یا اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا...... اور کون سا انسانی نظریہ ہے جو اپنی تمام جزئیات میں درست اور ناقابل اعتراض ہوا کرتا ہے بلکہ میرا مقدر یہ کہنا ہے کہ جب وہ کسی مسئلے سے متعلق تحقیق شروع کرتے تھے تو اس کے تمام گوشوں کو چھان پھٹک کر اپنا اطمینان کر لیتے تھے۔ اُردو کے آغاز سے متعلق بھی انھوں نے یہی کیا۔ اس کتاب کے بعد بھی انھوں نے متعدد مضمون اُردو سے متعلق لکھے۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ گراہم بیلی نے اپنی تاریخ ادب اُردو میں شیرانی کے نظریے کی تائید کی ہے۔

شیرانی بڑے بت شکن تھے۔ انھوں نے متعدد ان نظریوں کی غلطی مسکت دلائل سے ثابت کی جو صدیوں سے مسلمہ کلیوں کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ مثلاً:

(۱) فردوسی نے شاہنامہ سلطان محمود غزنوی کی فرمائش پر لکھا تھا۔

(۲) فردوسی نے سلطان کی ہجو لکھی۔
(۳) خالق باری، حضرت امیر خسرو کی تصنیف ہے۔
(۴) پرتھی راج راسا محمد غوری کے عہد میں کسی شاعر چاند بردے نے تصنیف کیا۔
(۵) دیوانِ معینی، حضرت معین چشتیؒ کا کلام ہے۔
(۶) شاہنامے کے علاوہ فردوسی نے یوسف زلیخا نام کی نظم بھی لکھی تھی۔

جب کوئی نظریہ کسی لمبے عرصے تک لوگوں میں تسلیم کیا جاتا رہے تو یہ مذہبی عقیدے سے بھی زیادہ عزیز بن جاتا ہے اور اگر کوئی شخص اس کے خلاف آواز اٹھاتا ہے تو وہ گردن زدنی قرار دے دیا جاتا ہے۔ شیرانی خوب جانتے تھے کہ وہ اتنے سارے تسلیم شدہ مسئلوں میں اختلافی رائے دے کر کن بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ رہے ہیں لیکن انھوں نے اندرونی اور بیرونی شہادتوں کی بناء پر ان سب نظریوں کی تغلیط کی۔ یہ کچھ آسان کام نہیں تھا اس لیے انھیں لسانی اور تاریخی ثبوت مہیا کرنے میں کتنی محنت کرنی پڑی، اس کا کچھ اندازہ ان مضامین کے غائر مطالعے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

ان تحقیقی مضامین کے علاوہ شیرانی نے ہمارے ادب کی دو مشہور کتابوں پر طویل تحقیقی تنقیدی مضمون بھی لکھے۔ پہلا شبلی کے شعر العجم پر اور دوسرا محمد حسین آزاد کے آبِ حیات پر، افسوس کہ باوجود یہ دونوں مضمون نامکمل رہ گئے۔ تاہم تنقید شعر العجم بہت حد تک مکمل ہی کہی جا سکتی ہے۔ آبِ حیات والا مضمون انھوں نے زندگی کے آخری ایام میں شروع کیا تھا اور وہ اس زمانے میں بہت بیمار رہنے لگے تھے، اس لیے اسے مکمل نہ کر سکے۔ تنقید شعر العجم کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہے، اس کا ایک ایک صفحہ ان کے مطالعے کی وسعت اسلامی تاریخ پر جس ذہانت اور نکتہ سنجی کا شاہد عادل ہے جیسا کہ نواب صدر یار جنگ مرحوم نے کہا تھا۔ شیرانی کی گرفت درشت لیکن درست ہوتی تھی اس لیے آج تک کسی کو جواب دینے کی جرأت نہیں ہوئی۔

شیرانی کے بعض شاگردوں نے ان کا تتبع کیا ہے۔ اس پر مجھے بے اختیار محمد ابراہیم ڈار (ف مئی ۱۹۵۳ء) کا نام یاد آ گیا۔ افسوس کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ قبل از وقت ہم سے جدا ہو گئے۔ ان کی مولانا سید سلیمان ندوی کی حیاتِ شبلی پر تنقید خاصے کی چیز ہے۔

اس سلسلے میں لاہور ہی کی ایک اور شخصیت بھی قابلِ ذکر اور قابلِ قدر ہے، میری مراد پرنسپل محمد شفیع سے ہے۔ ان کا بیشتر علمی کام بعض پرانے متون کی ترتیب و تحشیہ تک محدود رہا لیکن ان کے فیضِ تربیت سے پنجاب میں کام کرنے والوں کی ایک وقیع جماعت تیار ہو گئی ان کا سب سے اہم اصول یہ تھا کہ کوئی بات بے ثبوت نہ کہی جائے، ہر ایک بیان یا دعویٰ یا تحریر بادلیل اور باحوالہ ہونا چاہیے، ان کے نزدیک مآخذ اور مصادر کی اہمیت خود مقالے سے کم نہیں تھی۔

جیسا کہ آپ حضرات جانتے ہوں گے، پروفیسر محمد شفیع ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے انگریزی ادب اور عربی میں ایم اے کی اسناد لے کر ۱۹۱۵ء میں ولایت گئے۔ ۱۹۱۹ء میں کیمبرج سے ایم اے کی سند لے کر واپس آئے تو اپنی مادرِ علمی، پنجاب یونیورسٹی ہی میں عربی ادبیات کے استاد مقرر ہو گئے اور ۱۹۴۲ء تک جب وہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے ہیں، اسی عہدے پر فائز رہے۔ اس دوران میں ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۲ء تک وہ لاہور اورینٹل کالج کے پرنسپل بھی رہے، اس کے بعد جب پنجاب یونیورسٹی نے اُردو دائرۃ المعارف اسلامیہ یعنی اُردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی ترتیب و تدوین کا منصوبہ بنایا، تو وہ اس شعبے کے صدر بنائے گئے۔ اسی عہدے پر ان کا ۱۹۶۳ء میں انتقال ہوا۔

انھوں نے جس محنت اور تندہی سے ابن عبد ربہ کی کتاب عقد الفرید کے تفصیلی اشاریے تیار کیے، وہ تحقیق و ترتیب و تحشیہ کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں ان کے صبر و استقلال اور جفاکشی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس کام میں ان کے پندرہ برس صرف ہوئے۔ یہ کام انھوں نے انگریزی میں کیا تھا، اس کے علاوہ تذکرہ میخانہ عبدالنبی فخر الزمانی قزوینی مطلع سعدین، مکاتیب رشیدی، کو بھی انھوں نے حواشی اور فرہنگ کے ساتھ شائع کیا، یہ کتابیں فارسی میں ہیں، عربی تتمہ، صوان الحکمہ، کے متن اور حواشی کی اشاعت بھی انھی کی محنت کا نتیجہ ہے۔

تاریخ لاہور، تاریخ قصور (کہ ان کا مسقط الراس تھا) فرقہ نور بخشی، تاریخ خاندان تیمور، ان کے خاص موضوع تھے، ان کے علاوہ انھیں خطاطی اور خط کے ارتقا اور مختلف خطاطوں کے حالات سے بھی خاص دلچسپی تھی اور انھوں نے ان سے متعلق متعدد مقالے لکھے ہیں ان میں سے بیشتر اورینٹل کالج میگزین لاہور میں شائع ہوئے تھے، کاش کے کوئی صاحب ہمت کر کے ان کے وہ مضمون کتابی صورت میں شائع کر دیں جو فارسی اور اُردو والوں کی دلچسپی کے ہیں۔

اب میں ایسی شخصیت کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو خدا کے فضل سے ہمارے درمیان موجود ہیں، میرا اشارہ جناب قاضی عبدالودود کی طرف ہے۔ موصوف اب ستر کے پیٹے میں ہیں، وہ پٹنہ کے ایک مذہبی گھرانے میں ۱۸۹۷ء یا ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ان کی بھی عربی کی ہوئی بلکہ انھوں نے قرآن تک حفظ

کیا، اس کے بعد انگریزی پڑھی، پھر بیرسٹری کی سند لینے کو ولایت گئے۔ وہاں بیمار ہو گئے۔ علاج معالجے سے ٹھیک تو ہو گئے لیکن ڈاکٹروں نے بتایا کہ آپ کی صحت مخدوش ہے اس لیے آپ کو کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جس سے مرض کے عود کر آنے کا اندیشہ ہو چونکہ خدا کا دیا گھر میں کافی تھا اور بسر اوقات کے لیے نوکری یا وکالت کرنے کی چنداں ضرورت بھی نہیں تھی۔ انھوں نے پڑھنے لکھنے کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ خوش قسمتی سے بانکی پور پٹنے کا شہرہ آفاق کتب خانہ گویا ان کے گھر میں تھا۔ اس سے انھوں نے جی بھر کے استفادہ کیا۔ میرا ایمان ہے کہ جہاں تک فارسی علم و ادب کا تعلق ہے آج ملک بھر میں ان کی برابری کا شاید ہی کوئی اور عالم ہو، بدقسمتی سے انھوں نے کوئی مستقل تصنیف پیش نہیں کی لیکن پچھلے ۴۰۔۴۵ برس میں انھوں نے بیسیوں تحقیقی مقالات قلم بند کیے ہیں۔ ان میں انھوں نے اُردو شعرا اور ادبا کے حالات لکھے ہیں، کتابوں پر تبصرے کیے ہیں۔ بعض کتابوں کی تلخیص کی ہے اور کئی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے، ان کے بعض مقالے خاصے طویل ہیں اور بآسانی الگ سے کتابی شکل میں چھاپے جا سکتے ہیں، مثلاً ان کا مقالہ غالب بحیثیت محقق کم و بیش دو سو صفحات پر محیط ہے۔ ان کے تنقیدی مقالات کے دو مختصر مجموعے عیارستان اور اشتر و سوزن، چھپ چکے ہیں۔ اگر ان کے تمام مضامین ہی جمع کیے جائیں تو کئی جلدوں کا مواد ہے۔ مقالات کے علاوہ انھوں نے بعض کتابوں کو مفید اور معلوماتی حواشی کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ مثلاً دیوان شورش، تذکرہ ابن امین اللہ طوفان وغیرہ۔

لیکن میرے نزدیک تحقیق کے میدان میں موصوف کا اصلی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہمارے نئے لکھنے والوں کے لیے احتیاط اور محنت کی مثال قائم کی ہے۔ ان کی دیکھا دیکھی بعض نوجوان محقق بھی اب اپنے موضوع کے مالہ، و ماعلیہ کا پورا احاطہ کرنے لگے ہیں۔ اگر ان اصحاب نے حفظ مراتب کا خیال رکھا اور درشتی سے زیادہ درستی کو اپنا شعار بنایا، تو یہ تحریک ہماری زبان کی ترقی اور نیک نامی کا باعث ہوگی۔

میں نے اب تک ان کے اکابر کا ذکر کیا ہے جنھوں نے مختلف مرحلوں پر نہ صرف خود تحقیق کا کام وسیع پیمانے پر کیا، بلکہ ان کے اثرات بھی دوررس اور دیرپا ثابت ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد اصحاب نے انفرادی طور پر بھی بلند پایہ اور قابل فخر کام کیا ہے۔ ان میں سے مولوی عبدالحق، شیخ چاند، محی الدین قادری زور، مولوی عبدالرزاق کان پوری وغیرہ آج ہمارے درمیان نہیں ہیں، زندوں میں جن اصحاب نے تحقیقی کام کیا ہے، ان کے نام آپ سے مخفی نہیں ہوں گے اور میں سمجھتا ہوں کہ مجھے ان سے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

اب میں مختصراً ان چند موضوعات سے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں جو ہماری توجہ کے مستحق ہیں اور جو کسی تحقیقی کام کے بھی بنیادی میدان ہیں۔ اس سلسلے میں مختلف حیثیتوں سے یہ شعبے اہم ہیں:

(۱) سوانح عمریاں، یہ دو حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں۔

(الف) اُردو کے مصنفوں، ادیبوں، شاعروں کی سوانح عمریاں۔

(ب) دوسری تاریخی شخصیتوں کی سوانح عمریاں۔

(۲) تاریخی واقعات کی چھان بین۔

(۳) غیر مطبوعہ متنوں کی تلاش اور مناسب ترتیب کے بعد انھیں شائع کرنا۔

(۴) مطبوعہ کتابوں کے تازہ ایڈیشن تیار کرنا۔

(۵) یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام۔

(۶) تحقیقی رسائل و مجلات۔

آیئے ان پر سلسلہ وار غور کریں:

(الف) سب سے پہلے ادیبوں شاعروں کے حالات اور سوانح عمری کو لیجیے۔ اس سلسلے میں کچھ کام ہوا ہے لیکن ابھی بہت کرنے کو پڑا ہے۔ ہمارے ہاں دس بیس نہیں سینکڑوں ادیب اور شاعر ایسے ہیں جن کی نگارشات ہماری زبان کی تاریخ کا اہم حصہ ہیں لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ہمیں ان میں سے بیشتر کے تفصیلی تو درکنار، اجمالی حالات بھی معلوم نہیں۔ ان میں سے بیسیوں ایسے ہیں جن کی ولادت یا وفات کی تاریخ تک کا پتہ نہیں یا اس کے متعلق یقین سے کچھ کہا نہیں جا سکتا، یہ صورت حال بہت افسوسناک ہے۔ جو چند سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں، ان میں بھی غیر متعلق اور تحقیقی رطب و یابس زیادہ ہے اور کام کی باتیں کم۔ یہ یاد رکھیے کہ طویل نویسی کوئی ہنر نہیں بلکہ کلام کا حسن ایجاز و اختصار میں ہے، ماقل وذل کا مقام حاصل کر لینا بہت بڑی کامیابی ہے۔ جب کوئی شخص اپنے موضوع پر حاوی ہو جاتا ہے اور اس نے اپنے خیالات کو ذہن میں مرتب کر لیا ہے، تو ناممکن ہے کہ وہ بسیار گو ہو سکے، کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ میرے موضوع سے متعلق کون سی بات

ضروری ہے اور کون سی غیر ضروری۔ اب تک ولی، میر، سودا، مظہر جان جاناں، درد، انشا، غالب، مومن، ذوق، ظفر، انیس، دبیر، امیر، داغ، شبلی، نذیر احمد، محمد حسین آزاد، رنگین، جلال، اقبال، ریاض، جگر کی سوانح عمریاں چھپ چکی ہیں، شاید کچھ اور بھی ہوں جن کے نام میں بھول رہا ہوں۔ ان سب کا معیار ایک سا نہیں، ان میں سے بعض مکمل اور مدلل ہیں، بعض کچھ تھوڑی سی محنت اور غیر ضروری باتوں کو حذف کر دینے کے بعد اچھی سوانح عمریاں بن سکتی ہیں، بقیہ نہ یہ ہیں، نہ وہ، ان میں نہ تحقیق ہے نہ حسن بیان۔ ان موضوعات سے متعلق از سر نو تحقیقی کام کرنے کی ضرورت ہے۔

(ب) غیر ادبی شخصیتوں کے سوانح مرتب کرنے پر بھی توجہ ہوئی ہے۔ حالی اور شبلی کی لکھی ہوئی سوانح عمریوں کا ذکر کر چکا ہوں، ان کے علاوہ البرامکہ نظام الملک طوسی، اسلامی تاریخ کے مشاہیر خصوصاً خلفائے راشدین، فقہ کے چاروں امام، رازی، ابن رشد، ابن تیمیہ، متعدد بادشاہ اور حکمران یا ان کے وزراء، البیرونی، عبدالحق محدث دہلوی، صوفیائے کرام، ان کے حالات میں مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے بیشتر کا معیار تحقیق تسلی بخش ہے۔ ان کا سب سے کمزور حصہ حضرات صوفیہ کے حالات ہیں جہاں نہ روایت کا لحاظ کیا گیا ہے نہ درایت سے کام لیا ہے۔

ان ادبی اور غیر ادبی سوانح عمریوں کے درمیان مدارج کا جو فرق ہے اس کی ایک وجہ سمجھ میں آتی ہے، ادب سے باہر جتنے مشاہیر ہیں ان کے حالات کم و بیش تفصیل سے عربی اور فارسی مآخذ میں موجود ہیں، اگر کوئی شخص کام کرنا چاہتا ہے تو وہ ان سے رجوع کرے۔ لیکن اُردو کے شاعروں اور ادیبوں کے حالات جمع کرنے کے لیے کہیں زیادہ عرق ریزی اور جانفشانی کی ضرورت ہے۔ ان کے پس ماندگان اور لواحقین کا کھوج نکالا جائے، ان سے مل کر خاندانی روایات جمع کی جائیں اور عقل و نقل کے مسلمہ اصولوں کی روشنی میں انھیں پرکھ کر کتابیں مرتب کی جائیں۔ ظاہر ہے یہ کام آسان نہیں۔ اس کے لیے بہت کاوش اور دیدہ ریزی درکار ہے، لازماً اُس کے بعد جو کتاب لکھی جائے گی اس کی حیثیت کا فیصلہ بھی اس تحقیق پر منحصر ہوگا جو اس کی تیاری میں صرف ہوئی ہے۔

۲۔ تاریخی واقعات کی چھان بین۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ جہاں کسی شخص یا مسئلے سے متعلق اتنا مواد نہیں ہے کہ اس کی کوئی مفصل سوانح عمری یا پوری کتاب مرتب کی جا سکے لیکن موضوع اپنی جگہ اتنا اہم اور دلچسپ ہے کہ اس سے متعلق تحقیق کی جانی چاہیے یا کی جا سکتی ہے مثال کے طور پر ذوالقرنین کون تھا؟ ہندوستان دار العرب ہے یا دار السلام؟ اس طرح کے مسائل پر ہمارے ہاں بہت کم لکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں لے دے کر سر سید، شبلی، اعظم یار جنگ، عبداللہ عمادی، شرر اور نیاز فتح پوری کے نام ذہن میں آتے ہیں۔

۳۔ اُردو میں پرانے متون کی اشاعت کا مسئلہ بہت مشکل ہے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہماری ادبی تاریخ کے بعض اہم اساتذہ کا کلام نظم و نثر آج تک شائع نہیں ہوا اور جب تک یہ شائع نہ ہو جائے ہم بھلا اپنی زبان کی تاریخ کیوں کر مرتب کر سکتے ہیں، تاریخ انھی مصنفوں کے حالات اور ان کی تفصیلات کے تذکرے اور ان کی اہمیت اور ادب کے تاریخی ارتقا میں ان کے مقام کے یقین کا ہی تو دوسرا نام ہے، جب ان کی سوانح عمریوں کا وہ حال ہے اور مصنفات کا یہ، تو کوئی شخص تاریخ قلمبند کرنے کا تصور ہی کیوں کر سکتا ہے! اس سلسلے میں ہمارے افلاس کا یہ عالم ہے کہ عہد ظفر کو مشکل سے سو سال ہوئے ہیں اور خوش قسمتی سے اس عہد کے بیشتر خطی نسخے تلف ہونے سے بچ گئے ہیں، لیکن ہم آج تک اس زمانے کے متعدد اساتذہ مثلاً نصیر، ممنون، عیش، احسان، آزردہ، حکیم قاسم اور ان کے بیٹے عشق ہدایت، بیان، فراق وغیرہ کے دیوان تک شائع نہیں کر سکے حالانکہ ان کے خطی نسخے کہیں نہ کہیں موجود ہیں۔

ان سے ذرا پہلے کا زمانہ لیجیے تو حالت اور بھی المناک ہے۔ مصحفی، جرأت، حسن، حاتم، وغیرہ کے دیوان ہنوز طباعت سے محروم ہیں۔ جب صورت حال یہ ہو تو ہم کس منہ سے ان شعرائے متعلق گفتگو کر سکتے ہیں یا انھیں اپنی تاریخ میں شامل کر سکتے ہیں؟

بات سے بات یاد آتی ہے۔ ابھی ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے کتب خانوں کے اُردو مخطوطات کی مکمل فہرست تک شائع نہیں ہوئی۔ ہندوستان میں کئی خانقاہوں، قدیم مدرسوں، خاندانی ذخیروں میں قیمتی مخطوطات منتشر پڑے ہیں جو بے توجہی اور ذوق جستجو کی کمی کا شکار ہو رہے ہیں، ضرورت ہے کہ ملک کو چند ادبی حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور کچھ اہل ذوق و استعداد اصحاب ایک ایک حصے کے تمام مقامات پر ذاتی طور پر جائیں اور وہاں سے مخطوطات تلاش کرنے کا بیڑا اٹھائیں۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ کون سی کتاب کہاں دستیاب ہو سکتی ہے تو یہ بھی تکمیل کار کی طرف ایک قدم ہے، ان خطی نسخوں کا یا ان کے عکس کا حصول اور ان کا کسی مرکزی کتب خانے میں محفوظ کر دینا اس سے اگلا قدم ہوگا۔ مرحوم سید محی الدین قادری زور نے دکنی مخطوطات اسی طرح جمع کیے تھے۔ ادارہ ادبیات اُردو، حیدر آباد کا کتب خانہ فخر کر سکتا ہے کہ اس میں پانچ ہزار مخطوطات محفوظ ہیں۔ یہ سب زور مرحوم اور ان کے فرض شناس رفقائے کار کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس سلسلے میں بہار کے بعض احباب نے بھی بہت قابل تعریف کام کیا ہے، لیکن نہیں کہا جا سکتا کہ آندھرا پردیش یا بہار میں بھی اب اور کہیں مخطوطات کے ملنے کا امکان نہیں، ملک کے باقی حصوں میں تو ابھی تک کوئی کام قابل ذکر ہوا ہی نہیں، پس جب تک پوری کوشش اور وہ بھی بلا تاخیر نہیں کی جائے گی، توی اندیشہ ہے کہ بہت سے قیمتی نسخے ضائع

ہو جائیں گے اور چونکہ عین ممکن ہے کہ ان میں سے بعض نسخے وحید ہیں، یعنی ان کی دوسری نقل کہیں اور موجود نہیں ہے، اس لیے اس حد تک یہ نقصان ناقابل تلافی ہوگا۔ غرض اُردو کا غیر مطبوعہ ذخیرہ ایک بروکلمن کا انتظار کر رہا ہے۔

ان خطی نسخوں کے حصول کے بعد ان کے شائع کرنے کا مرحلہ ہے، پرانے متن کا پڑھنا اور حل کرنا خاصا کٹھن کام ہے اور اگر نسخہ منحصر بفرد ہے اور اس متن کا کوئی دوسرا نسخہ دریافت نہیں ہوا تو اس کا مرتب کرنا اور بھی مشکل اور بہت بڑی ذمے داری کا کام بن جاتا ہے۔ شکر ہے کہ ہمارے اہل علم حضرات کو اس کام کی اہمیت کا اندازہ ہو رہا ہے اور چند مستثنیات کو چھوڑ کر آج تک جتنے متن شائع ہوئے ہیں مجموعی طور پر غنیمت ہیں۔

میں اس سلسلے میں دو ایک اور باتیں بھی عرض کر دوں۔

کام مقدار میں بہت ہے اور مشکل بھی اور کام کرنے والے آدمی کم ہیں، خاص طور پر وہ جو اس کے اہل ہیں۔ اس لیے یہ بے حد ضروری ہے کہ کسی کا وقت ضائع نہ ہو اور دو آدمی ایک ہی کام پر نہ لگے رہیں۔ اس کے لیے ایک دوسرے سے تعاون اور تبادلہ خیالات کی اشد ضرورت ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ ایک ہی موضوع پر دو دو بلکہ بعض اوقات تین تین جگہ کام ہو رہا ہے۔ آخر یہ لوگ ایک دوسرے سے خط و کتابت کر کے کیوں طے نہیں کر لیتے کہ ان میں سے ایک نہ ایک اس موضوع سے دست بردار ہو جائے۔ بعض جگہوں پر بہت رازداری سے کام لیا جاتا ہے کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی کہ کن موضوعات پر کام ہو رہا ہے۔ یہ کوئی فوجی اور جنگی راز نہیں، بلکہ علمی باتیں ہیں، ان کی جتنی اشاعت ہو اتنی ہی طلبا کے لیے مفید ثابت ہوگی۔ کسی کام کو خفیہ اور پوشیدہ رکھنے سے نہ کام کی رفتار بڑھے گی نہ اس کا معیار بلند ہوگا۔

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ اب تک جو متن شائع ہوئے ہیں، بحیثیت مجموعی ان کا معیار برا نہیں۔ یہ میں نے اس لیے کہا ہے کہ ہمارے یہاں یہ کام ابھی حال میں شروع ہوا ہے جو لوگ کام کر رہے ہیں انھیں خود تو اس کا تجربہ تھا ہی نہیں، جو اصحاب ان کے نگران اور رہنما ہیں وہ بھی کچھ زیادہ نہیں جانتے۔ پس ان حالات میں ان سے بہتر نتائج کی توقع رکھنا بے سود ہے لیکن ظاہر ہے کہ کام اس سے کہیں بہتر شکل میں ہو سکتا تھا اور ہونا چاہیے تھا لہٰذا جن اصحاب نے یہ کام کیا ہے انھیں اس پر مطمئن ہو کے بیٹھ نہیں رہنا چاہیے۔ انھیں ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش رہے، یہی کامیابی اور فلاح کا راستہ ہے۔

اب تک جو پرانے متن چھپے ہیں، ان کی فہرست کچھ ایسی طویل نہیں اور آپ میں سے کسی صاحب سے پوشیدہ بھی نہیں ہوں گے، اس لیے میں ضرورت نہیں سمجھتا کہ ان سب کتابوں کے نام گنواؤں، ہاں میں معیاری کام کی مثال پیش کر سکتا ہوں، اس سلسلے میں صرف تذکروں کو لیجیے، آپ نے محمود شیرانی کا مرتبہ تذکرہ مجموعہ نغز ضرور دیکھا ہوگا۔ اگر عاری متن شائع کرنا مقصود ہے تو یہ کم از کم اتنی توجہ اور محنت کا مستحق ہے، اگر اس پر حواشی کا اضافہ کرنا چاہیں تو اس کے لیے عرشی کا مرتبہ تذکرہ دستور الفصاحت یا قاضی عبدالودود کا تذکرہ ابن امین اللہ طوفان نمونے کا کام دے سکتے ہیں۔

۴۔ اب مطبوعہ کتابوں کے ایڈیشن شائع کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہو گیا ہے جتنا کہ غیر مطبوعہ متون کا۔ ستم ہے کہ معمولی کتابیں تو درکنار، آج بعض مشاہیر تک کی تصنیفات بھی سہل الحصول نہیں ہیں۔ میر، درد، ذوق، مومن، ناسخ، آتش، صبا، وزیر وغیرہ کے دیوان کا کوئی اچھا نسخہ بازار میں نہیں ملتا، رجب علی بیگ سرور کے فسانہ عجائب یا فخر الدین حسین خان سخن کے سروش سخن کا نسخہ کہیں سے دستیاب نہیں ہو سکتا۔

مطبع نولکشور نے اس ملک میں علم و ادب کی جو خدمت کی ہے، ہم رہتی دنیا تک اس کے احسان سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ سینکڑوں، ہزاروں کتابیں محض اس کی بدولت محفوظ ہو گئیں ورنہ وہ یقیناً صفحۂ ہستی سے ناپید ہو گئی ہوتیں۔ منشی نول کشور (آنجہانی) نے کبھی اس بات کی پروا نہیں کی کہ مسودے کا موضوع کیا ہے اور اس کی ضخامت کتنی۔ ان کے پاس جو مسودہ آیا، انھوں نے اسے شائع کر دیا۔ بدقسمتی سے، ان کتابوں میں کتابت کی بہت اغلاط رہ گئی ہیں! کاغذ بھی کچھ اچھا نہیں استعمال ہوا لیکن یہی کیا کم ہے کہ کتاب اس طرح ضائع ہونے سے تو بچ گئی۔

ایک اور وجہ سے بھی یہ کام ضروری ہو گیا ہے، جب یہ کتابیں پہلی بار منظر عام پر آئی ہیں تو غالباً ان کا وہی ایک نسخہ تھا جو مطبع کو اشاعت کے لیے دے دیا گیا تھا۔ آج عام طور پر ان کتابوں کے کئی خطی نسخے دستیاب ہو گئے ہیں، ان سب کو سامنے رکھ کر مناسب اہتمام اور حسن ترتیب سے یہ سب کتابیں از سر نو شائع ہونا چاہئیں۔

مناسب یہ ہوگا کہ دو تین ناشر مل کر آپس میں یہ کام تقسیم کر لیں، اہل علم و نظر حضرات مستند ایڈیشن تیار کریں جن میں متن کی تصحیح، الفاظ کی فہرست، فرہنگ وغیرہ پر خاص توجہ دی جائے۔

۵۔ ہماری بعض یونیورسٹیوں میں بھی اُردو سے متعلق کچھ کام ہونے لگا ہے، اب ہر وہ طالب علم جو ایم اے کا امتحان پاس کر لیتا ہے، ڈاکٹریٹ کی سند

حاصل کرنا ضروری خیال کرتا ہے حالانکہ یہ بات لازی نہیں کہ جو شخص امتحان میں کامیاب ہو گیا ہے وہ تحقیق کا بھی اہل ہے۔ ان دونوں کے لیے الگ الگ قسم کا مزاج درکار ہے، یہی امتیاز مدنظر نہ رکھنے کا نتیجہ ہے کہ پی۔ ایچ ڈی کی سند کے جو مقالات اب تک شائع ہوئے ہیں، افسوس کہ ان میں سے بیشتر مایوس کن ہیں۔

میں اس افسوسناک صورتحال کے لیے یونیورسٹیوں کے ان پروفیسروں کو ذمے دار گردانتا ہوں جو ان طلباء کے کام کی نگرانی کرتے ہیں یا جن کی رہنمائی میں یہ مقالے تیار ہوتے ہیں۔ اگر یہ حضرات چاہیں تو معیار بلند ہو سکتا ہے اور جب تک موجودہ سہل نگاری رہے گی اس معیار کے بلند ہونے کا کوئی امکان نہیں، یوں لگتا ہے جیسے ان یونیورسٹیوں نے آپس میں کوئی سمجھوتہ کر رکھا ہے، کہ ہر مقالہ نگار کو سند لازماً عطا کر دی جائے گی۔ اگر آپ کو بالآخر یہی کچھ کرنا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر کوئی ممتحن مقرر کرنے کی ضرورت کیا ہے، جن بزرگوار کے زیر ہدایت مقالہ لکھا گیا ہے، اگر وہ مطمئن ہو جائیں تو سند عطا کر دی جائے۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ بعض اوقات سند دینے کے ساتھ یہ شرط عائد کر دی جاتی ہے کہ مقالہ شائع نہیں کیا جائے۔ اس شرط کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ یونیورسٹی کی رائے میں مقالہ اس قابل نہیں کہ اسے منظر عام پر لایا جائے اگر یہ بات صحیح ہے اور بظاہر کوئی وجہ نہیں کہ یہ کیوں صحیح نہ ہو تو اس سے زیادہ صریح اقبال جرم تصور میں نہیں آ سکتا، یہ اجازت نہ دینے کی وجہ اس کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ مقالہ معیاری نہیں، وہ اس قابل نہیں کہ اہل نقد و نظر اسے دیکھیں اور علم و فن کی کسوٹی پر اسے پرکھیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس صورت میں مقالہ نگار سند کا مستحق کیوں کر قرار دیا جا سکتا ہے۔

یاد رکھیے، اس سے آپ اُردو کا مستقبل روشن نہیں کر رہے ہیں بلکہ یہ اور تاریک ہو رہا ہے۔ معاملہ ایک ڈگری یا سند عطا کر دینے پر ختم نہیں ہو جاتا ان نو وارد ڈاکٹر صاحب کی بنیاد ہی کمزور اور کج ہے، وہ آگے طلباء کو کیا پڑھائیں گے اور ان کی رہنمائی کیا کریں گے، لازماً اس کا اثر نئی نسل کے طلبا پر پڑے گا اور یوں یہ دیوار تا ثریا کج ہی چلی جائے گی۔

خدارا اپنی ذمے داریوں کا خیال کیجیے اور ہر سال ناپختہ اور خام کار استادوں میں اضافہ نہ کیجیے۔ ممکن ہے اس وقت آپ کو کوئی ٹوکنے والا نہ ہو لیکن مستقبل کا مورخ آپ کو ہرگز معاف نہیں کرے گا۔ خدا کرے میری یہ دردمندانہ نصیحت صدا بصحرا ثابت نہ ہو اور متعلقہ حضرات اس سے زیادہ محتاط ہو جانے کا تہیہ کر لیں۔

۶۔ اب مجھے ایک آخری مسئلے کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا ہے۔

اُردو میں تحقیقی رسائل و جرائد گویا ہیں ہی نہیں، بے شک معارف اور برہان موجود ہیں لیکن ان کا دائرہ کار محدود ہے، وہ زیادہ تر دینی اور فقہی مسائل کے لیے مخصوص ہو کے رہ گئے ہیں۔ ان میں گاہے گاہے کوئی ادبی مضمون بھی غلطی سے چھپ جاتا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ ان کی عام افتاد کو دیکھتے ہوئے یہ کچھ بے محل سا معلوم ہوتا ہے۔

کیا واقعی اُردو داں طبقہ علمی اور ذہنی اور مالی لحاظ سے اتنا ہی افلاس زدہ ہے کہ وہ اپنے دو چار بھی کام کے تحقیقی رسالے جاری نہیں رکھ سکتا؟

❖❖❖❖

(۱) اُردو میں تحقیق، مالک رام، مشمولہ رہبر تحقیق، لکھنؤ، ۱۹۷۶ء، ص ۵۵ تا ۸۳۔

ادبی تحقیق کے بعض مسائل[1]

پروفیسر محمد حسن

تحقیق دراصل سچائی کی تلاش ہے۔ سچائی سے زیادہ مقبول اور مبہم شاید ہی کوئی دوسرا تصور ہو۔ انسانی اقدار کی بنیاد سچائی پر ہے لیکن سچائی کیا ہے، اس کی تعریف کرنا یا اس تک رسائی حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ معمولی واقعہ کے بارے میں اتنی متضاد روایتیں سامنے آتی ہیں کہ صداقت کا تعین دشوار ہو جاتا ہے، اسی لیے فلسفے ہی میں نہیں عملی زندگی میں بھی متشکک اور منکر پیدا ہوتے آئے ہیں۔ تحقیق کی تعریف کرتے وقت بھی اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ تحقیق مخصوص حالات میں اور مخصوص شواہد اور روایات کی روشنی میں اس صداقت کی تلاش ہے جو محقق کی دسترس میں ہو یا اس کی دسترس میں ہو سکتی ہو۔ اس صورت میں تحقیق مطلق صداقت کی دریافت کا دعویٰ نہیں کر سکتی اس کی تلاش بھی اضافی ہوگی، اس کے وسائل بھی اور اس کے نتائج بھی۔ عین ممکن ہے کہ آج جن مخطوطات کو مستند سمجھ کر نتائج اخذ کیے گئے ہیں کل وہ جعلی ثابت ہوں یا آج جن شواہد پر شہرتوں کے مینار تعمیر ہو رہے ہیں، ان کے علاوہ وہ اور ان کے بالکل متضاد شواہد سامنے آجائیں اور آج کے دعاوی کو باطل ثابت کر دیں اس لیے تحقیق اپنے زمان و مکان کی حدود میں رہ کر صداقت کی تلاش کر سکتی ہے، مطلق صداقت اس کے دائرے اور دسترس سے باہر ہے۔

لازمی طور پر اس ضمن میں یہ بحث بھی آئے گی کہ صداقت کے ان گنت روپ اور بے شمار تفاصیل ممکن ہیں، محقق ان میں سے کن حقائق کو اہمیت دے گا اور کن کو نظر انداز کرے گا۔ اس سلسلے میں افراط و تفریط ممکن ہے۔ بعض ایسے محقق ہیں جن کا خیال ہے کہ حقائق کی معمولی سے معمولی تفاصیل بھی اہم ہیں کیونکہ اس سے پوری حقیقت یا اس سے نکالے ہوئے نتیجہ پر اثر پڑ سکتا ہے۔ مثلاً آپ باہر سے لوٹے ہوں اور گھر آ کر دریافت کریں کہ آپ کی غیر حاضری میں کوئی آیا تو نہیں تھا، عام طور پر اس سے یہ مراد لی جائے گی کہ آپ سے ملنے تو کوئی نہیں آیا تھا اور یہ سمجھ کر گھر والے یہ جواب دیں گے کہ کوئی نہیں آیا تھا ہر چند کہ اس دوران میں ڈاکیہ خط لے کر آیا ہوگا۔ اس سوال کے جواب میں ڈاکیے کا آنا حقیقت کی ایک غیر ضروری اور غیر متعلق تفصیل سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا، لیکن ایک ایسے گھر میں جہاں قتل ہوا ہو ڈاکیے کے آنے کی یہ معمولی بات اہم ہو سکتی ہے اور ڈاکیے کی شہادت نہایت دور رس نتائج پیدا کر سکتی ہے۔

اس مکتبۂ خیال کے محقق حقائق اور حقائق میں کم سے کم نظریاتی طور پر فرق روا نہیں رکھتے گو عملاً وہ بھی کسی ایک حقیقت کی تمام ترکڑیوں کو بیان نہیں کرتے بلکہ ان میں بعض کا ذکر کرتے ہیں اور بعض کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو تحقیق کے سارے کارنامے پر خط تنسیخ کھینچنے میں بھی تامل نہیں کرتے، ان کا خیال ہے ادیب و شاعر کا کارنامہ اس کی تحریریں ہیں۔ ادیب و شاعر کی زندگی کی تفاصیل، اس کے مسودات کی چھان بین، نقطے اور شوشے گننا سب غیر ضروری باتیں ہیں کیونکہ ادبی تحریر کوئی قانونی دستاویز نہیں، اس کا کام معلومات یا سائنٹیفک اطلاعات کی بے کم و کاست ترسیل نہیں ہے محض تاثر اور کیفیت کی باز آفرینی ہے اس لیے تحقیق کا علم ہی ان کے نزدیک غیر ضروری تفاصیل کی تلاش قرار پاتا ہے۔

یہ دونوں نظریات نیم صداقت کی مثالیں ہیں لیکن نہ تو حقائق کی مکمل اور بے کم و کاست ترجمانی ممکن ہے نہ ضروری ہے اس لیے سب سے پہلا سوال جو محقق کے سامنے آتا ہے اور انھی دونوں مباحث سے پیدا ہوتا ہے یعنی محقق کی اپنی دسترس کن حقائق تک ہے اور ان میں کون سے حقائق اہم اور معنویت سے بھرپور ہیں۔

محقق کی دسترس کے مسئلے کے دو پہلو ہیں، داخلی اور خارجی۔ داخلی پہلو یہ ہے کہ جو شخص کسی موضوع پر تحقیق کا کام شروع کر رہا ہے وہ خود اپنے کردار اور اپنے علم کے لحاظ سے کس حد تک تحقیق کے مطالبات کو عموماً اور اس مخصوص موضوع کے مطالبات کو خصوصاً پورا کر سکے گا۔ کردار کا مسئلہ یہاں اخلاقی نقطۂ نظر سے اتنا اہم نہیں جتنا علمی اور سائنٹفک نقطۂ نظر سے اہم ہے۔ اس ضمن میں مختصراً صداقت شعاری، ذمے داری، متانت، علمی معروضات، خلوص اور حقیقت پسندی کی خصوصیات کو لازم قرار دیا جا سکتا ہے۔

یوں تو کون ہے جو اپنے آپ کو صداقت شعار نہ جانتا ہو مگر ہم میں سے کتنے ہیں جو حقیقت کے بے کم و کاست اظہار سے تجاوز اور صداقت سے یکسر موگریز

(۱)

نہ کرتے ہوں۔ ذمہ داری کا بھی یہی حال ہے لیکن ان تمام خصوصیات میں شاید سب سے ضروری خصوصیت، علمی معروضیت اور حقیقت پسندی ہے۔ علمی معروضیت بھی قدر مطابق ہے اور آدرش کو پوری طرح حاصل کرنا ناممکنات میں ہے لیکن جہاں تک ممکن ہو محقق نہ تو کسی مصنف یا میلان کی وکالت کی خاطر قلم اٹھائے، نہ کسی کی نکتہ چینی اور عیب بینی اس کی نیت ہو، نہ وہ وکیل ہے، نہ محتسب البتہ تحقیق کی معروضی تلاش میں وہ جن نتائج تک پہنچتا ہے، انھیں بے کم وکاست اور بلا خوف ولالچ کے پیش کر دینا ہی اس کا مقصد ہونا چاہیے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ محقق حقیقت کو کسی قسم کی رنگ آمیزی کے بغیر اور بلا کسی ضروری حصے کو چھپائے یا توڑے مروڑے پوری معروضیت کے ساتھ بیان کر سکے۔ اس سلسلے میں محقق کی نیت ہی نہیں اس کا انداز بیان اور الفاظ پر اس کی قدرت بھی نہایت اہم ہے۔ اس منزل پر پہنچ کر تحقیق کی زبان کا مسئلہ بھی پیدا ہوتا ہے۔

تحقیق کی زبان افسانوی ادب کی زبان سے یقیناً مختلف ہوگی، اس میں تخیل سے زیادہ واقعیت، ابہام سے زیادہ قطعیت اور کیفیت سے زیادہ حقیقت کے بے کم وکاست بیان پر زور دیا جائے گا۔ رنگینی اس کا حسن نہیں عیب ہو سکتی ہے۔ اس کا مقصد کیفیت نہیں معلومات کی ترسیل اور استنباط نتائج ہوتا ہے، اس لیے اس کا حسن اس کی قطعیت، ربط، استقلال اور ترتیب کے مقدمات اور نتائج کی معقولیت اور توازن میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ اس کا رخ آرٹ سے زیادہ سائنس اور فلسفے کی طرف ہوتا ہے۔ جہاں الفاظ حتی الامکان پوری احتیاط اور تعین معانی کے ساتھ استعمال کیے جانے چاہئیں۔

جہاں تک خارجی پہلو کا تعلق ہے، محقق کا ان تمام علوم سے واقف ہونا ضروری ہے جو اس موضوع کے سلسلے میں ضروری ہوں مثلاً اگر زیر بحث موضوع پر کام کرنے کے لیے لسانیات یا کسی دوسرے ٹیکنیکل علم کا حصول یا بعض زبانوں سے واقفیت اور ان پر عبور حاصل کرنا لازم ہو تو یہ محقق کے فرائض میں داخل ہے۔ یہ بات دراصل کہنا یا لکھنا آسان ہے لیکن علوم کا رشتہ ایک دوسرے سے اس قدر ملا جلا ہے اور مختلف زبانوں کی افادیت اور ان میں بکھرے ہوئے خام مواد کی مقدار اتنی زیادہ ہے کہ ان سب وسائل سے فائدہ اٹھانے کے لیے جس ہمہ گیر لیاقت کی ضرورت ہے اس کا حصول محال ہے پھر بھی ضروری وسائل میں سے بعض ناگزیر ہوتے ہیں جن کے بغیر کام شروع کرنا اور موضوع کے ساتھ انصاف کرنا ممکن نہیں ہوتا ان علوم کا حصول لازمی ہے۔

ان مختلف اور متفرق علوم کے علاوہ خارجی مسائل میں خود تحقیق کے فن، اس کے آئین اور ادب کا علم ضروری ہے۔ تحقیق ادب محض مشق یا مشغلہ نہیں ہے، اس کے ضابطے بہت کچھ متعین ہو چکے ہیں اور اس کے لیے جن صلاحیتوں کی ضرورت ہے ان کو حاصل کرنے یا مشق اور ریاضت کی مدد سے ان پر جلا کرنے اور ان کو صحیح راستوں پر لگانے کے لیے اصول وضوابط مرتب ہو چکے ہیں اور تحقیقی طریق کار Research Methodology کے نام سے ایک علم وجود میں آچکا ہے۔ یہ علم دراصل محقق کے لیے قطب نما یا کمپاس کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اس تحقیقی مواد کی فراہمی میں تو کوئی مدد بہم نہیں پہنچاتا البتہ فراہم شدہ مواد کی ترتیب، اس کی تصدیق اور پرکھ اور اس سے مناسب نتائج نکالنے میں مدد کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تحقیق متن اور تصحیح متن کے مسائل بھی ہیں، جن کے بغیر کوئی محقق یا نقاد کوئی بات بھی وثوق اور اعتماد سے نہیں کہہ سکتا۔

اُردو میں تحقیق کا سب سے پہلا اور بنیادی مسئلہ تحقیق متن اور تصحیح متن کا ہے۔ تصحیح متن سے میری مراد یہ ہے کہ متداولہ کلیات یا تصانیف میں جو الحاقی یا غیر مستند حصے شامل ہو گئے ہیں، ان کی نشاندہی کی جائے اور جو حصے شامل ہونے سے رہ گئے ہیں، انھیں شامل کیا جائے۔ تحقیق متن سے مراد یہ ہے کہ اصل مصنف نے جس طرح لکھا ہے اسی شکل میں متن کو پیش کر دیا جائے۔ اُردو ادب کی بڑی بدقسمتی ہے کہ تحقیق اور تنقید کی تمام کامیابیوں اور کامرانیوں کے اعلان کے باوجود ابھی تک ہمارے اساتذہ کی تحریروں کا بھی صحیح متن فراہم نہیں ہو سکا ہے۔

غالب کے استثنا کے ساتھ، شاید ہی اُردو کا کوئی قابل ذکر قدیم شاعر ایسا ہو جس کے کلام کا صحیح متن دستیاب ہوتا ہو۔ یہی حال اُردو کے صاحب طرز نثر نگاروں کا ہے۔ البتہ نثر کا رواج بعد میں ہوا اور اس کے نامور لکھنے والے عہد جدید میں پیدا ہوئے اس لیے نثری تصانیف کے متن کی تحقیق کا مسئلہ اتنا اہم نہیں۔ جب تک وہ کلام مستند نہ ہو جس پر رائے دی جا رہی ہے، اس وقت تک تنقید کا سارا کاروبار محض قیاسی ہوگا اور غیر مستند اور الحاقی کلام کی بنیاد پر بخشی ہوئی شہرتیں یا عائد کی ہوئی گمنامی دونوں فرضی اور بے بنیاد ہوں گی لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ آج بھی ہماری تحقیق اپنے اس بنیادی فرض سے پوری طرح سبکدوش نہیں ہو سکی ہے۔ غور کیجیے تو اس لحاظ سے ہماری تنقید کا بیشتر حصہ محض تاثراتی ہے مثلاً فراق گورکھپوری کا ذوق پر نہایت کامیاب مقالہ ذوق کے مستند اور پورے کلام پر حاوی نہیں ہے اگر نقاد کے پیش نظر پورا اور مستند کلام ہوتا تو شاید ان کی رائے مختلف ہوتی۔ اسی طرح مجنوں گورکھپوری کے مضمون ''میر اور ہم'' کی بنیاد یہ شعر ہے:

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے امیر
مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا

اور اس کو راہ نما بنا کر انھوں نے میر کے کلام میں تاب مقاومت ڈھونڈ نکالی ہے، جب کہ یہ حقیقت ہے کہ یہ شعر میر کا نہیں بلکہ ایک غیر معروف شاعر امیر کا ہے اور اس سے مختلف ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحیح متن کی غیر موجودگی نقاد کو کس طرح گمراہ کر سکتی ہے اور غلط نتائج تک پہنچا سکتی ہے۔

اُردو تحقیق کا دوسرا اہم مسئلہ اس کی سمت کا ہے۔ تحقیق کے جوش و خروش میں ایک طرف تو ہر مخطوطے یا نایاب نسخے کے بارے میں صفحے کے صفحے بیانیہ انداز سے سیاہ کیے جا رہے ہیں جن میں بعض ایسے بھی ہیں کہ اپنے زمانے میں بھی پنساریوں کے ہاں پڑیاں باندھنے کے علاوہ اور کسی کام نہ آتے۔ دوسری طرف اس بیانیہ قسم کی تحقیق نے اپنا تعلق توڑ لیا ہے۔ کبھی کبھی تنقید نگاروں کی طرف سے تحقیق پر ''گورکنی'' کی پھبتی کسی جاتی ہے تو کبھی تحقیق کے شیدائی تنقید کو محض لفاظی یا خیالی طوطا مینا بنانے سے تعبیر کرتے ہیں۔ تنقید اور تحقیق کا یہ فاصلہ یا ان دونوں میں کسی قسم کی رقابت یا تنافر افسوس ناک ہے اور اس کی موجودگی میں دونوں میں سے کوئی بھی اپنا منصب پورا نہیں کر سکتی۔ ظاہر ہے کہ تحقیق تنقید کا ہی ایک شعبہ بلکہ جز و لاینفک ہے، جب تک گارے چونے کا خام مواد جمع نہ ہو اس وقت تک عمارت کیوں کر تعمیر ہو سکتی ہے، جب تک تحقیق حقائق کی مناسبت چھان بین کر کے تصدیق کی مہر ان پر نہ لگا دے اس وقت تک ان حقائق سے نتائج کیوں کر نکالے جا سکتے ہیں۔ یہاں دونوں میں سے کسی کے غیر ضروری یا کم ضروری ہونے کا سوال نہیں، دونوں کے لازم و ملزوم ہونے کا اعتراف لازم ہے۔ دوسری طرف یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ تنقیدی شعور کے بغیر تحقیق کا کام ادھورا اور ناقص ہے۔ تحقیق کا کام صرف حقائق کے غیر مربوط اور بے ہنگم انبار سے پورا نہیں ہوتا جب تک ان حقائق سے مناسب نتیجے نہ نکالے جائیں یا ان کی ترتیب اس طرح نہ کی جائے کہ وہ کسی نتیجے تک پہنچنے میں مدد دیں، اس وقت تک تحقیق کا کام پورا نہیں ہوتا۔ حقائق کی اہمیت اور معنویت بھی اضافی ہوتی ہے۔ بعض حالات میں ایک حقیقت نہایت دور رس نتائج پیدا کرتی ہے اور اس لیے اہم سمجھی جاتی ہے، دوسرے حالات میں وہی حقیقت غیر متعلق اور غیر اہم ہو جاتی ہے۔ تحقیق کا کام اس شعور کے بغیر ممکن نہیں۔

اُردو میں ادبی تحقیق کے میدان میں سب سے دشوار ڈسپلن استخراج نتائج کا ہے، جہاں ہماری تنقید میں بنیادی حقائق کی فراہمی کے بغیر قیاسی رائے زنی کا رواج رہا ہے، وہاں تحقیق میں حقائق کے انبار ہی کو کافی سمجھ لینے کا رجحان بھی کم نہیں ہے۔ یونیورسٹیوں میں پی، ایچ ڈی کے لیے منظور ہونے والے تحقیقی مقالات میں اکثر نصف سے زیادہ محض تاریخی واقعات یا سماجی پس منظر کے ابواب پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان ابواب میں صرف تاریخی واقعات کی گردان کی جاتی ہے اور ان سے ضروری نتائج نکالے نہیں جاتے، جس سے وہ بجائے مفید ہونے کے تحقیقی مقالے کی اساس بن جاتے ہیں۔ جب تک ان حالات و واقعات سے نتائج نکالنا مقصود نہ ہو اس وقت تک ان کی کوئی گنجائش نہیں، حقائق کی مناسب توجیہہ اور ان کے عواقب اور متعلقات پر غور و فکر کرنا فن کا درجہ رکھتا ہے اور اس فن کے لیے اکتساب اور ریاضت اور مشق شرط ہے۔

اس مرحلے پر تحقیق میں تخیل کی کارفرمائی، اس کے منصب اور اس کی حدود کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ اکثر یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ تحقیق سائنس ہے اور تخلیق آرٹ۔ اس سے یہ بھی مراد لی جاتی ہے کہ تحقیق میں تخیل کی کارفرمائی سرے سے مفقود ہوتی ہے، جب کہ تخلیق میں بنیادی طور پر اور تنقید میں ضمنی طور پر تخلیق کی کارفرمائی موجود ہوتی ہے۔ حقیقت کا سراغ حقیقت کی مناسب توضیح تفتیش و تصدیق کے لیے متعلقہ اور اہم حقائق کا انتخاب، ان سب کاموں میں تحقیق کو تخیل کا سہارا لینا پڑتا ہے جو انتخابی یا تحقیقی شعور کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف شواہد و روایات کی تطبیق، تفتیش اور ترتیب کی مدد سے کسی نتیجہ تک پہنچنا اور ان میں سے کسی ایک روایت کو صحیح اور دوسری کو غلط یا غیر مستند قرار دینے کے لیے بھی ضروری ہے کہ حقائق کے مختلف ٹکڑوں کو ایک پیکر میں ڈھالا جائے اور ان کی مدد سے ایک تصویر یا ایک خیال تک رسائی حاصل کی جائے۔ یہ کام تخیل کی مدد کے بغیر سرانجام نہیں پا سکتا، اس لیے یہ خیال کہ قیاس اور تخیل کی تحقیق میں کوئی گنجائش نہیں ہے حقیقت سے بعید ہے، البتہ یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ تخلیق میں جس طرح تخیل کا عمل غالب ہوتا ہے، اس طرح تحقیق میں عمل غالب نہیں ہوتا بلکہ سائنٹفک ذریعہ تفتیش اور حقائق کے تابع ہوتا ہے۔ تخیل صرف حقائق کی سنگین حد بندی میں ہی عمل پذیر ہو سکتا ہے اور ان حد بندیوں سے وہ زیادہ دور تک تجاوز نہیں کر سکتا۔

ادبی تحقیق کے سلسلے میں ایک اور اہم کمی یہ ہے کہ ابھی تک تحقیق کے بنیادی وسائل کی فراہمی کا کام بھی مکمل نہیں ہو سکا۔ آج جو طالب علم تحقیق کے میدان میں قدم رکھتا ہے اسے بار بار جویندہ یابندہ کی منزل سے گزرنا پڑتا ہے اور معمولی سے معمولی معلومات حاصل کرنے کے لیے خاصی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کی حیثیت بیسویں صدی کے اس سیاح کی سی ہے، جسے یہ علم نہ ہو کہ کولمبس امریکہ دریافت کر چکا ہے اور وہ اپنے طور پر ساری مصیبتوں کو جھیلتا اور غیر ضروری تکالیف اٹھاتا ہوا راہ اور سمت کے بارے میں اطلاعات سے بے خبر امریکہ کے ساحل تک پہنچے۔ مثال کے طور پر اُردو میں تحقیق کے میدان میں قدم رکھنے والے کو یہ معلومات بھی بہم نہیں پہنچتیں کہ کن کن موضوعات پر کام ہو چکا ہے اور کن کن موضوعات پر اب تک کون کون سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اگر کسی قدیم مخطوطے کے متن کی تحقیق کا کام کرنا چاہتا ہے تو بعض غیر ملکی لائبریریوں کے علاوہ اپنے ملک کی لائبریریوں کے ذخیرہ مخطوطات کی فہرست تک بھی میسر نہیں آتی، جس سے یہ معلوم

ہو سکے کہ کن لائبریریوں میں متعلقہ مخطوطے کے نسخے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیشہ بعض مقامی دوستوں کی اعانت، بعض لائبریریوں کے لائبریرین اور دوسرے علم دوست حضرات کے تعاون کا مرہونِ منت ہونا پڑتا ہے۔ لائبریریوں کے علاوہ مخطوطات اور قدیم اور نایاب نسخے ذاتی کتب خانوں اور درس گاہوں، سکولوں، کالجوں اور امام بارگاہوں کے ذخیروں میں بھی بکھرے پڑے ہیں، ان کی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ کوئی مرکزی ادارہ ایک طرف تو ان تمام نادر مخطوطات کی فراہمی کا کام شروع کرے جو لائبریریوں اور Archives کے دائرے سے باہر ہیں اگر ممکن ہو تو انھیں حاصل کرے، ورنہ کم سے کم ان کی مائیکروفلم یا فوٹوسٹیٹ نقلیں حاصل کر لی جائیں تا کہ یہ مخطوطات مکمل طور پر ضائع ہونے سے بچ جائیں۔ دوسری طرف اُردو اور اُردو سے متعلق فارسی اور دیگر زبانوں کے مخطوطات کی ایک مکمل فہرست مرتب کی جائے جو ہندوستان کے مختلف کتب خانوں اور Archives میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ ہندوستان میں کم سے کم کسی ایک مرکزی ادارے میں برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کے تمام اُردو فارسی مخطوطات کے مائیکروفلم یکجا کر لیے جائیں تا کہ تحقیق کا کام کرنے والوں کو ہر منزل پر در بدر بھٹکنا نہ پڑے۔ اس سے تحقیق کے طالب علم کی تمام مشکلیں آسان نہیں ہوں گی مگر اس کا بار اس حد تک ضرور کم ہو جائے گا کہ وہ جسمانی مشقت سے کسی قدر آزاد ہو کر غور و فکر کی طرف زیادہ یکسوئی کے ساتھ توجہ کر سکے۔

تحقیق دراصل تنقید کی بنیاد اور اس کا پس منظر فراہم کرتی ہے، اس لیے اس کا رشتہ براہِ راست ادب کے علاوہ علوم و فنون کے دوسرے شعبوں سے بھی ہے۔ اس کے لیے نام اور تاریخیں اہم ہیں اور قدم قدم پر محقق کو ایسے علوم سے مدد لینی پڑتی ہے جو ادب کے دائرے سے باہر ہیں۔ مثلاً امیر خسرو کے اُردو کلام کو جن دلائل کی بناء پر الحاقی قرار دیا گیا ہے، ان میں ایک دلیل یہ بھی تھی کہ اس میں تمباکو کا ذکر ہے اور تمباکو کا رواج امیر خسرو کے زمانے سے بہت بعد میں ہوا۔ دوسرے لفظوں میں ہندوستان میں تمباکو کے رواج کی تاریخ کا تعلق براہِ راست ادبی تحقیق سے ہے، اسی طرح کسی دور کے رسم و رواج، گفتگو کے آداب، اس دور کی زبان اور طرزِ عمل کے عام انداز سے واقفیت تحقیق کے طالب علم کے لیے ضروری ہے۔

مثال کے طور پر آبرو کا شعر ہے:

سخن یک رنگ کا سب گانٹھ باندھو
کہ یہ گوہر ہیں بحر آبرو کے

اس شعر سے یہ نتیجہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ یک رنگ آبرو کے معاصر ہی نہیں بلکہ ان کے شاگرد تھے لیکن اگر یہ بات ملحوظ رکھی جائے کہ اس دور کا ایک عام دستور یہ بھی تھا کہ شعرا مقطع میں اپنے تخلص کو لغوی معنوں میں بھی استعمال کر دیتے تھے تو یقیناً اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا یا انیس کے مرثیے میں یہ مصرع۔

پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

پڑھ کر صاحب ہی نہیں اور ان کے والد کی مرثیہ گوئی کے بارے میں شہادت فراہم کی جا سکتی ہے لیکن اگر یہ بات پیش نظر ہو کہ میر انیس نے یہ مرثیہ اپنے بیٹے کے نام سے لکھا تھا اور انھی کے نام سے پڑھا گیا تو پھر پانچویں پشت کا شمار دوسرے طریقے پر کیا جائے گا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ محقق کے لیے نہ صرف تحقیق بلکہ متعلقہ دور کی سماجی تاریخ سے واقفیت ضروری ہے۔ ہندوستان میں سماجی تاریخ کی تدوین کا کام ابھی پوری طرح شروع ہی نہیں ہوا، ہماری تاریخ بادشاہوں کی فہرست ہے۔ ابھی اس دور کی معاشرت، تصورات و اقدار کی تصویر سامنے نہیں آئی۔ ضرورت ہے کہ تحقیقی کام میں سماجی اور تہذیبی تاریخ اور اس کے بدلتے ہوئے اقدار و تصورات کو ملحوظ رکھا جائے اور ان دونوں کے درمیان گہرا ربط پیدا کیا جائے۔

تحقیق کے سلسلے میں ایک اور اہم کام تحقیقی مآخذوں کی تدوین اور ضابطہ بندی ہے۔ قدیم شاعری ہی نہیں بلکہ ہمارے ادب کے دورِ قدیم کے بارے میں ہمارے سب سے اہم مآخذ تذکرے ہیں۔ ان میں بعض ضائع ہو چکے ہیں بعض ابھی مخطوطات کی شکل ہی میں ہیں۔ شائع شدہ تذکروں کے متن ابھی مستند اور صحیح نہیں ہیں اور ان کے متن کی تحقیق اور تصحیح کا کام ابھی نہیں ہوا۔ شائع شدہ تذکروں میں سے اکثر اب نایاب ہیں۔ تحقیق کے فرائض میں سے ایک اہم فریضہ یہ بھی ہے کہ یہ تمام تذکرے تصحیح متن کے ساتھ شائع ہوں اور ان سے حاصل شدہ معلومات کی درجہ بندی اس طرح کی جائے کہ تحقیق کے طالب علم جب چاہیں، جس شاعر اور ادیب کے بارے میں چاہیں، ایک جگہ اس شاعر اور ادیب کے بارے میں تمام تذکروں سے حاصل شدہ معلومات حاصل ہو سکیں۔ اس طرح گویا کئی جلدوں میں ہمارے ادبی مشاہیر کی تعارفی فہرست تیار ہو جائے گی اور تحقیق کا کام کرنے والوں کے لیے بڑی سہولت پیدا ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ غیر مطبوعہ تذکروں کی طباعت اور ان پر مناسب حاشیے لکھنے کا کام بھی ضروری ہے اور ان دونوں کاموں میں تطابق اور ہم آہنگی کرنا بھی لازم ہے۔

تحقیق بڑی ذمے داری اور ریاضت کا کام ہے۔ اُردو میں ابھی اس کی اہمیت کا احساس شروع ہوا ہے اور ابھی اس کی مبادیات بھی پوری طرح بہم نہیں

پہنچی ہیں۔ضروری ہے کہ تحقیق کے میدان میں قدم رکھنے والے اس کی منزل، سمت اور آئین وادب کا صحیح تصور پیش نظر رکھیں اوراسے جھوٹی وفاداریوں، رقابتوں اور ذاتی رنجشوں سے پاک رکھیں اوراس کے صحیح علمی پس منظر کوملحوظ رکھ کراسے محض عیب بینی، نکتہ چینی یا شہرتیں ملیامیٹ کرنے اور سندیں بخشنے کا وسیلہ نہ بنائیں، بلکہ سنجیدگی اور علمی وقار کے ساتھ ادبی تحقیق کے معیار کو اور بلند اوراس کی روایت کو اور تابناک بنائیں۔

❖❖❖❖

(۱) ادبی تحقیق کے بعض مسائل؛ ڈاکٹر محمد حسن، مشمولہ رہبر تحقیق، ۱۹۶۷ء، ص ۱۴۸ تا ۱۶۰۔

قدیم دواوین کی ترتیب کے مسائل[1]

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

تحقیق کا کام زبان و ادب کے جس شعبہ اور جس دائرے میں بھی کیا جائے، دوسرے کام کرنے والوں کے لیے روشنی و رہنمائی کا باعث بنتا ہے، اور آج ہماری زبان میں مختلف متنوع موضوعات پر جس رفتار سے کام کیا جا رہا ہے، اس میں ایک روشن مستقبل کے امکانات موجود ہیں۔ اس ضمن میں یہ سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اس وقت تحقیق کے لیے ہمارے بنیادی مسائل کیا ہیں؟ میں اپنی محدود نظر کی بناء پر یہ سمجھتا ہوں کہ قدیم دواوین تذکروں اور نثری کتابوں کی ترتیب کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم ہے اور ان میں بھی ترتیب دواوین کا کام ہماری ایک بنیادی ضرورت کی حیثیت رکھتا ہے۔

قدیم دواوین ہمارے لیے ''سورس بکس'' (Source Books) کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کو جدید تحقیق کے تقاضوں کی روشنی میں مرتب کیے بنا نہ ہمارے ادب کی کوئی صحیح تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے، نہ ہماری زبان کی کوئی مبسوط لغت تیار کی جا سکتی ہے۔

ہمارا قدیم ادبی سرمایہ بڑی حد تک شعر و شاعری پر مشتمل ہے۔ شاعری دل آسائی اور دلربائی کا ایک وسیلہ ہے لیکن آج شاعری کا مطالعہ محض فرصت کے دلچسپ مشغلے کی حیثیت نہیں رکھتا، اس سے زبان و بیان کے ارتقا اور تہذیب و تاریخ کے مختلف رشتوں کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہمارا شاعر کئی اعتبار سے دور ماضی کا مورخ بھی ہے اور ہماری اپنی پہلی چند صدیوں کا ذہنی مطالعہ دواوین کے بغیر ممکن نہیں۔

زبان کی عہد بعہد تبدیلیاں، لب و لہجہ کا فرق، املا و تلفظ کا تغیر، اسالیب بیان کا تنوع، ہیئت و فن کے تجربے جس وسعت ذکر کے ساتھ ساتھ دواوین میں مل جائیں گے، شاید ہی نثر کی کتابوں کے صفحات پر مل سکیں۔ اس طرح ہماری زبان کی لغت کا جتنا بڑا خزانہ دواوین میں محفوظ ہے، ایک حد تک ہماری داستانوں کو مستثنیٰ کرتے ہوئے کہیں اور نہیں مل سکتا۔ الفاظ کے سادہ استعمال اور عبارت و معنی کی برابری سے قطع نظر جہاں تک لفظ و معنی کی صورت گری اور حسن آفرینی کا تعلق ہے، اس کے بہترین نمونے دواوین ہی کی زینت ہیں اور قدیم نثر پاروں میں جہاں جہاں ان کی جھلکیاں نظر آتی ہیں، ان کو بھی شعر و سخن ہی کی دین سمجھیے۔ ان حقائق کے مطالعہ کے لیے دواوین کی ترتیب اور ان کے متن کی تشکیل ناگزیر حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بغیر نہ اس سے پوری طرح استفادہ ممکن ہے نہ استناد۔

بہت سے قدیم شعرا کے قلمی نسخے مل جاتے ہیں، بعض اساتذہ کے دواوین کے ایک سے زیادہ چھپے ہوئے نسخے بھی ملتے ہیں۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جن کی تدوین و تصحیح میں قابل ذکر افراد نے حصہ لیا ہے مثال کے طور پر ہم دیوان ظفر کے اس نسخے کو پیش کر سکتے ہیں جو دہلی اُردو اخبار کے مطبع سے شائع ہوا تھا اور جس کی تصحیح کا کام ذوق مرحوم نے انجام دیا تھا۔ ایسی ہی ایک مثال دیوان ذوق مطبوعہ مطبع احمدی شاہدرہ کی ہے جس کی ترتیب و تدوین ظہیر اور انور جیسے ذوق کے عزیز تلامذہ کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی۔ اس لیے ان کی بڑی اہمیت ہے لیکن ایک طرف تو وہ جامع نہیں ہیں، دوسرے ان کی ترتیب میں ان اصول و ضوابط کو پیش نظر نہیں رکھا گیا جن سے تحقیق متن کے تقاضے پورے ہو سکیں۔ اس زمانے میں غالباً اس کی ضرورت بھی نہ تھی کہ وہ ترتیب کے وقت لسانیات لغت اور تاریخ ادب کے مسائل کو سامنے رکھیں اور ان کی روشنی میں متن کو مرتب کریں۔

متن کے تعین، تصحیح اور ترتیب کی مشکلات تذکروں اور نثری کتابوں کے سلسلے میں بھی کچھ کم نہیں لیکن دواوین کے دائروں میں تو اور بھی زیادہ ہیں۔

سب سے پہلا اور اہم کام کسی شاعر کے ذخیرہ کلام و کمال سے متعلق مصادر کی تلاش اور مآخذ کا تحفظ ہے۔ شاید ہی ہمارا کوئی ایسا شاعر ہو جس کا حرف حرف محفوظ رہ گیا ہو۔ جو کچھ شعرا کی زندگی میں ان کی بے توجہی کے ہاتھوں ضائع ہوا یا خود انھوں نے نظری قرار دے دیا اس کو جانے دیجیے جو کچھ اب تک گوشۂ گمنامی میں پڑا ہوا ہے اس سے بھی صرف نظر کیجیے۔ جو کچھ کسی نہ کسی طرح شہروں یا قصبوں کی لائبریریوں میں پہنچ گیا اس کا بھی ایک بڑا حصہ ایسا ہے جو ہنوز علم و تحقیق کی روشنی میں نہیں آ سکا۔ ہماری بہت سی قابل ذکر لائبریریاں ایسی ہیں جن کے کیٹلاگ ابھی باقاعدہ طور پر مرتب بھی نہیں ہوئے۔ تا بہ اشاعت چہ رسد، سینٹرل پبلک لائبریری پٹیالہ اس کی ایک بہت نمایاں مثال ہے۔ جس میں آبرو، ناجی، میر، سودا، ممنون اور احسان جیسے اساتذہ کے دواوین کے قلمی نسخے موجود ہیں، مگر ان کے بارے میں معلومات کا کوئی ذریعہ نہیں۔ ہمارے مختلف اداروں اور خاص طور پر ہندوستانی یونیورسٹیوں کے جن شعبہ ہائے اُردو میں تحقیقی کام ہو رہا ہے ان کے کام کا ایک حصہ

میرے خیال سے یہ بھی ہونا چاہیے کہ وہ اپنے اپنے حلقہ ہائے کار مقرر کر کے ایسے اداروں اور ذخیروں سے متعلق معلومات فراہم کریں اور اسے ایم لٹ یا پی۔ایچ۔ڈی کورس کے کام کا ایک ضروری حصہ قرار دیں جس کی نگرانی ریسرچ پروفیسر یا ریسرچ گائیڈ کے سپرد ہو۔

مختلف موضوعات پر کام کرنے والوں کے لیے وسائل معلومات کی کمی اور معلوم وسائل سے استفادہ کی راہ میں چند در چند مشکلات کا سوال تو اُردو میں ایک ''قدرِ مشترک'' کی حیثیت رکھتا ہے۔اس سے آگے اور الگ بھی اس کی کچھ مشکلات ہیں۔ایک نثری کتاب کے ایک سے زیادہ قلمی یا قدیم مطبوعہ نسخے مل جائیں تو ان کی مدد سے تقابل اور ترتیب کا کام وغیرہ آسان ہو جاتا ہے لیکن ایک شاعر کے کلام کی تدوین و ترتیب کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں، تحقیق مسائل اور تلاش مواد کے لیے ایسے قلمی بیاضوں، ہم عہد تذکروں، روزناموں، سفرناموں، نجی خطوط، ملفوظات، شعری گلدستوں، انتخابات اور بعض شعرا کے سلسلے میں غدر سے پہلے کے اخبارات کی بھی ورق گردانی اور چھان بین کرنی پڑتی ہے۔بعض نثری کتابوں کی عبارتیں اور حوالے کبھی کبھی اور کہیں کہیں دوسرے مآخذ میں مل جاتے ہیں۔مگر اشعار اور خصوصاً بڑے اور مشہور شعرا کے اشعار تو نہ جانے کہاں کہاں بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔غیر ادبی مآخذ اس کے علاوہ ہیں۔ان سب کو سمیٹنا اور احتیاط کی چھلنی میں چھاننا آسان نہیں۔

علاوہ بریں شعر کی روایت میں تبدیلی کے امکانات اس سے کہیں زیادہ ہیں جتنے کسی نثری عبارت میں ممکن یا متوقع ہو سکتے ہیں۔شعر زبانوں پر جاری رہتا ہے اور ایک سے دوسری جگہ پر اس کی نقل میں یادداشت کو بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔زمان و مکان کی تبدیلی اور زبان کا فرق بھی اس کی روایت املا، تلفظ اور لب و لہجہ میں فرق پیدا کر دیتا ہے، جن کی وجہ سے کہیں مضمون کم و بیش اور کہیں الفاظ پس و پیش ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی تو شعر کی صورت ہی بدل جاتی ہے۔اُردو کے بعض ایسے خوش نصیب نمائندے بھی ہیں، جن کے دیوان کے ایک سے زیادہ قلمی نسخے ملتے ہیں۔کچھ ایسے بھی ہیں جن کے دیوان کا کوئی بھی مخطوطہ نہیں ملتا ہے۔اس کی ایک نمایاں مثال شیخ ابراہیم ذوق کا دیوان ہے اور کسی دیوان کی ترتیب کے سلسلے میں مصادر کی کثرت، کثرتِ تعبیر کا درجہ رکھتی ہے، تو مصادر کا فقدان نقش وفا کی طرح وجہ تسلی نہیں ہوتا۔دونوں صورتیں ترتیب کی مشکلات میں اضافہ کا باعث بنتی ہیں لیکن عبارت میں تشکیل متن کا سوال اتنا پیچیدہ اور نازک نہیں ہوتا جتنا دیوان یا شعر میں ہوتا ہے نظم و شعر کی روایت میں کافی احتیاط برتی جاتی ہے۔ترقیموں کی مدد سے تاریخی ترتیب یا تفہیم کی راہ کی بعض مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں، اس کے ساتھ بعض نسخے ایسے بھی مل جاتے ہیں جو خود مصنف کے اپنے ہاتھ کے ہیں۔بعض مصنفین کی نظر سے گزر چکے ہیں۔بعض نسخے معتبر اشخاص کی اصلاحوں سے مزین ہیں لیکن ایسے نسخے بھی بڑی تعداد میں ہیں جن کے ساتھ یہ صورت نہیں، جس سے ترتیب و تفہیم کی دشواریاں بڑھ جاتی ہیں۔

اگر دواوین کے مختلف زمانوں کے قلمی نسخے نہ ملیں اور تذکروں سے بھی کوئی خاص قابل ذکر مدد اس بارے میں نہ مل سکے اور تشفی بخش سطح پر اس کے لیے اور بھی داخلی یا خارجی شہادتیں ممکن نہ ہوں تو اس کا تصفیہ آسان نہیں ہوتا کہ کس دیوان میں کتنا حصہ کب کہا گیا ہے اور کس شاعر کے کن سنین عمر سے تعلق رکھتا ہے بلکہ ترغیب و تفہیم کی بہت سی دشواریوں کا حل اس تصفیہ پر منحصر ہوتا ہے، اس کے لیے لسانیاتی مطالعہ سے مدد مل سکتی ہے۔لیکن فیصلہ کن حد تک نہیں۔اس لیے کہ بعض شعرا کے یہاں متروکات کا سلسلہ آخری وقت تک جاری رہتا ہے۔مثال کے طور پر شاہ نصیر کے ان چند نسخوں کو پیش کیا جا سکتا ہے جن میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی کوئی ترقیمہ یا پھر مرتب کا نام درج نہیں اور رامپوری نسخہ کے علاوہ کسی دوسرے نسخہ کے سلسلے میں ایسی کوئی خارجی شہادت بھی موجود نہیں، جس سے یہ معلوم کیا جا سکے کہ یہ کب مرتب ہوا۔ایسی صورت میں جب کہ دوسرے قرائن بھی نہ ہوں، اس نتیجہ پر پہنچنا بہت مشکل ہوتا ہے کہ اس کی فلاح و کمال کی نہج و ارتقا کو سمجھنے کے لیے اس کی بنیادی طور پر تاریخی ترتیب کیا ہو۔کاتب اگر بدخط ہے یا اس نے ضروری احتیاط سے کام نہیں لیا یا ایسی کسی دوسری خاص وجہ سے اس متن کی قرأت ممکن نہیں تو ایسے نثر پاروں کی ایڈیٹنگ میں مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں لیکن شعر و غزل کی دنیا میں، ان کی مخصوص ہیئت کی وجہ سے یہ صورت حال بڑی پیچیدگی اور الجھن کا باعث بنتی ہے۔نثر میں اندازِ نگارش، جملوں کی ترتیب، ساخت اور تلفظ کی تبدیلیاں ورق ورق میں اس طرح نہیں ملتیں، جس طرح قدیم دواوین میں ملتی ہیں۔تلفظ کا مسئلہ شعر کی ہیئت کے تعین کے سلسلے میں جو اہمیت رکھتا ہے نثر میں اس کی وہ اہمیت نہیں ہوتی۔کسی نثر پارے کو ایڈیٹ کرنے کے لیے بحور و اوزان سے واقفیت بالعموم ضروری نہیں ہوتی، لیکن کسی دیوان کے مرتب کو عروض کے فن سے کم و بیش واقف ہونا ضروری ہے اور اگر وہ موزوں طبع نہیں ہے تو بہت ممکن ہے کہ یہ فاعلاتن فاعلاتن فاعلات کا پیمانہ بھی کام نہ دے اور موزوں اور غیر موزوں شعر میں مرتب فرق ہی نہ کر سکے۔جہاں شعر کی مختلف روایتیں اختلاف نسخ کی صورت میں ہوا کرتی ہیں وہاں کاتبوں کی غلطیاں بھی نقل در نقل کی وجہ سے ایک روایت کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں اور ان کو بھی اختلاف نسخ میں شامل کر لیا جاتا ہے۔بے احتیاطی، نااہلی یا بدخطی کی وجہ سے متن میں جو غلطیاں یا اضافی صورتیں داخل ہو جاتی ہیں، ان کے علاوہ کسی مخصوص علاقہ کے تلفظ یا کسی زمانہ کے طرزِ ادا کو بھی نقل روایت میں دخل ہوتا ہے۔املا اور تلفظ کی صورتیں کتابوں پر مقامی اثرات کی غمازی کرتی ہیں۔اس سے اختلاف متن کی صورت بھی جنم لیتی ہے مگر مبنی بر حقیقت نہیں ہوتی اور خود شاعر اور اس کے دور کا بھی کوئی

واسطہ نہیں ہوتا۔ اگر کسی نسخہ یا مآخذ کے ساتھ کسی اعتبار سے اس کی شہادت موجود نہیں ہوتی کہ کاتب سے اس کا زمانی و مکانی رشتہ نہیں ہے تو ان اختلافات کو سمجھنا اور بھی دشوار ہوتا ہے۔

تعینِ متن میں کس نسخہ کو زیادہ معتبر اور مرجع سمجھا جائے، یہ ایک مرتب کے لیے بنیادی مسئلہ ہے۔ مصنف کے ہم عہد یا قریب العہد نسخے زیادہ مستند خیال کیے جاتے ہیں اور خاص طور پر وہ نسخہ مرجع ہوتا ہے، جو خود مصنف کا اپنا ہو یا اس کی نظر سے گزر چکا ہو یا پھر اس کو اس کے شاگرد یا قریب رہنے والے کسی فرد نے مرتب کیا ہو۔ مگر اس ضمن میں اس امر کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ بعض شاعروں اور مصنفوں کی طویل زندگی میں زبان و بیان اور شعری میلانات میں بہت کچھ فرق آ جاتا ہے اور وہ خود بھی اس کے زیرِ اثر اپنے لکھنے کو بھی نظری قرار دیتے ہیں، کبھی اس میں بنیادی اصلاحیں اور ترمیمیں کر جاتے ہیں۔ اب اگر کوئی نسخہ یا مآخذ مصنف کے آخری عہد سے تعلق رکھتا ہے اور اس میں اس کا اصلاح شدہ کلام درج ہے تو آخری صورت ہی بالعموم مرجع سمجھی جاتی ہے۔ لیکن میرے خیال سے قدیم اور مستند صورت ہی کو ترجیح دی جانی چاہیے۔ اس سے شاعر کے ذہنی ارتقاء، اس کے اندازِ بیان، لفظیات اور تلفظ کے فرق کو زیادہ آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ باقی صورتیں اختلافِ نسخہ کے ذیل میں آنی چاہئیں۔

سہوِ کتابت کو سمجھنا اور اس کی نشاندہی ضروری ہے، لیکن جب تک اس کے حق میں کچھ قرائن نہ ہوں، اسے اختلافِ متن کا درجہ دینا مناسب نہیں۔ جیسا کہ بعض مرتبین نے کتابوں کی بالکل غیر واضح غلطی کو بھی "کذا" اختلافِ متن میں داخل کر لیا ہے جس سے تصحیحِ متن کی پیچیدگیاں بڑھ جاتی ہیں۔ ترتیبِ دواوین کبھی اس طرح بھی ہوتی ہے کہ ایک نسخہ کو بنیاد بنا لیا جاتا ہے اور روایاتِ متن میں اس کو شروع سے آخر تک پیش کیا جاتا ہے۔ دوسرے نسخوں میں شامل کلام ضمیمہ کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اس سے بعض آسانیاں ضرور پیدا ہوتی ہیں لیکن یہ ترتیب کا ایک نقص بھی ہے۔ زیادہ صحیح صورت یہ ہے کہ معتبر اور غیر معتبر حصہ کلام کو الگ الگ مدون کیا جائے اور مقدمہ میں اس پر تفصیلی گفتگو کے ساتھ ساتھ حواشی میں اس کی نشاندہی کر دی جائے کہ کسی شعر، غزل، قصیدہ، قطعہ یا رباعی وغیرہ کا مآخذ کیا ہے؟ کسی مطبوعہ نسخے، قلمی نسخوں یا مخطوطوں کی مدد سے جو اضافہ عمل میں آیا ہے اس کو متن سے الگ نہ کیا جائے ہاں مآخذ اور مرتبہ نسخے کے حوالے کے ساتھ اس کی فہرست ضرور پیش کی جانی چاہیے تاکہ ایک نظر میں یہ جانا جا سکے کہ نو دریافت حصہ یہ اور اتنا ہے۔

ترتیبِ دیوان کی راہ ہفتخواں کا سب سے بڑا طلسم الحاق الکلام ہے۔ جس کی متنوع اور گوناگوں مثالیں اُردو شعرا کے دواوین میں ملتی ہیں۔ الحاق کہیں تو کاتب کی لاعلمی یا بداحتیاطی کی وجہ سے عمل میں آتا ہے یا پھر وہ کسی ارادت وعقیدت اور خلوص کے زیرِ اثر کیا جاتا ہے۔ اُردو شعر و شاعری میں اس کا دستور رہا ہے کہ ایک شاعر کا کلام دوسرے شاعر کے حصہ میں آتا رہتا ہے۔ جتنا وقت گزرتا جاتا ہے راست واقفیت کے فقدان کی وجہ سے یہ مسئلہ بہت پیچیدہ ہو جاتا ہے اور مرتب بھول بھلیوں میں پھنس جاتا ہے۔ مآخذ دواوین کے تقابلی مطالعہ اور شاعر کی اپنی لفظیات، تشبیہات، لب ولہجہ اور مزاج کے فرق کو معیار بنا کر دریافت حقیقت کی صورتیں پیدا کی جاتی ہیں لیکن واضح ثبوت اور قطعی شواہد کی موجودگی کے بغیر کوئی حتمی فیصلہ بھی دشوار ہوتا ہے۔ یہ صورت اس وقت مشکلیں پیدا کرتی ہے جب دوسرے کے تخلص سے شاعر کا کلام ملتا ہے۔ نیز معاصرین کے روایتی شاعری کے اسالیب میں کبھی کبھی ایسی مماثلت موجود ہوتی ہے کہ امتیاز مشکل ہو جاتا ہے۔

قدیم دواوین کا مطالعہ جیسا کہ اس سے بیشتر کسی موقع پر کہا جا چکا ہے اور لغوی اعتبار سے بھی کیا جاتا ہے، جس کے لیے تلفظ، معنی اور املا کی صورتیں اور ان کا تعین بنیادی اہمیت کی چیز ہے۔ اس کے لیے محاورات، کلمات، افعال، حروف اور لفظیات پر خصوصی توجہ ضروری ہے جو اس بات کی مقتضی ہے کہ معاصر ادب اور لغت کا گہرا مطالعہ کیا جائے۔ قدیم دواوین میں غیر زبانوں مثلاً پنجابی، مرہٹی اور تلیگو وغیرہ بولیوں کے الفاظ اور ان کی متروک شکلیں بھی داخل ہیں جن کی صورت اور معنی سے نیا ادب واقف نہیں اور ہماری اپنی زبان کی لغت میں بھی ان کے معنی نہیں ملتے۔ اس لیے ان کو حل کرنا ناممکن سا ہو جاتا ہے۔ ایسے الفاظ کی تفہیم ان کے تلفظ کے تعین اور ان کی گرامر تیار کرنے کے لیے متعلقہ زبانوں کے ادب، تاریخ اور لغت سے ضروری واقفیت ناگزیر ہے مگر اس کے مناسب وسائل ہنوز ہماری دسترس سے باہر ہیں۔

یہ کچھ ایسے مسائل ہیں جن سے قدیم متن کی تحقیق کرنے والوں کو واسطہ پڑتا ہے، ان پر غور و فکر کرنا اور ممکن حدوں میں ان کو دریافت کرنے کی ہر سطح پر کوشش ہمارے لیے ضروری ہے۔

❖❖❖❖

(۱) قدیم دواوین کی ترتیب کے مسائل، مشمولہ ادبی اور لسانی تحقیق اصول اور طریق کار، مرتب ڈاکٹر عبدالستار دلوی، بمبئی، ۱۹۸۴ء، ص ۲۴۵-۲۵۰۔

حوالہ اور صحت متن [۱(الف)]

رشید حسن خان

تحقیق کی ایک مشکل یہ ہے کہ اس میں معتبر حوالے کے بغیر کچھ بھی قابل قبول نہیں ہوتا اور اس سے بڑھ کر مشکل یہ ہے کہ ایسے متن کم ہیں جو موجودہ صورت حال میں قابل اعتماد ہوں۔ اس طرح حوالے کا مسئلہ بہت پریشان کن ہے۔ اساتذہ کے دواوین، قدیم نثری تصانیف، تذکرے بھی اس کمیابی کی ذیل میں آتے ہیں۔ بس چند کتابوں کے اچھے ایڈیشن سامنے آئے ہیں۔ تذکروں کا شمار بنیادی مآخذ میں کیا جاتا ہے لیکن بیشتر مطبوعہ تذکرے ترتیب نو کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ اختلافات متن یا انتساب کلام کے تحت جس فراغ دلی کے ساتھ تذکروں میں چھپے ہوئے اشعار کا حوالہ دیا جاتا ہے وہ تو اور زیادہ غیر مناسب ہے، کیونکہ بیشتر مطبوعہ تذکروں میں اشعار کے متن کا حال سب سے زیادہ سقیم ہے۔ ایسے تذکروں کو جب تک آداب تدوین کی مکمل پابندی کے ساتھ مرتب نہ کیا جائے، اس وقت تک متن کو شبہات سے محفوظ نہیں قرار دیا جا سکتا۔

یہ صورت حال تحقیق کے طالب علموں کے لیے مصیبت آفریں ہے۔ اس مضمون کا مقصد یہ ہے کہ اساتذہ کی توجہ اس طرف مبذول کرائی جائے کہ اہم مآخذ خاص طور پر اساتذہ کے دواوین اور تذکروں کو پابندی آداب تدوین کے ساتھ مرتب کرنے کی بہت ضرورت ہے اور طلباء کے سامنے اس بات کو واضح کیا جائے کہ حوالہ دیتے وقت ان کو بہت احتیاط کرنی چاہیے۔ جو کتابیں عام طور پر بطور مآخذ استعمال میں آتی رہتی ہیں، ان کو صحیح طور پر مرتب کیا جانا چاہیے اور جب تک ایسا نہیں ہوتا اس وقت تک ہر مآخذ کو امکانی حد تک دیکھ بھال لینا چاہیے اور جہاں تک ممکن ہو، دوسرے مآخذ سے مقابلہ بھی کر لینا چاہیے اور اگر ایک کتاب کے کئی نسخے ہیں، مطبوعہ یا غیر مطبوعہ تو ان میں سے جتنے نسخے مل سکتے ہوں، ان کو بھی ضرور دیکھ لینا چاہیے۔ اس احتیاط کے بغیر کبھی بعض صورتوں میں اور کبھی اکثر صورتوں میں غلط فہمی اور غلط آفرینی کے امکانات کارفرما رہیں گے۔

میں تحقیق کے طالب علموں کی توجہ اس طرف خاص طور پر منعطف کرانا چاہتا ہوں کہ تحقیق میں شک کو بنیادی حیثیت حاصل ہے بلکہ اکثر صورتوں میں تحقیق کا آغاز اسی نقطے سے ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص خوش اعتقاد ہے تو یہ ممکن ہے کہ وہ اللہ کا نیک بندہ ہو یا جلد ہی یہ سعادت اسے حاصل ہو جائے، مگر تحقیق کی روشنی سے اس کی آنکھیں محروم رہیں گی۔ عقیدت، زود یقینی اور ان جیسی تصوف پسند اور مغالطہ آفرین خوش اخلاقیوں کی تحقیق میں گنجائش نہیں۔ یہ ضمنی بات ختم ہوئی۔

اس مضمون میں بعض حوالوں کا ذکر کیا جائے گا اور بعض اختلافات کو پیش کیا جائے گا، تاکہ ان مثالوں کی مدد سے وضاحت بیان کی آسانی حاصل ہو سکے۔ مثالیں مختلف کتابوں سے پیش کی جائیں گی۔ اس طرح حوالہ دینے کی مشکلات کا، صحیح متنوں کی کمیابی اور اس دائرے کی وسعت کا اندازہ کیا جا سکے گا۔ یہ صراحت کی جاتی ہے کہ صحت متن اور حوالے کے سارے مسائل پر گفتگو کرنا مقصود نہیں۔

مخدومی قاضی عبدالودود صاحب نے ''تذکرہ شعرا'' مصنفہ ابن امین اللہ طوفان کے حواشی میں آب حیات کی ایک عبارت کے ضروری اجزا نقل کر کے اعتراض کیا ہے کہ آزاد نے ناسخ و آتش کے دواوین دیکھے بغیر اعتراض جڑ دیا۔

ایک مشاعرے میں خواجہ (آتش) نے مطلع پڑھا۔

سرمہ منظورِ نظر ٹھہرا ہے چشم یار میں
نیل کا گنڈا پنھایا، مردم بیمار میں

شیخ (ناسخ) نے کہا، سبحان اللہ، خوب فرمایا ہے ''سرمہ۔۔۔۔۔۔ یار میں نیلگوں۔۔۔۔۔ بیمار میں'' خواجہ صاحب نے اٹھ کر سلام کیا اور کہا، جائے استاد خالیست۔ آزاد کی سمجھ میں نہیں آتا کہ بیمار میں گنڈا کیوں کر پنھاتے ہیں۔ گنڈا بیمار کو پنھاتے ہیں اور اس سے زیادہ تعجب شیخ کے مطلعے کا ہے (شعر ۸ اس اختلاف کے ساتھ کہ ردیف میں) [۱(ب)]

(آب حیات طبع ۱۹۱۷ء۔ ص ۳۶۹)

آتش و ناسخ دونوں نے اس زمین میں بکثرت اشعار کہے ہیں اور کلیات مطبوعہ میں ردیف ''کو'' ہی ہے دونوں استادوں کے دیوان آب حیات کی تصنیف سے بہت قبل چھپ چکے تھے اور چار دانگ ہند میں رائج تھے۔ دیوان کی طرف رجوع کیے بغیر اعتراض جڑ دینا نہایت غیر ذمے دارانہ روش ہے۔

(حواشی تذکرہ مذکور۔ ص ۲۹)

قاضی صاحب کا مآخذ آب حیات کا نسخہ مطبوعہ ۱۹۱۷ء ہے۔ میرے سامنے آب حیات کا نسخہ مطبوعہ ۱۸۹۹ء ہے، جو مفید عالم پریس لاہور کا چھپا ہوا ہے۔ اس میں یہ عبارت جس طرح ہے اس سے آزاد پر وہ اعتراض وارد ہی نہیں ہوتا جو قاضی صاحب نے کیا۔ اس نسخے میں یہ عبارت یوں ہے۔

ایک مشاعرے میں خواجہ صاحب نے مطلع پڑھا۔

سرمہ منظور نظر ٹھہرا ہے چشم یار کو
نیلگوں گنڈا پنھایا مردم بیمار کو

شیخ صاحب نے کہا۔ سبحان اللہ! خواجہ صاحب نے کیا خوب فرمایا ہے:۔

سرمہ منظور نظر ٹھہرا جو چشم یار کو
نیلگوں گنڈا پنھایا مردم بیمار کو

خواجہ صاحب نے اٹھ کر سلام کیا اور کہا ''جائے استاد خالی است'' مجھے تعجب ہے شیخ صاحب کے مطلع کا کہ فرماتے ہیں۔

یوں نزاکت سے گراں ہے سرمہ چشم یار کو
جس طرح ہو رات بھاری مردم بیمار کو

یہاں ''بیمار پر'' ہو تو ٹھیک ہو۔

(آب حیات مطبوعہ ۱۸۹۹ء۔ ص ۳۴۴)

یعنی اس نسخے کی عبارت کے مطابق آتش و ناسخ کے اشعار کی ردیف وہی ہے، جو ان کے مطبوعہ دواوین میں ہے اور اس میں آزاد نے کچھ تصرف نہیں کیا۔ آب حیات بار بار چھپی ہے اور اس کی مختلف اشاعتوں میں اختلاف پائے جاتے ہیں مگر خاص بات یہ ہے کہ جو اشاعتیں ۱۹۰۰ء سے پہلے کی ہیں ان میں اور بعد کی اشاعتوں میں زیادہ اختلاف ہیں۔ آزاد کی دیوانگی کا زمانہ بھی معلوم ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ ان کے ورثا بھی صاحب قلم تھے۔ ان امور کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ اس اہم کتاب کے مختلف ایڈیشن جمع کیے جائیں اور ایک اچھا نسخہ مرتب کیا جائے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ ایسے اختلافات کی حیثیت کیا ہے۔ قاضی صاحب نے تذکرہ مذکور کے ''ملحقات حواشی'' میں اسی سلسلے میں لکھا ہے ''شعر ناسخ بہ ردیف کو'' بھی آب حیات میں ہے (ص ۳۶۰) اس سے بات اور الجھ گئی۔ مجھے یقین ہے کہ آب حیات کے بعض حوالوں میں اس سے کہیں زیادہ الجھنوں سے سابقہ پڑے اگر اختلاف متن کا یہ پہلو پیش نظر ہو۔

اکثر مطبوعہ تذکروں کا متن اغلاط سے خالی نہیں۔ مگر اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ متعدد تذکروں کے نئے خطی نسخوں کا علم ہوا ہے اور اب جب تک ان تذکروں کو مختلف نسخوں کی مدد سے احتیاط کے ساتھ از سر نو مرتب نہ کیا جائے، اس وقت تک حوالے کا مسئلہ پریشان کن رہے گا۔ میں اس سلسلے میں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔ اثبات مدعا کے لیے یہی کافی ہے۔

تذکرۂ شورش کا شمار اہم تذکروں میں کیا جاتا ہے، دیگر وجوہ کے علاوہ ''سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ پہلا تذکرہ ہے جو عظیم آباد میں لکھا گیا'' اس کے ایک خطی نسخے کا علم تھا۔ (مخزونہ، باڈلین لائبریری آکسفورڈ) اور اسی نسخے کو کلیم الدین احمد صاحب نے شائع کیا ہے اور بقول ڈاکٹر محمود الٰہی ''اس کی اشاعت نے اس کے ثقہ اور مستند ہونے کو ایک مستقل سوال بنا دیا ہے'' موصوف نے مزید لکھا ہے:

''حال ہی میں راقم سطور کو تذکرہ شورش کا ایک اور مخطوطہ دست یاب ہوا ہے جس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آکسفورڈ والے مخطوطے میں کسی نہ کسی حد تک تحریف ہوئی ہے۔ جہاں تک شعراء کے سلسلے میں بیانات اور انتخابات اشعار کا سوال ہے، اس کے بارے میں صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ دونوں نسخوں میں قابل لحاظ اختلاف موجود ہے۔ شورش نے اکثر مقامات پر اپنے مآخذ اور ذرائع معلومات کی صراحت کر دی ہے لیکن آکسفورڈ والے نسخے سے ایسے بیانات غائب ہیں''۔

(قومی زبان۔ (کراچی)، اپریل ۱۹۶۷ء)

آخر میں موصوف نے لکھا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دونوں نسخوں کو سامنے رکھ کر ایک مستند متن تیار کیا جائے، تاکہ تحقیقی کام کرنے والے صحیح تر مواد سے واقف ہو سکیں۔ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تذکرہ شورش کے موجودہ مطبوعہ نسخے سے کامل اعتماد کے ساتھ حوالے نہیں دیے جا سکتے اور نہ وہ لازماً قابلِ قبول ہو سکتے ہیں۔ اکثر مطبوعہ تذکرے اسی ذیل میں آتے ہیں۔ اس سے اتفاق کیا جائے گا کہ عام طور پر جس طرح مطبوعہ تذکروں کی عبارتوں کو نقل کر دیا جاتا ہے یا

اختلاف متن کے ذیل میں اشعار کا حوالہ دیا جاتا ہے، وہ تقاضائے احتیاط کے خلاف ہے۔

متعدد مجموعہ ہائے کلام کے متعلق یہ معلوم ہے کہ ان میں الحاقی کلام موجود ہے یا یہ کہ متن میں تحریف کی گئی ہے۔ مثلاً کلیات سودا کے مطبوعہ نسخوں میں بہت سا کلام دوسروں کا ہے۔ یہ کہا گیا ہے کہ سو سے کچھ زیادہ غزلیں تو میر سوز ہی کی ہیں (ملاحظہ ہو مقالہ قاضی عبدالودود صاحب سویرا (لاہور) شمارہ ۲۹) یا مثلاً خواجہ حافظ شیرازی کا دیوان۔ ایران کے فاضل اجل اور محقق بزرگ محمد قزوینی (مرحوم) کی تحریر کے مطابق دیوان حافظ کے جو نسخے نویں صدی ہجری تک لکھے ہوئے ملتے ہیں، ان میں ''عدہ غزلیات از پانصد تجاوز نمی کندہ بلکہ غالباً بہ پانصد ہم نمیرسد'' لیکن جس قدر زمانہ گزرتا جاتا ہے، غزلوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ گیارھویں صدی ہجری کے اواخر اور بارھویں صدی کے اوائل میں یہ تعداد چھ سو تک پہنچ جاتی ہے۔ یعنی موجودہ صدی میں دیوان کے بعض مطبوعہ نسخوں میں آٹھ سو سے زیادہ غزلیں ملتی ہیں۔ ''در بعضے از چاپہائے اخیر دیوان حافظ در طہران بیش از سی صد غزل الحاقی بر اصل دیوان خواجہ علاوہ شدہ است و شمارہ مجموع غزلہائے دیوان بہ ہشت صد واند غزل رسیدہ است''۔

(مقدمہ دیوان حافظ۔ مرتبہ محمد قزوینی و قاسم غنی)

اب اگر کوئی شخص دیوان حافظ کا ترجمہ کرنا چاہتا ہے، فہرست الفاظ بنانا چاہتا ہے یا سند کے لیے اشعار کا انتخاب کرنا چاہتا ہے تو لازم ہوگا کہ وہ ان امور کو ملحوظ رکھے اور یہ نہ کرے کہ جو مطبوعہ نسخہ ہاتھ آ جائے، اسی پر قناعت کر لے۔ یہی صورت امیر خسرو سے منسوب ہندوی کلام کی ہے کہ جب تک صحت انتساب اور صحت متن دونوں کے سلسلے میں قابل قبول شہادت نہ ملے، اس وقت تک امیر خسرو سے اس کلام کا انتساب ناقابل قبول رہے گا اور ان اجزاء کو حوالے کے طور پر نہ پیش کیا جا سکتا ہے، نہ قبول کیا جا سکتا ہے۔

محمد حسین آزاد کے مرتب کیے ہوئے دیوان ذوق کا بھی حال معلوم ہے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ آزاد نے بہت سے مقامات پر ترمیموں اور اضافوں کی پیوند کاری کی ہے۔ حال ہی میں یہ انکشاف بھی ہوا ہے کہ ناسخ کے کلام کا بھی یہی حال ہے کہ ان کے شاگرد (اور مصحح کلیات ناسخ) میر علی اوسط رشک نے بھی بہت سی ترمیمیں کی ہیں (ملاحظہ ہو مقدمہ انتخاب ناسخ مرتبہ: راقم الحروف اور ڈاکٹر گیان چند جین کا مقالہ مشمولہ نذر عابد) مقدمہ انتخاب ناسخ سے تصحیح کا ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ کلیات ناسخ (اشاعت اول) میں ص ۲۴۲ پر ایک شعر یوں چھپا ہوا ہے۔

چھوڑ کر اپنی تعلی، کر تواضع اختیار

رتبہ مینار مسجد پست ہے محراب سے

کلیات کے غلط نامے میں ''رتبہ مینار مسجد'' کو غلط بتایا گیا ہے اور اس کی جگہ ''رتبہ مسجد کے منارے کا ہے کم'' کو صحیح بتایا گیا ہے۔ اب دوسرا مصرع یوں ہوا:

رتبہ مسجد کے منارے کا ہے کم محراب سے

ایک اور شعر میں بھی مینار نظم ہوا تھا:

طاق ابرو کے تصور میں کروں نالے بلند

چاہیے مسجد عالی کے ہوں مینار دراز (ص ۱۲۳)

غلط نامے میں اس کی بھی تصحیح کی گئی اور تصحیح کے مطابق دوسرے مصرعے کو یوں پڑھنا چاہیے۔

''ایسی مسجد کو منارے ہیں سزا وار دراز''

دونوں مصرعوں میں لفظ مینار نظم ہوا تھا، جب کہ بلحاظ لغت اصل لفظ ''منار'' (بہ فتح میم) ہے۔ صاحب غیاث اللغات نے اس کی صراحت کر دی ہے کہ یہ لفظ بہ اضافہ یا غلط ہے۔ لفظ منار کے ذیل میں لکھا ہے ''و دریں زماں کہ آں را مینار گویند بزیادت تحتانی غلط محض است'' شاگرد نے غالباً اس خیال سے کہ استاد کے دامن پر اس غلطی کا داغ نہیں آنا چاہیے، غلط نامے کے واسطے سے تصحیح کر دی یا یوں کہیے کہ تحریف کے مرتکب ہوئے۔ ڈاکٹر گیان چند جین کے مقالے میں اس کی مزید صراحت کی گئی ہے۔ موصوف نے ایک خط کا حوالہ دیا ہے جس میں ناسخ کی مثنوی ''سراج نظم'' کے متعلق لکھا ہوا ہے کہ ''ہمیں نسخہ را جناب میر علی اوسط صاحب گرفتہ و اصلاح فرمودہ بطبع آوردند و بعض اشعار شیخ صاحب راچناں از قلم محو فرمودہ اند کہ خواندہ نمی شود'' (نذر عابد ص ۳۰۷) جین صاحب نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ ''اس رقعے سے دو اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ میر علی اوسط رشک نے سراج نظم کے نسخے میں اصلاحیں کیں اور انھوں نے اصل نسخے میں بعض جگہ ناسخ کے اشعار کو اس طرح

قلم زد کیا کہ وہ بعد کو پڑھے تک نہیں جاتے تھے۔ یہی اصلاح شدہ نسخہ انھوں نے شائع کیا۔ معلوم ہوا کہ مطبوعہ نسخے میں فاضل شاگرد نے فراغ دلی سے سعادت مندی کا ثبوت دیا تھا۔۔۔ (نذر عابد۔ ص ۳۰۸)

اس طرح کی تصحیح یا تحریف کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ایک اور دلچسپ مثال سے صورت حال کا اچھی طرح جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

رام پور سے مصحفی کے کلام کا ایک انتخاب ۱۲۹۶ھ میں شائع ہوا تھا۔ مرتبین تھے مصحفی کے شاگرد اسیر اور اسیر کے شاگرد امیر مینائی اور فرمائش تھی نواب کلب علی خان کی۔ ان دونوں اساتذہ کی رائے میں جہاں مصحفی کے کلام میں متروکات شامل ہو گئے تھے وہاں وہاں اس طرح تصحیح کی گئی ہے کہ ان کو بدل دیا گیا ہے اور مصرعوں کو ''زبان حال'' کے مطابق بنا دیا گیا ہے' مولوی عبدالسلام خان صاحب رام پوری نے ایک مفصل مضمون میں اس انتخاب کا تعارف کرایا ہے۔ (مطبوعہ معارف نمبر ۲ جلد نمبر ۴۰) اس مضمون سے نمونے کے طور پر دو تصحیحات نقل کی جاتی ہیں۔ مصحفی کا شعر تھا:

دل کو ہے رنگی اس ابروے خمدار کے ساتھ
جوں سپاہی کے تئیں ربط ہو تلوار کے ساتھ

انتخاب میں اس شعر کو یوں چھاپا گیا ہے۔

دل کو یوں ربط ہے اس ابروے خمدار کے ساتھ
عشق جس طرح سپاہی کو ہو تلوار کے ساتھ

مصحفی کا معروف شعر ہے۔

اس گل کی باغ میں جو صبا نے چلائی بات
غنچے نے مسکرا کے کہا، ہم نے پائی بات

غالباً اس خیال[2] سے کہ ''بات چلانا فصیح نہیں'' استاد کے مصرعے کو اس طرح بدل دیا گیا:

پیک صبا نے اس کے دہن کا کیا جو ذکر
غنچے نے مسکرا کے کہا، ہم نے پائی بات

مضمون نگار نے صراحت کی ہے کہ یہ اصلاحات (جن کو تحریفات کہنا چاہیے) بہ خط امیر مینائی ہیں۔ (مولانا عرشی سے میں نے دریافت کیا تو موصوف نے اس کی تصدیق کی) کلام مصحفی کا وہ خطی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے، جس کے صفحات پر یہ محفوظ ہیں۔

کلام سودا کا کوئی اچھا مجموعہ اس زمانے میں شائع نہیں ہوا۔ وہی نول کشوری نسخہ ملتا ہے اور ہم سب اسی سے استفادہ کرتے ہیں۔ خطی نسخوں سے یا ان کے عکس سے ہر شخص استفادہ نہیں کر سکتا یہ محض اتفاقات پر مبنی ہے کہ کسی شخص کو ایسے مآخذ سے استفادے کا موقع مل جائے۔ اسی لیے میں خاص طور پر اس طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ اہم کتابوں کو اس زمانے میں قاعدے کے ساتھ مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ بہت ضروری کام ہے۔

دیوان ولی کے ایک مطبوعہ نسخے کا ذکر کرتے ہوئے گارساں دتاسی نے لکھا ہے:

''اس مقالے کے شروع میں میں نے دیوان ولی کے ایک ایڈیشن کا ذکر کیا ہے، جو حال ہی میں بمبئی سے شائع ہوا ہے۔ حسب ضرورت متن کی تصحیح بھی کی گئی ہے یعنی تبدیلیاں کر دی گئی ہیں۔ دیوان کو مرتب کرنے والوں کو نام نہاد اصلاح کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ان کا خیال تھا کہ ولی کے دیوان میں بعض متروک الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ترتیب دینے والوں کو اصلاح دیتے وقت یاد نہ رہا کہ ولی نے دکنی اُردو میں شاعری کی ہے اور اس زبان کے محاورے شمال کی موجودہ زبان میں لامحالہ ناپید ہوں گے۔ ولی کے کلام کی خصوصیت یہی اجنبی زبان ہے۔ بمبئی کے ایڈیشن میں ولی کو نیا لباس پہنانے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کے کلام کو کاٹ چھانٹ کر مسخ کر دیا ہے۔ یہی نہیں کہ جدید صرف ونحو کا نشتر چلایا گیا ہے بلکہ دکنی الفاظ کو نکال کر ان کی جگہ ایسے فارسی لفظ رکھ دیے گئے ہیں جو شمالی ہند میں رائج ہیں۔ اپنے اعتراض کے ثبوت میں نیچے میں چند مثالیں دیتا ہوں۔ پہلے ہی شعر سے تصرف شروع ہو گیا ہے۔ ولی کہتا ہے:

کیتا ہوں ترے ناؤں کا میں ورد زبان کا

لیکن بمبئی کے ایڈیشن میں لکھا ہے:

رکھتا ہوں ترے نام کو میں ورد زبان کا

(مقالات گارساں دتاسی حصہ دوم۔ ناشر: انجمن ترقی اُردو ہند، دہلی، سال طبع ۱۹۴۳ء۔ ص ۲۰۶)

دتاسی کی یہ تحریر ۱۸۷۵ء کی ہے لیکن ۱۹۶۰ء میں بھی اس کی مثال مل سکتی ہے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور (مرحوم) نے ساہتیہ اکادمی کی فرمائش پر اُردو شاعری کا ایک انتخاب مرتب کیا تھا۔

اس میں دکنی شعرا کا کلام بھی شامل تھا اور بہت سے اشعار دکنی کے بجائے شمالی ہند کی زبان کا لباس پہن کر جلوہ گر ہوئے ہیں۔ اس انتخاب پر میں نے تبصرہ کیا تھا، جو اس مجموعے میں شامل ہے۔ تفصیل کے لیے اس کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس انتخاب یا ایسے ہی غیر معتبر مجموعوں سے حوالے دیتا ہے، تو وہ گویا غلط متن کو قبول بھی کرتا ہے اور پیش بھی کرتا ہے۔ حوالے کے طریقہ کار کی خلاف ورزی کے علاوہ کبھی کبھی یہ بھی ہوگا کہ ایسے حوالوں سے جو نتائج نکالے جائیں گے (لسانی، سیاسی، سماجی، وغیرہ) وہ بجائے خود نا قابل قبول ہوں گے۔

پرانی کتابوں کے اچھے خطی نسخوں سے اگر مطبوعہ کتابوں کے متن کا مقابلہ کیا جائے تو بہت زیادہ اختلافات سامنے آئیں گے۔ میں اس سلسلے میں بھی ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔

اب تک کی معلومات کے مطابق کلیات سودا کا قدیم ترین مطبوعہ نسخہ وہ ہے جو مطبع مصطفائی دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اس کا سال تکمیل طباعت ۱۲۷۲ھ[۳] ہے۔ عبدالباری آسی مرحوم کی تصحیح و ترتیب کے ساتھ یہ کلیات نول کشور پریس سے بھی شائع ہوا ہے اور اب عموماً یہی نسخہ دیکھنے میں آتا ہے اور اس کو حوالے کے لیے بھی عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ کئی بار چھپا ہے۔ اب تک کی معلومات کے مطابق کلام سودا کا (بہ لحاظ صحت متن و انتساب کلام) اہم ترین اور معتبر ترین خطی نسخہ وہ ہے، جو انڈیا آفس لائبریری (لندن) میں محفوظ ہے۔ اس کی کتابت سودا کی زندگی میں ہوئی تھی۔ خیال یہ ہے کہ اس نسخے کی تکمیل کتابت ۱۱۹۳ھ اور ۱۱۹۵ھ کے درمیانی زمانے میں ہوئی ہے۔ ۱۱۹۵ھ میں سودا کا انتقال ہوا ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے مقدمہ انتخاب سودا مکتبہ جامعہ، دہلی) یہ نسخہ سودا کے ایک ممدوح رچرڈ جانسن کی نذر کیا گیا تھا، اسی لیے اس کو ''نسخہ جانسن'' کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اس نسخے کے عکس[۴] سے میں نے استفادہ کیا ہے۔ سودا کا ایک مشہور شعر نسخہ آسی میں اس طرح ملتا ہے:

ناوک نے ترے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

نسخہ مصطفائی میں یہ اس طرح ہے:

ناوک ترے نے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپھے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

اور نسخہ جانسن میں آپ اسے اس طرح پائیں گے:

ناوک ترے نے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپھے ہے مرغ قبلہ نما اپنے خانے میں

سودا کا ایک شعر اس طرح مشہور ہے:

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں

نسخہ آسی میں بھی اس طرح ہے، مگر نسخہ مصطفائی اور نسخہ جانسن میں ''مجھے'' کی جگہ ''تجھے'' ہے:

''کیفیت چشم اس کی تجھے یاد ہے سودا''

تحقیقی اصطلاحوں کی فرہنگ

ڈاکٹر گیان چند جین

اُردو اصطلاحیں:

اتقاقیہ: کسی نسخے میں ہجے، رموز اوقاف اور لفظوں کی تقسیم۔

اختلاف نسخ: تدوین متن میں مختلف نسخوں کے اختلاف اور ان کا یکجا اندراج۔

اساسی نسخہ: وہ نسخہ جسے تدوین میں اہم ترین مان کر متن میں دیا جائے۔

استدراک: لغوی معنی: سمجھ حاصل کرنا یا تدارک کرنا۔ کتاب کے آخر میں، متنِ کتاب کے کسی اندراج میں ترمیم وتصحیح۔

اسماء الرجال: اشاریے میں اشخاص کے نام۔

اشاریہ: ا۔ کتاب کے آخر میں، متن میں مذکورہ اشخاص، مقامات، کتب، اداروں وغیرہ کی ہجائی ترتیب مع نمبر صفحہ۔ ۲۔ کسی ادیب کی تخلیقات نیز اس پر لکھی گئی کتابوں اور مضامین کی سلسلے وار فہرست۔

افقی تشجیر: اگر کسی نسخے یا ایڈیشن سے دوسرے کئی نسخے نکلے ہوں تو اسے افقی (Collateral) تشجیر کہیں گے۔

الحاق: کسی کی تخلیق یا مجموعے میں کسی دوسرے کی تخلیقات کا شامل ہو جانا۔

آمیختہ نسخہ: وہ نسخہ جس کا متن پہلے کے دو نسخوں سے ملا کر تیار کیا گیا ہو۔

انتحال: یہ عربی اصطلاح ہے جو اُردو میں رائج نہیں لیکن ہونی چاہیے: حفقدی حسن ازہری "مختصر تاریخ ادب عربی" (بنارس، ۱۹۷۷ء) حصہ اول، ص ۹۵ پر لکھتے ہیں: "انتحال نام ہے کسی چیز کی غلط نسبت کا" لیکن انتحال کا صحیح مفہوم کسی دوسرے کی تخلیق کو اپنی تخلیق بنا کر پیش کرنا ہے۔

انتخابی اسکول: متن کی تدوین کرتے وقت جملہ معتبر نسخوں کو لے کر، سب کی مدد سے متن تیار کرنا۔

انتخابِ متن: دیکھیے تنقیدِ متن۔

اوقاف: جملے، فقرے اور لفظ میں توقف اور تخصیص وغیرہ کے نشانات۔

بنیادی نسخہ: دیکھیے اساسی نسخہ۔

بیاض: کسی کی ذاتی کاپی جس میں وہ اپنے یا دوسروں کے اشعار، نظمیں یا غزلیں لکھ لیتا ہے۔ شاذ، ان کے مصنف کے بارے میں تعارفی جملہ یا فقرہ بھی لکھ دیا جاتا ہے۔

تبییض: مسودے کو صاف کر کے نقل کرنا۔

تتمہ: کتاب کے تمام ہو جانے کے بعد کسی اور جزو کا اضافہ۔

تحریف: ایک حرف کی جگہ دوسرا حرف رکھنا۔ کسی شعر یا نثری جملے کے اصل متن میں تبدیلی کر دینا۔

تحشیہ: کسی متن پر حاشیے لکھنا۔

تخریج: اگر کسی تحریر میں، عموماً نثری تحریر میں؛ دوسروں کے اشعار، اقوال، آیات، احادیث وغیرہ ہوں تو ان کے مصنف کی نشاندہی کرنا، نیز ان کا صحیح متن دینا۔

تدوین: ا۔ کسی تصنیف کے مختلف نسخوں کا مقابلہ کر کے درست متن تیار کرنا۔ ۲۔ کسی مصنف کی منتشر تخلیقات یا کسی تخلیق کے منتشر اجزا کو صحیح ترتیب سے جمع کرنا۔

ترتیب: دیکھیے، تدوین۔

ترجمہ: تذکرے میں کسی شاعر کے حالات۔

ترقیمہ: مخطوطے کے آخر میں کاتب کی اختتامیہ عبارت، جس میں کاتب کا نام، مالکِ کتاب یا فرمایش کنندہ کا نام، زمان و مکانِ کتابت، اختتامی شعر وغیرہ میں سے کچھ یا سب دیے ہوں۔ پرانی مطبوعات کے آخر میں بھی ترقیمہ ہوتا تھا۔

ترک: اگلے لوگ مخطوطات میں صفحے کا نمبر نہیں ڈالتے تھے۔ دائیں ہاتھ کے صفحے کے نیچے، بائیں کونے میں، اگلے صفحے کی ابتدا کے ایک دو الفاظ لکھ دیتے تھے۔ انھیں ترک کہا جاتا ہے۔

تسوید: کسی مضمون یا کتاب کا پہلا مسودہ لکھنا۔

تصحیح: متن میں اگر کچھ صریحاً غلط ہے تو اس کو درست کرنا۔

تصحیف: لفظ کو بدل دینا، بالخصوص نقطوں کی تبدیلی سے، مثلاً توشہ کو نوشہ یا لغت کو لعنت لکھ دینا۔

تعلیقہ: ضمیمہ۔

تمت: کتاب کا خاتمہ جو بالعموم اس قسم کے فقرے پر ہوتا ہے: تمت تمام شد، کار من نظام شد۔

تمسیخ: متن کو غلط نگاری سے مسخ کر دینا۔

تنشیر: ایک قلمی یا مطبوعہ نسخے (بالعموم مصنف کے نسخے) سے جو دوسرے نسخے ماخوذ ہوتے ہیں، اس پورے سلسلے کو تنشیر کہتے ہیں۔

تنقیدِ متن: کسی لفظ، فقرے، جملے، مصرعے یا شعر کے مختلف متون میں سے مناسب ترین متن کے انتخاب کا عمل۔

توقیت: (بروزن توقیر) کسی ادیب کی زندگی کے اہم واقعات اور تصانیف کو سنہ اور تاریخ وار درج کرنا۔

توقیف: اوقاف لگانے کا عمل۔

جدی تنشیر: اگر ایک قلمی یا مطبوعہ نسخے سے دوسرا نسخہ اور اس سے تیسرا نسخہ ماخوذ ہو، علیٰ ہذا القیاس، تو اس عمودی تنشیر کو جدی تنشیر کہتے ہیں۔

حاشیہ: ۱۔ پہلے زمانے میں کتابت و طباعت میں کچھ نثری عبارت یا اشعار، درمیانِ صفحہ میں لکھتے تھے اور کچھ اطراف کے حاشیے میں ترچھا کر کے۔ اس نواحی جگہ کو حاشیہ کہتے ہیں۔ ۲۔ متن کے کسی اندراج پر تبصرہ یا مزید معلومات جو فٹ نوٹ میں یا باب یا متن کے آخر میں دی جائیں۔

حواشی: حاشیے کے دوسرے معنی کی جمع، یعنی متن پر تبصرے یا اضافی معلومات۔

حوض: کسی صفحے پر جدولی خطوط سے محصور درمیانی جگہ جس کے تین طرف حاشیہ ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو ذیل کی شکل میں:

حاشیہ

حوض

حاشیہ

حاشیہ
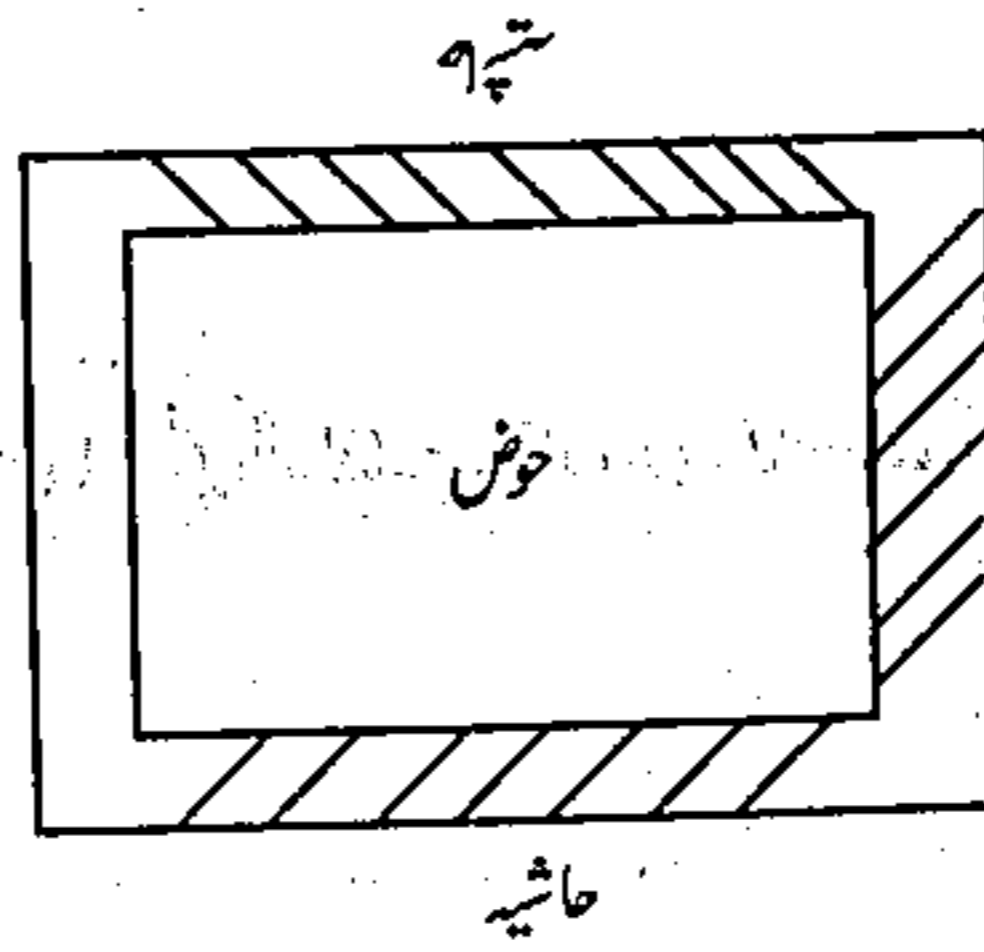
حیات نامہ: دیکھیے، توقیت۔

خطی نسخہ: دیکھیے، قلمی نسخہ۔

دستخطی نسخہ: مصنف کے ہاتھ کا لکھا یا ٹائپ کیا ہوا نسخہ۔

راوی: روایت کرنے والا۔ مصنف یا مولف۔

رکاب: دیکھیے، ترک۔

رموزِ اوقاف: اوقاف کی علامتیں۔

روایت: ایک تخلیق کی مختلف شکلیں، تحریری ہوں کہ زبانی۔

روشِ التقاطی: التقاط کے معنی ہیں چننا۔ یہ ایرانی اصطلاح ہے۔ کسی متن کے نسخوں میں جو بہترین معلوم ہو، اسے اساسی نسخہ بنا لینا۔

روشِ انتقادی: یہ بھی ایرانی اصطلاح ہے۔ کسی متن کے قدیم ترین نسخے کو اساسی نسخہ بنانا۔
دیکھیے ڈاکٹر سید حسن کا مضمون، مشمولہ ''تدوینِ متن مسائل''۔ پٹنہ۔ ص ۴۳۔
سادہ تشیر: دیکھیے: جدی تشیر۔
فرہنگ: عام معنی لغت کے ہیں، لیکن تدوینِ متن میں کسی متن کے بعد اس کے اصطلاحی، مشکل، خصوصی معنی والے الفاظ یا عربی وغیرہ کے فقرے دے کر ان کے معنی لکھنا۔
قرأت: کسی تحریر، بالعموم مخطوطے کے کسی لفظ یا عبارت کو پڑھ کر اس کا تلفظ اور ہجے متعین کرنا، مثلاً ''بل پری'' کی ''صحیح قرأت'' ''بھول پڑے'' طے کرنا۔
ضمیمہ: کسی کتاب کے متن کے بعد وہ اضافی حصہ جس میں متن کے تعلق سے مفید معلومات دی ہوں، لیکن وہ ایسی ہوں جنھیں متن میں نہیں دیا جا سکتا تھا۔
قلم زد: دیکھیے: منسوخ۔
قلمی نسخہ: ہاتھ سے لکھا ہوا نسخہ۔
قیاسی تصحیح: کسی متن کے غلط اندراج کو قیاساً درست کرنا۔
کتابیات: ا۔ کسی کتاب کے جملہ مآخذ، یعنی کتابوں اور مضامین کی فہرست۔ ۲۔ کسی ادیب کا اشاریہ، یعنی اس کے بارے میں لکھی گئی کتابیں اور مضامین۔
کشکول: وہ بیاض جس میں دوسروں کی متفرق نظم ونثر کی چیزیں لکھ لی گئی ہوں۔
لا ادری: میں نہیں جانتا۔ دیکھیے: لا اعلم۔
لا اعلم: مجھے علم نہیں۔ ایسے شعر، نظم، غزل یا نثری عبارت کے قبل لکھا جاتا ہے جس کا مصنف معلوم نہ ہو۔
لوح: کسی کتاب کا پہلا صفحہ یا سرورق۔ بعض اوقات پہلے صفحے کا سرِ عنوان، یعنی اوپری حصہ۔
مآخذ: دیکھیے کتابیات کا پہلا مفہوم۔
ماخذی نسخہ: جس نسخے سے کسی دوسرے نسخے کی نقل کی جائے۔
مبیضہ: مسودے میں نظرِ ثانی کے بعد صاف نقل کیا ہوا نسخہ۔
متداول: کسی ادیب کا وہ منتخب مروج متن جو حذف وترمیم کے بعد تشکیل پذیر ہوا اور جسے مصنف نے اپنی تائید، سند کے ساتھ جاری کیا ہو۔
متن: تدوین کے لیے وہ تحریر جسے کوئی ترتیب دینا چاہے۔
متنی تنقید: دیکھیے: تدوین۔
مجہول الاسم: ایسی قلمی یا مطبوعہ کتاب یا تخلیق جس کا مصنف معلوم نہ ہو۔
محشی: حواشی لکھی ہوئی کتاب یا دوسری تحریر۔
مخطوطہ: قلمی وغیر مطبوعہ نسخہ۔
مخلوط تشیر: اگر کسی کتاب کے ایسے دو نسخے یا ایڈیشن ملیں جن میں بہت اختلاف ہو اور یہ طے نہ کیا جا سکے کہ کس کا کتنا استناد ہے، اس صورت حال کو مخلوط تشیر کہتے ہیں۔
مدون: تدوین کرنے والا۔
مرتب: دیکھیے مدون۔ [''ترتیب دینے والا'' چاہیے: مرتب]
مسودہ: کسی کتاب یا مضمون کا نقشِ اول۔ ہاتھ کی لکھی یا ٹائپ کی ہوئی وہ تحریر جو طباعت کے لیے دی جائے۔
مصادر: دیکھیے: کتابیات کے پہلے معنی۔
منسوخ: وہ تخلیقات یا تخلیق کا حصہ جسے مصنف نے خارج کر دیا ہو۔
موازنہ: ایک متن کے مختلف نسخوں کے اندراجات کا تقابلی مطالعہ کر کے مناسب ترین کا تعین۔
ناقص الآخر: وہ کتاب جس کے آخر کے اوراق نہ ہوں۔

ناقص الاوسط: وہ کتاب جس کے بیچ کے کچھ اوراق کم ہوں۔

ناقص الاول: وہ کتاب جس کے شروع کے اوراق نہ ہوں۔

ناقص الطرفین: وہ کتاب جس کے شروع اور آخر کے اوراق ضائع ہو گئے ہوں۔

نسخہ: کسی قلمی یا مطبوعہ کتاب کی ایک جلد۔

نظری: دیکھیے: منسوخ۔

وحید نسخہ: اگر کسی متن کا دنیا میں ایک ہی نسخہ ملتا ہو تو اسے وحید نسخہ کہتے ہیں۔

وضاحتی فہرست: کتابوں کی فہرست جس میں اس کے مشمولات کی تفصیل و تحقیق دی ہو۔

وضاحتی کتابیات: ایسی کتابیات جس میں کتابوں کے مطالب کا مختصر بیان اور اس پر تبصرہ بھی دیا ہو۔

وضعی: جعلی

ولہ: اس کے معنی ہیں ''اس کا''۔ کسی شاعر کا ایک شعر، نظم و غزل لکھ کر اس کے بعد اسی کی دوسری چیز دی جائے تو آخر الذکر کے اوپر ولہ لکھ دیتے ہیں، جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ بھی اسی شاعر کا کلام ہے۔ نثر میں اس کا استعمال نہیں ہوتا، لیکن غالب نے کیا ہے (''مکاتیب غالب'' مرتب عرشی۔ ص ۴۳۴ بحوالہ: رشید حسن خاں ''اُردو املا''۔ ص ۵۴۵)۔

❖❖❖❖

تحقیق کا فن، اسلام آباد، ص ۵۶۴۔۵۶۹۔

اُردو کی ادبی تحقیق آزادی سے پہلے

پروفیسر گیان چند جین

اُردو ادب کی مسلسل تخلیق بہمنی دور سے شروع ہوتی ہے۔ پہلی مکمل ادبی کتاب نظامی کی مثنوی ''کدم راو پدم راؤ'' ہے جو ۸۲۵ھ اور ۸۳۹ھ یعنی ۱۴۲۱ء اور ۱۴۳۵ء کے بیچ کی تصنیف ہے۔ اس کے بعد سے اردو کی ادبی تخلیقات کی ایک اٹوٹ روایت ملتی ہے۔ اُردو کے ادیب عام طور سے نہ اہل زر تھے نہ ان کا ادب درباروں کی زینت کے لیے تخلیق کیا گیا۔ عوامی زبان تھی جس کی ادبی و غیر ادبی تحریروں کو عامۃ الناس نے پسند کیا۔ یہ تحریریں زبانوں پر چڑھ کر دور تک مشتہر ہوئیں۔ سینوں میں محفوظ ہو کر زبانوں پر غالب رہیں۔ لیکن اس ہر دلعزیزی کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدر دان اپنے حافظے اور مذاق کے مطابق ان میں ترمیم کرتے رہے۔ اُردو کے اہل قلم لا ابالی بھی ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تخلیقات کو اپنے ہاتھ سے لکھ کر محفوظ کرنے کی طرف بقدر بایست توجہ نہیں کی۔ ان کے دور میں ان کے مفصل اور مستند حالات قلم بند نہیں کیے گئے، جس کی وجہ سے ادیبوں کے حالات اور تخلیقات میں بعید از حقیقت عناصر در آ گئے۔

ہمیں حق اور حقیقت عزیز ہے۔ ہم اپنے محسن ادیبوں کے صحیح اور بے کم و کاست حالات جاننا چاہتے ہیں۔ ہم ان کی تخلیقات کے اس روپ تک رسائی چاہتے ہیں جو انھوں نے آخری طور پر پیش کیا تھا۔ اس کٹھن ڈگر میں اہل تحقیق ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ تحقیق کوشاں ہے کہ ماضی کے ادب پاروں کو غیر مسخ شدہ معتبر ہیئت میں تعبیر کیا جا سکے۔ نیز ان کے خالقوں کی زندگیاں ہمارے سامنے اس طرح افشا ہو جائیں جیسے کوئی وقت کی مشین پیچھے کو چلا دی گئی ہو۔ اس مشکل کام میں جزوی کامیابی ہی ہو سکتی، لیکن اس راہ میں مسلسل کوششیں جاری رکھنی ہیں تا کہ اغلاط کا بیش از بیش ازالہ اور صحت کی بیش از بیش تعبیر ہو سکے۔

میں اس تحریر کو صرف ادبیات تک محدود رکھوں گا۔ زبان، قواعد، لغات، معانی و بیان وغیرہ کو نہ لوں گا۔ لغات و قواعد کے باب میں ہمارے یورپی مستشرقین کے قابل فخر کارنامے موجود ہیں جن کی شرح کے لیے ایک علیحدہ دفتر درکار ہے۔

جو ادیب و ادبیات زمانی حیثیت سے ہم سے دور ہیں، ان کے بارے میں ہماری معلومات ناقص ہیں۔ جوں جوں وہ ہم سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں، ہماری بصیرت و بصارت روشن تر ہوتی جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ماضی میں ہمارا تاریخی و دستاویزی شعور اتنا رسیدہ نہ تھا جتنا اب ہو گیا ہے۔ قدیم تذکروں میں حالات کی وہ تفصیل و صحت نہیں جو بعد کے تذکروں اور تواریخ ادب میں ہے۔ لیکن اپنی تمام کمزوریوں اور فرو گذاشتوں کے باوجود قدیم تذکروں سے صرف نظر نہیں کر سکتے۔ حال، ماضی سے انقطاع نہیں کر سکتا، وہ ماضی پر قائم ہے۔ اُردو کے محققوں کے لیے خشت اول بلکہ حبل المتین یہی تذکرے ہیں جنھیں چشم کم سے نہیں دیکھنا چاہیے۔

مجھے اعتراف ہے کہ تذکروں میں فحص کے بجائے تساہل سے کام لیا گیا ہے۔ حالات کے جمع کرنے میں کد نہیں کی گئی۔ جس کے بارے میں جو کچھ معلوم تھا وہی زیب قرطاس کر دیا۔ کسی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ''از دست'' ہی پر اکتفا کر لی گئی لیکن اکثر تذکروں میں چند شعرا کے حالات میں کچھ کام کی باتیں اور کچھ تفصیلات مل جاتی ہیں۔ ضخیم تذکرے اس خصوص میں مفید تر ہیں۔ ایک شاعر کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات فراہم ہو ہی جاتی ہیں۔ کم اہم شاعروں کے بارے میں کم، تو اہم شاعروں کے بارے میں زیادہ۔ چونکہ تذکرہ نگاروں نے تحقیق کو اپنا شعار نہیں بنایا اس لیے ان میں غلط بیانیاں بھی ہیں۔ مختلف تذکروں کے بیانات میں عدم مطابقت ہوتی ہے۔ محقق کا کام ہے کہ ان کو چھان پھٹک کر ایک صحیح نقشہ تیار کر سکے۔ اُردو کی ادبی تحقیق کا پہلا قدم، پہلی منزل تذکرے ہیں، جو دکن گجرات اور شمال سب مقامات پر لکھے گئے۔ انیسویں صدی کی ابتداء تک تمام تذکرے فارسی میں ہیں۔ اس کے بعد ۱۸۵۷ء تک بیشتر تذکرے فارسی میں لکھے گئے۔ معدودے چند اُردو میں، ۱۸۵۷ء کے بعد معاملہ برعکس ہو گیا۔ چند غیر اہم تذکرے فارسی میں ہیں، بقیہ سب اُردو میں۔

ذیل میں تذکروں کی ایک فہرست پیش کرتا ہوں جو جامع نہیں لیکن اس میں کسی اہم تذکرے کا نام نہیں چھوٹا۔ ان میں سے بعض تذکرے فارسی شعرا کے ہیں لیکن چونکہ ابتدائی دور میں فارسی اور اُردو کے شعرا مشترک تھے اس لیے ہم اُردو ادیبوں کے لکھے فارسی شعرا کے تذکروں کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ مثلاً ملاحظہ ہو۔

نام تذکرہ	مصنف	تصنیف	مرتب	سنہ طبع و کیفیت
نکات الشعرا	میر	۱۱۶۵ھ	حبیب الرحمٰن خاں	۱۹۲۰ء یا ۱۹۲۶ء

—	—	—	شیروانی	بدایوں
نکات الشعرا	میر	۱۱۶۵ھ	مولوی عبدالحق	۱۹۳۵ء
نکات الشعرا	میر	۱۱۶۵ھ	محمود الٰہی	۱۹۷۲ء
تحفۃ الشعرا (فارسی)	افضل بیگ قاقشال	۱۱۶۵ھ	ڈاکٹر حفیظ قتیل	۱۹۶۱ء
گلشن گفتار	خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی	۱۱۶۵ھ	سید محمد	۱۳۳۹ فصلی
گلشن راز یا	سید فتح علی	۱۱۶۶ھ	عبدالحق	۱۹۳۳ء
تذکرہ بے بدل ہندی	خاں حسینی گردیزی	۱۷۵۲ھ	—	—
مخزن نکات	قائم	۱۱۶۸ھ	عبدالحق	۱۹۲۹ء
مخزن نکات	قائم	۱۱۶۸ھ	ڈاکٹر اقتدا حسن	۱۹۶۶ء، لاہور
ریاض حسنی قلمی	خوجہ عنایت اللہ فتوت	۱۱۶۸ھ	—	سنٹرل ریکارڈ آفس حیدرآباد
خزانہ عامرہ	غلام علی بلگرامی	—	—	—
سرو آزاد	غلام علی بلگرامی	—	—	۱۹۱۲ء
مقالات الشعرا	قیام الدین حیرت	۱۱۷۴ھ	نثار احمد فاروقی	رسالہ تحریر ۱۹۶۸ء
چمنستان شعرا	لچھمی نرائن شفیق	۱۱۷۵ھ / ۱۷۶۲ء	عبدالحق	۱۹۲۸ء
طبقات الشعرا	قدرت اللہ قدرت وشوق	۱۱۸۸ھ	نثار احمد فاروقی	لاہور، ۱۹۶۸ء
تذکرہ شعرائے اردو	میر حسن	۱۱۹۲ھ	حبیب الرحمٰن خان شیروانی	طبع اول، ۱۹۲۲ء / طبع دوم ۱۹۴۰ء
خزان و بہار	بہاؤ الدین خاں عروج	۱۱۹۲ھ	—	—
مسرت افزا	امیر الدین احمد امر اللہ ابو الحسن	۱۱۹۲-۵ھ / ۱۷۷۸ء-۱۷۸۱ء	قاضی عبدالودود	معاصر ۱۹۵۴ء
رموز الشعرا یا یادگار دوستان یا تذکرہ شورش ۱۱۹۵ھ	شورش التونی	۱۱۹۳ھ	کلیم الدین احمد	جلد اول، ۱۹۵۹ء
تذکرہ عشقی	شیخ وجیہ الدین عشقی	۱۱۸۸ء تا ۱۲۳۶ھ	دو تذکرے کے نام سے	جلد دوم، ۱۹۶۳ء
گل عجائب	اسد علی خاں تمنا	۱۱۹۴ھ	عبدالحق	۱۹۳۶ء
بہار و خزاں	اسد علی خاں تمنا	—	—	آصفیہ لائبریری حیدرآباد میں
گلشن سخن	مرزا کاظم مخاطب بہ مردان علی خاں مبتلا لکھنوی	۱۱۹۴ھ	مسعود حسن رضوی	۱۹۶۵ء
انیس الاحباء قلمی	موہن لال انیس	۱۱۹۴ھ	مرزا فاخر مکین کے شاگردوں کے احوال	—
گلزار ابراہیم	علی ابراہیم خلیل	۱۱۹۸ھ / ۱۷۸۴ء	ڈاکٹر زور کی ترتیب سے مع گلشن ہند	۱۹۳۴ء
گلشن ہند	مرزا علی لطف	۱۲۱۵ھ	ترتیب شبلی و مقدمہ عبدالحق	۱۹۰۶ء

—	—	۱۸۰۱ء	—	—
گلشن ہند	حیدر بخش حیدری	۱۲۱۵ھ	ڈاکٹر مختار الدین آرزو	طبع اُردو ادب ۱۹۶۶ء
عقد ثریا (فارسی شعرا)	مصحفی	۱۱۹۹ھ ۱۷۸۵ء	مقدمہ عبدالحق	۱۹۳۴ء
تذکرہ ہندی	مصحفی	۱۲۰۹ھ	مقدمہ عبدالحق	۱۹۳۳ء
ریاض الفصحا	مصحفی	۱۲۳۶ھ ۱۸۲۱ء	مقدمہ عبدالحق	۱۹۳۴ء
عمدہ منتخبہ	اعظم الدولہ سرور	۱۲۱۶ھ لیکن اضافے تقریباً ۱۲۳۱ھ تک	ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی	۱۹۶۱ء
مخزن الغرائب	احمد علی سندیلوی	۱۲۱۸ھ	—	—
تکملۃ الشعرا	شوق رام پوری	۱۲۱۸ھ	—	—
عیار الشعرا	خوب چند ذکا	۱۲۱۸ھ تا ۱۲۴۷ھ	ڈاکٹر نور الحسن نقوی	غیر مطبوعہ
مخزن شعرایا تذکرہ شعرائے گجرات	قاضی نور الدین فائق	—	عبدالحق	طبع ۱۹۳۳ء
مجمع الانتخاب	شاہ کمال مانکپوری	۱۲۱۹ھ	—	—
سفینہ ہندی	بھگوان داس ہندی	۱۲۱۹ھ	شاہ عطاالرحمٰن عطا کاکوی	۱۹۵۸ء
سفینۂ خوشگو	بندرابن داس خوشگو	—	شاہ عطا کاکوی	۱۹۵۹ء
مجموعہ نغز	قدرت اللہ قاسم	۱۲۲۱ھ	محمود شیرانی	۱۹۳۳ء
دیوان جہان	بنی نرائن	۱۲۲۲ھ	کلیم الدین احمد	۱۹۵۹ء
تذکرہ ابن امین طوفان	ابن امین طوفان	قاضی عبدالودود	۱۹۵۴ء	—
طبقات سخن	غلام محی الدین عشق و مبتلا میرٹھی	۱۲۲۲ھ	—	—
تذکرہ بے جگر	خیراتی لال بے جگر	۱۲۴۱ھ	—	انڈیا آفس لندن میں
تذکرہ آزردہ	منشی صدر الدین آزردہ	۱۲۲۹ اور ۱۲۳۱ھ کے درمیان	مختار الدین احمد	رسالہ تحریر ۱۹۷۹ء میں
گلشن بے خار	شیفتہ	۱۲۵۰ھ ۱۸۳۴ء	کلب علی خان فائق	۱۹۷۳ء
دستور الفصاحت	حکیم احمد علی خاں یکتا	۱۸۳۴ھ	امتیاز علی خان عرشی	۱۹۴۳ء
گلشن ہمیشہ بہار	نصر اللہ خان خویشگی	۱۲۵۷ھ	ڈاکٹر اسلم فرخی	۱۹۶۷ء (طبع اول)
خلاصہ دواوین شعرائے مشہور	امام بخش صہبائی	—	—	۱۸۴۴ء یا ۱۸۴۶ء
گلستان سخن یا آثار المعاصرین	مرزا قادر بخش صابر و صہبائی	۱۲۷۱ھ	خلیل الرحمٰن داؤدی	۱۹۶۶ء لاہور
مدائح الشعرا	عنایت حسین خاں مہجور	۱۸۴۴ء رامپور	افسر صدیقی	کراچی
گلستان بے خزاں یا نغمۂ عندلیب	میر قطب الدین باطن	—	—	طبع ۱۲۶۱ء

تذکرہ	مصنف	سنہ	مرتب / مترجم	سنہ اشاعت	
خوش معرکہ زیبا	سعادت خاں ناصر	۱۲۶۲ھ	مشفق خواجہ	۱۹۷۰ء	—
خوش معرکہ زیبا	سعادت خاں ناصر	۱۸۴۵ء	شمیم انہونوی		
بہار بے خزاں	احمد حسن سحر	۱۲۶۱ھ	ڈاکٹر نعیم احمد	۱۹۶۸ء	
بہار بے خزاں	احمد حسن سحر	۱۲۶۱ھ	حفیظ عباسی	۱۹۶۹ء	
گلدستہ نازنیناں	کریم الدین	۱۲۶۱ھ	—	طبع ۱۲۶۱ھ ۱۸۴۵ء	
طبقات الشعرائے ہند	کریم الدین و فیلن	—	۱۸۴۷ء	طبع ۱۸۴۸ء	
انگریزی تذکرہ	اشپرنگر	۱۸۵۰ء		۱۸۵۰ء	—
یادگار شعرا	اشپرنگر کا ترجمہ	—	طفیل احمد	۱۹۴۳ء	
سراپا سخن	سید محسن علی	۱۲۶۷ھ	—	طبع ۱۲۶۹ھ	—
شوکت نادری	کلب حسین خاں نادر	۱۲۴۷ھ	—		
تذکرہ نادر	کلب حسین خان نادر	۱۲۸۳ھ	مسعود حسن رضوی	۱۹۵۷ء اصلاً	
—	—	—	—	دیوان غریب میں	
—		—	—	۱۲۸۴ھ میں شائع ہوا	
سخن شعرا	نساخ	۱۲۸۱ھ	—		
خزینۃ العلوم فی	درگا پرشاد نادر دہلوی	۱۲۸۸ھ	—	فائق کے مخزن شعرا	
—	—	—	—	کا انتخاب	
متعلقات المنظوم یا گلدستہ	—	۱۸۷۱ء	—	—	
نادر الازکار یا شعرائے دکن	—	—		—	
انتخاب یادگار	امیر مینائی	۱۲۹۰ھ	—	طبع ۱۲۹۷ھ	
شمع انجمن	نواب صدیق حسن خاں	۱۲۹۳ھ	—	—	
بزم سخن	سید علی حسن خاں سلیم	۱۲۹۷ھ	—	۱۲۹۸ھ	
روز روشن	مظفر حسین صبا بھوپالی	۱۲۹۷ھ		—	
طور کلیم	سید نور الحسن کلیم	۱۲۹۸ھ		—	
بہارستان ناز	حکیم فصیح الدین رنج، میرٹھ	۱۸۸۴ء	خلیل الرحمٰن داؤدی		—
شمیم سخن	مولوی عبدالحی صفا بدایونی	—	—	طبع ۱۸۸۴ء	
آثار الشعرائے ہنود	دیبی پرشاد بشاش	—		۱۸۸۵ء	
جلوہ خضر	صفیر بلگرامی	۱۳۰۲ھ	ڈاکٹر ظفر اوگانوی	۱۹۷۳-۷۴ء	
—	—	۱۸۸۴-۸۵ء		—	
یادگار ضیغم	عبداللہ خان ضیغم	۱۳۰۲ھ	—	—	
خم خانہ جاوید	لالہ سری رام	—	کیفی	جلد اول ۱۹۰۸ء	
—	—	—	—	دوم ۱۹۱۱ء سوم ۱۹۱۷ء چہارم ۱۹۲۶ء پنجم	
محبوب الزمن	محمد عبدالجبار	—	—	۱۹۴۰ء	
تذکرہ شعرائے دکن ۲ جلد	صوفی ملکاپوری	—	—	طبع ۱۳۲۹ھ	

اعجاز سخن	شیر علی سرخوش	—	—	۱۹۲۳ء
انتخاب زریں	راس مسعود	—	—	—
قاموس المشاہیر	نظامی بدایونی	۲۶-۱۹۲۴ء	—	—
انڈو یورپین شعرائے اُردو (انگریزی)	رام بابو سکسینہ	—	—	—
یورپین شعرائے اُردو	محمد سردار علی	۱۳۴۴ھ	—	—
شعرائے اورنگ آباد	محمد سردار علی	۱۳۴۵ھ	—	—
آب بقا	خواجہ عبدالرؤف عشرت	—	—	۱۹۲۸ء
ہندو شعرا	خواجہ عبدالرؤف عشرت	—	—	۱۹۳۱ء
تذکرہ کاملان رام پور	حافظ احمد علی خاں شوق	—	—	۱۹۳۲ء
تذکرہ خندہ گل	عبدالباری آسی	—	—	۱۹۲۹ء
معرکۂ سخن	عبدالباری آسی	—	—	۱۹۲۹ء
بہار گلشن کشمیر	جگموہن رینہ شوق و برج	—	—	۱۹۳۱ء
	کشن کول بے خبر	—	—	—
بہار سخن یا تذکرہ	شیام سندر لال برق	—	—	طبع ۱۹۳۲ء
ہندو شعرا	سیتا پوری	—	—	—
سخن وران دکن	تسکین عابدی	—	—	۱۹۳۸ء
آثار الشعرا	ممتاز احمد	—	—	—
تذکرہ بے نظیر	عبدالوہاب افتخار	۱۹۴۰ء	—	—
تذکرہ نیرنگ سودا	غالباً عبدالرفیع علوی	—	—	—
منتخب ہندو شعرا	پرنسپل عبدالشکور	—	—	۱۹۴۳ء

قدیم تذکروں میں سب سے ضخیم خوب چند ذکا کا عیار الشعراء ہے۔ اس کے مکمل دو نسخے ملتے ہیں۔ حال میں اسے ڈاکٹر نورالحسن نقوی نے ترتیب دے کر علی گڑھ یونیورسٹی سے ڈی لٹ کی ڈگری لی ہے۔ یہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ اس کے بعد عمدۂ منتخبہ کا نمبر آتا ہے۔ تیسرا ضخیم تذکرہ قاسم کا مجموعۂ نغز ہے۔ ان تمام تذکروں کی مدد سے اہم شعرا کے حالات مرتب کیے جاسکتے ہیں۔ گو تاریخ ولادت و وفات کا تعین بعض صورتوں میں ہو پاتا ہے، بعض میں نہیں۔ ہمارا جدید تذکرہ بزرگ خم خانہ جاوید انھیں تذکروں کا عطر مجموعہ ہے اور اس سے ناآسودگی کی کوئی وجہ نہیں۔ جناب مالک رام نے اس تذکرے کو اپنے طور پر مکمل کرلیا ہے لیکن شائع نہیں کیا۔

ایک انگریزی اور ایک فرانسیسی تذکرے کا ذکر کرتا ہوں۔ الواس اسپرنگر کو ۱۸۴۶ء کے اواخر میں شاہان اودھ کے اور دوسرے کتب خانوں کی فہرست بنانے پر مامور کیا گیا۔ اُن کی فہرست مخطوطات ۱۸۵۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کے باب اول میں ان شاعروں کا تذکرہ ہے، جن کے مخطوطات شامل فہرست ہیں۔ اس طرح اس میں ۱۵۱۶ شاعروں کے حالات ہیں گو نہایت مختصر۔ اس کا اُردو ترجمہ طفیل احمد نے یادگار شعرا کے نام سے ۱۹۴۳ء میں شائع کیا اور دوسری کتاب گارساں دتاسی کی تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی ہے۔ اس کی پہلی جلد ۱۸۳۵ء میں اور دوسری ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی۔ دوسرے ایڈیشن کے وقت اس نے تین جلدیں کردیں جو ۱۸۷۰ء میں شائع ہوئیں۔ اس میں اُردو اور ہندی دونوں شعرا کا تذکرہ ابجدی ترتیب سے ہے۔ چونکہ گارساں دتاسی نے بہت دور بیٹھ کر یہ تذکرہ مرتب کیا اس لیے اس میں اغلاط بار پاگئے۔ اس پر کریم الدین و فیلن کا تذکرہ شعرائے ہند مبنی ہے اور وہ بھی غلطیوں کی پوٹ ہے۔ گارساں دتاسی کی تاریخ کا اُردو ترجمہ کراچی میں ایک فرانسیسی خاتون سکتان ایلین نذور نے دو جلدوں میں ۱۹۶۱ء میں کیا۔ اس کی ترتیب و تحشیہ کر کے اس پر کراچی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ یہ ترجمہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

تذکروں کے بعد تحقیق ادب میں دوسرا سنگ میل تاریخ ادب ہے۔ تذکرے حروف تہجی کے اعتبار سے ہیں۔ ان میں ادوار کی تقسیم ہوتی ہے۔ ہر دور کی خصوصیات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ تاریخ ادب صرف افراد کی تاریخ نہیں ہوتی، بلکہ اصناف سخن اور ادبی رجحانات کا ارتقاء بھی پیش کرتی ہے۔ جدید تاریخیں، ادب کا مطالعہ اس کے سماجی پس منظر میں کرتی ہیں۔ یہ بالکل فطری ہے۔ ابتدائی تاریخیں ہماری جملہ توقعات پوری نہیں کرتیں۔ جس طرح بعد کے تذکرے ابتدائی تذکروں کے مقابلے میں بالیدہ ہیں، اسی طرح تواریخ ادب نے ابتداء سے انتہا تک ترقی کی کئی منزلیں طے کرلی ہیں۔ ہماری پہلی تاریخ ادب آب حیات (طبع ۱۸۸۱ء) ہے۔

زبان پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا۔ آب حیات ہماری صنف غزل کی طرح ہے۔ اس میں لاکھ کیڑے نکالیے لیکن اس سے مفر ممکن نہیں۔ شبلی نے آزاد کے لیے کہا تھا کہ اگر وہ گپیں بھی ہانک دیتا ہے تو لوگ اسے وحی مان لیتے ہیں۔ آب حیات کے مصنف نے دل کشی اور دل چسپی پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ وہ حکایت کو لذیذ بنانے کے لیے درازتر کردیتا ہے، گو اس میں اپنے تخیل رسا سے عبارت آرائی ہی کیوں نہ کرنی پڑی۔ آزاد نے اُردو کے زریں دور کے زعمائے ادب کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ اس نے آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی کو سپرد قلم کرکے بڑی خدمت کی ہے۔ آج ہمارے سامنے اٹھارویں اور انیسویں صدی کے ہر اہم شاعر کا جو تصور ہے وہ آب حیات ہی کا عطا کردہ ہے۔ تاریخی اعتبار سے آب حیات ہر جگہ درست نہ سہی لیکن ہماری ہر تاریخ ادب پر بھاری ہے۔ اس میں جو چہکتی بولتی زندگی جو روح جہندہ ہے وہ دوسری تاریخوں میں کہاں۔ یہ تاریخ بھی ہے تخلیق بھی۔ اس نے آب حیات پیا ہے، پلایا ہے۔

آب حیات کے بعد انیسویں صدی میں ایک اور تاریخ ادب لکھی گئی۔ یہ امداد امام اثر کی کاشف الحقائق ہے جس کی دونوں جلدیں ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئیں۔ تذکروں کی طرح آب حیات صرف شاعروں تک محدود رہی۔ بیسویں صدی میں ایسی کئی تاریخیں لکھی گئیں جنھوں نے صرف شاعروں سے سروکار رکھا۔ ان میں حکیم عبدالحی کی گل رعنا (۱۳۴۰ھ) اور عبدالسلام ندوی کی شعر الہند کی دو جلدیں (۱۹۳۸ء؟) قابل ذکر ہیں۔ شعر الہند کی دوسری جلد میں اصناف کے بارے میں بھی لکھا۔ شعر الہند کی اہمیت تحقیق سے زیادہ تنقید میں ہے۔ اس نے پہلی بار دلی اور لکھنؤ کے دبستانوں کا تصور پیش کیا جو تاریخ میں چپک کر رہ گیا۔ نیز ہر دور میں دو دو حریفوں کے جوڑے قائم کیے۔

ادب کی کچھ تاریخیں ایسی ہیں جو صرف نثر نگاروں تک محدود رہیں۔ ان میں سب سے پہلی احسن مارہروی کی نمونہ منثورات یا تاریخ نثر اُردو (۱۹۳۰ء) ہے جس میں حالات بہت کم اور نمونے بہت زیادہ ہیں۔ اس کے بعد محمد یحییٰ تنہا کی سیر المصنفین کی دو جلدیں ہیں جو ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئیں۔ انھوں نے ۱۹۴۸ء میں اس پر نظر ثانی کی۔ اس کتاب میں اُردو ادب کے عناصر خمسہ یعنی حالی وشبلی وغیرہ کے بارے میں جامعیت سے لکھا۔ نثر کی ایک اہم تاریخ حامد حسن قادری کی داستان تاریخ اُردو (۱۹۴۱ء) ہے۔ اس میں مستشرقین کے کارناموں کو بڑی تفصیل سے پیش کیا ہے، نیز سرسید اور ان کے رفقا پر بھی بڑی بھرپور نظر ڈالی ہے۔ نثر کی حد تک یہ کتاب اب بھی حوالے کی کتاب ہے۔ سید محمد کی ارباب نثر اُردو فورٹ ولیم کالج کے نثر نگاروں کے بارے میں بڑا جامع تعارف پیش کرتی ہے۔

مکمل تاریخ ادب وہی کہلائے گی جو نظم و نثر دونوں کی تاریخ پیش کرے۔ آزادی سے قبل اس خصوص میں رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب اُردو ممتاز ہے۔ اسے انھوں نے انگریزی میں[1] غالباً ۱۹۲۷ء میں لکھا۔ وہاں یہ نسبتاً مختصر تھی۔ محمد عسکری نے اس کا اُردو ترجمہ کرکے ۱۹۲۹ء میں شائع کیا۔ یہ صرف ترجمہ نہیں۔ حق یہ ہے کہ عسکری نے بہت کچھ اضافہ کیا ہے لیکن اس غریب کی یہ حیثیت نظروں سے اوجھل رہ گئی۔ اس تاریخ ادب کی جامعیت آج بھی مسلم ہے۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ۱۶ جلدوں میں تاریخ مسلمانان پاکستان و ہندوستان شائع ہوئی، جس کی چھٹی تا دسویں جلد اُردو ادب سے متعلق ہیں۔ اس میں سکسینہ کی تاریخ کو ان الفاظ میں خراج تحسین ادا کیا ہے:

''اگرچہ اس کتاب کی بعض تاریخی غلطیاں اب ظاہر ہوگئی ہیں، تاہم اب بھی اُردو ادب کی سب سے جامع تاریخ یہی ہے''۔[2]

آپ نے بقامت کہتر اور بقیمت بہتر کی ضرب المثل سنی ہوگی۔ اسے دیکھنا ہو تو مولوی عبدالحق کے رسالے اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام (۱۹۳۳ء) کی سیر کیجیے۔ علم کے دریا کو کوزے میں بند کرنے کی یہ بہترین مثال ہے۔

کچھ ادبی تاریخیں علاقائی ہیں۔ ان میں سب سے پہلے دیار دکن کو لیجیے۔ کئی صدیوں تک دکن میں کتنا ادب تخلیق ہوا اللہ اللہ۔ حیرت کہ اہل شمال بلکہ خود جدید اہل دکن بھی اس سے غافل تھے۔ میر کے تذکرہ نکات الشعرا میں گجرات کے میر عبدالولی عزلت اور ولی کا ذکر ہے۔ ان میں صرف ولی کو دکنی کہہ سکتے ہیں۔ صاحب آب حیات کو ولی سے پہلے کے کسی دکنی ادیب کا نام معلوم نہ تھا۔ اس پورے جزیرہ نما میں وہ ولی اور سراج سے یا ذاللہ رکھتے تھے۔ عبدالجبار آصفی ملکاپوری کا محبوب الزمن یعنی تذکرہ شعرائے دکن بھی شمالیوں تک رسائی حاصل نہ کرسکا۔ لیکن حکیم شمس اللہ قادری کی اُردوئے قدیم سے صرف نظر کرنا ممکن نہ تھا۔ بالخصوص

اس لیے کہ اس وقت دکن کے افق پر مولوی عبدالحق جیسا مورخ اُردو نمودار ہو چکا تھا۔ اُردوئے قدیم ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی۔ یہ بنیادی حیثیت سے دکن کے شعرا کی تاریخ ہے۔

اسی عہد میں نصیر الدین ہاشمی کی تاریخ ساز کتاب ''دکن میں اُردو'' ۱۹۲۵ء یا ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی۔ علاقائی تاریخوں میں یہ پہلی منصۂ ادب پر نمودار ہوئی۔ ''دکن میں اُردو'' کے متعدد ایڈیشن نکلے اور ہر ایڈیشن میں ترمیم و اصلاح و اضافہ ہوتا رہا۔ ہاشمی مرحوم نے انھیں خطوط پر ''مدارس میں اُردو'' بھی لکھی۔ ڈاکٹر زور کی ''اُردو شہ پارے'' دکنیات کی دوسری اہم کتاب ہے۔ یہ ۱۹۲۸ء میں مرتب اور ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی۔ اس میں نہ صرف نمونے دیے گئے ہیں بلکہ ادیبوں کے حالات بھی ہیں۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ہاشمی اور ڈاکٹر زور کے بیانات میں کہیں کہیں تاریخی تصحیح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے لیکن ان دونوں علما کی تصانیف کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

''دکن میں اُردو'' پہلی علاقائی تاریخ ادب ہے۔ اس کی تقلید میں مختلف علاقائی تاریخیں وجود میں آئیں۔ دوسری اہم علاقائی تاریخ ''پنجاب میں اُردو'' ہے۔ اس کتاب کی اہمیت تاریخ ادب کی نہیں لسانیاتی ہے۔ اس میں آغاز اُردو کے ایک اہم نظریے کو پیش کیا گیا۔ علاقائی ادب کی تاریخ کی حیثیت سے یہ ناقص اور نامکمل ہے۔ محمود شیرانی اہم محقق ہیں لیکن اس کتاب میں ان کی تحقیق پایۂ اعتبار سے گری ہوئی ہے۔ وہ بابا فرید شکر گنج، خسرو، کبیر اور کس کس کے لیے غیر ثقہ بیاضوں اور افسانوی روایتوں پر بھروسا کر لیتے ہیں۔ ''پنجاب میں اُردو'' میں خسرو اور کبیر کیوں در آ گئے اور بیسویں صدی کے ادیب کیوں خارج رہے چنانچہ اقبال کا کہیں نام ہی نہیں۔ دراصل یہ کتاب شیرانی کی ابتدائی کوشش تھی جو لسانی اعتبار سے اہم ہے لیکن تاریخ ادب کے طور پر قطعی نامعتبر ہے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں دو اصحاب نے شعرالہند کے نظریے کو پروان چڑھایا۔ ابواللیث صدیقی نے لکھنؤ کا دبستان شاعری (طبع ۱۹۴۴ء) اور نورالحسن ہاشمی نے دلی کا دبستان شاعری (تکمیل ۱۹۴۳ء) کے عنوان سے تحقیقی مقالے لکھے۔ ان میں نہ صرف دلی و لکھنؤ کے دبستانوں کی واضح تشکیل کی گئی ہے، بلکہ ان علاقوں کے شعرا کے مفصل حالات بھی لکھے گئے ہیں۔ چونکہ ہم ان کے ساتھ جدید تحقیقی دور میں داخل ہو جاتے ہیں، اس لیے ان کارناموں کو تحقیقی اعتبار سے قابل قدر ہونا ہی چاہیے۔

علاقائی تاریخوں کی طرح اصناف ادب کی تاریخیں بھی ادب کے ایک جز کو پیش کرتی ہیں۔ آزادی سے پہلے اصناف پر کم توجہ کی گئی۔ انیسویں صدی میں اُردو صحافت کی ایک کلاسیکی تاریخ محمد اشرف کی ''اختر شہنشاہی'' (۱۸۸۸ء لکھنؤ) وجود میں آئی لیکن صحافت کو صنف ادب نہیں مانا جاتا۔ ادبیات میں پرانے انداز کی دو کتابیں جلال الدین احمد جعفر زینبی کی ''تاریخ قصائد اُردو'' اور تاریخ مثنویات اُردو تھیں ان میں تاریخ، نیز ادیبوں کے حالات کا عنصر بہت کم تھا۔ امیر احمد علوی کا کتابچہ مثنویات (۱۹۳۶ء) ان سے بہتر تھا اور ان سے بھی اچھی کتاب پروفیسر عبدالقادر سروری کی ''اردو مثنوی کا ارتقا'' ۱۹۳۶ء تھی۔ یہ کتاب ایک لحاظ سے علاقائی بھی تھی، کیونکہ زیادہ تر دکنی مثنوی کا جائزہ لیا گیا تھا۔ ''دربار حسین'' مرثیہ گویوں کی تاریخ ہے۔

الہ آباد کی یونیورسٹی میں استاذی سید رفیق حسین نے اُردو غزل کی نشوونما پر ۱۹۴۲ء میں اُردو کی پہلی پی ایچ ڈی کی۔ اس میں حالات سے زیادہ تنقیدی پہلو پر توجہ کی گئی اور اس طرح افراد کی بجائے ایک صنف کو مرکز توجہ بنایا گیا۔ کلیم الدین احمد کی کتاب ''اُردو اور فن داستان گوئی'' خالص تنقیدی ہے۔ راقم الحروف نے اُردو کی نثری داستانوں پر تحقیقی مقالہ لکھا، جو ۱۹۴۲ء میں مکمل ہوا اور نقلیں تیار کرا کے جون ۱۹۴۷ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں داخل کر دیا گیا۔ اس پر ۱۹۴۸ء کے اوائل میں ڈگری ملی۔ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے، آزادی سے قبل کسی اور مصنف پر کوئی قابل قدر تحقیقی کام وجود میں نہیں آیا۔

تاریخ ادب کو مکمل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اور دوسرے درجے کے ہر ادیب کے بارے میں کم از کم ایک اچھی تحقیقی و تنقیدی کتاب وجود میں آ جائے۔ آزادی سے پہلے ادبی شخصیات پر بہت کم کام ہوئے ہیں۔ تحقیقی اعتبار سے ان میں سرفہرست غالب ہیں جن پر انیسویں صدی ہی میں حالی نے ''یادگار غالب'' لکھی۔ یہ کتاب ۱۸۹۶ء میں لکھی گئی اور اگلے سال شائع ہوئی۔ حالی ہی نے ۱۹۰۱ء میں سرسید کی سوانح ''حیات جاوید'' لکھی جو اُردو میں لکھی جانے والی پہلی بھرپور سوانح ہے۔ غالب پر دوسری نہایت اہم کتاب غلام رسول مہر کی ''غالب'' ہے جو ۱۹۳۵ء میں یا اس سے بھی پہلے وجود میں آئی۔ یہ بڑی حد تک ایک مستند سوانح عمری ہے۔ غالب پر تیسری اہم تحقیقی کتاب شیخ محمد اکرام کی ''غالب نامہ'' (۱۹۳۶ء) ہے جس کا نقش ثانی ''آثار غالب'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس کتاب کی اہمیت تحقیق سے زیادہ تنقید غالب میں ہے۔ مالک رام کی ''ذکر غالب'' ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی اور یہ ایک معتبر تحقیقی کاوش ہے۔

آزادی سے قبل افراد پر لکھی جانے والی کتابوں میں نہایت اہم شیخ چاند مرحوم کی کتاب ''سودا'' ہے جو ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب جدید تحقیقی مقالوں کے انداز پر لکھی گئی ہے اور اسی نے بعد میں لکھے جانے والے مقالوں کے لیے مثال کا کام دیا۔ اس میں پہلا باب سیاسی و سماجی پس منظر کا ہے جو اُردو کے

سندی تحقیقی مقالوں کے لیے اس طرح ضروری ہو گیا ہے جیسے غزل کے لیے مطلع۔ بہر حال اس ابتدائی دور میں شیخ چاند نے بڑے معرکے کا کام کیا۔ کلیات سودا میں جو دوسروں کی مثنویاں اور مرثیے داخل ہو گئے تھے، پہلی بار شیخ چاند نے ان کی نشاندہی کی اور وہ آج تک درست مانی جاتی ہے۔ منفرد ادیبوں پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں جن میں بعض بہت پائیدار ہیں۔ مختلف کتب کی ایک سرسری فہرست ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

حیات سلطان محمد قلی قطب شاہ	ڈاکٹر زور	
نصرتی	عبدالحق	۱۹۴۱ء
ولی گجراتی	ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی	
سرگذشت حاتم	ڈاکٹر زور	
میخانہ درد	میر ناصر نذیر فراق	طبع ۱۳۴۴ھ
اُردو کا سب سے بڑا شاعر اور محسن (مصحفی)	عبدالصمد صارم	۱۹۴۳ء
زندگی بے نظیر	عبدالغفور شہباز	۱۹۰۰ء
یادگار ذوق	ظہور الدین وحشی	بیسویں صدی کی ابتدا میں
یادگار انیس	امیر احمد علوی	
حیات دبیر	افضل حسین ثابت لکھنوی	۱۹۱۳ء
یادگار امیر مینائی	میکش تھانوی	۱۹۰۳ء حیدرآباد
سوانح امیر مینائی مع کارنامہ امیر مینائی	جلیل مانکپوری	۱۳۴۷ھ
دبدبہ امیری	سید محمد عبدالحکیم حکمت	۱۹۳۷ء
امیر مینائی	ممتاز علی آہ	۱۹۴۱ء
جلوہ داغ	احسن مارہروی	۱۹۰۲ء
آئینہ داغ	محمد نثار علی شہرت	۱۹۰۵ء
داغ	نور اللہ محمد نوری	۱۳۵۵ھ
جلیل مرحوم	محمد امام امامی	۱۳۲۶ھ بنگلور
حفیظ جون پوری	کامل بی اے	۱۹۳۹ء
تذکرہ شمس العلما حافظ نذیر احمد	محمد مہدی بمبئی	
حیات النذیر	مولوی افتخار عالم مارہروی	
اُردو کا پہلا ناول نگار (نذیر احمد)	محمد اویس احمد ادیب	۱۹۳۳ء
حیات شبلی	سید سلیمان ندوی	۱۹۴۳ء
شبلی نامہ	شیخ اکرام	۱۹۴۶ء
تذکرہ محسن	امین زبیری	۱۹۳۵ء
تذکرہ وقار	امین زبیری	۱۹۳۸ء
وقار حیات	مولوی اکرم اللہ خان ندوی	
حیات محسن (محسن الملک)	محمد امین زبیری	۱۹۳۴ء
سجاد حیدر یلدرم	مبارز الدین رفعت	۱۹۴۶ء
سیرت محمد علی	رئیس احمد جعفری	۱۹۳۲ء

اکبرالہ آبادی	طالب الہ آبادی	ـــــ
بزم اکبر	قمر بدایونی	ـــــ
سیرت اقبال	طاہر فاروقی	ـــــ
ذکر اقبال	خواجہ عبدالمجید سالک	ـــــ
روح اقبال	ڈاکٹر یوسف حسین خان	۱۹۴۳ء

مندرجہ بالا فہرست میں نصرتی، ولی، نظیر، دبیر، امیر مینائی، نذیر احمد، شبلی، اکبر اور اقبال کی بہت اچھی سوانح شامل ہیں، جو آزادی کے بعد کے تحقیقی کارناموں کے معیار کی ہیں۔ کئی رسالوں نے افراد کے بارے میں اچھے نمبر نکالے، جن میں ذیل کے شمارے مشہور ہیں:

نیرنگ دہلی	چکبست نمبر	مارچ ۱۹۴۳ء
زمانہ	پریم چند نمبر	تاریخ ندارد لیکن پریم چند کی وفات کے فوراً بعد
نیرنگ خیال	اقبال نمبر	۱۹۳۲ء
جوہر اقبال	جوہر کا اقبال نمبر	۱۹۳۸ء
اُردو	اقبال نمبر	۱۹۳۸ء
نگار	نظیر نمبر	۱۹۴۰ء

رسالوں کے رواج کے ساتھ مضمون، انشائیے یا مقالے کا بھی فروغ ہوتا گیا ہے۔ ہر قسم کے موضوع پر مضامین لکھے گئے۔ بعض اوقات کسی مضمون کی اہمیت کتاب سے کم نہیں ہوتی۔ تحقیق کے متعلق بھی بہت سے مضامین لکھے گئے۔ انھیں کے ساتھ خطبات اور مقدمات کو بھی لے لیجیے۔ اُردو کے تحقیقی خطبات اور مقالات کا آغاز اول گارساں دتاسی ہے جس نے فرانس کی شیریں زبان میں اُردو ادب پر رطب اللسانی کی۔ خطبات گارساں دتاسی کا فرنچ سے اُردو میں کئی حضرات نے ترجمہ کیا۔ اس پر مولوی عبدالحق نے مقدمہ لکھا اور نیز شیخ چاند نے حواشی لکھے۔ مقالات کا اُردو ترجمہ ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔ ان میں مواد اور ناموں کی بھرمار ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ تحقیقی حزم واحتیاط سے آشنا نہ تھا۔ اس کے یہاں ہمالیائی اغلاط ہیں اور بکثرت ہیں۔ وہ جو معلومات فراہم کرتا ہے، ان کی جب تک کسی دوسرے ماخذ سے توثیق نہ کر لی جائے ان پر باور نہیں کیا جا سکتا۔ دتاسی کے علاوہ تحقیقی تحریروں کے کچھ مجموعے یہ ہیں، ضروری نہیں کہ ان میں ہر مضمون تحقیقی ہو۔ بعض کا موضوع تحقیق ہوگا، بعض کا کچھ اور۔

نقوش سلیمانی	سید سلیمان ندوی	ـــــ
دکنی کے چند تحقیقی مضامین	نصیرالدین ہاشمی	ـــــ
مقالات ہاشمی	نصیرالدین ہاشمی	ـــــ
مقدمات عبدالحق	عبدالحق	۱۳۵۶ھ
خطبات عبدالحق حصہ اول	عبدالحق	۱۹۳۹ء
خطبات عبدالحق حصہ دوم	عبدالحق	۱۹۴۴ء
مقالات شیروانی	حبیب الرحمٰن خان شیروانی	مرتبہ محمد مقتدا خان شیروانی ۱۹۴۶ء علی گڑھ
مقالات شیرانی	محمود شیرانی	طبع اول ۱۹۶۸ء
مقالات حافظ محمود شیرانی، ۶ جلدیں	محمود شیرانی	مجلس ترقی ادب، لاہور

آزادی سے پہلے ملک میں معرکے کے اُردو رسالے نکلے۔ ان کے ایڈیٹروں کی ادبی شخصیت جتنی قدرآور تھی بعد کے ایڈیٹر ان سے کچھ کم ہی رہیں گے۔ ہر اچھے رسالے میں گاہے گاہے تحقیقی مضامین بھی آتے رہتے تھے۔ کچھ ایسے پرچے تھے جن میں یہ رنگ شوخ تھا۔ ابتدائی پرچوں میں مخزن اور حسرت موہانی کے اُردوئے معلی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ سہ ماہی اُردو بنیادی حیثیت سے تحقیقی رسالہ تھا۔ یہ پہلے اورنگ آباد سے نکلتا تھا، بعد میں انجمن کے ساتھ دہلی چلا آیا۔ مولوی

صاحب دکنیات میں جو دریافت کرتے تھے اس کا تعارف پہلے رسالہ اُردو میں کراتے تھے۔ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کا سہ ماہی رسالہ "ہندوستانی" بھی زبان و ادب کی تحقیق کا رسیا تھا۔ ان کے علاوہ اودھ پنچ، دکن ریویو، نقاد، معارف، نگار، ساقی، علی گڑھ منتھلی، نیرنگ خیال اور ادبی دنیا میں کبھی کبھی تحقیقی مضامین نکلتے تھے۔

فارسی کا وہ جو مصرع ہے۔ خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود۔ اس کا اطلاق رسالہ "کارواں" پر ہوگا، جو محمود شیرانی کی ادارت میں سال میں صرف ایک بار ظاہر ہوتا تھا۔ اس کے محض دو سال نامے ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۴ء میں نکلے۔ ۱۹۳۳ء کے پرچے میں شیرانی کا تاریخ ساز مضمون "چار درویش" نکلا، جس میں انھوں نے ثابت کیا کہ امیر خسرو چار درویش کے مصنف نہیں۔ شیرانی کو محمد علی معصوم خاں کا نسخہ چار درویش مل گیا تھا۔ انھوں نے بڑی عجلت کے ساتھ چار درویش کی تصنیف کا سہرا محمد علی کے سر باندھ دیا، جو غلط ہے کیونکہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی لائبریری میں چار درویش کا ایسا فارسی نسخہ موجود ہے جو محمد علی سے تقریباً ۲۵ سال پہلے کا مکتوبہ ہے اور جس کے ترقیمے میں قصے کا نام اسی طرح دیا ہے جیسے یہ نام پہلے سے مشہور ہو۔

کتابوں اور رسالوں کی طرح کتب خانوں کی وضاحتی فہرستیں بھی تحقیق کا گنجینہ ہوتی ہے۔ وضاحتی فہرست بسا اوقات مخطوطات کی ہوتی ہے۔ مرتب فہرست نہ صرف مخطوطے کی تفصیلات فراہم کرتا ہے بلکہ اس کے دوسرے نسخوں اور ترجموں کی بھی تفصیل دیتا ہے۔ مستشرقین نے اس سلسلے میں اہم کام کیا ہے۔ اُردو تحقیق کے لیے جو فہرستیں زیادہ مفید ہیں اور جن کی تیاری میں تحقیقی نظر سے کام لیا گیا ہے، وہ یہ ہیں:

1. A Descriptive Catalogue of the Oriental Library of the late Tipu Sultan of Mysore. By C. Stewart, 1809 A.D.
2. Catalogue of the Arabic, Persian, Hindustani manuscripts in the Library of Kings of Oudh. By Springer, 1854 A.D.

۳۔ برٹش میوزیم فارسی مخطوطات کی وضاحتی فہرست۔ از ڈاکٹر چارلس ریو۔

۴۔ برٹش میوزیم ہندی پنجابی ہندوستانی (اُردو) مخطوطات کی وضاحتی فہرست از بلوم ہارٹ۔

۵۔ انڈیا آفس فارسی مخطوطات کی وضاحتی فہرست۔ از اتھے۔

۶۔ انڈیا آفس ہندوستان مطبوعات کی فہرست۔ از بلوم ہارٹ۔

۷۔ بورڈلین لائبریری آکسفورڈ فارسی مخطوطات کی وضاحتی فہرست از اتھے اور سخاؤ۔

۸۔ انڈیا آفس ہندوستان مطبوعات کی فہرست۔

۹۔ برٹش میوزیم ہندوستانی مطبوعات۔ از بلوم ہارٹ۔

۱۰۔ انڈیا آفس فارسی مطبوعات۔

۱۱۔ کیمبرج یونیورسٹی فارسی مخطوطات کی فہرست۔ از براؤن۔

۱۲۔ سپلیمنٹ ہندوستانی مطبوعات برٹش میوزیم۔ از بلوم ہارٹ۔

۱۳۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال لائبریری فارسی مخطوطات۔

۱۴۔ خدا بخش لائبریری بانکی پور کے مخطوطات کی فہرست۔ از خان بہادر عبدالمقتدر اور کمال الدین احمد۔

۱۵۔ گورنمنٹ اورینٹل لائبریری مدراس کے مخطوطات کی فہرست۔

مندرجہ بالا تمام فہرستیں انگریزی میں ہیں۔ اُردو میں صرف دو فہرستیں تحقیقی اعتبار سے قابل ذکر ہیں۔

۱۶۔ یورپ میں دکھنی مخطوطات از نصیر الدین ہاشمی۔ حیدر آباد۔ ۱۹۳۲ء۔

۱۷۔ ادارہ ادبیات اُردو کے مخطوطات کی فہرست۔ از ڈاکٹر زور جلد اول ۱۹۴۳ء مطابق ۱۳۶۲ھ باقی جلدیں آزادی کے بعد شائع ہوئیں۔

ان فہرستوں میں برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کی فہرستیں نیز یورپ کی دکھنی مخطوطات، تحقیق کا خزانہ ہیں۔

تحقیق کی ایک نہایت اہم شاخ ترتیب متن ہے۔ پرانے متنوں میں دوسروں کی تحریریں الحاق کر جاتی تھیں۔ مصنف کی بعض غیر مطبوعہ تحریریں شامل ہونے سے رہ جاتی تھیں۔ مصنف کی واقعی نگارشات میں بھی بعض اوقات تحریف ہو جاتی تھیں۔ مخطوطات کو صحیح پڑھنا مشکل ہوتا ہے۔ ایک ہی متن کے مختلف نسخوں میں۔۔۔

اختلافات پائے جاتے ہیں۔ محقق کا کام ہے کہ ایک قابل اعتبار متن تیار کرے۔ اس کی راہ میں دشواریاں ہوتی ہیں۔ صحیح مآخذ دست یاب نہیں ہوتے، پھر بھی جو کچھ ہے، اس کی بناء پر نظر تحقیق سے کام کرنا ہوتا ہے۔ آزادی کے بعد اس نوع کے متعدد کام کیے گئے۔ لیکن آزادی سے پہلے بھی اُردو کا دامن تہی نہیں۔ اس دور میں جتنے غیر مطبوعہ اہم متن پہلی بار پیش کیے گئے، اتنے آزادی کے بعد نہیں۔ دکنیات کا بیشتر حصہ آزادی سے پہلے ہی ہمارے سامنے لایا گیا ہے۔ اس کی ترتیب مثالی نہیں تھی لیکن نا قابل اطمینان بھی نہ تھی۔

مثالی ترتیب میں مرتب کو ایک سیر حاصل مقدمہ لکھنا چاہیے۔ اس کے بعد صحیح متن کی بازتعمیر کرنی چاہیے۔ اختلافات نسخ درج کر کے حواشی دے جائیں۔ اختلافات نسخ محض محنت کا کام ہے لیکن مقدمے اور حواشی مرتب کے مبلغ علم کی غمازی کرتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ اس مثالی معیار پر دو چار متنوں کی ترتیب ہی سرخرو ہوگی۔ لیکن کسی نے اچھا متن ہی تیار کر کے چھاپ دیا تو بڑی خدمت ہے۔ ذیل میں آزادی سے قبل کی ترتیب متن کی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔ ان میں اس قسم کے کام شامل نہیں جن میں کسی متن کو بے احتیاطی سے محض چھاپ دیا گیا ہو۔

نام	مصنف	مرتب	مثنویاں
ابراہیم نامہ	عبدل	ڈاکٹر زور	ــــــ
ارشاد نامہ	ــــــ	ڈاکٹر زور	ــــــ
قطب مشتری	وجہی	عبدالحق	۱۹۳۹ء
سیف الملوک و بدیع الجمال	غواصی	میر سعادت علی رضوی	۱۹۳۸ء
طوطی نامہ	غواصی	میر سعادت علی رضوی	۱۳۵۷ھ
پھول بن	ابن نشاطی	عبدالقادر سروری	۱۳۵۷ھ
گلشن عشق	نصرتی	عبدالحق	ــــــ
قصہ بے نظیر	ضنعتی	عبدالقادر سروری	ــــــ
قصہ ملکہ مصر	محمد علی عاجز	سید محمد	ــــــ
مثنویات میر	میر	سرشاہ سلیمان	ــــــ
مثنویات میر	میر	سید محمد	ــــــ
بحرالمحبت	مصحفی	عبدالماجد دریابادی	۱۹۲۲ء
مثنوی خواب و خیال	میر اثر	عبدالحق	۱۹۲۶ء
مثنوی گلزار نسیم مع دیوان نسیم	نسیم	چکبست۔ بیسویں صدی کی ابتداء	
زہر عشق	شوق لکھنوی	مجنوں گورکھپوری	۱۹۳۰ء
مرثیے			
مراثی میر انیس ۳ جلدیں	انیس	حیدر علی نظم طباطبائی نظامی پریس بدایونی ۲۴ تا ۳۰ء	
روح انیس	انیس	مسعود حسن رضوی	۱۹۳۱ء
شاہکار انیس	انیس	مسعود حسن رضوی	۱۹۴۳ء
دیوان، کلیات اور ان کے انتخابات			
کلیات قلی قطب شاہ	قلی قطب شاہ	ڈاکٹر زور	۱۹۴۰ء
دیوان عبداللہ قطب شاہ	عبداللہ قطب شاہ	سید محمد	۱۹۳۹ء
کلیات ولی	ولی	احسن مارہروی	۱۹۲۷ء

کلیات ولی	ولی	نورالحسن ہاشمی	۱۹۴۵ء
دیوان ولی	ولی	حیدر ابراہیم سایانی	
دیوان فائز	فائز دہلوی	مسعود حسن رضوی	۱۹۴۶ء
کلیات سراج	سراج اورنگ آبادی	عبدالقادری سروری	۱۹۴۰ء
انتخاب سراج	سراج اورنگ آبادی	عبدالقادری سروری	
کلیات بحری	قاضی محمود بحری	ڈاکٹر حفیظ سید	۱۹۳۹ء
نادرات شاہی	شاہ عالم	عرشی	۱۹۴۴ء
مہتاب سخن	لالہ مہتاب رائے	عبدالقادر سروری	
انتخاب کلام میر	میر	عبدالحق	۱۹۲۱ء
دیوان خواجہ میر درد	میر درد	حبیب الرحمٰن خان شیروانی	۱۹۲۲ء
دیوان اثر	میر اثر	تقی الدین احمد حیدرآباد	۱۹۲۹ء
دیوان اثر	میر اثر	عبدالحق علی گڑھ	۱۹۳۰ء
دیوان یقین	انعام اللہ خان یقین	فرحت اللہ بیگ	۱۹۳۰ء
دیوان تاباں	تاباں	مولوی عبدالحق	——
دیوان جوشش	جوشش عظیم آبادی	عبدالودود	۱۹۴۱ء
دیوان بیدار	میر محمدی بیدار	جلیل قدوائی	۱۹۳۷ء الہ آباد
دیوان بیدار	میر محمدی بیدار	محمد حسین محوی صدیقی	۱۹۳۵ء
دیوان غالب	غالب	نظامی بدایونی	——
نسخہ حمیدیہ	غالب	انوار الحق	۱۹۲۱ء
انتخاب غالب	غالب	عرشی	۱۹۴۲ء
داستان			
سب رس	وجہی	عبدالحق	——
باغ و بہار	میر امن	عبدالحق	——
داستان رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی	انشا	عبدالحق	۱۹۳۳ء
قواعد			
دریائے لطافت	انشا و قتیل	عبدالحق	۱۹۱۶ء
دریائے لطافت اردو ترجمہ	انشا و قتیل	مترجم پنڈت کیفی	۱۹۳۵ء
خطوط			
مکاتیب غالب	غالب	عرشی	۱۹۳۷ء
خطوط غالب	غالب	مہیش پرشاد	۱۹۴۱ء
بیگمات اودھ کے خطوط	——	مفتی انتظام اللہ شہابی	۱۳۶۶ھ
خطوط سرسید	سرسید	سر راس مسعود	۱۹۲۴ء
خطوط منشی امیر احمد	امیر مینائی	احسن اللہ خان ثاقب	۱۹۱۰ء

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی

معروف شعر ہے اور نسخۂ آسی میں اسی طرح ہے، مگر نسخۂ جانسن میں پہلا مصرع یوں ہے:

گل پھینکے ہے عالم کی طرف بلکہ ثمر بھی

متن کی بہت سی تبدیلیاں کتاب کے بار بار چھپنے کا نتیجہ بھی ہوتی ہیں۔ اب یہ طے کرنا تو مشکل ہے کہ ایسی تبدیلیاں محض اغلاط کتابت ہیں یا کسی مصحح کا قلم بھی ذمے دار ہے، تبدیلیاں بہر حال ہیں۔ اکثر کتابوں کی اولین اشاعتیں یا اہم اشاعتیں بہ آسانی نہیں ملتیں، اس لیے دست یاب ایڈیشنوں سے ہی کام لیا جاتا ہے (یہ بڑی مجبوری ہے) اور اس صورت میں متن کی ایسی تبدیلیوں کا نقل ہوتے رہنا بھی لازم ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے میرا خیال ہے کہ ایک ہی مثال کافی ہے۔

آتش کا کلیات پہلی بار ۱۲۶۱ھ میں شائع ہوا تھا، اس کی تصحیح خود آتش ؒ نے کی تھی۔ (مطبوعہ نسخے کے سرورق پر اس کی صراحت کی گئی ہے) دوسری بار یہ ۱۲۶۸ھ میں چھپا تھا اضافہ کلام کے ساتھ۔ اب یہ دونوں اشاعتیں کمیاب ہیں۔ مطبع نول کشور سے یہ کئی بار چھپا ہے۔ اس پریس کی اشاعت ۱۹۲۹ء میرے سامنے ہے۔ اس کے بعض اختلافات متن کی نشاندہی کی جاتی ہے:

نول کشوری نسخہ (۱۹۲۹ء)	اشاعت اول (۱۲۶۱ھ)
کسی کی محرم آب رواں کی یاد آئی	کسی محرم آب رواں وہ یاد آئی
حباب کے جو برابر کوئی حباب آیا	حباب کے جو برابر بھی حباب آیا
عود کرنے کی نہیں روح، نکل کر تن سے	عود کرنے کی نہیں ------
پھر نہ آباد یہ گھر ہوگا، جو ویراں ہوگا	پھر نہ ہوگا یہ گھر آباد، جو ویراں ہوگا

یہ مستغرق تصور میں ہوئیں اس طاق ابرو کی
یہ مستغرق تصور میں ہوئے اس طاق ابرو کے

....

پھریں اپنی نگاہیں جس طرف، کعبہ ادھر دیکھا
پھریں اپنی نگاہیں جس طرف، کعبہ ادھر دیکھا

....

بدبیں کو اپنی بزم میں اے دل جگہ نہ دے
بدبیں کو اپنی بزم میں اے دل جگہ نہ دے

....

پتھر کو کاٹتی ہے یہ کافر نظر کی چوٹ
پتھر کو توڑتی ہے یہ کافر نظر کی چوٹ

ہاں، یہ بھی عرض کروں گا کہ کلیات آتش کی اشاعت ثانی میں جو زائد کلام ہے (اشاعت اول کے مقابلے میں) وہ اس نول کشوری ایڈیشن سے غیر حاضر ہے۔ یہ ایک اور پہلو ہوا۔ ایسے اختلافات کی بہت مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

بہت سے معروف اشعار جس طرح زبان زد ہیں، دواوین کے موجودہ قابل ذکر نسخوں میں وہ اس طرح نہیں ملتے اور جب تک آداب تدوین کی مکمل پابندی کے ساتھ اہم دواوین شائع نہ ہوں، اس وقت تک ایسے اشعار کے متعلق قطعی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے مثلاً میر کا ایک معروف شعر اس طرح سننے میں آتا ہے:

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا   آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

ڈاکٹر یوسف حسین خان کی کتاب اُردو غزل میں بھی یہ شعر اسی طرح ہے (اشاعت ثانی ص ۴۲۷) مگر کلیات میر مرتبہ آسی میں پہلا مصرع یوں ملتا ہے۔ ''راہ دور عشق سے روتا ہے کیا'' بظاہر یہی متن مرجع مانا جائے گا (کلام میر کا ایک اہم مطبوعہ نسخہ وہ بھی ہے جسے نسخۂ فورٹ ولیم کالج کہا جاتا ہے مگر وہ نایاب کی حد تک کم یاب

ہے میں اس سے استفادہ نہیں کر سکا) مگر یہ مسئلہ رہے گا غور طلب۔

میر کا ایک شعر اس طرح زبان زد ہے۔

سرہانے میر کے آہستہ بولو ابھی وہ روتے روتے سو گیا ہے

آب حیات مطبوعہ ۱۸۹۹ء میں بھی اسی طرح ہے (ص ۱۵۱) اس کی اشاعت دوازدہم بھی پیش نظر ہے۔ (مطبوعہ اتحاد پریس لاہور) اس میں بھی اسی طرح ہے (ص ۱۶۵) لیکن کلیات میر کے نسخہ آسی (ص ۲۰۷) میں اس کی صورت یہ ہے۔

سرہانے میر کے کوئی نہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

یہاں بھی نسخہ آسی کا متن مرجع ہے اور فی الحال اسی کو مرجع مانا جائے گا۔ مگر یہ ضرور ہے کہ جب تک کسی نئے مرتب شدہ نسخے میں اختلاف نسخ کی تفصیلات کے ساتھ ایسے اشعار کا اندراج نہ ہو، اس وقت تک الجھن تو رہے گی۔

اس سے ذرا مختلف صورت بھی دیدنی ہے۔ ذوق کا ایک معروف شعر اس طرح سننے میں آتا ہے۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

دیوان ذوق مرتبہ حافظ ویران و ظہیر و انور میں بھی اسی طرح ہے (ص ۱۳۹) یادگار غالب میں بھی اسی طرح نقل کیا گیا ہے (یادگار غالب مطبوعہ نامی پریس کانپور سال طبع ۱۸۹۷ء ص ۔۸۲) مگر دیوان ذوق مرتبہ آزاد میں یہ اس طرح ملتا ہے۔

اب تو گھبرا کہ یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مر گئے پر نہ لگا جی تو کدھر جائیں گے (ص ۲۳۸)

ساقیا عید ہے لا بادہ سے مینا بھر کے
کہ مے آشام پیاسے ہیں مہینا بھر کے

ذوق کا یہ شعر نسخہ ویران میں اسی طرح ملتا ہے (ص ۱۳۲) لیکن دیوان ذوق مرتبہ آزاد میں یہ اس طرح ملتا ہے۔

ساقیا عید ہے، لا بادہ سے مینا بھر کے
کہ پیاسے ہیں مے آشام مہینا بھر کے (ص ۲۲۲)

اور مولانا عبدالحی کی کتاب گل رعنا میں اس کی شکل اور بدلی ہوئی ملتی ہے، اس طرح:

ساقیا عید ہے، لا ساغر و مینا بھر کے...... بادہ آشام پیاسے ہیں مہینا بھر کے (طبع چہارم، ص ۱۹۵)

ذوق کا ایک اور شعر نسخہ ویران میں اس طرح چھپا ہوا ہے:

کھل کے گل کچھ تو بہار اپنی صبا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے (ص ۱۳۹)

اور نسخہ آزاد میں اس کی صورت یہ ہے:

گل بھلا کچھ تو بہاریں اے صبا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے (ص ۲۸۳)

ذوق کی ایک معروف غزل کے دو اشعار:

ہم سا بھی اس بساط پہ کم ہوگا بد قمار
جو چال ہم چلے وہ بہت ہی بری چلے

ہو عمر خضر بھی تو ہو، معلوم وقت مرگ
ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے

نسخۂ ویران میں یہ اسی طرح ہیں (ص ۱۳۱) اور آزاد کے مرتب کردہ دیوان میں اس طرح ہیں:

کم ہوں گے اس بساط پہ ہم جیسے بد قمار
جو چال ہم چلے سو نہایت بری چلے
ہو عمر خضر بھی تو کہیں گے بوقت مرگ
ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے (ص ۲۴۸)

ایک اور بات، نسخۂ آزاد میں اس غزل میں آٹھ شعر ہیں اور نسخۂ ویران میں چار شعر ہیں۔ یہ بھی اہم اختلاف ہوا۔

اس طرح کے اختلافات بہت ہیں۔ ان چند مثالوں سے اس بات کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نقلِ اشعار میں کس قدر احتیاط کرنا چاہیے اور یہ کہ اس طرح کے اختلافات کا علم ضرور ہونا چاہیے۔ مثلاً ایک شخص کلامِ ذوق کے سلسلے میں نسخۂ ویران کو ترجیح دیتا ہے اور اسی سے اشعار نقل کرتا ہے۔ اس کو اس کا حق ہے، مگر یہ ضروری ہے کہ اس کو اختلافِ متن کا علم ہو، تا کہ ان سے بے خبری کی بناء پر غلطیاں نہ ہوں۔ تاریخ ادب اُردو اور انتخابات کے مجموعوں سے، جہاں تک ممکن ہو، اشعار نقل نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اصلی مجموعوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے، اگر ایسے قدیم یا جدید مجموعے موجود ہوں، مثلاً کلامِ ذوق کے دو قدیم مجموعے موجود ہیں اور ایک جدید کلیات چھپا ہے، تو اب ذوق کے اشعار دوسرے انتخابات یا تاریخوں سے منقول نہیں ہونا چاہئیں، کیونکہ متن کے اختلافات پریشان کن ثابت ہوں گے۔ میں ایک مثال سے اس کی وضاحت کرنا چاہوں گا۔

آزاد نے آبِ حیات میں ناسخ کے حالات میں لکھا ہے:

"ابھی دنوں کا ایک مطلع شیخ صاحب کا ہے۔ خواجہ صاحب کے سامنے کسی نے پڑھا اور انھوں نے لطفِ زبان کی تعریف کی۔

جنوں پسند ہے مجھ کو ہوا ببولوں کی
عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

(آبِ حیات، مفید عالم پریس لاہور۔ ص ۳۴۴)

لیکن کلیاتِ ناسخ میں یہ اس طرح ہے ملتا ہے:

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی
عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

ناسخ کا کلیات پہلی بار ذوالحجہ ۱۲۵۸ھ (۱۸۴۲ء) میں مطبع محمدی لکھنؤ سے شائع ہوا تھا اور دوسری بار لکھنؤ کے مطبع مولائی میں ۱۲۶۲ھ (۴۶-۱۸۴۵ء) میں چھپا تھا۔ دونوں اشاعتیں پیشِ نظر ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی سلسلے میں اس شعر کو آبِ حیات سے نقل کرے گا تو وہ اختلافاتِ متن کے سلسلے میں جواب دہ ہوگا، کیونکہ کلیاتِ ناسخ کے مذکورہ مجموعوں کے مقابلے میں تعینِ متن کے لحاظ سے آبِ حیات کو قابلِ قبول نہیں قرار دیا جا سکتا۔ نصاب کی کتابیں جو لوگ مرتب کرتے ہیں، ان میں سے اکثر حضرات یہی ستم ڈھاتے ہیں کہ اصلی مجموعوں کی طرف رجوع کرنے کی بجائے آسان پسندی کے پھیر میں آ کر پہلے کے شائع شدہ انتخابات سے یا ایسے دوسرے ثانوی یا غیر معتبر مآخذ سے نثر و نظم کے اجزاء نقل کر لیا کرتے ہیں۔ یہ نہایت درجہ غلط طریق کار ہے اور ایک وجہ یہ بھی ہے نصابی کتابوں میں اغلاط کی بھرمار کی۔ اصولِ تدوین کے لحاظ سے یہ طریق کار حد درجہ قابلِ اعتراض ہے۔ عام طلبا یا عام پڑھنے والوں سے یہاں بحث نہیں، مگر تحقیق کے طلباء کے ذہن میں یہ بات رہنی چاہیے کہ انتخابات نصابی ہوں یا غیر نصابی یا اس طرح کے اور مآخذ ان کے متن کو سند اور ثبوت کے طور پر اس وقت تک پیش نہیں کیا جا سکتا، جب تک کہ معتبر نسخوں سے اس کا مقابلہ نہ کر لیا جائے۔

ایسی کتابیں موجود ہیں جو یکسر جعلی ہیں یا مشکوک واقعات کا گنجینہ ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ بعض مصنفین کو سخن طرازی اور واقعہ آفرینی کا شوق ہوتا ہے اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ کچھ کتابوں میں جو غلطیاں ہیں، ان میں سے اکثر مصنف کے اسی ذوقِ افسانہ تراشی کی مرہون ہیں۔ اول الذکر کتابیں تو قطعاً ناقابلِ اعتنا ہیں۔ مگر یہ ضروری ہے کہ ان کے متعلقات کا علم ہو۔ ورنہ اس کا امکان رہے گا کہ ایک شخص اکثر صورتوں میں غیر معتبر روایات یا الحاقی کلام کو قبول کرنے سے محفوظ رہے اور کسی ایک مقام پر چوک جائے اور اس کی اصل وجہ لاعلمی ہو۔ میں اس کی صرف ایک مثال پیش کروں گا۔

سردار جعفری نے کلامِ میر کا ایک دیدہ زیب انتخاب شائع کیا ہے۔ مرتب نے یہ بھی لکھا ہے کہ "اس انتخاب میں وہ اشعار شامل نہیں کیے گئے ہیں جو غلطی سے میر

کے نام سے مشہور ہیں یا جن کی تصدیق نہیں ہو سکی' (ص ۴۷) اور یہ واقعہ ہے کہ یہ انتخاب الحاقی اشعار سے پاک ہے، مگر اس اہتمام کے باوجود، اس انتخاب کا آغاز ایک جعلی رسالے کی عبارت سے ہوتا ہے جس کا عنوان ہے "میر کو وصیت" یہ رسالہ خواجہ عبدالرؤف عشرت مرحوم نے چھاپا تھا اور غالباً انھی کے نتائج افکار سے ہے، بہر حال میر سے اس رسالے کا کوئی تعلق نہیں۔ اس رسالے کے مندرجات کو میر کے اقوال یا مختارات مان کر، کوئی صاحب نقل کریں یا ان کا حوالہ دیں، تو وہ بھی مبتلائے غلط فہمی ہوں گے اور دوسروں کو بھی اس میں مبتلا کریں گے۔

مشکوک کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ کہیں انتساب کا مسئلہ ہے، کہیں الحاقی کلام کا مسئلہ ہے اور کہیں کچھ اور ایسے مجموعے حوالے کے طور پر قابل قبول ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے، جب تک انتساب سے لے کر صحت متن اور الحاق کلام تک ہر بات قابل قبول حد تک معلوم نہ ہو جائے، اس وقت تک ان کو مآخذ کا درجہ نہیں دیا جانا چاہیے۔ یوں چھاپتے رہے اور بیچتے رہے اور مقالے لکھتے رہے، بیٹھنے سے بیگار بھلی۔ جیسے امیر خسرو سے منسوب ہندی کلام، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے منسوب رسائل وغیرہ۔ عبدالباری آسی مرحوم کے "دریافت کیے ہوئے" کلام غالب کا حال اب سب کو معلوم ہو چکا ہے یا غالب سے منسوب وہ غزل جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ غالب نے کبھی بھوپال کا بھی سفر کیا تھا اور جس کے متعلق بعد کو معلوم ہوا کہ وہ دراصل "اپریل فول" کا تحفہ تھی، مگر جس کو ہمارے بعض اہل قلم نے جوش عقیدت میں فوراً قبول کر لیا تھا ایسے بہت سے کارنامے سامنے آ چکے ہیں، اس لیے مشکوک اجزا کو حوالے کے طور پر نہ استعمال کرنا چاہیے، نہ قبول کرنا چاہیے۔

ستم یہ ہے کہ اس زمانے میں بھی ایسے مجموعے شائع ہو رہے ہیں جو کہ کم احتیاطی کے امانت دار ہیں اور طلبا ان سے دھوکہ کھا سکتے ہیں۔ مثلاً حال ہی میں "ضبط شدہ نظمیں" کے نام سے ایک مجموعہ شائع ہوا ہے جس میں مرتبین کی صراحت کے مطابق وہ نظمیں شامل ہیں، جنھیں ضبط کر لیا گیا تھا۔ مرتبین نے ستم یہ کیا ہے کہ صحت انتساب اور صحت متن کے پھیر میں پڑنے سے امکان بھر اپنے کو محفوظ رکھا ہے۔ کسی نظم کے متعلق یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ وہ کب ضبط ہوئی اور کیا واقعتاً ضبط ہوئی تھی۔ اس طرح ثبوت پیش کرنا پڑتا اور تلاش و تفحص کی وادی میں سرگرداں ہونا پڑتا، اس کی غالباً فرصت نہیں ہوگی اور ضرورت بھی نہیں سمجھی گئی ہوگی۔ صحت متن کا بھی یہی احوال ہے کہ اس کے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کتاب سے یا ایسی اور کتابوں سے بغیر سوچے سمجھے حوالے نہیں دینا چاہیے اور قبول بھی نہیں کرنا چاہیے۔

تیسری قسم میں آب حیات جیسی کتابیں آتی ہیں یا جیسے ذکر میر (وغیرہ) کہ ان کو یکسر رد نہیں کیا جا سکتا، بعض باتوں کے سلسلے میں ان کی حیثیت اولین مآخذ کی ہے۔ ان میں صحیح واقعات بھی ہیں اور افسانے بھی ہیں۔ یہ ضروری ہوگا کہ ایسی کتابوں پر لکھے ہوئے جن واقعات کی تصدیق کا اور ذریعہ نہیں، ان کو لازماً قابل قبول نہ سمجھا جائے۔ یہی صورت انتساب کلام اور صحت متن کی ہوگی۔

ذوق افسانہ تراشی کی کارفرمائیاں کچھ کم نہیں اور جو لوگ ایسے راویوں کی روایتیں تصدیق کے بغیر حوالے کے طور پر قبول کیا کرتے ہیں، وہ پہلے تو خود مبتلائے غلط فہمی ہوتے ہیں اور پھر دوسروں کو اس کی برکتوں میں شریک کرتے ہیں۔ میں اس کی ایک مثال پیش کرنا چاہوں گا۔

ممتاز حسین صاحب کا مرتب کیا ہوا نسخہ باغ و بہار، اُردو ٹرسٹ کراچی نے ۱۹۵۸ء میں شائع کیا تھا۔ مرتب نے اس کے مقدمے میں لکھا ہے:

> "میں آخر میں مفتی انتظام اللہ شہابی صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے مجھے میر امن کے سن (کذا) وفات سے متعلق ایسی نادر اطلاعات بہم پہنچائیں جن کا ذکر اُردو ادب کی کسی تاریخ میں اب تک نہیں کیا گیا ہے"۔

مفتی صاحب کی فراہم کردہ اطلاعات یہ ہیں:

> "نصر اللہ خان قمر خورجوی اپنے تذکرے "ہمیشہ بہار" میں احسن شاعر کے ذکر میں یوں لکھتے ہیں۔
>
> "احسن، میر احسن نام دارد، پسر میر امن، از خوش فکران مرشد آباد است، جوانے دلچسپ...... از مدتے در عظیم آبادی باشد...... پدرش روز پنجشنبہ وقت صبح سال ۱۲۱۷ھ رہ نورد بادیہ فنا شد، بعد وفات پدر نامدار نواب الدولہ کہ از مرائے آں دیار زندہ اور بسلک مصاحبت خود منسلک کروند"۔

نصر اللہ خان قمر خورجوی کے اس بیان کی تصدیق مولوی مجتبیٰ علی خان جو فاموی کے اس اندراج سے بھی ہوتی ہے، جسے انھوں نے میر امن کی موت کا (کذا) اپنی کتاب "مواقیت الفواتح" میں کیا ہے:

> "میر امن، صاحب گلشن خوبی (کذا) در سال دوازدہ و دوہم (کذا) و ہفت ہجری نبوی فوت شدند"۔

مفتی صاحب کی ان نادر اطلاعات کی بنا پر ممتاز حسین صاحب نے یہ نتیجہ نکالا کہ:

> "یہ مرد پیر اسی سال یعنی سنہ بارہ سو سترہ ہجری کے آخر میں اس دار فانی سے رخصت ہو گیا اور اس کے متعدد ثبوت ہیں۔ ایک تو یہ کہ فورٹ

وليم کالج کی خدمات کے سلسلے میں ان کا ذکر ۱۸۰۲ء کے بعد وہاں کی رپورٹ میں نہیں آتا ہے۔

محمد عتیق صدیقی صاحب نے اسی زمانے میں ہفت روزہ ہماری زبان (علی گڑھ) کے شمارہ ۱۵ اکتوبر ۵۹ء میں اس کی تردید کردی تھی کہ فورٹ ولیم کالج کی رپورٹوں میں ۱۸۰۲ء کے بعد میرامن کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ عتیق صاحب نے ایک حوالہ پیش کیا جس سے ثابت ہوتا تھا کہ ۴ جون ۱۸۰۲ء تک میرامن کالج سے متعلق رہے تھے۔ اس سے ممتاز صاحب بلکہ مفتی صاحب کے پیش کیے ہوئے سنہ وفات کا غلط محض تو ثابت ہو گیا تھا لیکن مفتی صاحب نے جس مطبوعہ تذکرے کا حوالہ دیا تھا، بلکہ عبارت بھی نقل کی تھی، اس کا قصہ تصفیہ طلب تھا۔ اس تذکرے کی اشاعت اول کا ایک نسخہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ اس کو دیکھنے پر معلوم ہوا کہ اس میں احسن کے ترجمے میں وہ عبارت سرے سے ہے ہی نہیں جسے مفتی صاحب نے نادر اطلاع بنا کر پیش کیا ہے اور جسے ممتاز حسین صاحب نے نہایت مسرت کے ساتھ قبول کیا ہے۔ اس تذکرے میں احسن تخلص کے ایک شاعر کا ذکر ملتا ہے جس کا میرامن سے کچھ تعلق نہیں۔ یہ تذکرہ میرامن کے ذکر سے خالی ہے۔

''نقوش'' لاہور کے آپ بیتی نمبر میں جن صاحب نے میرامن کی آپ بیتی مرتب کی ہے، انھوں نے مفتی صاحب کے تراشے ہوئے اس سنہ وفات کو بھی درج کر دیا ہے اور حوالہ نہیں دیا۔ اللہ جانے اور کتنے لوگ اس سے گمراہ ہوں گے۔ رہا میرامن کا سنہ وفات سو اس کے متعلق آج تک کچھ معلوم نہیں۔ یہی حال سنہ ولادت کا ہے۔ ہاں مفتی صاحب نے جس قلمی کتاب ''مواقیت الفواتح'' کا نام لیا ہے، اس کے وجود سے بھی لوگ باخبر نہیں۔ مفتی صاحب کا شمار غیر معتبر راویوں میں کیا جاتا ہے۔ ممتاز حسین صاحب نے جس سادگی کے ساتھ ان کی روایت کو قبول کر لیا، اس کو قبول روایت کے صحیح طریقہ کار سے کچھ مناسبت نہیں۔

لغات تذکیر و تانیث اور قواعد سے متعلق رسائل میں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جو براہ راست اصل ماخذ سے منقول نہیں۔ نقل در نقل ہیں یا محض زبانی روایت پر بھروسا کیا گیا ہے۔ اسی بناء پر یہ کہا جاتا ہے کہ مختلف فیہ مسائل میں مثالیہ اشعار کے متن کی تصدیق ضرور کر لینا چاہیے۔ میں اس سلسلے میں دو مثالیں پیش کرنا چاہوں گا۔

مولف معین الشعراء نے لفظ ''ایجاد'' کو مذکر لکھ کر حاشیے میں یہ بھی لکھا ہے کہ امیر اللہ تسلیم نے اسے مونث نظم کیا ہے اور سند میں تسلیم کا یہ شعر لکھا ہے۔

رشک اعدا نے کیا تسلیم خستہ کو شہید
دیکھیے ایجاد اس ترک ستم ایجاد کی

تسلیم کا دیوان میری دسترس میں نہیں تھا۔ یہ معلوم تھا کہ رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے۔ حسب معمول عرشی صاحب کو زحمت دی۔ مولانا محترم کے خط سے معلوم ہوا کہ اس غزل کی ردیف ''کی'' کے بجائے ''کا'' ہے۔ یعنی تسلیم کے دیوان میں دوسرا مصرع یوں ہے ''دیکھیے ایجاد اس ترک ستم ایجاد کا'' (دیوان تسلیم موسوم بہ نظم دل افروز ص ۳۰۹) غلط متن کی بناء پر صورت حال بدل گئی۔

''صاد'' کی تذکیر و تانیث کے سلسلے میں مولف فرہنگ آصفیہ نے اس کو ''اسم مذکر و مونث'' لکھ کر مثال میں مثنوی گلزار نسیم کا یہ شعر لکھا ہے۔

صاد آنکھوں کی دیکھ کر پسر کی — بینائی کے چہرے پر نظر کی

اور صراحت کی ہے کہ تانیث کی مثال بھی اس شعر سے ثابت ہے۔

اس ایک شعر کے سوا کوئی اور مثال تانیث کی اب تک نہیں پیش کی جا سکی ہے۔ مولف آصفیہ کی تقلید میں ''رشحات صفیر'' ''ارمغان احباب'' اور ''نور اللغات'' میں اسی ایک شعر کو تانیث کی سند میں لکھا گیا ہے اور اس طرح تذکیر و تانیث کے لحاظ سے ''صاد'' کا مختلف فیہ ہونا گویا مسلم ہو گیا مگر یہاں وہ صورت ہے جسے ''بناء الفاسد علی الفاسد'' کہتے ہیں۔ گلزار نسیم کا پہلا ایڈیشن ۱۲۶۰ھ میں مطبع حسنی میر حسن رضوی سے شائع ہوا تھا اور اس میں اس زمانے کے رواج کے بموجب معروف و مجہول کی کتابت میں امتیاز ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ اس میں مصرع اول اسی طرح چھپا ہوا ہے (صاد آنکھوں کی دیکھ کر پسر کی) ۱۹۰۵ء میں چکبست نے اس کا جو ایڈیشن چھاپا (جو کہ معرکہ چکبست و شرر کی بنیاد بنا تھا) اس میں بھی یہ مصرع اسی طرح رہا۔ سند لینے والوں نے اس بات پر دھیان نہیں دیا کہ یہاں کیا صورت ہے۔ محض کتابت کی بناء پر ''صاد'' کی تانیث فرض کر لی اور یہ خیال نہیں کیا کہ اس کو صاد آنکھوں کے...... بھی پڑھا جا سکتا ہے (اور اسی طرح پڑھنا چاہیے) پہلے ایک لغت نویس نے محض کتابت پر استدلال کی بنیاد رکھی اور بعد میں دوسروں نے اس کی تقلید کی اور اس طرح کسی حقیقی سند کے بغیر محض متن کی بناء پر ''صاد'' مونث بھی بن گیا۔

اس سلسلے میں الفاظ کی شکل و صورت کا مسئلہ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ مصنف کس زمانے کا ہے، کتاب اس کے مثلاً سو برس بعد چھپی ہے، جب کہ زبان میں بہت سی تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ مختلف لوگوں کے تیار کیے ہوئے نسخے عجائبات کی کان ہوتے ہیں اور ان میں لفظوں کی عجیب عجیب صورتوں سے آنکھیں چار ہوتی ہیں۔ کبھی علاقائی خصوصیتیں اپنے آپ کو نمایاں کر لیا کرتی ہیں اور کبھی ناقل کی کم سوادی اپنے کمالات کی نمود کے لیے گنجائش نکال لیا کرتی ہے۔ جب تک ایسے متنوں کو

آداب تدوین کی پابندی کے ساتھ معرضِ طبع میں نہ لایا جائے، اس وقت تک غلط فہمی کو اپنی صلاحیتوں کی نمائش کے لیے وسیع میدان تیار ملے گا۔ مثلاً کربل کتھا کا واحد خطی نسخہ جرمنی میں ہے اور اس کا عکس یہاں کئی حضرات کے پاس ہے۔ یہ کتاب شائع ہو چکی ہے اور اس اہم ترین نثری تصنیف کی زبان پر کئی مضامین لکھے گئے ہیں۔ مگر ایسے جائزوں کا بڑا حصہ مبنی ہے اس مجہول الاحوال کاتب کے اندازِ نگارش پر جس کے متعلق ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں۔ وہ کون تھا، کس علاقے کا تھا اور کس زمانے میں تھا البتہ اس کی تحریر میں اس قدر فاش غلطیاں ہیں کہ اس کا کم سواد ہونا مسلم ہے (اس کتاب کے عکس سے میں نے استفادہ کیا ہے) اس نے معمولی معمولی الفاظ کا املا غلط لکھا ہے۔ مثلاً اس نے ''ڈھارس'' کو ''ڈھارث''، ''سات'' کو ''ثات''، ''فرات'' کو ''فراط'' لکھا ہے وغیرہ۔ اب ایک ایسے شخص کے نوشتے پر لسانی تجزیے کی عمارت کھڑی کر دینا احتیاط کے قطعاً منافی ہے۔ بحث کی جا سکتی ہے اور کی گئی ہے، مگر ایسی بحثوں کے نتائج کو لازماً قبول نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً ایک اہم قدیم کتاب ''فقہ ہندی'' کے مخطوطے اچھی خاصی تعداد میں ملتے ہیں اور مختلف مخطوطوں میں اختلافات ملیں گے اور ان میں سے بہت سے اختلافات علاقائی اثرات کی نشاندہی کریں گے۔ ڈاکٹر اختر اورینوی (مرحوم) نے ایک مضمون میں اس کتاب کے دو خطی نسخوں کا تعارف کرایا ہے اور ایسے اختلافات کی نشاندہی کی ہے (معاصر پٹنہ، اگست ۱۹۵۷ء) جب تک اس کتاب کو صحیح طور مرتب نہ کیا جائے، اس وقت تک اس کے کسی ایک یا ایک سے زیادہ مخطوطوں کے طریق نگارش کی بناء پر لسانی مباحث کے متعلق کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہی جا سکتی۔

ایک مثال سے اس پرخطر کاروبار کا حال وضاحت کے ساتھ معلوم کیا جا سکے گا۔ ترقی اُردو بورڈ (کراچی) کے زیرِ اہتمام اُردو کا لغت مرتب ہو رہا ہے اور اس لغت کے اجزا، رسالے اُردو نامے میں چھپتے رہے ہیں۔ اُردو نامے کی ایک اشاعت میں (شمارہ ۲۷) حصہ لغت میں لفظ ''اچنبھا'' کی ایک اور صورت ''اچھنبا'' بھی موجود ہے۔ اس ''اچھنبا'' کو ''اچنبھا'' کی قدیم صورت بتایا گیا ہے اور اس کی تین سندیں پیش کی گئی ہیں۔ من جملہ ان کے ایک سند میر امن کی کتاب گنج خوبی سے بھی منقول ہے ''اوس کے کنگورے کے اونچے ہونے کا اچھنبا نہیں''۔

اب تک کی معلومات کے مطابق یہ کتاب پہلی بار (اُردو رسم الخط میں) ۱۸۴۶ء میں مطبع احمدی کلکتہ میں چھپی تھی۔ یہ ایڈیشن میرے سامنے ہے۔ اس کتاب کا خطی نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن میں موجود ہے اور اس کا عکس پیش نظر ہے (اس مخطوطے میں آخر میں ایک تحریر ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ میر امن کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ ہے۔) ان دونوں نسخوں میں مندرجہ بالا جملے میں ''اچنبھا'' ہے اور ''اچھنبا'' سے یہ نسخے کلیتاً خالی ہیں۔ یہ کتاب ایک بار ۱۸۷۵ء میں بمبئی کے مطبع محبوب ہر دیار میں بھی چھپی ہے۔ یہ ایڈیشن میری نظر سے نہیں گزرا۔ میں فرض کیے لیتا ہوں کہ اس نسخے میں ''اچھنبا'' چھپا ہوا ہوگا۔ مگر وہ لغت کے لیے تو قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ جو دو اور سندیں پیش کی گئی ہیں وہ بھی نا قابل قبول ہیں۔ اس سلسلے میں میرا ایک مفصل مضمون ''اُردو نامے'' میں شائع ہو چکا ہے۔ ایسی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ کاتبوں، ناقلوں اور تصحیح کرنے والوں کی تحریفات اور غلط نگاریوں سے کتابیں بھری پڑی ہیں اور جب تک اہم کتابوں کے قابل اعتماد متن موجود نہ ہوں اس وقت تک حوالے کا مسئلہ پریشان کرتا رہے گا۔

یہ حقیقت ہے، تلخ سہی، کہ ایسے متن ہمارے پاس کم ہیں جن کو حوالے کے لیے صحیح معنی میں قابل اعتماد قرار دیا جا سکے اور اس سے بھی زیادہ تلخ حقیقت یہ ہے کہ اس طرف توجہ کم سے کم ہے اور یہ کہ اس زمانے میں مختلف اداروں کی طرف سے جو پرانی کتابیں شائع کی گئی ہیں، تدوین کے لحاظ سے ان میں بیش تر ساقط المعیار ہیں۔ یہ اُردو کی بدنصیبی ہے کہ اس کو جن لوگوں کی سرپرستی حاصل ہے ان میں سے اکثر اچھے دنیادار ہیں۔ یہ لوگ کتابوں کو علم کا مخزن اور تحقیق کا آئینہ سمجھنے کے بجائے پتھر کے ان ٹکڑوں کا مرادف سمجھتے ہیں جن پر پیر رکھ کر آگے بڑھا جاتا ہے۔ ایسے لوگ زبان سے یہی کہتے ہیں کہ بھائی! اللہ کا کام ہے۔ یہ بڑی سعادت ہے جو ہمارے حصے میں آتی ہے اور ہمارے پاس ہے کیا، بس دل میں لہو کی ایک بوند ہے اور سر میں خدمت زبان کا سودا۔ مگر ہیں یہ دراصل سوداگر۔ ان حالات کی بناء پر یہ توقع نہیں کرنا چاہیے کہ پرانے متن آداب تدوین کی پابندی کے ساتھ کچھ زیادہ تعداد میں شائع ہو سکیں گے۔ اچھی کتاب علم میں ضرور اضافہ کرتی ہے مگر دنیا طلبی کی دوڑ میں وہ کچھ زیادہ ساتھ نہیں دے پاتی۔ اس لیے آدمی خوامخواہ پابندی آداب کے پھیر میں کیوں پڑے۔

اکثر تذکرے تدوین کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ بیش تر اہم دواوین اور نثری تصانیف کا بھی یہی حال ہے۔ میر خدائے سخن ہیں اور سودا ملک الکلام ہیں، مگر ان کا کوئی مکمل اور قابل اعتماد مجموعہ موجود نہیں۔ مومن کی کس قدر شہرت ہے، مگر ان کی غزلوں کا بس وہی نسخہ ملتا ہے جس کو ایک زمانے میں ضیاء احمد صاحب مرحوم نے چھپوا دیا تھا۔ غالب کی سو سالہ یادگار منائی گئی اور بہت دھوم دھڑکے کے ساتھ، کتنا شور وغل ہوا تھا، مگر ان کی تصانیف کو قاعدے قرینے کے ساتھ شائع کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ امیر خسرو کی سات سو سالہ یادگار منائی گئی، مگر خسرو کی کتابوں کو شائع نہیں کیا جا سکا۔

بہرحال موجودہ حالات میں ہمارے اچھے طلباء کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ حوالہ دیتے وقت اس کا خیال ضرور رکھیں کہ وہ حوالہ قابل قبول بھی ہو اور جہاں تک

ممکن ہو مختلف نسخوں اور مختلف مآ خذ سے مقابلہ کرلیا کریں۔ یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھیں کہ بیشتر مآ خذوں کے قابل اعتماد ایڈیشن موجود نہیں۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ اکثر مقامات پر ایسے مرکز موجود نہیں جہاں مختلف کتابیں یکجا ہوں۔ عام کتب خانوں کا حال بھی قابل رحم ہے۔

مخطوطات سے استفادہ تو اور بھی مشکل ہے۔ ہندوستان کے مختلف مقامات پر وہ بکھرے ہوئے ہیں اور بہت سے اہم مخطوطات تو ہندوستان سے باہر یورپ کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کسی ایک فرد کے بس کی بات نہیں کہ وہ ان سب بکھرے ہوئے مآ خذ سے حسب تقاضائے ضرورت استفادہ کر سکے اور ایسا کوئی مرکز موجود نہیں جہاں ایسے مخطوطات کے عکس اور اہم مطبوعات کے نسخے یا ان کے عکس یکجا ہوں۔ کتابوں کی اولین اشاعتیں یا معتبر نسخے اکثر لوگوں کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں اور مجبوری کے عالم میں ہم سب کو دستیاب نسخوں سے ہی استفادہ کرنا پڑتا ہے۔ یہ ہماری مجبوری ہے مگر اس کمی کا، اس مجبوری کا اور ان کے اثرات کا اگر صحیح طور پر اندازہ ہو تب بھی بہت سی غلطیوں سے بچا جا سکتا ہے۔ اس تحریر کا مقصد بھی یہی ہے کہ ان مسائل کی طرف طلباء کو متوجہ کیا جائے۔ مجبوری کا کچھ علاج نہیں ہوتا، مگر اس مجبوری کے متعلقات اور ذیلیات کا اگر صحیح طور پر علم اور اندازہ ہو تو احتیاط کے تقاضے اپنا کام کرتے رہیں گے۔

(ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ سے اقتباس)

❖❖❖❖

حواشی

(۱۔الف) مشمولہ ادبی اور لسانی تحقیق اصول اور طریق کار، مرتب پروفیسر عبدالستار دلوی، بمبئی ۱۹۸۴ء، ص ۱۱۹۔۱۲۸۔

(۱۔ب) مطلب یہ کہ آب حیات میں ناسخ کا مطلع یوں لکھا ہوا ہے۔

یوں نزاکت سے گراں ہے سرمہ چشم یار میں

جس طرح ہو رات بھاری مردم بیمار میں

(۲) بات چلائی پر آزاد نے آب حیات میں یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ امروہے کی زبان ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب نے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''آزاد زندہ ہوتے تو ان سے پوچھا جاتا کہ میر کے مصرع ہائے ذیل کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے۔

قسم ہے میں نے اگر بات بھی چلائی ہو (کلیات۔اشاعت آسی۔ص ۱۲۳)

رفتار کی جو تیری صبا نے چلائی بات (کلیات۔اشاعت آسی۔ص ۲۵۶)

(نوائے ادب (بمبئی) اپریل ۱۹۵۶ء)

(۳) یہ اشاعت کمیاب ہے۔ دہلی یونیورسٹی لائبریری میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے اور میں نے اسی سے استفادہ کیا ہے۔

(۴) اس کی مائیکروفلم دہلی یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے لیکن میں نے اس کے عکس سے استفادہ کیا ہے جو محب مکرم ڈاکٹر محمد حسن کی عنایت سے حاصل ہوا ہے۔

(۵) اشاعت اول کمیاب ہے۔ آصفیہ لائبریری حیدرآباد میں اس کا ایک نسخہ محفوظ ہے اور میں نے اسی سے استفادہ کیا ہے۔ اشاعت ثانی کا ایک نسخہ میرے پاس ہے۔

(۶) دیوان ذوق مرتبہ حافظ ویران وظہیر وانور۔ مطبوعہ مطبع احمدی دہلی۔ سال طبع ۱۲۷۹ھ۔ آسانی کے لیے آئندہ اس کو نسخہ ویران لکھا جائے گا۔

(۷) دیوان ذوق مرتبہ آزاد۔ مطبوعہ مطبع اسلامیہ لاہور۔ جو نسخہ میرے سامنے ہے اس پر سنہ اشاعت موجود نہیں۔ یہ صراحت بھی نہیں کہ یہ اشاعت اول ہے۔ کلیات ذوق کے مرتب ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی یہ رائے ہے کہ یہ اشاعت اول ہے۔ نسخہ ویران تو میری معلومات کے مطابق ایک ہی بار چھپا ہے مگر نسخہ آزاد کئی بار چھپا۔ اس کا ایک اور ایڈیشن بھی پیش نظر ہے۔ مطبوعہ محبوب المطابع دہلی۔ سال اشاعت ۱۹۲۱ء۔ اشعار ذوق کے سلسلے میں دونوں اشاعتیں پیش نظر رہی ہیں مگر صفحات نمبر صرف اول الذکر اشاعت سے متعلق ہیں۔

(۸) یہ شعر اس طرح بھی سنا گیا ہے۔

پھول تو دو دن بہار جاں فزا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

مختلف لوگوں کے ذوق اور پسندیدگی نے بیسیوں معروف اشعار میں لفظی تبدیلیاں روا رکھی ہیں اور ستم یہ کہ بعض لوگ اسی بنیاد پر اب بھی ترمیم شدہ صورتوں پر اصرار کرتے ہیں اور اس کے لیے غیر منطقی استدلال سے کام لینا چاہتے ہیں۔

❖❖❖❖

ببلیو گرافی: تحقیق کا پہلا قدم

یونس اگاسکر

تحقیق کو عام طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے: کتابی اور تجربی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ پہلی قسم کی تحقیق میں تجربات کو یا دوسری قسم میں کتابوں کے مطالعے کو قطعی دخل نہیں ہوتا۔ البتہ کتابی تحقیق میں زیادہ تر تحریری مواد کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے اور تجربی تحقیق میں سائنسی تجربات یا مادی حقائق کے براہ راست مشاہدے پر خاص زور دیا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں کتابی تحقیق لائبریری میں کی جاتی ہے اور تجربی تحقیق لیبارٹری میں۔ ادبی تحقیق کا شمار خالصتاً پہلی قسم میں کیا جاتا ہے۔

تحقیق کا بنیادی مقصد سچائی کی تلاش اور اس کا اثبات ہے۔ زندگی کی تمام سچائیاں تو سب پر آشکار ہوتی ہیں لیکن علم وادب کے بعض حقائق کا ادراک کم ہی لوگوں کو ہوتا ہے۔ ان حقائق کی جستجو کر کے انھیں دوسروں پر منکشف کرنا محقق کا اولین فرض ہوتا ہے۔ لیکن اس فرض کی تکمیل اسی وقت ممکن ہے جب اس کا احساس ہو جائے کہ کون سے حقائق ہنوز محتاجِ نقاب کشائی ہیں۔ ادبی تحقیق چونکہ عملی کم اور کتابی زیادہ ہوتی ہے اس لیے ادبی تحقیق کا آغاز پہلے ان تمام کتابوں کی تلاش سے ہونا چاہیے جو موضوعِ تحقیق سے متعلق ہوں۔ یہاں کتابوں سے میری مراد وہ سارا تحریری مواد ہے جو کتابوں، رسالوں، پمفلٹوں، قاموسوں، رپورٹوں اور اخباروں وغیرہ میں بکھرا ہوتا ہے۔ اس تحریری مواد کو ذیل کے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (یہ تقسیم قطعی اور مکمل نہیں ہے)۔

۱۔ انسائیکلوپیڈیا (قاموس)

۲۔ لغات

۳۔ سوانحی لغات یا تذکرہ مشاہیر

۴۔ تذکرے

۵۔ سوانح عمریاں

۶۔ فہرست مخطوطات ونایاب کتب

۷۔ فہرست مطبوعات

۸۔ غیر مطبوعہ مقالات

۹۔ انتخابات

۱۰۔ کتابیات

۱۱۔ اخبارات ورسائل کے فائل

۱۲۔ روداد یں اور پمفلٹ

۱۳۔ مستقل تصنیفات

ان میں سے کس قسم کے مواد پر سب سے پہلے توجہ دی جائے اس کا فیصلہ موضوع کی نوعیت اور اس کی مختلف پہلوؤں کے پیشِ نظر محقق خود کرتا ہے لیکن بنیادی مواد اور تلاش میں آسانی کے نقطۂ نظر سے انسائیکلوپیڈیا پر سب سے پہلے نگاہ ڈال لینا مفید ہوتا ہے۔ اس سے نہ صرف حوالوں کی دیگر کتابوں تک رہنمائی ہوتی ہے بلکہ موضوع کی جزئیات طے کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

قاموسیں (انسائیکلوپیڈیا) بھی دو قسم کی ہوتی ہیں، عمومی اور خصوصی۔ عمومی یا جنرل انسائیکلوپیڈیا میں علوم وفنون اور زبان وادب کے ہر موضوع پر معلومات درج ہوتی ہیں۔ خصوصی یا اسپیشلائزڈ انسائیکلوپیڈیا کا میدان علم متعین ومحدود ہوتا ہے مثلاً قاموس مذہبیات، قاموس اسلام، قاموس ادویات وغیرہ۔

خالص زبان کے مسائل سے بحث کرنی ہو تو لغات کا مطالعہ بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ بعض لغات اتنی تفصیلی ہوتی ہیں کہ قاموس کی طرح بہت سے اندراجات پر مستقل تحقیقی مقالوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہوتی ہیں جیسے فرہنگ آصفیہ۔

شخصیات پر کام کرتے ہوئے سوانحی لغات یا تذکرہ مشاہیر کی اہمیت بنیادی ہوتی ہے۔ اس سے شخصیت کے وہ تمام پہلو اجاگر ہو جاتے ہیں جن پر خاص طور پر تحقیقی نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہمارے قدیم تذکرے بھی تحقیق شعر و ادب کے میدان میں بنیادی حوالوں کا درجہ رکھتے ہیں اس لیے قدیم ادب اور خالقین ادب سے متعلق ہر تحقیق تذکروں سے شروع ہونی چاہیے۔

کسی خاص شخصیت اور اس کے دور پر سیر حاصل نظر ڈالنی ہو تو سوانح عمریوں کا مطالعہ از حد ضروری ہے۔ سوانح عمریاں اگر خود نوشت ہوں یا کسی ہم عصر سوانح نگار کی تالیف ہوں تو زیادہ مستند تسلیم کی جاتی ہیں۔

ہندوستان جیسے علمی و ادبی اعتبار سے کم ترقی یافتہ ملک میں ایسے قدیم مخطوطات کی بہتات ہے جنھیں مطبع تک پہنچنا نصیب نہیں ہوا ہے لیکن ان میں سے اکثر کی فہرستیں مرتب ہو چکی ہیں۔ ان فہرستوں میں مخطوطات سے متعلق ساری اہم تفصیلات مع تشریح موضوعات دی ہوتی ہیں، اس لیے مخطوطات کی فہرستوں کا مطالعہ قدیم ادب کی تحقیق کے سلسلے میں اشد ضروری ہے۔ اسی طرح مطبوعات کی فہرست کا مطالعہ بھی مواد کی فراہمی کے سلسلے میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں نایاب کتابوں کے کیٹلاگ بھی اہمیت کے حامل ہیں۔

ہندوستان بھر کی یونیورسٹیوں میں نت نئے موضوعات پر پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے مقالے لکھنے کا سلسلہ گزشتہ کئی دہائیوں سے جاری ہے لیکن ان میں سے اکثر مقالے کتابی صورت میں منظر عام پر آنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ تحقیق میں انفرادیت اور متحقق امور سے ہٹ کر نئی بات پیش کرنے کے لیے ان مقالات سے واقفیت ضروری ہے۔ یہ مقالے متعلقہ جامعات کی لائبریریوں میں محفوظ ہوتے ہیں۔ ان تک رسائی حاصل کر کے ان میں درج شدہ حقائق کا مطالعہ کیے بغیر تحقیق شروع کرنا، اپنے کام کی اہمیت و انفرادیت کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف ہے۔

ان کے علاوہ ہر سال شائع ہونے والی مطبوعات کی ببلیوگرافی یا کتابیات، متعدد انتخابات، رسائل و اخبارات کے فائل، انجمنوں یا اداروں کی روداد یں اور مستقل تصنیفات کا مطالعہ تحقیق کے لیے ناگزیر ہے۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ کیا ان کا مطالعہ اسی ترتیب سے جو اوپر پیش کی گئی ہے شروع کر دیں تو صحیح راہ تحقیق روشن ہوتی چلی جائے گی اور تحقیق کا فرض ادا ہو جائے گا؟ جی نہیں۔ تحقیق کا آغاز محض مطالعے سے نہیں، مطالعے اور مواد کے تعین سے ہونا چاہیے اور اس کے لیے ضروری ہے ببلیوگرافی یا کتابیات کی تیاری۔ دوسرے الفاظ میں فہرست مآخذات کی ترتیب، تحقیق کا اولین قدم ہوگا۔

عام طور پر فہرست مآخذات سے مراد وہ طویل فہرست ہوتی ہے جو مقالے کے آخر میں جوڑ دی جاتی ہے تا کہ محقق کے استفادے کا اندازہ ہو سکے اور مقالے کے حوالہ جات سے بہ یک نظر واقفیت حاصل کرنے میں سہولت ہو۔ یہ فہرست مقالے کی تیاری کے بعد ترتیب دی جاتی ہے، یہاں یہ فہرست مراد نہیں ہے۔ ببلیوگرافی سے بھی ہم ہر سال شائع ہونے والی کتابوں کی معلوماتی فہرست مراد لیتے ہیں۔ اس مضمون میں اس نہج کی کوشش بھی زیر بحث نہیں ہے۔ فی الوقت ببلیوگرافی سے مراد وہ فہرست مآخذات ہے جو تحقیق کا طالب مقالہ لکھنا شروع کرنے سے پہلے تیار کرتا ہے تا کہ تحقیق کے مختلف پہلوؤں سے متعلق مواد کی وسعت اور فراہمی مواد کے سلسلے میں سہولت یا دشواری کا اندازہ کر کے منظم طور پر تحقیق کا آغاز کر سکے۔

اس کے لیے پہلی شرط ہے لائبریریوں میں موجود تمام تر کتابوں میں سے مفید مطلب کتابوں کی فہرست تیار کرنا۔ یہ فہرست محض ان تصانیف اور حوالے کی کتابوں تک محدود نہیں ہونی چاہیے جو کسی بھی طالب علم کی یادداشت کا حصہ ہو سکتی ہیں۔ محقق کو چاہیے کہ لائبریریوں میں موجود فہرست یا کیٹلاگ کا بہ غور مطالعہ کرے اور جہاں کتاب کے موضوع سے متعلق شک و شبہ پیدا ہو، وہاں لائبریرین یا اپنے گائیڈ سے مشورہ کر کے اپنے موضوع تحقیق سے متعلق ایک طویل فہرست تیار کرے۔

یہ فہرست فل اسکیپ سائز کے کاغذ یا نوٹ بک میں درج نہ ہو بلکہ موٹے کاغذ کے کارڈوں پر مشتمل ہو۔ ان کارڈوں کا معیاری سائز ۵×۳ انچ ہوتا ہے لیکن محقق اپنی سہولت کے مطابق ان کا سائز بڑھا بھی سکتی ہے۔ ان کارڈوں پر تمام اندراجات روشنائی میں ہوں۔ حسب سہولت ایک سے زیادہ رنگ بھی استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

ہر لائبریری میں ذخیرہ کتب کی فہرست دستیاب ہوتی ہے۔ اگر یہ فہرست کارڈ کیٹلاگ کی صورت میں ہے تو محقق کا کام اور بھی آسان ہو جاتا ہے۔ وہ ان

کارڈوں کی مدد سے اپنی فہرست مرتب کرسکتا ہے لیکن براہ راست لائبریری کی فہرست سے استفادہ کرنے سے قبل مختلف ناشرین کی شائع کردہ فہرست کتب، مشہور ومعروف لائبریریوں میں مخزونہ مخطوطات ومطبوعات کے کیٹلاگوں، نایاب کتب فروشوں کے کیٹلاگوں اور ہر سال شائع ہونے والی ببلیوگرافی کے مطالعے سے کام کا آغاز کرنا زیادہ مفید ہوگا۔

طالب تحقیق کے کارڈ میں ذیل کی تفصیلات کا اندراج ضروری ہے:

(الف)۔ مصنف یا مولف کا نام

(ب)۔ عنوان کتاب رمضمون (مع رسالہ راخبار)

(ج)۔ مقام اشاعت

(د)۔ ناشر یا طابع رمع مدیر

(ہ)۔ تاریخ اشاعت

اگر کتاب لائبریری میں موجود ہے تو:

(و)۔ لائبریری کا نام

(ز)۔ کتاب کا نمبر

بھی درج ہونا چاہیے۔

ان بنیادی اندراجات کو اصل کتاب (یا مآخذ) سے ملا کر درست کرلیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ کتاب سے متعلق ایک دو جملے اشارے کے طور پر درج کرلیے جائیں تاکہ کتاب (مآخذ) کی افادیت واہمیت پر روشنی پڑسکے۔

مذکورہ بالا مآخذوں کی مدد سے جب ایک قابل لحاظ فہرست تیار ہوجائے تو رسائل میں شائع شدہ تبصروں، انتخابات یا مرتب کردہ مجموعوں کے مقدموں یا ضمیموں، غیر مطبوعہ مقالات کے حوالوں سے اس فہرست کے کارڈوں میں اضافہ کیا جائے۔

جب یہ ببلیوگرافی تیار ہوجائے گی تو طالب تحقیق کو سب سے پہلے خوشی یہ جان کر ہوگی کہ موضوع کے جن پہلوؤں پر روشنی ڈالنا چاہتا تھا ان پر پہلے ہی بہت کام ہوچکا ہے اس لیے وہ اعادہ کرنے سے بچ گیا اور بعض گوشے ایسے باقی رہ گئے ہیں جن پر تحقیقی نظر ڈال کر وہ کوئی نئی بات پیش کرسکتا ہے۔ اس طرح اس کے کام کی اہمیت بہت بڑھ جائے گی۔

اب ان کارڈوں کو مختلف گروپوں میں بانٹ لیا جائے مثلاً انتخابات ومرتبہ کتب، رسائل واخبارات کے مضامین، سوانح عمریاں، بنیادی حوالے وغیرہ۔ اس طرح مآخذات کو یکے بعد دیگرے زیر مطالعہ لانے میں آسانی ہوگی۔ اب ان گروہوں کے کارڈوں کو حروف تہجی کے مطابق ترتیب دے کر سب سے پہلے مآخذوں پر قدرے تفصیلی نظر ڈالنے کے لیے تیار ہوجائیں۔ یاد رہے کہ اب تک باقاعدہ مطالعے اور نوٹس لینے کا سلسلہ شروع نہیں ہوا۔ ابھی تو مآخذ کے استناد، اس کے مشمولات، انداز واسلوب، مواد وموضوع پر غور کرنا باقی ہے تاکہ فہرست مآخذات کو درست ومکمل کیا جاسکے۔ بعض کتابوں کے عنوانات گمراہ کن ہوتے ہیں، بعض کا تحقیقی درجہ ناقابل اعتنا ہوتا ہے، بعض مصنفین کا ذاتی نقطۂ نظر تصنیف کو ناقابل استفادہ بنادیتا ہے، بعض محض سنی سنائی یا پٹی پٹائی باتوں کو دہرانے پر اکتفا کرتے ہیں، بعض پرانی کتابیں نئے عنوانات کے ساتھ چھپ کر فہرست میں تکرار اندراج کا باعث بنتی ہیں۔ اس قسم کے مآخذات کو خارج فہرست کرنا اور دیگر مآخذات میں شامل کتابیات اور اشاریوں سے فہرست کو مزید وسیع کرنا بے حد ضروری ہے۔ اس طرح تمام مآخذات پر نظر ڈالتے چلیں۔

اس کام کے ساتھ ہی ساتھ ہر مآخذ سے متعلق بعض اہم تفصیلات کو درج فہرست کرنا بھی تحقیق کی اگلی منزلوں کو بہ آسانی سر کرنے میں بے حد مددگار ثابت ہوگا۔ یہ تفصیلات کچھ اس قسم کی ہوں گی:

الف۔ دور کا احاطہ

ب۔ اشخاص کا احاطہ

د۔ مقدمہ، دیباچہ، یا پیش لفظ

ہ۔ تصاویر، نقشے، خاکے وغیرہ

و۔ مآخذ کی قدامت اور استناد

ز۔ معروضیت یا داخلیت

ح۔ متعلقہ مواد کے صفحات

محقق کے اپنے نقطۂ نظر اور طریق کار کے مطابق اس تقسیم میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ ان تفصیلات کو متعلقہ مآخذ سے متعلق کارڈ پر مختصر ترین الفاظ میں درج کر لیں۔ اب آپ کی ببلیو گرافی اس لائق ہو گئی ہے کہ اس کی روشنی میں نوٹس لینے اور اصل تحقیق کی منزلیں سر کرنے کا کام شروع کر دیا جائے۔

❖❖❖❖

---

(۱) مشمولہ ادبی و لسانی تحقیق اصول اور طریق کار، ڈاکٹر عبدالستار دلوی، بمبئی، ۱۹۸۴ء، ص ۱۷۵ تا ۱۷۹۔

تعلیقات و حواشی

ڈاکٹر نذیر احمد

بعض محققین صرف تعلیقات اور بعض صرف حواشی کا استعمال کرتے ہیں اور بعض دونوں کے ہمراہ۔ ایران کے محقق شہیر؛ مرزا محمد قزوینی نے دونوں کو ساتھ ساتھ لکھا ہے۔ انھی کی پیروی میں راقم نے مکاتیب سنائی (۱۹۶۲ء علی گڑھ اور ۱۹۷۷ء میں کابل یونیورسٹی سے شائع ہوئی) میں تعلیقات و حواشی لکھا۔ قاضی عبدالودود صاحب نے صراحت چاہی تو میں نے قزوینی کی مثال پیش کی، لیکن دیوانِ سراجی میں صرف لفظ ''تعلیقات'' کا استعمال کیا۔ مالک رام صاحب نے غبارِ خاطر میں صرف حواشی کا لفظ لکھا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ تعلیقات اور حواشی مترادف ہیں۔

فرہنگِ معین میں تعلیق، جس کی جمع تعلیقات ہے، اس کی تشریح اس طرح کی ہے:

۱۔ آویختن، آویزاں کردن، درآویختن۔

۲۔ یادداشت کردن، نوشتنِ مطالب در ذیلِ رسالہ و کتاب۔

۳۔ یادداشتِ ضمیمۂ کتاب و رسالہ۔

اس فرہنگ میں حاشیہ بمعنی ''شرحی کہ در کنارۂ رسالہ یا کتاب نویسند'' آیا ہے۔

فرہنگ نامۂ دہخدا سے معلوم ہوا کہ حاشیہ اور تعلیق یا تعلیقہ، بہ اعتبارِ مفہوم و معنی، یکساں ہیں، لیکن استعمال کے لحاظ سے کچھ فرق ہے۔ تعلیقہ؛ معقولات اور فلسفے کی کتابوں کے حواشی کو کہتے ہیں اور دوسرے فنون کی کتابوں کے تعلیقے، حواشی یا حاشیہ کہلاتے ہیں۔ اہلِ فلسفہ، تعلیقہ کا استعمال بہتر جانتے ہیں۔ ایران میں حاشیے تین قسم کے ہوتے تھے: (۱) حواشی بر کتب ادبی: یہ حواشی زیادہ تر شرح و توضیح کی شکل میں ہوتے۔ ان میں انتقادی عنصر کم شامل ہوتے تھے: (۲) حواشی بر کتب دینی: اور ان میں اکثر مسائلِ اصولی و کلامی سے بحث ہوتی ہے۔ (۳) حواشی کتبِ معقول: فلسفیانہ کتابوں پر حواشی لکھنے کا رواج زیادہ تھا۔ یہ حاشیے الگ رسالوں کی صورت میں ہوتے، حاشیوں پر حاشیے لکھے جاتے اور یہ سلسلہ برابر جاری رہتا۔ نصیر الدین طوسی (م: ۶۷۲ھ) کی تجرید کی قوشجی (م: ۸۷۹ھ) نے شرح لکھی اور جلال الدین دوانی (م: ۹۰۷ھ) نے اس پر پہلے حاشیہ لکھا، پھر دوسرا اور آخر میں تیسری بار حاشیہ لکھا۔ دوانی کی وفات پر غیاث الدین منصور (م: ۹۴۸ھ) نے دوانی کے حاشیے پر حاشیہ لکھا۔ حاشیہ نویسی کا رواج اتنا بڑھ چکا تھا کہ دوانی نے تفتازانی (۷۹۲ھ) کی تہذیب منطق پر حاشیہ لکھا۔ پھر شریفی (م: ۹۷۶ھ) نے دوانی کے حاشیے پر حاشیہ لکھا، عیاث الدین نے شریفی کے حاشیے پر اور شیروانی (م: ۱۰۹۸ھ) نے غیاثی کے حاشیے پر حاشیہ لکھا۔

جدید دور میں تعلیقات و حواشی الگ رسالے کی شکل میں نہیں لکھے جاتے، کتاب ہی کے ساتھ شامل ہوتے ہیں۔ آج کل تحقیق کی اصطلاح میں تعلیقات و حواشی، وہ یادداشتیں ہیں جو بہ طور ضمیمہ کتاب درج کیے جاتے ہیں۔ ان مندرجات کے امور: تاریخی، ادبی، لغوی، فرہنگی ہوتے ہیں اور اصل متن کتاب میں بعض ایسے امور مذکور ہوتے ہیں جن کی توضیحات سے کتاب کی اہمیت اور افادیت میں بڑا اضافہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات عدم توضیحات کی بنا پر اصل مفہوم تک رسائی نہیں ہوتی۔ اسی بنا پر جدید تحقیق میں تعلیقات نگاری و حواشی نویسی، تنقیدِ متن کا لازمہ سمجھی جاتی ہے اور ان سے گوناگوں فوائد حاصل ہوتے ہیں، جن کو بہ طورِ خلاصہ، یوں بیان کر سکتے ہیں:

(۱) تعلیقات سے، متن زیادہ انتقادی اور پُر از معلومات قرار پاتا ہے۔ بعض اوقات اصل کتاب سے اتنا فائدہ نہیں ہوتا جتنا حواشی و تعلیقات سے۔ فارسی کے محققوں میں اس لحاظ سے مرزا محمد قزوینی سب سے ممتاز اور اپنے میدان میں منفرد ہیں۔ ان کے حواشی، جو ''چہار مقالہ'' از نظامی عروضی، ''لباب الالباب'' عوفی اور ''شد الازار'' از جنیدی شیرازی پر ملتے ہیں، وہ تعلیقات نگاری کے قابلِ تقلید نمونے ہیں۔ ان سے تعلیقات نگاری کے اصول مرتب ہو سکتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ علوم اسلامی، تاریخ ادب، لغت، دستور زبان وغیرہ میں ان کی دقیقہ رسی کس پایے کی تھی۔

(۲) مطالب کتاب کی تفہیم و تنقید میں ان سے بڑی مدد ملتی ہے اور کتاب کی غرض و غایت کما حقہ، پوری ہوتی ہے۔

(۳) ان سے کتاب کی تاریخی، ادبی، فنی اور فرہنگی اہمیت کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ گویا یہ کتاب کے معیار کے جانچنے کا ایک آلہ ہے، یا پرکھ کا پیمانہ۔

(۴) تعلیقات و حواشی، اپنے وسعتِ معلومات اور تنوعِ مضامین کے اعتبار سے الگ تصنیف کے خواص کے حامل ہوتے ہیں۔ اگرچہ جدید دور میں ان کا رواج نہیں، لیکن قدیم دور میں، اسلامی معاشرے میں، ان کا عمومی چلن تھا۔

(۵) تعلیقات؛ تنوع و وسعتِ معلومات کے اعتبار سے، اصل کتاب سے زیادہ مفید ہوتے ہیں۔ کوئی کتاب اتنے متنوع مضامین کی حامل نہیں ہوتی جو حواشی نگاری کے حدود میں شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیقات نویس، زیادہ وسیع المعلومات ہوتا ہے۔

(۶) تعلیقات نویسی نہایت مشکل فن ہے۔ تعلیق نویس ذوالفنون ہوتا ہے۔ علوم و فنون پر غیر معمولی دست گاہ کے بغیر محقق، اس لحاظ سے، کامیاب نہیں ہوتا۔ یہ فن، علوم پر غیر معمولی دست رس کی متقاضی ہے اور اس سے وہی صحیح طرح سے استفادہ کر سکتا ہے، جس کو علوم میں کسی قدر درک حاصل ہو۔

(۷) تعلیقات، مصنف کے علم و فضل کے لیے مقیاس کا کام کرتے ہیں۔

(۸) تعلیقات نویسی، مصنف کی کوتاہیوں کی بھی نشاندہی کرتی ہے۔ اگر یہ نہ لکھے جائیں تو مدتوں، غلطیوں کا شمار، علم کے درجے میں ہوتا رہے گا۔ گویا یہ حواشی علم و جہل کے درمیان حدِ مقیاس قائم کرتے ہیں۔

تعلیقات نویسی، مسلسل مطالعے کی متقاضی ہوتی ہے۔ مرزا محمد قزوینی کے تعلیقاتِ لباب الالباب، دیکھنے کے قابل ہیں۔ پھر بھی سعید نفیسی نے اس تذکرے کے دوسرے ایڈیشن میں نہایت مفید اضافے کر کے اس کو نہایت مفید بنایا ہے۔ پروفیسر نفیسی نے رودکی کے کلام کی تدوین میں جس قابلیت کا ثبوت دیا ہے، وہ مشرق میں کم ہی نظر آتا ہے، لیکن روس میں نفیسی کی تحقیقات پر قابلِ ذکر اضافے ہوئے ہیں۔ اردو میں ابھی اس معیار کے کام نہیں ہوئے ہیں، پھر بھی جناب مالک رام کی مرتبہ غبارِ خاطر اور تذکرہ اور جناب مالک رام اور پروفیسر مختار الدین احمد کی ترتیب کربل کتھا نہایت قیمتی حواشی سے مزین ہیں۔ اکثر محققین اب تعلیقات کی اہمیت کو بہ خوبی محسوس کرنے لگے ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ جو لوگ حواشی لکھنا چاہتے ہیں، ان کے لیے فارسی کی متذکرۃ الصدر کتابیں، اپنے پیشِ نظر رکھنا، بہت مفید ہوگا۔

❖❖❖❖

(۱) مشمولہ تحقیق شناسی رفاقت علی شاہد، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۱۵۰-۱۵۲

ضمیمہ، فرہنگ، اشاریہ[1]

ڈاکٹر گیان چند جین

ضمیمہ:

اس میں وہ مواد دیا جاتا ہے جو کتاب سے متعلق تو ہے لیکن بوجوہ متن میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں متن کے کسی موضوع کی مزید تفصیل، اس پر تبصرہ یا اس کے متعلقات دیے جاتے ہیں۔ ترابیان نے لکھا ہے کہ ضمیمے کا کتاب سے وہی تعلق ہے جو فٹ نوٹ کا ضمیمے سے، یعنی اس میں وہ مواد دیا جاتا ہے جو بے حد ضروری نہیں۔ (ص ۷۵)

ضمیمہ کسی گھرانے کے دوست کی طرح ہے کہ وہ گھرانے کا فرد نہیں، اس کا خون کا رشتہ نہیں، جزو لاینفک نہیں؛ لیکن گھرانے کے افراد کا ممد و معاون ہے۔ قانونی اور سماجی سائنس کی کتابوں کے آخر میں ضمیموں اور جدولوں کا ہونا عام بات ہے۔ دستورِ ہند کے آخر میں کئی جدول ہیں۔ ادبی کتابوں میں یہ شاذ ہی ہونے چاہئیں۔ جارج واٹسن نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ضمیمے کے بارے میں غور کیجیے کہ اسے رکھا جائے کہ نہیں۔ اگر یہ بحث کے لیے ضروری تھا تو اسے متن میں کیوں جگہ نہیں دی گئی؟ اگر زیادہ ضروری نہیں تو اسے کسی رسالے میں عالمانہ مضمون کے طور پر شائع کر دیجیے۔ اگر یہ بہت ضروری ہے، تبھی اسے مقالے میں شامل کیجیے۔ (ص ۴۵)

ضمیموں کو کس طرح متن میں ضم یا مخفف کیا جا سکتا ہے، اس کی مثال اپنی ایک کتاب سے دیتا ہوں۔ میرے تحقیقی مقالے ''اُردو کی نثری داستانیں'' کی طبعِ اول (۱) کے آخر میں تین ضمیمے تھے: ۱۔ شمالی ہند کے قصوں کی فہرست ۲۔ چند غیر مطبوعہ داستانوں کی فہرست ۳۔ داستانوں کے مختلف نسخے اور ترجمے۔ دوسرے ضمیمے میں چند قلمی قصوں کا وضاحتی بیان تھا۔ کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں (۲) جو زیادہ اہم تھے، ان کا بیان متن میں لے لیا، جو کم اہم تھے، انھیں خارج کر دیا۔ اس ایڈیشن میں دو مزید ضمیمے شامل کرنے پڑے۔ کتاب کے متن کی کتابت کے بعد دو نئی کتابیں شائع ہوئیں۔ عیسوی خاں کی قصہ مہر افروز و دلبر (۳) اور شاہ عالم کی عجائب القصص۔ (۴) ان دونوں کی تفصیل دو ضمیموں میں دی۔

کتاب کا تیسرا ایڈیشن لکھنؤ (۵) سے شائع ہوا۔ اس میں ان دونوں داستانوں کو متن میں شامل کر کے دونوں ضمیموں کو سوخت کر دیا۔ پہلے اور دوسرے ایڈیشنوں میں جو ضمیمہ قصوں کے نسخوں اور ترجموں سے متعلق تھا، اسے یوں ختم کر دیا کہ متن میں جس داستان کا جہاں ذکر آیا ہے، وہیں اس کے مختلف نسخوں کا بیان کر دیا ہے۔ دونوں ایڈیشنوں میں جو ضمیمہ قصوں کی فہرست پر مشتمل تھا، اسے اس طرح مختصر کیا کہ جن قصوں کا متنِ کتاب میں مفصل بیان ہو چکا ہے، ان سب کو فہرست سے خارج کر دیا۔ صرف انھی کو داخلِ فہرست کیا گیا جن پر متن میں نہیں لکھا گیا۔

فرہنگ:

یہ عموماً تخلیقی متن ہی میں دی جاتی ہے۔ اس میں، متن میں شامل اصطلاحات یا مشکل الفاظ و محاورات کی تشریح کی جاتی ہے۔ اگر کوئی لفظ یا محاورہ، عام استعمال سے ہٹ کر استعمال کیا گیا ہے تو اسے بھی، گو وہ آسان اور قابلِ فہم ہی کیوں نہ ہو، فرہنگ میں جگہ دی جاتی ہے۔ تمام اندراجات لغوی، یعنی الف بائی ترتیب سے دیے جاتے ہیں۔ انھیں حسبِ ذیل طریقے پر لکھیے:

صفحے پر اوپر سے دو انچ جگہ چھوڑ کر جلی فہرست میں عنوان ''فرہنگ'' لکھیے۔ پھر دو تین سطروں کی جگہ چھوڑ کر دائیں حاشیے کے ساتھ الفاظ لکھیے۔ لفظ کے بعد ڈیش، پھر مفہوم۔ ایک سے زیادہ مفہوم دینا ہے تو کاما لگا کر لکھیے۔ اگر تشریح ایک سطر سے زیادہ کی ہو تو دوسری سطر میں، حاشیے سے تقریباً چوتھائی انچ جگہ چھوڑ کر لکھیے۔ فرہنگ عموماً دو کالموں میں ہوتی ہے جس کی وجہ سے ہر کالم میں وسعت کم ہوتی ہے۔ اگر تیسری سطر میں بھی مفہوم لکھنا پڑے تو دوسری سطر کے نیچے، یعنی حاشیے سے تقریباً چوتھائی انچ خالی جگہ چھوڑ کر، درج کیجیے۔ ایک اندراج کے بعد بقیہ اندراجات کو اسی طریقے سے لکھیے۔

اشاریہ:

تحقیقی کتاب کے آخر میں اشاریہ ضروری ہے، لیکن دقت یہ ہے کہ یہ کتابت کے بعد ہی تیار کیا جاسکتا ہے۔ آپ اپنا مسودہ ناشر کو بھیج دیجیے۔ اب اس کی مرضی ہے کہ کتابت کے بعد اشاریہ تیار کرائے کہ نہیں۔ میں نے یو پی اُردو اکادمی سے، اُردو کی نثری داستانیں کا تیسرا ایڈیشن شائع کرایا۔ انھیں لکھتا رہا کہ پروف چھپنے کے بعد مجھے بھیج دیجیے کہ میں اشاریہ بنا دوں۔ انھوں نے اسے کارِ زائد جان کر کتاب کو کسی قسم کے اشاریے کے بغیر چھاپ دیا۔ اشاریہ تیار کرنے کا کام مصنف ہی کو کرنا چاہیے۔ اگر ناشر تیار کرائے گا تو اس کے اندراج مصنف کی مرضی کے مطابق نہیں ہوں گے۔ دوسرے تیار کیے ہوئے اشاریے کی صحت و جامعیت بھی مشکوک ہوتی ہے۔ اشاریے میں مقدمے کا احصا کر سکتے ہیں، لیکن ابتدائی فہرست، عنوانات اور آخری کتابیات کو خارج رکھیے۔ اشاریے کے دو طریقے ہیں۔

۱۔ اشخاص، کتابوں اور مقامات وغیرہ کو ملا جلا کر الف بائی ترتیب سے درج کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اشخاص کے ناموں میں سرنیم پہلے لکھا جائے گا۔ کتابوں کی نام فطری ترتیب سے ہوں گے۔ ہر اندراج کے آگے ان تمام صفحات کے نمبر درج کیے جائیں گے جن پر وہ اندراج واقع ہے۔ یہ بالکل ضروری نہیں کہ ہر غیر ضروری اور کم اہم نام کو اشاریے میں درج کیا جائے۔

۲۔ بہتر طریقہ یہ ہے کہ اندراجات کو کئی زمروں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ان میں دو اہم ترین زمرے ہوں گے: ۱۔ اشخاص ۲۔ کتابیں اور رسالے۔ ان کے علاوہ مقامات، ادبی اصناف و موضوعات کو بھی علاحدہ علاحدہ درج کیا جاسکتا ہے۔ زیادہ گروہوں کی ضرورت نہیں۔ اشخاص میں ادیبوں اور دوسری اہم شخصیتوں ہی کو لینا چاہیے، مثنوی و داستان کے کرداروں کو نہیں۔

اگر اشاریہ بہت طویل اور مفصل ہوگا تو ضروری اندراج تلاش کرنے میں دقت ہوگی۔ قاری کی ضرورت کو پیشِ نظر رکھ کر اسے حدود میں، اور مختصر رکھیے۔ میری کتاب ''اُردو کی نثری داستانیں'' طبع دوم میں ناشر: انجمن ترقی اُردو نے ابو سلمان شاہجہاں پوری سے اشاریہ بنوا کر شامل کیا۔ یہ ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ذیل کے زمرے ہیں:

۱۔ شخصیات اور کردار۔ اس میں ستم یہ کیا ہے کہ داستانوں کے کردار: شہزادہ کام روپ، راجا کام سین، کوکب روشن ضمیر وغیرہ کو بھی شامل کر لیا ہے۔
۲۔ کتب ۳۔ مقامات ۴۔ ادارے۔

ڈاکٹر جالبی کی تاریخ ادبِ اُردو، جلد اول (۶) کے اشاریے میں ذیل کے زمرے ہیں:
۱۔ کتب ۲۔ اشخاص ۳۔ مقامات ۴۔ موضوعات

انھی کی جلد دوم میں یہ زمرے بڑھ کر اتنے ہو گئے ہیں:
۱۔ کتب و منظومات ۔۲۔ مقالات ۔۳۔ رسائل و جرائد ۔۴۔ موضوعات۔
۵۔ لسانیات ۶۔ علمی و ادبی ادارے اور پریس ۷۔ اشخاص، اقوام و ملل، افسانوی کردار ۸۔ مقامات ۹۔ متفرقات، جس میں دو عنوان جنگیں اور سیاسی ادارے ہیں۔

تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند (۷) کی جلد ۶ تا ۱۰ اُردو ادب سے متعلق ہیں۔ ان کا اشاریہ ایک پوری جلد نمبر ۱۵ میں ہے۔ اس میں ۲۶ زمرے ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں:

اخبارات و رسائل۔ ادارے۔ ادبیات۔ ادبی اصطلاحات۔ اشخاص۔ تحریکات۔ دبستان۔ شعر و شاعری۔ کتب۔ مضامین و مقالات، وغیرہ۔
یہ کوئی سماجی تاریخ نہیں، اس لیے اس میں ایسے عنوانات غیر ضروری ہیں:
اقوام و قبائل۔ پیشے۔ تہذیب و تمدن۔ تہوار۔ رسوم و مشاغل۔ لباس۔ زیورات و سامانِ آرایش، وغیرہ۔

ہمارے محققین کو اہم اور غیر اہم میں تمیز کرنی چاہیے۔ اہلِ اُردو کے مادی و ذہنی وسائل محدود ہیں، انھیں کم اہم کاموں میں صرف نہ کیجیے۔ طباعت کی اس گرانی کے دور میں آٹھ دس صفحات کا اشاریہ کافی ہونا چاہیے۔ اس میں اشخاص، کتب اور رسالے سب سے اہم ہیں۔ اس کے بعد ادارے، موضوعات و تحریکات کو لے سکتے ہیں، اور بس۔ میرے نزدیک مقامات کی بھی چنداں اہمیت نہیں۔

بعض عربی زدہ حضرات ''اشخاص'' کو رجال اور مقامات کو امکنہ کہتے ہیں۔ یہ دقیق نگاری مستحسن نہیں۔

---

(۱) ''تحقیق کا فن'' ڈاکٹر گیان چند'' اسلام آباد ۱۹۹۴ء، ص ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۲۵ تا ۳۴۲

مکتوبات شاد عظیم آبادی	شاد عظیم آبادی	ڈاکٹر زور	۱۹۳۹ء
شاد و اقبال	کشن پرشاد شاد اور اقبال	ڈاکٹر زور	۱۹۴۲ء
خطبات			
مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچز	سرسید	امام الدین لاہور	۱۹۰۰ء
نذیر احمد کے لیکچروں کا مجموعہ	نذیر احمد	بشیر الدین احمد آگرہ	۱۹۱۸ء
متفرق			
معراج العاشقین	خواجہ بندہ نواز (کذا)	عبدالحق	۱۹۴۳ء
ذکر میر	میر	عبدالحق	۱۹۲۸ء
فیض میر	میر	مسعود حسن رضوی	۱۹۲۹ء
مجالس رنگین	رنگین	مسعود حسن رضوی	۱۹۲۹ء

تذکرے بڑی تعداد میں ترتیب دے کر شائع کیے گئے۔ چونکہ ان کی تفصیل مضمون کی ابتدا میں دی جا چکی ہے اس لیے یہاں اسے حذف کیا جاتا ہے۔ ترتیب متن کے سلسلے میں سب سے سنسنی خیز کارنامہ غالب کے قلم زد کلام کی دریافت ہے، جسے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے ۱۹۱۸ء میں دریافت کیا لیکن وہ اس کی ترتیب سے پہلے انتقال کر گئے۔ بعد میں مفتی انوار الحق نے ۱۹۲۱ء میں نسخۂ حمیدیہ کے نام سے ترتیب دیا۔ اس میں انھوں نے غالب کا بعد کا کلام بھی ملا کر ابتدائی دیوان کی صورت مسخ کر دی۔ اس طرح مفتی صاحب کی ترتیب قابل قدر نہیں۔ اصل اہمیت اس متن کو افشا کرنے کی ہے اور یہ غالبیات میں سنگ میل ہے۔

اسی طرح کی دریافت دکنیات کے خزانوں کی ہے، جس نے کئی سو سال کے دفینے ہماری نظروں کے سامنے الٹ دیئے۔ ان کی اشاعت کی اہمیت ترتیب متن میں نہیں، دریافت متن میں ہے۔ اب معلوم ہوا کہ ان کے بہت سے متنوں کو از سرِ نو ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ مثلاً مصحفی کے تذکرہ ہندی کو انھوں نے ایک ناقص نسخے کی بناء پر چھاپ دیا ہے۔ معراج العاشقین کو رسمی مشابہت کی بناء پر انھوں نے خواجہ بندہ نواز سے منسوب کر کے ایک بڑی غلط فہمی کو رائج کیا۔ ڈاکٹر حسینی شاہد اور ڈاکٹر حفیظ قتیل کی تحقیق ہے کہ یہ نسخہ ڈھائی صدی بعد کے ایک دوسرے بزرگ مخدوم شاہ حسینی کی تصنیف ہے۔

مثالی تدوین متن کے کیا تقاضے ہوتے ہیں، انھیں مولانا عرشی نے عملاً واضح کیا۔ مکاتیب غالب میں انھوں نے غالب کے وہ خطوط پیش کیے جو والیان رام پور کو لکھے گئے تھے۔ اس پر انھوں نے ایک معرکہ کا مقدمہ لکھا اور متن کی صحت کا پورا خیال رکھا۔

تذکروں کی ترتیب کس نہج پر ہونی چاہیے، اس کا معیار بھی مولانا عرشی نے قائم کیا۔ احمد علی یکتا نے ۱۸۳۴ء میں دستور الفصاحت لکھی تھی، جو بلاغت کی کتاب ہے۔ اس میں جن شعرا کے اشعار درج کیے گئے تھے، کتاب کے ساتویں حصے میں ان کے حالات بھی لکھ دیئے تھے۔ گویا یہ حصہ ایک قسم کا تذکرہ تھا۔ عرشی صاحب نے ۱۹۴۳ء میں اسی کو ترتیب دے کر شائع کیا۔ انھوں نے حواشی کو یہ وسعت دی کہ شامل تذکرہ ایک ایک شاعر کو لے کر دوسرے تذکروں سے بھی اس کے ترجمے نقل کر دیے، تاکہ دوسروں کے بیانات کا فرق واضح ہو جائے۔ یہ تحشیہ نگاری کی غیر معتدل صورت ہے۔ ان خطوط پر اصل تذکرے کے مقابل اس سے دس گنے حجم کا ایک اور تذکرہ تیار ہو جائے گا۔ اسے کچھ بھی کہا جائے لیکن یہ کام ترتیب متن کے ضمن میں نہیں آئے گا۔ مولانا عرشی کے بعد آج تک کسی نہ کسی تذکرے پر اس انداز سے حواشی نہیں لکھے۔

بہر حال قابل اطمینان بات یہ ہے کہ آزادی سے قبل ہی ترتیب متن کے اعلیٰ نمونے سامنے آنے لگے تھے۔ دکنی متون اور تذکروں کو اس کاوش سے پیش کیا گیا کہ ان پر پورا ابھر وسا کیا جا سکتا ہے۔

تحقیق کی اس روداد کے بعد آزادی سے قبل کے محققوں کا ایک اجمالی تعارف پیش کرنا بے موقع نہ ہوگا۔ سب سے پہلے ان رسمی محققوں کو لیجیے، جو یونیورسٹیوں سے پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کی ڈگریاں لیتے ہیں۔ اب ڈگری یافتہ ڈاکٹروں کی آبادی بہت ہو گئی ہے لیکن آزادی سے قبل کے مقالہ نویس دو ہاتھوں کی انگلیوں پر شمار کیے جا سکتے تھے۔

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے آزادی سے بہت پہلے کلکتہ یونیورسٹی سے جدید اُردو شاعری کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری لی، ان کا مقالہ انگریزی میں تھا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ڈگری اُردو کی تھی یا کسی اور مضمون کی چونکہ اس وقت کلکتہ یونیورسٹی میں ایم اے اُردو کی جماعتیں نہیں تھیں، اس لیے یہ قرین قیاس نہیں کہ انھیں

اُردو میں ڈگری دی گئی ہو۔

ڈاکٹر زور نے ۱۹۳۰ء میں لندن یونیورسٹی سے ''اُردو کا آغاز اور ارتقا'' پر پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ اُردو شہ پارے، ہندوستان لسانیات اور ہندوستانی صوتیات اسی کے حصے ہیں، یہ بات خود انھوں نے مجھے بتائی تھی۔ ہو سکتا ہے انگریزی میں ان کا جو مقالہ رہا ہو، اس کے مختلف حصوں کو پھیلا کر ان کتابوں کی شکل دی گئی ہو۔ مجھے اس کی نوعیت میں شبہ ہے کہ یہ اُردو کی ڈگری تھی کہ لسانیات کی۔ انھوں نے ڈی لٹ کے لیے پیرس یونیورسٹی میں گجری بولی پر کام کرنا چاہا لیکن پورا کیے بغیر واپس آ گئے۔

ہندوستانی یونیورسٹیوں کے اُردو کے شعبوں سے جن لوگوں نے ڈگریاں لی ہیں، وہ زیادہ معتبر ہیں۔ آزادی سے قبل ڈی لٹ کی ڈگری کی صرف ایک مثال ملتی ہے۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین نے الہ آباد یونیورسٹی سے مذہب اور شاعری کے موضوع پر ۱۹۴۶ء میں ڈی لٹ کی۔ پی ایچ ڈی کی تفصیل یہ ہے:

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	لکھنؤ کا دبستان شاعری	علی گڑھ یونیورسٹی
ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	دلی کا دبستان شاعری	علی گڑھ یونیورسٹی
ڈاکٹر مسعود حسین خان	تاریخ زبان اُردو	علی گڑھ یونیورسٹی
ڈاکٹر جگت نرائن میکروال	پریم چند حیات اور تخلیقات	لکھنؤ یونیورسٹی ۱۹۴۵ء
ڈاکٹر عبادت بریلوی	اُردو تنقید کا ارتقا	لکھنؤ یونیورسٹی ۱۹۴۵ء
ڈاکٹر سید رفیق حسین	اُردو غزل کی نشو ونما ۱۸۵۰ء تک	الہ آباد یونیورسٹی ۱۹۴۲ء
ڈاکٹر حامد حسین بلگرامی	اُردو میں منظر نگاری	الہ آباد یونیورسٹی ۱۹۴۲ء
ڈاکٹر گیان چند جین	اُردو کی نثری داستان	ایضاً ۱۹۴۸ء

راقم الحروف نے اپنا مقالہ ۱۹۴۶ء میں مکمل کیا۔ جون ۱۹۴۷ء میں یونیورسٹی میں داخل کیا اور ۱۹۴۶ء میں ڈگری لی چونکہ کام کی تکمیل آزادی سے پہلے ہو گئی تھی، اس لیے میں نے اپنے کام کو اس جائزے میں بار دیا ہے۔

ہندوستانی یونیورسٹیوں سے استاذی ڈاکٹر سید رفیق حسین اُردو کے پہلے پی ایچ ڈی ہیں اور استاذی ڈاکٹر سید اعجاز حسین پہلے ڈی لٹ۔

محققوں کی یہ فہرست ان ناموں کی ہے جو ضابطے کے اعتبار سے محقق کا ٹھپہ لیے ہوئے ہیں۔ لیکن زیادہ معیاری اور زیادہ قابل قدر کام ان پختہ کار محققوں کے تھے، جو ڈگری سے بلند و بالا تھے، جنھیں فاضل تحقیق کہا جا سکتا ہے۔ اہم محققوں کے آزادی سے قبل کے کارناموں کی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔

۱۔ حبیب الرحمٰن خان شیروانی:

صدر یار جنگ رئیس بھیکم پور (۱۸۶۵ء تا ۱۹۵۰ء) یہ غبار خاطر کے صدیق مکرم ہیں۔ انھوں نے ۱۹۲۲ء میں میر حسن کا تذکرہ شعرائے اُردو ۱۹۲۶ء میں میر کا تذکرہ نکات الشعرا مرتب کیا۔ نکات الشعرا کو بعد میں مولوی عبدالحق نے مرتب کیا۔ انھوں نے خواجہ میر درد کا دیوان بھی مرتب کیا۔

۲۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق (۱۸۷۱ء تا ۱۹۶۱ء)

ان کے تحقیقی کارنامے بہت زیادہ ہیں۔ تحقیق میں ان کی اصل خدمت پرانے متنوں کو ترتیب دے کر شائع کرنے میں ہے۔ انھوں نے ذیل کے تذکرے مرتب کیے:

چمنستان شعرا از شفیق، ۱۹۲۸ء۔ مخزن کا نکات از قائم، ۱۹۲۹ء۔ تذکرہ ریختہ گویان (گلشن راز) از گردیزی ۱۹۳۳ء۔ ریاض الفصحا از مصحفی ۱۹۳۴ء۔ نکات الشعرا از میر ۱۹۳۵ء۔ گل عجائب از اسد علی خان تمنا ۱۹۳۶ء۔

شبلی نے مرزا علی لطف کے تذکرہ گلشن ہند کو ۱۹۰۶ء میں ترتیب دیا، جس پر مولوی عبدالحق نے مقدمہ لکھا۔

مثنویات میں انھوں نے وجہی کی قطب مشتری ۱۹۳۹ء، نصرتی کی گلشن عشق اور میر اثر کی خواب و خیال مرتب کیں۔ دواوین میں عبدالحی تاباں کا دیوان، انتخاب کلام میر ۱۹۲۱ء، اور دیوان اثر ۱۹۳۰ء مرتب کیے۔

انشا کی دریائے لطافت کا فارسی متن مرتب کر کے ۱۹۱۶ء میں شائع کیا۔ ذکر میر ۱۹۲۸ء میں اور معراج العاشقین ۱۹۴۳ء میں۔ وجہی کی سب رس کو

دریافت کر کے انھوں نے رسالہ اُردو، اکتوبر ۱۹۲۴ء میں مضمون لکھا جو بعد کو ان کے مرتبہ ''سب رس'' میں مقدمہ کے طور پر شامل ہوا۔ اسی طرح باغ و بہار پر رسالہ اُردو جولائی ۱۹۳۰ء میں مضمون لکھا جو اس کتاب سے پہلے شائع ہوا۔ داستان رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی ۱۹۲۳ء میں شائع کی۔ رسالہ اُردو، جنوری ۱۹۲۲ء میں ان کا مضمون کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ شائع ہوا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زور سے پہلے مولوی صاحب اس کلیات کا عرفان کر چکے تھے۔

ان کے مقدمات، خطبات اور ادبی تبصروں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ آزادی سے قبل مقدمات عبدالحق ۱۹۳۱ء میں مرزا محمد بیگ حیدر آبادی کی ترتیب سے شائع ہوئے۔ خطبات عبدالحق کی پہلی جلد ۱۹۳۹ء میں اور دوسری ۱۹۴۴ء میں آئی۔ ۱۹۵۲ء میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے خطبات عبدالحق کا جامع ایڈیشن شائع کیا۔

ان کی مستقل تصانیف کی تعداد زیادہ نہیں۔ آزادی سے پہلے ادبی تحقیق سے متعلق کتابیں یہ ہیں:

''اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام'' ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی۔ مرحوم دلی کالج کے عنوان سے رسالہ اُردو ۱۹۳۳ء میں مضمون شائع ہوا، کتاب ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی۔ نصرتی ملک الشعرا بیجاپور ۱۹۳۸ء یا ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی۔ رسالہ اُردو کے پہلے شمارے ۱۹۲۱ء کی بسم اللہ ان کے مضمون ''مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر'' سے ہوئی۔ بعد میں یہ مضمون کتابی شکل میں آ گیا لیکن چونکہ یہ لسانیات سے متعلق ہے اس لیے ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

ترتیب متن ایک دشوار گزار کام ہے۔ ممکن نہیں کہ ایک فرد اتنے بہت سے کاموں کو تشفی آمیز طریقے پر انجام دے سکے۔ قاضی عبدالودود نے رسالہ معاصرہ پٹنہ شمارہ ۱۳ سے ۱۵ تک میں ایک ضخیم مضمون ''عبدالحق بحیثیت محقق'' لکھا ہے۔ مجھے معاف کیا جائے کہ اس مضمون کے پڑھنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مولوی صاحب ایک غیر محتاط محقق تھے۔ وہ فارسی عبارتوں کے معنی سمجھنے میں بھی سہو کر جاتے تھے۔ انھوں نے معراج العاشقین اور تذکرہ ہندی کا ناقص متن چھاپ دیا۔ حد یہ ہے کہ اس انتخاب کلام میر میں یہ صراحت بھی نہیں کی کہ یہ انتخاب کلیات کے کس نسخے پر مبنی ہے۔ ان متنوں کے اختلافات نسخ سے عاری ہوتے ہیں۔ گو اختلافات نسخ کا دینا ترتیب متن کی مبادیات میں سے ہے۔

میں یہ مانتا ہوں کہ مولوی عبدالحق کے مرتبہ متون کو جدید اصول کی روشنی میں از سر نو مرتب کرنے کی ضرورت ہے اور ان میں سے بعض مرتب کیے جا رہے ہیں۔ لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ انھوں نے اتنے سارے قدیم متنوں کو اچھی خاصی (گو بہترین نہیں) ہیئت میں متعارف کر کے کتنی بڑی خدمت انجام دی ہے۔

۳۔ حافظ محمود خان شیرانی (۱۸۸۸ء تا ۱۹۴۵ء)

ان کی تحقیق کے زیادہ اہم حصے ہمارے دائرہ تحریر سے خارج ہیں۔ مثلاً تنقید شعر العجم، فردوسی پر چار مقالے، پرتھی راج راسو وغیرہ۔ ان کی سب سے مشہور تصنیف ''پنجاب میں اُردو'' کی اہمیت لسانی نظریے کے لیے زیادہ ہے، ادبی تحقیق کے لیے کم ہے۔ اُردو تحقیق میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ امیر خسرو کو دو تصانیف سے بے دخل کرنا ہے۔ مفت کرم داشتن کے بمصداق قصہ چہار درویش کو امیر خسرو کی تصنیف قرار دیا جاتا تھا۔ شیرانی نے رسالہ کاروان ۱۹۳۳ء میں مضمون لکھ کر شافی طریقے پر ثابت کر دیا کہ یہ قصہ خسرو سے بہت بعد کا ہے۔ لیکن انھوں نے عہد محمد شاہی کے محمد معصوم علی خان کو جو اس کا مصنف ٹھہرایا وہ بھی صحیح نہ تھا۔ خالق باری کے لیے انھوں نے ثابت کیا کہ امیر خسرو کی تصنیف نہیں بلکہ عہد جہانگیر کے کسی ضیاء الدین خسرو کی ہے۔ ابھی یہ پوری طرح محقق نہیں، لیکن ان کے اس دعوے کو ماننے کو جی چاہتا ہے کہ یہ عامیانہ لغت خسرو کی تخلیق نہیں۔

انھوں نے قدرت اللہ قاسم کے ضخیم تذکرے مجموعہ نغز کو حسن و خوبی سے ترتیب دیا اور اس پر بڑا عالمانہ مقدمہ لکھا۔ ان کے مضامین کو مقالات حافظ محمود شیرانی کے نام سے مجلس ترقی ادب لاہور نے ۱۹۶۶ء کے قریب ۶ جلدوں میں شائع کیا۔

۴۔ سید مسعود حسین رضوی ادیب (۱۸۹۳ء تا ۱۹۷۵ء)

یہ اُردو کے مثالی محققوں میں سے ہیں۔ انھوں نے آزادی سے پہلے کئی اہم تحقیقی مضامین لکھے اور چند متون شائع کیے۔ ان میں سے قابل ذکر یہ ہیں۔

۱۔ فیض میر۔ ۱۹۲۹ء۔ اس میں میر نے درویشوں کی پانچ حکایات لکھی ہیں۔ اس کتاب کی دریافت مسعود صاحب ہی کا کارنامہ ہے۔ انھوں نے میر کی گمشدہ کتاب ذکر میر کا ایک نسخہ بھی کھو جا تھا۔ اس کی کتابت کرائی کہ اسی دوران میں انجمن ترقی اُردو نے یہ کتاب شائع کر دی۔ مسعود صاحب نے اپنا کام روک کر فیض میر کی اشاعت پر اکتفا کیا۔

۲۔ مجالس رنگین۔ ۱۹۲۹ء۔

۳۔ روح انیس۔ اس میں انیس کے سات بہترین مرثیوں اور چند سلاموں اور رباعیات کو کمال صحت کے ساتھ پیش کیا۔ ۱۹۳۱ء سے لے کر تا حال اس کے پانچ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

۴۔ دیوان فائز۔ ۱۹۴۶ء۔ انھوں نے ۱۹۲۵ء میں اس دیوان کا نسخہ دریافت کیا۔ ان سے پہلے کوئی اس شاعر کے نام سے بھی واقف نہ تھا۔ ان کی ضبط کی داد دینی چاہیے کہ انھوں نے یہ دیوان ۱۹۴۶ء میں شائع کیا اور اسی طرح شمالی ہند میں اُردو کے ایک بہت قدیم شاعر کا اضافہ کیا۔

مسعود صاحب نے غالبیات میں ایک کتاب ''متفرقات غالب'' ترتیب دی جو رضا لائبریری رام پور کی طرف سے ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی۔ اس مجموعے میں غالب کے کئی خطوط، نظمیں اور ایک اُردو غزل پہلی بار پیش کی۔ مجموعے میں بعض مطبوعہ چیزوں کی بھی قدیم تر روایات شامل کی ہیں۔

مسعود صاحب نے رسالوں میں اعلیٰ درجے کے تحقیقی مضامین لکھے۔ انھوں نے امانت کی تصنیف ''شرح اندر سبھا'' کو دریافت کر کے پہلی بار رسالہ اُردو میں شائع کیا۔ مسعود صاحب کے بہترین تحقیقی کارنامے آزادی کے بعد سامنے آئے ہیں لیکن آزادی سے قبل بھی وہ ایک چوٹی کے محقق کا رتبہ حاصل کر چکے تھے۔

۵۔ غلام رسول مہر (۱۸۹۴ء تا نومبر ۱۹۷۱ء)

ماہر غالبیات مولانا غلام رسول مہر نے غالب کے خطوں کی مدد سے غالب کی مفصل اور مستند سوانح عمری مرتب کی۔ آزادی کے بعد انھوں نے خطوط غالب بھی دو جلدوں میں ترتیب دیے۔

۶۔ قاضی عبدالودود (پیدائش ۱۸۹۸ء)

قاضی صاحب کو معلم المحققین یا تنبیہ الغافلین تحقیق کہنا چاہیے۔ انھوں نے تحقیق کا جو اعلیٰ معیار مقرر کیا ہے، اس پر بہت کم محقق اور تحقیقی کارنامے پورے اتر سکے ہیں۔ تحقیق میں غیر معتبر حوالوں اور غیر ثقہ متون سے بچنا اور انتہا کا حزم و احتیاط ان کا شیوہ خاص ہے۔ انھوں نے میدان تحقیق کے بڑے بڑے جغادریوں کے کاموں کا جائزہ لیا اور ان کے پرخچے اڑا دیے۔ اُردو کی ادبی تحقیق کو جس حد تک قاضی صاحب نے متاثر کیا ہے، اتنا کسی اور نے نہیں کیا۔ ان کی تنبیہ کے خوف سے بڑوں بڑوں کا زہرہ آب ہو جاتا ہے۔

ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی کتابیں دیوان جوشش، قطعات دلدار اور دیوان رضا، آزادی سے قبل کی ہیں۔ انھوں نے غالباً ۱۹۳۶ء میں رسالہ معیار جاری کیا جو زیادہ نہ چل سکا۔ ۱۹۳۶ء کے معیار کے شماروں میں ان کے بہت سے مضامین شائع ہوئے۔ بعد میں وہ رسالہ معاصرہ پٹنہ کو خاص طور سے نوازتے رہے۔

۷۔ نصیر الدین ہاشمی (۱۸۹۵ء تا ۱۹۶۵ء)

دور جدید میں دکنیات پر لکھنے والوں میں ان کی حیثیت قافلہ سالاروں کی ہے۔ ان کی کتاب ''دکن میں اُردو'' اپنے رنگ میں منفرد ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۵ء کے قریب نکلا۔ اس کے بعد بہت سے ایڈیشن نکل چکے ہیں اور ہر بار اس میں اضافے ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ ان کی زندگی کا آخری ایڈیشن نہایت ضخیم ہے۔ آزادی سے قبل ان کی تصنیف ''مدراس میں اُردو، یورپ میں دکھنی مخطوطات'' شائع ہو چکی تھیں۔ آخر الذکر محض مخطوطات کی فہرست نہیں بلکہ ایک تحقیقی کارنامہ ہے۔ انھیں کی تقلید میں اُردو کی علاقائی تاریخیں لکھنے کا رواج ہوا۔ ان کے مضامین کے دو مجموعے ''دکھنی کے چند تحقیقی مضامین'' اور مقالات ہاشمی ۱۳۵۶ھ کے ہیں۔

مرحوم نے ایک بار راقم الحروف سے کمال انکسار سے اعتراف کیا تھا کہ ''چونکہ میرا علم زیادہ نہیں اس لیے میری تحقیق میں غلطی رہ جاتی ہے'' اس کا اعتراف کا پہلا حصہ تو صحیح نہیں، لیکن دوسرا حصہ بڑی حد تک ایک حقیقت ہے انھوں نے کتب خانوں کی جو وضاحتی فہرستیں شائع کی ہیں ان میں بڑی فاش غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن ''دکن میں اُردو'' اور ''یورپ میں دکنی مخطوطات'' کو کسی طرح غیر معیاری کام نہیں قرار دیا جا سکتا۔

۸۔ ڈاکٹر غلام محی الدین قادری زور (۱۹۰۵ء تا ۱۹۶۲ء)

اگر مولوی عبدالحق بابائے اُردو تھے تو میں ڈاکٹر زور کو ''بابائے دکنی اُردو'' کہوں گا۔ انھیں دکنی اُردو سے عشق تھا۔ انھوں نے دکنی ادب اور دکنی ادیبوں کو پایہ اعتبار عطا کیا۔ بعض حضرات کی تعریف میں کہا جاتا ہے کہ

ع وہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں

ڈاکٹر زور کے لیے کہا جائے گا کہ وہ اپنی ذات میں ایک ادارہ تھے۔ آزادی سے قبل ان کے کئی شاہکار وجود میں آ گئے تھے۔ جن میں اہم ترتیب متن کے دو کارنامے ''اُردو شہ پارے'' (۱۹۲۸ء) اور ''کلیات قلی قطب شاہ'' (جون ۱۹۴۰ء) کی ترتیب ہے۔ اُردو شہ پارے میں دکنی ادیبوں کی نگارشات کے نمونے ہی نہیں بلکہ حالات بھی ہیں۔ اس طرح یہ کتاب دراصل ایک تذکرہ یا علاقائی تاریخ ادب ہے۔ انھوں نے ۱۹۳۴ء میں ''گلزار ابراہیم مع گلشن ہند'' مرتب کیا، جس میں مولوی عبدالحق کا مقدمہ بھی شامل کیا ہے۔ وہ ابراہیم نامہ اور ارشاد نامہ کی ترتیب غالباً ۱۹۴۰ء تک مکمل کر چکے تھے۔ مکتوبات شاد (عظیم آبادی) مرتب کر کے اکتوبر ۱۹۳۹ء میں شائع کیے اور شاد و اقبال ۱۹۴۲ء میں۔ اس میں مہاراجا سرکشن پرشاد اور اقبال کی مراسلت ہے۔

ان کی مستقل تصانیف میں چند منفرد ادیبوں کی سوانح ہیں، جن میں حیات سلطان محمد قلی قطب شاہ ممتاز ہے۔ قطب شاہی کے پیشوائے سلطنت میر محمد مومن کی سوانح حیات میر محمد مومن (۱۹۴۱ء) بھی قابل ذکر ہے لیکن مومن کی حیثیت سیاسی ہے، ادبی نہیں۔ سرگزشت غالب، سرگزشت حاتم اور گارساں دتاسی نسبتاً سرسری کتابیں ہیں جن میں گارساں دتاسی کسی قدر بہتر ہے۔ پہلے یہ مضمون کی شکل میں شائع ہوئی تھی، بعد میں اضافوں کے ساتھ کتاب بن گئی۔

اُردو شہ پارے کے علاوہ انھوں نے دکنی ادب کی تین تاریخیں لکھیں۔ ''داستان ادب حیدرآباد'' میں قطب شاہی کے دور سے جامعہ عثمانیہ کے قیام تک کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ''عہد عثمانی میں اُردو کی ترقی'' (۱۹۳۴ء) کا موضوع نام سے ظاہر ہے۔ ۱۹۶۰ء میں کراچی سے ان کی کتاب ''دکنی ادب کی تاریخ'' شائع ہوئی۔ یہ مندرجہ بالا کتب پر اضافہ ہے انھوں نے ادارہ ادبیات اُردو کے مخطوطات کی فہرستیں ۵ جلدوں میں شائع کیں، جن میں سے صرف پہلی جلد آزادی سے قبل ۱۹۴۳ء میں سامنے آئی۔ والہ کی مثنوی ''طالب وموہنی'' کی ترتیب بھی آزادی سے بعد کا کام ہے۔ دکنیات کی تحقیق و تدوین و اشاعت میں ان کی حیثیت ایک چھتنار درخت کی سی ہے۔ دکنیات سے ہٹ کر انھوں نے جو کام کیے ہیں، مثلاً ہندوستانی لسانیات یا غالب یا حاتم کی سرگذشت، وہ قابل اطمینان نہیں ہیں۔

۹۔ پروفیسر عبدالقادر سروری (غالباً ۱۹۰۶ء تا ۱۹۷۱ء)

ڈاکٹر زور کی طرح مرحوم سروری بھی جامعہ عثمانیہ سے متعلق تھے۔ ان کی کتاب ''اُردو مثنوی کا ارتقا'' خاص طور سے دکنی مثنوی ہی کی تاریخ ہے لیکن سروری صاحب کے کاموں میں یہ چنداں اہم نہیں۔ ان کے بڑے کارنامے ترتیب متن کے ہیں۔ ۱۳۵۷ھ مطابق ۱۹۳۸ء میں انھوں نے ابن نشاطی کی مثنوی، پھول بن، مرتب کی، جو ان کی رائے میں دکن کی بہترین مثنوی ہے۔ ان کا سب سے اہم کام کلیات سراج (۱۹۴۰ء) کی ترتیب ہے، جس پر انھوں نے ایک نہایت سیر حاصل مقدمہ لکھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے ''انتخاب سراج'' بھی ترتیب دیا۔ صنعتی کے قصہ بے نظیر کو بھی مرتب کیا۔ ۱۹۴۴ء میں شاہ صدرالدین کی ''مراۃ الاسرار'' کو بنگلور سے شائع کیا۔

ان کے کئی کام آزادی کے بعد وجود میں آئے جن میں سے ''اُردو کی ادبی تاریخ'' قابل ذکر ہے۔ کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ'' شائع ہو چکی ہے اور ''کشمیر میں اُردو ادب کی تاریخ'' (تین جلدیں) ابھی تک زیر اشاعت ہیں۔

۱۰۔ شیخ چاند (۱۹۰۶ء تا ۱۹۳۶ء)

شیخ چاند نے مولوی عبدالحق کی نگرانی میں ''سودا'' پر تحقیقی مقالہ لکھا۔ ۱۹۳۰ء میں عثمانیہ یونیورسٹی میں داخل کیا۔ معلوم نہیں کیوں ڈگری نہیں ملی۔ ان کی یہ تحقیقی کتاب ''سودا'' ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس نے اُردو میں منفرد ادیبوں پر تحقیقی مقالے لکھنے کا نہج مقرر کیا۔ شیخ چاند نے مولوی عبدالحق کے ساتھ ''خطبات گارساں دتاسی'' کے حواشی بھی لکھے۔ ترقی اُردو بورڈ کراچی نے ۱۹۶۸ء میں شیخ چاند کی مرتبہ مثنوی ''خاور نامہ'' شائع کی ہے۔ میری نظر سے نہیں گزری۔ معلوم نہیں یہ سودا والے شیخ چاند ہی ہیں یا کوئی اور صاحب ہیں۔

۱۱۔ سید محمد

ان کی شہرت ''ارباب نثر اُردو'' کے مصنف کی حیثیت سے ہے۔ اس میں فورٹ ولیم کالج کے مصنفین پر پہلی بار تفصیل کے ساتھ لکھا گیا۔ ترتیب متن میں ان کے کارنامے حسب ذیل ہیں۔

۱۔ خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی کا تذکرہ گلشن گفتار ۱۹۳۹ء فصلی۔ ۲۔ دیوان عبداللہ قطب شاہ ۱۹۳۹ء۔ ۳۔ محمد علی عاجز کی مثنوی قصہ ملکہ مصر۔ ۴۔ مثنویات میر۔ ۱۹۵۶ء میں انھوں نے فائز کی مثنوی رضوان شاہ اور روح افزا کو شائع کیا لیکن وہ ہمارے دائرے سے خارج ہے۔

۱۲۔ مولانا امتیاز علی عرشی (پیدائش ۱۹۰۴ء)

اُردو کے عمائد تحقیق میں مولانا عرشی کا نام ممتاز ہے۔ وہ بنیادی حیثیت سے ماہر غالبیات ہیں لیکن انھوں نے دوسرے میدانوں میں بھی دادِ تحقیق دی ہے۔ آزادی سے قبل ۱۹۳۷ء میں انھوں نے ''مکاتیب غالب'' شائع کر کے ترتیب متن کی ایک اچھی مثال قائم کی۔ اس کا مقدمہ جتنا ضخیم ہے، اتنا ہی عالمانہ ہے۔ غالب نے اپنے فارسی اُردو کلام کا انتخاب خود کر کے نواب رام پور کو بھیجا تھا۔ مولانا عرشی نے اسے دریافت کر کے ۱۹۴۲ء میں شائع کیا۔ ۱۹۴۴ء میں انھوں نے یکتا کی ''دستور الفصاحت'' ترتیب دی، جس میں تذکروں کی ترتیب کا اتنا بلند معیار قائم کر دیا جس تک کوئی دوسرا پہنچ ہی نہ سکا۔ ۱۹۴۷ء میں انھوں نے شاہ عالم آفتاب کا کلام ''نادرات شاہی'' مرتب کیا۔ ۱۹۴۷ء میں انھوں نے فرہنگ غالب شائع کی۔

۱۳۔ شیخ محمد اکرام (ولادت ۱۹۰۷ء)

ماہر غالبیات میں ان کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ غالب کی تحقیق و تنقید دونوں میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے ۱۹۳۶ء میں ''غالب نامہ'' شائع کی۔ نقش ثانی میں اس کا نام ''آثار غالب'' ہو جاتا ہے۔ اس میں انھوں نے غالب کی سوانح کے ساتھ ساتھ ان کی ذات و نفسیات کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کی مذہبی، روحانی اور علمی تاریخ ''آبِ کوثر'' ''رودِ کوثر'' اور ''موجِ کوثر'' کے نام سے لکھیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ آزادی سے پہلے کے کام ہیں یا بعد کے۔ ان کی ''شبلی نامہ'' غالباً تقسیم ملک سے بعد کی ہے۔

۱۴۔ مالک رام (ولادت ۱۹۰۷ء)

یہ ماہر غالبیات بھی ہیں اور چوٹی کے محقق بھی۔ انھوں نے غالب کی مستند سوانح ''ذکر غالب'' کے نام سے ۱۹۳۸ء میں شائع کی۔ غالب کے فارسی کلام ''سبد چین'' کو بھی انھوں نے اسی سال میں شائع کیا۔ اس کے علاوہ غالب پر ان کے تحقیقی مضامین کی تعداد بہت زیادہ ہے، جن میں سے کئی آزادی سے قبل لکھے جا چکے تھے۔ ان کے زیادہ وقیع کام آزادی کے بعد وجود میں آئے جن میں ''ذکر غالب'' کا پانچواں ایڈیشن قابل ذکر ہے۔ اسے غالب کی مستند ترین سوانح عمری کہا جائے گا۔ ترتیب متن میں ان کے شاہکار آزادی کے بعد کے ہیں۔

ان علماء کے علاوہ آزادی سے قبل دوسرے کئی حضرات نے اُردو تحقیق میں اضافے کیے لیکن میں نے صرف ان کا ذکر کیا ہے جو تحقیق اور ترتیب متن کے قافلہ سالاروں میں ہیں۔ میں نے اس فہرست میں ڈاکٹر سید عبداللہ کا نام نہیں لیا، جن کا مضمون ''شعرائے اُردو کے تذکرے'' پہلے رسالہ اُردو میں شائع ہوا، بعد میں کتابی شکل میں۔ تحقیقی اعتبار سے یہ مضمون نہایت اہم ہے لیکن ڈاکٹر سید عبداللہ ہمارے ذہن میں محقق سے زیادہ نقاد کی حیثیت سے ابھرتے ہیں۔

اُردو تحقیق اور تحقیق کاروں کے اس سرسری جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزادی سے قبل کی ربع صدی ادبی تحقیق کے ارتقا میں ایک زریں دور کہلائے گی۔ اس عہد میں اُردو ادب کی تاریخ میں کچھ بنیادی اضافے ہوئے۔ ہمارے چوٹی کے محققین اس دور میں ابھر کر سامنے آئے۔ دشتِ تحقیق کی پہلی منزل اگر اتنی دل ربا ہے تو اس کا اگلا پڑاؤ اگر ایک گلزار نہیں تو کم از کم مرغزار ہونا ہی چاہیے۔ مجھے اعتماد ہے کہ ہمارے محققین دنیائے ادب کو تمام خس و خاشاک سے پاک و صاف اور ہر گوشہ تاریک کو ضیائے علم سے درخشاں کر دیں گے۔

(مشمولہ، ادبی اور لسانی تحقیق اصول اور طریق کار، پروفیسر عبدالستار دلوی، بمبئی، ۱۹۸۴ء ص ۲۰۳-۲۲۹)۔

❖❖❖❖

حواشی

۱۔ سید علی جواد زیدی نے اپنے کتابچے ''اُردو ادب کی تاریخ'' انگریزی اصل کا سنہ ۱۹۲۴ء اور اُردو ادب کا ۱۹۲۷ء دیا ہے۔ مجھے انگریزی تاریخ میں شبہ ہے۔

۲۔ تحقیق و تنقید از ڈاکٹر شمس الدین ص ۲۰۳۔ دسویں جلد یعنی اُردو ادب کی جلد پنجم۔ فروری ۱۹۷۲ء۔

۳۔ محققین کے عہد حیات کی تاریخیں۔ تاریخ مسلمانان پاکستان و ہند۔ دسویں جلد میں ڈاکٹر شمس الدین صدیقی کے مضمون سے لی گئی ہیں۔

❖❖❖❖❖

ہندوستان میں اُردو تحقیق اور تدوین کا کام

(۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک)

ڈاکٹر خلیق انجم

اگر چہ اُردو میں ادبی تحقیق کا باقاعدہ آغاز انیسویں صدی کے نصف آخر میں شروع ہوا۔ لیکن ادبی تحقیق کے ابتدائی نقوش اُردو شاعروں کے ان تذکروں میں نظر آتے ہیں جو فارسی میں لکھے گئے۔ میر تقی میر کے ''نکات الشعرا'' سے لے کر بھوپال کے سید علی حسن خان کے ''بزم سخن'' تک ۶۵، ۶۶ تذکرے اب تک دستیاب ہو چکے ہیں۔ اپنی تمام خرابیوں کے باوجود یہ تذکرے تاریخ ادب اُردو کے اہم ترین مآخذ ہیں۔

اُردو تحقیق کی تاریخ لکھتے ہوئے سر سید احمد خان کے نام کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر چہ انھوں نے اُردو میں تحقیق کی اور نہ کسی اُردو متن کا تنقیدی ایڈیشن تیار کیا۔ لیکن ان کی ''آثار الصنادید'' تاریخی تحقیق اور ان کا مرتبہ ''آئین اکبری'' ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی اور ''تو زک جہانگیری'' تدوین متن کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ اس کا پورا امکان ہے کہ اس عہد کے نوجوان محققین سر سید کے ان کاموں سے متاثر ہوئے ہیں، مولانا محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی اور علامہ شبلی اگر چہ اُردو کے ادیب تھے لیکن ان تینوں نے فارسی میں بھی تحقیق کی ہے۔ مولانا آزاد کی ''سخندان فارس'' مولانا حالی کی ''حیات سعدی'' اور علامہ شبلی کی ''شعر العجم'' اگر چہ فارسی سے متعلق ہیں، لیکن چونکہ یہ کتابیں اُردو زبان میں لکھی گئی تھیں اس لیے یہ تینوں کتابیں اُردو میں جدید تحقیق کے ابتدائی نمونے قرار پاتی ہیں۔ ان تحقیقی کارناموں میں حقائق کی بہت سی غلطیاں ہیں۔ لیکن ان موضوعات پر آج تک ان سے بہتر کتابیں بھی نہیں لکھی گئیں۔ علامہ شبلی نے اگر چہ ''موازنہ انیس و دبیر'' جیسی معرکتہ الآرا تنقیدی کتاب لکھی لیکن اُردو تحقیق میں ان کا کوئی کارنامہ نہیں ہے۔ ہاں مولانا آزاد کی ''آب حیات'' اور مولانا حالی کی ''یادگار غالب'' اُردو تحقیق کے ابتدائی نمونے ہیں۔ آب حیات اگر چہ بنیادی طور پر شاعروں کا تذکرہ ہے لیکن اُردو میں ادبی تاریخ و تحقیق کا پہلا نمونہ بھی ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ ''آب حیات'' میں بے شمار تحقیقی غلطیاں ہیں۔ کچھ غلطیاں تو اس لیے ہوئیں کہ مولانا آزاد سے سہو ہوا اور کچھ واقعات دانستہ طور پر غلط پیش کیے گئے۔ حافظ محمود شیرانی اور قاضی عبد الودود کی تحقیقی تنقیدوں کے باوجود ''آب حیات'' آج بھی اُردو کی اہم ترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ ''یادگار غالب'' میں ''آب حیات'' کے مقابلے میں تحقیقی غلطیاں بہت کم ہیں۔ اس کی شہرت اور مقبولیت کا بھی وہی عالم ہے جو ''آب حیات'' کا ہے۔ غالبیات میں آج بھی ''یادگار غالب'' کو اہم مقام حاصل ہے۔

اُردو کے پہلے باقاعدہ محقق ہونے کا شرف حافظ محمود شیرانی کو حاصل ہے۔ آپ اعلیٰ ترین محقق کے لیے کوئی بھی مغربی یا مشرقی معیار قائم کریں، حافظ محمود شیرانی اس پر پورے اتریں گے۔ ادبی تحقیق کی حافظ صاحب میں جو صلاحیتیں تھیں اور جو علم انھوں نے حاصل کیا تھا، وہ ان سے پہلے کسی کو نصیب ہوا اور نہ ان کے بعد۔ وہ اُردو کے واحد محقق ہیں جنھیں عتیقیات پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ مرحوم سکہ شناسی، مہر شناسی، تصویر شناسی، کتب شناسی، قدیم کاغذ، روشنائی، صفحات کی آرائش، نقش و نگار اور علم خط کے زبردست ماہر تھے۔ شیرانی صاحب نے لندن کی لوزک اینڈ کمپنی میں نوادرات اور عتیقیات کے ماہر کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ مختلف علوم پر مہارت کا انھوں نے ادبی تحقیق میں پورا فائدہ اٹھایا۔ علامہ شبلی کی ''شعر العجم'' پر شیرانی صاحب کی تنقید اور فارسی ادب پر خاصی تعداد میں ان کے مضامین فارسی ادب کی تاریخ لکھنے والوں کے لیے اہم ترین مواد فراہم کرتے ہیں۔ خالق باری اور پرتھوی راج راس پر ان کے مضامین ادبی تحقیق کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں۔

بیسویں صدی کے نصف اول میں اُردو تحقیق اور تدوین کی طرف زیادہ توجہ کی گئی۔ حکیم شمس اللہ قادری، نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، پروفیسر عبد القادر سروری وغیرہ نے دکنیات میں نمایاں کام کیا۔ شمالی ہند کے اُردو ادب پر احسن مارہروی، محمد یحییٰ تنہا، رام بابو سکسینہ، پروفیسر نور الحسن ہاشمی، ڈاکٹر سید عبد اللہ، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، قاضی عبد الودود، مولانا غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرام، مالک رام، شیخ چاند، مسعود حسن رضوی ادیب، ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی اور افتخار عالم مارہروی کے نام قابل ذکر ہیں۔

اس دور کا سب سے اہم نام مولوی عبد الحق کا ہے جنھوں نے خود بھی تحقیق کی اور دوسروں کو بھی راستہ دکھایا۔ وہ پہلے محقق ہیں جنھوں نے دکنی ادب پر توجہ کی۔ انھوں نے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے منسوب رسالہ ''معراج العاشقین'' ملا وجہی کی ''سب رس''، انشا کی ''رانی کیتکی''، وجہی کی ''قطب مشتری'' ملا نصرتی کی

مثنوی ''گلشن عشق'' مرتب کر کے شائع کیں۔

اُردو ادب کی تاریخ اٹھارویں صدی سے شروع ہوتی تھی۔ دکنی ادب پر کام کر کے ڈاکٹر عبدالحق نے اس تاریخ میں کئی صدیوں کا اضافہ کر دیا۔ اگر ڈاکٹر صاحب اُردو شاعروں کے تذکرے نکات الشعرا، تذکرہ ریختہ گویاں، مخزن نکات، چمنستان شعرا، گل عجائب، عقد ثریا، تذکرہ ہند، ریاض الفصحا اور مخزن شعرا مرتب کر کے شائع نہ کرتے تو اُردو تاریخ اہم ترین مآخذ سے محروم رہتی۔

ہندوستان آزاد ہوا اور ملک تقسیم ہوا تو مولانا غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرام، ڈاکٹر سید عبداللہ، خلیفہ عبدالحکیم وغیرہ پاکستان میں رہ گئے۔ ڈاکٹر عبدالحق، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور بعد میں علامہ نیاز فتح پوری ہندوستان سے ہجرت کر گئے۔

ملک کی آزادی اور تقسیم نے اہل اُردو کو بہت متاثر کیا تھا، اس لیے آٹھ دس سال تک کوئی قابل ذکر تحقیقی کارنامہ وجود میں نہیں آیا۔ اس مختصر سے زمانے کے بعد اُردو تحقیق و تدوین میں وہ کام شروع ہوا جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ یہ بات پوری ذمے داری کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ہندوستان میں پچھلے سینتیس برسوں میں ادبی تحقیق میں جتنا کام ہوا ہے، اُردو کی پوری تاریخ میں نہیں ہوا۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہ دور قاضی عبدالودود کا ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ قاضی صاحب نے آزادی سے قبل لکھنا شروع کر دیا تھا۔ انجمن ترقی اُردو ہند نے ان کا مرتبہ دیوان جوشش بھی چھاپا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آزادی سے قبل انھوں نے اُردو ادب میں کوئی نمایاں حیثیت حاصل نہیں کی ہے۔ قاضی صاحب نے خود بھی بہت کچھ لکھا ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔ لیکن اُردو تحقیق میں ان کا مقام ان کے تبصروں کی وجہ سے ہے۔ قاضی صاحب نے دیوان فائز (مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کی میر تقی میر، ڈاکٹر اختر اورینوی کی ''بہار میں اُردو زبان و ادب کا ارتقا'' پروفیسر نورالحسن ہاشمی کی ''دلی کا دبستان شاعری، ڈاکٹر ممتاز احمد کی مرتبہ ''مثنویات راسخ'' پر تبصرے کیے۔ ان کے علاوہ انھوں نے ''غالب بحیثیت محقق''، ''آزاد بحیثیت محقق'' اور ''عبدالحق بحیثیت محقق'' جیسے مضامین سے تحقیق کے معیار قائم کیے اور بتایا کہ حقائق کی چھان بین اور واقعات کے بیان میں کس قدر احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ قاضی صاحب کے ان تبصروں نے بہت سے محققین کو محتاط کر دیا لیکن ایسے محققین حضرات کی بھی کمی نہیں جو ''کرہی لے گا میرا کیا'' کے قائل رہے۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں بہت سی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں اور نئی اور پرانی یونیورسٹیوں میں اُردو کے شعبے قائم ہوئے۔ اس وقت اکتیس یونیورسٹیوں میں اُردو شعبے موجود ہیں۔ جن میں ایم اے اور پی ایچ ڈی تک کی تعلیم کا انتظام ہے۔

اُردو کی تاریخ میں پہلی بار پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے دلی یونیورسٹی کے شعبہ اُردو میں ''مخطوطہ شناسی'' کا ایک سالہ کورس شروع کیا۔ اب تک تحقیق و تدوین کے مسائل پر ڈاکٹر نذیر احمد اور قاضی عبدالودود نے چند مضامین لکھے تھے لیکن اس موضوع پر کوئی باقاعدہ کتاب نہیں تھی۔ اس کورس کی ضروریات کے پیش نظر خلیق انجم نے تدوین متن کے مسائل پر ''متنی تنقید'' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ بعد میں اس موضوع پر عبدالرزاق قریشی کی ''مبادیات تحقیق'' اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی ''اصول تحقیق و ترتیب متن'' شائع ہوئیں۔ پروفیسر گیان چند، مالک رام اور رشید حسن خان وغیرہ نے تدوین متن کے موضوع پر کچھ مقالے لکھے۔ اس موضوع پر مختلف مصنفوں کے مقالوں کو ترتیب دے کر شعبہ اُردو لکھنؤ نے ''رہبر تحقیق''، بمبئی یونیورسٹی کے ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے ۱۹۸۴ء میں ادبی اور لسانی تحقیق، اصول اور طریق کار اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سید محمد ہاشم نے ۱۹۷۸ء میں ''تحقیق و تدوین'' شائع کیں۔ ماہنامہ ''آجکل'' نے اگست ۱۹۶۷ء میں تحقیق نمبر شائع کیا۔

تحقیقی کام کی ضروریات کے پیش نظر فہرست سازی کا بھی خاصا کام ہوا ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے حیدرآباد ادارہ ادبیات اُردو میں محفوظ مخطوطات کی وضاحتی فہرست مرتب کرنے کا کام شروع کیا تھا۔ اس کی پہلی جلد ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی۔ دوسری جلد ۱۹۵۱ء، تیسری جلد ۱۹۵۷ء، چوتھی ۱۹۵۸ء، پانچویں ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی۔ چھٹی جلد محمد اکبرالدین صدیقی اور ڈاکٹر محمد علی اثر نے مرتب کی۔ نصیرالدین ہاشمی نے اسٹیٹ سنٹرل لائبریری، حیدرآباد کے اُردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست ۱۹۶۱ء میں دو جلدوں میں شائع کی۔ ''مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے رام پور رضا لائبریری کے مخطوطات کی وضاحتی فہرستیں تین چار جلدوں میں شائع کیں۔

ڈاکٹر صلاح الدین نے دلی کی مختلف لائبریریوں میں محفوظ مخطوطات کی وضاحتی فہرست مرتب کی، جسے انجمن ترقی اُردو (ہند) نے شائع کیا۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) کی لائبریری کے مخطوطات کی فہرست ''اُردو ادب'' میں شائع ہو چکی ہے۔

عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ٹونک کے مخطوطات کی وضاحتی فہرست کی ابھی تک دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ باقی جلدیں زیر ترتیب ہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر مظفر حنفی نے تازہ مطبوعات کی وضاحتی فہرست سازی کا مفید کام شروع کیا۔ اس فہرست کی دو جلدیں ''وضاحتی فہرست'' کے نام

سے ترقی اُردو بورڈ نئی دلی سے شائع ہو چکی ہیں۔ پہلی جلد میں ۷۶-۱۹۷۵ء اور دوسری جلد میں ۷۸-۱۹۷۷ء کی مطبوعات شامل ہیں۔ تیسری جلد زیر طبع ہے۔

اس دوران میں کتابیات سازی اور اشاریہ سازی کا بھی کام ہوا ہے۔ غالب پر اس سلسلے میں جو کام ہوا ہے، اس کا ذکر آئے گا۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے میر انیس، یگانہ چنگیزی، پریم چند، مرزا دبیر پر کتابیات تیار کیں، جو سہ ماہی ''اُردو ادب'' اور ''کتاب نما'' دہلی میں شائع ہوئی۔ دسنوی صاحب نے مولانا سید سلیمان ندوی پر بھی کتابیات تیار کی ہے جو ان کی کتاب ''یادگار سلیمان'' میں شامل ہے۔

ایم حبیب خان صاحب نے علامہ اقبال پر کتابیات تیار کی جو سہ ماہی اُردو ادب میں شائع ہوئی۔

دکنی ادب:

ڈاکٹر عبدالحق نے ۱۹۴۷ء سے قبل دکنی ادب کے جو متن مرتب کر کے شائع کیے تھے، ان کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق کے علاوہ پروفیسر محی الدین قادری زور نے کلیات قلی قطب شاہ (حیدر آباد) ۱۹۴۰ء اور پروفیسر عبدالقادر سروری نے کلیات سراج اورنگ آبادی (حیدر آباد) ۱۹۴۰ء مرتب کر کے شائع کی۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر محمد حفیظ نے بھی دکنی ادب پر کام کیا تھا۔

آزادی کے بعد دکنیات میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ کتاب نورس، چندر بدن و مہیار، رضوان شاہ و روح افزا، معراج العاشقین، دیوان داؤد اورنگ آبادی، علی نامہ، پنچھی باچھا، کلیات غواصی، دیوان جمال اللہ عشق، دیوان ہاشمی، گلشن الحقائق، شکار نامہ، کلیات شاہی، من سمجھاون، لیلیٰ مجنوں، سکھ انجن، ابراہیم نامہ، ارشاد نامہ، تاج الحقائق، داستان نظام علی خان، پھول بن، گلشن الاسرار، کلام معظم بیجاپوری، میناست ونتی، کلیات سراج، کلیات قلی قطب شاہ اور پرت نامہ وغیرہ مرتب کر کے شائع کیے گئے ہیں۔

دکنی ادب کے متن تو کافی تعداد میں مرتب کر کے شائع کیے گئے ہیں۔ لیکن ادب کی تاریخ یا دکنی ادیبوں اور شاعروں پر کام کم ہوا ہے۔

ڈاکٹر حسینی شاہد نے سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ، حیات اور کارنامے اور شاہ معظم (منظومات اور تنقید) لکھیں۔ ڈاکٹر رشید مولوی کی ''دکن میں عزاداری'' محمد ہاشم علی کی ''میراں جی شمس العشاق'' لئیق صلاح کی ''میر شمس الدین فیض'' ڈاکٹر محمد علی اثر کی ''غواصی شخصیت اور فن'' وغیرہ شائع ہو چکی ہیں۔

اس دوران میں دکنی لغات بھی مرتب کی گئیں۔ پاکستان میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے لغت مرتب کی۔ ہندوستان میں ''دکھنی لغات'' کے نام سے سید ابوتراب خطاطی ضامن نے اور پروفیسر مسعود حسین اور غلام عمر خان نے ''دکنی اُردو کی لغات'' کے نام سے لغات مرتب کیں۔

ڈاکٹر عبدالحق نے پہلی بار اُردو تذکروں کی اہمیت کا احساس دلایا تھا۔ انھوں نے خاصی تعداد میں تذکرے مرتب کر کے شائع کیے۔ آزادی کے بعد ہندوستان میں کم سے کم دو حضرات نے پی ایچ ڈی کے لیے تذکرہ نویسی کو اپنا موضوع بنایا۔ ڈاکٹر محمد شمیم نے سعادت خاں ناصر کے تذکرہ خوش معرکہ زیبا کا تنقیدی ایڈیشن تیار کر کے لکھنؤ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ یہ مقالہ ۱۹۷۶ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔ محمد انصار اللہ نظر نے شعرائے اُردو کے اولین تذکرے (علی گڑھ) ۱۹۷۸ء میں شائع کی۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے ''رسالہ تذکران'' مولفہ گارساں دتاسی و مترجم ذکاء اللہ مرتب کر کے دہلی سے ۱۹۶۶ء میں چھاپا۔

تذکرہ ابن طوفان غالباً پہلا تذکرہ ہے جو آزادی کے بعد ۱۹۵۴ء میں ہندوستان میں چھپا۔ اس کے مرتب قاضی عبدالودود ہیں۔ ہندوستان میں قاضی عبدالودود اور پاکستان میں ''نگار'' کے تذکروں کا تذکرہ نمبر اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب ''اُردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری'' نے بہت اہم رول ادا کیا۔

قاضی عبدالودود نے اُردو اور فارسی شاعروں کے تذکروں پر تنقیدی یا تعارفی مضامین لکھے ہیں۔ انھوں نے آب حیات اور مولانا محمد حسین آزاد پر معاصر (پٹنہ) اور نوائے ادب (بمبئی) میں تنقیدی مضامین لکھے، جنھیں اب خدا بخش لائبریری نے کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ قاضی صاحب نے خاتمہ خلاصۃ الافکار (نوائے ادب بمبئی جولائی ۱۹۵۱ء اور اکتوبر ۱۹۵۱ء) آب حیات اور طبقات الشعرا (معاصر پٹنہ، حصہ ۴) آب حیات کے دو مآخذ (معاصر پٹنہ۔ حصہ اول) آزاد بحیثیت محقق (تین قسطوں میں نوائے ادب بمبئی اپریل ۱۹۵۶ء جولائی ۱۹۵۶ء اکتوبر ۱۹۵۶ء) اقتباس سفینہ خوش گو (نوائے ادب، بمبئی، جولائی ۱۹۵۷ء) تذکرہ صادقہ اور لسان الصدق (ماہنامہ آجکل، دہلی، جون ۱۹۵۹ء) بیدل اور تذکرہ خوش گو (معارف، اعظم گڑھ مئی ۱۹۴۲ء اور جولائی ۱۹۴۲ء) تذکرۃ الابرار (معاصر پٹنہ، حصہ ۱۸) روز روشن، شعرائے فارسی گو کا ایک تذکرہ (بہار کی خبریں، آزادی نمبر ۱۹۶۱ء) سفینہ ہندی (نوائے ادب بمبئی اکتوبر ۱۹۵۷ء) عمدہ منتخبہ یعنی تذکرہ سرور (اشتر و سوزن) طبقات الشعرائے ہند (معاصر، پٹنہ، حصہ ۹) فارسی تذکرے اور ریختہ گو شعرا (نوائے ادب بمبئی، اپریل ۱۹۵۷ء) کریم الدین اور گارساں دتاسی (دلی کالج میگزین ۱۹۵۳ء) گلدستہ شعرا پٹنہ (معاصر، پٹنہ، حصہ ۱۴) گلستان سخن (دلی کالج میگزین ۱۹۵۳ء) گلشن سخن (معاصر، پٹنہ، حصہ ۲۷)۔ قاضی صاحب نے ابوالحسن کا

تذکرہ مسرت افزا پانچ قسطوں میں شائع کیا۔ (معاصرہ پٹنہ، حصہ ۵، ۶، ۷، ۸ اور ۱۴) اس موضوع پر یقیناً قاضی صاحب کے اور مضامین بھی ہوں گے، جن تک اس وقت میری دسترس نہیں ہو سکی۔

قاضی صاحب کے مضامین نے محققین میں تذکروں سے دلچسپی پیدا کر دی۔ عطاء الرحمٰن کاکوی نے بھگوان داس ہندی کا تذکرہ "سفینہ ہندی" پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے اعظم الدولہ میر محمد خان سرور کا عمدہ منتخبہ (دہلی، ۱۹۶۱ء) پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے مردان علی خان مبتلا لکھنوی کا گلشن سخن (علی گڑھ ۱۹۶۵ء) ڈاکٹر مختار الدین احمد نے سید حیدر بخش حیدری کا گلشن ہند (دلی۔ ۱۹۶۷ء) پروفیسر نثار احمد فاروقی نے قدرت اللہ شوق کا طبقات الشعرا اور قیام الدین حسرت آبادی کا مقالات الشعرا (دلی ۱۹۶۸ء) اور تین تذکرے جن میں لچھمی نرائن شفیق کا "گل رعنا" شاہ محمد کمال کا مجمع الانتخاب اور قدرت اللہ شوق کا طبقات الشعرا شامل تھے، (دہلی، ۱۹۶۸ء) مرتب کر کے شائع کیا۔

ڈاکٹر مجیب قریشی نے امیر اللہ کے "تذکرہ مسرت افزا" کا اُردو ترجمہ (دہلی ۱۹۶۸ء) ڈاکٹر نعیم احمد نے احمد حسین سحر کا "بہار بے خزاں" (دہلی ۱۹۶۸ء) پروفیسر محمود الٰہی نے میر تقی میر کا "نکات الشعرا" (دہلی ۱۹۷۲ء) مرتب کیا۔

ڈاکٹر انصار اللہ نظر نے مولوی عبدالغفور خان نساخ کا "تذکرہ قطعہ منتخب" کراچی ۱۹۷۴ء، ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری نے مصحفی کا تذکرہ "شعرائے ہندی" (لکھنو، ۱۹۷۹ء) پروفیسر محمود الٰہی نے سید غلام حسین کا "تذکرہ شورش" (لکھنو) شائع کیا۔

پروفیسر عطاء الرحمٰن کاکوی نے انیس الاحبا، بزم سخن، طور کلیم، تذکرہ بے نظیر، تذکرہ خوش معرکہ زیبا، روز روشن، سخن شعرا، تذکرہ شعرائے اُردو، شمع انجمن، نگارستان سخن، صبح گلستان، عقد ثریا اور نتائج الافکار اس طرح چھاپے کہ شاعروں کا کلام حذف کر دیا۔ اس طرح تذکرے بہت مختصر ہو گئے اور کم قیمت میں لوگوں کو دستیاب ہو گئے۔

حافظ محمود شیرانی نے قدرت اللہ قاسم کا تذکرہ مجموعہ نغز مرتب کیا تھا، جسے پنجاب یونیورسٹی لاہور نے شائع کیا تھا۔ ۱۹۷۳ء میں ترقی اُردو بورڈ نے یہ تذکرہ فوٹو آفسٹ کے ذریعے چھاپ دیا۔ اس طرح ۱۹۸۲ء میں اتر پردیش اُردو اکیڈمی نے قطب الدین باطن کا "گلستان سخن" مولوی عبدالغفور نساخ کا "سخن شعرا" نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کا "گلشن بے خار" مولوی کریم الدین کا "طبقات الشعرائے ہند" مرزا قادر بخش قادری کا "گلستان سخن" اور امیر مینائی کا "انتخاب یادگار" فوٹو آفسٹ کے ذریعے چھاپا اور ان سب تذکروں کی قیمت بہت کم رکھی۔ اس دوران میں اور شاعروں کے کچھ تذکرے بھی لکھے گئے۔ ان میں سے اہم مالک رام صاحب کا "تذکرہ معاصرین" ہے۔ اب تک اس کی چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ پہلی جلد ۱۹۷۲ء میں دوسری ۱۹۷۶ء تیسری ۱۹۷۸ء میں اور چوتھی جلد ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی۔ اس تذکرے میں مالک رام صاحب نے وفات پانے والے شاعروں اور ادیبوں کے حالات بہت محنت اور تحقیق سے لکھے ہیں۔ اس تذکرے کی پانچویں جلد زیر ترتیب ہے۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں کئی نئے تذکرے بھی لکھے گئے۔ احترام الدین شاغل کا تذکرہ "شعرائے جے پور" ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ اس سال خواجہ حمید الدین شاہد کا مرتبہ "حیدر آباد کے شاعر" کی پہلی جلد شائع ہوئی۔ اس تذکرے کی دوسری جلد سلیمان ادیب نے مرتب کی تھی، وہ بھی اس سال شائع ہوئی۔ "حیدر آباد کے ادیب" کے نام سے ڈاکٹر زینت ساجدہ نے دو جلدوں میں تذکرہ مرتب کیا۔ پہلی جلد ۱۹۵۸ء میں اور دوسری جلد ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی۔ مشتاق احمد کی "بیسویں صدی میں مغربی بنگال کے اُردو شعرا" ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی۔ لطیف حسین ادیب نے "چند شعرائے بریلی" لکھی۔ سید سلیمان حسین نے "لکھنو کے چند نامور شعرا" ۱۹۸۳ء میں شائع کی۔ رانا گنواں نے "تذکرہ شعرائے ہریانہ" ۱۹۸۳ء میں چھاپا۔ عرفان عباس "تذکرہ شعرائے اتر پردیش" لکھ رہے ہیں۔ اس کی پہلی جلد ۱۹۸۲ء میں اور چھٹی ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی۔ اس تذکرے کی مزید جلدیں زیر ترتیب ہیں۔

شمالی ہند کے ادب اور خاص طور سے شاعر اور شاعری پر بہت کام ہوا ہے۔ سید ظہیر الدین مدنی نے "ولی گجراتی" کے نام سے ولی کی شخصیت اور فن پر کتاب لکھی۔ ڈاکٹر شارب ردولوی نے "مطالعہ ولی" ۱۹۷۲ء میں اور امراؤ حسن فاروقی نے ۱۹۷۹ء میں "حیات ولی" شائع کی۔

ڈاکٹر تنویر سہائے انور نے خان آرزو پر پی ایچ ڈی کا مقالہ انگریزی میں لکھا۔ یہ تو شائع نہیں ہوا لیکن اس کے کچھ حصے بعض رسالوں میں چھپ چکے ہیں۔ مرزا مظہر جان جاناں پر عبدالرزاق قریشی کی کتاب چھپ چکی ہے۔ اس موضوع پر خلیق انجم نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ خلیق انجم نے مرزا مظہر کے فارسی خطوط کا اُردو ترجمہ "مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط" کے نام سے شائع کیا۔ عبدالرزاق قریشی نے مرزا مظہر کے کچھ اور فارسی خطوں کا متن اور ان کا ترجمہ شائع کیا۔ ڈاکٹر نعیم احمد نے کلیات میر جعفر زٹلی مرتب کر کے شائع کیا۔ پروفیسر محی الدین قادری زور نے ۱۹۴۴ء میں ظہور الدین حاتم کی سوانح "سرگزشت حاتم" کے نام

سے لکھی۔ آزادی کے بعد ڈاکٹر عبدالحق نے ''انتخاب حاتم'' مرتب کیا۔ ڈاکٹر محمد حسین نے شاہ مبارک آبرو کا دیوان، ڈاکٹر فضل الحق نے مرزا مظہر کے شاگرد مصطفیٰ خان یکرنگ، ڈاکٹر اسما سعیدی نے حسرت عظیم آبادی اور ڈاکٹر نعیم احمد نے دیوان عبداللہ خان مبتلا مرتب کر کے شائع کیا۔ پروین فاطمہ نے دیوان انعام اللہ خان یقین مرتب کر کے دلی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ ڈاکٹر محمد امین نے ''قائم اور ان کا کلام'' لکھی۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام نے دیوان قائم دین مرتب کر کے شائع کیا۔

میر، درد اور سودا پر قابل قدر کام ہوا ہے۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے ''میر تقی'' کے نام سے میر کی زندگی اور فن پر ۱۹۵۴ء میں کتاب شائع کی۔ پروفیسر نثار احمد قادری نے میر کی ''ذکر میر'' کا ترجمہ ''میر کی آپ بیتی'' کے نام سے ۱۹۵۷ء میں شائع کیا۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے میر تقی میر کی ''فیض میر'' مرتب کر کے چھاپی۔ صفدر آذر نے ''میر اور میریات'' میں میر کی سوانح لکھی، ان کی شخصیت اور فن کا جائزہ لیا۔ مولانا الدور صابری نے ۱۹۶۵ء میں راولپنڈی سے ''تلامذہ میر'' شائع کی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اسلوبیات میر کے نام سے کلام میر کا لسانیاتی جائزہ لیا۔ ظل عباس عباسی نے ''کلیات میر'' مرتب کیا۔ جس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۸ء میں اور دوسرا ۱۹۸۳ء میں دہلی سے شائع ہوا۔ پروفیسر احتشام حسین نے ''کلیات میر'' (حصہ اول، غزلیں) مرتب کر کے الٰہ آباد سے چھاپا۔ اس کلیات کا دوسرا حصہ جو مرثیوں اور مثنویوں پر مشتمل تھا، مسیح الزمان نے مرتب کر کے شائع کیا۔

سودا پر شیخ چاند کی کتاب ''آزادی سے قبل شاعری'' ۱۹۶۵ء میں خلیق انجم کی مرزا محمد رفیع سودا شائع ہوئی۔ ڈاکٹر شاد نے ''افکار سودا'' محمد حسن نے ''مطالعہ سودا'' کے نام سے تنقیدی کتابیں، پروفیسر عتیق صدیقی نے سودا کی قصیدہ نگاری پر ایک کتاب شائع کی۔ ام ہانی نے سودا کی قصیدہ نگاری پر مختلف لوگوں کے مضامین کا مجموعہ شائع کیا۔ امرت لال عشرت نے ۱۹۷۱ء میں دو حصوں میں ''کلیات سودا'' مرتب کیا۔ ڈاکٹر محمد حسن نے کلیات سودا کا رچرڈ جانسن والا نسخہ شائع کیا، ترقی اُردو بورڈ نے حال ہی میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا ہے۔

خواجہ میر درد پر قدیر احمد نے ''خواجہ میر درد اور ان کا ذکر و فکر'' ۱۹۶۴ء میں شائع کی۔ ڈاکٹر وحید اختر نے اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ ''خواجہ میر درد۔ نصرت اور شاعری'' ۱۹۷۱ء میں شائع کی۔ خواجہ میر درد کا دیوان حبیب الرحمٰن شیروانی نے مرتب کر کے ۱۹۲۲ء میں چھاپا تھا۔ آزادی کے بعد پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے ۱۹۶۳ء میں دیوان درد مرتب کر کے شائع کیا۔ جس کے اب تک کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں رشید حسن خان نے ''دیوان درد'' مرتب کر کے چھاپا۔ ۱۹۷۹ء میں ڈاکٹر فضل امام نے ''دیوان درد کا نقش اول'' مرتب کر کے چھاپا۔ آزادی سے قبل میر درد کے چھوٹے بھائی میر اثر کا دیوان تقی الدین احمد نے مرتب کر کے حیدر آباد سے ۱۹۲۹ء میں شائع کیا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں ڈاکٹر عبدالحق نے دیوان اثر مرتب کیا۔ آزادی کے بعد ڈاکٹر فضل حق کامل قریشی نے دیوان اثر مرتب کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) نے اسے شائع کر دیا ہے۔

انشاء اللہ خان انشا پر اُردو میں مرزا فرحت اللہ بیگ کی ایک چھوٹی سی کتاب تھی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ڈاکٹر اسلم پرویز نے انشا پر ایک کتاب لکھی جس میں ان کے سوانح لکھے اور کلام پر تنقید کی۔ ڈاکٹر شام لال عابد کاشمیری نے انشا پر پی ایچ ڈی کی۔ انشا پر ان کی دو کتابیں ''انشا کے حریف و حلیف'' اور ان کا تحقیقی مقالہ شائع ہوا ہے۔ ۱۹۵۲ء میں مرزا محمد عسکری نے ''کلام انشا'' مرتب کر کے شائع کیا۔ ۱۹۷۴ء ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے اور ۱۹۷۵ء میں سید سلیمان حسینی نے انشا کی ''رانی کیتکی کی کہانی'' مرتب کر کے شائع کی۔

مصحفی کی سوانح پر ابھی تک کوئی کتاب نہیں چھپی۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی نے کلیات مصحفی کا حصہ اول۔ دیوان اول، کراچی سے مرحوم افسر امروہوی نے مصحفی کے شاگردوں کے حالات مرتب کر کے شائع کیا اور ڈاکٹر نور الحسن نقوی نے ''کلیات مصحفی'' مرتب کر کے شائع کیا۔ میر انیس پر پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب نے اعلیٰ درجے کا کام کیا ہے۔ انیس کی شخصیت اور فن پر ان کی ''انیسیات'' اور ''روح انیس'' اہم کتابیں ہیں۔ پہلی کتاب میں انیس کے سوانح اور کلام پر تنقید اور دوسری کتاب میں انیس کے مرثیوں کا انتخاب ہے۔ انیس کے جشن صد سالہ کے موقع پر انیس پر سیمینار ہوا۔ اس کے مقالے پروفیسر نارنگ نے مرتب کر کے ''انیس شناسی'' کے نام سے شائع کیے۔ ڈاکٹر فضل امام نے بھی انیس شناسی کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔

بعد میں مرزا دبیر پر ڈاکٹر محمد زمان آزردہ نے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ ان کا مقالہ ''مرزا سلامت علی دبیر'' کے نام سے ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۵ء میں چھپا۔ اکبر حیدر کاشمیری کی ''شاعر اعظم مرزا سلامت علی دبیر'' ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے مرزا دبیر کے کلام پر پی ایچ ڈی کا مقالہ، جو ۱۹۶۶ء میں دبستان دبیر کے نام سے شائع ہوا۔ کاظم علی خان کی ''تلاش دبیر'' ۔ دبیر پر تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے لکھنؤ سے ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔
ڈاکٹر شعیب راہی کی ''خواجہ حیدر علی آتش'' چھپی۔ ۱۹۷۲ء میں پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کا مرتبہ کلیات آتش اور پروفیسر اعجاز حسین کا ''کلام آتش'' شائع

ہوئے۔ ۱۹۷۷ء میں شاہ عبدالسلام کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ''دبستان آتش'' کے نام سے چھپا۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ''ناسخ'' شائع ہوا۔ ناسخ کے کلیات کی طرف ابھی تک توجہ نہیں دی گئی۔ رشید حسن خان اور کاظم علی خان نے ناسخ کے کلام کے انتخاب شائع کیے ہیں۔

تقسیم ملک کے وقت اُردو ادیبوں اور محققوں نے دو شاعروں کو بھی تقسیم کیا۔ علامہ اقبال پاکستان کے حصے میں آئے اور غالب ہندوستان کے۔ ان دونوں عظیم شاعروں پر ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں تحقیقی اور تنقیدی کام ہو رہا ہے۔ لیکن علامہ اقبال پر اعلیٰ ترین کام پاکستان میں ہوا ہے اور غالب پر بہترین تحقیق اور تنقید ہندوستان میں ہوئی۔ چونکہ غالب ہندوستان کے اُردو شاعروں، نقادوں اور محققوں کا محبوب موضوع رہے ہیں اس لیے غالب پر ہونے والے کام کا قدرے تفصیلی ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

غالب خوش نصیب ہیں کہ انھیں ہر زمانے میں محقق اور نقاد ملتے رہے ہیں۔ ۱۹۳۷ء میں مولانا امتیاز علی خان عرشی نے نوابانِ رام پور کے نام غالب کے خطوط کا تنقیدی ایڈیشن مکاتیب غالب کے نام سے پیش کیا تھا۔ ۱۹۴۷ء تک اس کے سات ایڈیشن شائع ہو چکے تھے۔ غالب نے نواب کلب علی خان کے لیے اپنے فارسی اور اُردو کلام کا انتخاب کیا تھا۔ عرشی صاحب نے ۱۹۴۲ء میں یہ انتخاب بھی مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں عرشی صاحب نے ''فرہنگ غالب'' کے نام سے ایک کتاب مرتب کر کے رام پور سے شائع کی۔ غالبیات میں عرشی صاحب کا اہم ترین اضافہ دیوان غالب (نسخہ عرشی ہے)، جس کا پہلا ایڈیشن انجمن ترقی اُردو (ہند) سے ۱۹۵۸ء میں اور دوسرا ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔

عرشی صاحب کی طرح مالک رام کو بھی ہمیشہ سے غالبیات میں دلچسپی رہی ہے۔ ۱۹۳۸ء میں ان کی ''ذکر غالب'' کا پہلا ایڈیشن مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اب تک اس کے پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ایڈیشن میں اضافہ اور ترمیم و تنسیخ کی گئی ہے۔ ۱۹۳۸ء ہی میں مالک رام صاحب نے سبد چین مرتب کر کے شائع کی۔ ۱۹۶۰ء میں ان کا مرتبہ ''دیوان غالب'' دہلی سے شائع ہوا۔ ۱۹۶۲ء میں مالک رام صاحب نے مولوی مہیش پرشاد کے مرتبہ ''خطوط غالب'' جلد اول پر نظر ثانی کر کے اس کا دوسرا ایڈیشن تیار کیا۔ ۱۹۶۹ء میں غالب کے جشن صد سالہ تقریبات کی موقع پر مالک رام نے دیوان غالب کا صدی ایڈیشن مرتب کر کے شائع کیا۔ اس موقع پر انھوں نے غالب کی ''دستنبو'' بھی مرتب کر کے شائع کی۔ اس کتاب پر مرتب کی حیثیت سے ان کا نام نہیں ہے۔ ۱۹۷۰ء میں انھوں نے غالب کی ''گل رعنا'' اور ۱۹۷۱ء میں یادگار غالب مرتب کر کے شائع کی۔ مالک رام صاحب نے غالب پر بہت سے مضامین لکھے تھے۔ ان میں سے کچھ مضامین ''فسانہ غالب'' (۱۹۷۷ء) اور ''گفتار غالب'' (۱۹۸۵ء) کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ مالک رام صاحب کی تلامذہ غالب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا اب بہت زیادہ ترمیم اور اضافے کے بعد ۱۹۸۴ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن چھپا ہے۔ ماہرین غالب میں قاضی عبدالودود کا نام سرفہرست ہے۔ انھوں نے ''قاطع برہان و رسائل متعلقہ'' مرتب کر کے صد سالہ تقریبات کے موقع پر شائع کیے۔ اس کے علاوہ انھوں نے غالب پر بے شمار مضامین لکھے ہیں۔ آزادی سے قبل انھوں نے عرشی صاحب کی مرتبہ ''مکاتیب غالب'' اور مولوی مہیش پرشاد کی مرتبہ ''خطوط غالب'' پر تبصرے کیے تھے یا غالب کے بارے میں مختصر تحریریں لکھی تھیں۔ غالب پر پہلی بار ان کے طویل مضامین ۱۹۴۸ء میں علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر میں شائع ہوئے۔ اس نمبر میں قاضی صاحب کے دو مضامین ''غالب کا ایک فرضی استاد'' اور ''غالب بحیثیت ایک محقق'' کے علاوہ ''متاثر غالب'' کے نام سے غالب کی نادر مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحریریں پیش کیں۔ اس میگزین میں قاضی صاحب ''جہان غالب'' کے نام سے مختلف رسالوں میں مضامین لکھتے رہے۔ یہ مضامین غالب کے بارے میں بیش بہا معلومات کا خزانہ ہیں۔ اگر انھیں مرتب کیا جائے تو دو سو ڈھائی سو صفحات پر مشتمل ایک کتاب بن جائے گی۔

ماہرین غالب میں چوتھا بڑا نام پروفیسر نذیر احمد کا ہے۔ فارسی فرہنگوں اور فارسی الفاظ پر جو قدرت نذیر صاحب کو حاصل ہے وہ اس زمانے میں شاید کسی اور کو نہیں ہے۔ انھوں نے غالب کے قاطع برہان کے مواد کے سلسلے میں بہت سے مضامین لکھے ہیں۔ اب یہ مضامین نقد ''قاطع برہان'' کے نام سے غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دلی سے شائع ہوئے ہیں۔ پروفیسر مختار الدین احمد نے ۱۹۵۳ء میں غالب کی سوانح اور شخصیت پر مضامین کا مجموعہ ''احوال غالب'' کے نام سے اور ۱۹۵۶ء میں تنقیدی مضامین کا مجموعہ نقد غالب کے نام سے شائع کیا۔

۱۹۶۱ء میں خلیق انجم نے ''غالب کی نادر تحریریں'' کے نام پر غالب کے بعض اُردو خطوط اور تحریریں مرتب کیں۔ ۱۹۷۴ء میں ''غالب اور شاہان تیموریہ'' کے نام سے ایک کتاب لکھی اور غالب کے تمام اُردو خطوط پانچ جلدوں میں مرتب کیے۔ ان میں سے دو جلدیں غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دلی سے شائع ہو چکی ہیں۔ ۱۹۱۰ء میں ان کی مرتبہ ''مرقع غالب'' شائع ہوئی۔ اس کتاب میں غالب کا اُردو کلام اور غالب کے تقریباً سو اُردو خطوط کے عکس شامل ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں پرتھوی

چندر صاحب نے نیشنل آرکائیوز، نئی دلی میں محفوظ غالب کی پنشن کے کاغذات مرتب کر کے ''حق جاگیر غالب'' کے نام سے چھاپی لیکن نہ جانے کیوں اس کتاب کی اشاعت نہیں ہوئی۔

فروری ۱۹۶۹ء میں غالب کے جشن صد سالہ کی تقریبات منعقد ہوئیں، ان تقریبات سے کافی قبل غالب شناسوں نے تیاریاں شروع کر دیں۔ ۱۹۶۸ء میں پروفیسر نثار احمد فاروقی نے غالب کی کتابیات پر مشتمل مضامین برہان (دہلی) اور تحریک (دہلی) میں شائع کیے۔ اس سال پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے ''غالبیات'' کے نام سے غالب پر کتابیات مرتب کر کے شائع کی۔ ۱۹۷۲ء میں محمد انصار اللہ نظر نے ''غالب ببلیوگرافی'' چھاپی۔

فروری ۱۹۶۹ء میں غالب کا جشن صد سالہ بہت شاندار طریقے سے منایا گیا۔ ''صد سالہ یادگار غالب کمیٹی'' کی طرف سے مالک رام صاحب کا مرتبہ دیوان غالب قاضی صاحب کی مرتبہ ''قاطع برہان و رسائل متعلقہ'' اور ''دستنبو'' شائع کیں۔ اس موقع پر بین الاقوامی سیمینار منعقد ہوا۔ جس میں پڑھے جانے والے اُردو اور انگریزی مقالے ڈاکٹر یوسف حسین خان نے مرتب کر کے شائع کیے۔

اُردو ادب (علی گڑھ) اُردو معلی (دلی یونیورسٹی) فروغ اُردو (لکھنؤ جامعہ (دہلی) آج کل (دہلی) تحریک (دہلی) تحریر (دہلی) اور بہت سے رسالوں نے غالب نمبر شائع کیے۔ اس موقع پر ایک بڑا کام یہ ہوا کہ دہلی میں غالب اکیڈمی اور غالب انسٹی ٹیوٹ دو ادارے قائم ہو گئے۔ دونوں کی عمارتوں کی تعمیر میں لاکھوں روپے صرف ہوئے۔ یہ دونوں ادارے ہر سال غالب پر سیمینار اور غالب پر معیاری کتابیں شائع کرتے ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ ''غالب نامہ'' کے نام سے بہت معیاری سہ ماہی شائع کرتا ہے۔ اسی سال پروفیسر نثار احمد فاروقی کے تحقیقی مضامین کا مجموعہ ''تلاش غالب'' کے نام سے چھپا۔ بیاض غالب بخط غالب ہندوستان اور پاکستان سے ایک ساتھ شائع ہوئیں۔ ہندوستان میں بعض وجوہ سے اس کی اشاعت روک دی گئی۔ نیشنل آرکائیوز دلی میں پنشن کے متعلق غالب کے فارسی خطوط محفوظ ہیں۔ سید اکبر علی ترمذی نے یہ ''نامہ ہائے غالب'' کے نام سے مرتب کیا۔

جشن صد سالہ تقریبات کے بعد غالب پر تحقیقی اور تنقیدی کام کی رفتار ذرا سست پڑ گئی۔

۱۹۷۵ء میں پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی ''مطالعہ خطوط غالب'' اور ۱۹۸۲ء میں حامدہ مسعود کی خطوط غالب ___ فنی تجزیہ شائع ہوئیں۔ ۱۹۷۸ء میں کالی داس گپتا رضا کے تحقیقی مضامین کا ایک مجموعہ ''متعلقات غالب'' کے نام سے اور ۱۹۸۲ء میں دوسرا مجموعہ ''غالبیات'' چند عنوانات کے نام سے شائع ہوا۔

محققین نے غالب کے شاگردوں پر بھی توجہ کی ہے۔ ڈاکٹر صلاح الدین نے نواب مصطفی خان شیفتہ پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا ہے، جو ابھی چھپا نہیں ہے۔ ۱۹۷۲ء میں ظہیر احمد مدنی نے میاں داد خان سیاح، پر ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب نے غالب اور ذکا کے نام سے کتابیں شائع کیں۔ ۱۹۷۹ء سراج الدین علی خان نے ذکر سالک (مرزا قربان علی بیگ سالک) ۱۹۷۵ء میں ایم حبیب خان نے غالب اور سرور اور ۱۹۸۵ء میں ڈاکٹر ضیاء الرحمن انصاری نے ''تفتہ اور غالب'' شائع کیں، حمیدہ سلطان احمد کی ''خاندان لوہارو کے شعرا'' ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی، محمد فیروز دلی یونیورسٹی سے میر مہدی مجروح پر پی ایچ ڈی کے لیے تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں۔

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کا تحقیقی مقالہ ''مومن، شخصیت اور فن'' کے نام سے شائع ہوا۔ پروفیسر ضیاء احمد ضیاء بدایونی نے دیوان مومن مع شرح شائع کیا تھا۔ اس کا چوتھا ایڈیشن ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ کلب علی خان فائق، مسیح الزمان نے ۱۹۷۱ء میں ''کلیات مومن'' شائع کیا اور پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے انشائے مومن کا فارسی متن اور اُردو ترجمہ شائع کیا۔

ذوق پر ابھی تک صرف ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے کام کیا ہے۔ انھوں نے ذوق کو پی ایچ ڈی کا موضوع بنایا تھا۔ علوی صاحب کی ''ذوق، سوانح اور انتقاد'' اور ان کا مرتبہ ''کلیات ذوق'' کا پہلا ایڈیشن لاہور سے ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ ذوق کی طرح بہادر شاہ ظفر پر بھی بہت کم کام ہوا ہے۔ ڈاکٹر اسلم پرویز کو ظفر پر پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی تھی۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) یہ تحقیقی مقالہ شائع کر رہی ہے۔ نظم میں دیوان عزلت، دیوان سودا، کلیات نظیر اکبر آبادی، کلیات ممنون، کلیات شاہ نصیر، کلیات شہزادہ سلیمان شکوہ، کلیات نواب مرزا شوق، دیوان داغ، کلیات شاد عارفی، کلیات چکبست، مثنوی گلزار نسیم وغیرہ بھی مرتب کر کے شائع کر دی گئی ہیں۔ کربل کتھا، نو طرز مرصع، آرائش محفل، فسانہ عجائب نثر میں بکٹ کہانی، قصہ مہر افروز و دلبر، باغ و بہار، گنج خوبی، غبار خاطر، خطابات آزاد، (مولانا ابوالکلام آزاد کا تذکرہ) امراؤ جان ادا، فسانہ مبتلا، ابن الوقت، افادات سلیم، توبۃ النصوح، نیرنگ خیال وغیرہ۔

اُردو میں سب سے زیادہ مونوگراف لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے ہیں۔ جن ادیبوں اور شاعروں کے مونوگراف لکھے گئے ہیں اور جن کا ابھی تک اس مقالے میں ذکر نہیں آیا، ان کے نام ہیں مرزا محمد علی ندوی، میر حسن، میر ضمیر، مرزا علی لطف، مفتی صدر الدین آزردہ، ماسٹر رام

چندر (ان پر دو مونو گراف لکھے گئے ہیں) مولوی کریم الدین، نذیر احمد، میر غلام علی عشرت بریلوی، منشی نول کشور، میر باقر مخلص، مرزا رسوا، مرزا کلب حسین بہادر نادر، بیان میرٹھی، فقیر محمد خان گویا، داغ، امیر مینائی، جلیل مانک پوری، امیر اللہ تسلیم، نسیم دہلوی، منیر شکوہ آبادی، اسماعیل میرٹھی، بیخود دہلوی، نظم طباطبائی، شاد عارفی، سرور جہاں آبادی، آرزو لکھنوی، فانی، جگر، نوح ناروی، عبدالرحمٰن بجنوری، نواب صدیق حسن خان، مضطر خیر آبادی، ریاض خیر آبادی، مہدی حسن افادی، مولانا ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی، حسرت موہانی، مرزا یگانہ، منور لکھنوی، مجاز، مانی جائسی، اعجاز حسین، آرزو لکھنوی، عزیز لکھنوی، ہارون خان شروانی، خواجہ حسن نظامی، رشید احمد صدیقی، سید نجیب اشرف ندوی، حامد اللہ افسر، ڈاکٹر عابد حسین، اثر لکھنوی، مسعود حسن رضوی ادیب، خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر زور، سلیمان ادیب، راجندر سنگھ بیدی، جان نثار اختر، کنہیا لال کپور، بسمل سعیدی، شفیع الدین نیر، حیرت بدایونی، گوپال متل، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، غلام ربانی تاباں، رام لعل، ضیاء فتح آبادی، کالی داس گپتا رضا۔

ہندوستان میں علامہ اقبال پر جو کتابیں شائع ہوئی ہیں، ان میں بڑی تعداد ان کتابوں کی ہے جن کے مصنف پاکستانی ادیب ہیں۔ عاشق حسین بٹالوی، ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ڈاکٹر عبادت بریلوی، رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر سہیل بخاری، طاہر تونسوی، صلاح الدین احمد، رئیس احمد جعفری، عبدالمجید سالک، یوسف سلیم چشتی اور خلیفہ عبدالحکیم کی کتابوں کے ہندوستانی ایڈیشن شائع ہوئے۔

ہندوستان کے محققین نے علامہ اقبال کی نظم و نثر بہت کم مرتب کر کے شائع کی ہے۔ میری معلومات کے مطابق ایسی کتابوں کی تعداد چار پانچ سے زیادہ نہیں ہے۔ ڈاکٹر عبدالغفار شکیل نے ''نوادر اقبال'' اور ''اقبال کے نثری افکار'' مرتب کر کے شائع کیے۔ ۱۹۷۵ء میں دلی یونیورسٹی کے ڈاکٹر عبدالحق نے اقبال کی انگریزی ڈائری کا ''بکھرے خیالات'' کے نام سے ترجمہ کیا۔ اخلاق اثر صاحب نے ''اقبال نامے'' کے نام سے اقبال کے کچھ خطوط مرتب کر کے ۱۹۸۱ء میں شائع کیے۔ یوں تو علامہ اقبال کی نظم اور نثر سب ہی ہندوستان میں چھپی لیکن یہ وہی ہے جو پاکستانی ادیبوں نے مرتب کی تھی۔ ہاں آج کل ہریانہ کے گورنر سید مظفر حسین برنی علامہ کے تمام خطوط مرتب کر رہے ہیں۔ اس کام کی تکمیل میں تین چار سال لگیں گے۔

ہندوستان میں اقبال پر تحقیقی کام بہت کم ہوا ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی کی ''اقبال کامل'' ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اقبال کی سوانح چار جلدوں میں لکھی ہے۔ پہلی جلد ''روداد اقبال'' ہے۔ ہندوستان میں علامہ اقبال پر سب سے زیادہ اور سب سے بہتر کام پروفیسر آزاد ہی نے کیا ہے۔ ۱۹۷۷ء میں انھوں نے علامہ اقبال پر ایک نمائش ترتیب دی تھی جس میں علامہ اقبال اور ان کے خاندان کے لوگوں کی تصویروں اور تحریروں کے عکس تھے۔ اس نمائش سے کچھ تصویریں منتخب کر کے پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے مرقع اقبال کے نام سے شائع کر دی ہیں۔ علامہ پر تحقیقی کاموں میں پروفیسر عبدالقوی دسنوی کا ''اقبال۔ انیسویں صدی میں'' (۱۹۷۷ء) اخلاق اثر کی ''اقبال اور شیش محل'' (۱۹۷۷ء) پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی ''اقبال اور کشمیر'' اور عبداللطیف اعظمی کی ''اقبال۔ دانائے راز'' (۱۹۷۸ء) قابل ذکر کتابیں ہیں۔

علامہ اقبال کے فن پر بہت بڑی تعداد میں تنقیدی مضامین اور کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان کے لکھنے والوں میں پروفیسر آل احمد سرور، سردار جعفری، ڈاکٹر ظہیر انصاری، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، کلیم الدین احمد، اسلوب احمد انصاری، مظفر حسین برنی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر شکیل الرحمان، پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر عبدالحق، شانتی رنجن بھٹاچاریہ، اشفاق حسین، غلام عمر، جوش ملسیانی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

علامہ اقبال پر اہم تحقیقی اور تنقیدی کتابوں کی فہرست اس مقالے کے آخر میں شامل کر دی گئی ہے۔ پچھلے پچیس تیس سال میں ایسے مقالے بھی لکھے گئے ہیں جن میں اصناف ادب کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ مونو گراف کی طرح ان موضوعات پر بھی عام طور سے کام پی ایچ ڈی کے طلباء نے کیا ہے۔ یہ موضوعات اس طرح کے ہیں: اُردو نثر کا آغاز اور ارتقا، اُردو غزل کی نشو و نما، ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اُردو مثنویاں، اُردو شاعری میں قومی یک جہتی کی روایت، اُردو شاعری میں منظر نگاری، مثنوی نگاری، ریختی کا تنقیدی مطالعہ، اُردو ناولوں میں سوشلزم، بیسویں صدی میں اُردو ناول آزادی کے بعد، شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ وغیرہ، ہندوستان کے کسی ایک صوبے یا شہر کے ادیبوں اور شاعروں پر بھی کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ اس سلسلے میں موضوعات ہیں: ''بمبئی میں اُردو'' ''بہار میں اُردو زبان و ادب کا ارتقا''، ''بہار میں اُردو نثر کا ارتقا''، ''اُردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ''، ''ریاست میسور میں اُردو''، ''ریاست میسور میں اُردو کی نشو و نما''، ''ریاست میسور کی اُردو مثنویاں''، ''اُردو نثر کا دہلوی دبستان''، ''اودھ میں اُردو مرثیے کا ارتقا''، ''دکن میں عزاداری'' اور ''مدھیہ پردیش میں اُردو ادب کے پچیس سال''۔

بعض اہم اداروں پر بھی تحقیقی کام ہوا ہے۔ مالک رام صاحب نے ''قدیم دلی کالج'' کے نام سے کتاب چھاپی۔ ڈاکٹر انتظار مرزا نے ''دلی کالج'' پر

پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ لکھا، مجید بیدار نے ''دارالترجمہ، جامعہ عثمانیہ کی ادبی خدمات'' کتاب چھاپی۔ یہ ان کا تحقیقی مقالہ ہے۔ ڈاکٹر مجیدہ بیگم نے اپنا تحقیقی مقالہ ''فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات'' شائع کیا۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۵ء تک کے تحقیقی اور تدوینی کام کے اس جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تحقیقی کام یونیورسٹیوں میں زیادہ ہو رہا ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ مولانا امتیاز علی خان عرشی، قاضی عبدالودود اور مالک رام صاحب جیسے اعلیٰ درجے کے محقق اور متنی نقاد یونیورسٹی کے باہر ہی کے ہیں۔ ان حضرات کے پائے کا کوئی محقق یونیورسٹی میں نہیں پیدا ہوا۔

قاضی عبدالودود نے عملی تنقید کے ذریعے محققین کی ذہنی تربیت کی۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے پہلی بار دہلی یونیورسٹی میں ببلیوگرافی کا کورس شروع کر کے طلبا کی تربیت کی۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ تحقیق کے اصولوں اور متنی تنقید پر جن لوگوں نے لکھا ہے ان میں دہلی یونیورسٹی کے لوگوں کی زیادہ تعداد ہے۔ خلیق انجم نے پروفیسر فاروقی کی فرمائش پر ''متنی تنقید'' کتاب لکھی تھی۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی اور رشید حسن خان صاحب کو خواجہ صاحب سے قربت حاصل تھی اور یہ دونوں دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر فاروقی کے بنائے ہوئے ماحول سے متاثر تھے۔

اُردو کے کلاسیکی متن خاصی تعداد میں شائع ہوئے ہیں، لیکن اس میدان میں بہت کم کام ایسا ہوا ہے کہ جس پر اطمینان کا اظہار کیا جا سکے۔ متن ترتیب دینے والے کی نااہلی اور لاپروائی نے بہت سے متون بگاڑ کر رکھ دیے ہیں۔ بعض متن تو کاتب کو اٹھا کر دے دیئے گئے ہیں۔ کلیات سودا اس کی بدترین مثال ہے۔

یونیورسٹیوں میں اب سے بیس پچیس برس پہلے تک قدیم ادب پر کام کرنے کا عام رجحان تھا۔ اب جدید ادب پر کام کیا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اساتذہ اور شاگرد فارسی اور قدیم کلاسیکی ادب دونوں سے ناواقف ہیں۔ ضرورت ہے کہ ایم اے اور ایم فل میں فارسی کی تعلیم پر خاص زور دیا جائے۔ دکنی ادب کے متن تو کافی تعداد میں چھپے ہیں لیکن شاعروں اور ادیبوں پر کام بہت کم ہوا ہے۔ اس طرف توجہ دی جانی چاہیے۔

دکنی ادب کی تاریخ نصیر الدین ہاشمی مرحوم نے لکھی تھی۔ اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ یونیورسٹیوں میں ادیبوں اور شاعروں کے مونوگراف بڑی تعداد میں لکھے جا رہے ہیں۔ پندرہ بیس سال پہلے بیسویں صدی کے ادیبوں اور شاعروں پر لکھے جانے لگے۔ اب زندہ مصنفوں پر لکھے جا رہے ہیں۔ یہ رجحان صحت مند نہیں ہے۔ کیونکہ یونیورسٹیاں صرف ایسے مصنفوں کو کیوں منتخب کر رہی ہیں، جن کی مالی حالت بہت اچھی ہے۔

اُردو رسالے بھی انھی مصنفوں کے گوشے یا پورے نمبر شائع کر رہے ہیں۔ یہ بھی غیر صحت مند رجحان ہے۔

ہندوستان کی تحقیق میں حوالے کی کتابوں کی تیاری پر بہت کم توجہ دی گئی ہے جب کہ یہ بنیادی اور اہم کام ہے۔

اُردو میں تحقیقی کام کے اس مختصر سے جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں تحقیقی کام بڑے پیمانے پر ہوا ہے۔ اس میں اعلیٰ درجے کا کام بھی ہے اور سطحی اور تیسرے درجے کا بھی۔

❖❖❖❖

پاکستان میں اُردو تحقیق

ڈاکٹر معین الدین عقیل

تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں اُردو تحقیق کا جائزہ تحریر کیا گیا ہے لیکن یہ جائزہ ادبی ولسانی تحقیق تک محدود ہے اور صرف ان کاوشوں تک جو میرے پیش نظر رہیں۔ ذیل میں جن تحقیقات کا جائزہ لیا جا رہا ہے، ممکن ہے اس معیار کے یا اس سے بہتر تحقیقی کام کیے گئے ہوں لیکن چونکہ ایسے کام میری دسترس میں نہیں رہے، اس لیے میں ان کے جائزے سے معذور رہا۔ اس جائزے میں علمی و مذہبی تحقیق کو بھی شامل نہیں کیا گیا۔ گو بعض ایسی تحقیقات، جو مذہب، علم اور تاریخ و سیاست کے ذیل میں آتی ہیں، اُردو کی ادبی و تاریخی تحقیق کے باب میں بھی شمولیت کے مستحق ہیں اور ان سے اُردو کی ادبی ولسانی تحقیق کا کام بھی آگے بڑھا ہے، مثلاً ''ادارہ تحقیقات اسلامی'' (اسلام آباد)، ''ادارہ تحقیقات پاکستان'' (لاہور)، ''ادارہ ثقافت اسلامیہ'' (لاہور)، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی'' (کراچی) قومی کمیشن برائے تحقیق تاریخ و ثقافت (اسلام آباد) ''قومی محفوظات'' (نیشنل آرکائیوز، اسلام آباد) ''آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس'' (کراچی) ''مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان'' (راولپنڈی)، ''مرکزی اُردو بورڈ'' (لاہور) ''اُردو اکادمی'' (بہاولپور) اور ان کے علاوہ علاقائی زبانوں کی اکادمیاں ''پنجابی ادبی اکادمی'' (لاہور) ''سندھی ادبی بورڈ'' (حیدر آباد) ''پشتو اکادمی'' (پشاور)، ''بلوچی اکیڈمی'' (کوئٹہ) اور جامعات سے ملحق اداروں میں سے جامعہ پنجاب کے شعبہ تصنیف و تالیف، جامعہ کراچی کے شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ اور موسسہ تحقیقات علوم آسیائی میانہ و غربی'' نے ضمنی طور پر اُردو زبان و ادب کی مآخذ و معاون کتب شائع کی ہیں اور ان اداروں میں بعض مشاہیر ادب کی قومی و سیاسی خدمات کے جائزوں پر مشتمل تحقیقات عمل میں آئی ہیں یا مثلاً جامعہ پنجاب کا مبسوط منصوبہ ''اُردو دائرہ معارف اسلامیہ'' جس میں اُردو زبان و ادب اور ادبی شخصیات پر متعدد تحقیقی مقالات شامل ہیں اور جو بجائے خود اہمیت کے حامل ہیں، لیکن یہاں ذیل میں ان اداروں کی ایسی کاوشوں کا علیحدہ جائزہ مقصود نہیں رہا۔ ان میں سے چند خصوصی اہمیت کی کاوشیں مناسب مقام پر اس جائزے میں شامل ہیں۔

مجموعی طور پر اُردو میں علمی، تاریخی و سیاسی اور مذہبی تحقیق کے بارے میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ حوصلہ افزا ہے اور اس سلسلے میں متعدد کام لائق ستائش ہیں۔ ان سے علم اور تحقیق، دونوں کے سرمائے میں بیش بہا اضافہ ہوا ہے اور بلاشبہ ایسے کام پایہ تکمیل کو پہنچے ہیں، جنھیں عالمی سطح پر بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ذخائر و مآخذ

قیام پاکستان کے وقت پاکستان میں اُردو تحقیق مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر عندلیب شادانی وغیرہ کی کاشوں کے تحت ارتقا پذیر تھی۔ یہ بزرگ قیام پاکستان سے قبل تحقیق کی دنیا میں معتبر حیثیت حاصل کر چکے تھے۔ قیام پاکستان کے کچھ عرصے بعد تک تحقیق کا سلسلہ ایک حد تک منتشر رہا۔ اس عبوری مدت میں یہی بزرگ اُردو تحقیق کے اس تسلسل کو اپنی ذاتی کاوشوں کے ذریعے قائم رکھنے میں کامیاب رہے۔ جو قیام پاکستان کے وقت قریب قریب ٹوٹ چکا تھا۔ کیونکہ تحقیق کے صبر آزما عمل میں جن سہولتوں اور مآخذ کے ذخیروں کی ضرورت ہوتی ہے وہ تقسیم ہند کے سبب اور اس کے انتشار کے باعث یہاں میسر نہ تھے۔ بھارت میں تحقیق کا کوئی تسلسل ٹوٹ نہ سکا تھا۔ وہاں کا معاشرہ مستحکم تھا مستحکم رہا۔ وہاں مآخذ اور ذخائر کی کوئی کمی نہ تھی۔ بانکی پور، رام پور، علی گڑھ، دہلی، حیدر آباد دکن، کلکتہ، بھوپال، بمبئی، پٹیالہ وغیرہ کے علمی ذخائر اُردو تحقیق کے لیے بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور انھی سے وہاں اُردو تحقیق اپنی روایات کے تسلسل کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئی۔

پاکستان میں معاملہ اس کے برعکس تھا۔ یہاں محض ڈھاکہ اور پنجاب کی جامعات کے کتب خانوں کے علاوہ پنجاب پبلک لائبریری، (لاہور)، لاہور ریکارڈز آفس، (لاہور) اور پشاور محفوظات، (آرکائیوز) تھے۔ یہی وجہ ہے کہ صرف لاہور میں تحقیقی روایت برقرار رہی۔ اورینٹل کالج کے اساتذہ اور اس کا مجلّہ اورینٹل کالج میگزین، اس تسلسل کو برقرار رکھنے میں نہایت اہم کردار ادا کرتا رہا۔ بعد میں نئی نئی جامعات کے قیام کے ساتھ ساتھ ان میں کتب خانے قائم ہوئے۔ انجمن ترقی اُردو کا کتب خانہ بھارت سے کراچی منتقل ہوا پھر کراچی کا محفوظات (آرکائیوز) اور قومی عجائب گھر اور لاہور کا عجائب گھر تہذیبی و علمی ورثے کے اہم مراکز بن گئے۔ جن میں خصوصاً کراچی کے عجائب گھر کا کتب خانہ اپنے مخطوطات اور نوادر کے سرمائے کے لحاظ سے بہت وقیع اور اہم ہے۔ اس کے علاوہ سرکاری امداد و اعانت سے قائم ہونے والے ادارے اور اکادمیاں بھی مآخذ کی جمع و ترتیب میں مصروف ہوئیں۔

ان اداروں میں محفوظ مخطوطات و نوادر محققین کے لیے نہایت اہمیت رکھتے ہیں اور یہ تحقیق کے فروغ کا اہم وسیلہ ہیں۔ ان کی معلوماتی اور وضاحتی فہرستوں کی اشاعت کا یہ سلسلہ جاری ہے، جو قیام پاکستان سے قبل شروع ہو چکا تھا۔ کتب خانہ جامعہ پنجاب کے مخطوطات کی فہرست کی پہلی جلد ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی تھی، دوسری جلد ۱۹۴۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد پنجاب پبلک لائبریری نے اپنے مخطوطات کی فہرستیں شائع کیں۔ پھر کتب خانہ جامعہ پنجاب کے دیگر ذخائر ذخیرہ محمود شیرانی اور ذخیرہ مولوی محمد شفیع کی فہرستیں شائع ہوئیں۔ ذخیرہ شیرانی کے مخطوطات کی فہرست کی تین جلدوں (لاہور، ۱۹۶۸ء۔ ۱۹۷۳ء) کے علاوہ اس کے مرتب ڈاکٹر محمد بشیر حسین نے ''مخطوطات ذخیرہ شیرانی'' کا ایک جائزہ مشمولہ اورینٹل کالج میگزین، شیرانی نمبر شمارہ (۲۲۲۔ ۲۲۳) تحریر کیا تھا۔ لیکن ایک نوجوان محقق سید عارف نوشاہی نے ۱۹۶۸ء سے ۱۹۸۱ء کے درمیان شائع ہونے والی متعدد نئی فہارس مخطوطات و مطبوعات کی مدد سے مذکورہ بالا فہرست پر مکرر اجمالی نظر ڈالی ہے (مشمولہ اورینٹل کالج میگزین شمارہ (۲۲۶۔ ۲۲۷) اور بعض مزید نسخوں کی نشاندہی کر کے اس کو مزید مفید بنایا ہے۔۔۔ کتب خانہ جامعہ پنجاب میں موجود مائیکرو فلم اور فونوگراف کی کتابیات بھی شائع ہو گئی ہیں (مرتبہ سید جمیل احمد رضوی۔ مشمولہ ''مجلہ تحقیق''۔ لاہور جلد ۲ شمارہ ۲)۔

ان کے علاوہ ''عجائب گھر'' (لاہور)، ''قومی مخطوطات'' (اسلام آباد) ''گیلانی لائبریری'' (اوچ)، ''کتب خانہ جامعہ کراچی''، ''کتب خانہ ہمدرد'' (کراچی) سندھ کے کتب خانوں کے اُردو مخطوطات کی مشترکہ فہرست ''سندھ میں اُردو مخطوطات'' (مرتبہ سید احمد علی زیدی، لاہور ۱۹۶۹ء) بھی شائع ہوئیں۔

اس عرصے میں یورپی ممالک کے کتب خانوں میں موجود اُردو مخطوطات اور نوادرات کی فہرستیں اور وہاں کے مخطوطات و نوادرات کے تحقیقی جائزے بھی شائع ہوئے۔ لیکن فہرست مخطوطات کے ضمن میں صرف ایک فہرست ''مخطوطات پیرس'' (کراچی) ۱۹۶۷ء کا ذکر ضروری ہے۔ جسے ایک پاکستانی مصنف ڈاکٹر آغا افتخار حسین نے پیرس کے کتب خانوں میں موجود اُردو فارسی پنجابی کے مخطوطات کے تذکرے پر مشتمل مرتب کیا۔

سقوط مشرقی پاکستان کے وقت تک ڈھاکہ اُردو زبان و ادب کے مطالعہ و تحقیق کا مرکز رہا ہے۔ ڈھاکہ میں السنہ شرقیہ کے مخطوطات کا بھی خاصا وقیع ذخیرہ موجود ہے، جس میں اُردو کے مخطوطات بھی موجود ہیں۔ ان مخطوطات کی ایک فہرست محمد صدیق خان نے مرتب کی ہے جس کی جلد دوم (ڈھاکہ ۱۹۶۸ء) میں اُردو مخطوطات کا تذکرہ شامل ہے۔

بعض اور کتب خانوں اور اداروں نے بھی ذخائر کی فہرستیں شائع کیں لیکن چونکہ ان میں اُردو مخطوطات و نوادر کا ذکر شامل نہیں اس لیے یہاں ان کی نشاندہی ضروری نہیں۔

ان مذکورہ فہرستوں سے قطع نظر یہاں دو فہرستوں کا ذکر ضروری ہے، جو اس اعتبار سے اہم ہیں کہ یہ صرف مخطوطات کے تذکرے پر مشتمل نہیں بلکہ ان میں تصنیف اور صاحب تصنیف پر بھی تحقیقی نظر ڈالی گئی ہے اور اس طرح اضافی تحقیقی معلومات یک جا کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک فہرست ''مخطوطات انجمن ترقی اُردو'' ہے جو انجمن کے کتب خانے کے ذخیرہ مخطوطات کے مفصل جائزے پر مشتمل ہے۔ اس کے مرتبین سید سرفراز علی رضوی اور افسر امروہوی ہیں جنھوں نے خاصی محنت اور دقت نظر سے مخطوطات اور ان کے مصنفین کے بارے میں معلومات یک جا کی ہیں۔ اس فہرست کی اب تک چھ جلدیں شائع ہو چکی ہیں (کراچی ۱۹۶۵ء۔ ۱۹۸۲ء) دوسری فہرست ''جائزہ مخطوطات اُردو'' ہے، جس کے مرتب مشفق خواجہ ہیں۔ یہ جائزہ مخطوطات کے تذکرے پر مشتمل ہے، لیکن دراصل اس میں مذکورہ مخطوطے کے دیگر تمام نسخوں اور اگر وہ شائع ہو چکا ہے، تو اس کی اشاعتوں کی تفصیلات کے جائزے کے ساتھ ساتھ صاحب تصنیف کے حالات و آثار پر نہایت محققانہ معلومات یک جا کی گئی ہیں۔ یہ التزام بعض دوسری فہرستوں میں بھی ملتا ہے لیکن اس قدر خصوصیت اور جامعیت کے ساتھ نہیں کہ خود اسے ایک ایسا تحقیقی کارنامہ کہا جا سکے جو اس جائزہ مخطوطات کے لیے کہا جا سکتا ہے۔ اس کی ابھی پہلی جلد شائع ہوئی ہے (لاہور، ۱۹۷۹ء) اور اس میں صرف کراچی کے دو سو مخطوطات کے جائزے کو شامل کیا گیا ہے۔ اس کے پیش لفظ کے مطابق یہ کام دس جلدوں پر محیط ہوگا اور ان میں پاکستان کے تمام کتب خانوں کے اُردو مخطوطات کا جائزہ شامل کیا جائے گا۔

اشپرینگر نے شاہان اودھ کے اُردو، فارسی اور اُردو مخطوطات کی جو فہرست مرتب کی تھی، اسے کئی حیثیتوں میں اہمیت حاصل ہے۔ یہ فہرست جو اُردو تحقیق کے لیے ایک مفید مآخذ کی حیثیت رکھتی ہے، ایک عرصے سے کم یاب تھی۔ محمد اکرام چغتائی نے یہ ایک بڑا کام کیا کہ اس فہرست کو ایک سیر حاصل مقدمے کے ساتھ جو بجائے خود تحقیق کا ایک عمدہ نمونہ ہے، اُردو میں منتقل کیا اور اس پر مفید تعلیقات تحریر کر کے اسے بیش از معلومات بنا دیا۔ ان کا یہ کام انجمن ترقی اُردو کے اہتمام سے پہلے مجلہ ''اُردو'' میں اور پھر کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے۔ (کراچی ۱۹۷۳ء)

ضمنی طور پر دکنی ادب کے تعلق سے بعض کتابیات کا یہاں ذکر کیا جا سکتا ہے۔ جو دکنی ادب کے محققین کے لیے معاون حیثیت رکھتی ہیں۔ اس موضوع پر

ایک کتابیات ''اُردو ادب کا دورِ اول'' کے زیرِ عنوان مجلہ ''اُردو نامہ'' (کراچی، جولائی ۱۹۶۱ء) میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں دکنی ادب کے اہم مخطوطات و مطبوعات کا ذکر کیا گیا تھا اور یہ بھی نشان دہی کی تھی کہ یہ مخطوطات و مطبوعات کس کتب خانے میں موجود ہیں۔ ان مآخذ کا تعلق تقریباً تین سو سال (۱۴۲۲ء تا ۱۷۵۰ء) کے عرصے پر محیط ہے۔ اس ضمن میں دو اور مضامین کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ایک سخاوت مرزا کا تحریر کردہ ہے جو انھوں نے سید نصیر الدین ہاشمی کی ''وضاحتی فہرست مخطوطات کتب خانہ سالار جنگ''، حیدر آباد کے مطالب و مباحث پر تنقید کے سلسلے میں لکھا تھا (مشمولہ ''اُردو'' کراچی، اپریل ۱۹۵۷ء) اس میں موصوف نے، جو قدیم ادب اور بالخصوص دکنی ادب پر گہری نظر رکھتے تھے بعض نئی معلومات فراہم کی ہیں۔ دوسرا مضمون سید ہاشمی فرید آبادی کا ہے جو انھوں نے دکنی (قدیم اُردو) کی بعض مطبوعات کے جائزے پر مشتمل تحریر کیا تھا مشمولہ (اورینٹل کالج میگزین اگست ۱۹۶۳ء)۔

فہرستوں کے علاوہ تحقیق کے دیگر مآخذ میں ''ماخذات احوال شعرا و مشاہیر'' کا ذکر بھی ناگزیر ہے (اسے سرفراز علی رضوی نے مرتب کرنا شروع کیا تھا۔ اس کی دو جلدیں انجمن ترقی اُردو نے شائع کی ہیں (کراچی ۱۹۷۷ء تا ۱۹۸۱ء) اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ کسی شخص کے بارے میں حصول معلومات کے کون کون سے مآخذ انجمن ترقی اُردو میں موجود ہیں۔ انجمن کا کتب خانہ اپنے سرمائے کے لحاظ سے خاصا وقیع ہے۔ فاضل مرتب نے تقریباً دو ہزار شعرا و مشاہیر علم و ادب کے ناموں کو بہ اعتبار حروف تہجی درج کر کے ان کے بارے میں مختصراً بنیادی معلومات اور پھر جن جن کتابوں میں ان کے حالات و آثار کے بارے میں معلومات ملتی ہیں ان کے نام اور صفحات نمبر درج کیے ہیں۔ مصادر میں ایسی کتابوں کے نام بھی ملتے ہیں جو راست سے قطع نظر ضمنی مآخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ عام طور پر محققین کے پیش نظر ایسی کتابیں نہیں رہتیں لیکن ان میں بڑی قیمتی معلومات مل جاتی ہیں۔ سرفراز علی رضوی ۱۹۸۱ء میں اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔ انھوں نے جس کام کا آغاز کیا تھا وہ اسے پورا نہ کر سکے۔ ان کے اس منصوبے کا باقی حصہ زیر ترتیب تھا۔ مطبوعہ جلدوں میں الف سے الف س تک ناموں کا اندراج ہوا ہے۔

انجمن کا ایک اور مفید منصوبہ اُردو کی تمام مطبوعات پر مشتمل ''قاموس الکتب'' کی اشاعت کا سلسلہ ہے۔ مذہب، تاریخ و سوانح اور عمرانیات سے متعلق مطبوعات کی فہرست پر مشتمل تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ باقی موضوعات پر جمع و ترتیب کا کام جاری ہے۔ بعض دیگر اداروں کی مطبوعات کی فہرستیں بھی شائع ہوئی ہیں۔ سندھ میں اُردو مطبوعات'' (مرتبین اسلام اختر و عبدالجمیل لاہور ۱۹۷۰ء)، سندھ کے کتب خانوں میں موجود اُردو کی کم یاب و اہم مطبوعات کے جائزے پر مشتمل ہے۔ بہادر یار جنگ اکیڈمی (کراچی) نے ''مملکت حیدر آباد'' کے نام سے ایک ضخیم کتابیات شائع کی ہے (کراچی، ۱۹۶۷ء) جس میں حیدر آباد دکن میں شائع ہونے والی کتابوں یا حیدر آباد دکن سے تعلق رکھنے والے مصنفین کی کتابوں کی فہرست درج کی گئی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ مذکورہ مآخذ پاکستان میں اُردو تحقیق کی رفتار کو بڑھانے میں معاونت کرتے ہیں لیکن پھر بھی یہ مآخذ اور یہاں کے ذخائر بھارت میں موجود ذخائر کے مقابلے میں بہت محدود ہیں۔

اصول تحقیق

اصول تحقیق اور ترتیب و تدوین متن پر یہاں خاطر خواہ کام نہیں ہوا۔ بھارت میں جس طرح قاضی عبدالودود، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، رشید حسن خان، ڈاکٹر عبدالرزاق قریشی، ڈاکٹر گیان چند، ڈاکٹر نذیر احمد اور مالک رام نے فن اور اصول تحقیق پر اپنی آراء کا اظہار کیا، ان سے ان کے معیار تحقیق کے تعین میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اس طرح کی مثالیں پاکستان میں بہت کم ہیں کہ یہاں محققین نے اصول و فن تحقیق کے معیار متعین کیے ہوں۔ وہ خود اگر بڑے اعلیٰ پائے کے محقق ہیں تو بھی انھوں نے اس کے اصول و فن وضع کر کے رہبری کا فریضہ انجام دینے کی طرف دل جمعی سے توجہ نہیں دی۔ اس ذیل میں وہ چند حضرات ضرور مستثنیٰ ہیں، جنھوں نے اس ضمن میں کچھ کوشش کی ہے۔ مثلاً ڈاکٹر سید عبداللہ (''تحقیق و تنقید'' مشمولہ ''نیا دور'' کراچی شمارہ ۵-۶، ۱۹۵۶ء اور ''تحقیق و تنقید کے مقامات اتصال'' مشمولہ ''اردو نامہ'' کراچی، اپریل ۱۹۶۰ء) اور مظفر علی سید (''اُردو ادب اور تحقیق'' مشمولہ ''نقوش'' لاہور، ۱۹۶۱ء) نے اس سلسلے میں کچھ ابتدائی و بنیادی اشارے کیے ہیں---- لیکن ان تینوں مضامین سے اصول تحقیق متعین نہیں کیے جا سکتے۔

اس موضوع پر دراصل پہلی بار ایک بزرگ اور ممتاز محقق، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے توجہ دی اور فن تحقیق کو موضوع بنایا۔ ان کا مقالہ ''فن تحقیق'' پہلے پہل ''کل پاکستان اُردو تدریس کانفرنس''، منعقدہ لاہور، دسمبر ۱۹۶۱ء میں پڑھا گیا تھا، جو بعد ازاں ترمیم کے ساتھ توسیعی خطبے کے طور پر سندھ یونیورسٹی میں ۷ اکتوبر ۱۹۶۵ء کو پیش کیا گیا۔ یہ توسیعی خطبہ بعد میں ''نقوش'' (لاہور) جنوری ۱۹۶۶ء میں اور پھر کتابی صورت میں شائع ہوا۔ پاکستان میں فن تحقیق پر لکھا جانے والا یہ پہلا قابل توجہ مقالہ ہے، یہ مقالہ مختصر ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس میں جو باتیں کہیں، وہ بھارت میں لکھی جانے والی بعض بڑی بڑی کتابوں میں محل کلام کے ساتھ نظر آتی ہیں۔

قریب قریب اسی عرصے میں ایک اور بزرگ محقق ڈاکٹر عندلیب شادانی نے بھی اس موضوع پر اظہار خیال کیا۔ ان کا مقالہ ''تحقیق اور اس کا طریق کار'' (مشمولہ ''صحیفہ'' لاہور، جولائی ۱۹۶۵ء) بھی ان بنیادی اصولوں کا تعین کرتا ہے، جو تحقیق کے سلسلے میں اختیار کیے جانے چاہئیں۔

ڈاکٹر آغا افتخار حسین نے بھی اس موضوع سے دلچسپی لیتے ہوئے اپنی ایک دو تحریروں میں (مشمولہ ''یورپ میں تحقیقی مطالعے'' مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۷ء) ایسے نکات پیش کیے، جو بہتر تحقیق میں معاون ہوسکتے ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کا مختصر مضمون ''ادبی تحقیق کا بنیادی اصول'' (مشمولہ ''افکار'' کراچی، جنوری ۱۹۵۸ء) بھی موضوع کی اہمیت سے متعلق ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔ اپنے ایک مقالے (مشمولہ: ''اکادمی'' لکھنؤ، مارچ ۱۹۸۲ء) میں تنقیدی اور تحقیقی موضوعات پر لکھنے کے اصول بتائے ہیں۔

اسی سلسلے میں ایک ضمنی کوشش نسیم فاطمہ نے ''حوالہ جاتی خدمات'' (کراچی ۱۹۷۸ء) کے توسط سے کی ہے۔ ان کی یہ کتاب بنیادی طور پر فن کتاب داری کے تقاضوں اور پیشہ وارانہ تعلیم و تربیت کے مقصد سے لکھی گئی ہے، لیکن یہ ان مآخذ کی طرف رہنمائی بھی کرتی ہے جو ایک کتب خانے سے محققین کو حاصل ہوسکتے ہیں۔ اس موضوع پر اب حال میں دو حضرات نے خاص توجہ دی ہے۔ ان میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے ''دستاویزی تحقیق'' کو موضوع بنایا (مشمولہ: ''اورینٹل کالج میگزین'' شمارہ ۲۲۴) مقالہ نگار نے اپنے مقالے میں اولاً یہ دکھایا ہے کہ دستاویزی طریق تحقیق میں کن ذرائع سے مواد حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ مقالہ نامکمل ہے اور ابھی اس کی صرف پہلی قسط شائع ہوئی ہے۔

اس موضوع پر حال میں سید جمیل احمد رضوی نے بھی اظہار خیال کیا ہے۔ اپنے مقالے ''دستاویزی طریق تحقیق'' (مشمولہ ''مجلّہ تحقیق'' لاہور'' شمارہ: ۱، جلد ۵، ۱۹۸۲ء) میں فاضل مقالہ نگار نے تقریباً انھی باتوں کو قدرے ترمیم و اضافہ سے دہرایا ہے، جنھیں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اپنے مقالے میں بیان کیا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں حضرات نے اپنے مقالے کی بنیاد ٹائیرس ہل وے (Tyrus Hillway) کی تصنیف (Introduction to Research) (مطبوعہ بوسٹن، ۱۹۷۴ء) میں بیان کردہ اصولوں پر رکھی ہے لیکن اس سے قطع نظر یہ دونوں مقالات اپنے موضوع پر محققین کے لیے مفید کہے جاسکتے ہیں۔ اپنی اہمیت کے پیش نظر یہ موضوع اور اصول ترتیب و تدوین متن ابھی اہل تحقیق کی توجہ کے مستحق ہیں۔

(۲)

تحقیقی کاموں کا جائزہ

جامعات تحقیق کے فروغ کا ایک بڑا اور مستقل ادارہ ہیں۔ نجی اور انفرادی طور پر بھی تحقیق میں قابل قدر اور وقیع کام انجام پاتے ہیں۔ ان کاموں کے جائزے کو سہولت کے پیش نظر دو شقوں، لسانی تحقیق اور ادبی تحقیق اور پھر اس کی ذیلی شقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

لسانی تحقیق

اُردو میں لسانی تحقیق کا آغاز حافظ محمود شیرانی اور مولوی عبدالحق نے کیا تھا۔ پھر وحید الدین سلیم، نصیر الدین ہاشمی، سید سلیمان ندوی نے اس میں مفید اضافے کیے لیکن جدید لسانیات کے علم سے استفادے کے بعد سب سے پہلے ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، عبدالقادر سروری اور احتشام حسین نے اس ضمن میں وقیع کام کیے۔ اس کام کو ڈاکٹر مسعود حسین خان نے سائنٹیفک اصولوں کی مدد سے آگے بڑھایا۔ ان کے ساتھ ساتھ اس سلسلے میں ڈاکٹر گیان چند، رشید حسن خان اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ یہاں پاکستان میں ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے نام اس لیے اہمیت رکھتے ہیں کہ ڈاکٹر سبزواری نے اُردو کے ارتقا کو علمی اور سائنسی بنیادوں کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے جدید علم لسانیات کی روشنی میں اُردو کی لسانی تشکیل کا مطالعہ کیا۔

لسانی تحقیق کے ضمن میں ایک تو وہ کام اہمیت رکھتا ہے، جو اُردو کے آغاز کے نظریے اور اس کی علاقائی حد بندی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کام کا آغاز ۱۹۲۳ء میں اس وقت ہوا تھا جب نصیر الدین ہاشمی نے ''دکن میں اُردو'' شائع کی تھی اور اس میں انھوں نے دکن کو اُردو کا مولد قرار دیا۔ پھر محمود شیرانی کی کتاب ''پنجاب میں اُردو'' ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی۔ جس میں انھوں نے پنجاب کو اُردو کے آغاز کی سرزمین ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان دونوں کتابوں کی اشاعت کے بعد اُردو زبان کے آغاز کے ضمن میں محققین میں مطالعہ و تحقیق کار جحان پیدا ہوا۔ ویسے محمد حسین آزاد کی تصنیف ''آب حیات'' کے بعد سے یہ موضوع

کبھی عدم توجہی کا شکار نہیں رہا تھا لیکن مذکورہ بالا دونوں تصانیف کے بعد اس موضوع کو مستقل اہمیت حاصل ہوئی اور اس طرزِ مطالعہ سے برصغیر کے تقریباً تمام علاقوں میں اُردو کے ارتقا اور ان کی اُردو خدمات کا تحقیقی جائزہ لیا جانے لگا۔ اس ضمن میں میسور میں اُردو، بنگال میں اُردو، بھوپال میں اُردو، بمبئی میں اُردو، بہار میں اُردو، سندھ میں اُردو، ناگپور میں اُردو، یوپی میں اُردو جیسے جائزے مرتب ہونے لگے۔ محققین نے ہر علاقے کے قدیم ادب کو بڑی محنت سے تلاش کر کے ادبی دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس طرزِ تحقیق سے اُردو زبان کے قدیم ادب کا بیش قیمت سرمایہ دریافت ہوا اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

پروفیسر محمود شیرانی نے اپنے معاصرین کے مقابلے میں اُردو میں لسانی تحقیق کا فی الحقیقت بہت بڑا کارنامہ انجام دیا اور اُردو کی ابتدا کے سلسلے میں تحقیق کا راستہ ہموار کیا۔ بعد میں ہریانی پر ڈاکٹر زور نے بھی اپنی موقر تصنیف ''ہندوستانی لسانیات'' (۱۹۳۲ء) میں زور دیا۔ بلکہ اس سلسلے میں انھوں نے سب سے کامیاب کوشش کی۔ ان کے بعد ڈاکٹر مسعود حسین خان نے ''مقدمہ تاریخ زبان اُردو'' (۱۹۴۷ء) میں یہ ثابت کیا کہ ہریانی زبان پرانی اُردو کی باقی ماندہ شکل نہیں بلکہ ایک علیحدہ اور مستقل زبان کی حیثیت سے عرصے سے مضافات دہلی میں رائج تھی۔ ڈاکٹر صاحب کھڑی بولی کو اُردو کی بنیاد قرار دیتے ہوئے اپنے تحقیقی نتائج تک پہنچتے تھے۔

قیامِ پاکستان کے بعد اس موضوع پر سب سے اہم کام ڈاکٹر شوکت سبزواری نے کیا۔ ان کی تصنیف ''اُردو زبان کا ارتقا'' (ڈھاکہ، ۱۹۵۶ء) اپنے موضوع پر نئی سمتوں کا تعین کرتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس میں محمود شیرانی اور مسعود حسین خان دونوں سے اختلاف کرتے ہوئے اپنا نظریہ وضع کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے لسانی تحقیق میں بڑا وقیع اور قابلِ قدر کام کیا ہے۔ اُردو کی اصل اور اس کی ابتدا، زبان کا ارتقا، دخیل الفاظ اور الفاظ کی سرگزشت ان کے محبوب موضوعات تھے۔ ان کی ایک اور تصنیف ''اُردو لسانیات'' (کراچی ۱۹۶۶ء) اور ان کا مبسوط مقالہ ''داستانِ زبانِ اُردو'' (مشمولہ: ''اُردو'' کراچی، اپریل ۱۹۵۸ء) نیز بہ صورت کتاب کراچی ۱۹۶۰ء) اس موضوع پر ان کی نمائندہ تصانیف ہیں۔ موخر الذکر تصنیف میں اُردو کے آغاز، اس کے لسانی سرمائے اور اس کے آغاز کے مختلف نظریوں کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اُردو پنجابی کا تقابلی مطالعہ بھی کیا ہے پھر اس کے مولد پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اس کے ارتقائی مدارج کا تعین کیا ہے اور اُردوئے قدیم کے چند نمونے بھی درج کیے ہیں۔

پیر حسام الدین راشدی نے اپنے ایک مقالہ ''اُردو زبان کا اصلی مولد سندھ'' (مشمولہ ''اُردو'' کراچی، اپریل ۱۹۵۱ء) میں سندھ کو اُردو کا اولین مولد قرار دیا ہے۔ اس نظریے کو اولاً سید سلیمان ندوی نے پیش کیا تھا لیکن انھوں نے یہ کہہ کر کہ ''سندھ، پنجاب اور دکن میں جو زبانیں بنیں وہ اُردو نہیں بلکہ بالترتیب سندھی، پنجابی اور دکنی تھیں'' رجوع کر لیا تھا۔ عبدالحق فرید کوٹی نے اس موضوع پر اپنی ایک ضخیم تصنیف ''اُردو زبان کی قدیم تاریخ'' (لاہور، ۱۹۷۲ء) میں اس نقطہ نظر میں اس حد تک اضافہ کیا کہ پنجابی، سرائیکی اور سندھی، تینوں وادیٔ سندھ کی زبانیں ہیں۔ لہٰذا پنجابی اور سرائیکی، سرائیکی اور سندھی، سندھی اور پنجابی میں ایک قریبی مماثلت پائی جاتی ہے (صفحہ ۷) ان کے خیال میں اُردو سنسکرت سے نہیں نکلی بلکہ اس کا سرچشمہ وادیٔ سندھ کی قدیم زبان ہے (صفحہ ۵۸) اور اُردو پنجابی سے نکلی ہے (صفحہ ۷۸) ان کی مراد یہ ہے کہ وادیٔ سندھ کی قدیم زبان پنجابی ہے لہٰذا وہی اُردو کا سرچشمہ ہے۔

اُردو کی ابتداء کے بارے میں جو اولین بیانات ملتے ہیں، ان میں میر امن دہلوی کا بیان پہلا بتایا جاتا ہے۔ میر امن نے باغ و بہار کے مقدمے میں اُردو زبان کے آغاز کا ذکر کیا تھا ''باغ و بہار'' ۱۸۰۳ء میں شائع ہوئی تھی لیکن ڈاکٹر عندلیب شادانی نے اکتوبر ۱۹۴۹ء کے مجلّہ ''اُردو'' (کراچی) میں مرزا جان طپش کے کلیات کے دیباچے کا (جو فارسی میں ہے) اُردو ترجمہ نقل کیا ہے۔ طپش نے اپنا کلیات ۱۱۹۹ھ میں مرتب کر لیا تھا۔ اس دیباچے میں طپش نے شعرِ ہندی کو ریختہ کہنے اور اُردو کی وجہ تسمیہ بھی بیان کی ہے۔ ڈاکٹر شادانی کی اس کاوش سے یہ بات سامنے آئی کہ میر امن سے پہلے اُردو کے آغاز کے بارے میں اظہارِ خیال ہو چکا ہے لیکن کچھ عرصے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی کی کاوش سے محمد باقر آگاہ کا ''دیباچہ گلزارِ عشق'' منظرِ عام پر آیا (صحیفہ، جنوری ۱۹۷۳ء) جس سے معلوم ہوا کہ طپش کے دیباچے سے بھی پہلے آگاہ نے برج بھاشا کو اُردو کی اصل بتایا ہے۔ اس دیباچے کی دیگر خصوصیات کا ذکر آئندہ اوراق میں آئے گا۔

اس جگہ چند ایسے مقالات کا ذکر بھی بے جا نہ ہوگا، جن میں زبان کے آغاز و مولد کے بارے میں تحقیق نظریات کا تنقیدی و وضاحتی جائزہ لیا گیا ہے۔

پروفیسر حبیب اللہ غضنفر ایک معتبر اور وسیع المطالعہ عالم تھے۔ ان کی دیگر تحریروں کی طرح ان کا اس موضوع پر ایک مقالہ ''اُردو زبان کے آغاز و ارتقا کے مختلف نظریے'' (مشمولہ تاریخ ادبِ اُردو، جلد اول مرتبہ ڈاکٹر عبدالقیوم، کراچی، ۱۹۶۱ء) ایک عمدہ تنقیدی و تحقیقی کاوش ہے۔ اس میں فاضل مقالہ نگار نے زیرِ بحث نظریات کی تشریح کے لیے خود تلاش و تحقیق سے کام لیا ہے اور متعدد ماخذ سے مدد لی ہے۔ اس نوع کا ایک مقالہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے ''پنجاب میں اُردو'' ''اُردو کی کہانی شیرانی کی زبانی'' تحریر کیا (مشمولہ ''اورینٹل کالج میگزین'' شمارہ ۲۲۳-۲۲۲) یہ بہ ظاہر محمود شیرانی کے نظریے کی تعبیر و تشریح ہے لیکن یہ اس نظریے کے پس منظر

کے تحقیقی جائزے پر مشتمل ہے اور اس میں دیگر پیش کردہ نظریات کی تردید کر کے شیرانی کے نظریے کو راسخ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اُردو کے آغاز کے تعلق سے محققین کے لیے جو موضوع بہت اہم رہا ہے، وہ اُردو کا رشتہ دوسری زبانوں سے ہے۔ اُردو اور پنجابی کی لسانی مشابہتوں پر محمود شیرانی نے تفصیل سے روشنی ڈالی تھی اور اس ضمن میں ان کی زیادہ توجہ اُردو، پنجابی اور برج بھاشا کے تقابلی جائزے پر مرکوز تھی۔ اُردو اور پنجابی کے رشتے پر ڈاکٹر زور نے بھی مفصل روشنی ڈالی ہے۔ پنڈت کیفی بھی ان دونوں زبانوں میں مضبوط باہمی رشتے کے قائل تھے۔ ان کے مقابلے میں ڈاکٹر مسعود حسین خان اُردو کا رشتہ پنجاب کے ساتھ ساتھ ہریانی سے بھی ملاتے ہیں اور پھر وہ موجودہ پنجابی اور ہریانی کا مقابلہ قدیم دکنی سے کر کے نتائج اخذ کرتے ہیں، جو ڈاکٹر زور کے خیال میں ان کی ایک اہم فروگزاشت ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اُردو کا تعلق پالی سے استوار کیا ہے۔ لسانی رشتوں، مماثلتوں اور اختلافات کی تلاش و تحقیق کا سلسلہ ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے پاکستانی محققین کے پیش نظر رہا ہے۔ ڈاکٹر سبزواری نے اپنی مذکورہ تصانیف اور پروفیسر حبیب اللہ غضنفر نے اپنے مذکورہ مقالے میں لسانی رشتوں اور مماثلتوں پر تحقیقی اور تنقیدی نظر ڈالی تھی۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے، اُردو لسانیات، اُردو کے آغاز اور اشتقاقیات میں مستقل دلچسپی لی ہے ''قدیم دکنی اور اُردو کا تقابلی مطالعہ'' (مشمولہ ''اُردو نامہ'' کراچی، اکتوبر ۱۹۶۴ء) بھی کیا اور صوتیات اور صرف و نحو کا مفصل تجزیہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ دکنی، اُردو سے الگ ایک آزاد اور مستقل زبان ہے، جسے انھوں نے بیجاپوری قرار دیا ہے اور جو آج بھی بیجاپور میں سنی جا سکتی ہے۔ یہ زبان اپنی پڑوسن کونکنی سے بہت زیادہ ملتی ہے۔ کونکنی بمبئی کے جنوب میں بھارت کے مغربی ساحل کی زبان ہے اور مرہٹی کی ایک اہم شاخ کہی جا سکتی ہے۔ یہ کونکنی زبان اپنی صوتیات کے اعتبار سے دکن میں اور چند خصوصیات کے باعث پورے ہندوستان میں اہمیت رکھتی ہے۔ بیجاپوری اور کونکنی قرب مکانی کے باعث بہت کچھ مشابہت رکھتی ہیں۔ چنانچہ دکنی کی بہت سی ایسی خصوصیات جنھیں آج تک پنجابی کا تصرف سمجھا جا رہا ہے، دراصل خود بیجاپوری کی مقامی خصوصیات ہیں جو کونکنی میں بھی پائی جاتی ہیں۔ ان کے خیال میں تاریخی واقعات کے مدد سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پنجابی، ہریانی وغیرہ زبانوں نے دکن کی متعدد زبانوں کو جنم دیا ہے۔ دوسری طرف اُردو اور دکنی کی مشابہت، جس کے باعث ان میں قدیم و جدید کا تعلق فرض کر لیا گیا ہے، صرف اس بات کی دلیل ہے کہ یہ دونوں، زبانوں کے مہاراشٹری گروہ سے تعلق رکھتی ہیں اس لیے دونوں میں نہ صرف دراوڑی بلکہ مہاراشٹری ہونے کے لحاظ سے بھی بہت کچھ حصہ مشترک ملتا ہے۔

اس نہج پر محققین نے اُردو کا سندھی (''اُردو سندھی کے لسانی روابط'' مصنفہ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، لاہور، ۱۹۷۰ء)، ملتانی ''ملتانی زبان اور اس کا اُردو سے تعلق'' مصنفہ ڈاکٹر مہر عبدالحق، بہاولپور، ۱۹۶۷ء) کشمیری، ہندکو، براہوی، پشتو اور راجستھانی سے لسانی اشتراک و اختلاف کا تحقیقی مطالعہ کیا ہے۔ یہ تحقیقی مطالعے جامعات میں مکمل ہوئے ہیں اور ان میں سے فی الحال اول الذکر دو مطالعے شائع ہوئے ہیں۔

مشترک خصوصیات کے ساتھ ساتھ مشترک الفاظ کی تلاش بھی محققین کی دلچسپی کا موضوع بنی ہے۔ ڈاکٹر محمد شہید اللہ نے اُردو اور بنگالی کے مشترک الفاظ کی ایک فرہنگ ترتیب دی (۱۹۵۹ء) پھر اس کام کو پروفیسر شبیر علی کاظمی مرحوم نے آگے بڑھایا۔ ان کا مبسوط مقالہ ''اُردو اور بنگلہ زبانوں میں انڈو آریائی نسل کے مشترک الفاظ'' (مشمولہ ''اُردو'' کراچی، اکتوبر ۱۹۵۷ء، جنوری ۱۹۵۸ء، جولائی و اکتوبر ۱۹۵۸ء) اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ مرکزی اُردو بورڈ لاہور کی مرتبہ ''ہفت زبانی لغت'' میں اُردو، بنگلہ، بلوچی، پشتو، پنجابی، سندھی، کشمیری زبانوں کے مشترک اور مماثل الفاظ یک جا کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر شہید اللہ کا ایک اور مختصر کام اُردو میں پرتگالی الفاظ کا کھوج لگانے سے تعلق رکھتا ہے۔ (''اصولیات'' مشمولہ ''اُردو نامہ'' کراچی، نومبر ۱۹۶۰ء)۔

زبانوں کے اشتراک کے مطالعے کا ایک اگلا قدم اُردو کا غیر ملکی زبانوں سے رشتے اور تعلق کے مطالعے کا ہے۔ اس ضمن میں ترکی اور اُردو کے مشترک عناصر کی نشاندہی کا کام ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے انجام دیا۔ اولاً انھوں نے ترکی اور اُردو کے مشترک عناصر کا تحقیقی مطالعہ کیا۔ "University Studies" جامعہ کراچی (ج ۳ ش ۲ اگست ۱۹۶۶ء) اور پھر مشترک الفاظ کی فہرست مرتب کی (ایضاً ج ۳ ش ۲) اسی سلسلے میں ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ نے ''اُردو زبان کے ترکی عناصر'' کا مطالعہ کیا (مشمولہ: ''صحیفہ'' جولائی ۱۹۷۲ء) فاضل مقالہ نگار نے اس مقالے میں جہاں تحقیق سے دکھایا ہے کہ ترکی زبان کے کون کون سے الفاظ اُردو میں عموماً استعمال ہوئے ہیں، وہیں لفظ اُردو پر بھی ایک نظر ڈالی ہے۔ ان کا یہ مقالہ خاص معلوماتی ہے۔ ترکی اور اُردو کے تعلق سے ڈاکٹر محمد صابر نے بھی مستقل کام کیے ہیں۔ ایک ''ترکی اُردو لغت'' کی ترتیب کے ساتھ ساتھ ترکی زبان پر بھی انھوں نے مقالات تحریر کیے۔ ان کا ایک مقالہ ''اُردو میں ترکی و منگولی الفاظ'' خاصا اہم ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے اس مقالے (مشمولہ ''اُردو نامہ'' جولائی ۱۹۶۳ء) میں ایک مفید اور مبسوط پس منظر کے بعد محض چند ہی الفاظ کا انتخاب کیا ہے لیکن ان پر بھی تحقیقی اور اشتقاقی نظر ڈالی ہے۔ پھر ان کا ایک وقیع مقالہ ''لفظ اُردو کی تاریخ'' ہے، (''اُردو نامہ'' اپریل ۱۹۶۲ء) اس میں ان مختلف معنوں کے ارتقا کا تحقیقی مطالعہ کیا گیا ہے جو ترکی اور اس کی مختلف زبانوں میں مروج ہیں۔

دوسری زبانوں سے اُردو کی اثر پذیری کے تعلق سے ڈاکٹر عبدالحق کے مبسوط تحقیقی مقالے ''فارسی شاعری کا اثر اُردو شاعری پر'' (ڈھاکہ سن ندارد) کا ذکر کیا جاسکتا ہے لیکن یہ زبان کے ساتھ ساتھ ادبی اثرات کے جائزے پر مشتمل ہے۔ لیکن اس نوعیت کا ایک منفرد اور قابل قدر کارنامہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ''اُردو میں قرآن وحدیث کے محاورات'' پر محققانہ نظر ڈالی ہے۔ ان کی تصنیف (اسلام آباد، ۱۹۸۰ء) دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول (یہ حصہ اولاً بہ صورت مقالہ ''نیا دور'' کراچی، شمارہ ۳۰-۲۹ میں شائع ہوا تھا) میں قرآنی محاورات اور حصہ دوم میں حدیث کے محاورات کو اُردو میں استعمال کرنے کی روایت کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ قرآنی محاورات کے ذیل میں ڈاکٹر صاحب نے اسماء الحسنیٰ کی مناسبت سے صرف ۹۹ محاورات کا انتخاب کیا ہے اور پھر یہ دکھایا ہے کہ اُردو ادب میں کس کس شاعر نے ان محاورات سے استفادہ کیا ہے۔ اس طرح حدیث کے محاورات کا انتخاب کیا ہے اور پھر ان سے اُردو شعرا کے استفادے کی مثالیں دی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ کام اُردو زبان کے متعلق تحقیق میں ایک منفرد کارنامے کے ذیل میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اسی ضمن میں قرآن وحدیث کے صنائع و بدائع کا مطالعہ بھی کیا ہے (''ہمارا علم وادب'' حیدرآباد ۱۹۸۵ء) اور تحقیق میں موضوعات کی انفرادیت کی ایک مثال قائم کی ہے۔ ان موضوعات پر کسی اور نے توجہ نہیں دی۔ اُردو زبان وادب کے اثر پذیری کے ذیل میں ڈاکٹر صاحب کا ایک اور مقالہ ''ثقافتی اُردو'' ہے۔ جو ''نیا دور'' کراچی میں اور کتابی صورت میں شائع ہوا۔ اس مقالے میں ڈاکٹر صاحب نے کمال تحقیق وجستجو سے یہ دکھایا ہے کہ اُردو زبان میں ہندوستانی اثرات کس حد تک کارفرما ہیں اور الفاظ ومحاورات پر ہندو مذہب، تہذیب اور افکار کی چھاپ کہاں کہاں نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ مقالہ ان کے وسیع مطالعے اور ان کی دقت نظری کا شاہد ہے۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ نے اُردو کی اثر پذیری کے ساتھ ساتھ اثر اندازی کا بھی ایک مطالعہ کیا ہے، ان کا مقالہ ''فارسی پر اُردو کا اثر'' اپنے موضوع پر ایک بہت جامع اور معلوماتی وتحقیقی کارنامہ ہے۔ اس مقالے کو ڈاکٹر صاحب نے نواب صدر یار جنگ کی فرمائش پر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ پونا میں ۲۹ دسمبر ۱۹۴۰ء کو پڑھا تھا۔ اس کے بعد یہ ''معارف'' (اعظم گڑھ، فروری مارچ ۱۹۴۱ء) میں شائع ہوا پھر یہ صورت کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۵۲ء میں اور پھر خاصی ترمیم واضافے کے ساتھ ۱۹۶۰ء میں دوبارہ شائع ہوا۔ اس نوع کی ایک کوشش ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی کی تھی اور ''قدیم عربی تصانیف میں ہندوستانی الفاظ کا سراغ لگایا تھا (مشمولہ ''اورینٹل کالج میگزین'' مئی ۱۹۴۳ء)، لیکن ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کا مقالہ زیادہ مبسوط اور جامع ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کے مطابق جس طرح اُردو فارسی سے متاثر ہوئی ہے، اسی طرح اس نے فارسی کو بھی متاثر کیا ہے۔ کم از کم پانچویں صدی ہجری سے اُردو کے الفاظ فارسی میں تواتر کے ساتھ ملتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے عہد بہ عہد فارسی شاعروں کے ہاں اُردو الفاظ تلاش کیے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ لسانی وادبی اثرات کی نشاندہی کی ہے اور پھر وہ تاریخی اسباب بھی بتائے ہیں جن کے زیر اثر فارسی شاعروں نے اُردو الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اسی ذیل میں فارسی شاعری میں ہندوستان کے تہذیبی ومعاشرتی لوازمات کا ذکر اور اُردو کے محاورات کے استعمال کا جائزہ بھی لیا ہے۔ اس مقالے میں ڈاکٹر صاحب نے الفاظ کے تلفظ، املا اور معانی کی تبدیلیوں پر بھی محققانہ نظر ڈالی ہے۔

اسی نہج پر ایک کوشش سکھوں کی مقدس کتاب ''گروگرنتھ'' میں اُردو کی تلاش ہے۔ یہ کام عبداللہ گیانی نے کیا ہے۔ انھوں نے اپنی تصنیف ''گروگرنتھ اور اُردو'' (لاہور، ۱۹۶۶ء) میں گروگرنتھ سے ایسے شبد اور اشلوک جمع کیے ہیں جن سے اُردو کی ابتدائی شکل معلوم کرنے میں مدد مل سکتی ہے اور اس امر کا پتا چل سکتا ہے کہ اُردو نے کس طرح کے تشکیلی مراحل طے کیے ہیں۔ تصنیف کا بڑا حصہ ان عربی وفارسی الفاظ کی فہرست پر مشتمل ہے جو گروگرنتھ میں استعمال ہوئے ہیں۔

اُردو زبان کے قدیم نمونوں کو تلاش کرنے کا کام ادبی تاریخوں میں بھی ہوا ہے لیکن وہ نمونے عموماً ادب کے ہیں اور بالعموم مسلمان شاعروں سے منسوب ہیں۔ جب سے یہ خیال عام ہوا ہے کہ اُردو کی داغ بیل مسلمانوں کی آمد سے قبل پڑ چکی تھی، ہندوستان کی قبل از اسلام زبانوں میں اُردو الفاظ کی تلاش وتحقیق کا رجحان بڑھ گیا ہے۔ بعض محقق اس کام میں پیش پیش رہے ہیں۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے اس کام کو خصوصی اہمیت دے کر ''رگ وید'' سے ایسے الفاظ کا انتخاب کیا ہے جو صوتی، حرفی اور نحوی اعتبار سے اُردو کے ابتدائی الفاظ کہے جاسکتے ہیں۔ اپنے مقالے ''اُردو زبان کا آغاز'' (''نقوش'' جنوری ۱۹۶۳ء) میں انھوں نے ان دلائل کے ساتھ ساتھ کہ اُردو مسلمانوں کے آمد سے قبل برعظیم میں موجود تھی، ''رگ وید'' میں شامل اُردو الفاظ کی مختلف صورتوں کو فہرست وار ترتیب دیا ہے۔ یہی کام انھوں نے زیادہ مبسوط انداز میں ایک ضخیم تصنیف ''اُردو کی کہانی'' (لاہور، ۱۹۷۵ء) کی صورت میں کیا ہے۔ اس میں انھوں نے ویدک اور سنسکرت سے اُردو الفاظ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالے ہیں اور پھر عہد بہ عہد اس کے نمونے جمع کیے ہیں۔

اس نوعیت کا ایک کام پروفیسر سید شبیر علی کاظمی نے انجام دیا۔ انھوں نے ''پراچین اُردو'' (کراچی، ۱۹۸۲ء) میں بنگالی اشلوکوں اور دوہوں میں قدیم اُردو عناصر تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے بودھ گان اور دوہا کے ۴۷ پدوں یعنی حمدوں کا ترجمہ کیا ہے، جو مسلمانوں کی آمد سے قبل لکھے گئے تھے۔ کاظمی صاحب نے پدوں کے ترجمے سے پہلے ایک جامع مقدمہ تحریر کیا ہے، جو ان پدوں کے پس منظر کے ساتھ ساتھ اُردو زبان کے آغاز کے پس منظر کے لحاظ سے بھی

معلوماتی ہے اور پھر آخر میں پدوں کی توضیحات، مشترک الفاظ، مشترک مصادر کی قدیم صورتیں اور ''اُردو کے آثار ۸۰۰ء'' میں جیسے ضمیے لکھ کر کتاب کی تحقیقی حیثیت کو بڑھا دیا ہے۔

قدیم لغات میں اُردو الفاظ کی تحقیق بھی ایک اہم موضوع ہے۔ قیام پاکستان کے بعد اس موضوع پر اولاً ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے توجہ دی۔ ان کا مقالہ ''چند قدیم لغات'' (''اورینٹل کالج میگزین'' مئی ۱۹۴۹ء) اُردو کے مختلف ناموں ہندوی، ہندی وغیرہ کے ذکر سے شروع ہوتا ہے اور پھر چار قدیم لغات ''ادات الفضلا'' مولفہ قاضی خان بدر محمد دھاروالی، ''مفتاح الفضلا'' مولفہ محمد ابن داؤد، ''موئد الفضلا'' مولفہ محمد ابن لاد اور ''دستور الصبیان'' مولفہ نامعلوم۔ قدیم اُردو الفاظ کے کچھ دستیاب نمونوں کے ذکر پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے مقالے میں ان تمام لغات کے برٹش میوزیم میں موجود نسخوں سے استفادہ کیا ہے۔

اس ضمن میں بعد میں ایک مفید بحث ڈاکٹر نذیر احمد (علی گڑھ) نے مجلّہ ''اُردو'' (کراچی) میں شروع کی اور ایک مقالہ ''قدیم فارسی فرہنگوں میں اُردو عناصر'' (قسط اول، جولائی ۱۹۶۷ء، قسط دوم ''ارمغان مالک جلد دوم'' دہلی ۱۹۷۱ء) لکھا۔ ڈاکٹر محمد باقر نے ان کے اس مقالے پر تنقید کرتے ہوئے اس موضوع پر تحقیق مزید سے روشنی ڈالی۔ ان کا مقالہ مجلّہ ''اُردو'' (اپریل ۱۹۶۸ء) میں شائع ہوا۔

لغات کے سلسلے کی ایک اہم تحقیقی کاوش سخاوت مرزا نے انجام دی۔ انھوں نے ایک مختصر مقالہ ''تحقیقات الفاظ ہندی غرائب اللغات'' (مشمولہ ''اُردو نامہ'' اپریل ۱۹۷۴ء) لکھا، جو اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں اُردو کے بعض قدیم لغات اور لغت نگاروں کا ذکر ملتا ہے۔ اُردو کے اس پہلے لغت ''غرائب اللغات'' مولفہ عبدالواسع ہانسوی کے الفاظ کی تحقیق پر خان آرزو نے وقیع کام کیا تھا۔ اس لغت کو ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے عالمانہ مبسوط مقدمے اور تصحیح کے ساتھ مرتب کیا ہے (کراچی ۱۹۵۱ء) لیکن اس درمیانی عرصے میں کسی اور محقق نے اس لغت یا اس کے مولف پر نظر نہیں ڈالی۔ سخاوت مرزا کے اس مقالے سے معلوم ہوتا ہے کہ دکن کے بعض ادیبوں نے ''غرائب اللغات'' پر توجہ دی ہے اور اس بات کی تحقیق کی ہے کہ اس لغت میں دراصل اُردو الفاظ کون سے ہیں اور ہندی و فارسی الفاظ کون سے ہیں۔ سخاوت مرزا کی نظر سے ایک تصنیف بعنوان ''تحقیقات الفاظ ہندی و اُردو غرائب اللغات'' کا ایک مخطوطہ گزرا تھا، جس کے مصنف کے نام کے بارے میں وہ شک میں تھے۔ اپنے اس مقالے میں انھوں نے اس مخطوطے کے چند منتخب الفاظ درج کیے ہیں تاکہ اس نسخے اور اس لغت کا فرق سامنے آسکے۔

اُردو کے ابتدائی ناموں کی تحقیق پر بھی محققین نے خاطر خواہ توجہ دی ہے۔ تاریخی حوالہ میں اس کے جو مختلف نام، ہندی، ہندوی، ہندوستانی، زبان ہندوستان، مورس، اُردو ہندی، اُردوے ہندی ملتے ہیں ان کا حوالہ متعدد مصنفین کی تحریروں میں ملتا ہے۔ اولاً اس موضوع پر حافظ محمود شیرانی نے داد تحقیق دی تھی (''اُردو زبان اور اس کے مختلف نام''، مشمولہ ''اورینٹل کالج میگزین ۱۹۲۹ء) بعد میں گراہم بیلی "A History of Urdu Literature" لندن، ۱۹۲۳ء صفحہ ۳۲) نے اس موضوع پر اظہار خیال کیا۔ پاکستان میں ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اپنی تصنیف ''اُردو زبان کا ارتقا'' (صفحات ۹۳-۹۲) میں اور پھر اسی موضوع پر ایک علیحدہ مقالہ لکھ کر اُردو کے مختلف ناموں کا تاریخی حوالوں سے جائزہ لیا (''اُردوے ہندی و ہندوستانی'' مشمولہ ''اُردو'' اکتوبر ۱۹۶۷ء) پروفیسر سید شبیر علی کاظمی کا مقالہ ''اُردو کے مختلف نام'' (مشمولہ ''اُردو'' اکتوبر ۱۹۶۶ء) بھی اسی طرح کی تحقیقی کاوش ہے۔ اسی موضوع پر ڈاکٹر محمد باقر نے ڈاکٹر نذیر احمد (علی گڑھ) کے ایک مقالے (مشمولہ ''اُردو'' اکتوبر ۱۹۶۷ء) کے حوالے سے اظہار خیال کیا (اُردو ہندوستانی، ہندی یا پہتہ ہندوئی مشمولہ ''اُردو'' جنوری ۱۹۶۸ء)۔

پھر یہ مسئلہ بھی محققین کے پیش نظر رہا کہ لفظ اُردو، بہ معنی زبان پہلے پہل کس نے استعمال کیا۔ اس دریافت کا آغاز ڈاکٹر محمد باقر کی کاوش ''اُردوے قدیم کے متعلق چند تصریحات'' (مشمولہ ''اورینٹل کالج میگزین'' فروری ۱۹۴۱ء) کو سمجھنا چاہیے۔ اس مقالے میں ڈاکٹر صاحب اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ مراد شاہ لاہوری نے لفظ اُردو کو زبان کے معنوں میں سب سے پہلے استعمال کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے علاوہ ضمنی طور پر محمود شیرانی (مقالہ اردو زبان اور اس کے مختلف نام'' اور غلام دستگیر نامی (''دیوان مراد شاہ'' مرتبہ، مشمولہ ''اُردو'' دہلی، جولائی ۱۹۴۶ء) بھی مراد شاہ لاہوری کے موید ہیں لیکن بعد میں ڈاکٹر اے حلیم نے اصرار کیا کہ یہ لفظ سب سے پہلے میر عطا حسین تحسین نے اپنی کتاب ''نو طرز مرصع'' میں استعمال کیا ہے۔

"Growth of Urdu Language and Literature, During Sayyed Lodhi period" مشمولہ "Journal of the Asiatic Society of Pakistan" ڈھاکہ، جلد ۳، ۱۹۵۸ء، ص ۴۳) لیکن تحسین نے اُردو کے بجائے ''زبان اُردوے معلا'' لکھا ہے۔ اس موضوع پر محمد اکرام چغتائی نے عمدہ تحقیق و دریافت سے کام لیا ہے۔ وہ اپنے تحقیقی مقالے ''اُردو بہ معنی زبان کے متعلق نئی تحقیق'' (مشمولہ ''اُردو نامہ'' دسمبر ۱۹۶۶ء) میں ایسے تمام نظریات سے انحراف کرتے ہیں۔ اس سلسلے کا ایک نیا نام مائل دہلوی کا پیش کرتے ہوئے ان کے خیال میں لفظ اُردو زبان کے معنوں میں سب سے پہلے میر محمدی مائل دہلوی (متوفی قبل ۱۲۲۱ھ)

نے استعمال کیا۔ مائل، قائم چاند پوری کے شاگرد تھے اور انھوں نے اپنا دیوان ۱۱۷۶ھ میں مرتب کیا تھا۔ اس دیوان میں ایک طویل قطعہ شامل ہے۔ جس میں چار مرتبہ لفظ ''اُردو'' زبان کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے ان چاروں مقامات کو مقالے میں نقل کیا ہے۔ اس اعتبار سے ان کی اس نئی تحقیق کے مطابق مائل دہلوی نے مراد شاہ لاہوری سے کم از کم ستائیس سال پہلے یہ لفظ استعمال کیا تھا۔

پاکستان میں قواعد اُردو زبان پر بھی معیاری کام ہوئے ہیں۔ ایسے کاموں میں کم از کم دو کوششوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو اُردو کی قدیم قواعدوں کی تدوین کے لحاظ سے اہم ہیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے بنجمن شلزے کی تحریر کردہ ''ہندوستانی گرامر'' کو ترجمہ و ترتیب اور تعلیقات کے ساتھ شائع کیا (لاہور، ۱۹۷۷ء) یہ قواعد اُردو کی اولین قواعد میں سے ایک ہے۔ یہ اصلاً لاطینی میں تھی، جس کے انگریزی ترجمے کو ڈاکٹر صاحب نے اُردو میں منتقل کیا ہے اور بہت ہی مفصل مقدمہ اُردو قواعد نویسی کی تاریخ پر تحریر کیا ہے اور آخر میں تعلیقات کے اضافے سے اس قواعد کو مفید بنایا ہے۔ اُردو میں اس قواعد کی ترتیب و اشاعت ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ دوسری کوشش خلیل الرحمن داؤدی نے کی ہے، جنھوں نے جان گل کرسٹ کی ''قواعد زبان اُردو'' کو تصحیح متن کے علاوہ اپنے مفید مقالے کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ تصحیح متن کے لیے رسالہ ''گل کرسٹ'' مطبوعہ کلکتہ ۱۸۲۰ء اور ۱۸۶۴ء کے نسخے استعمال کیے ہیں۔ لسانی تحقیق کے ضمن میں چند ایک متفرق کاموں کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً اُردو کے لسانی مسائل کے حوالے سے ''انگریزوں کی لسانی پالیسی'' مصنفہ سید مصطفیٰ علی بریلوی (کراچی، ۱۹۷۰ء) کا ذکر کیا جا سکتا ہے، جو ہندوستان میں اُردو زبان کی اہمیت، اس کے دائرہ اثر اور انگریزی عہد میں حکومت کی لسانی حکمت عملی کے تحقیقی مطالعے پر مشتمل ہے۔ اس مطالعے کا اگلا مرحلہ ''اُردو ہندی تنازع'' کا جائزہ ہو سکتا تھا۔ اسے ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے شرح و بسیط کے ساتھ تحریر کیا (اسلام آباد، ۱۹۷۷ء) انگریزی عہد میں ہندو مسلم سیاست کی روشنی میں اُردو ہندی تنازع کو اس کے کل پس منظر میں دیکھنے کی یہ ایک موثر کوشش ہے جو اپنے موضوع کا عمدگی سے احاطہ کرتی ہے۔ راقم کی کوشش ''تحریک آزادی میں اُردو کا حصہ'' (کراچی، ۱۹۷۶ء) اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ ''عورت اور اُردو زبان'' وحیدہ نسیم کی تصنیف ہے (کراچی، ۱۹۷۹ء) جس میں تفصیل سے اس موضوع کا احاطہ کیا گیا ہے۔ خصوصاً اس کے ابواب، عورت اور اُردو کی ابتداء، عورتوں کی زبان مغلیہ دور میں، اور عورتوں کی زبان مغلیہ دور کے بعد تحقیقی مزاج کے حامل ہیں۔

اُردو لغت کے ضمن میں مولوی عبدالحق کی مرتبہ ''لغت کبیر'' ایک تحقیقی و علمی منصوبہ تھا لیکن افسوس کہ مکمل نہ ہو سکا۔ اس کی محض دو جلدیں شائع ہوئیں اور حرف الف ختم نہیں ہوا۔ ''ترقی اُردو بورڈ'' (اب اُردو لغت بورڈ) کراچی کا اصل منصوبہ انگریزی آکسفورڈ لغت کے انداز پر ایک مبسوط لغت کی ترتیب و اشاعت ہے۔ اس بورڈ سے ممتاز ماہرین لسانیات کا تعلق رہا ہے۔ یہ کام قریب قریب مکمل ہو چکا ہے لیکن اشاعت کے مرحلے میں اب تک اس لغت کی چھ جلدیں شائع ہوئی ہیں۔ اُردو میں جامع لغت کی ضروریات کی تکمیل میں بورڈ کا یہ ایک اہم اور قابل قدر اقدام ہے۔ نسیم امروہوی نے ''نسیم اللغات'' کے علاوہ ''فرہنگ اقبال'' مرتب کی (لاہور، ۱۹۸۴ء) جو محض اقبالیات کے حوالے سے ہے لیکن بہت ضخیم ہے۔ وارث سرہندی نے بھی ایک ضخیم ''علمی اُردو لغت'' مرتب کی۔ سہیل بخاری نے جو اشتقاقیات کے مختلف مطالعے پیش کر چکے ہیں، ایک ''اشتقاقی لغت'' بھی مرتب کر دی ہے، جو فی الحال مجلّہ ''اُردو'' میں بالاقساط شائع ہوئی ہے۔

ادبی تحقیق

ادبی تحقیق میں بھی پاکستانی محققین نے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ متعدد نئے متون دریافت ہوئے، نظم و نثر کے قدیم متون کو مدون کیا گیا اور اہم انکشافات سامنے آئے۔ شعرا اور نثر نگاروں کے حالات پر بھی تحقیق ہوئی۔ ادبی تاریخیں اور تذکرے تصنیف ہوئے اور اصناف ادب پر بھی تحقیقی نظر ڈالی گئی۔ اب ذیل میں ایسی کاوشوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

(۱) نئے متون۔ دریافت اشاعت

پروفیسر محمود شیرانی نے مولانا عبدی کی ایک تصنیف ''فقہ ہندی'' کو پنجاب میں اُردو کی پہلی تصنیف قرار دیا تھا، جو ۱۰۷۴ھ میں لکھی گئی تھی لیکن ایک فاضل محقق گوہر نوشاہی نے ایک ایسی تصنیف کا تعارف کرایا (صحیفہ، اپریل ۱۹۶۶ء) جو ۱۰۶۴ھ یعنی مذکورہ تصنیف سے کم از کم دس سال قبل لکھی گئی تھی۔ یہ تصنیف حاجی سید محمد نوشہ گنج بخش قادری کی گنج الاسرار ہے، جن کا انتقال ۱۰۶۴ھ میں ہوا، ان کی تصنیف گنج شریف ڈاکٹر سید عبداللہ کے ارشاد کے مطابق ''پنجابی آمیختہ اُردو'' میں ہے۔ کتاب کے مخطوطے پر سال تصنیف درج نہیں لیکن چونکہ مصنف کا سال انتقال معلوم ہے اس لیے یہ اس سال یا اس سے پہلے کی تصنیف ہے اور اس اعتبار سے اس کے مصنف نے اپنا یہ کلیات اُردو و پنجابی قریب قریب اسی وقت ترتیب دیا تھا، جب قلی قطب شاہ (۹۷۲ھ-۱۰۲۰ھ) نے اپنا کلیات مرتب کیا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے

خیال کے مطابق ''گنج شریف'' میں قلی قطب شاہ کے مقابلے میں زیادہ پختہ اور زیادہ ترقی یافتہ زبان کے نمونے ہیں۔ سید شرافت نوشاہی نے اپنے خاندان کے ذخیرہ کتب میں سے اس کتاب کا ایک انتخاب، جو حصہ نظم اردو پر مشتمل ہے، ۱۹۷۵ء میں شائع کیا ہے۔ اس پر ڈاکٹر سید عبداللہ نے ایک مختصر تعارف اور پروفیسر محمد اقبال مجددی نے ایک مفصل مقدمہ تحریر کیا اور حاجی محمد نوشہ کے حالات و آثار اور گنج شریف، کا تحقیقی جائزہ لیا ہے۔ گوہر نوشاہی نے اپنے مقالے میں گنج الاسرار کا ایک مفصل جائزہ لینے کے بعد یہ دو نتائج اخذ کیے ہیں:

۱۔ یہ پنجاب میں تخلیق ہونے والی اُردو تصانیف میں سب سے قدیم ہے۔

۲۔ پنجاب کے علاوہ باقی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں تخلیق ہونے والے معاصر ادب میں زبان کے اعتبار سے سب سے زیادہ صحت مند ہے۔

قدیم اور دکنی ادب کی دریافت اور ترتیب و تدوین کے سلسلے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے نہایت اہم کام کیے ہیں۔ ''مثنوی کدم راؤ پدم راؤ'' کے علاوہ، جس کا ذکر آگے آئے گا ''دیوان حسن شوقی'' اور دیوان نصرتی'' ان کے توسط سے پہلی مرتبہ منظر عام پر آئے۔ ڈاکٹر صاحب سے قبل حسن شوقی کی صرف تین غزلیں سخاوت مرزا نے ایک قلمی بیاض میں تلاش کی تھیں (اُردو کی ایک قلمی بیاض، مشمولہ ''اُردو'' اپریل ۱۹۵۴ء) ڈاکٹر جالبی نے مختلف بیاضوں سے حسن شوقی کے معتدبہ کلام کو یک جا کر کے دیوان کی صورت میں شائع کیا ہے۔ (کراچی، ۱۹۷۱ء) اس میں ایک طویل مثنوی ''فتح نامہ نظام شاہ'' اور ''میزبانی نامہ سلطان محمد عادل شاہ'' کے علاوہ تیس غزلیں ہیں، جن میں سے چند کے علاوہ سب غیر مطبوعہ اور نایاب تھیں۔ اسی طرح اپنی ''تاریخ ادب اُردو'' کی تصنیف کے دوران قدیم مخطوطات کو کھنگالتے ہوئے انھیں نصرتی کا بھی ایسا کلام دستیاب ہوا، جو اب تک محققین کی نظروں سے پوشیدہ تھا، سوائے اس کے کہ افسر امروہوی نے انجمن ترقی اُردو کے کتب خانہ میں موجود ایک قلمی بیاض سے نصرتی کی ۲۸ رباعیاں تلاش کر کے شائع کر دی تھیں (''اُردو'' جنوری، ۱۹۶۶ء) چنانچہ اسے یک جا کر کے ڈاکٹر صاحب نے شائع کر دیا (اولاً صحیفہ' اکتوبر ۱۹۷۲ء میں پھر بہ صورت کتاب، لاہور، ۱۹۷۲ء) ڈاکٹر صاحب کے یہ دونوں کام اُردو کی گم شدہ کڑیوں کو ملانے میں اہم دریافت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان دونوں دواوین کے مبسوط مقدمے، ان دونوں شاعروں کے حالات اور ان کے عہد کے اچھے مطالعے ہیں۔

دکنی ادب کی دید و دریافت کے ضمن میں جو روایات مولوی عبدالحق نے قائم کی تھیں، اس کو آگے بڑھانے میں سخاوت مرزا اور افسر امروہوی نے بڑی دل جمعی سے کام کیا ہے۔ آگے ان دونوں حضرات کی مساعی کا ذکر کئی جگہ آئے گا، یہاں موضوع زیر نظر کے تعلق سے سخاوت مرزا کے دو مقالات کا ذکر ضروری ہے۔ ان میں سے ایک ''قدیم اُردو کی ایک نایاب بیاض'' (''اُردو'' اپریل ۱۹۵۴ء) کے تعارف پر مشتمل ہے، اس میں ۲۹ قدیم دکنی شعرا کا کلام نقل کیا گیا ہے اور دوسرا ''قدیم دکنی شعرا کے چند نایاب مرثیے'' (''اُردو'' جون ۱۹۶۹ء) کے عنوان سے لکھ کر معروف و غیر معروف شعرا کے غیر مطبوعہ مرثیے شائع کیے۔ انھیں یہ مرثیے، کتب خانہ سالار جنگ، حیدر آباد کی نایاب قلمی بیاضوں سے دستیاب ہوئے تھے۔

افسر امروہوی نے فضلی اورنگ آبادی (معاصر ولی) کی جو ایک مثنوی دریافت کی ہے، یہاں اس کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے۔ اب تک فضلی کی دو مثنویوں ''برہ بھبھوکا'' اور ''پریم لوکا'' اور ایک تصنیف ''زادِ راہ'' کا ذکر ملتا ہے لیکن یہ تصانیف دستیاب نہیں تھیں۔ افسر امروہوی نے انجمن کے کتب خانے کی ایک بیاض سے اس کی مثنوی ''برہ بھبھوکا'' تلاش کر کے شائع کر دی ہے (''صحیفہ'' اکتوبر ۱۹۷۲ء) تذکرہ نویسوں نے اس مثنوی کے پانچ سو اشعار کا قیاس کیا تھا لیکن بیاض میں صرف ۳۰۷ اشعار درج تھے، جنھیں ان مقالے میں نقل کر دیا گیا ہے۔ چونکہ اشعار قلیل ہونے کے باوجود قصے کے تسلسل میں کوئی فرق نہیں آیا، اس لیے افسر صاحب کا خیال ہے کہ یہ مثنوی انتخاب کر کے لکھی گئی ہے۔

دکن سے قطع نظر شمالی ہند کے ذخیرہ ادب میں جن متون کا اضافہ ہوا ہے، ان میں اولاً اسماعیل امروہوی کی دو مثنویاں 'وفات نامہ بی بی فاطمہ' اور ''معجزہ انار'' قابل ذکر ہیں۔ نائب حسین نقوی کو امروہہ کے ایک سفر کے دوران میں ایک قدیم ذخیرے سے ایک مخطوطہ دستیاب ہوا جس میں سات قدیم مثنویاں شامل تھیں۔ ان میں سے ان مذکورہ دو مثنویوں کو انھوں نے مفصل مقدمہ کے ساتھ مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔ (''اُردو کی دو قدیم مثنویاں'' لاہور، ۱۹۷۰ء) ان میں اول الذکر مثنوی کے ایک حصے کو مولوی عبدالحق نے ''شمالی ہند کی سب سے قدیم مثنوی'' کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ (''اُردو'' اپریل ۱۹۵۱ء) اگر نائب حسین نقوی کو مذکورہ مخطوطہ نہ مل جاتا تو یہ مثنوی نامکمل رہ جاتی۔ دوسری مثنوی ''معجزہ انار'' کو اولاً سید نجیب اشرف ندوی نے رسالہ ''اُردو'' جنوری ۱۹۵۴ء میں شائع کرایا تھا لیکن دونوں میں خاصا اختلاف نسخ موجود ہے۔ مرتب نے ان دونوں مثنویوں کو مخطوطے کی دستیاب نقول کی مدد سے تصحیح کر کے شائع کیا ہے۔ یہ دونوں مثنویاں تصحیح متن کے ذیل میں اگلے اوراق میں ذکر کے لائق تھیں چونکہ اول الذکر کے متن کا بڑا حصہ غیر مطبوعہ تھا، اس لیے اس کا ذکر یہاں مناسب معلوم ہوا۔

محمد اکرام چغتائی نے شمالی ہند کے تین شاعروں کے کلام کو پہلی مرتبہ دنیائے ادب سے متعارف کیا ہے۔ مائل دہلوی کے جس قطعے کے حوالے سے انھوں نے لکھا تھا کہ اس میں اُردو بہ معنی زبان سب سے پہلے استعمال کیا گیا ہے، اس اہم تاریخی قطعے کو انھوں نے جامعہ پنجاب کے کتب خانے کے ذخیرہ کیفی دہلوی کی ایک قلمی بیاض سے نقل کر کے مکمل شائع بھی کر دیا ہے۔ (مائل دہلوی کا ایک اہم تاریخی قطعہ" مشمولہ فنون" لاہور، دسمبر ۱۹۶۶ء) اس قطعے کی دریافت سے مذکورہ انکشاف کے علاوہ دیگر نئی باتیں یہ معلوم ہوتی ہیں کہ اس میں پہلی مرتبہ اُردو شاعری کی تاریخ بیان کی گئی ہے جو مختصر ہونے کے باوجود اہم ہے۔ اس قطعے میں بعض شعرا مثلاً ولی کا غیر مطبوعہ کلام بھی ملتا ہے اور اس سے بڑھ کر ایسے شعرا کا کلام بھی ملتا ہے جن کی شاعری کے نمونے کسی تذکرے میں درج نہیں مثلاً شاہ گلشن کی غزل۔ اس قطعے کو فاضل محقق نے مستند حوالوں کی مدد سے مرتب کر کے تحقیق کا ایک عمدہ نمونہ پیش کیا ہے۔

نگار دہلوی کا کلام بھی محمد اکرام چغتائی نے پہلی مرتبہ دنیائے ادب کے سامنے پیش کیا ہے، نگار، میر مہدی مجروح کے والد تھے۔ محمد اکرام چغتائی نے ایک قلمی بیاض سے، جو کتب خانہ پنجاب کے ذخیرہ کیفی میں موجود ہے، نگار کا انتخاب کلام دریافت کر کے شائع کر دیا ہے ("نگار دہلی، حالات و انتخاب کلام" لاہور ۱۹۶۸ء) اور اپنے مختصر مقدمے میں ان اغلاط کی نشاندہی کی ہے جو مختلف تذکرہ نگاروں، یہاں تک کہ مالک رام نے نگار کے حالات کے ضمن میں روا رکھی تھی، اسی کام کو گوہر نوشاہی نے بھی انجام دیا۔ ("صحیفہ" اکتوبر ۱۹۶۸ء) غالباً ان دونوں محققین کو ایک دوسرے کے کاموں کی خبر نہ رہی۔ دونوں نے قریب قریب ایک ہی وقت میں یہ کام کیا لیکن مقدمہ یا تعارف میں جو مباحث زیر بحث آئے ہیں، ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ اول محقق نے سابق مصنفین کی اغلاط کی نشاندہی کر کے مدلل نتائج نکالنے کی کوشش کی ہے۔

محمد اکرام چغتائی کا ایک اور قابل تحسین کام آدینہ بیگ کامل کے حالات اور کلام کا تعارف بھی ہے۔ اس شاعر کا تعلق حلقہ تلامذہ سودا سے تھا، لیکن اس کے حالات سے تقریباً تمام تذکرے اور سودا کے بارے میں لکھی جانے والی کتابیں خالی ہیں۔ فاضل مقالہ نگار کو اس کا کلام اور اس کے کچھ حالات زندگی کتب خانہ جامعہ پنجاب کی ایک قلمی بیاض سے دستیاب ہوئے جسے انھوں نے شائع کر دیا ("اُردو" اپریل ۱۹۶۹ء) حالات کے بارے میں جو کچھ بیاض نگار نے لکھا تھا، اس پر مزید تحقیق کر کے نئی معلومات جمع کی ہیں۔ کلام بھی پہلی مرتبہ یک جا شائع ہوا ہے۔

اسی طرح جوشش عظیم آبادی کے بھائی محمد عابد دل عظیم آبادی اپنے عہد کے اچھے شاعر شمار ہوتے تھے۔ مختلف تذکروں میں ان کے ذکر نے اچھی جگہ پائی ہے۔ لیکن ان کا مجموعہ کلام بھی دستیاب نہیں تھا۔ "تذکرہ گلزار ابراہیم" سے اتنا پتا چلتا تھا کہ انھوں نے ۱۱۹۳ھ میں اپنا انتخاب کلام تذکرے کے مصنف علی ابراہیم خان کو مرشد آباد بھیجا تھا تاکہ تذکرے میں شامل ہو سکے۔ حسن اتفاق کہ کراچی میں سید وصی احمد بلگرامی کو اس کا قلمی نسخہ دستیاب ہوا جو تقریباً دو سو سال پہلے کتابت ہوا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اسے محمد ظفیر الحسن کو دے دیا، جو "ارمغان دل" کے عنوان سے رسالہ "مہر نیمروز" (کراچی، اپریل ۱۹۷۱ء) میں تذکروں سے دل کے حالات مرتب کر چکے تھے۔ چونکہ دل کا وہ کلام، جو تذکروں میں ملتا ہے، اس میں شامل نہیں، اس لیے خیال ہے کہ یہ مکمل دیوان نہیں صرف انتخاب ہے اور یہی علی ابراہیم خان کو بھیجا گیا تھا۔ جناب ظفیر الحسن کی کوششوں سے "دیوان دل" (کراچی، ۱۹۷۴ء) پہلی مرتبہ منظر عام پر آیا۔

سعادت یار خان رنگین نے متعدد کتابیں تصنیف کی تھیں، جن میں سے ایجاد رنگین، چار باغ، رسالہ نادری وغیرہ پچھلی صدی میں شائع ہو چکی تھیں۔ اس صدی میں "مجالس رنگین" اور پھر کچھ عرصے قبل یہاں کراچی سے "اخبار رنگین" شائع ہوئیں۔ رنگین کی جو تصانیف غیر مطبوعہ ہیں، وہ غالباً سب انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہیں، جیسا کہ بلوم ہارٹ کی مرتبہ فہرست سے ظاہر ہوتا ہے لیکن تحسین سروری کے خیال کے مطابق ان تصانیف کی فہرست "شش جہات رنگین" کا کوئی ذکر نہیں۔ انھیں اس کا ایک نسخہ مکتوبہ ۱۲۳۳ھ کہیں سے دستیاب ہوا۔ جس کے آخری باب یعنی "مسدس رنگین" کو انھوں نے اپنے تعارف کے ساتھ شائع کر دیا (کراچی، ۱۹۵۲ء) تحسین سروری اچھے لکھنے والے تھے اور ان کے لکھے ہوئے کئی مقالات، جن میں سے چند کا ذکر آئے گا دقیع بھی ہیں لیکن یہاں موصوف نے بے احتیاطی کا ثبوت دیا ہے۔ رنگین پر ڈاکٹر صابر علی خان کا تحقیقی مقالہ شائع ہونے کے بعد پتا چلا کہ "شش جہات رنگین" کا ایک نامکمل نسخہ کتب خانہ جامعہ پنجاب میں موجود ہے اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ انڈیا آفس لائبریری میں بھی موجود ہے۔

اس عرصے میں چند شہر آشوب بھی پہلی مرتبہ شائع ہوئے۔ مولوی عبدالحق نے جعفر علی حسرت کے شہر آشوب "مخمس در احوال شاہجہاں آباد" کو شائع کیا ("اُردو" اکتوبر ۱۹۵۷ء) سید تقام حسین جعفری نے شیخ فدا علی عیش اور شاہ کمال الدین حسین کمال کے شہر آشوب قلمی بیاضوں سے اخذ کر کے شائع کیے ("تحقیقی نوادر" کراچی ۱۹۷۴ء) عیش کی مثنویاں "اشک مسلسل" اور "ابر آذر" بھی ان کے ذریعے پہلی مرتبہ شائع ہوئیں۔

بلوچستان کے ایک شاعر ملا محمد حسین براہوی (متوفی ۱۸۵۵ء) کا اُردو کلام ڈاکٹر انعام الحق کوثر کے اہتمام سے پہلی مرتبہ منظر عام پر آیا، شاعر نے اُردو

کلیات ۱۸۴۷ء میں مکمل کرلی تھی۔ طرز کلام میں ولی کا انداز جھلکتا ہے اور کلام میں سودا کے کلام پر تضمین ملتی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اساتذہ کا کلام شاعر کے پیش نظر رہا ہے۔ دیگر معاصر علاقائی شاعروں کے کلام کے مقابلے میں یہ کلام زیادہ پختہ اور زبان کے لحاظ سے بہتر ہے۔ اس کی اشاعت سے ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں گزشتہ صدی کے وسط میں اُردو شاعری کی کیفیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

(۲) ترتیب متون

(ا) نظم

یہ کہنا شاید بے جا نہ ہوگا کہ جو متون اب تک پاکستان میں شائع ہوئے ہیں ان میں فخر الدین نظامی کی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ اُردو کی پہلی تصنیف ہے اور اس کا جو نسخہ کتب خانہ کراچی میں موجود ہے وہ دنیا کا واحد اور کم از کم چار سو سال قبل لکھا ہوا ہے۔ دست برد زمانہ سے مثنوی کے آخری اوراق ضائع ہوگئے ہیں۔ سب سے پہلے اس کا تعارف سید نصیر الدین ہاشمی نے (''معارف'' اعظم گڑھ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں) کرایا تھا۔ مثنوی جس املا میں لکھی گئی ہے، اس وجہ سے اس کا پڑھنا دشوار تھا، چنانچہ انجمن ترقی اُردو کی طرف سے اس مخطوطے کے چند صفحات کا عکس علی گڑھ، حیدر آباد اور لندن کے مخطوطات شناسوں کو بھیجا گیا تھا لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی نے اسے انتہائی دیدہ ریزی و محنت سے پڑھنے میں کامیابی حاصل کرلی اور اپنے جامع و بسیط مقدمے کے ساتھ اس کے متن کو مخطوطے کے عکس کے ساتھ شائع کردیا۔ (کراچی، ۱۹۷۴ء)۔

چونکہ اس مثنوی میں دکن کے بہمنی فرماں روا احمد شاہ ولی بہمنی (۸۲۵ھ تا ۸۳۶ھ) کی مدح میں اشعار ملتے ہیں، اس لیے یہ اس کے عہد کی تصنیف ہے۔ نظامی نے مثنوی میں اپنا نام ''فخر دین'' لکھا ہے۔ لیکن مولوی عبدالحق نے مخطوطے پر فخر الدین اور ''اُردو'' پر اپنے مقالے مشمولہ ''اُردو دائرہ معارف اسلامیہ'' جامعہ پنجاب لاہور میں فخر الدین لکھا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے مقدمے میں، جو کمال محنت سے لکھا گیا ہے۔ اس بناء پر کہ خود نظامی نے مثنوی میں اپنا نام ''فخر دین'' تحریر کیا ہے، فخر الدین کے بجائے فخر دین درست تسلیم کیا ہے۔ مشفق خواجہ نے ڈاکٹر صاحب کے اس خیال سے اس دلیل کے ساتھ انحراف کیا ہے کہ نظامی اپنا نام مثنوی کی خاص بحر کی وجہ سے فخر الدین نظم نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے مجبوراً فخر دین نظم کیا ہے۔ چنانچہ جب تک کسی اور ذریعے سے فخر دین ثابت نہ ہوجائے، فخر الدین ہی کو صحیح سمجھنا چاہیے (''جائزہ مخطوطات'' صفحہ ۹۶۷) ان امور سے قطع نظر اس مثنوی کی تدوین و اشاعت تاریخ ادب کا ایک اہم واقعہ ہے۔

قدیم دکنی ادب کے جو دیگر متون تدوین و اشاعت کے مرحلے سے گزر کر قدیم ادب کے سرمائے میں اضافے کا باعث ہوئے، ان میں مولوی عبدالحق کی مرتبہ نصرتی کی مثنوی ''گلشن عشق'' (کراچی ۱۹۵۲ء) اور سخاوت مرزا کی مرتبہ قاضی محمود بحری کی مثنوی ''من لگن'' (کراچی، ۱۹۵۵ء) پہلی مرتبہ شائع ہوئی ہیں۔ شیخ چاند ابن حسین نے ''پھولبن'' (کراچی، ۱۹۵۵ء) جس کا ذکر آگے آئے گا، مرتب کرتے ہوئے اپنے مقدمے میں یہ نوید سنائی تھی کہ وہ ''تتمۂ پھولبن'' بھی مرتب کررہے ہیں لیکن ان کا یہ کام ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ (مشمولہ ''اُردو'' قسط اول: اپریل ۱۹۶۸ء، قسط دوم جولائی ۱۹۶۸ء) ''تتمۂ پھولبن'' محمد حیدر ابن جعفر کی تصنیف کردہ مثنوی ہے۔ سید نصیر الدین ہاشمی نے اپنی تصنیف ''یورپ میں دکنی مخطوطات'' میں اضافہ پھولبن کے تحت ابن جعفر کی اس تصنیف کی پوری صراحت کی ہے۔ چنانچہ مرتب نے ان کا اعادہ نہیں کیا۔ اسی فاضل مرتب نے رستمی بیجاپوری کی ضخیم مثنوی خاور نامہ کو بھی مرتب کرکے شائع کردیا ہے۔ (کراچی، ۱۹۶۸ء)

عہد قدیم کی ایک مثنوی منشی اجے چند سکندر آبادی نے ۹۶۰ھ میں ''خالق باری'' کے طرز پر تصنیف کی تھی۔ اسے افسر امروہوی نے ''مثل خالق باری'' کے نام سے مرتب کیا ہے (مشمولہ ''اُردو'' قسط اول، جولائی ۱۹۸۳ء اور قسط دوم: اکتوبر ۱۹۸۳ء) مولوی عبدالحق اور سخاوت مرزا کی تحقیق کے مطابق یہ مثنوی اُردو کی پہلی نصابی کتاب ہے مقالہ ''خوان یغما دکھنی'' (مشمولہ اُردو جنوری ۱۹۵۳ء) ''خالق باری'' اور ''مثل خالق باری'' کے طرز پر ایک قدیم منظوم نصاب ''واحد باری'' بھی معروف ہے۔ اس کا سال تصنیف ۱۰۲۸ھ ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ ڈاکٹر رانا احسان الٰہی کی ملکیت ہے، جسے انھوں نے اس کے دستیاب دیگر سات قلمی اور دو مطبوعہ نسخوں کی مدد سے مرتب کیا ہے۔ بنیاد انھوں نے اپنے نسخے کو بنایا ہے جو ۱۲۰۴ھ کا مکتوبہ ہے۔ سخاوت مرزا نے شاہ عبدالقادر کرنولی کے ''ارشاد نامہ'' کا متن مرتب کیا (''اُردو ادب'' علی گڑھ، شمارہ ۴، ۱۹۶۱ء) جو انجمن ترقی اُردو علی گڑھ میں موجود اس کا غالباً واحد نسخہ ہے۔

قدیم دکنی ادب کے دیگر اہم متون میں ''دیوان تراب'' بھی ایک قیمتی اضافہ ہے۔ شاہ تراب دکن میں چشتیہ سلسلے کی ایک اہم کڑی سمجھے جاتے ہیں۔ ان کا دیوان، جس کا واحد نسخہ کتب خانہ انجمن کراچی میں موجود ہے، ڈاکٹر سلطانہ بخش نے اپنے جامع مقدمے کے ساتھ مرتب کیا ہے (کراچی، ۱۹۸۲ء) ڈاکٹر سیدہ جعفر

نے شاہ تراب کی تصنیف ''من سمجھاون'' کے مقدمے میں ان کی ایک اور تصنیف ''گیان سروپ'' کے ایک مخطوطے مکتوبہ ۱۱۲۱ھ کی بنیاد پر شاہ تراب کا سال ولادت ۱۱۰۴ھ/۱۱۰۵ھ قرار دیا تھا لیکن ڈاکٹر سلطانہ بخش نے دیوان کی داخلی شہادتوں کی بنیاد پر ۱۱۲۰ھ متعین کیا ہے، جس سے شاہ تراب کی تاریخ پیدائش پر قطعیت کے ساتھ رائے دی جا سکتی ہے۔

شاہ تراب کے قریبی عہد کے معاصرین میں سے شاہ قاسم اورنگ آبادی کا دیوان اہم کہا جا سکتا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ دکن میں ایہام گوئی کے خلاف تحریک کے جو نمونے ملتے ہیں، وہ سراج اورنگ آبادی کے علاوہ شاہ قاسم کے ہاں نظر آتے ہیں۔ مرزا مظہر، تاباں، یقین شاہ حاتم کے معاصرین، دکن میں اُردو شاعری کی روایت کو استحکام دینے والوں میں ان کا نام اہمیت رکھتا ہے۔ ان کا دیوان سخاوت مرزا نے متعدد نسخوں کو پیش نظر رکھ کر مرتب کیا ہے اور مقدمے میں حالات زندگی اور شاعری کا احاطہ کیا ہے (کراچی، ۱۹۷۵ء) اس کی اشاعت سے ایک بات یہ سامنے آئی ہے کہ قاسم نے شاید شمالی ہند کے زیر اثر، کہ ان کے کلام میں یقین، تاباں اور مظہر کی طرح میں غزلیں ملتی ہیں، اپنے دیگر دکنی معاصرین کے مقابلے میں جن میں سراج جیسا شاعر بھی موجود ہے، اپنی زبان کو زیادہ صاف کیا ہے۔ افسر امروہوی نے انھی کے ایک ہم عصر کی ایک مثنوی کو، جس میں ''سنگھاسن بتیسی'' کو منظوم کیا گیا ہے، مرتب کر کے شائع کیا ہے (کراچی ۱۹۸۲ء) اس کے مصنف کا تخلص فقیر ہے اور اس کا تعلق دکن سے ہے۔

انجمن ترقی اُردو کراچی کے کتب خانے میں مخطوطات کے ساتھ ساتھ تقریباً ۶۴ بیاضیں موجود ہیں۔ ان بیاضوں میں قدیم ادب کا ایسا سرمایہ موجود ہے جو مخطوطات کے ذخیرے میں موجود نہیں، ایسی بیاضوں کی مدد سے بعض نہایت اہم انکشافات ہوئے ہیں اور نادر و قیمتی سرمایہ ادب دریافت ہوا ہے۔ کتب خانہ جامعہ پنجاب کے ذخائر کی بیاضوں سے محمد اکرام چغتائی نے ایسے متعدد اہم انکشافات کیے ہیں، جن کا حوالہ ان صفحات میں کئی جگہ آیا ہے۔ انجمن کے کتب خانے کی ایک بیاض مراثی اور نوحوں پر مشتمل ہے۔ افسر امروہوی نے اس بیاض کو قیمتی سمجھتے ہوئے مرتب کر دیا ہے اور ہر شاعر کے کلام کے ساتھ اس کے حالات زندگی تحریر کر دیے ہیں۔ اس طرح اسے ایک عمدہ تالیف اور ایک مفید ماخذ کی حیثیت دے دی ہے۔ (کراچی، ۱۹۷۵ء)

سراج کے شاگردوں میں سے خواجہ عنایت اللہ فتوت کے حالات اب تک تاریکی میں رہے ہیں۔ ان کا کلام بھی دستیاب نہیں۔ صرف غزلیات کے منتشر اشعار ملتے ہیں، جن میں سے بیشتر وہ ہیں جو تذکرہ ''گل عجائب'' میں بطور نمونہ کلام شامل ہیں۔ غزل سے قطع نظر ان میں سے ایک تذکرہ ''ریاض حسنی یا تذکرہ فتوت'' اور ایک مثنوی ''در معنوی'' یادگار ہیں۔ مثنوی کا ایک نسخہ کتب خانہ انجمن ترقی اُردو کراچی میں موجود ہے۔ یہ اس کا واحد قلمی نسخہ بیان کیا جاتا ہے۔ پروفیسر شفقت رضوی نے اس نسخے کو تعارف کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔ (''اُردو نامہ'' اپریل ۷۷ء) اس طرح ان نسخوں کی اشاعت سے دکن میں مرزا مظہر کے معاصر دکنی زبان کے نمونے سامنے آئے ہیں۔

ترتیب متون کے جائزے کے ساتھ ساتھ شاید یہ بے جا نہ ہوگا کہ معروف و ممتاز شعرا کے اس غیر مطبوعہ کلام کا حوالہ بھی دیا جائے۔ جسے محققین نے دریافت کیا ہے۔ دکنی ادب کے تعلق سے بالخصوص ولی کی مثال سامنے رکھی جا سکتی ہے جس کا معتدبہ کلام دریافت ہوا ہے۔ قیام پاکستان سے قبل اس ضمن میں سید نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر مختار الدین احمد، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان اور ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے بہت سا غیر مطبوعہ کلام دریافت کیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد اس سلسلے کو ڈاکٹر عالی جعفری (''نوائے ادب'' بمبئی جولائی ۱۹۵۲ء) اور قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی (''اُردو'' جولائی ۱۹۵۵ء) نے آگے بڑھایا۔ اس موقع پر قاضی صاحب کے پیش نظر بالخصوص ''دیوان ولی'' کا وہ قدیم ترین قلمی نسخہ تھا، جو کتب خانہ انجمن ترقی اُردو کراچی میں موجود ہے، اس کا سال کتابت ۱۱۳۵ھ ہے۔ قاضی صاحب نے اس مخطوطے کا مقابلہ ''کلیات ولی'' مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، طبع سوم، کراچی ۱۹۵۴ء سے کر کے چھ مکمل غزلوں اور متعدد ایسے اشعار کی نشاندہی کی ہے جو کلیات میں موجود نہیں۔ کلیات کے ضمیمہ اول میں ۱۴۱ ایسی غزلیں درج کی گئی ہیں، جو دیوان ولی کے کسی کسی نسخے میں ملتی ہیں۔ تمام نسخوں میں نہیں ملتیں۔ قاضی صاحب نے اس نسخے میں ۱۵ غزلوں کی نشاندہی کی ہے۔

محمد اکرام چغتائی نے بھی اس ضمن میں دلچسپی لیتے ہوئے کتب خانہ جامعہ پنجاب (لاہور) اور پنجاب پبلک لائبریری (لاہور) میں موجود ''دیوان ولی'' کے سات قلمی نسخوں اور اول الذکر کتب خانے کی قلمی بیاضوں سے ولی کا ایسا کلام دریافت کیا ہے جو غیر مطبوعہ تھا (اُردو جنوری ۱۹۶۷ء) اس سلسلے میں راقم نے بھی اپنے مملوکہ دیوان ولی کے ایک قلمی نسخے سے ولی کا غیر مطبوعہ کلام متعارف کرایا (''اُردو'' اپریل ۱۹۷۶ء) اس نسخے کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں ولی کا فارسی زبان میں ایک قطعہ ملتا ہے، جو پان کی تعریف میں ہے، ولی کا فارسی کلام کسی اور نسخے میں دستیاب نہیں ہے۔

شمالی ہند کے متون کے جائزے سے قبل یہاں ان چند متون کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو دکن اور شمالی ہند کے علاوہ دوسرے مقامات بالخصوص پنجاب سے تعلق

رکھتے ہیں۔ ان میں سے قدیم ترین متن مثنوی ''نوسرہار'' ہے۔ جو شاہ شرف الدین اشرف بیابانی کی تصنیف ہے اسے افسر امروہوی نے اپنے مقدمے کے ساتھ مرتب کیا ہے (کراچی، ۱۹۸۲ء) یہ مثنوی ۹۰۹ھ کی تصنیف ہے۔ اب تک اس کے صرف تین نسخوں کی بابت علم ہے۔ ایک کتب خانہ انجمن ترقی اُردو کراچی میں ہے، جسے افسر امروہوی نے مرتب کیا، دوسرا انجمن ترقی اُردو ہند کے کتب خانے میں اور تیسرا ''ادارہ ادبیات اُردو'' حیدرآباد دکن میں موجود ہے۔ یہ مثنوی پانچ سو سال قبل کی اُردو کا نمونہ پیش کرتی ہے۔

پنجاب میں اُردو کے تعلق سے محمود شیرانی نے اپنی موقر تصنیف میں مولانا عبدی کی مثنوی ''فقہ ہندی'' کو پنجاب میں اُردو کی اولین تصنیف قرار دیا تھا، اس مثنوی کا ایک قلمی نسخہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کے کتب خانے میں موجود ہے، جو ۱۲۹۶ھ کا مکتوبہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے مقدمے کے ساتھ اس کا مکمل متن شائع کردیا ہے (''اُردو'' اکتوبر ۱۹۵۹ء) ڈاکٹر صاحب نے مثنوی کی داخلی شہادت کی بنیاد پر یہ رائے دی ہے کہ ''فقہ ہندی'' کا مصنف ''عبدی'' نہیں، عبداللہ امین ہے۔

سید غلام قادر شاہ کی تصانیف کا ذکر پروفیسر شیرانی نے ''پنجاب میں اُردو'' میں کیا ہے، ان میں سے ایک ''رمزالعشق'' ہے، جو میر اثر کی مثنوی ''خواب و خیال'' سے قبل لکھی گئی ہے۔ اس کی اہمیت، اس کے علاوہ کہ یہ پنجاب کی قدیم تصانیف میں سے ایک ہے، یہ بھی ہے کہ اس کا عروضی وزن خالص ہندی ہے اور اس میں پنجابی لہجے کی تمام خصوصیات ملتی ہیں۔ یہ مثنوی مطبوعہ ہے لیکن یہاں اس کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ اسے متعدد قلمی نسخوں کی مدد سے اسی مصنف کی ایک اور مختصر مثنوی ''چرخی نامہ'' کے ساتھ گوہر نوشاہی نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ (لاہور، ۱۹۷۲ء)۔ ''چرخی نامہ'' اب تک غیر مطبوعہ تھی اور ایک قلمی بیاض مخزونہ ذخیرہ شیرانی کتب خانہ جامعہ پنجاب کے علاوہ کسی اور جگہ موجود نہیں ہے۔ اس سے کچھ ہی عرصے بعد لکھی جانے والی مثنوی ''عاقبت بخیر'' مصنفہ سید ساجد علی فنائی کو افسر امروہوی نے مرتب کیا ہے (کراچی، ۱۹۸۱ء) یہ مثنوی تاریخی لحاظ سے اہم ہے۔

شمالی ہند کے تعلق سے جو متون مرتب ہوئے ہیں، ان میں اولاً شاہ حاتم کا ''دیوان زادہ'' قابل ذکر ہے ''دیوان زادہ'' ۱۱۶۹ھ میں مکمل ہوا۔ اس کے اہم نسخے ''انڈیا آفس لائبریری'' اور کتب خانہ انجمن ترقی اُردو کراچی میں موجود ہیں لیکن کتب خانہ جامعہ پنجاب کے نسخے پر جو ۱۱۹۵ھ کا مکتوبہ ہے، حواشی میں ۱۱۹۷ھ تک کا کلام درج ہے اور یہی حاتم کا سال وفات ہے اس اعتبار سے یہ مکمل ترین نسخہ ہے۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے آخرالذکر نسخے پر مبنی اس کا ایک منتخب متن اپنے مقدمے کے ساتھ ''شاہ حاتم، حالات وکلام'' کے نام سے مرتب کیا تھا (لاہور، ۱۹۶۴ء) لیکن پھر اس کے متعدد دستیاب نسخوں کو پیش نظر رکھ کر تصحیح متن کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے ایک متن مرتب کیا اور ایک مفصل مقدمہ لکھ کر حاتم کے حالات اور دیوان زادہ کے دستیاب نسخوں کی کیفیت اور اس کی لسانی خصوصیت سے بحث کی۔ اسی دیوان زادہ میں شامل ایک بہاریہ مثنوی ''بزم عشرت'' کو انھوں نے علیحدہ ایک تعارف کے ساتھ مرتب کر کے ''صحیفہ'' (لاہور، جولائی ۱۹۷۳ء) میں بھی ''دیوان زادہ'' کی اشاعت (لاہور، ۱۹۷۵ء) سے قبل شائع کیا۔

شاہان مغلیہ میں سے شاہ عالم ثانی اور اس کے فرزندوں نے اُردو زبان کی بڑی خدمت کی ہے۔ اس کے فرزند جہاں دار شاہ کو اُردو شاعری سے بڑی محبت اور لگاؤ تھا۔ اُردو میں اس کا ایک دیوان موجود ہے اور کم از کم دو نسخے معلوم ہیں۔ ایک انڈیا آفس لائبریری میں، دوسرا کتب خانہ جامعہ پنجاب میں۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے موخرالذکر کو بنیاد بنا کر یہ دیوان مرتب کردیا ہے اور ایک مفصل مقدمہ لکھ کر جہاں دار شاہ کے حالات، ہندوستان کی سیاسی زندگی میں اس کا حصہ اور اس کی ادبی زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ آخر میں ضمیموں کا اضافہ ڈاکٹر صاحب کے تحقیقی مزاج کا آئینہ دار ہے۔ جہاں دار شاہ کی ولادت کے سال کے تعین میں مولانا عرشی نے ۱۷۴۹ء کو سال ولادت قرار دیا تھا۔ لیکن فاضل محقق نے مقدمے میں دلائل سے قیاس کیا ہے کہ اس کی پیدائش ۱۷۶۱ء کے آس پاس شمار ہونی چاہیے۔ اسی طرح اس کے سال وفات کے سلسلے میں بھی اختلاف ملتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے جینا بیگم تغلق سلطان کا ایک خط بنام لارڈ کارنوالس بطور ضمیمہ درج کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تغلق سلطان جہاں دار شاہ کے بستر مرگ پر موجود تھی۔ اس سے صحیح تاریخ یکم جون ۱۷۸۸ء کا تعین ہوتا ہے۔ فاضل مرتب نے ان اشعار سے اختلاف نسخ درج کیے ہیں، جو مختلف تذکروں میں ملتے ہیں۔

اسی عہد کی ایک رزمیہ مثنوی ''جنگ نامہ آصف الدولہ و نواب رام پور'' کو خلیفہ محمد معظم عباسی نے ۱۷۹۷ء میں نظم کیا تھا۔ ۱۷۹۴ء میں نواب آصف الدولہ والی اودھ نے روسائے رام پور کے ایک خاندانی تنازع کی بنا پر ریاست رام پور پر انگریزی لشکر کی مدد سے فوج کشی کردی تھی۔ معظم عباسی شاگرد قدرت اللہ شوق نے یہ مثنوی اسی واقعے پر نظم کی تھی۔ اس مثنوی کا صرف ایک نسخہ رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے۔ باقی نجی کتب خانوں کی ملکیت ہیں۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے مذکورہ نسخے کے علاوہ نجی کتب خانوں کے تین نسخوں کی مدد سے متن تیار کیا (کراچی، ۱۹۸۰ء) اور مقدمے میں اس مثنوی کے تاریخی پس منظر اور اس کے خصائص قلم بند کیے۔ اس واقعے پر کئی اہم عصر شعرا نے بھی توجہ دی تھی۔ میر تقی میر نے بھی جو اس وقت نواب آصف الدولہ کے دربار سے منسلک تھے۔ اس سلسلے میں ایک مختصر

مثنوی لکھی ہے اور دوسرے مقامی شعرا مثلاً عبدو، رستم، امیر اللہ تسلیم نے بھی نظمیں لکھیں۔ ڈاکٹر قادری نے بطورِ ضمیمہ عبدو اور تسلیم کی مثنویاں بھی اس کے ساتھ شامل کی ہیں۔

عبید اللہ خان مبتلا کے بارے میں اُردو شاعری کے مآخذ خاموش رہے ہیں۔ یہ بھی وثوق سے نہیں معلوم کہ وہ کون تھا اور اس کی حیثیت کیا تھی۔ برٹش میوزیم کے کتب خانے میں ''دیوان مبتلا'' کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے جو ۹ مئی ۱۷۵۷ء کو مکمل ہوا۔ ترقیمے میں کاتب نے جو عبارت لکھی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ احمد شاہ ابدالی کے حملے اور اس کے قیام دہلی کے دوران میں ۱۹ شعبان کو لکھا گیا ہے۔ بلوم ہارٹ نے قیاس کیا ہے کہ یہ نسخہ ۱۷۵۷ء اور ۱۷۶۱ء درمیان لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اس نسخے کو مرتب کیا (''اورینٹل کالج میگزین'' اگست ۱۹۶۷ء)۔ مبتلا کی شاعری پر دلی کا اثر جھلکتا ہے۔ مبتلا کے اسی دیوان کو بھارت میں ڈاکٹر نعیم احمد نے بھی مرتب کیا ہے (مشمولہ ''تحریر'' شمارہ ۱، دہلی ۱۹۷۱ء)۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے جو تقریباً پانچ سال اپنی تدریسی مصروفیات کے سلسلے میں لندن میں مقیم رہے، اپنے لندن کے دورانِ قیام میں اُردو کے کئی کم یاب اور نایاب متون دریافت کیے اور انھیں مرتب کر کے شائع کیا۔ اس سلسلے میں ''دیوان حیدری'' بھی ان کا ایک وقیع کام ہے۔ برطانیہ میں انھیں اس کے دو نسخے ملے، ایک برٹش میوزیم میں اور دوسرا باڈلین لائبریری آکسفورڈ میں۔ فاضل مرتب نے ان نسخوں کی مدد سے اور جہاں جہاں انھیں حیدری کا اُردو کلام دستیاب ہوا، اسے یک جا کر کے ''دیوان حیدری'' کے نام سے شائع کر دیا (لاہور، ۱۹۶۷ء)۔ اس میں جو قطعات و قصائد شامل ہیں ان سے خود حیدری کی شخصیت اور زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ مقدمے میں حیدری کی زندگی اور اس کے ادبی کاموں کا مفصل جائزہ تحریر کیا گیا ہے۔ اس مطبوعہ دیوان پر ایک تبصرہ سید معین الدین شاہ نے تحریر کیا (اُردو نامہ، جنوری ۱۹۷۲ء) ہے۔ اس تبصرے کے مطابق فاضل مرتب نے حیدری کے کلام کے ایک بڑے حصے کو اپنے مرتبہ نسخے میں شامل نہیں کیا۔ جو برٹش میوزیم کے مخطوطے میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ اس کی ترتیب میں نسخہ باڈلین سے بھی شاید مدد نہیں لی گئی۔ فاضل مبصر نے حیدری کے اس کلام کی نشاندہی کی ہے جو نسخہ باڈلین میں موجود ہے لیکن مطبوعہ دیوان میں شامل نہیں کیا گیا۔ پھر اس مقالے میں ان اغلاط کی نشاندہی بھی کی گئی ہے جو فاضل مرتب سے نقل کرنے میں سرزد ہوئی ہیں۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی کو برٹش میوزیم کے کتب خانے میں آغا حجو شرف، شاگرد آتش کی منظوم تصنیف ''شکوہ فرنگ'' (سال تصنیف ۱۸۶۸ء) کا بھی ایک نادر و واحد نسخہ ملا ہے، جسے انھوں نے تعارف کے ساتھ مرتب کر کے شائع کر دیا (لاہور، ۱۹۷۳ء)۔

یہاں اب تک ان متون کا ذکر کیا گیا ہے جو پہلی مرتبہ شائع ہوئے ہیں۔ اسی سلسلے میں ضمنی طور پر اس غیر مطبوعہ کلام کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے جو دریافت ہوا لیکن ابھی تک متعلقہ شاعر کے دیوان یا کلیات میں شامل نہیں ہوا۔ اس ضمن میں اولاً انعام اللہ خان یقین کے اس غیر مطبوعہ کلام کا ذکر کیا جا سکتا ہے، جسے محمد اکرام چغتائی نے کتب خانہ جامعہ پنجاب کی قلمی بیاضوں سے نقل کر کے شائع کیا ہے (اُردو، جولائی ۱۹۶۸ء) میر حسن کا غیر مطبوعہ کلام ڈاکٹر عبادت بریلوی نے دو مختلف صورتوں میں شائع کیا۔ انھیں میر حسن کے کلیات کا ایک نادر نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانے میں دیکھنے کا موقع ملا، جس میں انھیں کچھ غیر مطبوعہ کلام دستیاب ہوا۔ اس کلام میں انتخاب کے ساتھ انھوں نے ایک تعارف لکھ کر اس قلمی نسخے کی اہمیت بھی بتائی اور پھر میر حسن کے دیوان کی اشاعت کا بھی ذکر کیا لیکن ڈاکٹر صاحب کی نظر سے ''غزلیات میر حسن'' کا وہ مجموعہ نہیں گزرا، جو میر حسن کی غیر مطبوعہ غزلیات پر مشتمل مرزا علی حسن نے مرتب کر کے لکھنؤ سے ۱۹۴۴ء میں شائع کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے میر حسن کی جو ۳۱ غیر مطبوعہ غزلیں مرتب کیں ہیں ان میں سے ۱۵ غزلیں مرزا علی حسن کے مجموعے میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ''کلیات میر حسن'' کے مذکورہ قلمی نسخے سے میر حسن کی غیر مطبوعہ مثنویوں کو بھی نقل کر کے شائع کیا ہے۔ ان مثنویوں میں سے راقم کو ''خانہ میر حسن'' (''افکار'' کراچی، جولائی ۱۹۶۴ء) اور ''خوانِ نعمت'' (''ماہ نو'' کراچی، اکتوبر ۱۹۶۴ء) کا علم ہے۔

نظیر اکبر آبادی کی ایک غیر مطبوعہ مسلسل نظم ''ایک رقاصہ کا عروج و زوال'' مولوی عبدالحق کو کہیں سے دستیاب ہوئی جسے انھوں نے شائع کر دیا (''اُردو'' جنوری ۱۹۵۸ء) نواب الٰہی بخش خان معروف، غالب کے خسر اور دہلی کے باذوق شاعر تھے۔ ان کے دو دیوان تھے جن میں سے ایک ۱۹۳۵ء میں نظامی پریس، بدایوں سے شائع ہوا تھا۔ دوسرا دیوان ناپید ہے۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری کے نادر کتب خانے میں ان کے کلام کا ایک ناقص مجموعہ تھا، جس میں معروف کی ۳۳ غزلیں ایسی تھیں جو مطبوعہ دیوان میں شامل نہیں ہیں۔ ڈاکٹر قادری نے ایک جامع تعارف کے ساتھ ان کی غیر مطبوعہ غزلوں کو شائع کرا دیا، (''نقوش'' شمارہ ۱۲۶) امیر مینائی کے غیر مطبوعہ کلام کو کریم الدین احمد نے شائع کیا۔ انھوں نے امیر مینائی کے حالاتِ زندگی اور ان کے ادبی کارناموں کے ذکر پر مبنی مبسوط تحقیقی کام کیا ہے، جو ''امیر مینائی اور ان کے تلامذہ'' کے نام سے چھپ چکا ہے (لاہور، ۱۹۸۲ء) دورانِ تحقیق انھیں بہت سا غیر مطبوعہ کلام دستیاب ہوا، جس میں سے متفرق

نظموں (''اُردو'' جنوری ۱۹۵۸ء) اور ''ایک عاشقانہ مثنوی'' (''اُردو'' جولائی ۱۹۶۲ء) کو انھوں نے مرتب کر کے شائع کر دیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اپنی ابتدائی عمر میں شعر گوئی سے شغف رکھتے تھے۔ ابوسلطان شاہجہان پوری نے، جو مولانا آزاد کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی نوعیت کے کام کر چکے ہیں، ان کی شاعری کے آغاز اور اس کے ارتقا پر روشنی بھی ڈالی ہے اس ضمن میں انھوں نے مولانا آزاد کے ایسے کلام کو یکجا کیا ہے، جو کہیں شائع نہیں ہوا (''اُردو'' اکتوبر ۱۹۶۶ء) ان کا تیار کردہ یہ متن مولانا آزاد کے ذوقِ ادب کا مطالعہ کرنے میں معاون ہے۔

ثاقب لکھنوی جدید غزل کے پیش رووں میں اور چند زبان زد عام اشعار کی وجہ سے معروف ہیں۔ ان کا دیوان ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا جو انیسویں صدی کے آخری برسوں سے دیوان کے زمانہ کتابت تک کے کلام پر مشتمل تھا۔ ثاقب کا انتقال ۱۹۴۶ء میں ہوا۔ دیوان کی طباعت سے انتقال تک کے عرصے میں انھوں نے بہت کچھ کہا تھا جس کا بیشتر حصہ غیر مطبوعہ رہا۔ انھوں نے اپنے سارے مطبوعہ و غیر مطبوعہ کلام کو متعدد بیاضوں میں درج کیا، جن کی تعداد پندرہ بیس بتائی جاتی ہے۔ مشفق خواجہ کو ان میں سے چھ بیاضوں کا علم ہوا اور ان میں سے پانچ انھیں کراچی میں ثاقب کی ایک پوتی کے ہاں دستیاب ہوئیں۔ چنانچہ انھوں نے تمام غیر مطبوعہ کلام کو شائع کر دیا۔ ثاقب نے کلام پر جو اصلاح و ترمیم کی تھیں۔ ان اصلاحوں اور ترمیموں کی مطبوعہ دیوان سے مقابلہ کر کے نشاندہی بھی کر دی۔ اس طرح جدید غزل کے ابتدائی عہد کے ایک شاعر کا بہت سا اہم کلام سامنے آ گیا (پانچوں بیاضوں کے کلام کو پانچ قسطوں میں علی الترتیب دیکھا جا سکتا ہے۔ قسط اول: ''مجلۂ تحقیق'' لاہور، شمارہ ۳ جلد ۲ قسط دوم: ایضاً، شمارہ ۴ جلد ۲ قسط سوم: ایضاً، شمارہ ۳، جلد ۳، قسط چہارم: ایضاً، شمارہ ۱، جلد ۴ قسط پنجم: ''اورینٹل کالج میگزین'' شمارہ ۲۲۷-۲۲۶) ثاقب کی جو بیاضیں موجود ہیں ان کے حوالے سے اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ ثاقب نے اپنا دیوان انھی بیاضوں سے انتخاب کر کے تیار کیا تھا اور پھر اس کی اشاعت کے بعد بھی وہ اپنے کلام پر اصلاحی و ترمیمی نظر ڈالتے رہے۔

(ب) نثر

قدیم اُردو نثر کے متون کی دریافت و تدوین نظم کے مقابلے میں بہت کم ہے اور یہ امر عین متوقع بھی ہے کہ نثر کے مقابلے میں نظم کے نمونے بہ کثرت دستیاب ہوتے ہیں۔ دکنی ادب کے جو قدیم نمونے ملتے ہیں ان میں بھی نثر کے نمونے نسبتاً کم ہیں۔ اسی لیے پاکستان میں دکنی نثر کے نمونے دریافت و تدوین کے مرحلے سے نہیں گزرے۔ صرف ایک بہت مختصر تصنیف ''رسالہ محمود خوش دہان بیجاپوری'' خواجہ حمید الدین شاہد کو ایک نجی کتب خانے سے دستیاب ہوئی ہے، جسے انھوں نے ایک تعارف کے ساتھ شائع کر دیا۔ اس رسالے کے مصنف شاہ برہان الدین جانم کے مرید تھے۔ ان کی دیگر تصانیف ''ادارہ ادبیات اُردو'' حیدر آباد دکن اور کتب خانہ انجمن ترقی اُردو کراچی میں موجود ہیں۔ یہ رسالہ قدیم ترین اُردو نثر کا ایک نمونہ ہے اور اس کی تصنیف کا عہد برہان الدین جانم کی کتاب ''کلمۃ الحقائق'' کی تصنیف کے قریب کا ہے۔

دکنی نثر کے قدیم نثری نمونوں میں سے محمد باقر آگاہ کے ''دیباچہ گلزار عشق'' کو ڈاکٹر جمیل جالبی نے مرتب کیا ہے (صحیفہ جنوری ۱۹۷۳ء) ''گلزار عشق'' آگاہ کی مثنوی ہے جس کا دیباچہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس سے نہ صرف آگاہ کے عہد بلکہ چند ادبی لسانی مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔ ڈاکٹر جالبی نے ایک جامع تعارف کے ساتھ اس دیباچے کو مرتب کیا ہے۔ اس دیباچے سے ایک اہم بات یہ سامنے آتی ہے کہ ''قصہ رضوان شاہ و روح افزا'' دراصل مثنوی ''گلزار عشق'' ہی ہے۔ عبدالقادر سروری کو یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ یہ دونوں علیحدہ علیحدہ قصے ہیں۔ اس دیباچے سے ایک اور اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ آگاہ کے زمانے میں دکنی اُردو کا رواج ادبی سطح پر کم و بیش ختم ہو گیا تھا اور اس کی جگہ اُردوئے معلّا نے لے لی تھی۔ ایک اور انکشاف اس دیباچے سے یہ بھی ہوا کہ طپش کے دیباچے سے بھی پہلے، جس کا ذکر گزشتہ اوراق میں آیا، آگاہ نے برج بھاشا کو اُردو کی اصل بتایا ہے۔ ولی کے تعلق سے ہمارے ہاں یہ بحث بہت ہوئی ہے کہ وہ دکنی تھا یا گجراتی۔ اس دیباچے میں آگاہ نے دکن میں رہ کر تقریباً دو سو سال قبل ولی کو گجراتی کہا ہے اور اسے غزل و ریختہ کی ایجاد میں سبھوں کا مبتدا اور استاد کہا ہے۔ ولی کو گجراتی کہنے والوں کے لیے یہ دیباچہ ایک ٹھوس دلیل کی حیثیت سے ماخذ کا کام دے گا۔ ڈاکٹر جالبی نے اپنے تعارف میں اس دیباچے کے ان پہلوؤں کا سیر حاصل جائزہ لیا ہے۔

شمالی ہند کے نثری ادب میں سے فورٹ ولیم کالج سے وابستہ مصنفین کی کتابوں کے متون کی ترتیب و اشاعت کا جو کام پاکستان میں ہوا ہے، وہ بجا طور پر قابل تعریف ہے۔ ان تصانیف کے متون کی تدوین کا جائزہ آئندہ صفحات میں لیا جائے گا، یہاں متون کی تدوین کا ذکر مقصود ہے جو پہلی مرتبہ شائع ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اس ضمن میں بھی قابل قدر کام کیے ہیں۔ انھوں نے یورپ کے کتب خانوں میں موجود ایسے قلمی نسخے دریافت کیے جو یا تو نامعلوم تھے یا بے توجہی کا شکار تھے اور غیر مطبوعہ رہے۔ اس سلسلے میں حیدر ی کی تصنیف ''گلزار دانش'' کا بھی ایک نادر و واحد نسخہ انھیں کوپن ہیگن کے شاہی کتب خانے سے دستیاب ہوا، جسے

مورخین نے گم شدہ سمجھ لیا تھا۔ اس کے حصہ اول کو ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ایک مفصل مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے (اولاً اس کا تعارف "اورینٹل کالج میگزین" شمارہ ۱۸۹۔۱۸۸ میں اور پھر اس کا متن: ایضاً شمارہ ۱۹۵۔۱۹۴ میں) اس پر حیدری کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصنیف شیخ عنایت اللہ کی فارسی کتاب "بہار دانش" کا اُردو ترجمہ ہے، جس کو اس نے ولیم ہنٹر کی فرمائش پر ۱۸۰۲ء میں مرتب کیا۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے حیدری کی جو کتابیں مرتب کی ہیں، ان کے مقدموں میں حیدری کے حالات زندگی اور اس کی تصنیف و تالیف تحریر کی ہیں لیکن "گلزار دانش" کے مقدمے میں زیادہ جامعیت کے ساتھ حالات و آثار کا تحقیقی جائزہ لیا۔ اسی طرح مظہر علی خان ولا کی تصنیف "ہفت گلشن" جو ناصر علی واسطی کی فارسی تصنیف کا اُردو ترجمہ ہے اور "مادھونل کام کندلا" جو موتی رام کیشیر کی برج بھاشا میں لکھی ہوئی کہانی کا اُردو ترجمہ ہے، نایاب تھیں اور کبھی شائع نہیں ہوئیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے انھیں اپنے مفید مقدموں کے ساتھ شائع کیا ہے۔ (دونوں کراچی سے ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئیں) اول الذکر پند و نصاح اور اخلاقی موضوعات پر مشتمل ہے اور دوسری داستان عشق ہے۔

بینی نرائن جہاں کی تصنیف "چار گلشن" کا بھی واحد نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانے میں موجود ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اس نسخے کو اپنے مفصل مقدمے کے ساتھ مرتب کر کے شائع کر دیا ہے (کراچی، ۱۹۶۷ء) خلیل علی خان اشک کی تصنیف "گلزار چین" بھی مورخین کی نظروں سے اوجھل رہی۔ ان دونوں کے نسخے ڈاکٹر صاحب کو رائل ایشیا ٹک سوسائٹی لندن کے کتب خانے سے دستیاب ہوئے، جنھیں انھوں نے شائع کر دیا اور ان پر مفید مقدمات تحریر کیے (کراچی، علی الترتیب ۱۹۵۶ء، ۱۹۶۶ء) نواب کریم خان کا سیاحت نامہ بھی پہلی مرتبہ ڈاکٹر صاحب کی کوششوں سے منظر عام پر آیا (لاہور ۱۹۸۲ء) یہ تصنیف جو ذاتی یادداشتوں کا مجموعہ ہے اور لندن کے سفر کے حالات پر مشتمل ہے، کبھی شائع نہیں ہوئی تھی۔ صرف اس کے چند صفحات کا ترجمہ فارسی میں گارساں دتاسی نے سو سال پہلے کیا تھا۔ اس کا قلمی نسخہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان متون کو مرتب کر کے تاریخ ادب کے ایک خلاء کو پر کیا ہے اور پھر ان تمام متون پر مصنفین کے جو حالات و آثار تحریر کیے ہیں، وہ اب تک موجود کئی غلط فہمیوں کی تردید بھی کرتے ہیں۔

سعادت یار خان رنگین کی تصانیف میں سے صرف "مجالس رنگین" اور "فرس نامہ رنگین" شائع ہوئی تھیں، جب کہ اس کی اکثر تصانیف ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ "اخبار رنگین" اس کی ایک ایسی مختصر تصنیف ہے، جس سے اس کی ذاتی حالات کے ساتھ ساتھ اس دور کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کی عکاسی ہوتی ہے۔ اس تصنیف کا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے، اسے ڈاکٹر معین الحق نے اپنے مقالے میں اور تعلقات کے ساتھ مرتب کر کے شائع کر دیا ہے (کراچی، ۱۹۶۲ء)۔

واجد علی شاہ اختر نے اپنے ایام اسیری میں اپنی ایک بیگم ممتاز جہاں زینت محل کو خطوط لکھے تھے، ان کا ایک مجموعہ "تاریخ ممتاز" برٹش میوزیم کے کتب خانے میں موجود ہے جو ۱۲۷۶ھ کا مکتوبہ ہے۔ ڈاکٹر محمد باقر نے اس مخطوطے کو اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کر دیا (لاہور، ۱۹۵۲ء) یہ خطوط واجد علی شاہ کی زندگی کے آخری دور کی جھلک دکھاتے ہیں۔

یہ تو تھی مکمل متون کی تدوین و اشاعت کی سرگزشت، گزشتہ ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں جو مشاہیر ہماری تاریخ ادب کا ناگزیر حصہ ہیں ان کی غیر مطبوعہ اور نایاب تحریروں کی دریافت و اشاعت کا ایک سلسلہ جاری ہے، یہاں تک کہ غالب، سرسید، حالی و شبلی اور اقبال جیسے مصنفین کی تحریریں بھی جو خود ان کی زندگی میں تقریباً سب چھپ چکی تھیں، ابھی تک (غیر مطبوعہ) بھی دستیاب ہو رہی ہیں۔ ایسی غیر مطبوعہ اور غیر مدون تحریروں کا ذکر یہاں بہ خوف طوالت حذف کیا جاتا ہے۔ حذف کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ایسے مشاہیر ادب کی تحریروں کے مجموعوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے جن میں غیر مطبوعہ و غیر مدون تحریروں کو شامل کیا جا رہا ہے یا ان کی تدوین کے کام متوقع ہیں۔ اس ضمن میں پاکستان کے مؤقر رسائل "اُردو"، نقوش، "صحیفہ"، "فنون"، "اُردو نامہ"، "اورینٹل کالج میگزین"، "مجلہ تحقیق"، "ماہ نو" خاص طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

(ج) تذکرے

پاکستان میں تذکروں کے تعلق سے تین صورتوں میں کام ہوا ہے۔ ایک تو قدیم غیر مطبوعہ تذکرے شائع ہوئے، دوسرے قدیم تذکروں کو تصحیح متن اور ترمیم و تخفیف کے ساتھ شائع کیا گیا اور تیسرے نئے تذکرے لکھے گئے، ذیل میں تینوں صورتوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

موجودہ عہد میں جو تذکرے مرتب ہوئے ہیں، ان میں عمدہ تحقیق کے لحاظ سے جو امتیاز حیدر بخش حیدری کے تذکرے "گلشن ہند" مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین

احمد (دہلی، ۱۹۶۷ء) کو دیا جاسکتا ہے، وہ کسی اور کو نہیں، فاضل مرتب نے تراجم شعرا کے ذیل میں جو حواشی تحریر کیے ہیں، انھوں نے اس تذکرے کی افادیت کو کہیں زیادہ بڑھا دیا ہے۔ اس تذکرے کی ترتیب کو ایک تحقیقی کارنامے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہی تذکرہ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے بھی مرتب کیا ہے۔ (کراچی ۱۹۶۸ء) لیکن وہ اس کی مذکورہ اشاعت سے بے خبر رہے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے اس کا جو متن تیار کیا ہے، وہ برٹش میوزیم اور باڈلین لائبریری کے نسخوں کو سامنے رکھ کر کیا ہے۔ جب کہ ڈاکٹر مختار الدین نے اس کے مزید نسخوں سے استفادہ کیا ہے۔

بنارس کے اُردو شعرا کے احوال پر مشتمل ایک تذکرہ "مداح الشعرا" نواب عنایت حسین خاں مہجور بنارسی نے تصنیف کیا تھا جو اب تک غیر مطبوعہ تھا۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ انجمن ترقی اُردو کراچی میں ہے، جسے افسر امروہوی نے اپنے مقدمے اور تعلیقات کے ساتھ مرتب کیا ہے (کراچی، ۱۹۷۶ء)۔

ان تذکروں کے مقابلے میں اہمیت اور افادیت کے اعتبار سے سعادت خان ناصر کا تذکرہ "خوش معرکۂ زیبا" یہاں بطور خاص ذکر کا مستحق ہے۔ یہ تذکرہ ۱۲۶۹ھ میں مکمل ہوا تھا لیکن غیر مطبوعہ رہا۔ اپنی ترتیب کے لحاظ سے یہ تذکرہ دوسرے تمام تذکروں سے مختلف ہے۔ یہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں ایسے شعرا کا ذکر ہے، جن کے اساتذہ اور شاگردوں کے نام معلوم ہیں اور دوسرے حصے میں وہ شاعر ہیں جن کے اساتذہ اور شاگردوں کے نام معلوم نہیں، تیسرے حصے میں شاعرات کا ذکر ہے۔ اس تذکرے کے چار قلمی نسخے: بانکی پور، لکھنؤ یونیورسٹی، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ اور کتب خانہ انجمن ترقی اُردو کراچی میں موجود ہیں۔ اس تذکرے کو کمال عرق ریزی اور محنت شاقہ سے مشفق خواجہ نے مرتب کیا ہے۔ تذکرہ بہت ضخیم ہے لیکن فاضل مرتب نے چاروں قلمی نسخوں کی مدد سے اختلاف نسخ کی نشاندہی کی ہے۔ مقدمہ بہت مبسوط لکھا ہے، جس میں اُردو تذکرہ نگاری، مصنف کے حالات اور اس کی تذکرہ نگاری اور اس تذکرے کی خصوصیات اور کوتاہیوں سے سیر حاصل بحث کی ہے۔ اپنی ترتیب و تدوین کے لحاظ سے یہ تذکرہ اس ضمن میں چند مثالی کاوشوں میں شمار کیا جاسکتا ہے یہ دو جلدوں میں شائع ہوا ہے (لاہور، ۱۹۷۰ء) مقدمے میں فاضل مرتب نے تیسری جلد "تحقیق نامہ" کی نوید دی تھی کہ اس میں تعلیقات ہوں گی، افسوس کہ یہ جلد تا حال شائع نہیں ہوئی۔ اس تذکرے کو بھارت میں ڈاکٹر شمیم انہونوی نے بھی مرتب کیا ہے (لکھنؤ، ۱۹۷۱ء) لیکن ان دونوں نسخوں کی ترتیب میں وہی فرق ہے جو ڈاکٹر مختار الدین احمد اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کے مرتبہ حیدری کے "گلشن ہند" کی ترتیب میں نظر آتا ہے۔

ایک اہم تذکرہ نصیر الدین نقش کا "تذکرہ عروس الاذکار" ہے، جو ۱۲۸۹ھ میں لکھا گیا تھا۔ یہ اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں مصنف کے معاصر شعرا کے حالات درج ہیں اور بیشتر کا تعلق حیدرآباد دکن سے ہے۔ اس لحاظ سے یہ گذشتہ صدی کے دکنی شعرا کے حوالے کے لیے اہم ہے۔ اس تذکرے کے اب تک تین نسخوں کا علم ہوا ہے۔ دو کتب خانہ انجمن ترقی اُردو کراچی میں موجود ہیں اور ایک "ادارہ ادبیات اُردو" حیدرآباد دکن میں ہے۔ افسر امروہوی نے کتب خانہ انجمن کے دونوں نسخوں کو پیش نظر رکھ کر اس تذکرے کا متن تیار کیا ہے اور ایک مفید مقدمے کے ساتھ اسے شائع کیا ہے (کراچی، ۱۹۷۵ء) اولاً سخاوت مرزا نے اس تذکرے کا ایک تعارف لکھ کر اس کی اہمیت اجاگر کی تھی ("اُردو" جنوری ۱۹۵۸ء)۔

تذکرہ نگاری کی اہمیت کے پیش نظر تذکروں کی تصنیف کا سلسلہ بھی ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ اب بھی گاہے گاہے مختلف نوعیت کے تذکرے لکھے جاتے ہیں کچھ اہم تذکرے پاکستان میں لکھے گئے ہیں۔ ان میں بالخصوص "تذکرہ مسلم شعرائے بہار" کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ حکیم سید احمد علی ندوی نے اسے چھ جلدوں میں تحریر کیا ہے (کراچی، ۱۹۶۹ء۔۱۹۶۶ء) اپنے موضوع کے تعلق سے یہ ایک مآخذ کی حیثیت کا حامل ہے۔ ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے ہے اور جلد اول کے مقدمے میں تذکرہ نگار نے ان مآخذ کا حوالہ دیا ہے جو اس تذکرے کی تصنیف میں عمل میں آئے اور جو اس موضوع پر مستقل اہمیت رکھتے ہیں۔

اسی انداز کا ایک تذکرہ بہار سخن ہے، جودھ پور کے قدیم و جدید شعرائے اُردو کے احوال پر مشتمل ہے۔ اسے محمد شرف الدین یکتا جودھ پوری نے تحریر کیا ہے (حیدرآباد، ۱۹۶۳ء) محمد واصل عثمانی کا تحریر کردہ تذکرہ "سخنوران قصبہ کڑا" (کراچی، ۱۹۷۸ء) بھی قدیم و جدید شعرا کے ذکر پر مشتمل ہے۔ "سخنوران کاکوری" مصنفہ حکیم نثار احمد علوی بھی ایک ضخیم تذکرہ ہے جو کاکوری شاعروں کے تعلق سے خاصا مفید ہے (کراچی، ۱۹۷۹ء) برہان پور کے شعرا کے بارے میں اب تک جو کچھ لکھا گیا وہ فقط افتخار احمد خلیل برہان پوری کا مقالہ "تذکرہ شعرائے برہان پور" ("اُردو" اورنگ آباد، اکتوبر ۱۹۲۱ء) پر منحصر ہے یا چند شاعروں کا ذکر "تاریخ برہان پور" مصنف خلیل الرحمن میں ملتا ہے۔ افسر امروہوی نے دیگر مآخذ کی مدد سے شعرائے برہان پور کا ایک تذکرہ لکھا جو افسوس کہ کتابی صورت میں شائع نہیں ہوا۔ بلکہ مجلہ اُردو میں بالاقساط شائع ہوتا رہا (اپریل ۱۹۷۸ء تا جنوری ۱۹۸۰ء)۔

(۳) تصحیح متون

(۱) نظم

ابن نشاطی کی ''پھولبن'' پروفیسر عبدالقادر سروری نے ۱۹۳۷ء میں ''مجلس اشاعت دکھنی مخطوطات'' کے اہتمام سے شائع کی تھی۔ اس وقت تک مصنف کے حالات تاریکی میں تھے۔ حتی کہ اس کے نام سے بھی واقفیت نہیں تھی۔ اس مثنوی کی دوسری اشاعت میں شیخ چاند ابن حسین نے انڈیا آفس کے نسخے کو بنیاد بنا کر اور انجمن ترقی اُردو کے کتب خانے کے پھولبن'' کے نسخوں سے مقابلہ کر کے اپنا نسخہ ترتیب دیا (کراچی، ۱۹۵۵ء)۔ یہاں یہ اشارہ بھی مناسب ہوگا کہ بھارت میں دیوی سنگھ چوہان نے اس کا ایک نسخہ ہندی میں مرتب کیا ہے جو پونا سے ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔ اس نسخے میں اشعار کی تعداد ۱۷۴۴ ہے، جب کہ پروفیسر سروری کے نسخے میں عنوان کے ۱۴۷ اور مثنوی کے ۱۹۷۷ اشعار ہیں اور شیخ چاند ابن حسین کے نسخے میں عنوان کے ۱۴۹ اور مثنوی کے ۱۹۱۹ اشعار ہیں۔ ابن نشاطی نے اشعار کی تعداد ۱۷۴۴ بتائی ہے۔ چوہان نے اپنے مرتبہ نسخے میں یہی تعداد دی ہے اور توجیہہ کی ہے کہ مدح صحابہ اور بعض دوسرے مقامات کے اشعار الحاقی ہیں اور مناجات اور سراپا کے کچھ اشعار بعد کا اضافہ ہیں۔ اس کا ایک نیا ایڈیشن پروفیسر اکبرالدین صدیقی نے ان تمام نسخوں کو سامنے رکھ کر بھارت سے شائع کیا ہے۔ (دہلی، ۱۹۷۸ء)۔

یہاں یہ بیان کرنا بھی مناسب ہوگا کہ ڈاکٹر سید عبد اللہ نے تیرھویں صدی کی ایک مثنوی ''نل دمن'' مصنف احمد سرادی بہت پہلے مرتب کی تھی (''اورینٹل کالج میگزین'' نومبر ۱۹۴۱ء) اب اسے کتابی صورت میں شائع کیا ہے (کراچی، ۱۹۷۸ء) پاکستان میں انجمن کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے اُردو کے نایاب و غیر مطبوعہ متون کو کثیر تعداد میں شائع کیا ہے۔ انجمن کے علاوہ مجلس ترقی ادب (لاہور) نے یہ اعزاز حاصل کیا ہے کہ اس نے بھی ایک بڑی تعداد میں متون کو تصحیح و تدوین کے ساتھ شائع کیا ہے۔ بلکہ اپنے وسائل کی وجہ سے اس نے جس اہتمام اور سلیقے سے متون شائع کیے ہیں، اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اس ضمن میں اس نے جو کتابیں شائع کی ہیں، وہ بڑی تعداد میں اہل ذوق کے علم میں ہیں۔ یہاں ذیل میں صرف چند متون کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس کے شائع کردہ چند متون کا ذکر گزشتہ اوراق میں آ چکا ہے لیکن وہ متون پہلی مرتبہ شائع ہوئے تھے۔ مجلس نے ان متون کی تصحیح و اشاعت زیادہ تعداد میں کی ہے جو پہلے شائع ہو چکے تھے لیکن کم یاب تھے اور ان کی دوبارہ اشاعت مفید تھی۔ ڈاکٹر اقتداء حسن نے ''کلیات قائم چاندپوری'' (۱۹۶۵ء) کو قائم کی زندگی اور ان کے عہد و آثار پر مبنی اپنے مبسوط مقدمے کے ساتھ دو جلدوں میں مرتب کیا ہے۔ بنیادی نسخہ انڈیا آفس کے مخطوطے کو بنایا ہے لیکن مختلف مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخوں سے مقابلہ کر کے اختلاف نسخ کی نشاندہی کی ہے اور بڑی عرق ریزی سے تصحیح متن کی ہے۔ مقدمہ بھی نہایت جامع اور محققانہ ہے۔ اس میں غلط بیانیوں کی اصلاح کی ہے جو قائم سے منسوب رہی ہیں۔ قائم کے معاصرین میں سے میر حسن کی مثنویوں کو ڈاکٹر وحید قریشی نے مرتب کیا (''مثنویات میر حسن'' جلد اول ۱۹۶۶ء) ڈاکٹر صاحب میر حسن کے حالات و آثار پر مبسوط تحقیقی کام کر چکے ہیں۔ جس کا ذکر آئندہ اوراق میں آئے گا۔ میر حسن اپنی مثنوی ''سحرالبیان'' کی وجہ سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں لیکن اس کے علاوہ انھوں نے گیارہ مثنویاں لکھیں تھیں، ان مثنویوں کے دنیا بھر میں جو اہم نسخے دستیاب ہیں، ان کی مدد سے ڈاکٹر صاحب نے ان مثنویوں کا متن تیار کیا ہے۔ مقدمے میں انھوں نے تصحیح کے مآخذ کی تفصیلات درج کی ہیں۔

کلب علی خان فائق اور خلیل الرحمٰن داؤدی نے مجلس کے متون کی تصحیح و ترتیب میں بڑی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان دونوں محققین نے جن متون کو مرتب کیا ہے، ان کی تصحیح کے لیے تمام دستیاب مطبوعہ و غیر مطبوعہ مآخذ استعمال کیے ہیں۔ مقدمات میں اس کے مصنف کے حالات و آثار اور تصنیف کی اشاعتی تفصیلات کا سیر حاصل تذکرہ کیا ہے۔ ان حضرات کے تحریر کیے ہوئے تقریباً سب ہی مقدمات تحقیق کے اچھے معیار کو پیش کرتے ہیں۔ خلیل الرحمٰن داؤدی نے مرزا جان طپش کی مثنوی ''بہار دانش'' (۱۹۶۳ء) ''کلیات انشا'' (۱۹۶۹ء) ''اُردو کی قدیم منظوم داستانیں'' (۱۹۶۷ء) بشمول قصہ لعل و گوہر، قصہ لیلیٰ مجنوں، قصہ نازنین و خان والاشان جعفر خان، قصہ قاضی اور چور کا، قصہ چوہے اور بلی کا، قصہ لڑائی پیر الالم کا، قصہ جمجمہ بادشاہ، قصہ زیتون و محمد حنیف، قصہ تنبولی کی عورت کا، قصہ تمیم انصاری کا، وفات نامہ حضرت خاتون، قصہ کالی اور گوری کا مرتب کیں۔

کلب علی خان فائق نے ''کلیات میر'' (۱۹۷۶ء) ''کلیات مومن'' (۱۹۶۴ء) ''کلیات شیفتہ'' (۱۹۶۵ء)، ''کلیات سالک (۱۹۶۶ء) ''کلیات نظام'' (۱۹۶۵ء) کلیات نسیم'' (۱۹۶۵ء)، ''کلیات قلق'' (۱۹۶۶ء) مرتب کیں۔ ان کے علاوہ ''کلیات سودا'' کو ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے (۱۹۷۶ء)، ''کلیات آتش'' کو مرتضیٰ حسین فاضل نے (۱۹۷۱ء)، ''کلیات جرات'' کو ڈاکٹر اقتداء حسن نے (۱۹۷۲ء) ''دیوان میر مہدی مجروح'' کو ریاض احمد چوہدری نے (۱۹۷۶ء) ''کلیات نظم حالی'' کو ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے (۱۹۶۸ء) اور ''مہتاب داغ'' کو سید سبط حسن نے (۱۹۶۲ء میں) مرتب کیا۔ ان کے علاوہ متفرق اصناف نظم میں سے تحقیقی نقطہ نظر سے محمود بیگ راحت مثنوی ''ہشت عدل اور واسوخت'' کو گوہر نوشاہی نے (۱۹۷۱ء) اور ''منتخب مراثی انیس'' کو مرتضیٰ حسین فاضل

نے (۱۹۷۲ء میں) مرتب کیا۔

ان دونوں اداروں سے قطع نظر تصحیح متن کا جو انفرادی اور نجی کام ہوا ہے، اس میں بالخصوص ''جذبات نادر'' (نادر کاکوری) کا ذکر کیا جا سکتا ہے، جسے تصحیح اور حواشی کے ساتھ ممتاز حسن نے مرتب کیا (کراچی، ۱۹۶۱ء) اس کے علاوہ ایسے کام کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے جو قدیم اور کلاسیکی شعرا کے دواوین کی دوبارہ اشاعت کے ذیل میں آتا ہے۔ اس ضمن میں سید علی عباس نے ''تاریخ واقعات اظفری'' مصنفہ اظفر گورگانی سے اس کے اُردو کلام کو اخذ کر کے ''اظفری گورگانی اور ان کا ریختہ کلام'' کے نام سے شائع کیا ہے (اولاً ''اورینٹل کالج میگزین'' فروری ۱۹۶۳ء اور بعد بہ صورت کتاب) اور ایک مفصل مقدمہ لکھ کر اظفری کے حالات زندگی اور اس کی تصنیف ''واقعات اظفری'' پر تبصرہ کیا ہے۔ اظفری کے ایک اُردو دیوان کا ذکر ''واقعات اظفری'' میں موجود ہے جسے ۱۹۳۷ء میں مدراس یونیورسٹی نے چھاپا ہے۔ محوی صدیقی نے رسالہ ''اُردو'' (دہلی، اپریل ۱۹۴۰ء) میں اظفری پر ایک مضمون میں اس کے حالات تحریر کیے تھے لیکن یہ سب چیزیں کم یاب ہیں۔ اسی طرح شاد لکھنوی ''پیر زمیر'' متوفی (۱۸۹۹ء) کے دیوان بھی شائع ہوئے تھے لیکن کم یاب تھے۔ شیخ حامد حسن نے ان کے دواوین کا انتخاب اپنے مفصل مقدمے کے ساتھ ترتیب دیا ہے (لاہور، ۱۹۷۰ء) دوست علی خلیل کا دیوان ''گلزار خلیل'' بھی دستیاب نہیں تھا، فرحانہ حسن نے ان کے حالات زندگی کے ساتھ اسے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے (حیدر آباد، سن ندارد)۔

مرزا ہادی رسوا کی ایک مثنوی ''نو بہار'' ۱۹۱۴ء میں شائع ہوئی تھی لیکن کمیاب تھی۔ عشرت رحمانی کے کتب خانے میں اس کا ایک قلمی نسخہ ہے، چنانچہ انھوں نے ان دونوں کا مقابلہ کر کے صحت متن کے ساتھ اسے شائع کر دیا ہے (''اُردو نامہ'' جولائی ۱۹۶۱ء) اسی طرح عشرت رحمانی نے رسوا کی ایک اور مثنوی ''امید وبیم'' کو جو ۱۸۹۶ء میں لکھی گئی تھی اور چھپ کر کمیاب ہو گئی تھی، اپنی ملکیت کے ایک ذاتی قلمی نسخے سے اور کتب خانہ رام پور میں موجود ایک اور قلمی نسخے کی مدد سے بہ ترتیب جدید شائع کر دیا ہے (''اُردو نامہ'' جولائی ۱۹۶۲ء)۔ غلام بھیک نیرنگ کا مجموعہ کلام دو مرتبہ ۱۹۰۷ء اور ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا تھا لیکن عرصے سے ناپید تھا۔ راقم نے اسے دیگر غیر مدون کلام کے ساتھ ایک مبسوط مقدمہ لکھ کر مرتب کیا ہے (کراچی ۱۹۸۳ء)۔ خوشی محمد ناظر کا مجموعہ کلام ''نغمہ فردوس'' دو حصوں میں ۱۹۳۷ء۔ ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اسے عبدالحمید نے چند اضافوں کے ساتھ مرتب کر کے شائع کر دیا ہے (لاہور، ۱۹۷۱ء)۔

غالب کے اُردو کلام کی تصحیح متن کے ضمن میں سعی و کاوش کی عمدہ مثالیں نظر آتی ہیں اور اسی لیے یہ خصوصی جائزے کی مستحق بھی ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ تقریبات کی مناسبت سے غالب پر کئی اہم اور وقیع کام ہوئے۔ بالخصوص غالب کے تمام آثار کو ''مجلس یادگار غالب'' جامعہ پنجاب نے سلیقے اور نفاست سے شائع کیا۔ اس سے قبل غالب کے اُردو کلام کے دو نسخے بہت اہم سمجھے جاتے تھے۔ ایک ''نسخہ حمیدیہ'' اور دوسرا ''نسخہ شیرانی''، نسخہ حمیدیہ بھوپال کی حمیدیہ لائبریری سے غائب ہو چکا ہے۔ مگر اس کے مندرجات کا علم ''نسخہ حمیدیہ'' مرتبہ مفتی انوار الحق اور ''دیوان غالب'' مرتبہ عرشی سے ہو جاتا ہے لیکن اول الذکر مرتبہ نسخہ اس اعتبار سے صحیح نہیں تھا کہ وہ اشعار جو غالب نے نسخہ حمیدیہ کی کتابت ۱۸۲۱ء کے بعد حاشیے پر لکھے، وہ اس مطبوعہ نسخے کے ساتھ خلط ملط ہو گئے تھے، جس سے غالب کے کلام کے تدریجی ارتقاء کا اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا تھا۔ پروفیسر حمید احمد خان نے ۱۹۳۸ء میں بھوپال جا کر اس نسخے کا مطالعہ کیا تھا اور مفصل یادداشتیں تیار کی تھیں۔ ان یادداشتوں کی مدد سے انھوں نے نسخہ حمیدیہ کی نقل تیار کی اور نسخہ بھوپال کی ترتیب کے مطابق حواشی کے اندراجات حواشی میں درج کیے۔ مفتی انوار الحق کے مرتبہ نسخے میں کتابت کی جو غلطیاں رہ گئیں تھیں ان کی تصحیح بھی کر دی۔ اس طرح اس نسخے کی ترتیب و اشاعت غالبیات میں ایک قابل تحسین اضافہ ہے (لاہور، ۱۹۶۹ء)۔

دوسرا نسخہ ''نسخہ شیرانی''، پروفیسر محمود شیرانی کی ملکیت تھا اور اب کتب خانہ جامعہ پنجاب کے ذخیرہ شیرانی میں موجود ہے۔ مجلس ترقی ادب نے اس کا عکس شائع کر دیا ہے (۱۹۶۹ء)۔ اس طرح اصل مخطوطہ اب ہر ایک کے سامنے ہے۔ دیوان غالب کے متون کے لحاظ سے یہ دونوں نسخے بہت اہم ہیں۔ نسخہ شیرانی پر ڈاکٹر وحید قریشی (''نقوش'' غالب نمبر، حصہ اول، ۱۹۶۹ء) اور سید قدرت نقوی (''صحیفہ'' غالب نمبر، اپریل ۱۹۷۳ء) نے مقالات لکھ کر بڑی قیمتی معلومات فراہم کی ہیں۔

غلام رسول مہر نے بھی ''دیوان غالب'' کو صحت کے ساتھ مرتب کرنے کی کوشش کی (لاہور ۱۹۶۷ء) اس میں غالب کے کمیاب و نایاب اُردو کلام کی جمع و تدوین کے علاوہ نسخہ حمیدیہ کا انتخاب بھی شامل کیا جو اب تک مروجہ دیوان سے الگ رہا۔ ساتھ ہی ساتھ کلام کی صحیح تاریخیں مستند مآخذ کی بنیاد پر درج کرنے کا اہتمام بھی کیا۔ یہ ایک اچھا متن ہے لیکن صحت متن کے لحاظ سے مجلس یادگار غالب کا شائع کردہ ''دیوان غالب'' مرتبہ حامد علی خان شاید اس سلسلے میں مثالی ہے۔ اس متن کی ترتیب میں نسخہ مطبع نظامی ۱۸۶۲ء کو بنیاد بنایا گیا ہے، جسے خود غالب نے ترتیب دے کر شائع کرایا تھا۔ اس نسخے کے فاضل مرتب نے متن کی تصحیح کے لیے متعدد متداول نسخوں کو پیش نظر رکھ کر اس کا متن ترتیب دیا ہے۔ تصحیح متن کے لحاظ سے اس نسخے کو زیادہ جامع اور مکمل کہا جا سکتا ہے۔

کلام غالب کے متون میں سے منتخب اُردو فارسی کلام کا اولین مجموعہ ''گل رعنا'' خود غالب نے اپنے قیام کلکتہ کے دوران میں مرتب کیا تھا اور ستمبر ۱۸۲۸ء

کو اس کا دیباچہ لکھا تھا لیکن کچھ عرصے قبل تک یہ اولین مجموعہ ناپید تھا۔ ۱۹۵۲ء میں وزیر الحسن عابدی کو اس کے ایک نسخہ بہ خط غالب مملوکہ خواجہ محمد حسین (لاہور) کا علم ہوا، جسے انھوں نے ۱۹۶۸ء میں نقل کر کے مرتب کیا۔ اس عرصے میں بھارت میں مالک رام کو ۱۹۵۷ء میں اس کا ایک نسخہ دستیاب ہوا، جس کے جائزے پر مشتمل انھوں نے دو تعارفی مضامین تحریر کیے۔ ان سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اس نسخے کے کلام اور نسخہ حمیدیہ اور مروج دیوان غالب میں اہم اختلاف متن پائے جاتے ہیں۔ لاہور کے نسخے کا تعارف ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے علمی دنیا سے کرایا ('' نقوش'' غالب نمبر ۲، اکتوبر ۱۹۶۹ء)۔ وزیر الحسن عابدی نے نسخہ بہ خط غالب کو لاہور کے ایک نجی کتب خانے میں موجود ایک اور معاصر نسخے کی مدد سے مرتب کیا ہے (لاہور، ۱۹۶۹ء) اس عرصے میں بھارت میں مالک رام نے بھی اپنے نسخے کو شائع کر دیا۔ جناب عابدی نے جس نسخے کو مرتب کیا ہے، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے دیباچے کا اصل متن '' پنج آہنگ'' میں شامل متن سے پوری دو عبارتوں کی کمی اور لفظی اختلاف کے لحاظ سے مختلف ہے۔ نسخہ عابدی کی اشاعت کے بعد ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے اپنے ایک مقالے '' گل رعنا'' مطبوعہ لاہور، عابدی کی حقیقت ('' تحقیق غالب'' کراچی، ۱۹۸۱ء) میں اس نسخے کی دریافت کے بارے میں اور اس کے مقدمے کے مباحث میں فاضل مرتب نے جن غلط بیانیوں سے کام لیا تھا ان کی نشاندہی اور تصحیح کی ہے۔

'' گل رعنا'' کی دریافت کا یہ سلسلہ ۱۹۶۹ء میں ختم نہیں ہوا، کراچی میں سید وصی احمد بلگرامی کے کتب خانے سے بھی اس کا ایک نسخہ دستیاب ہوا، جسے انجمن ترقی اردو کراچی نے شائع کر دیا (کراچی، ۱۹۷۵ء) اس نسخے کی ترتیب و تدوین سید قدرت نقوی نے کی جو غالبیات کے ضمن میں کئی اہم مقالے اور غالب کی تصنیف '' ہنگامہ دل آشوب'' کو مرتب کر چکے ہیں (کراچی، ۱۹۶۹ء) انھوں نے کمال محنت و تحقیق سے '' گل رعنا'' کا متن تیار کیا ہے جو بلاشبہ اس کے دو سابقہ مطبوعہ نسخوں سے زیادہ جامع اور وقیع ہے۔ اس نسخے کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ مخطوطے کا عکس بھی ان کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہے اور مرتب نے '' گل رعنا'' کے بارے میں تمام معلومات فراہم کرنے کے علاوہ غالب کے سفر کلکتہ پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ غالب کی فارسی مثنوی '' آشتی نامہ غالب'' جو '' مثنوی باد مخالف'' کے عنوان سے کلیات میں شامل ہے، اس کا اولین متن بھی '' گل رعنا'' کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس کے متعلق بھی فاضل مرتب نے ایک جامع مقدمہ تحریر کیا ہے۔ یہ متون غالبیات کے ضمن میں نہایت اہم ہیں۔

مسلم ضیائی نے بالخصوص غالبیات کے تعلق سے کافی وقیع اور جامع تحقیقی کام کیے ہیں، متن کے سلسلے میں انھوں نے ایک مفید کام یہ کیا ہے کہ غالب کے ایسے تمام کلام کو جو قلمی نسخوں میں تو ملتا ہے لیکن متداول نسخوں میں موجود نہیں، انھوں نے وہ تمام غزلیں، منظومات، متفرق اشعار اور مصرعے جو ان کے دواوین، تذکروں اور خطوط میں بکھرے ہوئے تھے۔ یکجا کر کے بہ صورت دیوان مرتب کیا ہے اور اسے '' غالب کا منسوخ دیوان'' کے نام سے شائع کیا ہے (کراچی، ۱۹۶۹ء)۔ فاضل مرتب نے حواشی میں مآخذ کی نشاندہی کر دی ہے اور متن میں تو اشعار کو اپنی ابتدائی شکل میں درج کیا ہے لیکن حواشی میں وہ ترامیم پیش کر دی ہیں، جو مختلف اوقات میں کی گئیں۔ یہ متن ایک متوازی دیوان کی صورت میں اپنی جگہ اہم ہے۔

غالب کے فارسی کلیات کا متن بھی مختلف نسخوں کی مدد سے مرتضیٰ حسین فاضل نے صحت کے ساتھ تین جلدوں میں مرتب کیا ہے۔ (لاہور، ۱۹۶۷ء)۔ غالب کی فارسی مثنوی '' ابر گہر بار'' ان کی سب سے عمدہ مثنوی سمجھی جاتی ہے۔ اس کے نسخے بہت کم دستیاب ہیں۔ مرتضیٰ حسین نے کلیات نول کشور (لکھنو) کے متن کے مطابق اسے اپنے مقدمے کے ساتھ مرتب کیا اور دوسرے نسخوں سے مدد لے کر اس کا ایک اچھا متن تیار کیا۔ یہ تحسین سروری کے تعارف کے ساتھ شائع ہوئی ('' اردو'' جنوری ۱۹۶۶ء)۔ فارسی کلام کے دیگر تمام مجموعے '' مجلس یادگار غالب'' (لاہور) نے صحت متن کے ساتھ شائع کیے۔

(ب) نثر

نثری متون کی تصحیح کا کام بھی مجلس ترقی ادب کے تحت اسی توجہ اور مستعدی سے ہوا ہے جو نظم کے متون میں نظر آتی ہے۔ مجلس کی کوششیں اس سلسلے میں بھی مثالی ہیں۔ اس نے نایاب اور کمیاب متون جمع کر کے انھیں سلیقے کے ساتھ مرتب کروایا اور ان پر مفید مقدمات تحریر کروائے۔ فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی مطبوعات میں سے خلیل الرحمٰن داؤدی نے نہال چند لاہوری کی '' مذہب عشق'' (۱۹۶۱ء) کو، ڈاکٹر وحید قریشی نے میر بہادر علی حسینی کی '' اخلاق ہندی'' (۱۹۶۳ء)، اور حیدری کی '' توتا کہانی'' (۱۹۶۵ء) کو، اور '' آرائش محفل'' کو ڈاکٹر اسلم قریشی نے (۱۹۶۵ء) شیر علی افسوس کی '' باغ اردو'' کو کلب علی خان فائق نے (۱۹۶۵ء)، کاظم علی جوان کی تصنیف '' شکنتلا'' کو ڈاکٹر محمد اسلم قریشی نے (۱۹۶۳ء)، حفیظ الدین احمد کی '' خرد افروز'' کو ڈاکٹر عابد علی عابد نے (۱۹۶۳ء) اور مظہر علی خان ولا کی '' بیتال پچیسی'' کو گوہر نوشاہی نے (۱۹۶۵ء) میں مرتب کیا۔

پروفیسر وقار عظیم نے گل کرسٹ کی تالیف ''نقلیات'' کو مرتب کیا (۱۹۶۶ء) لیکن یہ اس کا پہلا حصہ تھا۔ وقار صاحب کو اس کا ایک نسخہ، جس پر سرورق موجود نہیں تھا، جامعہ پنجاب کے کتب خانے میں ملا تھا اس کے مصنف اور اس کی اشاعت کے بارے میں انھوں نے عتیق صدیقی کی گل کرسٹ پر کتاب سے معلومات اخذ کی تھیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کو لندن میں اس کتاب کا مکمل نسخہ دستیاب ہوا، جس سے معلوم ہوا کہ دراصل یہ دو جلدوں میں ہے اور ۱۸۰۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ انھوں نے اس مکمل نسخے کو اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کر دیا (لاہور، ۱۹۷۹ء)۔

فورٹ ولیم کالج کے بعد کے عہد کی اکثر مطبوعات عام دستیاب نہیں ہوئیں۔ اس سلسلے میں خلیل الرحمٰن داؤدی نے فخر الدین حسین سخن کی تصنیف ''سروش سخن'' (۱۹۶۳ء) اور محمد بخش مہجور کی تصنیف ''نورتن'' (۱۹۶۲ء) کو ترتیب دیا۔ سخن اور مہجور اپنے زمانے کے ممتاز شاعر اور ادیب تھے، فاضل مرتب نے ان کے حالات و جائزے پر مشتمل مبسوط مقدمات تحریر کیے ہیں۔ انھوں نے ''قصہ اگر گل'' بھی مرتب کیا (۱۹۶۷ء) جس کے مصنف کے نام سے دنیا لاعلم تھی۔ اس کے نام کے تعین میں کئی محققین نے دلچسپی لی لیکن کسی کی تحقیق کو قابلِ اعتنا نہیں کہا جا سکتا تھا۔ فاضل مرتب نے ان تمام تحقیقات کا جائزہ لیا لیکن خود بھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ وہ مقدمہ لکھ کر طباعت کے لیے دے چکے تھے، اسی اثنا میں مشفق خواجہ نے تذکرہ ''خوش معرکۂ زیبا'' مرتب کر کے مجلس کو اشاعت کی غرض سے دیا۔ ان کے تحریر کردہ مقدمے سے یہ بات معلوم ہوئی کہ یہ قصہ تذکرے کے مصنف سعادت خاں ناصر کا تصنیف کردہ ہے۔ چنانچہ فاضل مرتب نے پس نوشت میں اس انکشاف کا ذکر کر دیا۔

اس عہد کی جن دیگر تصانیف کے تصحیح شدہ متن مجلس نے شائع کیے، ان میں جیمز فرانسس کارکرن کی تصنیف ''جوہر اخلاق'' مرتبہ ڈاکٹر محمد باقر (۱۹۶۳ء)، شیخ اکرام علی کی تصنیف ''اخوان الصفا'' مرتبہ ڈاکٹر احرار نقوی (۱۹۶۶ء) محمود بیگ راحت کی تصنیف ''نتائج المعانی'' مرتبہ گوہر نوشاہی (۱۹۶۵ء) رجب علی بیگ سرور کی ''سرور سلطانی'' مرتبہ آغا سہیل (۱۹۷۲ء) شامل ہیں۔ ان کتابوں کی تصنیف کے زمانے میں اُردو میں ڈراما نگاری کا باقاعدہ آغاز ہو گیا تھا، مجلس نے ایک بڑا کام یہ بھی کیا کہ کلاسیکی اور قدیم ڈراموں کو تلاش کر کے انھیں سلیقے سے شائع کر دیا۔ اس سلسلے میں امتیاز علی تاج نے خاص دلچسپی لے کر اس ادب کو محفوظ کرنے کا سامان کیا جو اگر محفوظ نہ کیا جاتا تو ضائع ہو جاتا۔ اس ضمن میں خورشید، آرام، ظریف، رونق، حباب، حافظ عبداللہ، کریم الدین مراد، طالب بنارسی اور متفرق نامعلوم مصنفین کے تحریر کردہ ڈرامے مجموعوں کی صورت میں شائع کیے گئے۔

غالب کے نثری متنوں میں سے مجلس نے ''مجموعہ نثر غالب'' شائع کیا ہے (۱۹۶۷ء) اس میں غالب کی تمام تحریریں اور رسالے یکجا کر دیے گئے ہیں۔ خلیل الرحمٰن داؤدی نے اس کام میں دلچسپی لے کر اپنے مقدمے، تعارف اور حواشی کے ساتھ اسے ایک وقیع مجموعہ بنا دیا ہے اور تصحیح متن کے لیے تقریباً تمام مطبوعہ نسخے پیش نظر رکھے ہیں۔ غالب کے فارسی نثری مجموعے بھی تصحیح متن کے ساتھ شائع ہوئے۔ اس ضمن میں ''مجلس یادگار غالب'' نے اہتمام سے یہ کام کیا۔ ''باغ دو در'' جو فارسی مجموعہ نظم و نثر ہے، وزیر الحسن عابدی نے بہ تصحیح و تحقیق مرتب کیا (لاہور، ۱۹۷۰ء)۔ غالب کے خطوط کی جمع و ترتیب کا قابل قدر کام پاکستان میں غلام رسول مہر نے کیا (لاہور، ۱۹۵۱ء) جن میں مجموعہ ''خطوط غالب'' (لاہور ۱۹۵۱ء) قابل ذکر ہے۔ ۱۹۶۹ء میں اس کا ایک نیا ایڈیشن ''مجلس یادگار غالب'' نے دو جلدوں میں شائع کیا۔ ''عود ہندی'' اور ''اُردوئے معلّٰی'' کے تصحیح شدہ ایڈیشن مرتضیٰ حسین فاضل نے مرتب کیے (لاہور، ۱۹۶۲ء، ۱۹۶۹ء)۔

غالب کے بعد لکھے جانے والے کلاسیکی ادب کو بھی مجلس ترقی ادب نے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس سلسلے میں اس کا ایک اہم اور بڑا کارنامہ سرسید کے تمام مقالات، خطبات، مکاتیب اور سفرنامے کی اشاعت ہے جو سب تقریباً ۲۲ جلدوں میں شائع ہوئے۔ اس طرح اب سرسید کی قریب قریب سب ہی تصانیف، طویل و مختصر تحریریں یکجا ہو کر محفوظ ہو گئی ہیں، ان کو یک جا کرنے میں شیخ اسماعیل پانی پتی نے بڑی دلجمعی اور عرق ریزی کا ثبوت دیا ہے۔ ان مجموعوں کے علاوہ سرسید کی تصنیف ''آثار الصنادید'' کو ترتیب و حواشی کے ساتھ ڈاکٹر ایس معین الحق نے مرتب کر کے شائع کیا (کراچی، ۱۹۶۶ء)۔

سرسید کے معاصرین میں سے مولوی ذکاء اللہ دہلوی کی کتاب ''محاسن الاخلاق اور مکارم الاخلاق'' مرتبہ احمد رضا (۱۹۶۷ء)، مولوی نذیر احمد کی ''موعظہ حسنہ''، ''فسانہ مبتلا'' اور ''توبۃ النصوح'' مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی (۱۹۶۴ء-۱۹۶۲ء)، شبلی کی ''سوانح حیات مولانا روم'' اور ''موازنہ انیس و دبیر'' مرتبہ ڈاکٹر عابد علی عابد (۱۹۶۴ء-۱۹۶۱ء) حالی کی ''حیات سعدی'' (۱۹۶۵ء) اور ''کلیات نثر حالی'' دو جلدیں، مرتبہ اسماعیل پانی پتی (۱۹۶۸ء) محمد حسین آزاد کی ''قصص ہند'' (۱۹۶۱ء) ''مکاتیب آزاد'' (۱۹۶۶ء) مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل ''مقالات آزاد'' ۲ جلدیں مرتبہ آغا محمد باقر (۱۹۷۸ء) اور ''نیرنگ خیال'' مرتبہ ڈاکٹر محمد صادق (۱۹۶۶ء)، شرر کی ''فردوس بریں'' مرتبہ پروفیسر وقار عظیم (۱۹۶۷ء) اور ''ملک العزیز ورجینا'' مرتبہ ممتاز منگلوری (۱۹۶۶ء) کے نفیس متن شائع ہوئے۔ ان کے ساتھ پیارے لال آشوب کی ''رسوم ہند'' مرزا سودا کی ''مرقع لیلیٰ مجنوں'' عزیز مرزا کی ''وکرم اروسی'' سجاد حسین انجم کی ''نشتر''، منشی فیاض الدین کی ''بزم آخر'' کے متن بھی اہمیت رکھتے ہیں۔

ان مذکورہ تصانیف میں سے ''فردوس بریں'' کا ایک اچھا متن ممتاز منگلوری نے بھی اپنے مبسوط مقدمے کے ساتھ مرتب کیا (لاہور، ۱۹۶۷ء)۔ انھوں نے ''باغ و بہار'' اور ''اندر سبھا'' کو بھی اپنے مقدموں کے ساتھ شائع کیا۔ نواب سید محمد آزاد کی دو کتابیں بھی انھوں نے مرتب کیں، ان میں سے ایک ''نوابی دربار'' (۱۹۶۶ء) اور دوسری ان کے مضامین کا مجموعہ ''خیالات آزاد'' ہے۔ یہ دونوں کتابیں کم یاب تھیں، جنھیں مرتب نے اپنے مقدموں اور حواشی کے ساتھ شائع کیا ہے۔ حالی کے ''مقدمہ شعر و شاعری'' کو نہایت اہتمام سے ڈاکٹر وحید قریشی نے مرتب کیا (لاہور، ۱۹۵۲ء) اور ضمیموں کے اضافے نے اسے مفید بنا دیا۔ یہ ایڈیشن اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں مرتب نے حالی کی شخصیت، ان کی تنقید نگاری پر مختلف اکابر کی آرا یک جا کی ہیں اور ضمیموں میں مقدمے کے مباحث کے حق میں یا رد میں شامل ہونے والا مواد شامل کیا ہے۔

محمد حسین آزاد نے انگریزوں کی ایما پر بخارا، سمرقند، تاشقند اور بلوچستان کا سفر کیا تھا۔ اس کی مکمل روداد تاریخ کے صفحات پر دستیاب نہیں تھی۔ آغا محمد اشرف نے انڈیا آفس کی رپورٹ اور تاریخی دستاویزات کی مدد سے اسے مرتب کر کے ایک سفر نامے کی صورت دی (کراچی، ۱۹۵۹ء)۔ ان حالات سفر کو ڈاکٹر محمد صادق نے اپنے ایک مقالے میں مرتب بھی کیا ہے جو آزاد پر ان کے مقالات کے ایک مجموعہ ''آب حیات کی حمایت میں اور دوسرے مضامین'' (لاہور، ۱۹۷۳ء) میں شامل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے ارشاد کے مطابق وہ آزاد کے اس سفر کے حالات کا ذکر آزاد پر اپنے مبسوط مقالہ تحقیقی برائے پی ایچ ڈی۔ (۱۹۳۹ء) میں پہلے ہی کر چکے تھے۔

سید سجاد حیدر یلدرم کے مجموعہ ''خیالستان'' کو ڈاکٹر سید معین الرحمن نے مرتب کیا ہے اور اس پر ایک مفصل مقدمہ لکھ کر یلدرم کے افسانوں کے بارے میں نئی معلومات فراہم کی ہیں۔ اس ضمن میں ان کے ایک مضمون کا ذکر کیا جا سکتا ہے، جو اولاً ''فنون'' کے غالب نمبر (۱۹۶۹ء) میں شائع ہوا۔ اس میں انھوں نے تحقیق سے یہ ثابت کیا کہ اُردو کے اولین افسانہ نگار پریم چند نہیں، یلدرم ہیں۔ ان کا یہ مضمون بعض دیگر مضامین کے ساتھ، جو یلدرم کے تعلق سے اہم ہیں، ''خیالستان'' کے ان کے مرتبہ ایڈیشن میں شامل ہے۔ یہ ایڈیشن ۱۹۶۸ء سے اب تک تین مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔

علامہ اقبال کی اُردو نثر زیادہ تر ان کے مکاتیب پر مشتمل ہے ان کے مکاتیب کے کئی مجموعے مرتب ہوئے ہیں۔ شیخ عنایت اللہ کا مرتبہ مجموعہ ''اقبال نامہ'' (لاہور، ۱۹۵۱ء) سب سے اہم اور اولین مجموعہ ہے لیکن اس میں انگریزی خطوط کے تراجم بھی شامل ہیں۔ ان کے بعد سے اب تک متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں ان میں سے ''انوار اقبال'' مرتبہ بشیر احمد ڈار (کراچی، ۱۹۶۷ء) ''مکاتیب اقبال بنام خان محمد نیاز الدین'' (لاہور، ۱۹۵۴ء) ''مکتوب اقبال بنام سید نذیر نیازی'' کراچی، ۱۹۵۷ء)، ''مکاتیب اقبال بنام گرامی'' مرتبہ محمد عبداللہ قریشی (لاہور، ۱۹۶۹ء) اور ''خطوط اقبال'' مرتبہ رفیع الدین ہاشمی اہم ہیں۔ ان کے خطوط کے اہم حصوں اور ضروری اقتباسات پر مشتمل ایک مجموعہ ''روح مکاتیب اقبال'' محمد عبداللہ قریشی نے مرتب کیا (لاہور، ۱۹۷۸ء)۔ اقبال کی بعض متفرق تحریریں کئی اور مجموعوں میں بھی شائع ہوئیں، مثلاً ''مقالات اقبال'' مرتبہ عبدالواحد معینی (لاہور، ۱۹۶۳ء) اور ''گفتار اقبال'' مرتبہ محمد رفیق افضل (لاہور، ۱۹۶۹ء) لیکن یہ تحریریں تصحیح و ترتیب متن کے اصولوں سے مرتب نہیں ہوئیں۔

(ج) تذکرے

تذکروں کی تصحیح متن میں بھی سب سے نمایاں کام مجلس ترقی ادب نے انجام دیا ہے۔ اس سے وابستہ محققین نے متعدد اہم تذکروں کو تصحیح متن کے تقاضوں کے پیش نظر مفید اور مفصل مقدموں اور حواشی کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ قدیم تذکروں میں سے قائم چاند پوری کا ''مخزن نکات'' کئی وجوہ سے اہمیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر اقتدا حسن نے، جو قائم کا کلیات بڑی محنت سے مرتب کر چکے ہیں، اس تذکرے کو مفید حواشی اور اختلاف نسخ کے ساتھ مرتب کیا ہے (۱۹۶۶ء) اور مقدمے میں قائم اور ان کی تذکرہ نگاری کی خصوصیات کا محققانہ مطالعہ کیا ہے۔ اسی طرح کا ایک اہم تذکرہ شیفتہ کا ''گلشن بے خار'' ہے۔ اسے مفید حواشی اور ایک جامع مقدمہ کے ساتھ کلب علی خان فائق نے ترتیب دیا۔ (۱۹۷۲ء) اس تذکرے کا ایک اُردو ترجمہ بھی کراچی سے شائع ہوا۔ شاعرات کے ایک معروف تذکرہ بہارستان ناز، مصنفہ حکیم فصیح الدین رنج کو خلیل الرحمن داؤدی نے مرتب کیا اور اس پر ایک مفصل مقدمہ لکھ کر مصنف کے حالات اور تصانیف پر روشنی ڈالی (۱۹۶۵ء) قادر بخش صابر کے ضخیم تذکرہ ''گلستان سخن'' کو جو دو حصوں پر مشتمل ہے، خلیل الرحمن داؤدی نے مرتب کیا (۱۹۶۶ء) اور مصنف کے حالات زندگی اور تصانیف کے جائزے پر مشتمل مقدمہ تحریر کیا ہے۔ متن کی تصحیح اس کے سابقہ دو ایڈیشنوں کی مدد سے کی۔ متن سے پہلے ڈاکٹر وحید قریشی کا تحریر کردہ ایک تجزیہ بھی اس میں شامل کیا گیا ہے۔ مجلس کے زیر اہتمام یہ تمام تذکرے مختلف نسخوں کی مدد سے تصحیح کر کے شائع کیے گئے ہیں۔

بعض دیگر تذکرے بھی اہتمام سے مرتب ہوئے ہیں۔ نصر اللہ خان خویشگی کا تذکرہ ''گلشن ہمیشہ بہار'' کم یاب تھا، اسے ڈاکٹر اسلم فرخی نے اپنے مقدمے اور حواشی کے ساتھ مرتب کیا (کراچی ۱۹۶۷ء) اس سلسلے میں بالخصوص ڈاکٹر اقتدا حسن کا مرتب محسن لکھنوی کے تذکرے ''سراپا سخن'' کا بھی یہاں ذکر کیا جاسکتا ہے۔ محسن نے اپنا تذکرہ بنیادی طور پر موضوع وار انتخاب کے لیے مخصوص کیا تھا، جس میں وہ ضمنی طور پر شاعروں کا احوال نقل کرتا رہا۔ اس اعتبار سے اس میں شاعروں کے حالات مربوط صورت میں درج نہیں ہوئے۔ ڈاکٹر اقتدا حسن نے اشعار کو حذف کر کے صرف محسن کے تحریر کردہ تراجم شعرا کو یکجا کیا اور انھیں حروف تہجی کے اعتبار سے ایک تذکرے کی حیثیت میں مرتب کر دیا (لاہور، ۱۹۷۰ء)۔ بیانات سب محسن کے ہیں لیکن ربط مرتب نے پیدا کیا ہے، اس طرح اب اس تذکرے سے شاعروں کے حالات اخذ کرنے کی دشواری ختم ہوگئی ہے اور ساری اہم معلومات بہ یک نظر آ گئی ہیں۔ مرتب نے مقدمہ بھی بہت جامع لکھا ہے اور اس کا اختتامیہ جو دراصل محسن کے حالات و آثار کے بارے میں ہے، بعض نئی معلومات کا حامل ہے۔

اسی طرح محمد حسین خان کا تذکرہ ''ریاض الفردوس'' بنیادی طور پر مجموعے یا گلدستے کی صورت میں تھا۔ مصنف نے اس میں منظومات، مکاتیب، صرف و نحو، فقہ و حدیث اور تذکرہ علما، عرفا و شعرا پر شذرات تحریر کیے تھے۔ اس کی پانچویں فصل ''شعرائے متقدمین و متاخرین'' کے بارے میں تھی۔ اس فصل کو مرتضیٰ حسین فاضل نے علیحدہ کر کے حواشی کے ساتھ مرتب کر دیا (لاہور، ۱۹۶۸ء) مصنف نے شعرا کا ذکر بہت مختصر کیا تھا اور سنین کا قطعی التزام نہیں رکھا تھا۔ چنانچہ فاضل مرتب نے شعرا کے نام کے ساتھ سنین پیدائش و وفات تحریر کر دیے ہیں۔ اس نوعیت کی ایک کاوش ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ہے۔ انھوں نے ''ارمغان گوکل پرشاد'' مرتب کیا (کراچی، ۱۹۷۵ء)، جو محسن کے تذکرے کی طرح موضوعاتی تذکرہ تھا اور نایاب بھی تھا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اولاً اس کا ذکر اپنی موقر تصنیف ''اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری'' (لاہور، ۱۹۷۲ء) میں کیا اور پھر اس تذکرے کے تمام تراجم کو علیحدہ کر کے اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کر دیا۔

(۴) دریافت و تعارف متون

(۱) نظم

ترتیب و تصحیح متون کے علاوہ متون کے تعلق سے محققین کا وہ کام بھی اہم ہے جو متون کو دریافت کرنے اور ان کا تعارف کرانے سے متعلق ہے۔ یہ کام ابتدائی طور پر مخطوطات کی فہرستوں میں نظر آتا ہے لیکن وہ کسی ذخیرہ کتب سے متعلق فہرست پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہاں ایسے کام کا ذکر کیا جاتا ہے جو نادر و نایاب مخطوطات کے مستقل تعارف سے تعلق رکھتا ہے اور اس میں مخطوطات کے جامع تعارف کے ساتھ ساتھ اس کے مصنف کا تذکرہ اور اس کے متن کا کچھ حصہ بھی سامنے آجاتا ہے۔ ذیل میں بہ خوف طوالت صرف ایسے کاموں کا حوالہ دیا جائے گا جو زیادہ تر غیر مطبوعہ تصانیف کے تعارف پر مشتمل ہیں۔

اس ضمن میں پاکستان میں بلاشبہ سب سے زیادہ کام جناب سخاوت مرزا نے کیا ہے۔ انھوں نے مختلف کتب خانوں، بالخصوص کتب خانہ آصفیہ و کتب خانہ سالار جنگ اور کتب خانہ انجمن، کراچی کے نادر و نایاب مخطوطات اور ان کے معروف و غیر معروف مصنفین کے تعارف میں بڑی مستقل مزاجی اور عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ اس بارے میں انھوں نے نہ صرف قدیم دکنی ادبیات بلکہ شمالی ہند کے مخطوطات اور ان کے مصنفین سے بھی متعارف کرایا۔

اُردو کے اولین نمونوں کی تحقیق ایک عرصے سے محققین کے پیش نظر رہی ہے۔ پروفیسر محمود شیرانی نے امیر خسرو کی مشہور غزل ''ز حال مسکین تغافل،.....'' کو اُردو کا پہلا ریختہ، یعنی فارسی و ہندی مخلوط کلام قرار دیا تھا۔ جناب سخاوت مرزا نے اس ضمن میں شیخ فریدالدین گنج شکر کے ایک ریختے کو مجلہ ''اُردو'' (اکتوبر ۱۹۵۰ء) میں شائع کیا ہے اور اسے ریختے کا اولین نمونہ قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ انھیں شیخ بدرالدین جون پوری (متوفی اوائل نویں صدی ہجری) کا ایک ریختہ ملک محمد جائسی کے مجموعۂ رسائل میں سے رسالہ سوم ''اکھروتی'' سے دستیاب ہوا۔ یہ مجموعۂ رسائل روضہ گلبرگہ کے کتب خانے میں موجود ہے۔ انھوں نے اس غزل ریختہ کو تعارف کے ساتھ شائع کر دیا ہے (''اُردو ادب'' علی گڑھ، شمارہ ۱، ۱۹۷۰ء)۔

دکنی ادبیات میں سے ان کی متعارفہ ایک مثنوی ''بہارستان عشق'' ہے، جس کا مصنف مسرور تھا لیکن اس کے حالات انھیں نہ مل سکے۔ یہ مثنوی سام نامہ فارسی سے ماخوذ ہے۔ مصنف کے کچھ حالات انھوں نے مثنوی کی داخلی شہادتوں سے اخذ کیے ہیں۔ اپنے مقالہ (''اُردو'' جنوری ۱۹۶۶ء) میں انھوں نے مثنوی کے مآخذ اور اُردو میں عام ناموں کا تحقیقی جائزہ بھی لیا ہے اور پھر مثنوی کا تعارف کراتے ہوئے اس کے اقتباسات نقل کیے ہیں۔ یہ تعارف اس مثنوی کے واحد نسخے پر مبنی ہے، جو کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

مثنوی ''جامع الحقائق'' کے مصنف سید احمد قادری الحسینی سبز پوش کے حالات بھی دستیاب نہیں لیکن سبز پوش خاندان کے تاریخی حوالے جناب سخاوت مرزا نے اس مثنوی کے تعارف کے ذیل میں پیش کیے ہیں (''اُردو نامہ'' جنوری ۱۹۷۰ء) انھوں نے قیاس کیا ہے کہ مصنف شاہ عظمت اللہ اول کے مرید تھے اور پھر شاہ عظمت اللہ کے حالات پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے بعد مثنوی کے مخطوطات اور اس کے مندرجات کا ذکر کیا ہے۔ ایک اور مثنوی ''من موہن'' مصنفہ عین الحق آزاد حیدر آبادی کا تعارف بھی سخاوت مرزا نے تحریر کیا ہے (''اُردو نامہ'' جون ۱۹۶۷ء) یہ مثنوی بحری کی ''من لگن'' کے تتبع میں ہے۔ اس مقالے میں مصنف کے حالات اور مثنوی کے منتخب اشعار نقل کیے گئے ہیں۔ اس مثنوی کے نسخے کتب خانہ آصفیہ اور سالار جنگ میں موجود ہیں۔

یہاں سخاوت مرزا کے چند اور مقالوں کا حوالہ دے کر ان کے ایسے باقی کاموں کا جائزہ آئندہ اوراق پر چھوڑ جاتا ہے۔ ان میں سے ایک مقالہ عشرت بریلوی کی ایک گم نام مثنوی ''ریاض الحسنین'' کے تعارف پر مشتمل ہے۔ عشرت مرزا علی لطف کے شاگرد تھے۔ صاحب دیوان تھے۔ پدماوت کا منظوم ترجمہ ''شمع و پروانہ'' ان سے یادگار ہے۔ ''ریاض الحسنین'' کا ایک نادر و نایاب نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے، جس کا تعارف کراتے ہوئے فاضل مقالہ نگار نے عشرت بریلوی کے کلام کی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اس مثنوی کے، جو ایک ہزار اشعار پر مشتمل ہے، اقتباسات درج کیے ہیں۔

مہاراجہ چندو لعل شاداں کے عہد کے ایک شاعر نول سنگھ کی ایک مثنوی ''جگت روپ'' کا تعارف اور اس کے اقتباسات بھی سخاوت مرزا نے ایک مقالے میں نقل کیے ہیں (''اُردو نامہ'' اپریل ۱۹۷۰ء)۔ شاعر کے حالات کتابوں میں موجود نہیں۔ محض مثنوی کی داخلی شہادتوں سے فاضل مقالہ نگار نے کچھ حالات اخذ کیے ہیں۔ مثنوی کے نسخے کتب خانہ آصفیہ اور انجمن کراچی کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ مثنوی ۱۲۴۱ھ میں لکھی گئی تھی اور تقریباً ڈھائی ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ انھی کا مقالہ حنا لکھنوی معاصر واجد علی شاہ کے نایاب دیوان کے تعارف پر مشتمل ہے (''صحیفہ'' اکتوبر ۱۹۶۷ء) اس کا واحد نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ مقالہ نگار نے دیوان سے بہ کثرت نمونہ کلام درج کر کے اس کی خصوصیات کو اجاگر کیا ہے۔ ان کا ایک اور مقالہ بلوان سنگھ راجہ کے دیوان پر مشتمل ہے (''اُردو'' جنوری ۱۹۵۰ء) یہ بنارس کے حکمران تھے اور انتزاعِ ریاست کے بعد گوالیار چلے گئے تھے۔ نظیر اکبر آبادی اور مرزا حاتم علی مہر کے شاگرد تھے۔ شاعری میں ان کے تین دیوان اور ایک مثنوی ہے۔ سخاوت مرزا کو ان کا ایک نایاب دیوان دستیاب ہوا تھا، جس کا انھوں نے تعارف تحریر کر دیا۔ ناسخ کے ایک معاصر قاضی محمد صادق اختر بنگالی ثم لکھنوی کی مثنوی ''سراپا سوز'' کا تعارف بھی سخاوت مرزا نے تحریر کیا۔ (''اُردو جولائی ۱۹۷۲ء) اور اس کے اقتباسات نقل کیے۔

اُردو کے اولین نمونوں کی تحقیق کے ضمن میں سخاوت مرزا کی مذکورہ کاوش کے علاوہ ایک اور کوشش ڈاکٹر محمد صابر نے کی ہے۔ انھیں استنبول یونیورسٹی میں مغل حکمران بابر کے دیوان کا ایک مخطوطہ ملا، اس میں انھیں ایک ایسا شعر ملا، جس میں ترکی اور فارسی کے علاوہ اُردو الفاظ بھی شامل ہیں۔ ان کی تحقیق کے مطابق ''تزک بابری'' میں تقریباً ڈیڑھ سو الفاظ اُردو یا ہندی کے ہیں۔ اس موضوع پر ڈاکٹر صاحب کا مقالہ ''بابر کا فارسی، ترکی اور اُردو کلام'' (''اُردو نامہ'' اکتوبر ۱۹۶۲ء) محققانہ ہے۔

قلی قطب شاہ کے عہد کے ایک شاعر شیخ احمد دکنی کی ایک مثنوی ''یوسف زلیخا'' کا تعارف ڈاکٹر محمد اقبال جاوید نے تحریر کیا ہے (''اُردو نامہ'' جولائی ۱۹۷۴ء) اس شاعر کی ایک اور مثنوی ''لیلیٰ مجنوں'' کا ذکر عام طور پر ملتا ہے۔ مثنوی ''یوسف زلیخا'' قطب شاہی کے دور کی سب سے پہلی منظوم تصنیف ہے۔ شاعر کا نام احمد دکنی بیان کیا جاتا تھا لیکن ''یوسف زلیخا'' کا ایک نسخہ کتب خانہ انجمن ترقی اُردو کراچی میں موجود ہے، جس پر احمد سے پہلے شیخ بھی تحریر ہے۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اُردوئے قدیم کے دو نادر مخطوطوں ''خوب ترنگ'' اور ''چھند چھنداں'' کا تعارف کرایا (''اُردو'' جولائی ۱۹۵۲ء اور ''اورینٹل کالج میگزین'' مئی ۱۹۵۲ء) جو خوب محمد چشتی کی تصانیف ہیں۔ اول الذکر کے دو نسخے کتب خانہ انڈیا آفس میں اور آخر الذکر کتب خانہ جامعہ پنجاب میں محفوظ ہے۔ ''خوب ترنگ'' میں خوب محمد چشتی نے اپنے مرشد شیخ کمال محمد سیستانی کے اقوال نظم کیے اور پھر فارسی میں ان کی شرح ''امواج خوبی'' لکھی۔ دوسری تصنیف ہندی عروض پر اُردوئے قدیم میں غالباً سب سے پہلی تصنیف ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے مقالے میں ان دونوں تصانیف کی لسانی خصوصیات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے میر محمد باقر آگاہ کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی ''راحت جاں'' کا تعارف تحریر کیا۔ آگاہ نے اپنا دیوان ۱۱۹۴ھ میں مرتب کیا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی مثنویوں کا بھی ایک مجموعہ تھا، جس کا ایک قلمی نسخہ فاضل مقالہ نگار کو برٹش میوزیم کے کتب خانے سے دستیاب ہوا۔ ان مثنویوں میں سے مثنوی ''راحت جاں'' کے اقتباسات انھوں نے اپنے تعارف کے ساتھ شائع کیے۔ (''ماہ نو'' جولائی اگست ۱۹۶۳ء) اسی عہد میں سراج کے ایک شاگرد متین برہان پوری کے حالات کسی تذکرے میں نہیں ملتے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے ایک مخطوطے سے اس کے کچھ اُردو مرثیوں کا سراغ لگا کر انھیں شائع کر دیا (''اُردو'' اپریل ۱۹۵۶ء)۔

اُردوئے قدیم کے متعدد متون کو ادبی دنیا سے متعارف کرانے میں سخاوت مرزا کے علاوہ ڈاکٹر محمد باقر نے بھی قابل قدر کام کیے ہیں۔ ان کی

کتاب ''اُردوئے قدیم دکن اور پنجاب میں'' (لاہور،۱۹۷۲ء) اُردو کے کم یاب اور غیر مطبوعہ متون کے تعارف پر مشتمل ہے۔ ان کے متعارفہ چند مخطوطے دریافت کی حیثیت رکھتے ہیں، مثلاً ہاشمی بیجاپوری کے ''احسن القصہ'' (یوسف زلیخا) کا نسخہ انھیں برٹش میوزیم سے ملا، جس سے خود میوزیم والے بے خبر تھے، سید یوسف ملی خان کے اُردو مجموعہ کلام کا واحد نسخہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے پاس ہے، اس کا تعارف بھی ڈاکٹر محمد باقر نے کرایا۔ بھگونت رائے راحت کی مثنوی ''زہرہ و بہرام''، غوث ابن عظیم کا منظوم ''قصہ دلآرام'' اور میر صادق علی کا ''قصہ مہتاب شاہ و شہزادہ صف شکن'' کتب خانہ جامعہ پنجاب میں موجود ہیں۔ جن میں سے آخری دو مثنویوں کا کوئی نسخہ کسی اور جگہ دستیاب نہیں ہے۔ ان میں سے اول الذکر مثنوی کا مکمل متن اور آخر الذکر دونوں مثنویوں کا تعارف ڈاکٹر صاحب نے کرایا۔ پیر مراد شاہ لاہوری کی مثنوی ''مراد المجنین'' کا واحد نسخہ غلام دستگیر نامی مرحوم کے کتب خانے میں موجود تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کا مکمل متن ۱۹۴۲ء میں مجلّہ ''اُردو'' میں شائع کرایا تھا جو محفوظ رہ گیا۔ مرحوم کی وفات کے بعد اصل نسخہ غالباً ضائع ہو گیا ہے۔ ان متون کے علاوہ اُردوئے قدیم کی چند مثنویاں'' مجموعہ بارہ قصہ'' کا تعارف اور نثر میں اُردو کے جرمن شاعر فراسو کے تحریر کردہ ''قصہ عشق افزا'' کے واحد قلمی نسخے کا تعارف بھی ڈاکٹر صاحب نے کرایا۔

دکن کے اہم شاعر ولی کا کلام صرف اس کے ایک دیوان میں موجود ہے، جس میں مختلف دریافت نسخوں کی مدد سے اضافے ہوتے رہے ہیں۔ اس کے دیوان کے قلمی نسخوں کی دریافت اور تعارف کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ پاکستان میں اولاً قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی نے مجلّہ ''اُردو'' (جولائی ۱۹۵۵ء) میں اس کے ایک مخطوطے کا مفصل تعارف کرایا جو اس کے قدیم ترین مخطوطوں میں سے ایک ہے۔ اس کے بعد محمد اکرام چغتائی نے اپنے مقالے ''دیوان ولی کے قلمی نسخے'' (''اُردو'' جولائی و اکتوبر ۱۹۶۶ء) میں دیوان ولی کے ۱۱۸ مزید نسخوں کی تفصیلات بتائیں اور ۲۳ ایسی بیاضوں کا حوالہ دیا، جن میں ولی کا غیر مطبوعہ کلام ملتا ہے۔ پھر اس غیر مطبوعہ کلام کو بھی انھوں نے مرتب کر لیا، جس کا ذکر گزشتہ اوراق میں کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ ایک اور مخطوطے کا تعارف محمد اکرام چغتائی نے کرایا (''اُردو نامہ'' جولائی ۱۹۶۸ء) جو اس لحاظ سے اہم ہے کہ حاشیہ نگار نے ولی کے احباب، تلامذہ اور دیگر اشخاص کی سوانح، جن کا ذکر کلام ولی میں موجود ہے، لکھے ہیں۔ ان معلومات کے علاوہ حاشیہ نگار نے ولی کے کلام پر اصلاحیں بھی کی ہیں اور بہت سا غیر مطبوعہ کلام بھی درج کیا ہے۔ یہ نسخہ پنجاب پبلک لائبریری (لاہور) کی ملکیت ہے۔ مشفق خواجہ نے اپنے ''جائزہ مخطوطات اُردو'' کی جلد اول میں ''دیوان ولی'' کے مزید ۱۹ نسخوں کی نشاندہی کی، جن میں سے ایک نسخہ راقم کا مملوکہ ہے، جس پر خود راقم نے بھی ایک علیحدہ مضمون لکھ کر اسے متعارف کرایا (''غالب'' کراچی جنوری ۱۹۷۶ء)۔

دکن سے قطع نظر شمالی ہند اور دیگر علاقوں میں لکھے جانے والے متون بھی بہ کثرت متعارف ہوئے ہیں۔ میر حسن کی مثنوی ''سحر البیان'' کے متعدد نسخے دریافت ہوئے۔ مشفق خواجہ کے ''جائزہ مخطوطات'' جلد اول اور ڈاکٹر وحید قریشی کی مرتبہ ''مثنویات میر حسن'' جلد اول میں ان کی تفصیلات دیکھی جا سکتی ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی کو اس کا ایک اہم نسخہ دستیاب ہوا جو ان کے خیال میں تمام معلوم نسخوں سے زیادہ قدیم اور خود میر حسن کا لکھا ہوا ہے، اس نسخے کا تفصیلی تعارف کراتے ہوئے انھوں نے اس کی خصوصیات بیان کی ہیں (''نذر رحمٰن'' مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار لاہور، ۱۹۶۶ء) راقم کے کتب خانے میں بھی اس کے دو مخطوطے ہیں، جن میں سے ایک کا تعارف کرایا گیا ہے (''اُردو'' جنوری ۱۹۷۴ء)۔ ڈاکٹر وحید قریشی کو شاہ عالم ثانی کے عہد کے کسی سیف اللہ نامی شاعر کی مثنوی ''چندر بدن ماہیار'' کا بھی ایک نسخہ دستیاب ہوا، جس کی ادبی حیثیت کچھ نہیں۔ اس میں ایک بارہ ماسہ بھی شامل ہے لیکن یہ بھی افضل کے بارہ ماسہ کے مقابلے میں کم تر ہے۔ اس نسخے کا تفصیلی تعارف ڈاکٹر صاحب نے تحریر کیا ہے (''کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ'' لاہور ۱۹۶۵ء)۔ اس کی لسانی خصوصیات اور داخلی شہادت کی بنیاد پر ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ شاعر کا تعلق پنجاب سے تھا۔

مصحفی کے دیوان قصائد کے مختلف نسخوں کا تذکرہ اور بالخصوص جامعہ پنجاب کے کتب خانے میں موجود اس کی تین جلدوں کی مکمل کیفیت ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے تحریر کی (''صحیفہ'' جنوری ۱۹۷۰ء) راقم کے کتب خانے میں مصحفی کے دیوان اول کا ایک ناقص نسخہ موجود ہے، اس پر ایک مختصر مضمون راقم نے لکھا ہے۔ (''اُردو'' اپریل ۱۹۷۸ء)۔

ڈاکٹر نجم الاسلام نے اہم تحقیقی مقالات کے علاوہ، جن کا ذکر آئندہ اوراق میں آئے گا، متون کی دریافت اور تعارف میں بھی دلچسپی لی ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کے کتب خانے میں موجود مرزا جان طپش کی ایک بیاض کا انھوں نے ایک بہت جامع تعارف لکھا ہے (''نقوش'' شمارہ ۱۰۸) اس بیاض میں متعدد اہم معلومات درج ہیں، جن کی نشاندہی فاضل مقالہ نگار نے کی ہے۔

شیخ محمد جان شاد لکھنوی کی پیرو میر کے نایاب دواوین کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہیں۔ شاد لکھنوی کے تذکرے کے ساتھ ان کا تعارف سخاوت مرزا نے تحریر کیا ہے (''صحیفہ'' جنوری ۱۹۷۱ء) ان دواوین کی اہمیت یہ ہے کہ ان پر شاد لکھنوی کے استاد میر کلو عرش کی بعض اصلاحیں موجود ہیں۔ فاضل مقالہ نگار نے ان کی دو

مثالیں درج کی ہیں۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی کی رائے کے بہ موجب عرش کا دیوان لفظوں، محاوروں اور ان کے برمحل استعمال کے لیے ایک مستند لغت کا کام دے سکتا ہے اور شاد کا بیان تھا کہ استاد نے اپنے کلام کو جملہ عیوب سے پاک رکھا اور جس لفظ کو خلاف محاورائے فصحائے حال دیکھا، اسے ترک کر دیا۔ اس لحاظ سے عرش کی یہ اصلاحیں بہت قیمتی ہیں۔

غالبیات کے ضمن میں چند متون کا ذکر گزشتہ صفحات میں آ چکا ہے۔ یہاں ضمنی طور پر غالب کے کلیات فارسی کے قدیم ترین نسخے ''میخانہ آرزوے سر انجام'' کا حوالہ دیا جا سکتا ہے، جو مسلم ضیائی کو کتب خانہ انجمن ترقی اُردو کراچی سے دستیاب ہوا۔ اب تک قاضی عبدالودود کی تحقیق کے مطابق اس تصنیف کا قدیم ترین نسخہ ۱۱ ربیع الاول ۱۲۵۴ھ کا مکتوبہ تھا لیکن انجمن کا یہ نسخہ ۱۰ شعبان ۱۲۵۳ھ کا مکتوبہ ہے۔ اس نسخے کی خصوصیات کے تذکرے پر مشتمل ایک مقالہ مسلم ضیائی نے تحریر کیا ہے (''اُردو'' جنوری ۱۹۶۸ء)۔

(ب) نثر

نثری متون کی دریافت و تعارف کے تعلق سے بھی سخاوت مرزا کا کام مثالی ہے۔ اس سلسلے میں ان کا ایک مبسوط اور اہم مقالہ ''خوان یغما دکھنی'' پر ہے جو دراصل سید شاہ طاہر حموی کرنولی کا ایک نصاب صبیان ہے (''اُردو'' جنوری و اپریل ۱۹۵۳ء) فاضل مقالہ نگار نے خاصی محنت کے ساتھ مصنف کے حالات و آثار عصری مآخذ سے یکجا کیے ہیں اور فارسی و اُردو نصابوں کا ایک تحقیقی اور تاریخی جائزہ لے کر یہ طے کیا ہے کہ اُردو میں سب سے پہلا کونسا نصاب مرتب ہوا۔ ان کی رائے میں جو ڈاکٹر زور اور محمود شیرانی کی تردید میں اور مولوی عبدالحق کی تائید میں ہے، ''مثل خالق باری'' مصنفہ جے چند (تصنیف ۹۶۰ھ) اُردو کی اولین نصابی کتاب ہے۔ گزشتہ اوراق میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ اس تصنیف کو افسر امروہوی نے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔

دکنی نثر کی ایک کتاب ''انوار العاشقین'' سید حسین علی شاہ قادری نے تصنیف کی تھی، یہ مصنف ''خوان یغما'' کے والد شاہ عبداللطیف حموی کرنولی کے سلسلہ مریدی سے وابستہ تھے۔ اس تصنیف کا ایک کم یاب نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ اس کے اقتباسات سخاوت مرزا نے اپنے تحریر کردہ تعارف کے ساتھ نقل کیے ہیں (''اُردو نامہ'' جولائی ۱۹۷۲ء) سخاوت مرزا نے فارسی و اُردو کی ایک قدیم لغت ''کثیر الفوائد'' سے بھی متعارف کرایا ہے (''اُردو نامہ'' دسمبر ۱۹۶۶ء) یہ مولانا شاہ محی الدین کی تالیف ہے جو دکن کے ایک فاضل بزرگ تھے اور ۱۸۲۷ء تک بہ قید حیات رہے۔ اس تالیف کا نادر مخطوطہ بھی کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

دکنی مزاحیہ مسجع نثر پر مشتمل ''جنگ نامہ بنگی خان'' کا تعارف بھی سخاوت مرزا کے طفیل ہوا۔ اس کا ایک نسخہ کتاب خانہ آصفیہ میں موجود ہے جو ۱۲۷۵ھ کا مکتوبہ ہے۔ نسخے کا مصنف نامعلوم ہے لیکن اس نے اسے ۱۷۰۳ء میں لکھا۔ مقالے میں اس تصنیف کی خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ (''اُردو نامہ'' جولائی ۱۹۷۴ء)۔

یہاں ضمنی طور پر سخاوت مرزا کے ایک مفصل مقالے کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے جو انھوں نے ''ایک طالب علم'' کے فرضی نام سے سید نصیر الدین ہاشمی کی مرتبہ توضیحی فہرست مخطوطات کتب خانہ نواب سالار جنگ کے تحقیقی و تنقیدی جائزے پر مشتمل تحریر کیا تھا (''اُردو'' اپریل ۱۹۵۷ء)۔ اس طرح کا ایک اور مفید مقالہ وہ ڈاکٹر زور کی مرتبہ ''فہرست مخطوطات ادارہ ادبیات اُردو'' جلد اول پر بھی لکھ چکے تھے۔ (''ہندوستانی ادب'' حیدر آباد دکن، جنوری ۱۹۴۶ء)۔ سخاوت مرزا نے مذکورہ مقالے میں ایک تو ان اغلاط کی نشاندہی کی ہے جو نصیر الدین ہاشمی سے ہوئی ہیں اور دوسرے، مخطوطات اور مصنفین پر نئی معلومات بھی فراہم کی ہیں۔

ابتدائی اُردو کے نمونوں کی تلاش محققین کا ایک بیش قیمت کام ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے شیخ وجیہہ الدین گجراتی (متوفی ۹۷۰ھ) کے اُردو ملفوظات کا سراغ ایک مخطوطے میں لگایا جو ''بحر الحقائق'' کے علاوہ ہے جس میں شامل اُردو ملفوظات کے حوالے شمس اللہ قادری کی تصنیف ''اُردوئے قدیم'' اور مولوی عبدالحق کی تصنیف ''اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام'' میں ملتے ہیں۔ اس مخطوطے میں جو مرزا محمد کا مکتوبہ ہے، ان کے ایسے ملفوظات ہیں، جن میں جا بجا اُردو کے فقرے ملتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ان عبارتوں کو اپنے مقالے ''ملفوظات شیخ وجیہہ الدین گجراتی (''معارف'' اعظم گڑھ، جون ۱۹۵۰ء) میں نقل کیا ہے۔

ڈاکٹر نجم الاسلام نے شمالی ہند کی ابتدائی اُردو نثر کی تین غیر مطبوعہ کتابوں کا تعارف کرایا (''نقوش'' شمارہ: ۱۰۵) ان کتابوں کا ذکر ادب کی کسی تاریخ میں ضمناً بھی نہیں آیا تھا۔ یہ تینوں متن بارھویں صدی ہجری سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک شاہ حاتم کا ''نسخہ مفرح الضحک'' ہے جس میں طبیبوں کے نسخوں کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ یہ غیر مطبوعہ تحریر ۱۱۷۴ھ سے قبل کی ہے۔ دوسری تحریر ''دیباچہ تفسیر مرادیہ'' (زمانہ تحریر ۱۱۸۵ھ) جو تفسیر شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی کی تفسیر پارہ عم پر لکھا گیا

تھا۔ تفسیر کئی مرتبہ چھپی ہے لیکن دیباچہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ تیسری تصنیف ''قصہ و احوال روہیلہ'' ہے، جس کا مصنف سید رستم علی بجنوری ہے۔ یہ بھی غیر مطبوعہ ہے اور فاضل مقالہ نگار کے مطابق اُردو میں کتب تواریخ میں قدیم ترین ہے۔

انجمن ترقی اُردو کراچی کے کتب خانے میں سید حسن لطافت کا ایک روز نامچہ ''فرمان سلیمانی'' ہے جس کا تذکرہ مشفق خواجہ نے تفصیل سے اپنے ''جائزہ مخطوطات اُردو'' جلد اول میں کیا تھا، پھر اس کے تعارف پر مشتمل ایک نہایت جامع و مفصل مقالہ تحریر کیا (''نذر حمید'' مرتبہ مالک، دہلی، ۱۹۸۱ء)۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اودھ کے حکمران امجد علی شاہ کے فرزند مرزا سلیمان قدر جو شاعر بھی تھے، سید حسن لطافت کے شاگرد تھے۔ ''فرمان سلیمانی'' مرزا سلیمانی قدر کا روز نامچہ ہے، جسے لطافت لکھتے رہے۔ یہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں لکھنؤ کے بعض شعرا اور دیگر اہم شخصیات کے بارے میں مفید معلومات ملتی ہیں اور اس سے اواخر انیسویں صدی کے لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت سے واقفیت ہوتی ہے۔

(ج) تذکرے

تذکروں کے ضمن میں جو اہم تعارف یہاں لکھے گئے ہیں، ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ضخیم تصنیف ''اُردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری'' سے قطع نظر، کہ جس کا ذکر آئندہ اوراق میں آئے گا، ایک اہم تعارف سخاوت مرزا کا تحریر کردہ ہے (''اُردو'' جنوری ۱۹۵۸ء)۔ یہ بہ ظاہر نقش حیدرآبادی کے تذکرے ''عروس الاذکار'' کے تعارف میں ہے جو فاضل مقالہ نگار کی یادداشتوں پر منحصر ہے لیکن ان مفصل اور معلوماتی یادداشتوں سے قطع نظر، اس میں ان تذکروں کا مختصر تعارف بھی ہے جو دکن میں لکھے گئے۔ آخر میں ان تذکروں کی فہرست بھی درج کی گئی ہے۔

اس عرصے میں جو تذکرے دریافت ہوئے، ان میں سے ایک ''تذکرہ بشیر'' ہے جسے بہاء الدین بشیر نے دراصل ناسخ کے ''سخن شعرا'' کے تراجم کے ذیل میں حواشی پر کسی اضافے یا ترمیم یا تردید میں لکھا تھا ''سخن شعرا'' کا یہ نسخہ انجمن کراچی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ مشفق خواجہ نے اسے ''تذکرہ بشیر'' کے نام سے مرتب کرلیا ہے، جسے وہ شائع کرنا چاہتے ہیں۔ اس تذکرے کا تعارف ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی مذکورہ تصنیف سے ہوتا ہے لیکن اس کے مندرجات بہ سلسلہ تلامذہ غالب، جب مجلّہ ''اُردو'' غالب نمبر، جنوری ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئے، تو اس تذکرے کا تعارف بھی ہوا۔

خیراتی لعل جگر کا تحریر کردہ ''تذکرہ بے جگر'' بھی اس عرصے میں متعارف ہوا۔ اس کا غالباً واحد نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانے میں موجود ہے اس تذکرے کا ایک مفصل تعارف ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے تحریر کیا ہے (''نقوش'' جولائی ۱۹۷۳ء) اس تعارف سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی اسے مرتب کر رہے ہیں۔

(۵) متفرق تحقیقی کام

(ا) شخصیات

قدیم ادبی شخصیات میں سے دکنی شخصیات پر بالخصوص زیادہ کام ہوا ہے۔ گو دکنی عہد سے قبل اور دکنی شخصیات کی معاصر ادبی شخصیات پر بھی محققین نے توجہ دی ہے لیکن یہاں اولاً دکنی شخصیات پر ہونے والے تحقیقی کام کا جائزہ زیادہ مناسب ہے تاکہ ربط موضوع برقرار رہ سکے۔ اس ضمن میں بھی جناب سخاوت مرزا نے نمایاں اور مستقل کام کیا ہے۔ ''مجلّہ اُردو'' میں ''غواصی'' (اکتوبر ۱۹۵۴ء) ''خروشی'' معاصر ولی (جنوری ۱۹۶۰ء) اور ''سید شاہ عبدالقادر قادری کرنولی'' (جولائی ۱۹۵۹ء) ان کے تعارف اور ان کے کلام اور ان کی علمی خدمات کے جائزے پر مبنی ہے۔ مشتاق کے بہمنی ہونے پر ان کا مقالہ ''کیا مشتاق بہمنی دور کا شاعر نہیں تھا (جنوری ۱۹۵۹ء) ہے۔ بھارت کے ایک فاضل محقق ڈاکٹر نذیر احمد نے مجلّہ ''اُردو'' میں ان کے ایک مقالے ''قدیم اُردو کی ایک نایاب بیاض'' (اپریل ۱۹۵۴ء) میں بہمنی دور کے اس شاعر کے متعلق اپنے ایک مقالے (''اُردو ادب'' جون ۱۹۵۸ء) میں یہ رائے قائم کی تھی کہ مشتاق بہمنی دور کا نہیں بلکہ قطب شاہی یا عادل شاہی عہد کا تھا۔ سخاوت مرزا نے اس اعتراض کے جواب میں اس مقالہ میں اس کے بہمنی ہونے پر شواہد یکجا کیے ہیں۔

''اورینٹل کالج میگزین'' میں ان کا ایک مقالہ منشی غلام حسین جوہر بیدری (نومبر ۱۹۶۴ء) پر ہے جو دکن کے مشہور شاعر، ادیب اور مورخ تھے لیکن ان کے تفصیلی حالات اور کارنامے معروف نہیں۔ اس مقالے میں تحقیق سے ان کے حالات اور کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ''محمد زین العابدین خان المتخلص بہ دیوان نایطی'' (فروری ۱۹۵۹ء) اور ''شاہ راجو قتال گولکنڈوی'' (نومبر ۱۹۶۳ء) کے حالات اور ان کی شاعری پر بھی انھوں نے مقالات لکھے۔ ''صحیفہ'' میں رائے

گلاب چند ہمدم حیدر آبادی کے حالات اور ان کی شاعری پر ان کا مقالہ ہے (اکتوبر ۱۹۶۸ء)۔ ''اُردو نامہ'' میں دکنی شخصیات پر ان کے مقالات بہ کثرت شائع ہوئے۔ ان میں سے ''میر غلام مصطفیٰ سخن اورنگ آبادی'' (جولائی ۱۹۶۸ء) ''والہ موسوی'' (ستمبر ۱۹۷۱ء) ''ولی محمد عقلان'' (اپریل ۱۹۷۲ء) اور شیخ محمود چشتی کی نظم ونثر (جنوری ۱۹۶۲ء) پر ان کے مقالات، ان کے حالات شاعری اور تصانیف کے جائزے پر مشتمل ہیں۔ ایک مقالہ ''میراں جی شمس العشاق کی تاریخ وصال'' کے تعین میں ہے (جنوری ۱۹۶۸ء) ان کی تاریخ وصال اور بیجاپور میں کس بادشاہ کے عہد میں وارد ہونے کے بارے میں مورخین اور مصنفین کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ جناب سخاوت مرزا نے ''بساطین السلاطین'' مولفہ غلام مرتضیٰ کے ایک خاص قلمی نسخے کے حوالے سے جو ان کی ملکیت میں تھا، ان کے ورود بیجاپور کا سنہ ۹۶۷ھ طے کیا ہے اور وصال ۹۷۰ھ میں ہونے کی تحقیق کی ہے۔

اسی طرح کا ایک مقالہ شاہ کمال کڑامانک پوری مولف تذکرہ ''مجموعۃ الانتخاب'' کے سنہ وفات کی تحقیق پر ہے (اپریل ۱۹۶۵ء) ایک غیر متعلقہ مآخذ کی روشنی میں انھیں ان کے بارے میں بس اتنا معلوم ہوا کہ وہ ۱۲۴۸ھ تک کرنول میں موجود تھے، اس کے بعد ہی ان کا انتقال ہوا ہے۔ ''اُردو ادب'' میں ان کا ایک مقالہ رؤف احمد خان برتر مدراسی، شاگرد داغ کے حالات، شاعری اور تصنیفات کے جائزے پر ہے (شمارہ ۱، ۱۹۶۲ء)۔

دیگر محققین میں سے تحسین سروری نے ''شیخ سعدی ہندی'' (''اُردو نامہ'' اپریل ۱۹۶۲ء) اور ''سراج اور پروانہ'' (''اُردو'' اپریل ۱۹۵۱ء) پر تحقیقی نظر ڈالی اور ان کے تعلق سے چند غلط فہمیوں کی تردید کی۔ شفقت رضوی نے سراج اور معاصرین سراج کو موضوع بنایا۔ ان کی متعارفہ فتوت کی ایک مثنوی کا ذکر گزشتہ اوراق میں آچکا ہے۔ سراج کے ایک اور معاصر ''عارف الدین خان عاجز'' کی حیات اور کلام پر بھی ایک تحقیقی مقالہ انھوں نے لکھا (''اُردو نامہ'' جون ۱۹۷۵ء) اُردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ ماہ لقا بائی چندا پر ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے توجہ دی اور اس کے حالات اور اس کی شاعری کو موضوع بنایا۔ اورینٹل کالج میگزین (فروری ۱۹۶۰ء) محمد احسان اللہ نے ۱۹۷۴ء میں پروفیسر سید محمد کی نگرانی میں ہاشمی بیجاپوری پر مقالہ لکھا تھا، یہ مقالہ اب شائع ہوا ہے (لاہور، ۱۹۷۸ء) اور مصنف نے تازہ تحقیقات کی روشنی میں اس میں متعدد اضافے کیے ہیں۔

دکنی شخصیات میں جو شہرت و مقبولیت ولی کے حصے میں آئی، وہ کسی اور کو نصیب نہ ہوئی۔ محققین نے اچھی خاصی تگ و دو سے اس کے تعلق سے بعض موضوعات کو بالخصوص اہمیت دی ہے۔ مثلاً اس کی وطنیت کا مسئلہ محققین کے لیے الجھن کا باعث رہا۔ یہ مسئلہ قدیم تذکرہ نگاروں کے پیش نظر بھی رہا تھا جس کا اشارہ شفیق کے تذکرہ ''چمنستان شعرا'' سے ملتا ہے، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان اپنی تحقیق کے مطابق اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ولی دکنی نہیں گجراتی تھا۔ (''ساقی کراچی ۱۹۵۴ء) لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی کا یہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح غالب کی نسبت اکبر آباد سے اور مولوی نذیر احمد کی بجنور سے تھی لیکن دراصل وہ دہلوی ہو گئے تھے، اسی طرح ولی بھی دکنی ہو گئے۔ پھر خود ولی نے اپنے آپ کو ''شاعر ملک دکھن'' کہا ہے (''تاریخ ادب اُردو'' جلد اول صفحہ ۵۳۴)۔ اسی طرح ولی کے نام کے بارے میں بھی محققین متفق نہ رہے۔ ان کا ایک مفصل جائزہ محمد اکرام چغتائی نے تحریر کیا ہے (''اُردو نامہ'' ستمبر ۱۹۶۶ء)۔ ان کے اس مقالے سے اس موضوع پر متعدد معروف و غیر معروف مآخذ سامنے آتے ہیں۔ فاضل محقق ان تمام آرا کے جائزے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ''ولی اللہ'' بہر حال ولی کے نام کا لازمی جزو ہے اور ان کے خیال میں ولی کا پورا نام محمد ولی اللہ تھا۔

ولی کے سنہ وفات پر بھی محققین نے خاص توجہ دی ہے اولاً اس مسئلے کو مولوی عبدالحق نے اہمیت دی تھی۔ ان کے خیال میں ۱۱۱۹ھ میں ولی کا انتقال ہوا تھا ''اُردو'' (جنوری ۱۹۲۴ء) بعد میں یہ بحث محمد یحییٰ تنہا کے حصے میں آئی، جو ۱۱۵۵ھ کو درست سمجھتے رہے۔ اس موضوع پر انھوں نے اولاً ''مراۃ الشعرا'' جلد دوم میں اظہار خیال کیا، جس پر مولوی عبدالحق نے ایک تردیدی مضمون لکھا (''اُردو'' جنوری ۱۹۵۱ء) اور ۱۱۵۵ھ کو غلط قرار دیا۔ اس کے جواب میں یحییٰ تنہا نے اپنا مضمون ''ولی کا سنہ وفات'' لکھا (''اُردو'' اپریل ۱۹۵۱ء) اور ۱۱۵۵ھ پر مزید اصرار کیا۔ اس بحث میں مولوی عبدالحق کی تائید میں قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی اور حفیظ ہوشیار پوری نے بھی حصہ لیا۔ بعد میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس موضوع پر مستقل تحقیق کی (''اورینٹل کالج میگزین'' صد سالہ نمبر ۲، ۱۹۷۲ء) ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کے مطابق جلوس محمد شاہی کے دوسرے سال ولی کا دیوان دہلی آیا تو اس وقت ولی زندہ تھے۔

ولی کے تعلق سے جو مزید پہلو تحقیق طلب تھے، ان میں سے ایک ولی اور شاہ سعد اللہ گلشن کی ملاقات، سنہ ملاقات اور جائے ملاقات بھی ہے۔ کوئی سیر حاصل تحقیق اس مسئلے پر نہیں کی گئی تھی۔ محمد اکرام چغتائی نے اس طرف توجہ دی۔ ان کا مقالہ ''ولی گجراتی اور شاہ سعد اللہ گلشن'' (''اُردو نامہ'' مارچ ۱۹۶۶ء) ایک وقیع تحقیقی کاوش ہے۔ اس میں شاہ گلشن کے حالات پر بھی محققانہ معلومات ملتی ہیں۔ ان کے مطابق شاہ گلشن ۱۰۹۸ھ میں گجرات اور دیگر وبا کی دکن کی سیر و سیاحت کے لیے نکلے تھے اور ۱۱۲۰ھ تک دکن کے مختلف شہروں کی سیر و سیاحت میں مصروف رہے۔ فاضل مقالہ نگار کی تحقیق کے مطابق ان دونوں کی ملاقات احمد آباد گجرات میں

ہوئی اور یہ ملاقات ۱۱۰۰ھ اور ۱۱۰۵ھ کے درمیان کسی سنہ میں ہوئی۔

دکن کے علاوہ شمالی ہند اور دیگر علاقوں کی شخصیات پر بھی محققین نے توجہ دی ہے۔ ۱۹۷۵ء میں امیر خسرو تقریبات کا انعقاد ہوا، ان کی مناسبت سے متعدد کتابیں امیر خسرو کی سوانح، ان کے عہد اور ان کے علمی کمالات پر شائع ہوئیں، ان کی تصانیف اور کلیات کے نئے ایڈیشن مرتب ہوئے، متعدد رسائل نے خاص نمبر شائع کیے، جن میں کئی تحقیقی پہلوؤں اور عہد اور معاصرین کو موضوع بنایا گیا ہے۔ خسرو کی اُردو شاعری بھی تحقیق کا موضوع بنی۔ اس موقع پر شائع ہونے والی کتابوں میں سب سے اہم ممتاز حسین کی تصنیف ''امیر خسرو حیات اور شاعری'' (کراچی، ۱۹۷۵ء) ہے۔ خسرو کی حیات و تصنیفات پر اب تک بلاشبہ سب سے وقیع کام ڈاکٹر وحید مرزا کا تھا لیکن یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ ممتاز حسین کی اس تصنیف کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خسرو کی حیات و شاعری کا تنقیدی اور تحقیقی دونوں سطح پر مطالعہ کیا گیا ہے۔

اُردو شاعری کے ضمن میں محمود شیرانی نے امیر خسرو کی مبینہ تصنیف ''خالق باری'' کے امیر خسرو کی تصنیف نہ ہونے پر داد تحقیق دی تھی۔ ان کی تحقیق کے مطابق خالق باری کا اصل نام ''حفظ اللسان'' ہے۔ یہ بابائے اسحاق قادری (حلوائی) کی فرمائش پر کسی ضیاء الدین خسرو (نہ عہد جہانگیر) نے تصنیف کی تھی۔ ممتاز حسین کی تحقیق کے مطابق ''خالق باری'' کا اصل نام ''حفظ اللسان'' نہیں ہے۔ انھوں نے قیاس کیا ہے کہ یہ امیر خسرو کی تصنیف ہے۔

خسرو پر یہ مفصل تصنیف تحقیقی مزاج کی حامل ہے لیکن تحقیق کے حق کو اس نے کس حد تک ادا کیا ہے، اس بارے میں دو آراء ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ اس تصنیف کے متعدد بیانات کی روشنی میں صباح الدین عبدالرحمٰن کا مبسوط مقالہ بھی لائق مطالعہ ہے جو اسلام آباد سے بہ صورت کتاب ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا ہے ''خالق باری'' کے تعلق سے جناب افسر امروہوی نے بھی ایک مفصل مقالہ تحریر کیا ہے (''اُردو'' خسرو نمبر ۱۹۷۵ء) اور محمود شیرانی کے پیش کردہ ان شواہد کی تردید کی ہے، جن کی بنیاد پر انھوں نے اسے عرف خالق باری اور کسی ضیاء الدین خسرو کی تصنیف قرار دیا تھا۔ مقالہ بہت طویل ہے اور محققانہ شان سے لکھا گیا ہے۔

ولی کی معاصر، شمالی ہند کی شخصیات پر جو کام ہوا ہے، وہ بیش تر مقالات کی صورت میں ہے۔ ان میں سے متعدد مقالات مبسوط اور وقیع ہیں اور اپنے موضوع کے تعلق سے اہمیت رکھتے ہیں۔

چنانچہ شاہ مبارک آبرو پر محمد زکریا مائل (''اُردو نامہ'' اپریل، ۱۹۶۱ء) اور کلب علی خان فائق (''اورینٹل کالج میگزین'' مئی اور اگست ۱۹۶۰ء) نے اشرف علی خان فغاں پر، سید نقی احمد ارشاد (''صحیفہ'' جولائی ۱۹۶۶ء) نے عبدالحیٔ تاباں پر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان (''اُردو'' اپریل ۱۹۵۴ء) اور کلب علی خان فائق (''صحیفہ'' اکتوبر ۱۹۶۲ء) نے عمدہ مقالے لکھے۔ کلب علی خان فائق نے بڑی مستعدی اور لگن سے تحقیقی کام کیے ہیں۔ ان کے موضوعات تحقیق بہت متنوع ہیں۔ آبرو اور تاباں کے علاوہ نواب امیر خان انجام (''اورینٹل کالج میگزین'' نومبر ۱۹۶۰ء) جعفر علی حسرت (''صحیفہ'' جولائی ۱۹۶۷ء)، جرات (ایضاً جنوری ۱۹۶۲ء و اپریل ۱۹۶۲ء)، خواجہ حسن، شاگرد جعفر علی حسرت (''صحیفہ'' جولائی ۱۹۶۷ء) اور ممنون (ایضاً جنوری ۱۹۶۷ء) پر ان کے مفصل مطالعے اور ان کے علاوہ ''تاریخ کی صحیح عمر'' (ایضاً مارچ ۱۹۵۸ء) پر ان کا مقالہ ان کے معیاری کام ہیں۔ میر ان کا ایک محبوب موضوع ہے۔ پاکستان میں ''کلیات میر'' کو ڈاکٹر عبادت بریلوی نے بھی مرتب کیا ہے لیکن اس کی ترتیب میں تصحیح متن کے تقاضے نظر نہیں آتے۔ یہاں یہ کام کلب علی خان فائق نے کیا ہے۔ ان کے مرتبہ ''کلیات میر'' کو مجلس ترقی ادب نے شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے مرتبہ کلیات پر انھوں نے ایک تنقیدی نظر ڈال کر اس کی کمزوریوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔ (''صحیفہ'' جولائی ۱۹۶۲ء) میر پر ان کے مقالات میں ''میر کے ادبی معرکے'' (ایضاً ستمبر ۱۹۵۷ء) ''میر ایک نقاد'' (ایضاً، دسمبر ۱۹۵۸ء) ''میر کا ایک قصیدہ'' (''اُردو'' جنوری ۱۹۶۸ء) ہیں۔ آخر الذکر مقالے میں میر کے ایک رائیہ قصیدہ:

ہوا کیے ہیں ز بس شکوہ فلک تحریر
سیہ ہے کاغذ مشقی کے رنگ لوح ضمیر

کے بارے میں دیگر محققین سے اختلاف کرتے ہوئے بحث کی ہے کہ یہ عماد الملک کی مدح میں لکھا گیا ہے۔ ان کا ایک مقالہ ''حیات میر'' جو ''دلی کالج میگزین'' (دلی، میر نمبر) میں شامل ہے اہمیت رکھتا ہے، اس میں کئی مباحث پر فاضل مقالہ نگار نے اظہار خیال کیا ہے۔ مثلاً میر کی ولادت کے سنہ کے بارے میں جو اختلاف پایا جاتا ہے، اس پر طویل بحث کے بعد ۱۱۳۶ھ کو درست تسلیم کیا ہے۔

عہد میر و سودا سے قبل کے دیگر مطالعوں میں مرزا مظہر جان جاناں کے تعلق سے شاہ غلام علی دہلوی جانشین مظہر کی تصنیف ''مقامات مظہری'' بہت اہم ہے۔ اس کو اس عہد کے حالات، مرزا مظہر کی سوانح، ان کے علمی کمالات، ان کی شاعری اور ان کے خلفا کے لیے ایک ناگزیر مآخذ کی حیثیت دی جاتی ہے۔ یہ کتاب

فارسی میں تھی، اسے اُردو میں محمد اقبال مجددی نے تحریر کیا ہے لیکن کمال محنت و تحقیق سے اس تصنیف کی اہمیت اور افادیت کو دوگنا کر دیا ہے۔ ترجمہ کے ساتھ ساتھ فاضل مترجم و محقق نے مفصل مقدمہ، مفید حواشی اور تعلیقات لکھ کر اس کے متعلقہ دیگر موضوعات کے علاوہ مرزا مظہر، ان کے عہد کے اُردو ادب اور معاصرین شعرا و خلفا کے بارے میں بھی قیمتی معلومات یک جا کی ہیں۔ مرزا مظہر سے قطع نظر اس عہد کے ادب و شاعری کے تعلق سے بھی یہ ترجمہ بہت مفید ہے۔ (لاہور، ۱۹۸۳ء)۔

میر و سودا کے دور پر ثناء الحق صدیقی کی مبسوط تصنیف ''میر و سودا کا دور'' (کراچی، ۱۹۶۵ء) بھی اہمیت رکھتی ہے۔ فاضل مصنف نے اس میں اس عہد کے تقریباً تمام معروف اور اہم شعرا کے حالات اور ان کی شاعری کا احاطہ کیا ہے میر پر علیحدہ سے کوئی موقر کام پاکستان میں نہیں ہوا، سوائے اس کے کہ رسالہ ''ساقی'' کراچی اور ''نقوش'' نے میر پر خاص نمبروں کا اہتمام کیا ہے۔ جس میں سے موخر الذکر کی خصوصی اشاعت تین ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ لیکن ان میں کوئی نئی تحقیقی دریافت یا کوئی تحقیقی کاوش کسی پاکستانی محقق کے قلم سے سرزد نہیں ہوئی۔ میر پر ڈاکٹر سید عبداللہ کی تصنیف ''نقد میر'' صرف تنقیدی لحاظ سے اہم ہے۔ تحقیق و تنقید کے امتزاج کی حامل ایک کتاب ڈاکٹر جمیل جالبی کی ہے جو انجمن ترقی اُردو سے ''بابائے اُردو یادگاری خطبہ'' کے طور پر منظر عام پر آئی ہے لیکن دراصل یہ خطبہ ڈاکٹر صاحب کی ''تاریخ ادب اُردو'' جلد دوم، فصل پنجم کے دوسرے اور تیسرے باب پر مبنی ہے۔ ''تلامذہ میر'' پر مولانا امداد صابری کی تصنیف اگرچہ پاکستان میں شائع ہوئی ہے لیکن فاضل مصنف ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ تلامذہ میر پر پاکستان کے ایک محقق فاضل زیدی نے بھی ایک مقالہ لکھا ہے۔ (''دلی کالج میگزین'' دہلی، میر نمبر) اور ۳۵ شاعروں کا ذکر کیا ہے، جنھوں نے میر سے اصلاح لی۔

سودا پر بھی خاطر خواہ کام یہاں نہیں ہوا۔ صرف دو تین کاموں کا یہاں حوالہ دیا جا سکتا ہے، جن میں سے ایک اس کے کلیات کی تدوین ہے جو ڈاکٹر شمس الدین صدیقی کی محنت کا نتیجہ ہے، اسے مجلس ترقی ادب نے شائع کیا۔ اسے تمام متداول نسخوں کی مدد سے ڈاکٹر صاحب نے مرتب کیا ہے اور ایک فاضلانہ مقدمہ تحریر کیا ہے۔ ان کا ایک مقالہ اس ضمن میں ''تصانیف سودا کی تدوین اور اشاعت، ایک تحقیقی جائزہ'' (''اورینٹل کالج میگزین'' جشن صد سالہ نمبر ۱۹۷۴ء) دراصل ان کے مذکور مقدمے کی ایک صورت ہے۔ دوسرا قابل ذکر کام کلب علی خان فائق کا تحقیقی مقالہ ''حیات سودا'' (''صحیفہ'' جنوری تا اکتوبر ۱۹۶۸ء) ہے، جس میں بہت تفصیل سے سودا کی زندگی کے حالات اور اس کی خدمات زبان و شاعری پر نظر ڈالی گئی ہے اور اس سلسلے میں محققین کی غلط بیانیوں کی نشاندہی اور ان کی تصحیح کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ نادم سیتاپوری کا ایک مقالہ ''سودا کا پنجابی کلام'' (''افکار'' کراچی ۱۹۶۴ء) بھی قابل ذکر ہے۔ اس میں مختصراً ندوی کے حالات زندگی اور سودا سے اس کی معرکہ آرائیوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ اسی معرکہ آرائی کے سلسلے میں سودا نے ندوی کی ایک ہجو پنجابی زبان میں لکھی تھی۔ نادم سیتاپوری نے معاصرین میر میں سے ایک گم نام شاعر ''مرمت خان مرمت'' پر بھی ایک فاضلانہ مقالہ تحریر کیا۔ (''نقوش'' نومبر ۱۹۶۴ء) مرمت صاحب دیوان ہونے کے باوجود قدیم اور جدید تذکرہ نگاروں کی نظر سے دور رہا۔ اس کے دیوان کا قلمی نسخہ فاضل مقالہ نگار کو دستیاب ہوا، جس کے نتیجے میں تلاش بسیار کے بعد اس کے حالات زندگی بھی معلوم کر کے انھوں نے ترتیب دیے۔

اس عہد کے بعض اہم شاعروں پر مشفق خواجہ نے خاصی دل جمعی اور تحقیق سے مقالات لکھے اور ان کے تعلق سے تمام ضروری معلومات مستند مآخذ کی مدد سے یک جا کیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے جسونت سنگھ پروانہ (''غالب'' کراچی جنوری ۱۹۷۵ء) ثناء اللہ (ایضاً اپریل ۱۹۷۵ء) فضل علی ممتاز (ایضاً جولائی ۱۹۷۵ء) خواجہ احسن اللہ خان بیان (جنوری ۱۹۷۶ء) (ایضاً شاہ قدرت اللہ قدرت ''مجلۂ تحقیق جلد ۱ شمارہ ۱) اور قزلباش خان امید (اُردو، اپریل ۱۹۷۷ء) پر مبسوط مقالات تحریر کیے۔ یہ واقعہ ہے کہ کسی شاعر کی زندگی کی صحیح اور مکمل تصویر پیش کرنے میں مطالعے کی وسعت اور گہرائی کا جس قدر مظاہرہ اپنے مقالات میں کلب علی خان فائق اور مشفق خواجہ نے کیا ہے، اس کی بہت کم مثالیں دوسرے محققین کے ہاں ملتی ہیں۔ یہ حضرات شاعر کے کلام کو اس قدر توجہ سے پڑھتے ہیں کہ وہی ان کے لیے ایک اہم مآخذ بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے بھی اس انداز کے مقالات لکھے تھے، چنانچہ فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میر شیر علی افسوس، حیدر بخش حیدری، میر بہادر علی حسینی ان کے مقالات کا موضوع بنے (مشمولہ ''کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ'') شیر علی افسوس پر سید تقی احمد نے بھی ایک مقالہ (''ساقی'' جولائی ۱۹۶۳ء) لکھ کر مورخوں کی غلط فہمیوں کی نشاندہی کی تھی۔ میر حسن، ڈاکٹر وحید قریشی کا اہم موضوع ثابت ہوا۔ اس پر ان کی تصنیف ''میر حسن اور اس کا زمانہ'' (لاہور ۱۹۵۹ء) اہم اور مستقل تصنیف ہے۔ میر حسن پر اس سے قبل محمود فاروقی نے ایک کتاب ''میر حسن اور خاندان کے دوسرے شعرا'' (لاہور ۱۹۵۶ء) لکھی تھی۔ لیکن یہ مفید معلومات کی حامل ہونے کے باوجود تحقیق کے تقاضوں سے مبرا اور استناد سے عاری تھی۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنی ضخیم تصنیف میں میر حسن کے حالات زندگی، خاندان و معاصرین، تصانیف اور شاعری بالخصوص ''سحر البیان'' پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ اسے اپنے موضوع پر اب تک سب سے اہم تصنیف کہا جا سکتا ہے۔

مصحفی پر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے سب سے پہلے توجہ دی تھی۔ ان کی تصنیف ''مصحفی اور ان کا کلام'' (لاہور، مصحفی پر پہلا مبسوط کام ہے۔ گو اس کی تحقیقی

فروگزاشتوں پر ڈاکٹر وحید قریشی نے تنقیدی نظر ڈالی ہے (''کلاسیکی ادب کا تنقیدی مطالعہ'') لیکن پھر بھی اس سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ ڈاکٹر صاحب کے بعد مصحفی کو افسر امروہوی نے خاطر خواہ اہمیت دے کر دو مبسوط کتابیں تصنیف کیں، ایک ''مصحفی حیات وکلام'' (کراچی ۱۹۷۵ء) جو جامع اور محققانہ مطالعے پر مشتمل ہے اور دوسری ''تلامذہ مصحفی'' (کراچی ۱۹۷۹ء) تلامذہ مصحفی پر افسر امروہوی نے اپنی اول الذکر تصنیف میں بھی ایک باب مخصوص کیا ہے لیکن موخر الذکر تصنیف میں مصحفی کے تقریباً تمام تلامذہ کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔ مصحفی کے تلامذہ پر ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے بھی ایک کتاب لکھی ہے۔ جو پہلے بہ صورت مقالہ 'اورینٹل کالج میگزین' (فروری، اگست ۱۹۷۸ء) شائع ہوئی تھی لیکن یہ کتاب اپنے مندرجات اور مآخذ کے لحاظ سے افسر امروہوی کی مذکورہ کتاب سے مختلف نہیں۔ مصحفی کے ایک شاگرد مرزا حیدر علی کرم لکھنوی پر ایک جامع مقالہ سخاوت مرزا نے تحریر کر کے اس کے حالات اور شاعری پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے (''اُردو'' جولائی ۱۹۵۵ء) یہ صاحب دیوان شاعر تھا لیکن دیوان مطبوعہ نہیں۔ اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے، جس سے فاضل مقالہ نگار نے استفادہ کیا ہے۔

خواجہ میر درد پر پاکستانی محققین نے خاطر خواہ توجہ نہیں دی، صرف ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے انھیں موضوع بنایا۔ ان کے دو مقالات ''خواجہ میر درد کا خاندان'' (''اورینٹل کالج میگزین'' فروری ۱۹۵۸ء) اور ''خواجہ میر درد کے کلام میں تصوف کی تلاش'' (ایضاً مئی ۱۹۵۹ء) قابل ذکر ہیں۔ قائم چاند پوری پر ڈاکٹر اقتدا احسن کا کام وقیع ہے لیکن اس پر ان کا مفصل مطالعہ محض ان مقدمات تک رہا جو ''کلیات قائم'' اور ''مخزن نکات'' پر انھوں نے لکھے۔ اس کے حالات و واقعات پر ان کا علیحدہ مقالہ بہ زبان انگریزی ہے۔ (''اورینٹل کالج میگزین فروری ۱۹۶۵ء) لیکن وہ مذکورہ مقدمات کے مطالب ہی کا احاطہ کرتا ہے۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے مصحفی کے علاوہ نظیر اکبر آبادی اور جرات کے بھی تفصیلی مطالعے کیے۔ ان کی کتابیں ''نظیر اکبر آبادی، ان کا عہد اور شاعری'' (کراچی ۱۹۵۷ء) اور ''جرات ان کا عہد اور عشقیہ شاعری'' (کراچی ۱۹۵۲ء) اپنے موضوع پر پاکستان میں واحد مطالعے ہیں۔ گو نظیر پر مخمور اکبر آبادی کی بھی ایک ضخیم تصنیف موجود ہے لیکن اس کا انحصار تعارف پر زیادہ ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی نگرانی میں رنگین پر ایک معیاری کام ڈاکٹر صابر علی خان نے کیا (کراچی ۱۹۵۶ء) جو رنگین کی حیات وتصنیفات کے مطالعے پر مفصل اور جامع ہے۔ اس عہد کی ایک اور شخصیت حسین شاہ حقیقت پر مشرف احمد نے ''شاہ حسین حقیقت اور ان کا خاندان'' (کراچی ۱۹۷۷ء) لکھی، یہ مفصل اور معلوماتی تو ہے لیکن مستند حوالوں اور مآخذ کی نشاندہی کے نہ ہونے سے اس کا تحقیقی معیار قابل اعتبار نہ رہا۔ ممنون پر کلب علی خان فائق کے مذکورہ مقالے کے علاوہ ڈاکٹر صدیقہ ارمان نے مبسوط کام کیا ہے لیکن ان کا یہ پی ایچ ڈی کا مقالہ شائع نہیں ہوا، صرف اس کے دو اجزاء مجلہ ''اُردو'' میں شائع ہوئے (۱۹۸۰ء)۔

شاہ نصیر پر ڈاکٹر عبدالرزاق نے توجہ دی۔ ان کی زندگی کے چند پہلوؤں پر ان کے مقالات خاصے وقیع ہیں ''شاہ نصیر کے سفر'' (''اُردو'' اکتوبر ۱۹۷۰ء) ''شاہ نصیر اور ذوق کی معرکہ آرائی (ایضاً اپریل ۱۹۷۸ء) ان کے اسی نوعیت کے مقالات ہیں، ذوق، شاہ نصیر سے قبل شاہ نصیر کے ایک شاگرد غلام رسول شوق سے اصلاح لیا کرتے تھے، مگر ان سے غیر مطمئن ہو کر شاہ نصیر سے رجوع ہوئے، ڈاکٹر عبدالرزاق نے غلام رسول شوق پر بھی ایک جامع مقالہ تحریر کیا ہے۔ (غالب، کراچی، اکتوبر ۱۹۷۶ء) ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے بھارت میں شاہ نصیر کا کلیات مرتب کیا ہے جو خوش قسمتی سے پاکستان میں شائع ہوا لیکن ڈاکٹر صاحب نے مقدمے میں جو تسامحات ہوئے تھے ان کے تنقیدی جائزے پر مشتمل ڈاکٹر عبدالرزاق نے ایک مفصل مقالہ لکھ کر ان کی نشاندہی اور تصحیح کی (قومی زبان، کراچی ۱۹۷۲ء) ان کا ایک اور مقالہ شاہ نصیر اور غالب کے مابین روابط کی تحقیق میں ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے اپنے اس مقالے (صحیفہ، اپریل ۱۹۷۳ء) میں مذکورہ موضوع کے علاوہ اس قیاس کا بھی اظہار کیا ہے کہ ممکن ہے کہ غالب نے آغاز سخن میں شاہ نصیر سے اصلاح لی ہو اور پھر ان نکات کا حوالہ دیا ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب نے شاعری میں شاہ نصیر سے کس حد تک اثرات قبول کیے ہیں۔ شاہ نصیر پر فرحت شاہ جہاں پوری نے بھی ایک تعارفی مقالہ تحریر کیا ہے (صحیفہ، نومبر ۱۹۵۹ء) اور اس دور کے ایک اور شاعر اور مصنف سخن دہلوی، مصنف ''سروش سخن'' پر بھی ایک مقالہ تحریر کیا (ایضاً، مارچ ۱۹۵۹ء)۔

اس عہد کے ایک بزرگ غمگین شاہ جہاں آبادی کے بارے میں جو غالب کے خسر الٰہی بخش معروف اور ذوق کے استاد تھے، محمد مسعود احمد نے مقالات لکھ کر نئی معلومات فراہم کیں۔ ان میں سے ایک مقالہ ان کے حالات وشاعری کے بارے میں ہے (اُردو، جنوری ۱۹۶۰ء) اور دوسرا غالب سے ان کے روابط پر روشنی ڈالتا ہے (ایضاً، اکتوبر ۱۹۵۹ء) ان دو مقالات سے قطع نظر فاضل مقالہ نگار نے ایک اور مقالہ (''نوائے ادب'' بمبئی، اپریل ۱۹۶۳ء) لکھ کر غمگین کے حالات و تصنیفات کے جائزے کے ساتھ ساتھ ان کے مآخذ ومراجع کی ایک جامع فہرست بھی مرتب کی ہے۔ پھر غمگین کے نام غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط بھی انھیں دستیاب ہوا، جسے انھوں نے شائع کر دیا (اُردو نامہ، اکتوبر ۱۹۶۴ء) غمگین اور غالب کے خطوط کا ایک مجموعہ غمگین کے ایک خلیفہ سید ہدایت النبی نے ''مکاتیب غمگین وغالب'' مرتب کیا تھا، جن کے اقتباسات محمد مسعود احمد نے اپنے مذکورہ اوّل مقالے میں نقل کیے ہیں لیکن ان خطوط کو جو فارسی میں تھے تصحیح متن کے ساتھ سید وزیر الحسن عابدی اور

ڈاکٹر سید عبداللہ نے مرتب کر کے شائع کیا۔ (اورینٹل کالج میگزین، فروری ۱۹۶۴ء) شاہ غمگین پر ان کا مون کے خود غالب کے تعلق سے اہم باتیں سامنے آئی ہیں۔

مومن پر مستقل کام کلب علی خان فائق نے کیا ہے۔ کلیات کی تدوین کے علاوہ مومن کے حالات زندگی اور شاعری پر ان کی ایک مفصل کتاب ہے (لاہور، ۱۹۶۴ء) جس میں مومن کے عہد، خاندان، زندگی اور شاعری، تصانیف، تلامذہ، احباب و معاصرین کے بارے میں مستند معلومات یک جا کی ہیں۔ ایک ضخیم تصنیف ڈاکٹر عبادت بریلوی کی بھی ہے لیکن اس کا مزاج تنقیدی زیادہ ہے۔ ''مجلّہ نگار'' کا ایک ضخیم شمارہ یہاں شائع ہوا، جس میں متعدد تحریریں تو سابقہ ''مومن نمبر'' کی شامل کی گئیں لیکن چند نئے مقالات بھی اس میں لکھوائے گئے۔

ذوق پر ڈاکٹر تنویر احمد علوی کا مقالہ اور ان کا مرتبہ کلیات پاکستان میں چھپے لیکن یہاں ذوق پر کوئی قابل ذکر کام نظر نہیں آتا، ایک دو مقالے ضرور لکھے گئے جن میں سے ایک آغا محمد باقر کا مقالہ ہے جو ذوق کے فارسی کلام کے بارے میں ہے (ادبی دنیا، لاہور دور پنجم شمارہ دہم) مصنف کے پاس ذوق کی ایک قلمی بیاض تھی، جس میں ذوق کا فارسی کلام بھی درج ہے۔ اس سے ذوق کے مذہبی رجحانات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس بیاض سے معلوم ہوتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کا بیش تر کلام ذوق کا کہا ہوا ہے، اس میں کچھ غزلیں ایسی ہیں جو ذوق نے اپنے تخلص سے لکھیں لیکن بعد میں اپنا تخلص قلم زد کر کے ظفر کا تخلص ڈال دیا۔ اسی طرح اس بیاض کی چند غزلیں ایسی ہیں جن میں ذوق نے اپنا تخلص کاٹ کر معروف تخلص ڈال دیا ہے۔

بہادر شاہ ظفر پر رئیس احمد جعفری کی ضخیم تالیف ''بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد'' (لاہور، ۱۹۵۲ء) بہت مفصل لیکن خام مواد کی حامل ہے۔ اس کے برعکس خواجہ تہور حسین کی تصنیف ''بہادر شاہ ظفر، فن و شخصیت'' (کراچی، ۱۹۶۵ء) تحقیقی انداز رکھتی ہے۔ مفتی انتظام اللہ شہابی کی مختصر تصنیف ''حیات ظفر'' (مطبوعہ کراچی) بالخصوص جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے حوالے سے ہے۔

واجد علی شاہ بھی محققین کی توجہ کا مرکز ہے۔ ان کے تعلق سے رئیس احمد جعفری کی ضخیم تصنیف ''واجد علی شاہ اور ان کا عہد'' (لاہور، ۱۹۵۸ء) مفصل خام معلومات فراہم کرتی ہے۔ اس کے علاوہ واجد علی شاہ کی مثنوی ''حزن اختر'' کے متن کی اشاعت کے علاوہ اس کی خصوصیات و موضوعات کے مطالعے پر مبنی کئی حضرات نے مقالے لکھے۔ ان کی تصنیفات کے جائزے بھی تحریر ہوئے۔ مثلاً ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے ان کی ایک نادر تصنیف ''بنی'' پر مفصل تعارفی مضمون تحریر کیا (نقوش، جوبلی نمبر) ان کی ایک فارسی تصنیف ''پری خانہ'' کو جو ان کی نجی زندگی کے تعلق سے اہم ہے، تحسین سروری نے اُردو میں منتقل کیا لیکن ان سب سے قطع نظر واجد علی شاہ پر جو اہم کام ہوا ہے وہ مرزا علی اظہر برلاس کا مفصل مطالعہ ''واجد علی شاہ اختر'' ہے جو انھوں نے اولاً مبسوط مقالے کی صورت میں مجلّہ ''اُردو'' میں لکھا (قسط وار ۱۹۶۸ء تا ۱۹۷۱ء) اور پھر اسے ترمیم و اضافے کے ساتھ انگریزی میں لکھ کر شائع کیا (کراچی، ۱۹۸۲ء) اس مقالے میں واجد علی شاہ کے حالات زندگی اور زیادہ تر ان کی سیاسی زندگی کو مستند مآخذ کی مدد سے مرتب کیا گیا ہے۔ اگر واجد علی شاہ کے مستند مطالعے کے لیے پروفیسر مسعود حسن رضوی کی تصنیف ''واجد علی شاہ'' ناگزیر کہی جا سکتی ہے تو اس سے بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

غالب ایک عرصے سے محققین کا مقبول موضوع ہے۔ اس کے بارے میں دید و دریافت کی مدت قریب قریب ایک سو سال ہے۔ اس کا ایک سرسری اندازہ ان اشاریوں سے ہو سکتا ہے جو غالبیات پر مرتب ہوئے ہیں۔ پاکستان میں ایک جامع اشاریہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کا ہے جو ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی ہے۔ یہ غالب کی تمام دستیاب غیر مطبوعہ اور مطبوعہ تصانیف کا مفصل اور تحقیقی تذکرہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے کیا کچھ لکھا، وہ کہاں کہاں کس کس صورت میں موجود ہے اور یہ کہ غالب کی کوئی تصنیف اور کلام کس کس صورت میں شائع ہوا ہے۔ پھر اس کے غیر مطبوعہ و غیر مدون کلام کی تلاش و تحقیق کا جو کام اب تک ہوا ہے، اس کا اندراج بھی اس میں موجود ہے۔ اسی اشاریے کو غالب صدی کی مناسبت سے ''مجلس یادگار غالب'' نے شائع کیا ہے (۱۹۶۹ء) ایک اور اشاریہ ''غالب نما'' ابن حسن قیصر نے مرتب کیا ہے (کراچی ۱۹۶۹ء) جو ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۸ء تک کی پاکستانی مطبوعات کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ پاکستان میں غالب پر اب تک جو خاصا کام ہوا ہے، اس کا احاطہ کرنا اس وجہ سے بھی مشکل ہے کہ اس کا بیش تر حصہ کچھ نہ کچھ تحقیقی اہمیت رکھتا ہے۔ پھر اس عرصے میں غالب کی متعدد غیر مدون اور غیر مطبوعہ تحریریں محققین نے دریافت کیں، ان کا جائزہ طوالت کا باعث ہوگا۔ ۱۹۶۹ء تک کی ایسی دریافتوں کو ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے مذکورہ اشاریے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں ذیل میں غالب پر ہونے والے صرف ایسے تحقیقی کام کا جو راقم کے خیال میں اہم ہے اور جو راقم کے پیش نظر رہا ہے، سرسری تذکرہ کیا جاتا ہے۔

غالب کے حالات زندگی پر کوئی بہت اہم اور مستقل تصنیف پاکستان میں نہیں لکھی گئی۔ شیخ محمد اکرام کی ''غالب نامہ'' اور غلام رسول مہر کی ''غالب'' قیام پاکستان سے قبل کی تصانیف ہیں۔ یہ اس وقت تک کی تحقیق کے لحاظ سے مستند اور معتبر تھیں لیکن مالک رام کی تصنیف ''ذکر غالب'' اور قاضی عبدالودود کے مقالات ''جہان غالب'' اور ''غالب بہ حیثیت محقق'' کے بعد بڑی حد تک گنجائش رہی کہ ان میں اضافہ و ترمیم ہو اور حیات غالب کو نئے سرے سے مرتب کیا جائے۔ یہ

کام پاکستان میں اس صورت میں مستقل نہیں ہوا کہ غالب کی زندگی کے مستند حالات کسی نے مرتب کیے ہوں۔ ہاں ایسے مقالات لکھے گئے جو غالب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً غالب کے اجداد کے بارے میں مسلم ضیائی نے غالب کے نانا خواجہ غلام حسین کمیدان کی ایک تحریر اپنے حواشی کے ساتھ نقل کی ('' ماہ نو'' کراچی، فروری ۱۹۶۸ء) جس سے معلوم ہوا کہ خواجہ غلام حسین کے پاس میر حسن زمان نے اپنی ملکیت کا ایک قطعہ باغ گروی رکھا تھا جسے میر حسن زمان نے رقم ادا کر کے ۵ فروری ۱۸۰۹ء کو واگزار کرایا۔ مسلم ضیائی بلا شبہ پاکستان کے ایک معتبر ماہر غالبیات تھے۔ انھوں نے اپنے تحقیقی مقالات اور اس موضوع پر اپنی دیگر کاوشوں سے غالبیات میں مفید اضافے کیے۔ غالب ہی ان کا مخصوص موضوع رہا۔ غالب کے متون کے تعلق سے ان کے کاموں کا ذکر گزشتہ اوراق میں کیا گیا ہے۔ غالب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھی انھوں نے محققانہ مقالات لکھے ہیں۔ ایک مقالے میں سرورا کے '' تذکرہ عمدہ منتخبہ'' میں غالب کے ترجمے پر بحث کی ہے ('' ماہ نو'' فروری ۱۹۶۷ء)۔ غالب کی تاریخ پیدائش بالعموم آٹھ رجب بروز یکشنبہ ۱۲۱۲ھ تسلیم کی جاتی ہے۔ اس کی بنیاد خود غالب کی تحریروں پر ہے لیکن مسلم ضیائی نے کلیات غالب میں منقبتی قصیدے میں شامل غالب کے زائچے پر غور کر کے یہ انکشاف کیا ہے کہ صحیح تاریخ پیدائش ۸ رجب بروز یک شنبہ ۱۲۱۳ھ ہے (غالب کا زائچہ اور تاریخ ولادت مشمولہ '' اُردو نامہ'' جنوری ۱۹۶۶ء) ان کی تحقیق کے مطابق ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کو یک شنبہ نہیں بلکہ چہار شنبہ تھا لیکن اس موضوع پر سید نثار لطفی نے از روئے ہیئت بحث کر کے ۱۲۱۲ھ کو درست قرار دیا ('' ماہ نو'' مارچ ۱۹۶۷ء)۔ اس ضمن میں سید محمد حسین رضوی نے ایک بہت مفصل بحث کر کے از روئے ہیئت یہ ثابت کیا کہ غالب ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کو علی الصبح طلوع آفتاب سے چار گھڑی قبل یعنی ہندوستان کے معیاری وقت کے مطابق صبح ۵ بج کر ۳۶ منٹ پر پیدا ہوئے ('' اُردو'' غالب نمبر، جنوری ۱۹۶۹ء) مقالہ نگار نے اپنے حساب میں غالب کے اس زائچے سے مدد لی جو غالب کے '' کلیات فارسی'' کے نولکشور ایڈیشن میں شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر خالد حسن قادری نے اپنے مقالے '' غالب و حسرت کے کچھ سن و سال'' ('' اُردو نامہ'' مارچ ۱۹۷۳ء) میں اس ضمن میں ایسی الجھنوں کا ذکر کیا ہے جو غالب کی زندگی کے اہم سنین کے تعین میں پیش آتی ہیں۔ فاضل مقالہ نگار نے غالب کی تحریروں سے ان متعدد مقامات کی نشاندہی کی جن میں خود غالب نے تضاد بیانی سے کام لیا ہے۔ چنانچہ کسی معاملے میں خود غالب کے لکھے ہوئے سنہ کو ان کے خیال کے مطابق سند تسلیم نہیں کرنا چاہیے۔

ناظم سیتاپوری نے مرزا اوج لکھنوی کی تصنیف '' حیات غالب'' مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۹۹ء کا تعارف کراتے ہوئے، اسے ایک اہم تاریخی سوانح قرار دیا تھا اور غالب کی زندگی کے بارے میں چند نئی معلومات فراہم کی تھیں ('' ماہ نو'' مارچ ۱۹۶۴ء) لیکن مولانا غلام رسول مہر نے اس مقالے کی چند غلط بیانیوں کی نشاندہی کی ('' ماہ نو'' جولائی ۱۹۶۴ء) مولانا مہر نے اس عرصے میں غالب پر کچھ زیادہ نہیں لکھا۔ اپنے ایک مقالے '' مرزا غالب اور میر تقی'' ('' ماہ نو'' فروری ۱۹۴۹ء) میں اس حکایت کے بارے میں کہ غالب کے بچپن کے دوست نواب حسام الدین حیدر خان نے غالب کے اشعار میر کو دکھائے تھے، خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ درست نہیں ہو سکتی۔

مولوی عبد الحق نے '' روئداد مقدمہ مرزا غالب'' ('' افکار'' کراچی، فروری ۱۹۶۶ء) لکھ کر اس مقدمے کی روئداد مرتب کی جو غالب نے مولوی امین الدین مولف '' قاطع برہان'' کے خلاف ۲ دسمبر ۱۸۶۷ء کو ازالہ حیثیت عرفی کی نالش کے لیے دائر کیا تھا۔ سید قدرت نقوی نے بھی غالب پر کئی اہم کام کیے ہیں۔ ان کے مرتبہ نسخہ '' گل رعنا'' کا ذکر گزشتہ اوراق میں کیا گیا ہے۔ ان کی کتاب '' غالب کون ہے'' (ملتان، ۱۹۶۸ء) میں تین مقالات تحقیقی ہیں۔ '' غالب کا رابطہ فرنگ'' انگریزوں سے غالب کے تعلقات پر روشنی ڈالتا ہے، '' غالب کے معتقدات'' مذہبی عقائد کی تحقیق پر ہے اور '' غالب کے آخری ایام'' غالب کی تحریروں سے مرتب کیے ہیں۔

غالب کے سفر کلکتہ پر کئی مقالات لکھے گئے۔ مولانا اسماعیل پانی پتی نے خوب داد تحقیق دے کر ایک مفصل مقالہ (نقوش، غالب نمبر فروری، ۱۹۶۹ء) میں غالب کے سفر کی روداد اپریل ۱۸۲۷ء تا ۲۵ نومبر ۱۸۲۸ء مرتب کی۔ غالب کے قیام کلکتہ کے دوران وہ معرکہ بہت اہمیت رکھتا ہے جو ان کی فارسی مثنوی '' آشتی نامہ'' کی تخلیق کا محرک بنا۔ اس معرکے پر مسلم ضیائی نے ایک نہایت محققانہ مقالہ (نقوش، غالب نمبر ۱۹۷۱ء) لکھ کر '' آشتی نامہ'' کے پس منظر پر روشنی ڈالی اور مثنوی کو مختلف نسخوں کی مدد سے صحت متن کے ساتھ مرتب کیا۔ سید قدرت نقوی نے بھی '' گل رعنا'' کی ترتیب کے ساتھ بہ طور ضمیمہ اس مثنوی کو مرتب کیا ہے اور تعارف میں غالب کے قیام کلکتہ کے حالات پر محققانہ روشنی ڈالی ہے۔

غالب اور ۱۸۵۷ء کے تعلق سے ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی تصنیف '' غالب اور انقلاب ستاون'' (لاہور، ۱۹۷۴ء) مفصل جائزے پر مشتمل ہے، جس میں جنگ آزادی پر غالب کی تحریروں سے اس موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب سے غالب کے سیاسی رویے کا اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا غلام رسول مہر نے اپنے ایک مختصر مقالے ('' ماہ نو'' ۱۹۵۳ء) میں غالب کے مکاتیب کی مدد سے '' جنگ آزادی کی کہانی'' مرتب کی تھی۔ اسی نوعیت کا ایک مقالہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

نے ''اہل علم پر ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں کیا گزری'' (نقوش، جون ۱۹۵۷ء) لکھا۔

غالب پر نادم سیتاپوری نے مذکورہ بالا مقالے کے علاوہ کئی اور مقالے تحریر کیے۔ غالب پر ان کے متعدد مقالات کے دو مجموعے بھارت میں شائع ہو چکے تھے۔ پاکستان آ کر انھوں نے ''خیابانِ غالب'' (کراچی، ۱۹۷۰ء) مرتب کیا، جس میں کئی اہم موضوعات پر ان کے تحقیقی مطالعے شامل ہیں۔ حالاتِ زندگی کے حوالے سے ''غالب اور سیاست'' اور بالخصوص ''غالب کے متعلق چند غیر معتبر روایات'' وقیع ہیں۔ موخر الذکر میں غالب کے تعلق سے کئی معروف روایات کے غلط ہونے پر بحث کی گئی ہے۔ غالب کے اولین سوانح نگاروں کے تعلق سے ان کے مذکورہ بالا مقالے کے علاوہ ایک مقالہ ''غالب کی ایک قدیم سوانح عمری'' (''ادبی دنیا'' مارچ ۱۹۶۷ء) بھی ہے۔ اسی ضمن میں انھوں نے اپنے ایک مقالے ''غالب، ذوق کے ایک سیرت نگار کی نظر میں'' میں احمد حسین خان کی تصنیف ''حیاتِ ذوق'' میں شامل غالب کے تذکرے پر اظہار خیال کیا ہے۔

دیگر حضرات نے بھی غالب کے اولین تذکروں اور تذکرہ نگاروں پر تحقیقی نظر ڈالی ہے۔ مرتضیٰ حسین فاضل نے غالب کی وفات پر جو تاثرات مختلف لوگوں نے قلم بند کیے تھے، انھیں تلاش کر کے اپنے ایک مقالے (''نقوش'' غالب نمبر، فروری ۱۹۶۹ء) میں یک جا کیا ہے۔ شیخ اسماعیل پانی پتی نے اپنے ایک مضمون (''لیل و نہار'' لاہور، ۵ مئی ۱۹۶۳ء) میں ماہنامہ ''بالگوبندہ'' (آگرہ) کی اشاعت مارچ ۱۹۶۹ء میں غالب کی وفات پر شائع ہونے والے مضمون کو غالب کے سوانحی حالات کے متعلق پہلا مضمون قرار دیا تھا۔ پانی پتی صاحب نے اس بارے میں دراصل مسعود حسن رضوی کی تحقیق پر صاد کیا تھا۔ مسعود حسن رضوی نے ''احوالِ غالب'' (مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد) میں اس مضمون کا تعارف کرایا تھا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ۱۶ مارچ ۱۸۶۹ء کے ''اودھ اخبار'' لکھنؤ میں شائع ہونے والے ایک مضمون کو اس سلسلے کا پہلا مضمون خیال کیا اور اسے گارساں دتاسی کی تصنیف ''تاریخ ادب ہندوستانی'' سے نقل کیا لیکن اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ مضمون کس نے لکھا تھا اور اس کا عنوان کیا تھا (''غالب شاعر امروز و فردا'' لاہور، ۱۹۷۰ء) اسی طرح ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کے مطابق غالب کی یادگار قائم کرنے کی پہلی تجویز مردان علی خان رعنا نے ۲۳ مارچ ۱۹۶۹ء کے ''اودھ اخبار'' میں پیش کی تھی۔ (ایضاً)۔

غالب کے بارے میں ایک قدیم تحریر کو ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے بھی متعارف کرایا (''اردو'' غالب نمبر، اپریل ۱۹۶۹ء) یہ ''اخبار انجمن پنجاب'' میں ۸ جون ۱۸۷۷ء کو شائع ہوئی تھی اور اسے محمد علی شیر نے لکھا تھا۔ مرتضیٰ حسین فاضل نے محمد حسین آزاد کے ایک مضمون کو جو ''سرکاری اخبار'' (لاہور) میں ۲۴ فروری ۱۸۶۹ء کو ''وفات اسد اللہ'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا، غالب کی وفات کے بعد ان پر پہلا مضمون قرار دیا (ادبی دنیا، دور پنجم، شمارہ دوازدہم، ۱۹۶۴ء) ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے اس موضوع پر دوسرے محققین کی تحقیقات کا حوالہ دیتے ہوئے، ''غالب کے بعد ان پر پہلا مضمون'' کے عنوان سے اپنے مقالے نقوش، غالب نمبر (فروری ۱۹۶۹ء) میں ''اکمل الاخبار'' (دہلی) کی اشاعت ۱۷ فروری ۱۸۶۹ء کو زمانی تقدم کے لحاظ سے پہلا مضمون قرار دیا ہے۔ یہ مضمون غالب کے شاگرد مجروح کا لکھا ہوا تھا۔

اسی نوعیت کا ایک مقالہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا ''غالب کے اولین تعارف نگار'' (اردو، غالب نمبر، جنوری ۱۹۶۹ء) ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس خیال کی تردید میں کہ غالب کا اولین تذکرہ سرسید نے اپنی تصنیف ''آثار الصنادید'' میں کیا ہے، یہ مفصل مقالہ لکھ کر ان تمام تذکروں سے غالب کے تراجم نقل کیے ہیں جو ''آثار الصنادید'' سے قبل لکھے گئے تھے۔ اس مقالے میں ضمنی طور پر ان تذکروں کا زمانہ تصنیف بھی متعین کیا گیا ہے۔

غالب کے بارے میں قدیم اخبارات و رسائل میں سے مضامین اور تحریروں کی تلاش و دریافت ہوتی رہی۔ مرتضیٰ حسین فاضل نے اپنے مذکورہ انکشاف کے علاوہ ''اودھ اخبار'' میں جہاں جہاں غالب یا غالب کے کلام یا اس کے شاگردوں و احباب کا تذکرہ شائع ہوا، اس کی نشاندہی کی (''صحیفہ'' غالب نمبر، جنوری ۱۹۶۵ء)۔ آغا محمد باقر کے پاس ''آبِ حیات'' کا مسودہ محفوظ تھا، جسے خود آزاد نے لکھا تھا۔ آغا صاحب نے اس مسودے سے غالب کے حالات نقل کیے اور ''آبِ حیات'' کے مطبوعہ نسخوں سے مقابلہ کر کے انھیں شائع کر دیا (''صحیفہ'' غالب نمبر، جنوری ۱۹۶۹ء)۔ مسودے سے معلوم ہوتا ہے کہ آزاد نے جگہ جگہ ترمیم کی تھی۔

غالب کی سوانح عمریوں میں سے ''یادگارِ غالب'' میں حالی نے غالب کے حالات کے بارے میں جو باتیں لکھی تھیں، ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنے ایک مقالے ''یادگارِ غالب، ایک تحقیقی مطالعہ'' (سویرا، لاہور، شمارہ ۲۲) میں ان میں سے بعض کے غلط ہونے پر بحث کی۔ ان کے خیال میں حالی کی جلد بازی نے انھیں غالب کی تحریروں کے گہرے مطالعے اور احباب سے فراہمی مواد میں مزید تگ و دو سے باز رکھا۔ وہ اس سے بہتر تصنیف ہمیں دے سکتے تھے۔

غالب کے اعزا و اقربا کا ذکر غالب کے حالات اور اس کے معاصرین و تلامذہ کے بارے میں لکھی جانے والی تصانیف میں ملتا ہے لیکن خصوصیت سے ان کے بارے میں بہت کم تحقیق ہوئی۔ ایک مقالہ نادم سیتاپوری نے ''غالب کے خطوط، افراد خاندان کے نام'' (مشمولہ ''خیابانِ غالب'' کراچی، ۱۹۷۰ء) لکھا جو مختصر

ہے لیکن اس میں غالب کے قریبی اعزہ کا تذکرہ اور ان کے نام غالب کے دو غیر مدون خطوط ''خیابان'' (لکھنؤ، نومبر ۱۹۲۳ء) سے نقل کیے گئے ہیں۔ خواجہ قمر الدین خان راقم کے بارے میں تحسین سروری نے ''راقم اور غالب'' (ہم قلم، کراچی، اکتوبر ۱۹۶۱ء) لکھ کر ان کے حالات اور غالب سے ان کی نسبت پر روشنی ڈالی۔ تحسین سروری نے غالبیات کے ضمن میں غالب کی غیر مطبوعہ اور غیر مدون تحریروں کی بازیافت کے علاوہ غالب کے معاصرین اور تلامذہ کو بھی تحقیق کا موضوع بنایا۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے متعدد وقیع اور مفصل تحقیقی مقالات میں غالبیات کے مختلف گوشے اجاگر کیے۔ ان کی تصنیف ''غالب اور عصر غالب'' (کراچی، ۱۹۸۲ء) بلند معیار کے تحقیقی مطالعوں پر مشتمل ہے۔ ان مطالعوں کے موضوعات متنوع ہیں۔ معاصرین غالب کے تعلق سے ''غالب اور سرسید''، ''غالب اور غیاث اللغات''، غالب سے معاصرین کی چھیڑ چھاڑ''، غالب اور مارہرہ'' ان کے مفصل مقالات ہیں جو اپنے موضوع پر سیر حاصل ہیں۔

غالب کے ایک معاصر حکیم احسن اللہ خان پر ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کا مقالہ ''غالب، مراۃ الاشیا اور حکیم احسن اللہ'' (اردو، غالب نمبر، جنوری ۱۹۶۹ء) بھی بہت وقیع ہے۔ یہ اگرچہ حکیم احسن اللہ خان کی تصنیف ''مراۃ الاشیا'' کے تعارف میں ہے لیکن اس میں حکیم احسن اللہ کے حالات اور غالب سے ان کے روابط پر عمدگی سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ معاصرین غالب کے بارے میں ایک مبسوط تصنیف عبدالرؤف عروج کی ''بزم غالب'' (کراچی، ۱۹۶۹ء) ہے، جس میں غالب کے دو سو سے زائد معاصرین اور تلامذہ و احباب کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ ایک معلوماتی تصنیف تو ہے لیکن تحقیقی نقطۂ نظر سے مستند اور معیاری نہیں کہی جا سکتی۔ اس میں استناد اور مآخذ کا لحاظ معینہ اصولوں کے تحت نہیں کیا گیا۔ اس میں مالک رام کی تصنیف ''تلامذۂ غالب'' کے پہلے ایڈیشن کی پیروی کی گئی ہے۔ اس مقابلے میں سید حسام الدین راشدی کی تصنیف ''دود چراغ محفل'' (کراچی، ۱۹۶۹ء) ان دونوں سے مختلف اور تحقیقی لحاظ سے بہتر ہے۔ اس میں صرف ان پانچ شاعروں ناطق مکرانی، خادم بردوئی، رسوا بجنوری، شاہ باقر بکائی اور مولانا طرزی پاپوڑی کی سوانح اور ان کے کلام کا انتخاب شامل ہے جو یا تو غالب کے معاصر تھے یا شاگرد، ان شاعروں پر جس قدر حالات فاضل محقق نے یہاں یک جا کیے ہیں، وہ اس قدر کہیں اور نہیں ملتے۔

تلامذۂ غالب پر کوئی مستقل تصنیف یہاں نہیں لکھی گئی لیکن مفرد مطالعے کی کوششیں ضرور ہوتی رہیں۔ مشفق خواجہ نے ''غالب اور صفیر بلگرامی'' (کراچی، ۱۹۸۱ء) لکھ کر اس کی ایک مثال پیش کی ہے۔ اس مطالعے کا آغاز انھوں نے ۱۹۶۹ء میں کیا تھا (مقالات، صحیفہ، جولائی و اکتوبر ۱۹۶۹ء) لیکن اسے ترمیم و اضافے کے بعد ۱۹۸۱ء میں مکمل کیا۔ اس تصنیف میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ صفیر کے حالات، آثار اور غالب سے ان کے تعلقات کی تمام تفصیلات پیش کی جائیں اور تمام متعلقہ تحریروں کو یک جا کیا جائے۔ فاضل محقق نے اس ضمن میں متعدد قلمی اور نادر کتابوں سے استفادہ کر کے بہت سا ایسا مواد جمع کیا ہے جو پہلی مرتبہ سامنے آیا ہے۔ مشفق خواجہ نے اس ضمن میں اور بھی کام کیے ہیں، بہاء الدین بشیر نے نساخ کے تذکرہ ''سخن شعرا'' پر جو حواشی لکھے تھے، ان میں نہ صرف نساخ کی پیش کردہ معلومات پر اضافہ کیا گیا تھا، بلکہ ایسے شعرا کے حالات درج کیے تھے، جن کا ذکر نساخ نے کہیں نہیں کیا تھا۔

مشفق خواجہ نے حواشی کے تراجم کو علیحدہ کر کے انھیں ''تذکرۂ بشیر'' کے نام سے مرتب کیا ہے لیکن یہ ابھی شائع نہیں ہوا، ان تراجم میں سے ۳۸ تراجم غالب کے شاگردوں کے ہیں، ان تراجم کو انھوں نے ''غالب اور تلامذۂ غالب'' (''اردو'' غالب نمبر، جنوری ۱۹۶۹ء) کے عنوان سے شائع کر دیا ہے۔ اسی نوعیت کا ایک اور کام بھی انھوں نے کیا ہے، غالب اور تلامذۂ غالب کے بارے میں بہت سی معلومات اور روایات ایسے مآخذ سے دستیاب ہوئی ہیں، جن پر بالعموم نظر نہیں پڑتی۔ اسی انداز سے تحسین سروری نے بھی مختلف نادر کتابوں، گلدستوں اور یادداشتوں سے غالب کے کئی تلامذہ کے حالات مرتب کیے، ان میں سے کچھ نام غیر معروف تلامذہ کے بھی ہیں۔ موصوف کا یہ مقالہ (''تلامذۂ غالب'' مشمولہ صحیفہ، جولائی ۱۹۷۰ء) مشفق خواجہ کے مذکورہ کام کو آگے بڑھانے کی ایک عمدہ صورت ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے بھی دو گلدستوں سے تلامذۂ غالب اور ان کے نمونۂ کلام کا انتخاب کیا (''ماہ نو'' مارچ ۱۹۶۵ء)۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے ملک رام کی تصنیف ''تلامذۂ غالب'' میں مذکور ایسے شاگردوں کے مفصل حالات کی تحقیق کی جو مالک رام کو دستیاب نہ ہو سکے اور انھوں نے تشنہ چھوڑ دیے تھے۔ چنانچہ اس طرح ان کی تصنیف ''غالب اور عصر غالب'' میں شامل ایک مقالے میں مفتی سید احمد خان سید، مولوی سلطان حسن خان سلطان، مولوی محمد حسین تمنا، منشی سخاوت حسین مدہوش، مولوی عزیز الدین بدایونی، شیخ صادق علی مداح اور مولانا عبدالسمیع بیدل کے حالات کمال تحقیق سے مرتب ہو گئے۔ ڈاکٹر ایوب قادری کا ایک اور مقالہ ''کچھ غالب کے متعلق'' (اردو، غالب نمبر، اپریل ۱۹۶۹ء) بھی اہم ہے۔ اس میں غالب اور معاصرین و تلامذہ کے بارے میں دور از کار معلومات اور پھر غالب کے انتقال پر شاعروں اور ادیبوں کے تاثرات اور قطعات تاریخ وغیرہ جمع کیے گئے ہیں۔

تلامذۂ غالب کے مفرد مطالعوں میں نادم سیتاپوری نے غالب کے کئی شاگردوں پر مقالات تحریر کیے۔ قدر بلگرامی، حیدر دہلوی اور رفعت شیروانی کے حالات پر مشتمل ان کے مقالے، ان کی مذکورہ تصنیف ''خیابان غالب'' میں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ رفعت شیروانی کی خود نوشت تحریریں بھی انھوں نے شائع

کیں (نقوش، غالب نمبر ۳، ۱۹۷۱ء) سید مرتضیٰ حسین فاضل نے ''غالب اور تفتہ'' پر ایک جامع مقالہ لکھا (اُردو، غالب نمبر، جنوری ۱۹۶۹ء) افسر امروہوی نے غالب کے دکنی شاگرد منشی حبیب اللہ ذکا پر مقالہ (صحیفہ، جولائی ۱۹۷۱ء) لکھ کر اس کے حالات جمع کیے۔ یتاز بیری نے عطا مارہروی کے حالات قلم بند کیے (''قومی زبان'' جولائی ۱۹۶۶ء) شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے میر افضل دہلوی عرف میرن صاحب کے مبسوط حالات نہایت تحقیق سے یک جا کیے (''نقوش'' غالب نمبر، فروری ۱۹۶۹ء) اور مالک رام کے اس خیال کی تردید کی کہ میرن صاحب غالب کے شاگرد نہیں تھے۔ اسی طرح ڈاکٹر خلیق انجم نے (صحیفہ، جولائی ۱۹۶۹ء) سخن اور باقر کو غالب کے شاگردوں کے زمرے سے خارج کیا تھا، رفعت القاسمی نے اپنے مقالے ''سخن دہلوی اور غالب'' (صحیفہ اپریل ۱۹۷۲ء) میں ڈاکٹر خلیق انجم کے ان دلائل کا رد کیا ہے اور ثابت کیا کہ بالخصوص سخن غالب کے شاگرد تھے۔ غالب کے تعلق سے بعض دیگر متفرق موضوعات پر بھی عمدہ تحقیقی مقالے لکھے گئے۔ مسلم ضیائی کا مقالہ ''غالب کے سفارش نامے'' (اُردو، غالب نمبر اپریل ۱۹۶۹ء) ڈاکٹر محمد ایوب قادری کا مقالہ ''غالب اور روہیلکھنڈ'' اور ''غالب اور مارہرہ'' مشمولہ ''غالب اور عصر غالب'' اور ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری کا ایک مقالہ ''غالب اور ابوالکلام آزاد'' (اُردو نامہ، جون ۱۹۶۹ء) اپنے موضوع پر جامع، معلوماتی اور محققانہ ہیں۔

غالب کے معاصرین اور کچھ بعد کی شخصیات میں سے ناسخ پر ایک تحقیقی مقالہ احمد رضا نے ''ناسخ، سوانح اور شاعری'' (صحیفہ اکتوبر ۱۹۶۴ء) تصنیف کیا تھا لیکن زیادہ مبسوط کام ڈاکٹر محمد صدر الحق کا پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ ''ناسخ حیات و تصانیف'' (کراچی، ۱۹۷۹ء) ہے جو اپنے موضوع پر مکمل ہونے کے ساتھ ساتھ محنت سے لکھا گیا ہے اور ناسخ کی مکمل سوانح اور تصانیف کے جائزے پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر صدر الحق نے اپنے مقالات کے مجموعے ''انکشافات'' (کراچی ۱۹۸۱ء) میں سید محمود آزاد اور شمس کلکتوی پر بھی اچھے مقالات لکھے ہیں۔ امیر مینائی پر ایک دقیع مقالہ کسریٰ منہاس نے ''تحقیقات امیر مینائی، خطوط کی روشنی میں'' (نقوش، جنوری ۱۹۶۴ء) ان کی خدمات زبان کے اشاروں پر مشتمل ان کے خطوط کے مربوط اقتباسات سے ترتیب دیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک مختصر مقالہ ''دربار رام پور سے امیر مینائی'' (صحیفہ اپریل ۱۹۶۱ء) راحت محمود نے لکھ کر دربار رام پور سے امیر مینائی کے روابط پر روشنی ڈالی لیکن امیر کی زندگی، ان کے علمی و ادبی کاموں، ان کی شاعری اور تلامذہ پر ایک مبسوط تصنیف کریم الدین احمد کی ہے۔ میر مہدی مجروح کے کلام کو ریاض احمد چوہدری نے صحت متن کے ساتھ مرتب کیا ہے، اس کے علاوہ ایک مقالہ فرحت شاہجہان پوری نے لکھا ہے (''صحیفہ'' اگست ۱۹۵۹ء)۔ انھی کا ایک مبسوط تحقیقی مقالہ ''نظام رام پوری اور داغ دہلوی'' پر ہے (''صحیفہ'' اکتوبر ۱۹۶۳ء) اس میں ان دونوں کے روابط، دربار رام پور اور ان کی شخصیات پر تحقیقی نظر ڈالی گئی ہے۔ داغ پر تمکین کاظمی نے جیسا کام کیا ہے، اس سطح کا بھی کوئی کام یہاں نہیں ہوا۔ صرف فاضل زیدی داغ پر مستقل مزاجی سے کام کرتے رہے ہیں۔ ''نوادر داغ'' کے عنوان سے انھوں نے قیمتی اور نئی معلومات یک جا کی ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے اس سلسلے کے مقالات داغ پر اہم مآخذ کی نشاندہی کرتے ہیں (قسط وار ''اُردو نامہ'' اپریل ۱۹۷۰ء تا اپریل ۱۹۷۴ء)۔

میر انیس پر پاکستان کے چند رسائل نے خصوصی اشاعتوں کا اہتمام کیا لیکن کوئی بہت نمایاں تحقیقی کام سامنے نہیں آیا۔ ان کے حالات زندگی پر میر اختر نقوی کا مقالہ ''میر انیس کے حالات زندگی، ایک تحقیقی مطالعہ'' (''ماہ نو'' انیس نمبر ۱۹۷۲ء) ضرور قابل توجہ ہے لیکن اس میں استناد کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ انیس کے تعلق سے افسر امروہوی کا مقالہ ''فیضان انیس'' (''اُردو'' انیس نمبر ۱۹۷۲ء) اس ضمن میں ایک استثنائی کوشش ہے۔ یہ ایک مفصل مقالہ ہے، جس میں خاندان انیس اور تلامذہ انیس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اسی سلسلے میں ''شاگردان انیس'' ڈاکٹر سید تقام حسین جعفری کی ایک مبسوط تصنیف (کراچی، ۱۹۷۶ء) ہے جو مفصل اور معلوماتی ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے انیس کے تین اور شاگردوں فارغ، نفیس اور وقار کی سوانح اور کلام پر مبنی ایک کتاب ''آثار انیس'' بھی تصنیف کی ہے (کراچی، ۱۹۷۷ء)۔

دبیر پر مبسوط تحقیقی کام ڈاکٹر مظفر حسین ملک نے پی ایچ ڈی کے لیے کیا ہے۔ ان کا موضوع سوانح اور شاعری (لاہور، ۱۹۷۶ء) تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور کام افسر امروہوی نے بھی کیا ہے۔ انھوں نے ایک مفصل مقالہ ''نقش و نگار، ضمیر در آئینہ کمالات دبیر'' (اُردو، جولائی ۱۹۷۵ء) لکھ کر دبیر کے تلامذہ کا تذکرہ مرتب کیا ہے۔ اس مقالے کے علاوہ دبیر کے تعلق سے، حالات زندگی پر ضمیر اختر نقوی کا مقالہ ''مرزا دبیر کی زندگی'' ان کے خاندانی حالات پر مرزا علی اظہر برلاس کا مقدمہ ''مرزا دبیر کے کچھ خاندانی حالات'' اور مرتضیٰ حسین فاضل کا مقالہ ''نوادر دبیر'' تحقیقی افادیت کے حامل ہیں۔ یہ تینوں مقالات ''ماہ نو'' (دبیر نمبر، ستمبر ۱۹۷۵ء) میں شامل ہیں۔ مرزا دبیر کے تعلق سے سخاوت مرزا کا ایک مقالہ ''مکتوبات وہاب و مشاہیر متعلقہ مرزا دبیر لکھنوی'' (''اُردو نامہ'' جنوری ۱۹۷۵ء) بھی اہم ہے۔ اس میں سید عبدالوہاب حسینی، شاگرد دبیر کے حالات اور ان کی ایک بیاض مخزونہ کتب خانہ آصفیہ میں شامل مکتوبات کو نقل کیا گیا ہے۔

سرسید اور ان کے رفقا و معاصرین پر محققین نے اگر بہت زیادہ اہم نہیں تو قابل ذکر کام ضرور کیا ہے۔ سرسید پر ایک بہت بڑا کام یہ ہوا کہ ان کی تمام تصانیف اور طویل و مختصر تحریریں اور خطبات و مکاتیب کی جمع و ترتیب احسن طریقے پر ہوئی۔ مولوی عبدالحق کی تصنیف ''سرسید احمد خان'' (کراچی، ۱۹۵۹ء) ان کے

حالات وکارناموں پر مفصل تعارفی مقالات کا مجموعہ ہے۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کی مختصر تصنیف ''سرسید کا علمی کارنامہ'' (کراچی، ۱۹۶۴ء) تحقیقی نوعیت کی حامل ہے۔ ان دو تصانیف سے قطع نظر ڈاکٹر سید عبداللہ کی تصنیف ''سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقا کی اُردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ'' جو اصلاً انگریزی میں لکھا گیا ان کا تحقیقی مقالہ تھا، یہ اُردو میں ترجمہ ہو کر شائع ہوا (لاہور، ۱۹۶۰ء)۔ یہ اپنے موضوع پر ایک بہت جامع اور وقیع تصنیف ہے اور اس میں تحقیق وتنقید کا ایک خوبصورت امتزاج نظر آتا ہے۔ سرسید کے رفقاء میں سے حالی پر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی تصنیف ''حالی کا ذہنی ارتقا'' (لاہور، ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۶ء) بنیادی طور پر ڈاکٹر صاحب کے مقالات کا مجموعہ ہے۔ جس میں حالی کے سال بہ سال ذہنی ارتقا کا مطالعہ تحقیق وتدقیق سے کیا گیا۔ اس وقیع کام کے علاوہ ''حالی کی اُردو نثر نگاری'' پر ڈاکٹر عبدالقیوم کی ضخیم تصنیف (لاہور، ۱۹۶۴ء) اپنے موضوع کے اعتبار سے حالی کی تمام تصانیف کے تحقیقی اور تنقیدی جائزے پر مشتمل ہے۔ حالی کے تعلق سے دیگر تحقیقی نوعیت کے کاموں میں ایک مقالہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کا ''غالب اور حالی کے تعلقات'' (صحیفہ، جنوری واپریل ۱۹۷۲ء) بھی ایک مفید کام ہے، جسے ملک احمد نواز نے مرتب کیا۔

شبلی پر بھی پاکستان میں کئی اہم کام ہوئے ہیں۔ سید سلیمان ندوی کی تصنیف ''حیات شبلی'' کی تصنیف (۱۹۴۲ء) کے بعد ان پر جو کتابیں تصنیف ہوئیں، وہ زیادہ تر ''مذلل مداحی'' سے ہٹ کر تھیں۔ مثلاً شیخ محمد اکرام نے قیام پاکستان سے قبل شبلی کا ایک سوانحی خاکہ ''شبلی نامہ'' تحریر کیا تھا۔ جس کے بعد اسی مزاج کے تحت ڈاکٹر وحید قریشی کی مختصر تصنیف ''شبلی کی حیات معاشقہ، ایک نفسیاتی مطالعہ'' (لاہور، ۱۹۵۰ء) سامنے آئی جس کا ایک اگلا قدم محمد امین زبیری کی مختصر تصنیف ''شبلی کی زندگی کا رنگین پہلو'' کا نیا ایڈیشن ''شبلی کی رنگین زندگی'' (مطبوعہ لاہور) جمیل نقوی کی ترتیب نو کے ساتھ شائع ہوا۔ پھر امین زبیری کی تصنیف ''ذکر شبلی'' (لاہور، ۱۹۵۳ء) بھی شائع ہوئی۔ ان سب کتابوں میں تحقیق کے تقاضے بہت کم بروئے کار لائے گئے۔ ان سے قطع نظر شیخ محمد اکرام کی ضخیم تصنیف ''یادگار شبلی'' (لاہور، ۱۹۷۰ء) ہے۔ جس کا پس منظر ''شبلی نامہ'' ہی کو کہا جائے گا۔ فی الواقع یہ ''حیات شبلی'' کے علاوہ شبلی پر لکھی جانے والی سب سے اہم تصنیف ہے، فاضل مصنف نے شبلی کی زندگی اور ان کے کارناموں کا محققانہ اور ناقدانہ تجزیہ کیا ہے۔ یہ تحقیق اور تنقید کے مقامات اتصال کو بہت بہتر صورت میں نمایاں کرتی ہے۔

یہاں شبلی پر بعض اور کتابیں بھی قابل ذکر ہیں۔ معین الدین احمد انصاری کی تصنیف ''شبلی مکاتیب کی روشنی میں'' (کراچی، ۱۹۶۷ء) میں شبلی کے مکاتیب کے توسط سے ان کے سیرت کردار، معمولات زندگی، معاصرین، احباب اور تلامذہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اختر راہی نے ''کتاب نامہ شبلی'' (لاہور، ۱۹۸۱ء) مرتب کر کے محققین کے لیے ایک مفید کام کیا۔ خان عبیداللہ خان کے مرتبہ مجموعہ ''مقالات یوم شبلی'' (لاہور، ۱۹۶۱ء) کے بعض مقالات بھی تحقیقی لحاظ سے لائق توجہ ہیں۔

مولوی نذیر احمد کی زندگی اور ان کی ادبی وقومی خدمات پر پہلی جامع اور محققانہ تصنیف ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ''مولوی نذیر احمد دہلوی، احوال و آثار'' (لاہور، ۱۹۷۱ء) ہے۔ بلاشبہ یہ ایک بلند معیار کا تحقیقی کام ہے، جس میں فاضل مصنف نے معاصر ومعتبر مآخذ کی مدد سے مولوی نذیر احمد کے ذہنی ارتقاء اور سوانح وسیرت کے تمام اہم پہلوؤں کی تفصیل پیش کی ہے۔

عبدالحلیم شرر کی سوانح اور خدمات پر کوئی مستقل اور مبسوط کام تو یہاں نہیں ہوا لیکن ان کی ناول نگاری اور بالخصوص ان کے تاریخی وتنقیدی جائزے پر ایک معیاری کام ڈاکٹر ممتاز منگلوری نے کیا۔ ان کی تصنیف ''شرر کے تاریخی ناول اور ان کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ'' (لاہور، ۱۹۷۸ء) اپنے موضوع پر کافی وقیع اور معیاری ہے۔ فاضل مصنف نے شرر کی تقریباً تمام تاریخی ناولوں کا اولاً تحقیقی جائزہ لے کر ان سے منسوب تاریخی واقعات کی تحقیق کی ہے اور ان کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ شرر پر ایک ضمنی کام ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کا بھی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق سے متعلق کتاب ''ثانی اثنین'' کا ایک نیا ایڈیشن کراچی میں شائع ہوا ہے، جس کا مقدمہ ڈاکٹر کشفی نے تحریر کیا ہے۔ مقدمہ مبسوط ہے اور یہ شرر کے حالات، ان کی تاریخ نویسی کے پس منظر اور ان کی تصانیف کے مطالعے اور تجزیے پر مشتمل ہے۔

محمد حسین آزاد پر محققین نے خاطر خواہ توجہ دی ہے۔ بالخصوص ڈاکٹر محمد صادق نے ان پر کئی اہم کام کیے ہیں۔ بلکہ آزاد پر مستقل مطالعے کا آغاز بھی انھوں نے کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے اُردو میں پی ایچ ڈی کی پہلی سند ۱۹۳۹ء میں ڈاکٹر صادق کے مقالے مولوی محمد حسین آزاد کے حالات اور ان کے کام پر دی گئی جو انگریزی میں لکھا گیا تھا۔ اسے ترمیم اور اہم اضافوں کے بعد مصنف نے انگریزی سے اُردو میں منتقل کر کے ''محمد حسین آزاد، احوال وآثار'' کے نام سے شائع کر دیا (لاہور، ۱۹۷۶ء) اس عرصے میں ڈاکٹر اسلم فرخی نے بھی آزاد پر ایک مفصل تحقیقی مقالہ تحریر کیا، جس پر انھیں پی ایچ ڈی کی سند کراچی یونیورسٹی سے عطا ہوئی، یہ دو جلدوں میں شائع ہوا (کراچی، ۱۹۶۵ء) ڈاکٹر محمد صادق کے الفاظ میں ڈاکٹر فرخی کی یہ تصنیف ''اُردو تحقیق میں ایک کارآمد اضافہ ہے'' اور واقعتاً آزاد پر محنت سے لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر صادق نے مستقل مزاجی سے آزاد کے مطالعے کو جاری رکھا اور ان کی زندگی اور ان کے کاموں کے بارے میں کئی اہم دریافتوں میں کامیاب

ہوئے۔ مثلاً آزاد کے والد مولوی محمد باقر کی زندگی کے کچھ نئے پہلو ان کے سامنے آئے، آزاد کے سفر ایران و ترکستان کی غرض و غایت پر بھی کچھ نئی باتیں ان پر ظاہر ہوئیں۔ ان کی تصنیف ''نیرنگ خیال'' اور ''سخندان فارس'' کے مآخذ کا کھوج بھی انھوں نے لگایا اور پھر تدوین دیوان ذوق میں آزاد کے طرز عمل کے بارے میں دستاویزی شہادتیں بھی انھیں حاصل ہوئیں۔ اسی نوعیت کی ان کی تحقیقات ان کے مذکورہ مبسوط مقالے کے علاوہ ان کے مقالات میں بھی ہیں۔ جن کا ذکر مجموعہ ''آب حیات کی حمایت میں'' شائع ہوا ہے (لاہور، ۱۹۷۳ء)۔

آزاد کے تعلق سے گورنمنٹ کالج لاہور کے مجلے ''راوی'' کے محمد حسین آزاد نمبر (۱۹۸۲ء) میں بعض اہم مقالات شامل ہیں۔ ان میں سے محمد اکرام چغتائی کا مقالہ ''آزاد اور ان کے والد'' برلین کے کتب خانے میں ذخیرہ اشپرنگر کے نادر و نایاب مآخذ کی مدد سے لکھا گیا ہے۔ یہ مآخذ آزاد کی ابتدائی زندگی، ان کے والد کی شخصیت اور قاری جعفر علی جارچوی کے ساتھ ان کے مذہبی مناقشے کے بارے میں نئی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ اس مقالے کے علاوہ آزاد کی درسی کتابوں پر ڈاکٹر حسن اختر کا مقالہ اور حیات آزاد پر مولوی محمد خلیل الرحمان کا ایک نادر خط جو ڈاکٹر صادق کی تحقیقات کے لیے ایک اہم مآخذ بنا، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے مفصل تعارف کے ساتھ اس خاص نمبر میں شائع ہوئے۔

ان اکابر ادبی شخصیات کی ہم عصر اور کچھ بعد کی شخصیات میں سے مرزا رسوا پر ڈاکٹر ظہیر فتح پوری نے ایک مبسوط تحقیقی کام کیا لیکن یہ کام ''رسوا کی ناول نگاری'' محض اپنے موضوع کے تحقیقی و تنقیدی جائزے پر مشتمل ہے، (راولپنڈی، ۱۹۷۰ء) مگر محنت سے لکھا گیا ہے۔ ''اکبر الہ آبادی'' پر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا تحقیقی مقالہ (لاہور، ۱۹۸۰ء) اکبر کے حالات زندگی، شاعری، نثر نگاری اور ان کے افکار و خیالات جیسے موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔ فاضل مصنف نے ضمیموں میں اکبر کی غیر مدون اور غیر مطبوعہ تحریریں جمع کی ہیں۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی تصنیف ''ظفر علی خان، ادیب شاعر'' (لاہور، ۱۹۶۷ء) میں ان کی زندگی اور ان کے کاموں کا سلیقے سے تذکرہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی کی تصنیف ''مولانا ظفر علی خان بہ حیثیت شاعر'' (کراچی ۱۹۸۰ء) ان کے مبسوط تحقیقی مقالے کا ایک حصہ ہے۔ جگر مراد آبادی پر ڈاکٹر محمد اسلام نے لکھنؤ میں ایک کتاب شائع کی تھی، یہاں انھوں نے جگر کے استاد (''اردو نامہ'' جنوری ۱۹۷۰ء) اور جگر کے شاگردوں پر مقالات لکھے۔ ڈاکٹر احمر رفائی نے جگر کی شخصیت، سوانح اور ان کی شاعری کا احاطہ کیا ہے۔ ان کی تصنیف ''جگر مراد آبادی: احوال و آثار'' (کراچی، ۱۹۷۹ء) ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔

عزیز لکھنوی پر کوئی مبسوط کام نہیں ہوا، ان کے سنہ ولادت اور سال وفات کے بارے میں ایک عرصے سے اختلاف پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے تحقیق کے بعد انھیں علی الترتیب ۱۴ جنوری ۱۸۸۳ء اور ۲۶ جولائی ۱۹۳۵ء قرار دیا ہے (''اردو نامہ'' جنوری ۱۹۶۷ء) حسرت موہانی بھی پاکستانی محققین کی کما حقہ توجہ کا مرکز نہیں بن سکے۔ ان پر تعارفی و تنقیدی نوعیت کے متعدد مقالات، بلکہ ایک دو کتابیں بھی لکھی گئیں لیکن تحقیق لحاظ سے کوئی خاص کام ان پر نہیں ہوا۔ ڈاکٹر خالد حسن قادری نے اپنے مبسوط مطالعہ حسرت کے دوران یہ ضرور کیا کہ ان کی زندگی کے اہم سنین مثلاً پیدائش اور شادی کے تعین کی کوشش کی۔ ان کا مقالہ ''غالب اور حسرت کے کچھ سن و سال'' (اردو نامہ، مارچ ۱۹۷۳ء) حسرت کے بارے میں اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں حسرت کا سنہ پیدائش ۱۸۸۰ء طے کیا گیا ہے۔ جب کہ بالعموم ان کا سن پیدائش ۱۸۷۸ء تسلیم کیا جاتا ہے۔ شادی کے سنہ کے بارے میں ۱۹۰۱ء کو درست سمجھا جاتا تھا لیکن شادی دراصل ۱۸۹۹ء میں ہوئی۔

مولانا ابوالکلام آزاد پر ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری نے خاص اہمیت کے کام کیے ہیں۔ ان پر کئی کتابوں کی تالیف اور ایک کتابیات کی تیاری کے علاوہ اپنی مرتبہ ایک کتاب ''ارمغان آزاد'' (جلد اول، کراچی، ۱۹۷۲ء) میں مولانا آزاد کی شاعری کے جائزے اور ان کے دستیاب کلام کی ترتیب کے علاوہ ان کی مضمون نگاری کا تجزیہ اور ان کے منتخب ادبی مضامین تلاش و جستجو کے بعد شامل کیے ہیں۔ ان کی ایک مستقل تصنیف ''امام الہند'' (کراچی، ۱۹۶۳ء) مولانا آزاد کی ابتدائی زندگی اور ان کی تعمیر فکر کے تحقیقی جائزے پر مشتمل ہے۔

غالب کے علاوہ اقبال ہمارے ادب کی وہ شخصیت ہیں، جن کی زندگی، شاعری اور فکر و عہد پر بہت زیادہ لکھا گیا ہے۔ سینکڑوں کتابیں اور ہزاروں مقالات لکھے جا چکے ہیں۔ پاکستان میں دو مستقل ادارے ''بزم اقبال'' (لاہور) اور ''اقبال اکادمی پاکستان'' (لاہور) اقبال پر تحقیقی و تنقیدی کتابوں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ انگریزی اور اردو میں ہر سال چار تحقیقی مجلے شائع کرتے ہیں۔ ۱۹۷۷ء میں اقبال صدی منانے کی وجہ سے اقبالیات کی ترتیب و اشاعت میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے لیکن ان سب سے قطع نظر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اقبال پر بہ حیثیت مجموعی تحقیقی لحاظ سے اب تک حق ادا نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ آج تک کوئی مستند اور جامع سوانح عمری نہیں لکھی گئی۔ قیام پاکستان کے بعد اولاً اگر کسی سوانح پر نظر ٹھہرتی ہے تو وہ عبدالمجید سالک کی ''ذکر اقبال'' (لاہور، ۱۹۵۵ء) ہے جو اقبال پر اس وقت تک لکھی جانے والی سوانحی کتابوں سے نسبتاً بہتر ہے۔ اس کے بعد ایک اور قابل ذکر سوانح صابر کلوروی کی ''یاد اقبال'' (لاہور، ۱۹۷۷ء) ہے، جس میں اقبال کی زندگی

کے بارے میں جو واقعات و معلومات یک جا کی گئی ہیں، وہ اس وقت تک کسی اور سوانح میں نہیں ملتیں۔ مصنف نے تحقیق اور جستجو سے کام لیتے ہوئے نتائج بھی اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔

سوانح عمریوں کے ضمن میں اب حال میں دو اہم کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک سید نذیر نیازی کی ''دانائے راز'' (لاہور، ۱۹۷۹ء) ہے جو بدقسمتی سے نامکمل رہ گئی، اس کی صرف ایک جلد شائع ہوئی، جو ۱۹۰۸ء تک کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے۔ اس وقت تک جتنی سوانح عمریاں شائع ہوئیں اور ان میں اس عہد تک کے جو حالات و واقعات جمع کیے گئے تھے، یہ ان سب سے مفصل ہے اور ایک بہتر کوشش یہ نظر آتی ہے کہ اقبال کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال نے بھی اقبال کی مبسوط سوانح عمری کی دو جلدیں ''زندہ رود، حیات اقبال کا تشکیلی دور'' اور زندہ رود، حیات اقبال کا وسطی دور'' شائع کیں (لاہور، ۱۹۸۱ء، ۱۹۷۹ء) پہلی جلد ۱۹۰۸ء تک اور دوسری ۱۹۲۵ء تک کے دور کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ سوانح جس کی تیسری جلد ابھی شائع نہیں ہوئی، اب تک شائع ہونے والی سوانح عمریوں میں نسبتاً سب سے بہتر ہے، اس میں حالات و واقعات کے تجزیے سے اقبال کی شخصیت اور ان کے ذہن و فکر کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ کتاب مفصل ہے اور اس میں تمام ضروری پہلوؤں کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں ان تحقیقات کی تردید کی کوشش بھی کی گئی ہے جو اقبال کے اجداد اور تاریخ پیدائش کے ضمن میں کچھ عرصے میں عام ہوئی ہیں۔ تاریخ ولادت کے بارے میں اختلاف رائے کے سبب پاکستان میں سرکاری ادارے ''بزم اقبال'' نے ۱۹۶۶ء میں جسٹس ایس اے رحمان کی سرکردگی میں ایک مجلس قائم کی، تاکہ اقبال کی صحیح تاریخ ولادت کا تعین کر سکے۔ یہ مجلس کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔ ۱۹۷۳ء میں حکومت پاکستان نے بھی اس مسئلہ پر مرکزی سیکرٹری تعلیم کی سربراہی میں ایک مجلس تشکیل دی، جس نے ۹ فروری ۱۹۷۴ء کو اعلان کیا کہ صحیح تاریخ ولادت ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی تحقیقات کے مطابق لکھا ہے کہ میونسپل کمیٹی کے رجسٹر کے جس اندراج کو غلطی سے اقبال یا اس کے لڑکے کی پیدائش کا اندراج (۱۸۷۳ء) سمجھ لیا گیا، دراصل محلہ کشمیریاں کے کسی نتھو کشمیری کے ہاں لڑکے کی پیدائش کا اندراج ہے۔ اقبال دراصل محلہ چوڑیگراں کے مکان میں پیدا ہوئے۔ سنہ ولادت کے ضمن میں بھی ان کی تحقیق کے مطابق اقبال ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہی کو پیدا ہوئے۔ اس کی تائید میں انھوں نے متعدد شواہد نقل کیے ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے اولاً ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو صحیح تاریخ پیدائش تسلیم کیا تھا۔ (''کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ'' صفحات ۳۰۷۔۳۰۶) لیکن بعد میں اپنے ایک مبسوط مقالے (''نقوش'' اقبال نمبر، دسمبر ۱۹۷۷ء) میں اس بارے میں سیالکوٹ میں اقبال کی ایک اہم جماعت کریم بی بی کے بیان پر انحصار کرتے ہوئے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اقبال کی تاریخ پیدائش ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء درست ہے۔

اقبال کی سوانح کے مختلف پہلوؤں پر متعدد تصانیف میں معلوماتی مواد ملتا ہے۔ ان کی خانگی زندگی کے بارے میں خالد نظیر صوفی کی مذکورہ تصنیف کئی نئی معلومات فراہم کرتی ہے۔ فقیر سید وحید الدین کی تصنیف ''روز گار فقیر'' (دو جلدیں: لاہور، ۱۹۵۱ء۔۱۹۶۴ء) اور سید نذیر نیازی کی ''اقبال کے حضور'' (لاہور، ۱۹۷۱ء) قیمتی معلومات کی حامل ہیں۔ ''اقبال کی پہلی بیوی'' یعنی والدہ آفتاب اقبال کے بارے میں سید حامد جلالی کی تصنیف (کراچی، ۱۹۶۷ء) اقبال کی ازدواجی زندگی کے تعلق سے اہم ہے۔ اسی طرح سلطان محمود حسین کا مقالہ ''اقبال کی پہلی جماعت کا نتیجہ'' (''اقبال ریویو'' لاہور، جولائی ۱۹۸۳ء) صفدر محمود کا مقالہ ''اقبال کا گوشوارہ آمدنی'' (''صحیفہ'' اکتوبر ۱۹۷۳ء) اقبال کے حالات زندگی کے تعلق سے اہم ہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کی تصنیف ''اقبال کی صحبت میں'' (لاہور ۱۹۷۷ء) چشم دید واقعات پر مبنی ہے اور اقبال کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ قیام لاہور کے تعلق سے ڈاکٹر وحید قریشی کے دو مقالات ''علامہ اقبال کی تعلیمی زندگی کی بعض تفصیلات'' اور ''علامہ اقبال اور اسلامیہ کالج'' (مشمولہ ''کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ'') اور ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کا مقالہ ''اقبال اور اورینٹل کالج'' (''جرنل آف دی ریسرچ سوسائٹی پاکستان'' لاہور جولائی ۱۹۷۷ء) اقبال کی زندگی کے علمی اور تعلیمی گوشوں کو اجاگر کرتے ہیں۔

اقبال کی سیاسی زندگی پر محمد احمد خان کی تصنیف ''اقبال کا سیاسی کارنامہ'' (لاہور، ۱۹۷۷ء) بہت مفصل ہے لیکن تحقیقی لحاظ سے کمزور ہے، اس کے علاوہ احمد سعید کی تصنیف ''اقبال اور قائداعظم'' (لاہور، ۱۹۷۷ء) اقبال کے سیاسی نقطہ نظر کے ایک اچھے تجزیے اور تحقیق پر مبنی ہے۔ اس طرح حنیف شاہد کی تصنیف ''اقبال اور پنجاب کونسل'' (لاہور، ۱۹۷۷ء) بھی اقبال کی سیاسی زندگی کے حوالہ سے معلوماتی اور مفید ہے۔ اس میں اقبال کی عملی زندگی کے مظاہر بھی نظر آتے ہیں۔ رحیم بخش شاہین کا مقالہ ''اقبال بہ حیثیت بیرسٹر'' (''اقبال'' ۱۹۷۷ء) بھی اقبال کی زندگی کے عملی گوشوں پر محققانہ نظر ڈالتا ہے۔

اداروں اور انجمنوں سے رابطے کے سلسلے میں ''انجمن حمایت اسلام اور اقبال'' کے موضوع پر حنیف شاہد کی تصنیف (لاہور، ۱۹۷۶ء) اور ''مجلس کشمیری مسلمان، لاہور'' کے تعلق سے افضل حق قریشی کا مقالہ (''اقبال ریویو'' جنوری ۱۹۸۳ء) اہم گوشوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ چند ایک اور اداروں سے اقبال کے روابط کا مطالعہ بھی محققین نے کیا ہے۔

مذکورہ سوانح عمریوں کے علاوہ اقبال کے اجداد کے تعلق سے ڈاکٹر محمد باقر کا مقالہ "اقبال کے اجداد کا سلسلہ عالیہ" ("صحیفہ" اقبال نمبر، اکتوبر ۱۹۷۳ء) اپنے موضوع پر تلاش وتحقیق کی ایک اچھی مثال ہے۔ اقبال کے والد شیخ نور محمد کے حالات پر رحیم بخش شاہین کا مقالہ ("صحیفہ" جولائی ۱۹۷۷ء) مفصل اور جامع ہے۔ اقبال کے استاد میر حسن کے حالات زندگی، ان کی علمیت اور مشاہیر سے ان کے روابط کا ایک مبسوط مطالعہ محمود حسین کی تصنیف "میر حسن، حالات و آثار" (لاہور، ۱۹۸۱ء) میں کیا گیا ہے۔ یہ ایک عمدہ تحقیقی کاوش ہے۔

اقبال کے غیر مطبوعہ اور غیر مدون تحریروں اور کلام کی دریافت واشاعت کے علاوہ جس کا جائزہ طوالت کا متقاضی ہے اور جس سے بہ خوف طوالت یہاں صرف نظر کیا جاتا ہے، تصانیف اقبال کا تحقیقی وتوضیحی مطالعہ بھی محققین اور مصنفین کے پیش نظر رہا۔ اس بارے میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے کمال تحقیق کا ثبوت دیا ہے۔ ان کا مبسوط اور مفصل مقالہ برائے پی ایچ ڈی (مطبوعہ لاہور، ۱۹۸۲ء) تصانیف اقبال کے تعلق سے ایک مستند قاموس کی حیثیت رکھتا ہے۔ فاضل محقق نے اقبال کے کلام اور ان کی تصانیف پر ہر پہلو سے محققانہ نظر ڈالی ہے اور ان کے بارے میں تمام ضروری اور ممکنہ معلومات یک جا کر دی ہیں۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اس سے قبل "کتابیات اقبال" بھی مرتب کر چکے ہیں۔ یہ کام دیگر کئی حضرات نے بھی مختلف صورتوں میں کیا ہے۔ اقبال کی تصانیف کے تعلق سے ایک کام اس طور پر بھی کیا گیا ہے کہ اقبال کی "موجودہ تصانیف" اور ان کی زیر تصنیف اور غیر مطبوعہ تصانیف پر بھی تحقیقی نظر ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور حنیف شاہد نے اپنے مقالات (علی الترتیب "نقوش" اقبال نمبر، دسمبر ۱۹۷۷ء اور اقبال ریویو، جولائی ۱۹۷۷ء) میں ایسی تصانیف کا ذکر کیا ہے جنھیں اقبال لکھ رہے تھے یا لکھنا چاہتے تھے۔

اقبالیات کے ضمن میں تحقیقی نوعیت کی ایک کتاب مشفق خواجہ کی ایک کوشش ہے۔ اقبال کی شخصیت اور فکر وفن پر پہلی کتاب مولوی احمد دین نے تحریر کی تھی، جس کا پہلا ایڈیشن تلف کر دیا گیا تھا۔ بعض تبدیلیوں کے ساتھ یہ کتاب ۱۹۲۶ء میں دوبارہ شائع ہوئی مگر پھر بھی کمیاب رہی۔ مشفق خواجہ نے اس کی دونوں اشاعتوں کو سامنے رکھ کر اسے اختلاف نسخ کے ساتھ مرتب کیا اور ضروری تعلیقات وحواشی تحریر کیے۔ ابتدا میں احمد دین کے حالات، اقبال سے ان کے تعلقات اور ان کے علمی و ادبی کارناموں کے جائزے پر مشتمل ایک مفصل مقدمہ لکھا۔ اس لحاظ سے یہ کتاب (کراچی، ۱۹۷۹ء) ایک تحقیقی کاوش بن گئی ہے۔

شخصیات در جال پر یہاں ویسے تو متعدد محققین نے دلجمعی سے کام کیا ہے لیکن جس خصوصیت اور مستقل مزاجی سے ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے برصغیر پاک وہند اور بالخصوص شمالی ہند کی شخصیات علم وادب کو موضوع بنایا، وہ ایک مثال ہے۔ تذکرہ وسوانح نگاری ان کی دلچسپی کا خاص موضوع رہا۔ فارسی سے مآثر الامرا اور تذکرہ علمائے ہند، (رحمان علی) کے تراجم کے علاوہ، کہ جن میں ڈاکٹر صاحب کے لکھے ہوئے حواشی وتعلیقات ان میں مذکورہ شخصیات پر مزید تحقیقی مواد فراہم کرتے ہیں، خود ان کی اپنی تصانیف و تالیفات میں سے "جنگ آزادی، واقعات وشخصیات" (کراچی، ۱۹۷۶ء)، "مولانا فیض احمد بدایونی اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء" (کراچی، ۱۹۶۵ء)، "سوانح مولانا احسن نانوتوی" (کراچی، ۱۹۶۶ء) اور مولانا جعفر تھانیسری کی تصنیف "تواریخ عجیب" (کراچی، ۱۹۶۲ء) میں رجال پر لکھے ہوئے ان کے حواشی ایک مستقل اہمیت کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی ایک آخری تصنیف "کاروان رفتہ" (کراچی، ۱۹۸۳ء) متعدد معروف وغیر معروف شخصیات کا تذکرہ ہے جو تحقیق وسوانحی معلومات کی فراہمی کے لحاظ سے قابل قدر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی ایسی تمام تصانیف شخصیات پر، جن میں علمی وادبی دونوں طرح کی شخصیات شامل ہیں، ان کے اچھے تحقیقی کاموں میں شمار کے قابل ہیں۔

(ب) تصانیف

قدیم دکنی عہد کی تصانیف پر تحقیقی لحاظ سے بالخصوص سخاوت مرزا نے توجہ دی ہے۔ متعدد مقالات انھوں نے اس سلسلے میں تحریر کیے۔ ان کی مستقل مزاجی اس باب میں بھی مثالی ہے۔ وجہی کی تصنیف "تاج الحقائق" کے بارے میں محققین میں غلط فہمی رہی ہے۔ اس کی عبارت ہے کہ "ہمیں عاتف العشاق، ہمیں ہادی العشاق، ہمیں عاشق العشاق" سے یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ یہ تصنیف میراں جی شمس العشاق کی ہے اور بجائے وجہی کے اس کو وجیہہ الدین گجراتی کے کسی رسالے کا ترجمہ قرار دیا تھا۔ سخاوت مرزا نے اسے "سب رس میراں جی شمس الدین العشاق" سمجھ کر بہت عرصہ پہلے اس کے تعارف پر ایک مقالہ تحریر کیا تھا ("النور" حیدر آباد دکن، شمارہ ۶، جلد ۲، ۱۳۴۲ھ)۔ اس تصنیف کے نسخے کتب خانہ جامعہ بمبئی، کتب خانہ انجمن ترقی اردو کراچی، ادارہ ادبیات اردو وکتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد میں موجود ہیں۔ چونکہ ان تمام نسخوں میں آغاز کی عبارت ایک ہی ہے اس لیے "تاج الحقائق" میراں جی کی نہیں، وجہی کی تصنیف ہے۔ جناب سخاوت مرزا نے اپنے ایک مقالہ "سب رس میراں جی شمس العشاق یا تاج الحقائق وجہی" ("اردو نامہ" جنوری ۱۹۷۱ء) میں ان حقائق پر روشنی ڈالتے ہوئے اسے وجہی کی تصنیف قرار

دیا ہے۔ قریب قریب اس عرصے میں بھارت میں ڈاکٹر نورالسعید اختر نے ''تاج الحقائق'' کو مرتب کر کے شائع کیا ہے۔

اسی طرح کی ایک غلط فہمی تصنیف ''صراط المستقیم'' کے تعلق سے بھی عام ہوئی، محققین نے اسے وجہی کی تصنیف سمجھا۔ سخاوت مرزا نے اس موضوع پر بھی ایک مقالہ لکھا (''اورینٹل کالج میگزین'' نومبر ۱۹۶۰ء) اور داخلی و تاریخی شواہد سے ثابت کیا کہ یہ وجہی گولکنڈوی کی نہیں کسی اور کی تصنیف ہے۔

''تاج الحقائق'' سے قطع نظر وجہی کی تصنیف ''سب رس'' زیادہ معروف اور ادبی نقطہ نظر سے اہم ہے۔ تمام مورخین ادب نے اسے کما حقہ اہمیت دی ہے چونکہ اس کے مآخذ کے بارے میں خود وجہی نے کچھ نہیں لکھا، اس لیے اس کے مآخذ پر مولوی عبدالحق نے اپنے فاضلانہ مقدمے میں نظر ڈالی ہے لیکن اس موضوع پر عزیز احمد کا مبسوط مقالہ ''سب رس کے مآخذ اور مماثلات'' (''اردو'' جنوری ۱۹۵۰ء اور اپریل ۱۹۵۰ء) بہت جامع ہے۔ ''سب رس'' کا مآخذ فتاحی نیشاپوری کی تصنیف ''دستور العشاق'' ہے۔ مولوی عبدالحق کا مرتبہ نسخہ ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا، جبکہ ''دستور العشاق'' کو گرین شیلڈز نے برلن سے ۱۹۲۶ء میں اپنی جامع تحقیق کے ساتھ مرتب کیا۔ عزیز احمد نے اسی نسخے سے استفادہ کرتے ہوئے ''سب رس'' کے اس راست مآخذ اور اس کے مماثلات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

شیخ محمود چشتی خوش دہاں بیجاپوری کا ایک رسالہ نثر خواجہ حمید الدین شاہد نے مرتب کیا ہے، سخاوت مرزا نے محمود چشتی کے ایک اور نثری رسالے کا ذکر کیا ہے جس کا نام ''تنبیہ الخلائق'' ہے۔ یہ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس کا ایک نسخہ کراچی کے ایک نجی کتب خانے میں بھی ہے۔ اسی کو خواجہ حمید الدین شاہد نے اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کیا تھا لیکن وہ اس کے نام کا تعین نہ کر سکے تھے اور اس کے دوسرے نسخے سے بے خبر رہے۔ خاور نامہ رستمی بیجاپوری کو ایک فاضل محقق شیخ چاند ابن حسن نے مرتب کیا تھا۔ اس کے تعارف پر مشتمل ایک مقالہ سخاوت مرزا نے تحریر کیا ہے۔ اس مثنوی پر خواجہ حمید الدین شاہد نے بھی ایک مبسوط مقالہ تحریر کیا ہے (''صحیفہ'' اکتوبر ۱۹۶۸ء) اور اس میں فارسی و دکنی متن کا تقابلی جائزہ لیا ہے۔

گارساں دتاسی نے دکنی زبان کی ایک مثنوی ''کام روپ وکلا'' کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کا مصنف تحسین الدین تھا، جس نے ۱۱۷۰ھ میں یہ مثنوی لکھی تھی۔ ضمیر نیازی نے اس مثنوی پر تحقیقی نظر ڈال کر اس کے فنی محاسن کا جائزہ لیا ہے (''نیا دور'' کراچی شمارہ ۷۰۔۶۹)۔

شاہ تراب کی ایک مثنوی ''مہ جبین وملا'' بھی دکنی میں لکھی تھی۔ اس کے تعارف میں سخاوت مرزا نے ایک مقالہ لکھا ہے (ایضاً، ۱۹۶۱ء) اس کے بارے میں سخاوت مرزا اور سیدہ جعفر دونوں کا خیال ہے کہ یہ میر کی مثنوی ''دریائے عشق'' کی مماثل ہے۔ ''دریائے عشق'' کے مآخذ کے تعلق سے ایک اہم انکشاف ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے کیا ہے۔ اس موضوع پر ان کا ایک مقالہ ''دریائے عشق کا ایک مآخذ'' (''اردو'' اپریل ۱۹۵۱ء) ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو ایک نجی کتب خانے سے ایک نامعلوم شاعر کی ایک نامعلوم مثنوی ''قضا و قدر'' کا نسخہ ملا، جس کا قصہ سوائے چند معمولی اختلافات کے بالکل ''دریائے عشق'' کا ہے۔ ''قضا و قدر'' اورنگ زیب کے ایک صوبے دار شائستہ خان کے ایک ملازم کی داستان عشق ہے۔ مخطوطے کا سنہ کتابت ۱۱۱۳ھ ہے۔ یہ مثنوی دکن میں کافی مقبول تھی۔ چونکہ ''دریائے عشق'' کا سنہ تصنیف نامعلوم ہے، اس لیے یہ خیال بھی کیا گیا ہے کہ شاہ تراب کی مذکورہ مثنوی بھی ''دریائے عشق'' کا مآخذ ہو سکتی ہے۔ پروفیسر سید محمد مرتب ''مثنویات میر'' کے مطابق میر سے پہلے دکن کے شعرا نے بہت سی مثنویاں لکھی تھیں اور ان میں سے بعض میر کی نظر سے گزر چکی تھیں۔ سخاوت مرزا نے اس موضوع پر اپنے مذکورہ مقالے میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ شاہ تراب کی مثنوی میر کی مثنوی کا جواب بھی ہو سکتی ہے۔

''دریائے عشق'' کی طرح ''مثنوی گلزار نسیم'' کے مآخذ بھی تحقیق طلب رہے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ''گلزار نسیم'' کا قصہ گل بکاؤلی اردو میں نیا نہیں تھا۔ نسیم نے یہ مثنوی ۱۲۵۴ھ میں نظم کی تھی۔ اس سے قبل نثر میں قصہ گل بکاؤلی کو نہال چند لاہوری نے ''مذہب عشق'' کے نام سے فورٹ ولیم کالج کے لیے لکھا تھا۔ نسیم نے مثنوی کے آغاز میں اس قصے کے نثر میں ہونے کا ذکر کیا ہے لیکن وہ نظم میں اس قصے کے وجود سے شاید لاعلم تھے۔ محققین نے اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے دو فارسی مثنویوں ''مثنوی رفعت'' اور ''مثنوی فرحت'' اور ایک اردو ''مثنوی ریحان'' کا حوالہ دیا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اس موضوع پر ایک طویل مقالہ ''گلزار نسیم اور اس کے مآخذ قصہ'' (''صحیفہ'' جولائی ۱۹۶۸ء) لکھ کر اس ضمن میں ہونے والی تحقیقات کا جائزہ لیا ہے۔

اس کا ایک نسخہ مکتوبہ ۱۲۱۱ھ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں اچھی حالت میں موجود ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنے مقالے میں گلزار نسیم کے اس مآخذ پر مفصل روشنی ڈالی ہے ''گلزار نسیم'' کے ایک جزوی مآخذ پر افسر امروہوی نے توجہ دی ہے (''نیا دور'' کراچی، شمارہ ۵۶۔۵۵، ۱۹۷۱ء) یعنی نسیم نے اپنی مثنوی میں مرغ اسیر کی جو حکایت درج کی ہے وہ بھی طبع زاد نہیں، بلکہ جلال جعفر فراہانی (متوفی ۷۳۶ھ) کی اسی نوع کی ایک داستان سے ماخوذ ہے۔

ڈاکٹر نجم الاسلام نے شمالی ہند کے قدیم اردو نثر کے نمونوں کی دید و دریافت کے سلسلے میں مفید کام کیے ہیں۔ فضلی کی تصنیف ''کربل کتھا'' شمالی ہند کی قدیم ترین نثری تصانیف میں سے ایک ہے۔ ''کربل کتھا'' کی اشاعت کے بعد بھارت کے کچھ اور فضلا مثلاً ڈاکٹر گیان چند، ڈاکٹر محمود الٰہی اور ڈاکٹر انصار اللہ نظر

نے بھی ''کربل کتھا'' پر تحقیقی مقالات تحریر کیے ہیں۔ ان سب کو پیش نظر رکھ کر ڈاکٹر نجم الاسلام نے تنقیدی اور تحقیقی نظر سے ان فضلا کی تحقیقات کو پرکھا ہے۔ اس ضمن میں ''کربل کتھا'' سے قدیم نثری تصانیف کا بھی ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ خاص موضوع ہے۔ کئی نادر اور قدیم تصانیف کو انھوں نے ادبی دنیا سے متعارف کرایا ہے۔

اس سلسلے کی ایک تصنیف ''گربہ نامہ'' ہے جو نوطرز مرصع کی تحریک پر لکھا گیا تھا۔ اس کے مطبوعہ و قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں ملتے ہیں۔ اس کا قدیم ترین نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں ہے جو ۱۲۵۰ھ کا مکتوبہ ہے۔ اس کے مصنف کا نام اس کے متن کے حوالے سے میر غلام علی آزاد بلگرامی یا میر غلام علی دہلوی بتایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر نجم الاسلام نے آزاد بلگرامی سے اس قصے کے انتساب کو ناقابل تسلیم قرار دیا کہ یہ کسی اور غلام علی کی تصنیف تو ہوسکتی ہے، آزاد بلگرامی کی نہیں۔ فاضل مقالہ نگار اس ضمن میں اپنے مقالہ ''گربہ نامہ'' (''صحیفہ'' اپریل ۱۹۶۸ء) کی تکمیل کے بعد بھی اس کے حقیقی مصنف کی کھوج میں لگے رہے، چنانچہ انھیں اس میں کامیابی ہوگئی۔ انڈیا آفس کے نسخے کے عکس میں مصنف کا نام ''غلام علی امروہوی'' درج ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی رہنمائی کے بموجب یہ اندراج سہو کتابت کا شکار ہے ''امر دہلوی'' کے بجائے امروہوی ہونا چاہیے۔ اس طرح تحقیق کی مزید راہ کھلی اور اس کے مصنف کا نام غلام علی امروہوی ہونا ثابت ہوا۔ فاضل مقالہ نگار نے امروہہ کے قدیم مآخذ ''تواریخ واسطیہ'' مصنفہ سید رحیم بخش امروہوی مطبوعہ ۱۳۲۲ھ غلام علی امروہوی کے حالات بھی اخذ کیے اور اس سلسلے کو اپنے دوسرے مقالے ''گربہ نامہ کا مصنف'' (''صحیفہ'' اپریل ۱۹۷۱ء) میں شائع کیے۔

قدیم تصانیف کی ذیل میں اردو کی نادر مثنوی ''جنگ نامہ'' مصنفہ اپورب کشن کنور ۱۸۴۴ء میں شائع ہوئی تھی لیکن یہ نایاب ہے۔ اس کا ایک مطبوعہ نسخہ شریف الحسن کو استنبول میں دستیاب ہوا، چنانچہ انھوں نے اس کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کر کے ایک مقالے میں اس کے محاسن پر روشنی ڈالی (''اردو نامہ'' اکتوبر ۱۹۶۳ء) یہ مثنوی گلزار نسیم سے چار سال قبل لکھی گئی تھی۔

کافی عرصہ قبل مولوی عبدالحق نے قرآن حکیم کے اردو ترجمہ اور تفسیروں پر ایک مقالہ لکھا تھا (''اردو'' جنوری ۱۹۳۷ء)، یہ موضوع بعد میں بھی مختلف کتابوں اور مقالات میں نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر محمد مسعود احمد نے اس موضوع پر قابل قدر محنت کی اور پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ تحریر کیا، جس کا کچھ حصہ شائع ہوگیا ہے (''فکر ونظر'' اسلام آباد، دسمبر ۱۹۷۱ء) اسی سے متعلق ایک موضوع ''قرآن حکیم کے قدیم ترین منظوم ترجمہ و تفسیر'' پر ضمیر نیازی نے ایک مقالہ (''اردو'' اپریل ۱۹۷۵ء) لکھ کر شاہ غلام مرتضیٰ جنوں کے ترجمہ و تفسیر اور مصنف کے حالات پر نظر ڈالی ہے۔ خطوط غالب پر مولانا غلام رسول مہر نے خصوصی توجہ دے کر کام کیا ہے اور ضخیم مجموعہ تیار کیا۔ دیگر حضرات کو بھی غالب کے غیر مطبوعہ و غیر مدون خطوط دستیاب ہوتے رہے لیکن تحقیقی لحاظ سے خطوط کی تاریخوں اور ترتیب پر سید قدرت نقوی نے نظر ڈالی۔ ضمنی طور پر تو متعدد ماہرین غالبیات نے غالب کے خطوط کی تاریخوں پر اظہار خیال کیا ہے لیکن ان کی تاریخی ترتیب کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ اگر مکمل صحت کے ساتھ ترتیب قائم ہو جائے تو بعض تاریخی واقعات کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے۔ ان کا مقالہ ''غالب کے خطوط، تاریخیں اور ترتیب'' (''ماہ نو'' فروری ۱۹۶۸ء اور فروری ۱۹۶۹ء) اسی انداز کی ایک کوشش ہے۔ مکمل تاریخی ترتیب کا کام تو یقیناً بڑا دشوار اور قریب قریب ناممکن ہے لیکن خطوط کے ادوار ہی کا تعین ہو جائے تو اس سے بھی غالب کے ذہنی ارتقا اور اس کے حالات و عہد کے بارے میں رائے قائم کرنا آسان ہو جائے۔ اس جانب ڈاکٹر سید معین الرحمن نے اپنے ایک مقالے ''خطوط غالب کے ادوار'' ''تحقیق غالب'' (لاہور، ۱۹۸۰ء) میں توجہ دلائی ہے۔ انھوں نے غالب کے خطوط کے تیئیس برس کے عرصے ۱۸۴۶ء تا ۱۸۶۹ء کو دو ادوار میں تقسیم کرنا ضروری خیال کیا ہے۔ ان کے نزدیک حد فاصل وسط نومبر ۱۸۵۸ء ہے کیونکہ اس عرصے تک غالب نے جو خطوط لکھے تھے، وہ سب کے سب بے تکلف دوستانہ تھے لیکن اس کے بعد کے خطوط کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جاسکتی۔

ڈاکٹر معین الرحمن نے ''عود ہندی'' پر بھی ایک مبسوط تحقیقی مقالہ لکھ کر شواہد سے یہ ثابت کیا ہے کہ اس میں شامل خطوط کی تعداد، جیسا کہ مرتضیٰ حسین فاضل نے اپنے مرتبہ نسخے میں ۱۶۷ بتائی ہے، دراصل یہ تعداد ۱۷۶ ہے۔ مہیش پرشاد اور مالک رام نے یہ تعداد ۱۶۸ بتائی تھی اور مولانا عرشی کے خیال میں یہ تعداد ۱۶۲ تھی اور مولانا مہر کا خیال تھا کہ یہ تعداد ۱۶۳ سے زیادہ نہیں تھی۔ ڈاکٹر معین الرحمن نے ''غالب و مجروح کی مکاتیب'' پر بھی سیر حاصل نظر ڈالی (''اردو'' جنوری ۱۹۶۹ء) اور متعدد غیر مدون خطوط تلاش کر کے انھیں ایک ترتیب دی ہے۔

ڈاکٹر معین الرحمن نے گل رعنا کے مطالعے پر مشتمل تین مبسوط مقالات تحریر کیے ہیں (مشمولہ ''تحقیق غالب'') ڈاکٹر معین الرحمن کا ایک اہم مقالہ ''غالب کی معدوم تصنیفات'' کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ غالب کی کئی نادر تصنیفات کی دریافت کے باوجود بعض تصنیفات کا ذکر ابھی تک دستیاب نہیں۔ فاضل مقالہ نگار نے ایسی سات تصنیفات کا ذکر کیا ہے، جن کا حوالہ خود غالب کی تحریروں میں ملتا ہے لیکن یہ دستیاب نہیں ہوسکیں۔

اردو ناول کی تحقیق میں عام طور پر مولوی نذیر احمد کے ناول ''مراۃ العروس'' کو پہلا ناول قرار دیا جاتا ہے۔ بھارت میں ڈاکٹر محمود الٰہی نے مولوی کریم الدین کی تصنیف ''خطوط تقدیر'' (مطبوعہ لاہور ۱۸۶۲ء) کو اردو کا پہلا ناول قرار دیا تھا لیکن اس بنا پر کہ یہ محض ایک رزمیہ داستان ہے، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے اس کی تردید کی (''نگار'' کراچی، اگست ۱۹۶۷ء) داستان اور ناول کے درمیانی عہد میں واقعاتی اور اصلاحی کہانیوں کے مختلف نمونے لکھے گئے، جن میں سے کئی دستیاب ہیں۔ ان کا ذکر مولوی نذیر احمد پر ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کی فاضلانہ تصنیف میں ملتا ہے لیکن اس سلسلے کی ایک اہم کڑی فاضل محقق کو بعد میں دستیاب ہوئی، یہ مولوی وزیر علی کی چالیس واقعاتی و اصلاحی کہانیوں کا مجموعہ ''مراۃ النساء'' ہے جو ۱۲۸۰ھ کی تصنیف ہے۔ اس کے تعارف و تحقیق پر انھوں نے ایک مقالہ تحریر کر کے اس کی اہمیت اجاگر کی ہے (''اورینٹل کالج میگزین، ستمبر ۱۹۷۱ء) ناول ہی کے ضمن میں کسی خاتون کے لکھے ہوئے پہلے ناول کے تعلق سے پروفیسر وقار عظیم نے ''اصلاح النسا'' کو پہلا ناول قرار دیا (''صحیفہ'' اپریل ۱۹۶۸ء) اسے تاج النساء بنت شمس العلما سید وحید الدین خان نے تحریر کیا تھا اور یہ ۱۸۸۱ء میں پٹنہ سے شائع ہوا۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے اپنے ایک مقالے میں مولوی نذیر احمد کے ناول ''توبۃ النصوح'' پر لکھی جانے والی پہلی تنقید کا سراغ لگایا (''صحیفہ'' اپریل ۱۹۷۰ء) اس میں انھوں نے یہ بھی تحقیق کی کہ یہ ناول، جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے، ۱۸۷۷ء کی تصنیف نہیں بلکہ ستمبر ۱۸۷۳ء سے پہلے لکھا گیا تھا اور اسے چھاپنے سے قبل ولیم میور اور کیمپسن کو ملاحظے کے لیے پیش کیا گیا تھا۔ میور ممالک مغربی و شمالی کا لیفٹیننٹ گورنر اور کیمپسن سر رشتہ تعلیم کا ناظم تھا۔ کیمپسن نے ۱۸۸۴ء میں ''توبۃ النصوح'' کو انگریزی ترجمہ کر کے توضیحی حواشی کے ساتھ لندن سے شائع کیا اور اس پر دیباچہ میور سے لکھوایا۔ اس اشاعت سے قبل ان دونوں انگریزوں میں اس ناول کے بارے میں مراسلت کا تبادلہ ہوا۔ جن کی حیثیت اس ناول کے محاکے اور تنقید کی سی ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے مذکورہ دیباچہ اور اس مراسلت کو اس ناول پر پہلی تنقید قرار دیا ہے اور اس مراسلت کو نقل کیا ہے۔ یہ تبصراتی مراسلت، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کے مرتبہ ''ابن الوقت کے نسخے'' (لاہور، ۱۹۶۴ء) میں بطور ضمیمہ شامل ہے۔

''توبۃ النصوح'' پر ایک خاص محققانہ نظر ڈاکٹر محمد صادق نے ڈال کر یہ ثابت کیا ہے کہ نذیر احمد کے اس ناول کا مآخذ اٹھارویں صدی کے ایک انگریز ناول نگار ڈینئل ڈیفو کا ناول "The Family Instructor" ہے۔ نذیر احمد نے اپنے دیباچے میں کہیں اس امر کی طرف اشارہ نہیں کیا تھا، بلکہ دیباچے سے ظاہر ہوتا ہے کہ قصہ کا مذہبی ڈھانچہ انھوں نے اپنے دینی رجحانات کے تحت خود ہی تیار کیا ہے۔ ڈاکٹر صادق نے اولاً رسالہ ''ماہ نو'' (کراچی، مئی ۱۹۵۱ء) میں ''نذیر احمد، ایک جائزہ'' کے عنوان سے اپنے مقالے میں نذیر احمد کے ناولوں پر تبصرہ کرتے ہوئے اس انگریزی مآخذ کا سرسری طور پر ذکر کیا تھا لیکن پھر ایک علیحدہ مقالے ''توبۃ النصوح اور اس کا مآخذ'' (''ماہ نو'' دسمبر ۱۹۵۴ء) میں دونوں ناولوں کا تقابلی مطالعہ کر کے ان دونوں کے مماثلات اور اختلافات دکھائے ہیں۔

ناولوں کے ضمن میں سرشار کا آخری ناول ''چنچل نار'' تسلیم کیا گیا ہے لیکن محققوں کے لیے یہ ایک دلچسپ موضوع ثابت ہوا۔ اس ناول کے سرشار کی تصنیف ہونے کا ذکر پہلے پہل چکبست نے اپنے ایک مضمون میں کیا تھا جو ''مضامین چکبست'' میں شامل ہے۔ یہ مضمون سرشار کے انتقال کے ایک سال بعد لکھا گیا تھا۔ اس وقت سے عام طور پر اس ناول کو سرشار کی تصنیف قرار دیا جانے لگا لیکن نصیر الدین ہاشمی نے ۱۹۶۱ء میں ایک مضمون لکھ کر ''چنچل نار'' کو سرکشن پرشاد کا ناول قرار دیا اور اس کے ثبوت میں اس کا ۱۹۰۳ء کا وہ ایڈیشن بھی تلاش کر لیا جو حیدر آباد دکن میں شائع ہوا تھا لیکن اس موضوع پر بحث کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک مفصل مقالہ اس بارے میں ڈاکٹر احراز نقوی نے تحریر کیا ہے (''نقوش'' نومبر ۱۹۶۴ء) کمال محنت کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ ناول کشن پرشاد کا ہی تصنیف کردہ ہے۔ ان کے خیال میں اسے سرشار کا ناول ثابت کرنے کے لیے کوئی معتبر شہادت موجود نہیں ہے۔

محمد حسین آزاد کی تصانیف پر ڈاکٹر محمد صادق اور ڈاکٹر اسلم فرخی نے سیر حاصل نظر ڈالی ہے لیکن تحقیق کے مزید گوشے سامنے آئے ہیں۔ ''نیرنگ خیال'' کے مآخذ پر ڈاکٹر صادق کا مقالہ چونکا دینے والے انکشافات کا حامل تھا کہ آزاد کے اس مجموعے میں شامل مضامین کس کس انگریزی مضمون کا ترجمہ ہیں۔ اسی نوعیت کا مقالہ ''سخندان فارس'' کے مآخذ کے بارے میں بھی ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق ''سخندان فارس'' کا ایک علمی مآخذ جان مالکم کی انگریزی تصنیف ''تاریخ ایران'' ہے، اس کے کئی مطالب آزاد نے لفظی یا ترجمے کی صورت میں نقل کر لیے ہیں۔ فاضل محقق نے ایسے تمام مقامات کی نشاندہی کی ہے۔ ان کے یہ دونوں مقالات ان کے مقالات کے مجموعے ''آب حیات کی حمایت میں اور دوسرے مضامین'' میں شامل ہیں۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے ''نیرنگ خیال'' کے مطبوعہ نسخوں کے تحقیقی جائزے پر مشتمل مقالہ (صحیفہ اپریل ۱۹۷۱ء) لکھا اور اس کے مختلف مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھ کر ان کے اختلاف متن کی نشاندہی کی۔ ان کی تحقیق کے مطابق اختلاف متن کے باعث یہ تصنیف مسخ ہو کر رہ گئی۔ اس مقالے کے حوالے سے تحسین سروری نے بھی ایک مقالہ (''صحیفہ''، اکتوبر ۱۹۷۱ء) لکھ کر ڈاکٹر ذوالفقار کی باتوں کا اعادہ کیا ہے لیکن ساتھ ہی ان کی بھی فروگزاشتوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''نیرنگ خیال'' کے علاوہ فاضل محقق تحسین سروری نے اپنے مقالے میں آزاد کی دیگر تصانیف ''نظم آزاد'' اور ''نصیحت کا کرن پھول'' کی اشاعت اور ان کے مطالب کا

محققانہ جائزہ تحریر کیا ہے اور ان اغلاط و فروگزاشتوں کی طرف اشارے کیے ہیں جو محققین بالخصوص ڈاکٹر اسلم فرخی سے سرزد ہوئی ہیں۔ تحسین سروری کے اس مقالے سے پیوستہ یونس جاوید کا بھی ایک مقالہ شائع ہوا ہے۔ انھوں نے مجلس ترقی ادب، لاہور کے کتب خانے میں ''نیرنگ خیال'' کے نسخوں کو دیکھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس کا متن (اشاعت ثانی) تو ایک مرتبہ چھپا مگر اس کے سرورق کو دو مختلف اوقات میں چھاپا گیا۔

تصانیف میں تحقیقی لحاظ سے تذکروں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ بلکہ یہ واقعہ ہے کہ اردو میں تحقیقی کام تذکروں کی مدد سے آگے بڑھا ہے۔ چنانچہ محققین نے تذکروں کو مرتب کرنے، ان سے استفادہ کرنے اور ان کی تحقیق میں خاص دلچسپی لی ہے۔ قیام پاکستان سے قبل محمود شیرانی، مولوی عبدالحق، حبیب الرحمٰن خان شیروانی، ڈاکٹر زور، پروفیسر سید محمد، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور ڈاکٹر سید عبداللہ نے تذکرہ نگاری پر بھی کام کیے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد تذکروں کی اہمیت کا قابل ذکر احساس ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مرتبہ ''نگار'' کے ''تذکروں کا تذکرہ نمبر'' میں نظر آتا ہے۔ اس نمبر کی اشاعت نے اردو میں تذکرہ نگاری، اردو تذکروں کے جائزے، ان کی تحقیق اور تحقیق میں ان سے استفادے کی جانب عام لوگوں کو بھی متوجہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کام میں مثالی دلچسپی لی اور تذکروں کی تحقیق کے کام کو مستقل مزاجی سے جاری رکھا۔ ان کی مبسوط اور ضخیم تصنیف ''اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگار'' (لاہور، ۱۹۷۲ء) اس موضوع پر بلاشبہ اب تک سب سے وقیع اور جامع کام ہے۔ اس میں تذکرہ نگاری کے ارتقا کا جائزہ بھی تحریر کیا گیا ہے اور ''آب حیات'' کی تصنیف تک لکھے جانے والے تقریباً تمام تذکروں کے بارے میں تمام ضروری معروضی و موضوعی معلومات اس تصنیف میں یکجا ہو گئی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی اس تصنیف پر جامعہ کراچی نے ڈی لٹ کی سند بھی تفویض کی ہے اور ادبی دنیا میں اس کی خاطر خواہ ستائش بھی ہوئی ہے۔

پروفیسر حبیب اللہ خان غضنفر نے ایک مبسوط مقالہ ''اردو کے قدیم تذکرے۔ ایک تقابلی مطالعہ'' (اردو جنوری ۱۹۵۳ء) لکھ کر اردو کے تین قدیم تذکروں ''نکات الشعرا''، ''تذکرہ ریختہ گویان'' اور ''مخزن نکات'' کا تقابلی و تحقیقی جائزہ لیا۔ ان کے جائزے اور تحقیقی تجزیے کے مطابق ان تینوں تذکروں میں ''مخزن نکات'' حقیقی معنوں میں پہلا تذکرہ اور صحیح تنقید کا پہلا نمونہ ہے۔

تذکروں پر مجموعی تحقیق کے علاوہ انفرادی تذکروں پر بھی محققین نے تحقیقی و تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ ڈاکٹر آغا افتخار کافی عرصے تک یورپی ممالک میں رہے ہیں۔ وہاں رہ کر انھوں نے اردو کے تعلق سے قابل قدر تحقیقی و تصنیفی کام کیے ہیں۔ ان کی ایک تصنیف ''یورپ میں تحقیقی مطالعے'' ان کے ایسے دیگر تحقیقی مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں گارساں دتاسی کی ''تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی'' پر جو دراصل تذکرے کی تالیف کی تصنیف ہے، ایک مقالہ شامل ہے۔ جس میں اس تاریخ کے مآخذ یا ان کے تذکروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن سے دتاسی نے اپنے تذکرے کی تالیف میں مدد لی ہے۔ ان کے مطالعے کے مطابق دتاسی نے تقریباً ۶۳ قدیم تذکروں سے اپنی کتاب میں استفادہ کیا تھا۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی نے تذکروں کے ضمن میں ''دیوان جہاں'' کو اپنے ایک مقالے (مشمولہ ''تحقیق کی روشنی میں'' لاہور، ۱۹۶۳ء) میں تذکرے کی بجائے منتخب اشعار کا ایک گلدستہ قرار دیا ہے اور پھر اس تذکرے کی تلخیص شائع کر دی ہے۔ مطالب برقرار رکھے ہیں اور اشعار میں صرف نمائندہ اشعار نقل کیے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''نکات الشعرا'' کا تنقیدی (یعنی تحقیقی اور تنقیدی) مطالعہ کیا ہے (مشمولہ، نذر رشید مرتبہ مالک رام، دہلی ۱۹۸۱ء) ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کے مطابق میر اپنے اس تذکرے کا ایک نقش اول تقریباً ۱۱۶۰ھ میں لکھ چکے تھے۔ اس لیے یہ اردو شعرا کا اولین تذکرہ ہے اور بعد میں قطع و برید اور حذف و اضافہ سے میر نے اسے موجودہ شکل میں ۱۱۶۵ھ میں یا اس کے کچھ بعد مکمل کیا۔

میر نے جس سال ''نکات الشعرا'' ترتیب دی، اسی سال حمید اورنگ آبادی نے ''گلشن گفتار'' لکھا۔ میر کے تذکرہ کا سال تکمیل متعین نہیں۔ جبکہ ''گلشن گفتار'' اور ۱۱۶۵ھ میں مکمل ہونے والے دوسرے تذکرہ ''تحفۃ الشعرا'' (افضل بیگ قاقشال) کا سن تصنیف متعین ہے۔ اس باب میں مفصل بحث ڈاکٹر اقتدا حسن نے اپنے مرتبہ تذکرے ''مخزن نکات'' میں کی ہے۔ اگر ''نکات الشعرا'' کا ''نقش اول'' نظر انداز کیا جائے، تو اس کی تقدیم کا تصور قابل قبول نہیں رہتا۔ ''گلشن گفتار'' کو سید محمد صاحب نے ۱۹۲۹ء میں اپنے مفید مقدمے اور حواشی کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ اس تذکرے پر تحسین سروری نے ایک مقالہ (''صحیفہ'' اکتوبر ۱۹۶۸ء) لکھ کر اس شبہے کا اظہار کیا ہے کہ مطبوعہ تذکرہ کسی ناقص نسخے کی نقل ہے۔ تذکرہ نگار نے کوئی مبسوط تذکرہ مرتب کیا ہوگا اور مرتب تذکرہ کو جو نسخہ ملا وہ کسی ایسے شوقین کا منقولہ ہے، جس نے اپنے مذاق کی حد تک چند شعرا کے تراجم مع دیباچہ مولف نقل کر لیے۔ فاضل مقالہ نگار کی تحقیق کے مطابق موجودہ نسخہ نہ صرف اصل کی تلخیص ہے۔ بلکہ اس میں حذف و اضافہ بھی ہوا ہے۔

''تذکرہ سرور'' یا ''عمدۂ منتخبہ'' اردو کے معیاری تذکروں میں شمار ہوتا ہے۔ اسے بھارت میں خواجہ احمد فاروقی نے مرتب کر کے شائع کیا۔ اس نسخے کی

بنیاد انڈیا آفس کے نسخے پر رکھی گئی ہے اور پیرس کے نسخے سے تصحیح کی گئی ہے۔ اس کے دو اہم نسخے انجمن اور قومی عجائب گھر کراچی کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ فاضل مرتب نے ان سے استفادہ نہیں کیا۔ جبکہ موخر الذکر نسخہ غالباً سرور کا اصلاح شدہ ہے۔ چنانچہ اول الذکر دو نسخوں کی مدد سے ترتیب دیئے جانے کے باوجود یہ مرتب نسخہ ناقص رہ گیا ہے۔ کہیں تخلص نداردہے اور کہیں اشعار ناقص ہیں۔ کلب علی خان فائق کے خیال میں اگر فاضل مرتب نے ذراسی زحمت گوارا کی ہوتی تو تخلص اور ناموں کی تصحیح ہو سکتی تھی اور ناقص اشعار بھی درست ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ایک مقالہ (جنوری ۱۹۶۳ء) میں انھوں نے محض معاصر تذکروں سے ان مقامات کی تصحیح کی ہے جو اس مرتبہ نسخے میں ناقص رہ گئے تھے۔ مشفق خواجہ نے بھی اپنے مذکورہ ''جائزہ مخطوطات'' میں کراچی کے قومی عجائب گھر کے نسخے کا تعارف کراتے ہوئے مرتب تذکرہ کی متعدد فروگزاشتوں کا حوالہ دیا ہے۔

اسی طرح ایک ضخیم تذکرہ مولوی کریم الدین نے فیلن کے اشتراک سے ''طبقات الشعرائے ہند'' تحریر کیا تھا۔ اس کے تعارف اور تحقیق پر ایک مبسوط مقالہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے لکھا ہے (''صحیفہ'' جولائی ۱۹۶۷ء) عبدالحئی صفا بدایونی کے تذکرہ ''شمیم سخن'' کی دو جلدوں کا تعارف ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی مذکورہ تصنیف میں موجود ہے۔ اس کی پہلی جلد میں ان شاعروں کا ذکر ہے جو ۱۲۸۸ھ تک فوت ہو چکے تھے اور دوسری جلد شاعرات کے ذکر پر مشتمل ہے لیکن اس تذکرہ کی بابت سید امجد الطاف کے اپنے ایک مقالہ ''ایک گم شدہ تذکرہ'' (''فنون'' مئی ۱۹۶۵ء) میں اس کی دونوں جلدوں کے سنین اشاعت اور ان کی داخلی شہادتوں کو سامنے رکھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس تذکرے کی دراصل تین جلدیں ہیں، جن میں سے پہلی اور تیسری جلدیں دستیاب ہیں۔

غالب کے نسخہ امروہہ کے بارے میں جس طرح یہ بحث کی گئی ہے کہ یہ جعلی ہے، اسی طرح رام بابو سکسینہ کے شائع کردہ تذکرہ ''مرقع الشعرا'' کے بارے میں بھی محققین متفق ہیں کہ یہ بھی جعل سازی کا ایک نمونہ ہے۔ بھارت کے اکبر علی خان کا مقالہ (''صحیفہ'' جولائی ۱۹۷۲ء) اس سلسلے میں خاصا مدلل تھا لیکن کلب علی خان فائق نے مزید بحث کی ہے (''نذر زیدی'' مرتبہ مالک رام، دہلی ۱۹۸۰ء) انھوں نے داخلی شہادتوں سے بحث کرتے ہوئے یہ حتمی رائے دی ہے کہ یہ تذکرہ مختلف تذکروں کے اجزا سے مرتب کیا گیا ہے۔

(ج) اصناف ادب

ادب کی مختلف اصناف کے تحقیقی جائزے پر مشتمل پاکستان میں کام تو ہوا ہے لیکن بہت زیادہ قابل اطمینان اور مستقل نہیں، بعض اہم اور مستقل اصناف جیسے غزل، افسانہ پر ابھی تک محققین کما حقہ توجہ منعطف نہیں کر سکے۔ کئی رسائل بالخصوص ''نقوش''، ''فنون'' اور پھر ''اوراق''، ''نیا دور''، ''افکار''، ''سیپ'' اور ''نگار'' نے ضخیم اشاعتوں کا اہتمام تو کیا لیکن ان میں شامل مندرجات تحقیق کے معیار کے لحاظ سے قابل توجہ نہیں ''نقوش'' اور ''فنون'' نے غزل نمبر شائع کیے لیکن یہ معیاری تحقیق کے حامل نہیں۔ افسانہ نمبر بھی بالعموم عصری رجحانات اور ہم عصر افسانوں کے انتخابات پر مشتمل رہے۔ یہاں صرف نثر میں داستان، ناول اور شاعری میں مثنوی، رباعی اور بعض دوسری اصناف پر توجہ دی گئی ہے۔ ذیل میں ایسے کاموں کا سرسری تذکرہ مقصود ہے جو اصناف ادب کے تعلق سے کیے گئے ہیں۔

یہاں بھی سخاوت مرزا کے تحقیقی کاموں کا ذکر سب سے پہلے کیا جا سکتا ہے کیونکہ انھوں نے اردو کی دو قدیم اور غیر معروف اصناف سے متعارف کرایا۔ ہماری ادبی تہذیب میں مشاعروں کے ساتھ ساتھ ''مناقب بازی'' بھی داخل رہی ہے۔ مشاعرے ہماری مجلسی زندگی کی ایک ضرورت بن گئے تھے لیکن صوفیہ اور فقرا نے مشاعروں کی بجائے مناقب بازی سے بھی بہت کام لیا ہے۔ خصوصاً مذہبی نوعیت کی تقریبات اور عرس کے موقعوں پر مناقب کو جمع ہو کر آپس میں اسرار و معرفت کے اشعار ایک دوسرے کے جواب میں جوش و خروش کے ساتھ کہا کرتے تھے۔ سخاوت مرزا نے اس صنف ادب پر ایک مبسوط مقالہ (''اردو''، جولائی ۱۹۵۸ء) لکھ کر اردو کے قدیم مناقب نقل کیے اور بعض مناقب گو شاعروں کے حالات درج کیے ہیں۔ اسی طرح ایک قدیم دکنی صنف سخن ''برہنی'' ہے، جس میں عاشق مہجور اپنے محبوب کے دیدار کا متمنی ہوتا ہے اور فراق یار کی کیفیت کو نظم میں بیان کرتا ہے۔ سخاوت مرزا نے دکن کے مختلف شعرا کی برہنوں کے نمونے گیارھویں صدی ہجری سے لے کر وسط تیرھویں صدی ہجری تک اپنے ایک مقالے (''اردو نامہ'' جولائی ۱۹۷۰ء) میں یکجا کیے ہیں اور شاعروں کے حالات بھی تحریر کیے ہیں۔ ان دونوں اصناف پر یہاں غالباً کسی اور نے توجہ نہیں دی۔

شہر آشوب پر ڈاکٹر سید عبداللہ نے ایک عمدہ مقالہ قیام پاکستان سے قبل لکھا تھا۔ پھر مسعود حسن رضوی ادیب کا ایک مقالہ بھی جو یہاں ''نقوش'' میں شائع ہوا، خاصا وقیع ہے۔ اس صنف ادب کا مبسوط مطالعہ بھارت میں ہوا ہے۔ یہاں فقط ڈاکٹر نعیم مقام حسین جعفری نے اس کی طرف توجہ دی۔ انھوں نے اس موضوع پر پی ایچ ڈی کی سند کے لیے جامعہ کراچی میں اپنا مقالہ داخل کیا لیکن افسوس کہ یہ اب تک شائع نہیں ہو سکا۔ اس کے کچھ اجزا مجلہ ''اردو'' (۱۹۷۶ء تا ۱۹۷۷ء) کی مختلف

اشاعتوں میں شائع ہوئے۔ انھوں نے بعض غیر مطبوعہ شہر آشوب بھی مرتب کر کے شائع کیے۔

''نعت'' کے تعلق سے اردو کے ممتاز نعت گو شعرا کی کہی ہوئی منتخب اور مقبول نعتوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ایک دو مجموعوں کے ساتھ مفصل مقدمات بھی شامل ہیں لیکن انھیں صنف کا ارتقائی اور تنقیدی جائزہ تو کہا جا سکتا ہے، تحقیقی نہیں۔ اس موضوع پر متعدد مقالات بھی اسی نوعیت کے ہیں لیکن افسر امروہوی کا اس موضوع پر مقالہ (''ماہ نو'' جولائی ۱۹۶۳ء) استثنائی ہے۔ اس میں فاضل محقق نے قدیم ادب میں موجود نعتوں کا سراغ لگایا ہے لیکن اس کا یہ جائزہ دکنی دور تک محدود ہے۔ اسی نوعیت کا ایک مقالہ ڈاکٹر سید صفدر حسین کا ''ریختی'' پر ہے (''صحیفہ'' اپریل ۱۹۶۱ء) اس میں دکنی عہد کے مختلف شعرا کے ذکر کے علاوہ زیادہ تر لکھنوی شعرا کے ''ریختی'' کلام کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ریختی پر ایک محققانہ مقالہ ڈاکٹر عندلیب شادانی کا ہے (مشمولہ ''تحقیق کی روشنی میں'' لاہور، ۱۹۶۰ء) جس میں انھوں نے اس کے موجد پر تحقیقی نظر ڈالی ہے۔ ''رباعی'' پر مستقل اور مبسوط کام ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے کیا ہے۔ ان کی تصنیف ''اردو رباعی کا فنی و تاریخی ارتقا'' (کراچی، ۱۹۶۴ء) یہاں اس موضوع پر واحد اور محققانہ و ناقدانہ مقالہ ہے۔ اس میں عہد قدیم سے عہد جدید تک اس صنف سخن کی ارتقائی تاریخ مرتب کی گئی ہے۔ قطعہ نگاری پر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی تصنیف ''اردو میں قطعہ نگاری'' (لاہور، ۱۹۷۷ء) ہے جس میں اس صنف کے فنی جائزے کے ساتھ ساتھ اس کے ارتقا کا جائزہ بھی لیا گیا ہے اور یہ جائزہ دکنی عہد سے لے کر عہد جدید میں فیض اور ندیم کے عہد تک پھیلا ہوا ہے اور قطعہ نگاری پر فقط یہی ایک کام یہاں کیا گیا۔

مثنوی کے ضمن میں ایک بہت مبسوط اور جامع تحقیقی کام ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ''اردو کی منظوم داستانیں'' (کراچی، ۱۹۷۱ء) ہے، جس میں آغاز یعنی ''مثنوی کدم راؤ، پدم راؤ'' سے ۱۹۷۰ء تک لکھی جانے والی تمام اہم اردو مثنویوں اور منظوم داستانوں کا تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ شامل ہے۔

اردو مرثیے پر جو کام یہاں زیادہ ہوئے ہیں، ان کا تعلق قریبی عہد سے زیادہ ہے۔ تحقیقی لحاظ سے قدیم عہد کے مرثیوں کے جائزے پر خواجہ حمید الدین شاہد کا مقالہ ''قدیم اردو میں مرثیہ نگاری'' (''ماہ نو'' اپریل ۱۹۶۸ء) اور عبدالرؤف عروج کا مقدمہ ہے جو ماہنامہ ''نیا راہی'' کراچی کے خاص نمبر (۱۹۶۱ء) ''اردو مرثیے کے پانچ سو سال'' پر لکھا گیا تھا۔

اردو شاعری کے حوالے سے اس کے سیاسی اور سماجی پس منظر پر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کا مبسوط تحقیقی مقالہ (لاہور، ۱۹۶۶ء) ہے، جس میں دکنی دور سے قیام پاکستان تک سیاسی اور سماجی حالات کے پس منظر میں اردو شاعری کے رجحانات اور محرکات کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کا پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ ہے۔ اسی نوعیت کا ایک کام ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے بھی کیا ہے لیکن ان کا یہ کام ''اردو شاعری کے تاریخی و سیاسی پس منظر'' (کراچی، ۱۹۷۵ء) سے متعلق ہے اور اس کا دور اول الذکر مقالے کے مقابلے میں مختصر بھی ہے۔ یعنی یہ اورنگ زیب کی وفات سے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء تک سیاسی اور تاریخی تناظر میں اردو شاعری کے تحقیقی اور تنقیدی تجزیے پر مبنی ہے۔ حالات و واقعات کے تجزیے اور ان کی روشنی میں اردو شاعری کے محرکات و رجحانات کے مطالعے کی یہ ایک بہت بہتر اور عمدہ مثال ہے۔ ان کا یہ مقالہ بھی بنیادی طور پر پی ایچ ڈی کی سند کے لیے لکھا گیا ہے۔ اصناف نثر میں افسانوی ادب پر بہ حیثیت مجموعی پروفیسر سید وقار عظیم نے مستقل مزاجی سے کام کیا ہے اور داستان، ناول اور افسانے پر مختلف صورتوں میں اچھے جائزے تحریر کیے ہیں۔ تحقیق کی نمائندہ مثالیں تو ان کی تحریروں میں موجود نہیں لیکن بعض قدیم داستانوں اور ناولوں کے جائزے میں اس کا عمل دخل موجود ہے۔ ان کی تصانیف میں سے ''ہماری داستانیں'' (مطبوعہ لاہور) متعدد داستانوں کے تحقیقی اور تنقیدی مطالعے پر مشتمل ہے۔ ''داستان سے افسانے تک'' (لاہور، ۱۹۶۰ء) داستان، ناول اور افسانے کے ارتقا اور منتخب تصانیف کے تنقیدی جائزے پر مشتمل مقالات کا مجموعہ ہے۔ داستان کے سلسلے میں دو ایک مقالات بھی قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر غلام حسین اظہر کا مقالہ ''اردو داستان، ایک نفسیاتی جائزہ'' (''اردو'' جولائی ۱۹۷۶ء) داستانوں کی امتیازی صفات اور ان کے مطالعے پر مشتمل ہے۔ اظہر صدیقی کا ''طلسم ہوشربا میں مافوق الفطرت عناصر'' (''اردو'' اپریل ۱۹۷۷ء) کے جائزے پر مشتمل ایک مبسوط مقالہ ہے۔

ناول پر ڈاکٹر سہیل بخاری کی تصنیف ''اردو ناول نگاری'' (لاہور، ۱۹۶۰ء) ناول کے ارتقائی جائزے پر مشتمل ہے، ڈاکٹر عبدالسلام نے بھی اسی موضوع پر ایک مبسوط کتاب ''اردو ناول، بیسویں صدی میں'' (کراچی، ۱۹۷۲ء) تحریر کی ہے جو ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ اس تصنیف میں تحقیق اور تنقید کی ایک بہتر آمیزش موجود ہے۔ اردو ڈرامے پر ڈاکٹر محمد اسلم قریشی نے مستقل مزاجی سے اور مثالی کام کیے ہیں۔ ڈراما نگاری کے فن پر ان کی ایک مفید اور جامع تصنیف ہے لیکن ان کی زیادہ اہم تصنیف ''ڈرامے کا تاریخی و تنقیدی پس منظر'' (لاہور، ۱۹۷۱ء) ہے۔ اس تصنیف میں جو پی ایچ ڈی کا تحقیقی مطالعہ ہے، یورپ اور مشرق وسطیٰ کے ڈراموں کے تاریخی جائزے کے علاوہ برصغیر کے قدیم ڈراموں اور نظریات اور اردو ڈرامے کی تحقیق اور اس کی مختلف اقسام پر سیر حاصل نظر ڈالی گئی ہے۔ ڈرامے

کے باب میں یہ تصنیف ایک قابلِ قدر تحقیقی کاوش ہے۔ ڈرامے پر جن دیگر حضرات نے توجہ دی ہے، ان میں ایک نام عشرت رحمانی کا بھی ہے، اردو ڈرامے کی تاریخ وتنقید پر ان کی ایک کتاب اپنے موضوع پر مفصل ہے (لاہور، ۱۹۵۷ء)۔ جس میں قدیم ڈراما نگاروں سے لے کر جدید عہد کے ڈرا نگاروں کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ دراصل اردو ڈراما نگاری کی ایک ارتقائی تاریخ ہے۔ پروفیسر سید وقار عظیم نے ''آغا حشر اور ان کے ڈرامے'' (لاہور، ۱۹۵۴ء) میں آغا حشر کی ڈراما نگاری پر ایک مبسوط مقدمہ تحریر کیا ہے اور ان کی ڈراما نگاری کے تین ادوار کا تعین کر کے منتخب ڈراموں کی تصحیح و تدوین کی ہے۔ اسی نوعیت کا کام ڈاکٹر ممتاز منگلوری نے امانت لکھنوی کے تعلق سے کیا ہے اور ''اندر سبھا'' پر ایک مفصل مقدمہ تحریر کر کے اس کے متن کی تصحیح کی ہے۔ طنز و مزاح پر ڈاکٹر وزیر آغا کی تصنیف ''اردو ادب میں طنز و مزاح'' (لاہور، ۱۹۵۸ء) اردو نظم و نثر میں طنز و مزاح کے جائزے پر مشتمل ہے۔ اس موضوع پر کئی مقالات بھی لکھے گئے ہیں اور ''نقوش'' کا خاص نمبر اور کراچی کے ایک تعلیمی ادارے کے مجلّے ''ہم سخن'' کا خاص نمبر بھی اس موضوع کی تحقیق کے لیے مفید ہے۔ بچوں کے ادب پر ڈاکٹر اسد اریب کی تصنیف ''بچوں کا ادب، تاریخ و تنقید'' (ملتان، ۱۹۸۲ء) اور محمود الرحمٰن کی تصنیف ''اردو میں بچوں کا ادب'' (کراچی، ۱۹۷۰ء) معیاری جائزوں پر مشتمل ہیں۔ موخر الذکر تصنیف تحقیقی لحاظ سے اس وجہ سے اہم ہے کہ اس میں مندرجات متنوع ہیں اور عہدِ قدیم پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ سائنسی ادب پر خواجہ حمید الدین شاہد کی تصنیف ''اردو میں سائنسی ادب'' (کراچی، ۱۹۶۹ء) واحد مبسوط کام ہے۔ اس میں ان اداروں کی خدمات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے جو سائنس میں اردو کے حوالے سے انجام دی گئی ہیں۔ اس میں اُن مطبوعہ وغیر مطبوعہ تصانیف کی تفصیلات بھی بیان کی گئی ہیں جو سائنس کے مختلف موضوعات پر اردو میں لکھی گئیں۔

دینی ادب پر پروفیسر خورشید احمد کا ایک بہت مبسوط اور جامع مقالہ پنجاب یونیورسٹی کی مرتبہ ''تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و بھارت'' کی جلد دہم میں شامل ہے۔ یہ گزشتہ سو سال سے زائد عرصہ میں لکھے جانے والے دینی ادب کے سیر حاصل مطالعے پر مشتمل ہے۔ اسی موضوع پر ایک زیادہ محققانہ ''اردو کا دینی ادب ۱۸۵۷ء کے بعد'' ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے تحریر کیا ہے (''ہمارا علم و ادب'' حیدر آباد، ۱۹۸۵ء) یہ دینی ادب کی مختلف اصناف، قرآنی تراجم و تفاسیر، احادیث، فقہ، سیرت طیبہ، میلاد نامے، صوفیانہ شاعری، اخلاقی شاعری، سیاسی شاعری، مرثیہ نگاری اور اخبار و رسائل کے تحقیقی مطالعوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے بھی اس موضوع پر خصوصی توجہ دی ہے اور مختلف صورتوں میں محققانہ کام کیا ہے۔ ان کا ایک مقالہ ''اردو میں مذہبی ادب'' (''اردو نامہ'' دسمبر ۱۹۷۵ء) تحریکات اور شخصیات کے حوالے سے مذہبی ادب کے تحقیقی جائزے پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا مبسوط تحقیقی مقالہ ''شمالی ہند میں اردو نثر کے ارتقا میں علمائے کرام کا حصہ'' کے موضوع پر ہے، اس پر کراچی یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹریٹ کی سند عطا کی ہے، ایک لحاظ سے دینی ادب کے تحقیقی مطالعے پر مشتمل ہے۔ افسوس کہ یہ مقالہ شائع نہیں ہوا، راقم نے اسے دیکھا ہے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس موضوع پر جو ۱۸۵۷ء تک پھیلا ہوا ہے، اس سے زیادہ بہتر اور محققانہ کام شاید کہیں نہیں ہوا۔ اس میں شمالی ہند کے تمام مصنف علما کے حالاتِ زندگی، ان کی تمام اردو تصانیف کے تحقیقی، تنقیدی اور لسانی جائزے اور شمالی ہند میں اردو نثر کے ارتقا جیسے موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

سفرنامے اب ادب کی ایک مستقل صنف کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ نئے سفرناموں کی مقبولیت کے ساتھ ساتھ قدیم سفرناموں کی بازیافت اور ان کی تحقیق و ترتیب کی جانب بھی توجہ دی جانے لگی ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے نواب کریم خان کے سفر لندن کے جس روزنامچے کو برٹش میوزیم کے کتب خانے سے تلاش کر کے شائع کیا ہے، فاضل مرتب نے اسے اردو کا پہلا روزنامچہ قرار دیا ہے جو دراصل حالاتِ سفر پر مشتمل ہے لیکن متفقہ طور پر اردو کا پہلا سفرنامہ یوسف خان کمبل پوش کے ''عجائباتِ فرنگ'' کو سمجھا جاتا ہے جو ۱۸۴۷ء میں دہلی سے شائع ہوا تھا۔ پھر یہ دوبارہ لکھنؤ سے ۱۸۷۳ء میں شائع ہوا۔ اس کی اہمیت اور اولیت کے پیشِ نظر اسے تحسین فراقی نے ایک نہایت معلوماتی اور مبسوط مقدمے کے ساتھ مرتب کر کے حال ہی میں (لاہور، ۱۹۸۳ء) شائع کیا ہے اور مفید حواشی اور تعلیقات کا اضافہ کیا ہے۔ اس سفرنامے کا ایک مختصر لیکن بہت جامع تعارف محمد اکرام چغتائی نے تحریر کیا ہے اور اس میں ہندوستانیوں کے لکھے ہوئے یورپ کے قدیم سفرناموں پر تحقیقی نظر ڈالی ہے۔

سفرناموں کی بازیافت کے ضمن میں ایک مختصر سفرنامہ اکبر شاہ خان نجیب آبادی کے رسالہ ''عبرت'' کی قدیم فائلوں میں راقم نے دیکھا تھا۔ یہ ''سیر دکن'' کے نام سے ۱۹۱۶ء میں بالاقساط شائع ہوا تھا۔ اس کے مصنف قائم گنج کے ایک اہلِ علم عبدالغفار خان تھے۔ یہ سفرنامہ قائم گنج سے حیدر آباد دکن تک کے حالاتِ سفر پر مشتمل تھا لیکن اورنگ آباد اور دولت آباد کے تاریخی واقعات کے مشاہدات و حالات کے لحاظ سے مفید تاریخی و علمی معلومات کا حامل تھا۔ مصنف کے حالات کا زیادہ علم نہیں تھا۔ چنانچہ اس سفرنامے کی اہمیت اور دلچسپی کے پیشِ نظر اسے ضروری تشریحات اور مصنف کے حالات کی تلاش و ترتیب کے بعد شائع کیا گیا (کراچی، ۱۹۸۲ء)۔

(د) ادبی تاریخیں

تاریخ ادب کے سلسلے میں پاکستان میں سب سے وقیع کام ڈاکٹر جمیل جالبی کر رہے ہیں، اب تک انھوں نے اپنی ''تاریخ ادب اردو'' کی دو جلدیں مکمل کر لیں ہیں جو شائع ہو چکی ہیں (لاہور، جلد اول ۱۹۷۵ء، جلد دوم ۱۹۸۲ء) یہ کام چار جلدوں پر محیط ہوگا۔ اب تک اردو ادب کی جو متعدد تاریخیں لکھی گئی ہیں، یہ ان سے اس اعتبار سے مختلف اور اہم ہے کہ اس میں ادب کا مطالعہ تہذیبی و معاشرتی عوامل کی روشنی میں کیا جا رہا ہے۔ پہلی جلد آغاز سے ۱۷۵۰ء تک کے قدیم زبان و ادب کا اور دوسری جلد کم و بیش اٹھارہویں صدی کا احاطہ کرتی ہے۔ اس تاریخ کا ایک امتیاز یہ ہے کہ اس میں متقدمین، متوسطین اور متاخرین کی اس تقسیم سے جو ادب کی تاریخوں میں بالعموم روا رکھی گئی ہے، انحراف کرتے ہوئے ادوار کی زمانی تقسیم کے ساتھ روایت کی تشکیل و تعمیر اور ردعمل و تبدیلی کو بنیادی طور پر سامنے رکھا گیا ہے۔ اس کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ اس میں ہر دور کے اصل ادبی و غیر ادبی مآخذ تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے اور تقریباً ہر بات کو سند اور دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس تاریخ کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ یہ فرد واحد کا کام ہے۔ ایک شخص اپنی رسائی کی حد تک جو کچھ تحقیق و تصنیف کا حق ادا کر سکتا ہے، وہ اس میں نظر آتا ہے۔ یقین ہے کہ جب یہ تاریخ مکمل ہوگی تو ایک بڑے خلا کو پر کرے گی۔

دوسری قابل ذکر تاریخ ادب جامعہ پنجاب کے شعبہ تاریخ ادبیات کی مرتبہ ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و بھارت'' جو انیس جلدوں (بشمول اشاریہ) میں شائع ہوئی۔ اس کی چھٹی سے دسویں جلد اردو زبان و ادب کی تاریخ پر مشتمل ہے (جو ۱۹۷۱ء اور ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئیں) یہ ایک مبسوط تاریخ ہے، جسے سید فیاض محمود کے علاوہ ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر وحید قریشی اور پروفیسر وقار عظیم جیسے فاضل محققوں اور مصنفوں نے مرتب کیا اردو کی سب سے مکمل تاریخ کہا جا سکتا ہے جو اردو زبان و ادب کے تمام ادوار اور شخصیات کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کے باوجود تحقیقی اعتبار سے اس میں جو سقم موجود ہیں، ان سے شاید کوئی انکار نہ کر سکے۔ اس کے متعدد مقالہ نگار ادب و تحقیق کی نامی گرامی شخصیات ہیں اور بعض نے اپنے مقالے محنت سے بھی لکھے ہیں لیکن یہ کہنا کہ تمام مقالے تحقیق کے تمام تقاضے پورے کرتے ہیں، شاید درست نہ ہوگا۔ کئی مقالہ نگاروں نے تحقیقی غلط بیانیوں سے کام لیا ہے اور مرتبین نے تحقیقی ربط و ضبط کو برقرار نہیں رکھا۔ کئی مقامات پر تضاد بیانی بھی نظر آتی ہے۔ اس امر کا لحاظ بھی نہ رکھا گیا کہ کس واقعے اور کس شخص اور کس تصنیف کو کس قدر اہمیت دی جائے۔ اگر ان کوتاہیوں سے صرف نظر کیا جائے، تو اس تاریخ کو اب تک مکمل ہونے والی سب سے بڑی تاریخ کہا جا سکتا ہے۔

اسی طرح تاریخ ادب کی ترتیب کا ایک اور مفید منصوبہ بھی سامنے آیا تھا، جس کے مرتب ڈاکٹر عبدالقیوم تھے، اس تاریخ ادب کی محض ایک جلد شائع ہوئی (کراچی، ۱۹۶۱ء) جو آغاز سے وفات اورنگ زیب تک کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کے مقالہ نگاروں میں سخاوت مرزا اور پروفیسر حبیب اللہ غضنفر جیسے بزرگ محققین بھی شامل تھے اور انھوں نے جن موضوعات پر لکھا، محنت سے لکھا لیکن کسی وجہ سے یہ تاریخ نامکمل رہ گئی اور بقیہ جلدیں شائع نہ ہو سکیں۔

ان تاریخوں کے علاوہ پاکستان میں کچھ اور طویل و مختصر تاریخیں لکھی گئیں لیکن ان کا تحقیقی معیار قابل لحاظ نہیں۔ حالانکہ ان میں ڈاکٹر محمد صادق کی انگریزی زبان میں دو تاریخیں ''اردو ادب کی تاریخ'' (لندن، ۱۹۶۴ء) اور ''بیسویں صدی کا اردو ادب'' (کراچی، ۱۹۸۳ء) بھی شامل ہیں۔

تاریخ ادب کے ضمن میں اس کام کو بھی پیش نظر رکھا جا سکتا ہے جو زبان و ادب کی علاقائی حدود کے لحاظ سے کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں محققین کے پیش نظر بنگال، سندھ، پنجاب، صوبہ سرحد، بلوچستان، کشمیر میں اردو زبان و ادب کی تاریخ کا مطالعہ اہمیت حاصل کر رہا ہے لیکن اس معیار کا تحقیقی کام، جس کی مثال پروفیسر شیرانی نے ''پنجاب میں اردو'' اور ''نصیر الدین ہاشمی'' نے ''دکن میں اردو'' لکھ کر پیش کی تھی، ابھی تک نظر نہیں آیا۔ ویسے بعض قابل ذکر کام اس سلسلے میں ضرور انجام دیئے گئے۔ یہاں ایک مختصر کام کا حوالہ خصوصیت سے دیا جا سکتا ہے، جسے دراصل پروفیسر شیرانی کے کام میں بجا طور پر اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ پروفیسر شیرانی نے اردو کے قدیم نمونوں کی تلاش و تحقیق میں جن مصادر اور بیاضوں سے مدد لی تھی، ان کی تعداد محدود تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی تصنیف ''پنجاب میں اردو'' کی اشاعت کے بعد اس موضوع پر محققین کے مقالات اور ان کی دید و دریافت کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہاں جس مقالے کا بالخصوص ذکر مقصود ہے وہ ایس محمد اکرام چغتائی نے ''پنجاب میں اردو، مزید تحقیق'' (''فنون'' مئی ۱۹۶۹ء) کی صورت میں لکھا ہے لیکن اس مقالے میں فاضل مقالہ نگار نے بجا طور پر گلہ کیا ہے کہ شیرانی صاحب کے بعد پنجاب میں اردو کے متعلق اس ذوق و شوق سے کام نہیں ہوا، جس طرح مولوی عبدالحق اور شمس اللہ قادری کے مقالات کے بعد دکن کے محققین نے دکن کے قدیم ادب پر کیا ہے۔ محمد اکرام چغتائی نے اپنے اس مقالے میں یہ حق ادا کرنے کی اچھی کوشش کی ہے۔ انھوں نے ایک تو اسی مقالے میں کمال تحقیق سے یہ بتایا ہے کہ شیرانی صاحب کے بعد پنجاب میں اردو سے تعلق سے اگر کچھ تحقیقی کام ہوئے ہیں تو وہ کیا ہیں اور ان کا پس منظر کیا ہے۔ مقالے کا یہ حصہ قابل قدر معلومات کا حامل

ہے۔ پھر انھوں نے ایسے شعرا کا ذکر اور ان کا ایسا کلام پیش کیا ہے جسے پروفیسر شیرانی اور کسی دوسرے محقق نے پیش نہیں کیا۔ انھیں یہ کلام ان قلمی بیاضوں سے دستیاب ہوا ہے جو جامعہ پنجاب کے کتب خانے میں موجود ہیں۔

بنگال میں اردو زبان و ادب کی تاریخ کے لحاظ سے اقبال عظیم کی تصنیف ''مشرقی بنگال میں اردو'' (ڈھاکہ، ۱۹۵۴ء) اور وفا راشدی کی تصنیف ''بنگال میں اردو'' (حیدرآباد، ۱۹۵۵ء) اور اسی کے ساتھ عبدالجلیل بسمل کی تصنیف ''سلہٹ میں اردو'' (کراچی، ۱۹۸۱ء) تحقیقی معلومات کی حامل ہیں۔ ڈاکٹر محمد صدرالحق نے بھی اپنے دو مقالوں ''بنگال میں اردو کا طلوع'' اور ''مشرقی بنگال میں اردو نثر'' (مشمولہ، انکشافات کراچی، ۱۹۸۱ء) میں ان موضوعات پر قیمتی معلومات فراہم کی ہیں۔ ان کا ایک اور مقالہ ''شمالی ہند میں باضابطہ اردو شاعری کا ابتدا''[۱] بھی محققانہ ہے۔ اس میں فاضل محقق نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شمالی ہند میں ولی کی آمد سے قبل اردو شاعری کا آغاز ''دیوان ولی'' کے دہلی پہنچنے پر ہو چکا تھا۔ سندھ میں اردو زبان و ادب کے بارے میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی تصنیف ''سندھ میں اردو شاعری'' حیدرآباد، ۱۹۷۰ء) اور ڈاکٹر شاہدہ بیگم کی تصنیف ''سندھ میں اردو'' (کراچی، ۱۹۸۰ء) مبسوط تحقیقی کاوشیں ہیں۔ ان کے علاوہ پیر حسام الدین راشدی کا مقالہ ''سندھ کے اردو شاعر'' (''اردو'' اکتوبر ۱۹۵۱ء) اور پروفیسر معین الدین دردائی کا مبسوط مقالہ ''میران تالپور کے عہد میں اردو کی ترقی'' (''اردو نامہ'' قسط وار: جولائی ۱۹۷۳ء، اکتوبر ۱۹۷۳ء، اپریل ۱۹۷۴ء، جولائی ۱۹۷۴ء) بھی اس سلسلے میں اہم ہیں۔ صوبہ سرحد کے تعلق سے فارغ بخاری کی مرتبہ کتاب ''ادبیات سرحد، اردو ادب'' (جلد سوم، پشاور، ۱۹۵۵ء) بلوچستان کے تعلق سے ''بلوچستان میں اردو'' مصنفہ ڈاکٹر انعام الحق کوثر (لاہور، ۱۹۶۸ء)، کشمیر کے سلسلے میں ''کشمیر میں اردو'' مصنفہ حبیب کیفوی (لاہور، ۱۹۷۹ء) کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

❖❖❖❖

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے۔ پاکستان میں اردو تحقیق، موضوعات اور معیار، ڈاکٹر معین الدین عقیل، کراچی، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۱۹۸۷ء۔

ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں اردو تحقیق

مرتب سید فرحت حسین

ہندوستان کی درج ذیل یونیورسٹیوں میں اردو کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہے۔ اکثر یونیورسٹیوں میں اردو کے مستقل شعبے قائم ہیں۔ صرف چند جگہ اردو فارسی اور اردو ہندی کے مشترکہ شعبے ہیں۔ تحقیقی کام ان تمام یونیورسٹیوں میں ہو رہا ہے۔

۱۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی
۲۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (یو۔ پی)
۳۔ دہلی یونیورسٹی، دہلی
۴۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی
۵۔ آگرہ یونیورسٹی، آگرہ (یو۔ پی)
۶۔ بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی (یو۔ پی)
۷۔ لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ (یو۔ پی)
۸۔ میرٹھ یونیورسٹی، میرٹھ (یو۔ پی)
۹۔ الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد (یو۔ پی)
۱۰۔ اعظم گڑھ یونیورسٹی، اعظم گڑھ (یو۔ پی)
۱۱۔ گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور (یو۔ پی)
۱۲۔ یونیورسٹی آف بمبئی، بمبئی (مہاراشٹر)
۱۳۔ یونیورسٹی آف پونا، پونا (مہاراشٹر)
۱۴۔ ناگپور یونیورسٹی، ناگپور (مہاراشٹر)
۱۵۔ شیواجی یونیورسٹی، کولہاپور (مہاراشٹر)
۱۶۔ کلکتہ یونیورسٹی، کلکتہ (بنگال)
۱۷۔ جموں یونیورسٹی، جموں (جموں اینڈ کشمیر)
۱۸۔ سرینگر یونیورسٹی، سرینگر (جموں اینڈ کشمیر)
۱۹۔ بھوپال یونیورسٹی، بھوپال (مدھیہ پردیش)
۲۰۔ جبل پور یونیورسٹی، جبل پور (مدھیہ پردیش)
۲۱۔ وکرم یونیورسٹی، اوجین (مدھیہ پردیش)
۲۲۔ راجستھان یونیورسٹی، جے پور (راجستھان)
۲۳۔ یونیورسٹی آف اودے پور، اودے پور (راجستھان)
۲۴۔ پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ (بہار)
۲۵۔ مگدھ یونیورسٹی، گیا (بہار)
۲۶۔ عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد (آندھرا پردیش)

۲۷۔ بہار یونیورسٹی، مظفر پور (بہار)

۲۸۔ سری ونکٹیشور یونیورسٹی، تروپتی (آندھرا پردیش)

۲۹۔ بنگلور یونیورسٹی، بنگلور (کرناٹک)

۳۰۔ مدراس یونیورسٹی، مدراس (تامل ناڈو)

۳۱۔ انا ملائی یونیورسٹی، انا ملائی (ایس۔اے) مدراس

۳۲۔ میسور یونیورسٹی، میسور

۳۳۔ کالی کٹ یونیورسٹی، کریالہ

۳۴۔ اودھ یونیورسٹی، فیض آباد (یو۔پی)

۳۵۔ گورونانک یونیورسٹی، امرتسر (پنجاب)

یہاں پر اردو میں سرٹیفکیٹ کورس کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ایم۔اے اور ریسرچ کے لیے ابھی انتظام نہیں۔

۳۶۔ ایم ایس یونیورسٹی آف بڑودہ، بڑودہ (گجرات)

یہاں اردو، فارسی کا مشترکہ شعبہ قائم ہے۔ اردو کی تعلیم دی جاتی ہے لیکن ریسرچ کا انتظام نہیں ہے۔

۳۷۔ جودھپور یونیورسٹی، جودھپور (راجستھان)

یہاں تقابلی ادب اور لسانیات کا شعبہ قائم ہے جس میں ملک کی دوسری زبانوں کے ساتھ اردو کے تقابلی مطالعے کے لیے بھی گنجائش رکھی گئی ہے۔ فارسی کے کچھ کورس جلد شروع کیے جا رہے ہیں۔ شعبے کے ترقیاتی پروگراموں کے تحت آئندہ اردو کی تعلیم کا انتظام بھی ممکن ہے۔

۳۸۔ نارتھ ایسٹرن ہل یونیورسٹی، شیلانگ (آسام)

نئی قائم شدہ یونیورسٹی ہے۔ اردو کی تعلیم آئندہ پروگرام میں متوقع ہے۔

تاریخ ادب اردو

۱۔	ڈاکٹر مسعود حسین خان	تاریخ زبان اردو	تحقیق شدہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
۲۔	ڈاکٹر محمد عزیز	اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ	تحقیق شدہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
۳۔	ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی	ترقی پسند تحریک	تحقیق شدہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
۴۔	مرزا عزیز اللہ بیگ	دکنی اردو، اس کی نشوونما	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
۵۔	حسن احمد نظامی	اردو میں ایہام گوئی کا دور	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
۶۔	ڈاکٹر حبیب النساء بیگم	میسور میں اردو کی نشوونما	تحقیق شدہ	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۷۔	ڈاکٹر ذکیہ انجم	اردو ادب پر سماجی اور اقتصادی حالات کا اثر (دو عالمی جنگوں کے درمیانی دور میں یعنی ۱۹۱۳ء سے ۱۹۳۹ء تک)	تحقیق شدہ	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۸۔	ڈاکٹر محمد ذاکر	ہندوستان میں اردو ادب	تحقیق شدہ	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۹۔	محمد رشید	وہابی تحریک کا اردو پر اثر	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۱۰۔	زینب بی بی	اردو تذکروں کی تنقیدی اہمیت	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۱۱۔	قدسیہ افضال	اردو میں سفرنامے	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۱۲۔	محمد صابرین	۴۷ء کے بعد اردو ادب میں ہندوستانی معاشرے کی عکاسی	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۱۳۔	انتظار مرزا	اردو زبان و ادب کی ترقی میں قدیم دلی کالج کا حصہ	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی

۱۴۔	عبدالعزیز	اردو ادب پر سیاسی اور ثقافتی تحریکوں کا اثر (۱۹۰۰ سے ۱۹۴۷ء تک)	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۱۵۔	عبداللطیف اعزازی	قرآن پاک کا اردو ترجمہ	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۱۶۔	محمد مجیب	دارالترجمہ عثمانیہ کی ادبی خدمات	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۱۷۔	ڈاکٹر محمد حسن	اودھ میں اردو ادب	تحقیق شدہ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۱۸۔	سعادت علی صدیقی	اردو کا زندانی ادب (۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء)	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۱۹۔	مصطفیٰ کمال فاطمی	اردو تذکرے	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۲۰۔	وقار احمد	رام پور کی ادبی خدمات (۱۸۳۰ء تا ۱۹۳۰ء)	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۲۱۔	سید عبدالباری	اودھ میں اردو ادب کے ارتقا کا سماجی اور تہذیبی پس منظر (۱۷۶۰ء تا ۱۸۵۶ء)	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۲۲۔	ڈاکٹر مہر النساء حسن	جنگ آزادی میں اردو ادب کا حصہ	تحقیق شدہ	الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد
۲۳۔	ڈاکٹر اختر احمد اورینوی	بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا ۱۸۵۷ء تک	تحقیق شدہ ڈی لٹ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۲۴۔	ڈاکٹر یوسف خورشیدی	مشترکہ کلچر اور اردو ادب	تحقیق شدہ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۲۵۔	ڈاکٹر سید اسد اللہ کامل	اردو میں سیرت النبی ﷺ کا ادب	تحقیق شدہ	کشمیر یونیورسٹی، سرینگر
۲۶۔	مہانند لال	اردو میں یورپینوں اور اینگلو انڈینوں کی خدمات	زیر تحقیق	جموں یونیورسٹی، جموں (کشمیر)
۲۷۔	ڈاکٹر سلیم حامد رضوی	اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ	تحقیق شدہ	آگرہ یونیورسٹی، آگرہ
۲۸۔	ڈاکٹر میمونہ دلوی	بمبئی میں اردو	تحقیق شدہ	بمبئی یونیورسٹی، بمبئی
۲۹	شیخ فرید	اردو اور فارسی ادب میں برہانپور کا حصہ	زیر تحقیق	ناگپور یونیورسٹی، ناگپور
۳۰۔	قاضی زین العابدین	اردو میں سیرت نبوی ﷺ	زیر تحقیق	ناگپور یونیورسٹی، ناگپور
۳۱۔	ڈاکٹر عبدالوحید خان	جبل پور میں ادبی خدمات	تحقیق شدہ	جبل پور یونیورسٹی، جبل پور
۳۲۔	ڈاکٹر اے ایف عثمانی	گزشتہ صدی میں راجستھان میں اردو کی ترقی میں غیر مسلموں کا حصہ	تحقیق شدہ	راجستھان یونیورسٹی، جے پور
۳۳۔	ڈاکٹر حنیف نقوی	شعرائے اردو کے تذکرے	تحقیق شدہ	وکرم یونیورسٹی، اوجین
۳۴۔	وسیم الدین	اردو کی ادبی تاریخوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ	زیر تحقیق	وکرم یونیورسٹی، اوجین
۳۵۔	ڈاکٹر سید ثاقب حسن رضوی	راجستھان کے اردو ادب کی تاریخ	تحقیق شدہ	اودے پور یونیورسٹی، اودے پور

شاعری

۱۔	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	لکھنؤ کا دبستان شاعری	تحقیق شدہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۲۔	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	دہلی کا دبستان شاعری	تحقیق شدہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۳۔	ڈاکٹر قاضی عبدالستار	اردو شاعری میں قنوطیت	تحقیق شدہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۴۔	ڈاکٹر جمال شریف	دلی سے پہلے اردو شاعری دکن میں	تحقیق شدہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۵۔	غلام محمد ملک	اردو کے صوفی شعرا کا تنقیدی مطالعہ (۱۸۵۷ء تک)	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۶۔	حسن احمد نظامی	شمالی ہند کی اردو شاعری میں ایہام گوئی	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

نمبر	نام	موضوع	کیفیت	یونیورسٹی
۷۔	بیگم حامدہ مسعود	اردو میں نظریہ شاعری ولی سے اقبال تک	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۸۔	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	اردو شاعری میں ہندوستانی عناصر	تحقیق شدہ	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۹۔	مغیث الدین فریدی	اردو شاعری میں قومیت کا تصور	مقالہ پیش کیا جا چکا	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۱۰۔	ڈاکٹر عنوان چشتی	اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے	تحقیق شدہ	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۱۱۔	ثریا بیگم	اردو شاعری میں سراپا نگاری	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۱۲۔	ڈاکٹر عبدالسلام سندیلوی	اردو شاعری میں منظر نگاری	تحقیق شدہ ڈی لٹ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۱۳۔	ڈاکٹر محمد شکیل صدیقی	اردو میں صوفیانہ شاعری اٹھارہویں صدی تک	تحقیق شدہ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۱۴۔	ڈاکٹر عالیہ عسکری	جنگ آزادی میں اردو شاعری کا حصہ	تحقیق شدہ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۱۵۔	ڈاکٹر مصاحب علی صدیقی (قمر رئیس)	اردو شاعری میں تلمیحات	تحقیق شدہ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۱۶۔	ڈاکٹر زہرہ یاسمین	اودھ میں اردو شاعری کے ارتقا میں حکومت کا اثر	زیر تحقیق ڈی لٹ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۱۷۔	محمد نزہت پاشا	انیسویں صدی عیسوی میں لکھنؤ میں طنز و مزاح کا ارتقا	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۱۸۔	محمد اسلم	انیسویں صدی کی اردو شاعری میں اخلاقی شعور	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۱۹۔	ڈاکٹر رام آسراراز	اردو شاعری میں قومی یکجہتی کی روایت	تحقیق شدہ	بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانا سی
۲۰۔	ڈاکٹر امرت لال عشرت	پنجاب میں اردو شاعری کا ارتقا	تحقیق شدہ	بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانا سی
۲۱۔	ظفر عباس	اردو کی قومی اور وطنی شاعری کا مطالعہ	زیر تحقیق	بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانا سی
۲۲۔	ایس حسن مہدی حسینی	اردو کی رومانی شاعری کا مطالعہ	زیر تحقیق	بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانا سی
۲۳۔	ایس غضنفر عباس	اردو شاعری پر سیاسی تحریکوں کا اثر	زیر تحقیق	بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانا سی
۲۴۔	ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی	اردو شاعری میں فطرت نگاری	تحقیق شدہ	الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد
۲۵۔	ڈاکٹر سید اعجاز حسین	اردو شاعری پر مغرب کا اثر ۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۰ء تک	تحقیق شدہ	الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد
۲۶۔	ڈاکٹر سید ظل حسین عابدی	اردو شاعری۔ دو عالمی جنگوں کے درمیان	تحقیق شدہ	الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد
۲۷۔	ڈاکٹر سید مجاور حسین رضوی	ہندوستان کی قومی یکجہتی میں اردو شاعری کا حصہ	تحقیق شدہ	الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد
۲۸۔	محمد عتیق	اردو شاعری میں رومانی عناصر	زیر تحقیق	الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد
۲۹۔	رضیہ نقوی	الہ آباد میں اردو شاعری کا ارتقا ۱۸۵۷ء تک	زیر تحقیق	الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد
۳۰۔	نثار حسین زیدی	اردو شاعری بالخصوص مرثیہ میں رزمیہ عناصر کا تجزیہ	زیر تحقیق	الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد
۳۱۔	ڈاکٹر کلیم احمد عاجز	بہار میں اردو شاعری کا ارتقا (۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک)	تحقیق شدہ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۳۲۔	طلعت رضوی	اردو شعر کا سیاسی اور سماجی شعور ۱۸۵۷ء تک	زیر تحقیق	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۳۳۔	ڈاکٹر ظہور الدین	بیسویں صدی کی اردو شاعری پر مغربی ادبی رجحانات کا اثر	تحقیق شدہ	جموں یونیورسٹی، جموں (کشمیر)
۳۴۔	ضیاء الرحمان خان آفریدی	اردو کی نئی شاعری	زیر تحقیق	جموں یونیورسٹی، جموں (کشمیر)
۳۵۔	محمد حنیف ناسخ	اردو کی اخلاقی شاعری	زیر تحقیق	ناگپور یونیورسٹی، ناگپور
۳۶۔	ڈاکٹر عبدالباقی	مروجہ اصناف سخن پر جدید اردو شاعری کا اثر	تحقیق شدہ	جبل پور یونیورسٹی، جبل پور
۳۷۔	سید برکات احمد	اردو شاعری اور تصوف	زیر تحقیق	جبل پور یونیورسٹی، جبل پور
۳۸۔	شمیم انور	آزادی کے بعد اردو شاعری میں نئے میلان و رجحانات	زیر تحقیق	کلکتہ یونیورسٹی، کلکتہ
۳۹۔	عبدالکریم رومانی	اردو شاعری میں جدید رجحانات ۱۹۴۷ء کے بعد	زیر تحقیق	سری وینکٹیشور یونیورسٹی، ترو پتی (آندھرا)

نمبر	نام	موضوع	کیفیت	یونیورسٹی
۴۰۔	ڈاکٹر عبدالاحد	اردو شاعری میں قومی یکجہتی	تحقیق شدہ	سری وینکٹیشور یونیورسٹی، تروپتی (آندھرا)
۴۱۔	ڈاکٹر عبدالودود	اردو ہندی کی قومی شاعری کا تقابلی مطالعہ	زیر تحقیق ڈی لٹ	وکرم یونیورسٹی، اوجین
۴۲۔	سید علی اظہر راہی	اردو شاعری میں ہجویہ نگاری	زیر تحقیق	وکرم یونیورسٹی، اوجین
۴۳۔	حمیدہ بانو	اردو شاعری تحریکات ور جحانات	زیر تحقیق	وکرم یونیورسٹی، اوجین

غزل

نمبر	نام	موضوع	کیفیت	یونیورسٹی
۱۔	ڈاکٹر بشیر بدر	بیسویں صدی میں اردو غزل	تحقیق شدہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۲۔	آفاق احمد عرفان	اردو غزل میں تصوف کے بنیادی مسائل	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۳۔	ناہید تاج	اردو غزل میں رمزیت	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۴۔	ڈاکٹر عبدالاحد خان خلیل	اردو غزل کے پچاس سال (۱۸۷۰ء تا ۱۹۲۰ء)	تحقیق شدہ	لکھنو یونیورسٹی، لکھنو
۵۔	مظفر احمد لاری	اودھ میں اردو غزل کا سماجی اور تہذیبی پس منظر	زیر تحقیق	لکھنو یونیورسٹی، لکھنو
۶۔	مہربانو	اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۲۰ء تا ۱۹۴۷ء	زیر تحقیق	لکھنو یونیورسٹی، لکھنو
۷۔	شیریں بیگم رضوی	لکھنو میں اردو غزل (۱۹۱۸ء تا ۱۹۳۹ء)	زیر تحقیق	لکھنو یونیورسٹی، لکھنو
۸۔	غوث محمد خان	اردو غزل میں تخلیقی عمل کا مطالعہ۔ غالب کے خصوصی حوالے کے ساتھ	زیر تحقیق	لکھنو یونیورسٹی، لکھنو
۹۔	ڈاکٹر سید رفیق حسین	اردو غزل اور اس کا نشو و نما (۱۸۵۷ء تک)	تحقیق شدہ	الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد
۱۰۔	فاروق شفق	اردو غزل اور ایمائیت	زیر تحقیق	کلکتہ یونیورسٹی، کلکتہ

نظم

نمبر	نام	موضوع	کیفیت	یونیورسٹی
۱۔	شہناز انجم	جدید نظم نگاری کی تنقیدی تاریخ از ۱۹۱۴ء تا حال	زیر تحقیق	جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
۲۔	جمیل احمد	جدید نظم نگاری کی تنقیدی تاریخ از ۱۹۱۴ء تا ۱۹۵۴ء	زیر تحقیق	جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
۳۔	محمد حنیف قریشی کیفی	اردو میں نظم معریٰ اور آزاد نظم (تحقیقی وتنقیدی مطالعہ)	زیر تحقیق	جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
۴۔	فریدہ بیگم	اردو نظم میں علامت نگاری	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۵۔	احتشام پاشا	اردو نظم میں ہیئت کے تجربے	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۶۔	فہمیدہ خاتون	نظیر اکبر آبادی کی نظموں کا فنی مطالعہ	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۷۔	ڈاکٹر نعیم احمد	اردو میں شہر آشوب	تحقیق شدہ	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۸۔	محمد احمد	اردو میں آزاد نظم	تحقیق شدہ	لکھنو یونیورسٹی، لکھنو
۹۔	ڈاکٹر حبیب اللہ حامدی	جدید اردو نظم کا ارتقا اور یورپی تاثرات	تحقیق شدہ	کشمیر یونیورسٹی، سرینگر
۱۰۔	زین العابدین	جدید نظم کا ارتقا	زیر تحقیق	بمبئی یونیورسٹی، بمبئی
۱۱۔	یوسف تقی	اردو نظم میں ہیئتی تجربے	زیر تحقیق	کلکتہ یونیورسٹی، کلکتہ
۱۲۔	ڈاکٹر احتشام الدین فاروقی	اردو نظم میں سیاسی شعور (۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء)	تحقیق شدہ	وکرم یونیورسٹی، اوجین

مثنوی

۱۔	محمود حیدر نقوی	واجد علی شاہ کی مثنویوں کا تنقیدی مطالعہ	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۲۔	کندن لال	اردو کی تاریخی مثنویاں	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۳۔	ڈاکٹر سید سلیمان حسین	لکھنؤ اسکول کی مثنویاں	تحقیق شدہ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۴۔	جہاں آراء سلمان	مثنویات میر	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
			تحقیق شدہ	کشمیر یونیورسٹی، سرینگر
۵۔	ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی	اردو مثنوی کا ارتقا شمالی ہندوستان میں (۱۷۵۰ء سے ۱۹۵۰ء تک)	تحقیق شدہ	الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد
۶۔	سیدہ بیگم	شمالی ہند کی مثنویوں میں فضا آفرینی کا فن	زیر تحقیق	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۷۔	ڈاکٹر نصرت بانی	اردو کی نمائندہ مثنویوں میں فوق الفطرت عناصر اور ان کی اہمیت	تحقیق شدہ	کشمیر یونیورسٹی، سرینگر
۸۔	ڈاکٹر گیان چند جین	اردو مثنوی شمالی ہندوستان میں	تحقیق شدہ ڈی لٹ	آگرہ یونیورسٹی، آگرہ
۹۔	قیوم صادق	بیجاپور کی اردو مثنویاں	زیر تحقیق	بمبئی یونیورسٹی، بمبئی

مرثیہ

۱۔	ڈاکٹر اکبر حیدری	اودھ میں اردو مرثیہ کا ارتقا اور اس میں میر ضمیر و میر خلیق کا نمایاں حصہ	تحقیق شدہ ڈی لٹ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۲۔	سید افتدا حسین	رشید اور ان کی مرثیہ نگاری	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۳۔	ڈاکٹر سید مسیح الزمان	لکھنؤ میں مرثیہ۔ انیس تک	تحقیق شدہ	آلہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد
۴۔	ڈاکٹر افضل حسن	مرثیہ بعد انیس بہار میں	تحقیق شدہ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

قصیدہ

۱۔	ڈاکٹر محمود الٰہی	اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ	تحقیق شدہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۲۔	محمد کمال الدین	عصر نذیر میں قصیدہ نگاری	زیر تحقیق	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۳۔	زیڈ۔ ایم فاروقی	اردو قصیدہ۔ آغاز و ارتقا	زیر تحقیق	ناگپور یونیورسٹی، ناگپور

رباعی

۱۔	ڈاکٹر عبدالسلام	اردو رباعیات	تحقیق شدہ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۲۔	امین چند شرما	اردو میں رباعیات کا ارتقا	زیر تحقیق	ناگپور یونیورسٹی، ناگپور

نعت و سلام

۱۔	مرزا صغیر بیگ	اردو میں نعت گوئی کی ابتدا اور ارتقا	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۲۔	ڈاکٹر سید حیدر نقی رضوی	اردو میں سلام نگاری	تحقیق شدہ	جبل پور یونیورسٹی، جبل پور

تمثیل نگاری

نمبر	نام	موضوع	حیثیت	یونیورسٹی
۱۔	رضیہ سلطانہ	اردو ادب میں تمثیل نگاری	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۲۔	غلام رسول بکرانی	اردو میں تمثیل نگاری	زیر تحقیق	گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور
۳۔	ڈاکٹر عنایت اللہ منظر اعظمی	اردو میں ادب میں تمثیل نگاری	تحقیق شدہ	جموں یونیورسٹی، جموں (کشمیر)

شخصیات، شاعر

نمبر	نام	موضوع	حیثیت	یونیورسٹی
۱۔	صغرا مہدی	اکبر الہ آبادی کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ	زیر تحقیق	جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی
۲۔	ڈاکٹر اکبر حسین قریشی	اقبال کی شاعری میں تلمیحات	تحقیق شدہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۳۔	ڈاکٹر خورشید الاسلام	غالب ابتدائی دور	تحقیق شدہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۴۔	ڈاکٹر رضی الدین	نظیر اکبر آبادی	تحقیق شدہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۵۔	ڈاکٹر معین احسن جذبی	حالی کا سیاسی شعور	تحقیق شدہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۶۔	ڈاکٹر میمونہ بیگم	مرزا سودا۔ حیات اور کارنامے	تحقیق شدہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۷۔	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	ذوق۔ زندگی اور شاعری	تحقیق شددہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۸۔	ڈاکٹر وقار حسن	انیس کی زبان	تحقیق شدہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۹۔	ڈاکٹر منظر عباس نقوی	وحید الدین سلیم	تحقیق شدہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۰۔	ڈاکٹر اسما سعیدی	حسن عظیم آبادی۔ زندگی اور شاعری	تحقیق شدہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۱۔	افسر قریشی	حسرت موہانی۔ نثر اور شاعری	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۲	واجد علی خان (جاوید کمال)	امیر اللہ تسلیم۔ حیات اور شاعری	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۳۔	محمد اسماعیل حسن خان	اردو شاعری میں جوش کی خدمات	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۴۔	جمیلہ بانو	اردو غزل میں یگانہ کی خدمات	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۵۔	نور جہاں	میر تقی میر کے کلام میں امیجری	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۶۔	نور محمد	نظیر اکبر آبادی کا مطالعہ ساجی و تمدنی نقطہ نظر سے	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۷۔	سیدہ منی	شیفتہ کی ادبی خدمات	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۸۔	عارف حسن خان	میر کا فنی مطالعہ	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۹۔	شمع ساجد	زبان اور شاعری کے سلسلے میں جلال لکھنوی کی خدمات کا تنقیدی جائزہ	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۲۰۔	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	مومن۔ حیات اور شاعری	تحقیق شدہ	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۲۱۔	ڈاکٹر اسلم پرویز	بہادر شاہ ظفر اور ان کی شاعری	تحقیق شدہ	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۲۲۔	ڈاکٹر خلیق انجم	مرزا مظہر جان جاناں۔ حیات اور کارنامے	تحقیق شدہ	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۲۳۔	ڈاکٹر مجیب الرحمٰن قریشی	قلندر بخش جرات کا تنقیدی مطالعہ	تحقیق شدہ	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۲۴۔	ڈاکٹر سید نور الحسن نقوی	مصحفی۔ زندگی اور فن	تحقیق شدہ	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۲۵۔	ڈاکٹر صلاح الدین	شیفتہ۔ حیات اور خدمات	تحقیق شدہ	دہلی یونیورسٹی، دہلی

۲۶۔	انیس حسن	خواجہ میر درد۔ حیات اور کارنامے	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۲۷۔	صغریٰ مہدی	اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۲۸۔	شہناز اختر	اقبال کے فکر و فن کے سماجی اور ثقافتی سرچشمے	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۲۹۔	نسیم احمد عباسی	دیا شنکر نسیم۔ حیات اور کارنامے	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۳۰۔	ڈاکٹر افضال احمد	چکبست، حیات اور کارنامے	تحقیق شدہ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۳۱۔	ڈاکٹر اکبر حیدری	میر انیس کی رزمیہ شاعری	تحقیق شدہ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۳۲۔	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	حالی بہ حیثیت شاعر	تحقیق شدہ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۳۳۔	ڈاکٹر سید فدا حسین	فردوسی اور انیس (تقابلی مطالعہ)	تحقیق شدہ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۳۴۔	ڈاکٹر زہرہ یاسمین	منیر شکوہ آبادی۔ حیات اور شاعری	تحقیق شدہ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۳۵۔	ڈاکٹر محمد اسلام	جگر مرادآبادی، حیات اور شاعری	تحقیق شدہ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۳۶۔	ڈاکٹر ریاض الحسن صدیقی	اسیر اور ان کا عہد	تحقیق شدہ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۳۷۔	ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نونہروی	ناسخ کا تنقیدی مطالعہ	تحقیق شدہ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۳۸۔	محمد یونس	اکبر بہ حیثیت طنزیہ و مزاحیہ شاعر	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۳۹۔	رضا حیدر مخدومی	ناسخ اسکول کے چند مشاہیر شعرا	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۴۰۔	مسرور احمد	جلیل مانک پوری۔ حیات اور شاعری	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۴۱۔	سید صفدر حسین عابدی	اثر لکھنوی۔ حیات اور شاعری	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۴۲۔	محمد یوسف صدیقی	فانی بدایونی۔ حیات اور شاعری	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۴۳۔	شاہ عبدالسلام فاروقی	شاگردان آتش اور اردو شاعری کے ارتقا میں ان کا حصہ	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۴۴۔	عبدالرب	شاہ تراب علی قلندر۔ حیات اور شاعری	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۴۵۔	سید سعید الدین	آنند نرائن ملا اور اردو شاعری میں ان کا حصہ	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۴۶۔	صفیہ پروین	اصغر گونڈوی۔ حیات اور شاعری	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۴۷۔	قنبر علی	جلال لکھنوی۔ حیات اور کارنامے	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۴۸۔	صالحہ خاتون	پیارے صاحب رشید، حیات اور شاعری	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۴۹۔	سید مسعود حسن رضوی	عزیز لکھنوی۔ حیات اور شاعری	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۵۰۔	محمد عصمت خاں	جوش ملیح آبادی	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۵۱۔	ڈاکٹر حکیم چند نیر	سرور جہاں آبادی۔ حیات اور شاعری	تحقیق شدہ	بنارس یونیورسٹی، وارانسی
۵۲۔	مرزا احسان بیگ	مرزا محمد حسن فائز۔ حیات اور شاعری	زیر تحقیق	بنارس یونیورسٹی، وارانسی
۵۳۔	قمر جہاں	اکبر الہ آبادی، حیات اور شاعری	زیر تحقیق	بنارس یونیورسٹی، وارانسی
۵۴۔	ڈاکٹر سید نواب حسین	میر۔ ایک مطالعہ	تحقیق شدہ	الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد
۵۵۔	ڈاکٹر آصف جاہ کاروانی	اقبال کا فلسفہ خودی اور اس کا مقصد	تحقیق شدہ	الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد
۵۶۔	ڈاکٹر جعفر رضا	میر عشق اور ان کے خاندان کے مرثیہ گو	تحقیق شدہ	الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد
۵۷۔	ڈاکٹر سید احمد رضوی	بہادر شاہ ظفر۔ اس کی حیات و تصانیف	تحقیق شدہ	الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد
۵۸۔	نشاط ہادی	انیسویں صدی کے ہندوستانی افکار کی روشنی میں غالب کی اردو شاعری کا مطالعہ	زیر تحقیق	الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

۵۹۔	ڈاکٹر سید محمد صدرالدین فضا	شاہ حیات اللہ جوہری۔ حیات اور شاعری	تحقیق شدہ ڈی لٹ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۶۰۔	ڈاکٹر خالد رشید صبا	صوفی منیری، حیات اور شاعری	تحقیق شدہ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۶۱۔	ڈاکٹر روحی حسن	فضل حق آزاد۔ حیات اور شاعری	تحقیق شدہ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۶۲۔	ڈاکٹر شعیب راہی	آتش۔ حیات اور شاعری	تحقیق شدہ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۶۳۔	ڈاکٹر لطف الرحمٰن	راسخ عظیم آبادی کی غزل گوئی	تحقیق شدہ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۶۴۔	ڈاکٹر قاسم احسان وارثی	ظہور الظہور پھلواری۔ حیات اور شاعری	تحقیق شدہ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۶۵۔	ڈاکٹر محمد کاظم ہاشمی	آسی غازی پوری۔ حیات اور شاعری	تحقیق شدہ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۶۶۔	ڈاکٹر طلحہ رضوی	اکبر داناپوری۔ حیات اور شاعری	تحقیق شدہ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۶۷۔	ڈاکٹر محی الدین ظفر	صغیر بلگرامی۔ بہ حیثیت شاعر و ادیب	تحقیق شدہ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۶۸۔	ڈاکٹر محمد یونس	جرات بہ حیثیت مثنوی نگار	تحقیق شدہ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۶۹۔	ڈاکٹر مطیع الرحمٰن	راسخ کے دو شاگرد فرحت اور محسن	تحقیق شدہ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۷۰۔	ڈاکٹر ممتاز احمد	راسخ بہ حیثیت مثنوی نگار	تحقیق شدہ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۷۱۔	ڈاکٹر محمد حسنین	فدوی عظیم آبادی۔ حیات اور شاعری	تحقیق شدہ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۷۲۔	ڈاکٹر ظہیر احسن	شیر علی افسوس	تحقیق شدہ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۷۳۔	ایم۔ ایم مصطفیٰ	امیر الدین وجد۔ حیات اور شاعری	زیر تحقیق	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۷۴۔	نشاط اختر	بہار میں دبستان داغ	زیر تحقیق	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۷۵۔	طیبہ خاتون	نوازش لکھنوی۔ حیات اور شاعری	زیر تحقیق	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۷۶۔	پروفیسر زکی الحق	میر حسن کی غزل نگاری	زیر تحقیق ڈی لٹ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۷۷۔	سید آل احمد	شاد عظیم آبادی بہ حیثیت شاعر	زیر تحقیق ڈی لٹ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۷۸۔	پروین عالم	جوش ملیح آبادی بہ حیثیت شاعر	زیر تحقیق ڈی لٹ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۷۹۔	محمد ابراہیم	شوق نیموی۔ حیات اور فن	زیر تحقیق ڈی لٹ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۸۰۔	وارث الرحمٰن	کلیم الدین احمد بہ حیثیت شاعر اور نقاد	زیر تحقیق ڈی لٹ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۸۱۔	ایم اسرائیل رضا	جمیلہ خاتون۔ حیات اور شاعری	زیر تحقیق ڈی لٹ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۸۲۔	ثریا جبیں	رنجور عظیم آبادی، حیات اور فن	زیر تحقیق ڈی لٹ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۸۳۔	ڈاکٹر عبدالحق صدیقی	اقبالیات کا تنقیدی جائزہ	تحقیق شدہ	گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور
۸۴۔	ڈاکٹر محمد انصار اللہ نظر	میر علی اوسط رشک۔ حیات اور خدمات	تحقیق شدہ	گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور
۸۵۔	ڈاکٹر نورالعین لاری (احمر لاری)	حسرت موہانی۔ حیات اور خدمات	تحقیق شدہ	گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور
۸۶۔	ڈاکٹر خلیل اللہ خان	ریاض خیرآبادی۔ حیات اور خدمات	تحقیق شدہ	گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور
۸۷۔	ڈاکٹر سید فضل امام رضوی	امیر اللہ تسلیم۔ حیات و شاعری	تحقیق شدہ	گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور
۸۸۔	ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد	نظیر اکبرآبادی۔ حیات و شاعری	زیر تحقیق ڈی لٹ	گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور
۸۹۔	قمر جہاں	منیر شکوہ آبادی۔ حیات اور خدمات	زیر تحقیق	گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور

۹۰۔	سید مجاہد حسین رضوی	مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری	زیر تحقیق	گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور
۹۱۔	افغان اللہ خان	فراق کی شاعری	زیر تحقیق	گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور
۹۲۔	ناصر خان	جعفر علی حسرت۔ حیات و شاعری	زیر تحقیق	گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور
۹۳۔	کوثر جہاں	نسیم دہلوی۔ حیات و شاعری	زیر تحقیق	گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور
۹۴۔	شیخ محمد صدیق	آسی غازی پوری۔ حیات و شاعری	زیر تحقیق	گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور
۹۵۔	ڈاکٹر مظفر حنفی	شاد عارفی۔ شخصیت اور فن	تحقیق شدہ	بھوپال یونیورسٹی، بھوپال
۹۶۔	سید متین الرحمٰن	اردو میں غالبیات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ	زیر تحقیق	بھوپال یونیورسٹی، بھوپال
۹۷۔	سید حیدر عباس رضوی	میر انیس۔ حیات اور ادبی خدمات	زیر تحقیق	بھوپال یونیورسٹی، بھوپال
۹۸۔	ڈاکٹر مریم حامدی	شوق قدوائی۔ زندگی اور کارنامے	تحقیق شدہ	کشمیر یونیورسٹی، سرینگر
۹۹۔	ڈاکٹر کاشی ناتھ پنڈتا	چکبست، عہد، حیات اور کارنامے	تحقیق شدہ	کشمیر یونیورسٹی، سرینگر
۱۰۰۔	ڈاکٹر محمد عبداللہ شیدا	غالب کی اردو اور فارسی شاعری کا تقابلی مطالعہ اور مآخذ کی تحقیق	تحقیق شدہ	کشمیر یونیورسٹی، سرینگر
۱۰۱۔	بنسی لال شرما	تلوک چند محروم	زیر تحقیق	جموں یونیورسٹی، جموں (کشمیر)
۱۰۲۔	ہنس راج گپتا	بشیشور پرشاد منور لکھنوی	زیر تحقیق	جموں یونیورسٹی، جموں (کشمیر)
۱۰۳۔	ڈاکٹر محمد عرفان	قائم چاندپوری	تحقیق شدہ	آگرہ یونیورسٹی، آگرہ
۱۰۴۔	ڈاکٹر ابو محمد ابوالقاسم	اردو ادب میں امیر مینائی کا حصہ	تحقیق شدہ	آگرہ یونیورسٹی، آگرہ
۱۰۵۔	ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی	سخن وران گجرات	تحقیق شدہ	بمبئی یونیورسٹی، بمبئی
۱۰۶۔	ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی	دبستان دبیر	تحقیق شدہ	بمبئی یونیورسٹی، بمبئی
۱۰۷۔	ڈاکٹر عقیلہ خانم	اکبر الہ آبادی	تحقیق شدہ	بمبئی یونیورسٹی، بمبئی
۱۰۸۔	ڈاکٹر ضمیر احمد خان	نظیر اکبرآبادی۔ حیات اور شاعری	تحقیق شدہ	بمبئی یونیورسٹی، بمبئی
۱۰۹۔	ڈاکٹر سید عبدالحئی	قائم چاندپوری۔ حیات اور فن	تحقیق شدہ	بمبئی یونیورسٹی، بمبئی
۱۱۰۔	محمد حسین حسینی	آرزو لکھنوی۔ شخصیت اور کارنامے	زیر تحقیق	بمبئی یونیورسٹی، بمبئی
۱۱۱۔	صلاح الدین پرکار	ذولسانی شعرا اردو اور فارسی	زیر تحقیق	بمبئی یونیورسٹی، بمبئی
۱۱۲۔	سید محمد آغا حیدر حسن عابدی	مرزا محمد تقی ہوس لکھنوی	زیر تحقیق	ناگ پور یونیورسٹی، ناگ پور
۱۱۳۔	محمد منشاالرحمٰن خان منشا	میر نظام الدین ممنون دہلوی۔ حیات اور شاعری	زیر تحقیق	ناگ پور یونیورسٹی، ناگ پور
۱۱۴۔	خواجہ محمد حامد	مولوی امام بخش صہبائی، شخصیت۔ شاعری اور شارح	زیر تحقیق	ناگ پور یونیورسٹی، ناگ پور
۱۱۵۔	زرینہ ثانی	سیماب اکبرآبادی کی نظم نگاری	زیر تحقیق	ناگ پور یونیورسٹی، ناگ پور
۱۱۶۔	ظفر علی سید	نظیر اکبرآبادی کی شاعری میں ہندوستانی فضا	زیر تحقیق	ناگ پور یونیورسٹی، ناگ پور
۱۱۷۔	نصرت آراء بیگم	مسعود سعد سلمان۔ شخصیت اور شاعری	زیر تحقیق	ناگ پور یونیورسٹی، ناگ پور
۱۱۸۔	ڈاکٹر سید اختر جمیل نظمی	حضرت غمگین دہلوی	تحقیق شدہ	جبل پور یونیورسٹی، جبل پور
۱۱۹۔	ڈاکٹر عزیز انصاری	ملا رموزی، حیات و فن	تحقیق شدہ	جبل پور یونیورسٹی، جبل پور
۱۲۰۔	ڈاکٹر کشور جہاں	جاں نثار اختر۔ حیات و فن	تحقیق شدہ	جبل پور یونیورسٹی، جبل پور
۱۲۱۔	نہال الدین تاباں	فراق گورکھپوری	زیر تحقیق	جبل پور یونیورسٹی، جبل پور

نمبر	نام	موضوع	کیفیت	یونیورسٹی
۱۲۲ـ	قمر جہاں	اقبال۔ قرآن کا اثر	زیر تحقیق	جبل پور یونیورسٹی، جبل پور
۱۲۳ـ	عبدالرحمٰن امرامیری	پرویز شاہدی۔ حیات و شاعری	زیر تحقیق	کلکتہ یونیورسٹی، کلکتہ
۱۲۴ـ	ڈاکٹر ایم اے زیدی	اردو ادب میں داغ کا حصہ	تحقیق شدہ	راجستھان یونیورسٹی، جے پور
۱۲۵ـ	ڈاکٹر امانت شیخ	مرزا عبدالقادر بیدل	تحقیق شدہ	پونا یونیورسٹی، پونا
۱۲۶ـ	ڈاکٹر افتخار احمد	سیماب اور دبستان سیماب	تحقیق شدہ	پونا یونیورسٹی، پونا
۱۲۷ـ	سید سیف علی	غواصی۔ خدمات اور شاعری	زیر تحقیق	پونا یونیورسٹی، پونا
۱۲۸ـ	عبدالغنی فاروقی	ناقدین غالب	زیر تحقیق	سری وینکٹیشور یونیورسٹی، تروپتی
۱۲۹ـ	زبیدہ خاتون	اصغر گونڈوی۔ شخصیت اور فن	زیر تحقیق	سری وینکٹیشور یونیورسٹی، تروپتی
۱۳۰ـ	کے بشیر احمد	شوکت سبزواری۔ حیات اور فن	زیر تحقیق	سری وینکٹیشور یونیورسٹی، تروپتی
۱۳۱ـ	ڈاکٹر سید یونس حسنی	اختر شیرانی اور جدید اردو ادب	تحقیق شدہ	وکرم یونیورسٹی، اُجین
۱۳۲ـ	ڈاکٹر ایس غلام رسول	مولانا حالی اور میتھلی سرن گپتا۔ تقابلی مطالعہ۔ (مسدس حالی اور بھرت بھارتی کے خصوصی حوالے کے ساتھ میں)	تحقیق شدہ (انگریزی میں)	اناملائی یونیورسٹی، اناملائی

نثر

نمبر	نام	موضوع	کیفیت	یونیورسٹی
۱ـ	مصباح الحسن	اردو نثر پر مغربی طنز و مزاح کے اثرات ۱۸۵۵ء سے ۱۹۱۴ء تک	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۲ـ	عارفہ نزہت	اردو نثر میں مرصع اسلوب کا ارتقا انیسویں صدی کے اواخر تک	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۳ـ	سید ضمیر حسین	دہلی میں اردو نثر کا ارتقا ۱۹۰۰ء سے ۱۹۴۷ء تک	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۴ـ	طیبہ خاتون	اردو نثر کا ارتقا ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۵ـ	ڈاکٹر سید محمود الحسن رضوی	اودھ میں اردو نثر کا ارتقا ۱۹۰۰ء سے تا حال	زیر تحقیق ڈی لٹ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۶ـ	ڈاکٹر ظفر اقبال	بہار میں اردو نثر کا ارتقا ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک	تحقیق شدہ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۷ـ	بدرالدین خان (انجم عرفانی)	شمالی ہند میں اردو نثر کا ارتقا از ابتدا تا ۱۸۵۷ء	تحقیق شدہ	گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور
۸ـ	ڈاکٹر عبدالودود	اردو نثر میں ادب لطیف	تحقیق شدہ	وکرم یونیورسٹی، اُجین
۹ـ	ڈاکٹر اے۔ اے جہانگیر	اردو نثر کا دہلوی دبستان	تحقیق شدہ	شیواجی یونیورسٹی، کولہاپور

اردو تنقید

نمبر	نام	موضوع	کیفیت	یونیورسٹی
۱ـ	اخلاق محمد خان شہریار	اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات (انیسویں صدی کے آخر تک)	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۲ـ	ذکاء الرب رباب	اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات ۱۹۱۴ء تا ۱۹۴۷ء	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۳ـ	سید عبدالباری	اردو تنقید پر ارسطو کی بوطیقا کا اثر	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۴ـ	امیر زہرا	اردو تنقید ۱۹۴۷ء کے بعد	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۵ـ	ڈاکٹر عبادت بریلوی	اردو تنقید کا ارتقا	تحقیق شدہ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۶ـ	ڈاکٹر شارب ردولوی	اردو میں جدید تنقید کے اصول	تحقیق شدہ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

٧۔	ڈاکٹر سید محمود الحسن رضوی	اردو میں نفسیاتی تنقید	تحقیق شدہ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
٨۔	سید تصویر الحسن عابدی	حالی کا تنقیدی نظریہ اور اردو تنقید کے ارتقا میں ان کا حصہ	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
٩۔	ڈاکٹر ممتاز احمد	اردو شعرا کا تنقیدی شعور	تحقیق شدہ ڈی لٹ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
١٠۔	ڈاکٹر نور العین لاری (احمر لاری)	اردو تنقید کا ارتقا (١٨٢٦ تا ١٩٣٥ء)	زیر تحقیق ڈی لٹ	گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور
١١۔	یوسف خان	مارکسی تنقید۔ تعریف، تاریخ اور تجزیہ	زیر تحقیق	میرٹھ یونیورسٹی، میرٹھ

داستان

١۔	ڈاکٹر معصوم رضا راہی	طلسم ہوشربا میں ہندوستانی زندگی کی جھلکیاں	تحقیق شدہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
٢۔	زینت جہاں	اردو داستان کا تنقیدی مطالعہ	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
٣۔	قیصر بیگم صدیقی	داستانوں میں علامتی اور اساطیری عناصر	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
٤۔	رقیہ ناز	انیسویں صدی کی داستانوں میں دہلی کی تہذیب و معاشرت	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
٥۔	شفاعت محمد	دہلی میں داستان گوئی	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
٦۔	باجرہ ولی	لکھنؤ میں داستان گوئی کا ارتقا	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
٧۔	یوسف جہاں رضوی	لکھنؤ کی اہم نثری داستانوں میں نسوانی کرداروں کا ارتقا	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
٨۔	ڈاکٹر گیان چند جین	اردو داستان گوئی ہند میں (١٨٧٠ء)	تحقیق شدہ	الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد
٩۔	ڈاکٹر ثناء اللہ بٹ	فورٹ ولیم کالج کی داستانوں کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ	تحقیق شدہ	کشمیر یونیورسٹی، سرینگر
١٠۔	ڈاکٹر زرینہ بٹ	داستان امیر حمزہ میں فوق الفطری عناصر	تحقیق شدہ	کشمیر یونیورسٹی، سرینگر

ناول

١۔	محمد فاضل	اردو ناول میں ہیرو کا کردار	زیر تحقیق	جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی
٢۔	محمد نظر برنی	اردو ناول کی سوانحی ببلیوگرافی	زیر تحقیق	جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی
٣۔	محمد انجم	اردو ناول میں ہیروئن کا تصور (ہندوستانی سماج کی بدلتی ہوئی اقدار کی روشنی میں)	زیر تحقیق	جامعہ اسلامیہ، دہلی
٤۔	ڈاکٹر ہارون ایوب	پریم چند کے بعد اردو ناول	تحقیق شدہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
٥۔	فہمیدہ کبیر	اردو ناول میں عورت کا تصور نذیر احمد سے دور حاضر تک	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
٦۔	اشفاق محمد خان	نذیر احمد کے ناولوں کا تنقیدی جائزہ	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
٧۔	ڈاکٹر سیدہ شاہدہ غفران زیدی	اردو ناولوں میں نسوانی کردار (ابتدا سے پریم چند تک)	تحقیق شدہ	دہلی یونیورسٹی، دہلی
٨۔	ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی	اردو ناول کا آغاز و ارتقا (١٨٥٧ء سے ١٩١٤ء تک)	تحقیق شدہ	دہلی یونیورسٹی، دہلی

۹۔	سید اظہر حسین نقوی	اردو ناول کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۷۰ء تک	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۱۰۔	ایم۔ انجم	اردو میں تاریخی ناول	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۱۱۔	ڈاکٹر شمیم نکہت	پریم چند کے ناولوں میں عورتوں کا کردار	تحقیق شدہ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۱۲۔	نکہت فرید	اردو ناولوں میں کردار نگاری کا ارتقا	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۱۳۔	ڈاکٹر زرینہ عقیل احمد	جدید اردو ناول میں سماجی نظریات کا تنقیدی جائزہ	زیر تحقیق	الٰہ آباد یونیورسٹی، الٰہ آباد
۱۴۔	ڈاکٹر آصف زکریا	بہار میں اردو ناول نگاری	تحقیق شدہ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۱۵۔	ڈاکٹر اسلم آزاد	اردو ناول ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۷ء تک	تحقیق شدہ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۱۶۔	رضیہ بیگم	اردو ناول میں کردار نگاری کا فن	زیر تحقیق	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۱۷۔	فضل علی	اردو میں ناولٹ	زیر تحقیق	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۱۸۔	نشاط فاطمہ	راشد الخیری کے ناول میں سماجی حالات	زیر تحقیق	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۱۹۔	ثریا جمال مظہری	سرس کار کے نسوانی کردار؟	زیر تحقیق	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۲۰۔	محمد شعیب	اردو ناول ۱۹۳۶ء کے بعد	زیر تحقیق	گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور
۲۱۔	ڈاکٹر بی۔ آر سونی	اردو ناولوں کا سماجی پس منظر	تحقیق شدہ	پونا یونیورسٹی، پونا
۲۲۔	مقبول بادشاہ	اردو ناول پر مغربی ادب کے اثرات ۱۹۳۵ء کے بعد	زیر تحقیق	سری ونکٹیشور یونیورسٹی، تروپتی

افسانہ

۱۔	مسعود عالم	مختصر افسانہ (۱۹۳۶ء سے آج تک)	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۲۔	رابعہ اقبال صدیقی	۴۷ء کے بعد ہندو پاکستان کے افسانے	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۳۔	سرور داؤد	سرشار کے نسوانی کردار	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۴۔	عزیز فاطمہ	اردو کے مختصر افسانے کا سماجی اور تہذیبی پس منظر	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۵۔	ڈاکٹر سید محمد اجمل اجملی	اردو افسانہ میں عوامی زندگی	تحقیق شدہ	الٰہ آبادی یونیورسٹی، الٰہ آباد
۶۔	نجمہ سعید ہاشمی	اردو افسانہ میں موضوع اور ہیئت کا مطالعہ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۶۶ء تک	زیر تحقیق	الٰہ آبادی یونیورسٹی، الٰہ آباد
۷۔	ڈاکٹر فردوس فاطمہ	جدید اردو افسانہ نگاری	تحقیق شدہ ڈی لٹ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۸۔	احمد قدوس جاوید	اردو میں افسانہ نگاری ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۴ء تک	زیر تحقیق	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۹۔	عتیق عالم خان	اردو میں مختصر افسانہ نگاری	زیر تحقیق	گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور

ڈراما

۱۔	انجم آراء بیگم	اردو ڈرامے میں آغا حشر کی خدمات	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۲۔	ڈاکٹر عطیہ نشاط خان	اردو ڈرامے میں تجربہ اور روایت	تحقیق شدہ	الٰہ آباد یونیورسٹی، الٰہ آباد
۳۔	ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی	اردو ڈراما آغا حشر کے بعد	تحقیق شدہ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۴۔	ڈاکٹر عبدالعلیم نامی	اردو تھیٹر	تحقیق شدہ	بمبئی یونیورسٹی، بمبئی
۵۔	ڈاکٹر اخلاق حسین اثر	ریڈیو ڈرامے کا فن	تحقیق شدہ	وکرم یونیورسٹی، اوجین

مکاتیب

۱۔	ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی	اردو میں مکتوب نگاری کا ارتقاء	تحقیق شدہ	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۲۔	سید ابوالعاصم	غالب کے مکاتیب کا نثری اسلوب	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۳۔	جمیلہ عباسی	خطوط غالب کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۴۔	محمد رفیع انصاری	خطوط غالب کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ	زیر تحقیق	بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی

انشائیہ

	ڈاکٹر سید ناصر حسین نقوی	اردو میں مضمون نگاری کا ارتقا	تحقیق شدہ	الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

صحافت

۱۔	عبدالرشید سہسوانی	انیسویں صدی میں دہلی کی اردو صحافت	زیر تحقیق	جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی
۲۔	راج نرائن راز	اردو صحافت دہلی میں (از ۱۹۰۱ء تا ۱۹۴۷ء)	زیر تحقیق	جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی
۳۔	نادر علی خان	اردو صحافت	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۴۔	اصغر عباس	انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا تنقیدی جائزہ اور اردو صحافت	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۵۔	ڈاکٹر شفیع احمد عثمانی	ماہنامہ زمانہ کانپور کا اردو ادب کے ارتقا میں حصہ	تحقیق شدہ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۶۔	ضیاء الرحمٰن غوثی	بہار میں اردو صحافت	زیر تحقیق	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۷۔	دیویندر شرما	اردو علمی اور تصنیفی ادارے	زیر تحقیق	جموں یونیورسٹی، جموں (کشمیر)
۸۔	ڈاکٹر عبدالرزاق فاروقی	اودھ پنچ کی ادبی خدمات	تحقیق شدہ	سری وینکٹیشور یونیورسٹی، تروپتی

سوانح نگاری

	ڈاکٹر سید شاہ عالی	اردو سوانح نگاری کا ارتقا	تحقیق شدہ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

خاکہ نگاری

۱۔	اسد اللہ رانی	اردو میں خاکہ نگاری	زیر تحقیق	جموں یونیورسٹی، جموں (کشمیر)
۲۔	سید فاروق حسین	اردو میں خاکہ نگاری	زیر تحقیق	جبل پور یونیورسٹی، جبل پور

شخصیات۔نثر نگار

۱۔	صادقہ بیگم	محمد مجیب، حیات اور ادبی کارنامے	زیر تحقیق	جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی
۲۔	محمد حبیب خان	مولوی عبدالحق (حیات اور ادبی کارنامے)	زیر تحقیق	جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی
۳۔	شیو پرشاد جاوید وششٹ	اسد اللہ وجہی (حیات اور ادبی کارنامے)	زیر تحقیق	جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی
۴۔	سید فرحت حسین	خواجہ غلام السیدین (حیات اور تصانیف)	زیر تحقیق	جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی
۵۔	سید ریاض علی	خواجہ حسن نظامی (حیات اور ادبی خدمات)	زیر تحقیق	جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

نمبر	نام	موضوع	کیفیت	یونیورسٹی
۶۔	ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی	شبلی	تحقیق شدہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۷۔	ڈاکٹر مصاحب علی (قمر رئیس)	پریم چند کا تنقیدی مطالعہ	تحقیق شدہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۸۔	ڈاکٹر ظہور الحسن	برج موہن دتاتریہ کیفی۔ تنقیدی جائزہ	تحقیق شدہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۹۔	ڈاکٹر سید محمد علی	قاضی عبدالغفار۔ حیات اور کارنامے	تحقیق شدہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۰۔	ڈاکٹر کوکب قدر سجاد مرزا	واجد علی شاہ کی ادبی و تہذیبی خدمات	تحقیق شدہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۱۔	نسیم قریشی	شرر۔ زندگی اور ادبی تخلیقات کا تنقیدی مطالعہ	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۲۔	محمد عثمان (اظہر پرویز)	اردو نثری ادب میں خواجہ حسن نظامی کی خدمات	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۳۔	غیور عالم	عبدالحق۔ علمی و ادبی خدمات	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۴۔	مسعودہ خاتون	راشد الخیری کی ادبی خدمات	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۵۔	علی وردی خاں	سید سلیمان کی ادبی خدمات	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۶۔	قاضی محمد زکریا	نیاز فتح پوری کی تصانیف کا تنقیدی جائزہ	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۷۔	حسن شاہ زماں علیم	عبدالحلیم شرر	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۸۔	ایس ایم آفاق احمد عرفانی	حیدر بخش حیدری۔ حیات اور ادبی خدمات	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۹۔	نیر سلطانہ صدیقی	عبدالرحمٰن بجنوری کی ادبی خدمات	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۲۰۔	ثریا اقبال	قرۃ العین حیدر کی تصانیف کا تنقیدی جائزہ	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۲۱۔	محمد ایوب	ل احمد اکبر آبادی کی ادبی خدمات	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۲۲۔	امام مرتضیٰ نقوی	حسن نظامی کی ادبی خدمات	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۲۳۔	حسن آرا شاہین	ذکاء اللہ دہلوی کی ادبی خدمات	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۲۴۔	عظمت اللہ قریشی	عظمت اللہ خان۔ حیات اور کارنامے	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۲۵۔	سرور علی قریشی	سرسید کے تعلیمی نظریات	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۲۶۔	ڈاکٹر شرافت حسین مرزا	مولانا آزاد کی ادبی خدمات	تحقیق شدہ	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۲۷۔	ڈاکٹر خلیل الرحمٰن سیفی	اسماعیل میرٹھی کی حیات اور خدمات	تحقیق شدہ	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۲۸۔	ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی	ڈاکٹر گلکرائسٹ کے علمی کاموں کا تنقیدی مطالعہ	تحقیق شدہ	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۲۹۔	شریف احمد	عبدالحلیم شرر حیات اور کارنامے	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۳۰۔	اردواں روبر	گارساں دتاسی کی خدمات	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۳۱۔	کنیز وارثی	راشد الخیری کی تصانیف	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۳۲۔	آصفیہ بیگم چشتی	حامد حسن قادری بہ حیثیت ادبی مورخ	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۳۳۔	ڈاکٹر جگت نرائن سکروال	پریم چند۔ حیات اور کارنامے	تحقیق شدہ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۳۴۔	ڈاکٹر اعجاز نقوی	سرشار بہ حیثیت ناول نگار	تحقیق شدہ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۳۵۔	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	حالی بہ حیثیت نثر نگار	زیر تحقیق ڈی لٹ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۳۶۔	شریف الحسن لاہرپوری	شرر لکھنوی۔ حیات اور کارنامے	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

۳۷۔	سید مصباح الاسلام نقوی	عبدالماجد دریابادی۔ حیات اور ادبی خدمات	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۳۸۔	سید عقیل احمد ہاشمی	ڈاکٹر نذیر احمد۔ حیات اور ادبی خدمات	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۳۹۔	سید سعید الدین	مرزا یاس یگانہ چنگیزی حیات اور ادبی خدمات	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۴۰۔	چوہدری محمد نعیم	پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب اور اردو ادب میں ان کی خدمات	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۴۱۔	نسیم اقتدار علی	اردو میں خواتین ناول نگار	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۴۲۔	جلیس فاطمہ	عہد حاضر میں اردو کی خواتین مختصر افسانہ نگار	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۴۳۔	سید سلطان احمد رضوی	سید سجاد ظہیر۔ حیات اور ادبی خدمات	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۴۴۔	قاضی مسعود الحسن عثمانی	مولانا شبلی نعمانی۔ اردو ادب میں ان کی خدمات	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۴۵۔	اختر یزداں محسن	مولانا نیاز فتح پوری۔ حیات اور کارنامے	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۴۶۔	ڈاکٹر وشنو گوپال	رتن ناتھ سرشار اور اس کی تصانیف کا مطالعہ	تحقیق شدہ	الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد
۴۷۔	ڈاکٹر احمد حسن	کرشن چندر۔ اس کی حیات و تصانیف	تحقیق شدہ	الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد
۴۸۔	ڈاکٹر سید نیر مسعود رضوی	رجب علی بیگ سرور	تحقیق شدہ	الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد
۴۹۔	ڈاکٹر محمد شمیم حنفی	محمد حسین آزاد کی ادبی خدمات کا مطالعہ	تحقیق شدہ	الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد
۵۰۔	ڈاکٹر آر آر مسیح	حالی بہ حیثیت سوانح نگار	تحقیق شدہ	الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد
۵۱۔	ڈاکٹر نسیم بانو	اردو میں خواتین ناول نگار۔ ان کے ادبی اور فنی کارنامے	تحقیق شدہ	الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد
۵۲۔	ڈاکٹر قدسیہ خاتون	اردو ادب میں سرسید احمد خان کا حصہ	تحقیق شدہ	الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد
۵۳۔	ڈاکٹر احمد حسن	پریم چند پر گاندھی ازم کے اثرات	زیر تحقیق ڈی لٹ	الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد
۵۴۔	رابرٹ میسن	حالی کی سوانح نگاری کا تنقیدی مطالعہ	زیر تحقیق	الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد
۵۵۔	ڈاکٹر شکیل الرحمٰن	پریم چند کی افسانہ نگاری	تحقیق شدہ ڈی لٹ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۵۶۔	ڈاکٹر اقبال اختر	اردو میں طنز و ظرافت اور رشید احمد صدیقی کا خصوصی مطالعہ	تحقیق شدہ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۵۷۔	ڈاکٹر طیب ابدالی	صوفی منیری کی نثر نگاری	تحقیق شدہ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۵۸۔	ڈاکٹر نثار مصطفیٰ	بیدی۔ حیات اور فن	تحقیق شدہ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۵۹۔	پروفیسر منظر شہاب	آغا حشر کی ڈراما نگاری	زیر تحقیق ڈی لٹ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۶۰۔	عبدالرشید	یگانہ چنگیزی۔ حیات اور کارنامے	زیر تحقیق	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۶۱۔	ابوالبرکات	سلیمان ندوی بہ حیثیت نثر نگار	زیر تحقیق	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۶۲۔	نزہت افزا	اردو ادب کی ترقی میں خواتین بہار کا حصہ	زیر تحقیق	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۶۳۔	محمد رضوان احمد خان	ڈاکٹر محسن بہ حیثیت افسانہ نگار	زیر تحقیق	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۶۴۔	ڈاکٹر فضل الحق	میر حسن۔ حیات اور خدمات	تحقیق شدہ	گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور
۶۵۔	ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد	ابوالکلام آزاد۔ فکر و فن	تحقیق شدہ	گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور
۶۶۔	ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی	نذیر احمد۔ شخصیت اور کارنامے	تحقیق شدہ	گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور

۶۷۔	منور حسین	عبدالسلام ندوی۔حیات وخدمات	زیر تحقیق	گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور
۶۸۔	محمد موسیٰ خان (موسیٰ مجروح)	غالب کی نثر	زیر تحقیق	گورکھپور یونیورسٹی گورکھپور
۶۹۔	فیروز احمد	رومانی نثر اور مہدی افادی	زیر تحقیق	گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور
۷۰۔	محمد نعیم صدیقی	سید سلیمان ندوی کی ادبی خدمات	زیر تحقیق	گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور
۷۱۔	اسما سلطان	عبدالحلیم شرر بہ حیثیت ناول نگار	زیر تحقیق	بھوپال یونیورسٹی، بھوپال
۷۲۔	خدیجہ بانو افغانی	نیاز فتح پوری۔ایک مطالعہ	زیر تحقیق	بھوپال یونیورسٹی، بھوپال
۷۳۔	بیگم ثریا رضوی	اسماعیل میرٹھی کا اردو ادب کو عطیہ۔اسماعیل بچوں کے ادیب خصوصی حوالے کے ساتھ	زیر تحقیق	میرٹھ یونیورسٹی، میرٹھ
۷۴۔	مطیع الحق انصاری	عصمت چغتائی کے افسانوں کا فنی جائزہ	زیر تحقیق	میرٹھ یونیورسٹی، میرٹھ
۷۵۔	ڈاکٹر طاہرہ عبداللہ	آغا حشر کاشمیری اور اردو ڈرامے میں ان کی خدمات	تحقیق شدہ	کشمیر یونیورسٹی، سرینگر
۷۶۔	ڈاکٹر محمد امین اندرابی	رجب علی بیگ سرور۔حیات اور تصانیف	تحقیق شدہ	کشمیر یونیورسٹی، سرینگر
۷۷۔	ڈاکٹر زہرہ رضوی	سید احمد دہلوی۔حیات اور کارنامے	تحقیق شدہ	کشمیر یونیورسٹی، سرینگر
۷۸۔	ڈاکٹر برج کشن ایما	سعادت حسن منٹو۔حیات اور کارنامے	تحقیق شدہ	کشمیر یونیورسٹی، سرینگر
۷۹۔	شام لال کالڑا عابد پشاوری	انشا۔حیات اور نثری کارنامے	زیر تحقیق	جموں یونیورسٹی، جموں (کشمیر)
۸۰۔	تہمینہ اختر	علی عباس حسینی	زیر تحقیق	جموں یونیورسٹی، جموں (کشمیر)
۸۱۔	ایڈلن روحی	عصمت چغتائی	زیر تحقیق	جموں یونیورسٹی، جموں (کشمیر)
۸۲۔	محمد شریف	قرۃ العین حیدر	زیر تحقیق	جموں یونیورسٹی، جموں (کشمیر)
۸۳۔	حسینہ بانو	ل۔احمد اکبرآبادی	زیر تحقیق	جموں یونیورسٹی، جموں (کشمیر)
۸۴۔	ڈاکٹر سید لطیف حسین	پنڈت رتن ناتھ سرشار اور اردو ادب	تحقیق شدہ ڈی لٹ	آگرہ یونیورسٹی، آگرہ
۸۵۔	عبدالحمید شمسی	راشد الخیری۔حیات اور فن	زیر تحقیق	آگرہ یونیورسٹی، آگرہ
۸۶۔	ڈاکٹر عبدالستار دلوی	محمد حسین آزاد۔حیات اور فن	تحقیق شدہ	بمبئی یونیورسٹی، بمبئی
۸۷۔	ڈاکٹر آدم شیخ	مرزا رسوا کی ناول نگاری	تحقیق شدہ	بمبئی یونیورسٹی، بمبئی
۸۸۔	رضیہ محمد	نصیر الدین ہاشمی کی ادبی خدمات	زیر تحقیق	بمبئی یونیورسٹی، بمبئی
۸۹۔	عبدالمتین	خواجہ حسن نظامی	زیر تحقیق	جبل پور یونیورسٹی، جبل پور
۹۰۔	محمد صدیق صدیقی	اردو ناول نگاری اور نذیر احمد	زیر تحقیق	جبل پور یونیورسٹی، جبل پور
۹۱۔	ڈاکٹر ذاکرہ غوث	اردو اور فارسی ادب میں مولانا باقر آغا کا حصہ	تحقیق شدہ	بمبئی یونیورسٹی، بمبئی
۹۲۔	مشتاق احمد	نواب سید محمد آزاد۔حیات و تصانیف	زیر تحقیق	کلکتہ یونیورسٹی، کلکتہ
۹۳۔	اکبر رحمانی	احتشام حسین۔شخصیت اور خدمات	زیر تحقیق	پونا یونیورسٹی، پونا
۹۴۔	شیخ عبدالرشید	مولانا عبدالماجد۔شخصیت اور خدمات	زیر تحقیق	پونا یونیورسٹی، پونا
۹۵۔	اقبال احمد صدیقی	مجنوں گورکھپوری۔شخصیت اور کارنامے	زیر تحقیق	وکرم یونیورسٹی، اوجین
۹۶۔	صابر حسین	احتشام حسین۔شخصیت اور کارنامے	زیر تحقیق	وکرم یونیورسٹی، اوجین

لغت۔ زبان۔ لسانیات

۱۔	مسعود ہاشمی	اردو لغت نگاری کا تنقیدی جائزہ	زیر تحقیق	جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی
۲۔	نور جہاں	دہلی کی بیگماتی اردو	زیر تحقیق	جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی
۳۔	ابوالفیض سحر	اردو اصطلاحات سازی (اصول اور تاریخ)	زیر تحقیق	جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی
۴۔	ڈاکٹر اسلم رضوی	فونیٹکس اینڈ فونولوجیکل اسٹرکچر آف اردو	تحقیق شدہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۵۔	ڈاکٹر شیر اقبال	اردو قواعد نویسی	تحقیق شدہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۶۔	ڈاکٹر کنول کرشن پالی	اردو اور ہندی عروض کا تقابلی مطالعہ	تحقیق شدہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۷۔	عبدالغفار شکیل	دکنی اردو کا توضیحی مطالعہ	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۸۔	رضیہ سید	شمالی ہندوستان میں شعر و شاعری کا لسانیاتی جائزہ	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۹۔	وقار احمد شہاب جعفری	اردو زبان میں انگریزی الفاظ	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۰۔	عذرا خانم	میواتی زبان کا صوتیاتی جائزہ	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۱۔	ذکاء الدین شایاں	اٹھارہویں صدی کی اردو شاعری کی فرہنگ	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۲۔	محمد حسین قریشی	انیسویں صدی کی اردو شاعری کی فرہنگ	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۳۔	ڈاکٹر کالا سنگھ بیدی	اردو اور پنجابی کا لسانی رشتہ	تحقیق شدہ	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۱۴۔	ڈاکٹر امیر اللہ خان شاہین	اردو کے نثری اسالیب کا تنقیدی مطالعہ	تحقیق شدہ	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۱۵۔	معین زیدی	جدید ہندوستان میں اردو زبان کا ارتقا	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۱۶۔	عابدہ بیگم	نثری اسالیب کا ارتقا ۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۱۷۔	سید وقار احمد جعفری	اردو میں انگریزی کے دخیل (مستعار) الفاظ	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۱۸۔	ڈاکٹر عبدالخلیق	اردو نثر کے اسلوب آزاد سے آزاد تک	تحقیق شدہ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۱۹۔	محمد شفیق	جدید اردو اور ہندی کا تقابلی مطالعہ	زیر تحقیق	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۲۰۔	ڈاکٹر ایم۔ ایچ رضوی	اردو لغت نگاری	تحقیق شدہ	کشمیر یونیورسٹی، سری نگر
۲۱۔	نور الزمان صدیقی	اردو عروض کا تنقیدی مطالعہ	زیر تحقیق	جموں یونیورسٹی، جموں
۲۲۔	جتیندر شرما	اردو میں سنسکرت اور ہندی اردو تراجم	زیر تحقیق	جموں یونیورسٹی، جموں
۲۳۔	ڈاکٹر سید حسرت سہروردی	تامل ناڈو میں اردو	تحقیق شدہ	مدراس یونیورسٹی، مدراس
۲۴۔	ڈاکٹر نذیر انصاری	اردو زبان و ادب پر ہندی کا اثر	تحقیق شدہ	جبل پور یونیورسٹی، جبل پور
۲۵۔	قاضی افضال حسین	میر کی شعری لسانیات	زیر تحقیق	گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور

ترتیب و تدوین

۱۔	شاہدہ خاتون	تدوین کلیات قدرت اللہ قاسم	زیر تحقیق	جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی
۲۔	ملجیت سنگھ	تدوین دیوان نواب آصف الدولہ آصف مع تنقیدی و تحقیقی مقدمہ (مبنی برنسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال (کلکتہ) و نسخہ سالار جنگ میوزیم)	زیر تحقیق	جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

۳۔	کلدیپ چند ملہوترہ	تدوین کلیات آغا جان عیش (مع تنقیدی وتحقیقی مقدمہ)	زیر تحقیق	جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی
۴۔	ڈاکٹر سراج الحق قریشی	دیوان زادہ۔ ترتیب مع مقدمہ	تحقیق شدہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۵۔	ڈاکٹر آمنہ خاتون	دریائے لطافت۔ ترتیب وتدوین مع مقدمہ	تحقیق شدہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۶۔	ڈاکٹر محمد طاہر صدیقی	دیوان مہدی علی خان ذکی کی ترتیب مع تعارف وحواشی	تحقیق شدہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۷۔	ڈاکٹر فاخرہ منصور	کلیات طالب علی خان عیش (تدوین مع مقدمہ وحواشی)	تحقیق شدہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۸۔	محمود الحسن	دیوان جرات۔ ترتیب وتدوین	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۹۔	کامنی بیگم	دیوان میر دوم وسوم کی تنقیدی ترتیب	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۰۔	ضیاء فاطمہ ظفر	دیوان میر اول کی تنقیدی ترتیب	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۱۔	اظہار الحسن قریشی	تدوین دیوان ناسخ	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۲۔	شمیم فاطمہ	تدوین دیوان خواجہ احسن اللہ بیاں معہ مقدمہ وحواشی	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۳۔	شاہ زمان عالم	تدوین کلیات شیفتہ	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۴۔	الطاف حسین	ترجمہ کتاب العمدہ مع مقدمہ وحواشی	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۵۔	سید محمد حیدر نقوی	واجد علی شاہ کی مثنوی ''عشق نامہ'' کی تدوین وتنقید	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۶۔	ڈاکٹر فضل حق کامل قریشی	خواجہ میر اثر (ترتیب وتدوین دیوان)	تحقیق شدہ	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۱۷۔	ڈاکٹر افسری افتخار	دیوان مضمون کی تحقیقی اور تنقیدی تدوین مع مستند متن اور مقدمہ	تحقیق شدہ	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۱۸۔	فرحت فاطمہ	دیوان یقین کی تدوین مع مقدمہ	مقالہ پیش کیا جا چکا	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۱۹۔	عبدالحفیظ	غزلیات ناسخ کی تدوین	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۲۰۔	سید فرحت حسین	دیوان غالب سے متعلق خطی نسخوں کا تنقیدی مطالعہ	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۲۱۔	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	کلیات ولی (ترتیب وتہذیب)	تحقیق شدہ ڈی لٹ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۲۲۔	ڈاکٹر نذیر احمد	کتاب نورس	تحقیق شدہ ڈی لٹ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۲۳۔	ڈاکٹر سید سلیمان حسین	فسانہ عجائب (ترتیب وتدوین)	تحقیق شدہ ڈی لٹ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۲۴۔	ڈاکٹر سید محمد شمیم احمد	تذکرہ خوش معرکہ زیبا (تدوین وترتیب)	تحقیق شدہ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۲۵۔	ڈاکٹر سید شبیہ الحسن	زاد آخرت مصنفہ مرزا مغل غافل کی تنقیدی تدوین	زیر تحقیق ڈی لٹ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۲۶۔	محمد عتیق	کلیات جرات (تدوین وترتیب)	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۲۷۔	صبیحہ انور	غالب کا غیر متداول کلام	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۲۸۔	ڈاکٹر قریش حسین	کلیات حضرت رکن الدین عشقی	تحقیق شدہ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۲۹۔	پروفیسر کاظم حسین	اردو کی ایک نایاب مثنوی	زیر تحقیق ڈی لٹ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۳۰۔	انوار الحق	عیار الشعرا کی تدوین	زیر تحقیق	گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور
۳۱۔	ڈاکٹر عبدالحمید فاروقی	یوسف زلیخا از امین گجراتی (ترتیب وتدوین)	تحقیق شدہ	بمبئی یونیورسٹی، بمبئی
۳۲۔	ڈاکٹر عالی جعفری	مثنوی خوب رنگ (ترتیب وتدوین)	تحقیق شدہ	بمبئی یونیورسٹی، بمبئی

۳۳۔	فیض النسانصراللہ	ہشت بہشت خوشنود (ترتیب وتنقید)	زیر تحقیق	بمبئی یونیورسٹی، بمبئی
۳۴۔	نورالسعید اختر	تاج الحقائق (ترتیب وتنقید)	زیر تحقیق	بمبئی یونیورسٹی، بمبئی
۳۵۔	ڈاکٹر سید عباس	تذکرۃ البلاد مصنفہ حسین علی کرمانی کا ترجمہ اور تنقیدی مطالعہ	تحقیق شدہ	بمبئی یونیورسٹی، بمبئی
۳۶۔	عبدالوہاب تبسم	ذکا تلوری ان کے دیوان کی ترتیب اور ان کا تنقیدی مقام	زیر تحقیق	سری وینکٹیشور یونیورسٹی، تروپتی
۳۷۔	ڈاکٹر سید ثاقب حسن رضوی	مکمل دیوان احسن اللہ خان بیان دہلی۔ مع تقابلی متن۔تنقیدی تعارف اور مکمل فرہنگ	تحقیق شدہ	اودے پور یونیورسٹی، اودے پور
۳۸۔	ڈاکٹر سید ثاقب حسن رضوی	انسائیکلو پیڈیا تذکرہ جات شعرائے اردو	تحقیق شدہ	اودے پور یونیورسٹی، اودے پور

متفرق

۱۔	حسن مثنیٰ	اردو میں علم الکلام	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۲۔	قیصر جہاں	اردو گیتوں کا تنقیدی جائزہ (۱۸۵۷ء سے ۱۹۵۷ء تک)	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۳۔	اقبال عباس عباسی	اردو ہجویات	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۴۔	ڈاکٹر زین العابدین	اردو میں ریختی	تحقیق شدہ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۵۔	فرخ ہمایوں زبیری	میرٹھ میں اردو مطبعوں کی تاریخ اور کارنامے (انیسویں صدی میں)	زیر تحقیق	میرٹھ یونیورسٹی، میرٹھ
۶۔	قاضی سید شہاب الدین	اردو میں میلاد نامے	زیر تحقیق	ناگپور یونیورسٹی، ناگپور
۷۔	ڈاکٹر خلیل احمد صدیقی	ریختی کا تنقیدی مطالعہ	تحقیق شدہ	وکرم یونیورسٹی، اوجین

دیگر تحقیقی ادارے

ملک کی یونیورسٹیوں سے باہر بھی کچھ ادارے اردو کی اہم خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان میں ترقی اردو بورڈ نئی دہلی اور ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ترقی اردو بورڈ کے زیر اہتمام کافی عرصے سے اردو اصطلاحات وضع کیے جانے کا کام ہو رہا ہے۔ کئی ہزار سے زیادہ سائنس اور دوسرے علوم وفنون سے متعلق اصطلاحات وضع کی جا چکی ہیں۔ یہ بتدریج شائع ہوں گی۔ اس کے علاوہ ترقی اردو بورڈ کی زیر نگرانی اردو املا کی اصلاح اور معیار بندی کے اقدامات بھی کیے گئے۔ اصلاح املا کمیٹی کی سفارشات جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر شعبہ اردو پروفیسر گوپی چند نارنگ سے مرتب کرائی گئیں اور ''املا نامہ'' کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ ترقی اردو بورڈ کی زیر نگرانی اردو لغت کا بھی کام ہو رہا ہے۔ یہ پانچ جلدوں میں ہوگا، جسے ڈاکٹر مسعود حسن خان، مالک رام، پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر مختار الدین احمد مرتب کریں گے۔ اسی بورڈ کے زیر اہتمام مختلف علوم وفنون کی سینکڑوں کتابوں کے تراجم کرائے جا رہے ہیں اور جہاں ضروری سمجھا گیا ہے طبع زاد علمی اور تحقیقی کتابیں بھی لکھوائی جا رہی ہیں۔ طلبا کے استفادے کے لیے نسبتاً چھوٹے لغت کا کام بمبئی انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں بھی جناب شہاب الدین دسنوی کی سرکردگی میں ہو رہا ہے۔

ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، حیدرآباد کے سپرد اردو انسائیکلو پیڈیا کی تیاری کا کام ہے۔ اس کی ترتیب وتدوین کے لیے تین کمیٹیاں تشکیل دی گئی ہیں۔ مینیجنگ کمیٹی کے چیئرمین میر اکبر علی خان ہیں۔ ایگزیکٹو کمیٹی کے چیئرمین ایل این گپتا اور ادارتی بورڈ کے چیئرمین ڈاکٹر عابد حسین ہیں۔ فضل الرحمن صاحب سابق پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو انسائیکلو پیڈیا کا چیف ایڈیٹر مقرر کیا گیا ہے۔ پروفیسر مسعود حسن خان وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی مختلف مضامین سے متعلق ماہرین کے پینل کے ممبر ہیں۔ اس انسائیکلو پیڈیا کی تکمیل سے ہندوستان کے قدیم علوم وفنون، تہذیب وتمدن، اسلامی کلچر اور فکر وفن کے بارے میں ضروری معلومات یکجا طور پر سامنے آ جائیں گی اور حوالے کے کام میں آسانی ہوگی۔

نمبر	نام	موضوع	کیفیت	جامعہ
۳۔	کلدیپ چند ملہوترہ	تدوین کلیات آغا جان عیش (مع تنقیدی وتحقیقی مقدمہ)	زیر تحقیق	جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی
۴۔	ڈاکٹر سراج الحق قریشی	دیوان زادہ۔ ترتیب مع مقدمہ	تحقیق شدہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۵۔	ڈاکٹر آمنہ خاتون	دریائے لطافت۔ ترتیب وتدوین مع مقدمہ	تحقیق شدہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۶۔	ڈاکٹر محمد طاہر صدیقی	دیوان مہدی علی خان ذکی کی ترتیب مع تعارف وحواشی	تحقیق شدہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۷۔	ڈاکٹر فاخرہ منصور	کلیات طالب علی خان عیش (تدوین مع مقدمہ وحواشی)	تحقیق شدہ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۸۔	محمود الحسن	دیوان جرات۔ ترتیب وتدوین	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۹۔	کامنی بیگم	دیوان میر دوم وسوم کی تنقیدی ترتیب	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۰۔	ضیاء فاطمہ ظفر	دیوان میر اول کی تنقیدی ترتیب	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۱۔	اظہار الحسن قریشی	تدوین دیوان ناسخ	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۲۔	شمیم فاطمہ	تدوین دیوان خواجہ احسن اللہ بیاں معہ مقدمہ وحواشی	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۳۔	شاہ زمان عالم	تدوین کلیات شیفتہ	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۴۔	الطاف حسین	ترجمہ کتاب العمدہ مع مقدمہ وحواشی	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۵۔	سید محمد حیدر نقوی	واجد علی شاہ کی مثنوی "عشق نامہ" کی تدوین وتنقید	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۶۔	ڈاکٹر فضل حق کامل قریشی	خواجہ میر اثر (ترتیب وتدوین دیوان)	تحقیق شدہ	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۱۷۔	ڈاکٹر افسری افتخار	دیوان مضمون کی تحقیقی اور تنقیدی تدوین مع مستند متن اور مقدمہ	تحقیق شدہ	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۱۸۔	فرحت فاطمہ	دیوان یقین کی تدوین مع مقدمہ	مقالہ پیش کیا جا چکا	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۱۹۔	عبد الحفیظ	غزلیات ناسخ کی تدوین	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۲۰۔	سید فرحت حسین	دیوان غالب سے متعلق خطی نسخوں کا تنقیدی مطالعہ	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۲۱۔	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	کلیات ولی (ترتیب وتہذیب)	تحقیق شدہ ڈی لٹ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۲۲۔	ڈاکٹر نذیر احمد	کتاب نورس	تحقیق شدہ ڈی لٹ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۲۳۔	ڈاکٹر سید سلیمان حسین	فسانہ عجائب (ترتیب وتدوین)	تحقیق شدہ ڈی لٹ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۲۴۔	ڈاکٹر سید محمد شمیم احمد	تذکرہ خوش معرکہ زیبا (تدوین وترتیب)	تحقیق شدہ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۲۵۔	ڈاکٹر سید شبیہ الحسن	زاد آخرت مصنفہ مرزا مغل غافل کی تنقیدی تدوین	زیر تحقیق ڈی لٹ	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۲۶۔	محمد عتیق	کلیات جرات (تدوین وترتیب)	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۲۷۔	صبیحہ انور	غالب کا غیر متداول کلام	زیر تحقیق	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
۲۸۔	ڈاکٹر قریش حسین	کلیات حضرت رکن الدین عشقی	تحقیق شدہ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۲۹۔	پروفیسر کاظم حسین	اردو کی ایک نایاب مثنوی	زیر تحقیق ڈی لٹ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۳۰۔	انوار الحق	عیار الشعرا کی تدوین	زیر تحقیق	گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور
۳۱۔	ڈاکٹر عبد الحمید فاروقی	یوسف زلیخا از امین گجراتی (ترتیب وتدوین)	تحقیق شدہ	بمبئی یونیورسٹی، بمبئی
۳۲۔	ڈاکٹر عالی جعفری	مثنوی خوب رنگ (ترتیب وتدوین)	تحقیق شدہ	بمبئی یونیورسٹی، بمبئی

۳۳۔	فیض النسا نصر اللہ	ہشت بہشت خوشنود (ترتیب وتنقید)	زیر تحقیق	بمبئی یونیورسٹی، بمبئی
۳۴۔	نور السعید اختر	تاج الحقائق (ترتیب وتنقید)	زیر تحقیق	بمبئی یونیورسٹی، بمبئی
۳۵۔	ڈاکٹر سید عباس	تذکرۃ البلاد مصنفہ حسین علی کرمانی کا ترجمہ اور تنقیدی مطالعہ	تحقیق شدہ	بمبئی یونیورسٹی، بمبئی
۳۶۔	عبدالوہاب تسنیم	ذکا نلوری ان کے دیوان کی ترتیب اور ان کا تنقیدی مقام	زیر تحقیق	سری ونکٹیشور یونیورسٹی، تروپتی
۳۷۔	ڈاکٹر سید ثاقب حسن رضوی	مکمل دیوان احسن اللہ خان بیان دہلی۔ مع تقابلی متن۔ تنقیدی تعارف اور مکمل فرہنگ	تحقیق شدہ	اودے پور یونیورسٹی، اودے پور
۳۸۔	ڈاکٹر سید ثاقب حسن رضوی	انسائیکلوپیڈیا تذکرہ جات شعرائے اردو	تحقیق شدہ	اودے پور یونیورسٹی، اودے پور

متفرق

۱۔	حسن مثنیٰ	اردو میں علم الکلام	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۲۔	قیصر جہاں	اردو گیتوں کا تنقیدی جائزہ (۱۸۵۷ء سے ۱۹۵۷ء تک)	زیر تحقیق	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۳۔	اقبال عباس عباسی	اردو ہجویات	زیر تحقیق	دہلی یونیورسٹی، دہلی
۴۔	ڈاکٹر زین العابدین	اردو میں ریختی	تحقیق شدہ	پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
۵۔	فرخ ہمایوں زبیری	میرٹھ میں اردو مطبعوں کی تاریخ اور کارنامے (انیسویں صدی میں)	زیر تحقیق	میرٹھ یونیورسٹی، میرٹھ
۶۔	قاضی سید شہاب الدین	اردو میں میلاد نامے	زیر تحقیق	ناگپور یونیورسٹی، ناگپور
۷۔	ڈاکٹر خلیل احمد صدیقی	ریختی کا تنقیدی مطالعہ	تحقیق شدہ	وکرم یونیورسٹی، اوجین

دیگر تحقیقی ادارے

ملک کی یونیورسٹیوں سے باہر بھی کچھ ادارے اردو کی اہم خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان میں ترقی اردو بورڈ نئی دہلی اور ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ترقی اردو بورڈ کے زیر اہتمام کافی عرصے سے اردو اصطلاحات وضع کیے جانے کا کام ہورہا ہے۔ کئی ہزار سے زیادہ سائنس اور دوسرے علوم وفنون سے متعلق اصطلاحات وضع کی جاچکی ہیں۔ یہ بتدریج شائع ہوں گی۔ اس کے علاوہ ترقی اردو بورڈ کی زیر نگرانی اردو املا کی اصلاح اور معیار بندی کے اقدامات بھی کیے گئے۔ اصلاح املا کمیٹی کی سفارشات جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر گوپی چند نارنگ سے مرتب کرائی گئیں اور ''املا نامہ'' کے نام سے شائع ہوچکی ہیں۔ ترقی اردو بورڈ کی زیر نگرانی اردو لغت کا بھی کام ہورہا ہے۔ یہ پانچ جلدوں میں ہوگا، جسے ڈاکٹر مسعود حسن خان، مالک رام، پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر مختار الدین احمد مرتب کریں گے۔ اسی بورڈ کے زیر اہتمام مختلف علوم وفنون کی سینکڑوں کتابوں کے تراجم کرائے جارہے ہیں اور جہاں ضروری سمجھا گیا ہے طبع زاد علمی اور تحقیقی کتابیں بھی لکھوائی جارہی ہیں۔ طلبا کے استفادے کے لیے نسبتاً چھوٹے لغت کا کام بمبئی انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں بھی جناب شہاب الدین دسنوی کی سرکردگی میں ہورہا ہے۔

ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، حیدرآباد کے سپرد اردو انسائیکلوپیڈیا کی تیاری کا کام ہے۔ اس کی ترتیب وتدوین کے لیے تین کمیٹیاں تشکیل دی گئی ہیں۔ مینیجنگ کمیٹی کے چیئرمین میر اکبر علی خان ہیں۔ ایگزیکٹو کمیٹی کے چیئرمین ایل این گپتا اور ادارتی بورڈ کے چیئرمین ڈاکٹر عابد حسین ہیں۔ فضل الرحمن صاحب سابق پرووائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو انسائیکلوپیڈیا کا چیف ایڈیٹر مقرر کیا گیا ہے۔ پروفیسر مسعود حسن خان وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی مختلف مضامین سے متعلق ماہرین کے پینل کے ممبر ہیں۔ اس انسائیکلوپیڈیا کی تکمیل سے ہندوستان کے قدیم علوم وفنون، تہذیب وتمدن، اسلامی کلچر اور فکر وفن کے بارے میں ضروری معلومات یکجا طور پر سامنے آجائیں گی اور حوالے کے کام میں آسانی ہوگی۔

تحقیقی لائبریریاں

تحقیق کے میدان میں لائبریری کا اہم مقام ہے۔ لائبریری کی سہولت اور اس میں موجود کتابوں اور مخطوطات کے ذخائر تحقیق کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر یونیورسٹی میں ایک سینٹرل لائبریری ہے۔ بعض میں ریسرچ لائبریری کا علیحدہ بھی انتظام ہے۔ ان کے علاوہ بہت سی سرکاری، غیر سرکاری اور ذاتی لائبریریاں اور کتب خانے بھی ہیں جن میں انتہائی مفید اور معلوماتی خزینے جمع ہیں اور تحقیق کے بعض نئے ابواب ان ہی کے استفادے سے کھل سکے ہیں۔ تحقیق کے طالب علم کے لیے ان کا جاننا ضروری ہے۔ اس لیے ایسی جن لائبریریوں اور کتب خانوں کا علم ہو سکا وہ ذیل میں درج کر دی گئی ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
۲۔ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، نئی دہلی
۳۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی
۴۔ کتب خانہ غالب اکیڈمی، نئی دہلی
۵۔ کتب خانہ ایوان غالب، نئی دہلی
۶۔ کتب خانہ نذیریہ، پہاڑی بھوجلہ، نئی دہلی
۷۔ مولانا آزاد سنٹرل لائبریری، علی گڑھ
۸۔ سبحان اللہ اورینٹل لائبریری، علی گڑھ
۹۔ رضا لائبریری، رام پور
۱۰۔ صولت پبلک لائبریری، رام پور
۱۱۔ کتب خانہ مسعود حسن رضوی، لکھنؤ
۱۲۔ کتب خانہ مالک رام، نئی دہلی
۱۳۔ کتب خانہ مولانا خیر بہروری، لکھنؤ
۱۴۔ کتب خانہ حبیب الرحمٰن، حبیب گنج گلگشن، علی گڑھ
۱۵۔ کتب خانہ مطبع نول کشور پریس، لکھنؤ
۱۶۔ کتب خانہ ندوۃ العلما، لکھنؤ
۱۷۔ کتب خانہ قدیم امیر الملک نواب یار محمد خان مرحوم (شوکت)، بھوپال
۱۸۔ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، بھوپال
۱۹۔ مولانا آزاد سینٹرل لائبریری، بھوپال
۲۰۔ خدا بخش لائبریری، پٹنہ
۲۱۔ کتب خانہ مشرقیہ، بانکی پور، پٹنہ
۲۲۔ کتب خانہ سالار جنگ میوزیم، حیدر آباد
۲۳۔ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری، حیدر آباد
۲۴۔ کتب خانہ آصفیہ، حیدر آباد
۲۵۔ ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری، کلکتہ
۲۶۔ نیشنل لائبریری، کلکتہ
۲۷۔ کشمیر کلچرل اکیڈمی، سرینگر (کشمیر)

۲۸۔ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد

۲۹۔ کتب خانہ راجہ صاحب محمودآباد، محمودآباد

۳۰۔ کتب خانہ جامع مسجد، بمبئی

۳۱۔ کتب خانہ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بمبئی

۳۲۔ کتب خانہ مطبع مفید خلائق، آگرہ

۳۳۔ مہاراجہ لائبریری، پٹیالہ

بیرون ہند

۳۴۔ کتب خانہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور (پاکستان)

۳۵۔ کتب خانہ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، لاہور (پاکستان)

۳۶۔ قومی آثار خانہ، کراچی (پاکستان)

۳۷۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو، کراچی (پاکستان)

۳۸۔ برٹش میوزیم، لندن (انگلینڈ)

۳۹۔ انڈیا آفس لائبریری، لندن (انگلینڈ)

۴۰۔ کتب خانہ آکسفورڈ یونیورسٹی، آکسفورڈ (انگلینڈ)

۴۱۔ کتب خانہ کیمبرج یونیورسٹی، کیمبرج (انگلینڈ)

۴۲۔ لائبریری آف کانگریس، واشنگٹن (امریکہ)

۴۳۔ کتب خانہ برلن یونیورسٹی، برلن (مشرقی جرمنی)

۴۴۔ ببلیو تیک نیسونال (نیشنل)، پیرس (فرانس)

۴۵۔ کتب خانہ علوم شرقیہ، ماسکو (روس)

ذیل میں ایم فل ر پی ایچ ڈی میں داخلہ لینے والے ان طلبا کے نام اور ان کے موضوعات کی فہرست درج کی جا رہی ہے جنھوں نے ۱۹۸۴ء میں ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں اپنے موضوعات کا رجسٹریشن کرایا ہے۔ ان میں بعض طلبا نے اپنے اپنے داخلے مکمل کرا لیے ہیں اور بعض کو ابھی مکمل کرانے ہیں۔ جن طلبا نے ایم فل ر پی ایچ ڈی مکمل کر لی ہے یا جنھوں نے اپنے مقالے داخل کر دیے ہیں ان کے نام بھی شامل فہرست ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

پی ایچ ڈی (۱)	موضوع ایم فل (۲)	ریسرچ سکالر (۳)	نگران (۴)
۱۔ تدوین دیوان معروف	خاندان لوہاروں کی ادبی خدمات	عارفہ پروین	ڈاکٹر نورالحسن نقوی
۲۔ فکر اقبال اور ہم عصر فکری رجحانات	معاصر تحریکات	شجاع الدین	پروفیسر منظر عباس نقوی
۳۔ کلیم الدین احمد حیات اور خدمات	فن داستان گوئی اور داستان پر معاصر تنقید	قمرالہدی	پروفیسر عتیق احمد
۴۔ مصحفی کی تذکرہ نگاری		عظمت اللہ قریشی	ڈاکٹر نورالحسن
۵۔ میرامن اور ان کی ادبی خدمات کا تنقیدی جائزہ	نوطرز مرصع اور باغ و بہار کا تقابلی مطالعہ	زرینہ پروین	ابوالکلام قاسمی
۶۔ اردو ہندی افسانے میں فرقہ واریت کا مسئلہ	کرشن چندر کی افسانہ نگاری کا تنقیدی جائزہ	غیاث الدین	قاضی عبدالستار

۷۔ سرسید کی ادبی خدمات کا تنقیدی جائزہ	علی گڑھ سائنٹفک سوسائٹی کے کارناموں کا تنقیدی مطالعہ	محمد ابو صالح	پروفیسر ثریا حسین
۸۔ اردو نثر کے ارتقا میں علی گڑھ کا حصہ	اردو نثر کا اجمالی جائزہ (۱۸۵۰ء-۱۸۰۰ء) فورٹ ولیم کالج کے علاوہ	وسیم الرحمٰن	ڈاکٹر شہریار
۹۔ جعفر علی خان کی اثر کی ادبی خدمات کا تنقیدی جائزہ	لکھنؤ کی ثقافت بیسویں صدی میں	بشیر فاطمہ کاظمی	پروفیسر منظر عباس نقوی
۱۰۔ اردو غزل میں تصوف کے رجحانات	ولی کی شاعری میں تصوف	محمد عثمان خان	ڈاکٹر نادر علی خان
۱۱۔ بیسویں صدی کی طنزیہ مزاحیہ نثر کا تنقیدی جائزہ	مچھو بیگ ستم ظریف کی مزاح نگاری	محمد عقیل خان	ابوالکلام قاسمی
۱۲۔ ابوالکلام آزاد کی صحافت کا تنقیدی جائزہ	محمد علی جوہر کی صحافت	محمد فضیل انصاری	ڈاکٹر اصغر منہاس
۱۳۔ ولی کی نثری تصانیف کا تنقیدی مطالعہ	عجائب القصص کا تنقیدی مطالعہ	ملکہ پروین	ڈاکٹر محمد انصار اللہ
۱۴۔ دیوان شیفتہ کی تنقید و تدوین مع مقدمہ	شیفتہ کے عہد کا ادبی ماحول	شمع پروین	ڈاکٹر نعیم احمد
۱۵۔ ریاض خیرآبادی کی صحافت کا تنقیدی جائزہ	گلدستہ پیام یار کا تنقیدی مطالعہ	صاحب علی	ڈاکٹر نادر علی خاں

داخلہ برائے ڈی لٹ

اردو ناول میں دیہاتی زندگی کا عکس ۱۸۵۷ء سے ۱۹۸۰ء تک — ڈاکٹر جمال آرا نظامی

مندرجہ ذیل مقالے پورے ہو چکے ہیں:

۱۔ اردو نظم ۱۹۳۶ء تا حال	عقیل احمد صدیقی	ڈاکٹر شہریار	ڈگری یافتہ برائے پی ایچ ڈی
۲۔ عربی فارسی تنقید کا اثر اردو پر	ابوالکلام قاسمی		مقالہ داخل
۳۔ اکبر الہ آبادی کی شاعری کا مطالعہ	شاہدہ خانم	پروفیسر عتیق احمد صدیقی	مقالہ داخل
۴۔ مولوی عبدالحق کی ادبی اور لسانی خدمات	شہاب الدین	ڈاکٹر اصغر عباس	ڈگری یافتہ برائے ایم فل
۵۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، حیات اور شخصیت	غضنفر عباس	پروفیسر ثریا حسین	ڈگری یافتہ برائے ایم فل

شری وینکٹیشور یونیورسٹی، تروپتی

	موضوع (۱)	ریسرچ اسکالر (۲)	نگران (۳)
۱۔	شوکت سبزواری حیات اور ادبی خدمات	کے بشیر احمد	پروفیسر رضی الدین احمد
۲۔	ناقدین غالب	عبدالغنی فاروقی	پروفیسر رضی الدین احمد
۳۔	تدوین دیوان باقر آگاہ	حبیب النساء بیگم	پروفیسر رضی الدین احمد
۴۔	دیوان ذکا نلوری	عبدالوہاب تسنیم صاحب	پروفیسر رضی الدین احمد
۵۔	مغربی تہذیب اقبال اور اکبر کی نظر میں	شیخ ناصرہ بیگم	پروفیسر رضی الدین احمد
۶۔	افسانوی ادب میں اشاریت	آر محمود خان	ڈاکٹر محمد سلیمان خان
۷۔	۱۹۴۷ء کے بعد اردو غزل کے نئے رجحانات	عبدالستار صاحب	ڈاکٹر محمد سلیمان خان
۸۔	اختر الایمان حیات اور شاعری	رفعت النساء بیگم	ڈاکٹر محمد سلیمان خان
۹۔	حالی کی پیامی شاعری اور عصری آگہی	سید شاہ سکندر صاحب	پروفیسر رضی الدین احمد
۱۰۔	پروفیسر غلام عمر خان کے تحقیقی و تنقیدی کارنامے	شیخ محمد انور صاحب	پروفیسر رضی الدین احمد

۱۱۔	شاہ رفیع الدین دہلوی کی اردو خدمات	پی۔ داؤد خان صاحب	پروفیسر رضی الدین احمد
۱۲۔	اردو شاعری میں تعلیمی تصورات (اکبر، حالی اور اقبال کے یہاں)	بی زینت النساء	ڈاکٹر عبدالرزاق فاروقی
۱۳۔	جنوبی ہند میں اردو کی نشر و اشاعت میں ڈاکٹر عبدالحق کے کارنامے	اقبال احمد صاحب	ڈاکٹر عبدالاحد صاحب
۱۴۔	خواجہ احمد عباس اور کملیشور کا تنقیدی و تقابلی مطالعہ	نذیر احمد صاحب	ڈاکٹر عبدالاحد صاحب
۱۵۔	۱۹۴۸ء کے بعد اردو ناول	سید مقبول حسین پاشا	ڈاکٹر محمد سلیمان خان
۱۶۔	اردو مثنوی کا ارتقاء دبستان گولکنڈہ میں	شہزادی بیگم	پروفیسر رضی الدین

ایم فل

۱۔	خلیل الرحمن اعظمی بہ حیثیت شاعر	نیاض الدین احمد	پروفیسر رضی الدین احمد
۲۔	یسیر کرنولی شاعری اور شخصیت	یعقوب شریف	ڈاکٹر محمد سلیمان خان
۳۔	پروفیسر خواجہ احمد فاروقی۔ حیات اور کارنامے	شمشاد بیگم	ڈاکٹر محمد سلیمان خان
۴۔	خواجہ احمد عباس بہ حیثیت افسانہ نگار	محمد غوث صاحب	ڈاکٹر محمد سلیمان خان
۵۔	صالحہ عابد حسین حیات اور کارنامے	زرینہ بیگم	ڈاکٹر محمد سلیمان خان
۶۔	پروفیسر محمد مجیب بہ حیثیت ڈراما نگار	زیب النسا بیگم	پروفیسر رضی الدین احمد
۷۔	ناقدین نظیر	فضل الحق صاحب	پروفیسر رضی الدین احمد
۸۔	اردو کی رجائیہ شاعری	خورشید بیگم	پروفیسر رضی الدین احمد

گلبرگہ یونیورسٹی

۱۔	آزادی ہند کے بعد ضلع گلبرگہ میں اردو زبان و ادب کا ارتقا اور مسائل کا تجزیہ	فہیم الدین	ڈاکٹر رزاق فاروقی
۲۔	عہد آصف جاہی میں اردو میں نعتیہ شاعری	اطہر النسا	ڈاکٹر رزاق فاروقی
۳۔	اردو شاعری میں تعلیمی تصورات	زینت النسا	ڈاکٹر رزاق فاروقی
۴۔	یسیر کرنولی حیات اور ادبی خدمات	خلیل اللہ قاسمی	ڈاکٹر رزاق فاروقی
۵۔	ڈاکٹر سیدہ جعفر حیات اور ادبی خدمات	تقدیس کوثر	ڈاکٹر رزاق فاروقی
۶۔	قائد ملت بہادر یار جنگ حیات اور ادبی خدمات	زاہد عرفان	ڈاکٹر رزاق فاروقی
۷۔	عہد آصفی میں اردو نثر کا ارتقا	محمد طیب انصاری	ڈاکٹر قیوم صادق
۸۔	سید محمد، حیات اور ادبی خدمات	محمد عبدالجلیل تنویر	ڈاکٹر قیوم صادق
۹۔	شاہ محمد چندا حسینی شاپوری حیات اور شاعری	رابعہ بیگم	ڈاکٹر قیوم صادق
۱۰۔	پروفیسر مبارز الدین رفعت حیات اور ادبی خدمات	حشمت علی	ڈاکٹر قیوم صادق
۱۱۔	کرناٹک میں اردو ادب کا ارتقا	خالد سعید	ڈاکٹر قیوم صادق

بنگلور یونیورسٹی

نمبر	موضوع	اسکالر	نگراں
۱۔	اردو ادب میں شرر کے تاریخی ناولوں کا مقام	محمد اقبال احمد	ڈاکٹر فہمیدہ بیگم
۲۔	غواصی کی مثنویوں کا تنقیدی مطالعہ	محمد صبغۃ اللہ	ڈاکٹر فہمیدہ بیگم
۳۔	جنوبی ہند کی صوفیانہ مثنویاں	مہ نور زمانی بیگم	ڈاکٹر فہمیدہ بیگم
۴۔	سرسید کے تعلیمی نظریات کا تفصیلی جائزہ	فرزانہ بیگم	ڈاکٹر عبدالاحد

کرناٹک یونیورسٹی

نمبر	موضوع	اسکالر	نگراں
۱۔	کالی داس گپتا رضا شخصیت، شاعری اور کارنامے	راہی قریشی	ڈاکٹر حیدر کرمڑی (ڈگری یافتہ)
۲۔	حکیم محمد امام امامی شخصیت اور کارنامے	زبیر بن عمر	ڈاکٹر حیدر کومڑی (ڈگری یافتہ)

سیفیہ کالج بھوپال

نمبر	موضوع	اسکالر	نگراں
۱۔	شاد عارفی شخصیت اور فن	ڈاکٹر مظفر حنفی	پروفیسر عبدالقوی دسنوی (ڈگری یافتہ)
۲۔	ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری حیات اور علمی خدمات	ڈاکٹر صدیقہ بیگم	پروفیسر عبدالقوی دسنوی (ڈگری یافتہ)
۳۔	اردو تنقید کا مارکسی دبستان	ڈاکٹر نسیم شہنوی	پروفیسر عبدالقوی دسنوی (ڈگری یافتہ)
۴۔	اقبال اور اردو غزل	ڈاکٹر محمد ایوب خان	پروفیسر عبدالقوی دسنوی (ڈگری یافتہ)
۵۔	تخلص بھوپالی حیات اور ادبی خدمات	محترمہ صفیہ رودو	پروفیسر عبدالقوی دسنوی مقالہ (داخل ہو چکا ہے)
۶۔	بھوپال میں اردو انضمام کے بعد	محمد نعمان	پروفیسر عبدالقوی دسنوی مقالہ (داخل ہو چکا ہے)
۷۔	اقبال کی شاعری میں شخصیات	سید شرافت علی ندوی	پروفیسر عبدالقوی دسنوی
۸۔	ریاست بھوپال اور مشاہیر	ارجمند بانو	پروفیسر عبدالقوی دسنوی
۹۔	ریاست بھوپال میں اطبا کی علمی و ادبی خدمات	اختر مسعود صدیقی	پروفیسر عبدالقوی دسنوی
۱۰۔	محوی صدیقی ۔ حیات اور کارنامے	منیر المحوی	پروفیسر عبدالقوی دسنوی

راجستھان یونیورسٹی، جے پور

نمبر	موضوع	اسکالر	نگراں
۱۔	اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت اور ارتقا	روشن کاظمی	ڈاکٹر فضل امام (ڈگری یافتہ)
۲۔	جدید نظم ہیئت اور روایت	رفعت اختر خاں	ڈاکٹر محمد علی زیدی (ڈگری یافتہ)
۳۔	اردو نثر میں جدید رجحانات	سید مدبر علی زیدی	ڈاکٹر محمد علی زیدی (ڈگری یافتہ)
۴۔	ریاست ٹونک میں شعری و ادبی روایت	ڈاکٹر مس فیروز	ڈاکٹر فضل امام (ڈگری یافتہ)
۵۔	اردو قطعات نگاری	مس عابدہ آفریدی	ڈاکٹر فضل امام (ڈگری یافتہ)
۶۔	فرہنگ کلیات میر مع مقدمہ	فرید احمد برکاتی	ڈاکٹر فضل امام (ڈگری یافتہ)
۷۔	ظہیر دہلوی حیات اور شاعری	سید یاد علی	ڈاکٹر محمد علی زیدی
۸۔	مَیکش اکبر آبادی حیات اور شاعری	حبیب الرحمٰن نیازی	ڈاکٹر محمد علی زیدی
۹۔	راجستھان میں اردو نثر	زین الخالدین	ڈاکٹر محمد علی زیدی
۱۰۔	احسن مارہروی حیات اور ادبی خدمات	مس عمر جہاں	ڈاکٹر محمد علی زیدی

۱۱۔	مولانا سلیم الدین تسلیم حیات اور ادبی خدمات	مس حسن آرا	ڈاکٹر فضل امام
۱۲۔	تدوین کلیات میر	زہرہ سفیان	ڈاکٹر فضل امام
۱۳۔	اردو میں رومانوی تحریک اور سجاد حیدر یلدرم	اسلام اشرف	ڈاکٹر فیروز احمد
۱۴۔	لکھنؤ میں اردو نثر ۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۰ء تک	محمد شعیب	ڈاکٹر فیروز احمد
۱۵۔	جوش ملیح آبادی فکر و فن	مس ثریا خانم	ڈاکٹر فیروز احمد
۱۶۔	مرزا اکبر علی بیگ گل حیات اور شاعری	مس سلمٰی سفیان	ڈاکٹر فیروز احمد
۱۷۔	عصمت چغتائی حیات اور کارنامے	مسز عارفہ سلطانہ	ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی
۱۸۔	راجستھان میں مختلف زبانوں کی کتابوں کے اردو تراجم	عزیز اللہ شیرانی	ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی
۱۹۔	راجستھان میں اساتذہ دہلی اور لکھنؤ کا سلسلہ تلمذ	محمد عارف خان	ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی
۲۰۔	جدید نظم نگاری	ریاست حسین فاروقی	ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی

ایل۔ این۔ متھلا یونیورسٹی

	(۱)	(۲)	(۳)
۱۔	نواب سعادت علی خان حیات اور خدمات	حافظ عبدالمنان طرزی	ڈاکٹر محمد مطیع الرحمٰن
۲۔	تفہیم اقبال۔ ایک جائزہ اور تنقید	غلام قدوس	ڈاکٹر نجم الہدیٰ
۳۔	مراثی شاد میں فکری عناصر	اظہار احمد	ڈاکٹر محمد مطیع الرحمٰن
۴۔	رتن ناتھ سرشار کے ناولوں کا تہذیبی اور سماجی پس منظر	محمد عطا اللہ خان	ڈاکٹر محمد کمال الدین
۵۔	راشد الخیری کی ناول نگاری	عبدالعلام	ڈاکٹر محمد کمال الدین
۶۔	بہار کے طنز و مزاح نگار	نظیر احمد انجم	ڈاکٹر شاکر خلیق
۷۔	دربھنگہ میں اردو کا ارتقا	عبدالظہیر ناشاد	ڈاکٹر محمد مطیع الرحمٰن
۸۔	قاری عبدالمجید مضطر مظفر پوری حیات اور خدمات	محمد ظفر العلام	ڈاکٹر محمد طیب صدیقی
۹۔	شین مظفر پوری حیات اور خدمات	محمد مصطفیٰ	ڈاکٹر محمد طیب صدیقی
۱۰۔	ڈاکٹر سلام سندیلوی حیات اور خدمات	سید حسین احمد	ڈاکٹر محمد مطیع الرحمٰن
۱۱۔	محسن دربھنگوی حیات اور خدمات	عبدالقیوم	ڈاکٹر محمد طیب صدیقی
۱۲۔	ریاست علی ندوی حیات اور خدمات	محمد علقمہ	ڈاکٹر محمد طیب صدیقی
۱۳۔	مطالعہ اقبال تاریخ اسلام کی روشنی میں	محمد رضوان صدیقی	ڈاکٹر محمد طیب صدیقی
۱۴۔	بہار میں مثنوی نگاری کا ارتقا	سہیل اختر	(مقالہ جمع ہو گیا)
۱۵۔	ساحر لدھیانوی حیات اور خدمات	محمد ضیاء الرحمٰن	ڈاکٹر محمد مطیع الرحمٰن
۱۶۔	شبلی نعمانی سوانح نگار اور مورخ کی حیثیت سے	محمد جمیل اختر	ڈاکٹر محمد طیب صدیقی
۱۷۔	اردو کی ادبی تنقید اور جدید ذہن	محمد عمیر احمد	ڈاکٹر محمد طیب صدیقی
۱۸۔	پورنیہ میں اردو ادب کا ارتقا	فاران شکوہ یزدانی	ڈاکٹر محمد مطیع الرحمٰن
۱۹۔	مولانا ابوالکلام آزاد اور ادبی خدمات	محمد اعلیٰ نور	ڈاکٹر محمد طیب صدیقی
۲۰۔	محمد شعیب تیر پھلواروی حیات اور خدمات	محمد منیر فاروقی	ڈاکٹر محمد مطیع الرحمٰن

۲۱۔	منظری شاعری بہ تخصیص علامہ اقبال	محمد فیاض ظفر	ڈاکٹر محمد طیب صدیقی

مدراس یونیورسٹی

مقالات برائے ایم لٹ

۱۔	تامل ناڈو میں اردو زبان وادب کا ارتقا	مظہر قلندر	محمد یوشع (ڈگری یافتہ)
۲۔	مولوی باقر آگاہ کی عربی فارسی اور اردو تصانیف	ذاکرہ غوث	محمد یوسف کوکن (ڈگری یافتہ)
۳۔	تامل ناڈو میں اردو صحافت	سید صفی اللہ	محمد یوسف کوکن (ڈگری یافتہ)

مقالات برائے پی ایچ ڈی

۴۔	اردو مثنوی میں اخلاقی عناصر	ملکہ خورشید سلطانہ	ڈاکٹر نجم الہدیٰ (ڈگری یافتہ)
۵۔	اقبال کی اردو نظموں کا فنی وفکری جائزہ	محمد عبدالحفیظ	ڈاکٹر نجم الہدیٰ (ڈگری یافتہ)
۶۔	اردو ناولوں میں ترقی پسندی	حیات بادشاہ	ڈاکٹر نجم الہدیٰ (ڈگری یافتہ)
۷۔	شاعران فطرت ورڈز تھ اور نظیر کا تقابلی مطالعہ	ایس ایم عظمت اللہ	ڈاکٹر نجم الہدیٰ (ڈگری یافتہ)
۸۔	اردو ناولوں میں ہندوستانی سماج	سید سجاد حسین	ڈاکٹر نجم الہدیٰ (ڈگری یافتہ)
۹۔	کرشن چندر فکر وفن	محمد شبر	ڈاکٹر نجم الہدیٰ (ڈگری یافتہ)

مقالات برائے ایم فل (کام مکمل ہو چکا ہے)

۱۰۔	اقبال کی اردو نظموں کے افکار کا جائزہ	محمد عبدالحفیظ	ڈاکٹر نجم الہدیٰ
۱۱۔	کرشن چندر کے ناولوں میں ترقی پسندی	حیات بادشاہ	ڈاکٹر نجم الہدیٰ
۱۲۔	ڈاکٹر عبدالحق حیات اور کارنامے	فاطمہ بیگم	ڈاکٹر نجم الہدیٰ
۱۳۔	قاضی بدرالدولہ حیات اور کارنامے	سید سجاد حسین	ڈاکٹر نجم الہدیٰ
۱۴۔	راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں سماجی تصور	بی۔عبدالوحید خان	ڈاکٹر نجم الہدیٰ
۱۵۔	عہد والا جاہی کے تین شاعر، شاطر، پرتو اور ایمان کے شعری کارناموں کا تنقیدی جائزہ	پروین فاطمہ	ڈاکٹر نجم الہدیٰ
۱۶۔	نواب غلام غوث خان اعظم کے عہد میں اردو زبان وادب کا ارتقا	بدرالنساء	ڈاکٹر نجم الہدیٰ
۱۷۔	تامل ناڈو میں اردو زبان وادب کا ارتقا	شوکت جہاں	ڈاکٹر نجم الہدیٰ
۱۸۔	تامل ناڈو میں اردو کی نعتیہ شاعری، ۱۸۰۰ء سے ۱۹۸۰ء تک	منیر فاطمہ	ڈاکٹر نجم الہدیٰ
۱۹۔	تامل ناڈو میں اردو مثنوی کا ارتقا ۱۸۰۰ء سے ۱۹۸۰ء تک	شہنواز بیگم	ڈاکٹر نجم الہدیٰ
۲۰۔	اردو کے اسلام پسند شعرا حالی، اکبر اور اقبال کا فکری جائزہ	اے۔عبدالحق	ڈاکٹر نجم الہدیٰ
۲۱۔	تلنگانہ میں اردو نظم آزادی کے بعد	ضیاء الدین	ڈاکٹر نجم الہدیٰ

کام جو ہو رہا ہے۔ برائے پی ایچ ڈی

۲۲۔	اردو شاعری میں عوامی زندگی	پروین فاطمہ	ڈاکٹر نجم الہدیٰ

۲۳۔	تامل ناڈو میں اردو نثر کا ارتقا	سید صفی اللہ	ڈاکٹر نجم الہدیٰ
۲۴۔	تامل ناڈو میں اردو شاعری ۱۸۰۰ء سے ۱۹۵۰ء تک	بدرالنسا	ڈاکٹر نجم الہدیٰ
۲۵۔	اردو ڈرامے پر شیکسپیر کے اثرات	جی۔ ٹی۔ عبدالمجید	ڈاکٹر نجم الہدیٰ
۲۶۔	اردو کے جدید افسانوی ادب کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ	پی احمد شاہ	ڈاکٹر نجم الہدیٰ
۲۷۔	تامل ناڈو میں اردو ادب، ۱۸۵۷ء کے بعد	عبدالغفار شاکر	ڈاکٹر نجم الہدیٰ
۲۸۔	اردو شاعری میں کلاسیکی استعارے	مظہر علی شہیری	ڈاکٹر نجم الہدیٰ

(کام ہو رہا ہے برائے ایم فل)

۲۹۔	تامل ناڈو میں اردو شاعری کا جائزہ ۱۹۵۰ء کے بعد	عباس علی خان	ڈاکٹر نجم الہدیٰ
۳۰۔	قاضی عبید اللہ حیات اور کارنامے	سید محمد ابراہیم	ڈاکٹر نجم الہدیٰ
۳۱۔	آزاد غزل۔ ایک تنقیدی جائزہ	سید سجاد بخاری	ڈاکٹر نجم الہدیٰ

❖❖❖❖

پاکستانی جامعات میں اردو تحقیق کے ۳۵ سال

۱۹۴۷ء تا ۱۹۸۲ء رفتار اور معیار

ڈاکٹر سید معین الرحمن

(۱)

سابق مشرقی پاکستان میں ڈھاکہ یونیورسٹی کا شعبہ اردو بہت ممتاز تھا۔ اب اسے نظرانداز کر کے موجودہ پاکستان کی آٹھ یونیورسٹیوں کے اردو شعبوں میں تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ اب تک چار اسکالرز نے پاکستانی یونیورسٹیوں سے ڈی لٹ کا اعلیٰ ترین علمی اعزاز حاصل کیا ہے: ڈاکٹر وحید قریشی نے پنجاب یونیورسٹی سے، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ڈاکٹر قمقام جعفری نے کراچی یونیورسٹی سے اور ڈاکٹر جمیل جالبی نے سندھ یونیورسٹی سے یہ اسناد فضیلت پائیں۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۲ء تک کے ان پچیس برسوں میں پاکستان کی مختلف یونیورسٹیوں سے ایک سو ساٹھ اہل علم نے پی ایچ ڈی کی اسناد حاصل کی ہیں۔ ان میں پچیس خواتین بھی شامل ہیں۔

اس حد زمانی میں کراچی یونیورسٹی، سندھ یونیورسٹی اور بلوچستان کی جامعات سے تین خواتین اور تین اصحاب (کل چھ محققین) نے اردو میں ایم فل کی اسناد بھی حاصل کیں۔

سب سے زیادہ تحقیقی کام پنجاب یونیورسٹی میں ہوا، جہاں ستر سے زیادہ محققین کو اردو میں پی ایچ ڈی کی اسناد تفویض ہوئیں۔ تحقیقی کام کی جو آسانیاں اور قدیم اور باثروت کتاب خانوں کی جیسی سہولتیں لاہور میں میسر ہیں، اس کے پیش نظر تحقیقی کام کی یہ رفتار اور زیادہ بہتر اور اطمینان بخش ہو سکتی تھی، اگر ماضی میں مجاز رویے مثبت ہوتے اور نو آموز واردان تحقیق کی حوصلہ شکنی نہ کی جاتی۔

پنجاب یونیورسٹی لاہور سے تحقیقی کام کی اجازت حاصل کر لینا اب جیسا سہل ہے، پہلے ایسا کبھی نہیں رہا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، تقسیم ملک کے بعد سے ۱۹۶۴ء تک یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے صدر اور اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل رہے۔ ۱۹۶۴ء تک کے سترہ برسوں میں کل بارہ اصحاب کو پی ایچ ڈی سے سرخرو ہونا نصیب ہوا۔

۱۹۶۵ء سے ۱۹۸۲ء تک کے اگلے سترہ برسوں میں (جب پروفیسر سید وقار عظیم، ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ڈاکٹر وحید قریشی، شعبہ اردو کے صدر اور اورینٹل کالج کے پرنسپل رہے)، اکتیس محققین کو پی ایچ ڈی کی اسناد تفویض ہوئیں۔ پچاس کے قریب موضوعات کا اندراج ہو چکا ہے اور اہل علم منظور نظر موضوعات پر داد تحقیق دینے میں مصروف ہیں۔

پنجاب یونیورسٹی شعبہ اردو کے اس دوسرے دور (عہد موجودہ) میں تحقیقی کام کی اجازت حاصل کر لینا جیسا آسان اور ارزاں بنا دیا گیا ہے، وہ پہلے دور کی ناروا اور بے جواز حوصلہ شکنی کا ایک طرح سے گویا ردعمل ہے۔

کراچی میں تحقیق وسائل کی کمی ہے اور نہ ذی استعداد اصحاب کا قحط، اس عقب میں بیس بائیس برس میں صرف اٹھارہ انیس محققین کا ڈاکٹریٹ کی منزل کو پانا کسی طرح قابل رشک نہیں۔

سندھ یونیورسٹی نے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی نگرانی میں تحقیقی کام کی جو روایت اور رفتار قائم کی وہ قابل تحسین ہے۔ بعض صورتوں میں کام کے معیار کے بارے میں شاید دو رائے ہوں لیکن اس عدم اعتدال سے کون سی یونیورسٹی ہے جو بچی ہوگی۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ایک طرف ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی اور ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے تحقیقی کام کو ایک معیار اور مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے کہ تحقیقی کام کو کیسا ہونا چاہیے۔ دوسری طرف پنجاب یونیورسٹی ہی کے بعض بے ڈول یا کج مج ''انتقادی'' مقالات کو اس امر کی مثال بھی پیش کیا جا سکتا ہے کہ تحقیقی کام کو کیسا نہ ہونا چاہیے!!

قیام پاکستان کے بعد سے اب تک پنجاب یونیورسٹی لاہور، ڈھاکہ یونیورسٹی (سابق مشرقی پاکستان)، سندھ یونیورسٹی حیدرآباد (جامشورو)، کراچی

یونیورسٹی، پشاور یونیورسٹی، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور اور جامعہ بلوچستان کوئٹہ کے اردو شعبوں میں جو تحقیقی کام ہوا (یا ہو رہا ہے) اگلے صفحات میں اس کی ضروری تفصیلات پیش کی جا رہی ہیں۔ ان تفصیلات کے ہر طرح جامع ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا، ان کوائف میں ترمیم تصحیح یا اضافے کی گنجائش موجود ہے۔ پچھلی ایک تہائی صدی میں پاکستانی یونیورسٹیوں کے اردو شعبوں میں جو تحقیقی کام پایۂ تکمیل کو پہنچا یا جو شروع موضوع زیر تحقیق ہیں) اس کا جائزہ یا تجزیہ ایک بڑی فرصت کا متقاضی ہے، اس کا موقع نہیں، اس میں مقامات آہ و فغاں بھی بہت ہیں۔ بایں ہمہ ایک دو عمومی امور کی طرف اشارہ کر دینا چاہوں گا۔

پہلی بات، ایک ہی موضوع پر کام کی تکرار ہے۔ جہاں تحقیق کے لیے اردو شعر و ادب کی کتنی ہی وادیاں قدم قدم کی آبلہ پا کی منتظر ہوں، وہاں کم و بیش ایک یا ایک ہی سے موضوع کو تحقیق کے لیے منتخب کرنا اور منظور کر لینا (محقق کے پیش نظر کوئی آسان راستہ نہیں ہے تو) گویا توانائیوں کو ضائع کرنا ہے۔

اردو میں سیرت النبی ﷺ کے موضوع پر سندھ یونیورسٹی میں بھی کام ہوا (۱۹۸۲ء)، پنجاب یونیورسٹی نے بھی اس موضوع پر سند دی (۱۹۸۲ء) جب کہ ''اردو میں سیرت نبوی ﷺ کا ادب'' ہی کے موضوع پر ڈاکٹر اسد اللہ کامل، ۱۹۶۸ء میں شعبہ اردو، کشمیر یونیورسٹی، سرینگر سے پروفیسر عبدالقادر سروری کی نگرانی میں ڈاکٹریٹ پا چکے ہیں[1]۔ اردو شاعری کے سیاسی، سماجی اور تاریخی پس منظر پر پنجاب یونیورسٹی میں بھی کام ہوا، سندھ یونیورسٹی میں بھی، ڈھاکہ میں بھی اور کراچی[2] میں بھی عابد علی عابد مرحوم کے علمی کارناموں پر پنجاب یونیورسٹی میں بھی کام ہو رہا ہے اور ملتان میں بھی۔

وسائل اور افرادی قوت کی قلت کے مدنظر حتی الامکان مختلف یونیورسٹی میں ایک ہی موضوع پر یا بڑی حد تک ملتے جلتے موضوعات پر (کسی استثنائی استحقاق کے بغیر) کام کرنے کے رجحان کو روکنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کوئی طریق کار وضع کر سکتا ہے۔

ایک دوسری تکلیف دہ حقیقت یہ ہے کہ ان تیس پینتیس (۳۵) برسوں میں پاکستانی جامعات سے جتنے تحقیقی مقالات پر پی ایچ ڈی کی اسناد تفویض ہوئی ہیں، میری نظر اور دسترس کی حد تک، ان میں سے بمشکل ایک تہائی کو طباعت کی روشنی میسر آئی ہے۔ تحقیق کا مقصد اگر انکشاف یا حقائق کی نئی تعبیر و تشریح ہے، تو پھر ان تحقیقی مقالات کا جو اس معیار پر پورا اتریں، شائع نہ ہونا اور محض یونیورسٹی لائبریری میں یا یونیورسٹی کے دفتر میں سر بند رہنا، کیا صریح و سنگین ظلم نہیں؟

تحقیقی مقالات کی اشاعت کا لازمی اہتمام متعلقہ یونیورسٹی اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن دونوں کا مشترکہ درد سر ہونا چاہیے۔ پھر کامیاب مقالہ نگاروں کے مقالات اور علمی انکشافات نہ صرف یہ کہ ضرور شائع ہوں بلکہ جن فاضل ممتحنوں نے مقالے اور سند عطا کیے جانے کی سفارش کی ہو، ان کے اسما بھی التزاماً مقالے پر ثبت اور ہو سکے تو ان کی رپورٹیں بھی مقالے کے آغاز میں درج ہوں۔ اس سے تحقیقی کام کا معیار اور اعتبار بڑھے گا اور غلط بخشی یا سہل انگاری کا اگر کوئی راستہ ہے تو وہ بند ہو گا۔

(۲)

پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

(الف) ڈی لٹ (اردو):

پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد اکتوبر ۱۹۴۸ء سے پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں اردو میں ایم اے کی جماعتوں کا آغاز ہوا، اب اس پر ۳۵ برس ہونے کو آئے۔ اس ایک تہائی صدی میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے اردو میں ڈی لٹ کی صرف ایک سند تفویض ہوئی ہے۔ یہ اعزاز اور امتیاز ڈاکٹر وحید قریشی کو ۱۹۶۵ء میں حاصل ہوا جب ان کی کتاب ''میر حسن اور ان کا زمانہ'' (مطبوعہ لاہور، ۱۹۵۹ء) پر انھیں اردو میں ڈی لٹ کی سند عطا کی گئی۔ ۱۹۵۲ء میں انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی تھی۔

(ب) پی ایچ ڈی (اردو):

پنجاب یونیورسٹی لاہور سے اردو میں پی ایچ ڈی کی سب سے پہلی سند ڈاکٹر محمد صادق نے ۱۹۳۹ء میں حاصل کی۔ ان کا تحقیقی مقالہ جو انگریزی میں لکھا گیا (صفحات ۲۴۸)، مولانا محمد حسین آزاد کے بارے میں:

"Maulvi Muhammad Hussain Azad-- His Life and Works"

یہ مقالہ، ویسٹ پاک پبلشنگ کمپنی لاہور کی طرف سے ۱۹۷۴ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر محمد صادق نے اپنے اس مقالے کو ''بہت سی ترمیمات اور اہم اضافوں کے بعد'' انگریزی سے اردو میں بھی منتقل کیا۔ یہ ترجمہ مجلس ترقی ادب، لاہور سے ''محمد حسین آزاد۔ احوال و آثار'' کے نام سے نومبر ۱۹۷۶ء میں بصورت

کتاب چھپ چکا ہے۔ (صفحات ۲۹۶)۔

۱۹۴۸ء میں یونیورسٹی میں اردو میں ایم اے کی سطح پر تدریس کا آغاز اور اہتمام ہوا اس کے بعد سے اردو میں پی ایچ ڈی کی سند کے لیے تحقیقی کام کا رجحان بڑھا، اب تک اردو میں جن محققین نے یہ اعلیٰ علمی فضیلت حاصل کی ہے ان کے کوائف یہ ہیں:

۱۔ ڈاکٹر صابر علی خان، موضوع ''سعادت یار خان رنگین۔ حیات و کلام۳'' نگران کار: ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، سال تکمیل ۱۹۵۵ء۔

۲۔ ڈاکٹر وزیر آغا ''اردو ادب میں طنز و مزاح۴'' ڈاکٹر عبادت بریلوی، ۱۹۵۶ء۔

۳۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق، ''ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق۵''، ڈاکٹر سید عبداللہ، ۱۹۵۷ء۔

۴۔ ڈاکٹر سید صفدر حسین، ''زندگی اور ادب، شاہان اودھ کے عہد میں۶'' ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ۱۹۵۷ء۔

۵۔ ڈاکٹر اے۔ ڈی نسیم، ''اردو شاعری کا مذہبی اور فلسفیانہ مطالعہ'' ڈاکٹر سید عبداللہ ۱۹۵۹ء۔

۶۔ ڈاکٹر مظفر حسین ملک، ''مرزا دبیر سوانح و کلام۷'' سید عابد علی عابد، ۱۹۶۰ء۔

۷۔ ڈاکٹر ارشاد احمد ارشد، ''اردو میں شخصی، مذہبی اور قومی مرثیہ نگاری۔ تاریخ و تنقید'' ڈاکٹر سید عبداللہ ۱۹۶۰ء۔

۸۔ ڈاکٹر غلام حسین، ذوالفقار، اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر۸، ڈاکٹر سید عبداللہ، ۱۹۶۱ء۔

۹۔ ڈاکٹر ناظر حسن زیدی ''مومن خان مومن دہلوی'' سید وقار عظیم ۱۹۶۲ء۔

۱۰۔ ڈاکٹر عبیداللہ خان ''پریم چند ان کا عہد اور فن'' سید وقار عظیم ۱۹۶۲ء۔

۱۱۔ ڈاکٹر سید محمود نقوی (سہیل بخاری) ''اردو کی نثری داستانوں کا تنقیدی مطالعہ'' سید وقار عظیم ۱۹۶۳ء۔

۱۲۔ ڈاکٹر محمد اسلم قریشی، ''ڈرامائی نظریات اور تکنیک کی روشنی میں اردو ڈرامے کا جائزہ۹'' (۱) سید وقار عظیم، (۲) امتیاز علی تاج ۱۹۶۳ء۔

۱۳۔ ڈاکٹر سید ظہیر حسین فتح پوری، ''رسوا کی ناول نگاری۱۰'' سید وقار عظیم، ۱۹۶۷ء۔

۱۴۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ''مولوی نذیر احمد۔ احوال و آثار۱۱'' سید وقار عظیم ۱۹۶۷ء۔

۱۵۔ ڈاکٹر اسد علی اریب، ''اردو میں بچوں کا ادب۱۲'' ڈاکٹر وحید قریشی ۱۹۶۷ء۔

۱۶۔ ڈاکٹر آغا مسعود رضا، ''اردو افسانے کا ارتقا''، سید وقار عظیم ۱۹۶۸ء۔

۱۷۔ ڈاکٹر ناصر احمد خان، (پرویز پروازی) ''اردو ناول۔ نذیر احمد سے مرزا رسوا تک''، سید وقار عظیم، ۱۹۶۸ء۔

۱۸۔ ڈاکٹر عبدالرزاق عظیم، ''شاہ نصیر دہلوی''، ڈاکٹر وحید قریشی، ۱۹۷۲ء۔

۱۹۔ ڈاکٹر محمد صالحین تبسم کاشمیری، ''غلام ہمدانی مصحفی''، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ۱۹۷۳ء۔

۲۰۔ ڈاکٹر فیضان دانش، ''کلام ولی کا فنی و لسانی جائزہ'' ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، ۱۹۷۳ء۔

۲۱۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ''اکبر الہ آبادی۔ تحقیقی و تنقیدی مطالعہ۱۳'' ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ۱۹۷۴ء۔

۲۲۔ ڈاکٹر اورنگ زیب ممتاز منگلوری، ''شرر کے تاریخی ناول اور ان کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ۱۴''، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ۱۹۷۵ء۔

۲۳۔ ڈاکٹر رضیہ نور محمد، ''اردو زبان و ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی جائزہ''، ڈاکٹر وحید قریشی، ۱۹۷۶ء۔

۲۴۔ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، ''اردو کی نثری داستانوں میں طنز و مزاح اور ان کے محرکات کا جائزہ'' سید وقار عظیم، ۱۹۷۸ء۔

۲۵۔ ڈاکٹر سلیم اختر ''اردو میں تنقید کا نفسیاتی دبستان۱۵'' ڈاکٹر وحید قریشی، ۱۹۷۸ء۔

۲۶۔ ڈاکٹر سمیر عبدالحمید ابراہیم، ''اردو شاعری کی ساخت اور ترقی۔ اٹھارہویں صدی میں'' ڈاکٹر عبادت بریلوی، ۱۹۷۸ء۔

۲۷۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان ''اردو داستانوں کا علامتی مطالعہ'' ڈاکٹر عبادت بریلوی، ۱۹۷۹ء۔

۲۸۔ ڈاکٹر ملک حسن اختر، ''شمالی ہند کی اردو شاعری۔ عہد محمد شاہی میں'' ڈاکٹر عبادت بریلوی، ۱۹۷۹ء۔

۲۹۔ ڈاکٹر محمد انوار الدین (انور سدید) ''اردو ادب کی تحریکیں'' ڈاکٹر وزیر آغا، ۱۹۷۹ء۔

۳۰۔ ڈاکٹر محمد آغا سہیل: ''دبستان لکھنؤ کے داستانی ادب کا ارتقا'' ڈاکٹر عبیداللہ خان، ۱۹۷۹ء۔

۳۱۔ ڈاکٹر شمیم ملک، ''آغا حشر کاشمیری، حیات اور کارنامے'' (۱) وقار عظیم، (۲) ڈاکٹر عبادت بریلوی، ۱۹۷۹ء۔

۳۲۔ ڈاکٹر محمد یوسف بخاری ''کشمیری اور اردو کا تقابلی مطالعہ'' ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ۱۹۸۰ء۔

۳۳۔ ڈاکٹر مظفر عباس ''ابوالکلام آزاد، شخصیت اور فن'' ڈاکٹر عبیداللہ خان، ۱۹۸۱ء۔

۳۴۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ''اقبالیات۔ تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ'' ڈاکٹر وحید قریشی، ۱۹۸۱ء۔

۳۵۔ ڈاکٹر منظور الٰہی ممتاز ''اردو سفرنامے۔ تحقیقی و تنقیدی جائزہ'' ڈاکٹر عبیداللہ خان، ۱۹۸۱ء۔

۳۶۔ ڈاکٹر رخشندہ گل، ''اردو ادب میں عیسائیوں کی خدمات''، ڈاکٹر وحید قریشی، ۱۹۸۱ء۔

۳۷۔ ڈاکٹر روشن آراء راؤ، ''ادبیات اردو کے ارتقا میں رسائل کا حصہ'' ڈاکٹر وحید قریشی، ۱۹۸۱ء۔

۳۸۔ ڈاکٹر فقیر محمد انجم رحمانی، ''برطانوی دور میں اردو کے فروغ میں پنجاب کے نظام تعلیم کا حصہ''، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ۱۹۸۱ء۔

۳۹۔ ڈاکٹر ممتاز اختر مرزا ''پنجاب میں اردو کا ارتقا (۱۸۴۹ء سے ۱۹۱۴ء تک)''۔ ڈاکٹر ناظر حسن زیدی، ۱۹۸۱ء۔

۴۰۔ ڈاکٹر ناہید کوثر، ''اردو شاعری کا ارتقاء (۱۸۳۹ء۔۱۸۰۳ء)''، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، ۱۹۸۱ء۔

۴۱۔ ڈاکٹر انور محمود خالد، ''اردو نثر میں سیرت رسول ﷺ'' ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ۱۹۸۲ء۔

۴۲۔ ڈاکٹر ریاض الحق ظاہر، ''اردو نعت''، ڈاکٹر وحید قریشی ۱۹۸۲ء۔

۴۳۔ ڈاکٹر سلطان زمان نزہت اکرام، ''ڈاکٹر سید غلام محی الدین قادری زور (احوال و آثار)''، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ۱۹۸۲ء۔

(ج) پی ایچ ڈی (اردو) کے زیر تکمیل مقالات:

اردو میں پی ایچ ڈی کی سند کے لیے درج ذیل محقق اپنے منظور شدہ موضوعات پر تحقیقی کام پورا کر چکے ہیں یا ان کا کام تکمیل کے آخری مرحلے میں ہے۔

۱۔ طاہر تونسوی، ''سید مسعود حسن رضوی، احوال و آثار''، نگران کار، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، اندراج کا سال ۱۹۷۷ء، سال تکمیل ۱۹۸۳ء۔

۲۔ سعداللہ کلیم، ''اردو غزل کی تہذیبی و فکری بنیادیں'' ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ۱۹۷۶ء سال تکمیل ۱۹۸۴ء۔

۳۔ مظہر محمود خان شیرانی، ''حافظ محمود شیرانی اور ان کی علمی و ادبی خدمات'' ڈاکٹر وحید قریشی، ۱۹۷۶ء سال تکمیل، ۱۹۸۷ء۔

اردو میں پی ایچ ڈی کی سند کے لیے بہت سے محققین کے موضوعات، پنجاب یونیورسٹی اردو بورڈ آف اسٹڈیز رایڈوانسڈ اسٹڈیز اینڈ ریسرچ بورڈ سے منظور ہو چکے ہیں اور وہ بہ تفصیل درج ذیل اندراج کے بعد اپنے اپنے منظور شدہ موضوعات پر تحقیقی کام میں مصروف ہیں۔

۴۔ علی ثنا شاکر بخاری، ''سعادت حسن منٹو'' (۱) صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، (۲) ڈاکٹر وحید قریشی، ۱۹۷۵ء سال تکمیل ۱۹۸۶ء۔

۵۔ فضل میراں گوہر نوشاہی، ''لاہور کے چشتی خاندان کی علمی و ادبی خدمات''، ڈاکٹر وحید قریشی، ۱۹۷۷ء سال تکمیل، ۱۹۸۳ء۔

۶۔ محمد اسلم ضیا، ''علم عروض اور اردو شاعری''، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ۱۹۷۸ء سال تکمیل، ۱۹۸۶ء۔

۷۔ محمد صدیق جاوید، ''فکر اقبال کا عمرانی مطالعہ'' ڈاکٹر عبادت بریلوی، ۱۹۷۸ء سال تکمیل، ۱۹۸۷ء۔

۸۔ اختر علی، ''سید سلیمان ندوی اور ان کی علمی و ادبی اور دینی خدمات'' ڈاکٹر عبیداللہ خان، ۱۹۷۸ء سال تکمیل، ۱۹۸۴ء۔

۹۔ شمیم اختر سیال، ''جعفر طاہر، حیات اور فن''، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ۱۹۷۹ء۔

۱۰۔ نازنین اختر، ''مولوی ممتاز علی کی شخصیت اور علمی و ادبی اور صحافتی خدمات''، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، ۱۹۷۹ء سال تکمیل، ۱۹۸۶ء۔

۱۱۔ شگفتہ خواجہ، ''ایم ڈی تاثیر۔ شخصیت اور کارنامے'' ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ۱۹۷۹ء۔

۱۲۔ تنویر احمد بٹ، ''ریاض خیر آبادی، احوال و آثار'' ڈاکٹر وحید قریشی، ۱۹۷۹ء۔

۱۳۔ نثار احمد قریشی، ''صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، حیات و فن'' ڈاکٹر وحید قریشی ۱۹۷۸ء سال تکمیل، ۱۹۸۶ء۔

۱۴۔ عبدالحفیظ، ''فورٹ ولیم کالج (۱۸۰۰ء۔۱۸۵۴ء)، ڈاکٹر وحید قریشی، ۱۹۷۹ء۔

۱۵۔ طارق عزیز، ''اردو رسم الخط اور ٹائپ کا مسئلہ'' ڈاکٹر وحید قریشی، ۱۹۷۹ء سال تکمیل، ۱۹۸۶ء۔

۱۶۔ ریاض احمد ریاض، ''ابن انشاء احوال و آثار''، (۱) ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، (۲) ڈاکٹر عبید اللہ خان، ۱۹۷۹ء سال تکمیل، ۱۹۸۶ء۔

۱۷۔ رئیس عباسی زیدی ''اردو ادب میں رومانیت'' ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ۱۹۷۹ء۔

۱۸۔ احسن زیدی، ''اردو میں منقبت نگاری'' ڈاکٹر وزیر آغا، ۱۹۷۹ء سال تکمیل، ۱۹۸۶ء۔

۱۹۔ رضیہ سلطانہ، ''اسلامی کلچر، اردو مرثیے میں''، ڈاکٹر عبید اللہ خان ۱۹۷۹ء سال تکمیل، ۱۹۸۴ء۔

۲۰۔ ملازم حسین اختر، ''محمد احسن فاروقی، حیات اور فن'' ڈاکٹر عبید اللہ خان، ۱۹۷۹ء سال تکمیل، ۱۹۸۶ء۔

۲۱۔ سعیدہ مختار ''نصیر الدین ہاشمی۔ احوال و آثار'' ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، ۱۹۷۹ء۔

۲۲۔ ناہید سلطانہ ''کلام اقبال میں اعلام و اماکن کی فکری اہمیت'' ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، ۱۹۷۹ء۔

۲۳۔ پروین اختر، ''اردو مرثیے کا ارتقا'' سید سجاد باقر رضوی، ۱۹۷۹ء۔

۲۴۔ افسر عباس زیدی، ''انیسویں صدی میں تحریک اصلاح نسواں کا جائزہ اور اردو کے افسانوی ادب پر اس کے اثرات'' ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، ۱۹۷۹ء۔

۲۵۔ عبدالقیوم بھٹی (قیوم شاکر)، ''اردو گرائمر نویسی اور لسانیاتی ادب کا ارتقا'' ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ۱۹۷۹ء سال تکمیل، ۱۹۸۶ء۔

۲۶۔ منظور اختر تحسین فراقی، ''عبدالماجد دریا آبادی۔ احوال و آثار'' ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ۱۹۸۰ء سال تکمیل، ۱۹۸۶ء۔

۲۷۔ فریدہ کنول ''جدید اردو غزل'' (۱) ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، (۲) ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ۱۹۸۰ء۔

۲۸۔ عصمت اللہ خان، ''کنہیا لال کپور، شخصیت اور فن'' (۱) ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، (۲) ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ۱۹۸۰ء۔

۲۹۔ شبیہ کاظمی، ''ڈاکٹر یوسف حسین خان، احوال و آثار'' (۱) ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، (۲) ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ۱۹۸۰ء۔

۳۰۔ شفیق احمد، ''مولانا غلام رسول مہر۔ احوال و آثار'' ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ۱۹۸۰ء۔

۳۱۔ طارق حسین زیدی ''اردو غزل کے تہذیبی اور معاشرتی محرکات'' ڈاکٹر سہیل احمد خان، ۱۹۸۰ء۔

۳۲۔ نسرین وسیم، ''لکھنؤ میں اردو شاعری ۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء)'' ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، ۱۹۸۰ء۔

۳۳۔ عطاء اللہ خان عطش درانی، سید عابد علی عابد۔ احوال و آثار'' ڈاکٹر وحید قریشی، ۱۹۸۰ء۔

۳۴۔ محمد بشیر سیفی، ''اردو میں انشائی ادب کا ارتقا (قدیم انشا سے جدید انشائیے تک)'' ڈاکٹر وحید قریشی، ۱۹۸۰ء سال تکمیل، ۱۹۸۶ء۔

۳۵۔ محمد ایوب، ''شارحین دیوان غالب (اردو) کی شروح کا تقابلی مطالعہ''، ڈاکٹر وحید قریشی، ۱۹۸۰ء سال تکمیل، ۱۹۸۶ء۔

۳۶۔ شاہدہ نسرین، ''سید احمد دہلوی۔ احوال و آثار'' ڈاکٹر عبید اللہ خان، ۱۹۸۰ء۔

۳۷۔ سردار علی، ''شورش کاشمیری۔ احوال و آثار''، ڈاکٹر عبید اللہ خان، ۱۹۸۰ء۔

۳۸۔ سجاد حسین نقوی ''مولانا صلاح الدین احمد۔ احوال و آثار''، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ۱۹۸۰ء۔

۳۹۔ محمد اجمل خان نیازی، ''محمد دین فوق، حیات اور علمی و ادبی خدمات'' ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ۱۹۸۱ء سال تکمیل، ۱۹۸۸ء۔

۴۰۔ عفیرہ حامد علی خان، ''اردو زبان و ادب کی ترقی میں صحافت کا حصہ''، ڈاکٹر عبید اللہ خان، ۱۹۸۱ء سال تکمیل، ۱۹۸۷ء۔

۴۱۔ بیگم ثاقبہ رحیم الدین خاں، ''خواجہ میر درد اور ان کے تلامذہ'' ڈاکٹر وحید قریشی، ۱۹۸۱ء۔

۴۲۔ میرا راحیلہ بانو، ''محمد طاہر فاروقی۔ احوال و آثار'' ڈاکٹر عبید اللہ خان، ۱۹۸۱ء۔

۴۳۔ اعجاز حنیف، ''عزیز احمد، زندگی اور کارنامے'' ڈاکٹر وحید قریشی، ۱۹۸۱ء سال تکمیل، ۱۹۸۷ء۔

۴۴۔ رشید احمد گوریجہ، ''اردو میں تاریخی ناول نگاری'' ڈاکٹر عبید اللہ خاں، ۱۹۸۱ء سال تکمیل، ۱۹۸۷ء۔

۴۵۔ ثمینہ بشیر، ''سید عبدالحمید عدم، شخصیت اور فن'' ڈاکٹر سہیل احمد خاں، ۱۹۸۱ء۔

۴۶۔ ثریا جبیں ملک، شارحین اقبال، تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مرزا محمد منور، ۱۹۸۱ء۔

۴۷۔ ذوالفقار حسین بخاری، ''علمائے دیوبند کی ادبی خدمات'' ڈاکٹر عبید اللہ خان، ۱۹۸۱ء۔

۴۸۔ صابر حسین کلوری، ''باقیات شعر اقبال کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ'' (۱) ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، (۲) ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ۱۹۸۲ء۔

۴۹۔ اورنگ زیب عالمگیر، ''تدوین کلیات شعرناسخ''، ڈاکٹر خواجہ زکریا،۱۹۸۲ء۔

۵۰۔ عبدالغنی فاروق، ''مولانا طاہر القادری، حیات اور ادبی خدمات''، (۱) ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، (۲) ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ۱۹۸۲ء۔

(۳)

ڈھاکہ یونیورسٹی، ڈھاکہ (۱۹۴۸ء۔۱۹۷۱ء)

پنجاب یونیورسٹی لاہور کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی سب سے قدیم تھی، اس کا آغاز ۱۹۲۱ء میں ہوا لیکن اس میں شعبہ اردو کا اجرا قیام پاکستان کے بعد اپریل ۱۹۴۸ء میں ہوا، اگرچہ پنجاب یونیورسٹی نے بھی اس برس ایم اے کی کلاسیں شروع کیں لیکن تدریس کا آغاز اکتوبر ۱۹۴۸ء میں ہوا، اسی طرح ڈھاکہ یونیورسٹی کو پاکستان بھر میں سب سے پہلے اردو میں ایم اے کی سطح تک تدریس اور تعلیم و تعلم کا افتخار اور اعزاز حاصل ہوا۔

شعبہ اردو میں ۱۹۷۱ء تک ایم اے اور بی اے آنرز کے علاوہ پی ایچ ڈی کے لیے تحقیقی کام بھی ہوتا رہا۔ تحقیقی کام کی رہنمائی اور نگرانی کی خدمت ڈاکٹر عندلیب شادانی نے انجام دی۔ سقوط ڈھاکہ تک یہاں جو کام مکمل ہوا، اس کی دستیاب تفصیل یہ ہے:

۱۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری۔ ''اردو زبان کا ارتقا[۲۰]'' ۱۹۵۳ء۔

۲۔ ڈاکٹر عبدالحق: ''فارسی شاعری کا اثر اردو شاعری پر[۲۱]'' ۱۹۵۷ء۔

۳۔ ڈاکٹر محمد معزالدین: ''قائم چاند پوری۔ ترتیب کلام مع مقدمہ'' ۱۹۴۶ء۔

۴۔ The Social Analysis of Urdu Poetry During and After، 1857(1964)[۲۲]

۵۔ ڈاکٹر محمد صدرالحق: ''عبدالغفور نساخ، حیات و تصانیف[۲۳]'' ۱۹۶۶ء۔

ان اصحاب کے علاوہ شبیر احمد علوی (جعفر علی حسرت استاد جرأت)، صلاح الدین (اردو شاعری کے رجحانات پہلی جنگ عظیم کے بعد)، سید یوسف حسن (بنگال میں اردو)، ہارون الرشید (اردو شاعری ۱۸۵۷ء کے بعد)، کلیم سہسرامی (شاد عظیم آبادی اور ان کی شاعری) اور شبیر علی کاظمی (اردو اور بنگلہ زبانوں میں مشترک عناصر) کے موضوعات پر تحقیقی کام میں مصروف رہے ہیں۔

(۴)

سندھ یونیورسٹی، حیدرآباد رجامشورو

ایک امتحانی اور الحاقی یونیورسٹی کی حیثیت سے کراچی میں سندھ یونیورسٹی کا آغاز ۱۴ اپریل ۱۹۴۷ء سے ہوا۔ چار برس تک وہ اسی حیثیت سے کام کرتی رہی۔ ۱۹۵۱ء میں کراچی یونیورسٹی کے قیام کے بعد اس نے حیدرآباد منتقل ہو کر تدریسی ذمے داریاں سنبھالیں۔ اب یہ یونیورسٹی حیدرآباد سے جامشورو میں جا آباد ہوئی ہے۔

(الف) پی ایچ ڈی کے مقالات

۱۹۵۳ء میں سندھ یونیورسٹی میں شعبہ اردو کا قیام عمل میں آیا، ۱۹۵۵ء میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کا شعبہ اردو کے پروفیسر اور صدر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ یونیورسٹی سے ان کی وابستگی کے ساتھ یہاں تعلیم و تدریس اور تحقیق کے ایک مہتمم بالشان دور کا آغاز ہوا۔ پچھلے بیس پچیس برس میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی زیر نگرانی بتیس اہل علم نے ڈی فل ر پی ایچ ڈی کی اسناد فضیلت حاصل کیں۔ ان محققین کے کوائف یہ ہیں:

۱۔ ڈاکٹر کریم الدین، ''امیر مینائی اور ان کے تلامذہ[۲۴]''، سال تفویض، ۱۹۶۲ء۔

۲۔ ڈاکٹر خان رشید، ''اردو شاعری کا تاریخی اور سیاسی پس منظر''، ۱۹۶۳ء۔

۳۔ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، ''اردو سندھی کے لسانی روابط[۲۵]''، ۱۹۶۵ء۔

۴۔ ڈاکٹر سید یحییٰ احمد ہاشمی، ''شبلی کا ذہنی ارتقا'' ۱۹۶۶ء۔

۵۔ ڈاکٹر حسین بانو، "ناسخ اور ان کے تلامذہ" ۱۹۶۸ء۔

۶۔ ڈاکٹر نجم الاسلام، "دبستان دہلی کی نثر" ۱۹۶۹ء۔

۷۔ ڈاکٹر محمد مسعود احمد، "اردو میں قرآنی تراجم اور تفاسیر" ۱۹۷۰ء۔

۸۔ ڈاکٹر احمر رفاعی، "جگر مراد آبادی، آثار و افکار ۲۶" ۱۹۷۰ء۔

۹۔ ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی، "ظفر علی خان۔ شاعر اور صحافی ۲۷" ۱۹۷۰ء۔

۱۰۔ ڈاکٹر عبدالحق حسرت کاسگنجوی، "پاکستان میں اردو ناول" ۱۹۷۰ء۔

۱۱۔ ڈاکٹر شاہ محمد نعیم ندوی، "دبستان شبلی کی علمی و ادبی خدمات" ۱۹۷۱ء۔

۱۲۔ ڈاکٹر سردار احمد خان، "میر سوز۔ آثار و افکار" ۱۹۷۱ء۔

۱۳۔ ڈاکٹر حسن محمد خان، "اردو داستانوں پر قرآن کے اثرات" ۱۹۷۱ء۔

۱۴۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، "قدیم اردو ادب کا تحقیقی مطالعہ ۲۸" ۱۹۷۱ء۔

۱۵۔ ڈاکٹر سید معین الرحمن "غالبیات کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ ۲۹" ۱۹۷۲ء۔

۱۶۔ ڈاکٹر منیر الدین عرشی، "ڈپٹی نذیر احمد کی ناول نگاری" ۱۹۷۲ء۔

۱۷۔ ڈاکٹر اقبال احمد خان، "اصغر گونڈوی، آثار و افکار" ۱۹۷۲ء۔

۱۸۔ ڈاکٹر حبیب الثقلین، "اردو میں احادیث نبوی ﷺ کے ترجمے اور تعلیقات" ۱۹۷۳ء۔

۱۹۔ ڈاکٹر شمیم نکہت، "اردو میں قرآنی محاورات" ۱۹۷۳ء۔

۲۰۔ ڈاکٹر کشور سلطانہ "اردو میں قرآنی تلمیحات" ۱۹۷۳ء۔

۲۱۔ ڈاکٹر منہاج الدین "سندھ کے اردو نثر نگار" ۱۹۷۳ء۔

۲۲۔ ڈاکٹر شاکر حلیم، "اردو شاعری پر قرآن و حدیث کے اثرات" ۱۹۷۴ء۔

۲۳۔ ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی، "اردو شعرا کی فارسی اور اردو شاعری کا تقابلی مطالعہ" ۱۹۷۴ء۔

۲۴۔ ڈاکٹر محمد اقبال جاوید "دکن کی منظوم داستانیں" ۱۹۷۴ء۔

۲۵۔ ڈاکٹر غلام حسین اظہر، "اردو افسانے کا نفسیاتی مطالعہ" ۱۹۷۵ء۔

۲۶۔ ڈاکٹر رفعت سلطانہ، "اردو نثر پر تصوف کے اثرات" ۱۹۷۵ء۔

۲۷۔ ڈاکٹر فضل حق خورشید، "اردو نظم کا ارتقا، جعفر زٹلی کے بعد" ۱۹۷۶ء۔

۲۸۔ ڈاکٹر ظفر حسن "سرسید اور حالی کا نظریہ فطرت" ۱۹۷۶ء۔

۲۹۔ ڈاکٹر سید انور علی، "اردو لغت کا ارتقا" ۱۹۷۶ء۔

۳۰۔ ڈاکٹر خالد خاں خٹک، "سندھی، پشتو، اردو کے لسانی روابط" ۱۹۷۸ء۔

۳۱۔ ڈاکٹر ثریا صدیقی، "اردو شاعری کا دینی پس منظر" ۱۹۸۱ء۔

۳۲۔ ڈاکٹر شاہ محمد محمود الرحمن، "جنگ آزادی کے اردو شعرا" ۱۹۸۱ء۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی رہنمائی اور رہبری میں مندرجہ بالا بتیس اہل علم نے اردو میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ تین محققین نے ان کی نگرانی میں ایم فل کی سند پائی۔

۱۔ فضل حق خورشید، "اردو نظم کا تحقیقی جائزہ" ۱۹۷۰ء۔

۲۔ احمد سعید پراچہ "ہندکو، اردو کا تقابلی مطالعہ" ۱۹۷۵ء۔

۳۔ رقیہ بیگم، "مولانا احمد رضا خان، ادبی خدمات" ۱۹۸۲ء۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے علاوہ، شعبہ اردو کے ایک دوسرے سینئر استاد ڈاکٹر سید یحیٰ احمد ہاشمی نے بھی شعبے میں تحقیقی کام کی نگرانی کے فرائض انجام دیئے۔

ان کی رہنمائی میں اب تک نو محقق پی ایچ ڈی کی سند فضیلت پا چکے ہیں:

۱۔ ڈاکٹر تاج الدین، ''اردو شاعری کا معاشرتی پس منظر'' ۱۹۷۴ء۔

۲۔ ڈاکٹر سید سلطان محمود حسنین، ''خطبات گارساں دتاسی، حواشی و تعلیقات'' ۱۹۷۵ء۔

۳۔ ڈاکٹر عبدالواحد خنک، ''اردو سندھی کا تقابلی مطالعہ'' ۱۹۸۷ء۔

۴۔ ڈاکٹر نور محمد سرور اکبر آبادی، ''حامد حسن قادری۔ احوال و آثار'' ۱۹۷۸ء۔

۵۔ ڈاکٹر عزیز انصاری ''اردو اور راجستھانی بولیاں''، ۱۹۷۹ء۔

۶۔ ڈاکٹر عبدالجبار خاں، ''اردو میں سیرت نبویﷺ کا سرمایہ''، ۱۹۷۹ء۔

۷۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن، ''براہوی اردو کا تقابلی مطالعہ'' ۱۹۷۹ء۔

۸۔ ڈاکٹر اشفاق احمد بخاری، ''اردو کی منظوم تمثیلیں'' ۱۹۷۹ء۔

۹۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری، ''تذکرہ خانوادہ ولی اللّٰہی از سرسید'' (ترتیب) ۱۹۸۰ء۔

سندھ یونیورسٹی سے شعبہ اردو میں ڈاکٹریٹ کی تازہ ترین سند ڈاکٹر عبدالستار خان وفا راشدی کو ۱۹۸۲ء میں تفویض ہوئی ہے۔ ان کا موضوع تھا ''اردو کی ترقی میں اولیائے سندھ کا حصہ''۔ انھوں نے اپنا یہ تحقیقی مقالہ سندھ یونیورسٹی کے ایک اعزازی پروفیسر مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کی نگرانی میں تحریر کیا۔

(ب) ڈی لٹ کا مقالہ

شعبہ اردو، سندھ یونیورسٹی سے ڈی لٹ کی ایک اعلیٰ ترین علمی سند بھی عطا ہوئی ہے۔ یہ افتخار، ڈاکٹر جمیل جالبی کو حاصل ہوا جنھیں ان کے تحقیقی کارنامے ''مثنوی نظامی دکنی، المعروف بہ کدم راؤ پدم راؤ'' (مصنفہ فخر دین نظامی) ۳۰ کی ترتیب و تدوین پر ۱۹۷۶ء اردو میں ڈی لٹ کی سند تفویض کی گئی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کو اس تحقیقی کام پر پانچ ہزار روپے کا داؤد ادبی انعام بھی ملا۔

(۵)

کراچی یونیورسٹی، کراچی

کراچی یونیورسٹی ۱۹۵۱ء میں قائم ہوئی۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کو بہت پہلے ۳۱ ہی یونیورسٹی نے اعزازی پروفیسر تسلیم کر لیا تھا اور وہی اردو کے لیے پروفیسروں اور ریڈروں کی انتخابی کمیٹی کے صدر بھی تھے لیکن اردو کے اساتذہ کا انتخاب چونکہ ممکن نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے اردو کا شعبہ ابھی قائم نہیں ہوا تھا۔ ۱۹۵۵ء میں یونیورسٹی نے اردو کی پوسٹ گریجویٹ کلاسیں کالجوں سے لے لیں اور ۱۹۵۶ء۔ ۱۹۵۵ء کے تعلیمی سال کے آغاز پر کالجوں کے چند تسلیم شدہ اساتذہ کے ذریعے شعبہ اردو قائم کیا گیا۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان جو اردو کالج، کراچی میں شعبہ اردو کے سربراہ تھے ۱۹۵۵ء میں تعاون کی بنیاد پر یونیورسٹی کی تدریس پر مامور ہوئے اور صدر شعبہ کی حیثیت سے بھی کام کیا۔

۱۹۵۶ء میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا بہ حیثیت ریڈر تقرر ہوا اگرچہ اس سال بھی تدریسی کام کالجوں کے تسلیم شدہ اساتذہ کے ذریعے جاری رہا۔

(الف) پی ایچ ڈی کے مقالات

کراچی یونیورسٹی سے اردو میں پی ایچ ڈی کی پہلی سند ابوسعید نورالدین نے حاصل کی۔ ان کا تحقیقی مقالہ بعنوان ''اسلامی تصوف اور اقبال'' اپریل ۱۹۵۹ء میں اقبال اکادمی پاکستان (کراچی) سے شائع ہوا ۳۲۔

کوئی بیس بائیس سال تک شعبہ اردو میں تحقیقی کام کی نگرانی اور اس کی منصوبہ بندی کا تمام تر کام شعبے کے سربراہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے ہاتھ میں رہا۔ ان کی نگرانی میں درج ذیل محققین نے پی ایچ ڈی کی اسناد حاصل کیں۔

۱۔ ڈاکٹر مس سکستان لیلیان نذور، ''گارساں دتاسی کی تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی، فرانسیسی سے ترجمہ، مقدمہ حواشی'' ۱۹۶۱ء۔

۲۔ ڈاکٹر عبدالقیوم، ''حالی کی اردو نثر نگاری ۳۳'' ۱۹۶۲ء۔

۳۔ ڈاکٹر اسلم فرخی، ''محمد حسین آزاد۔ حیات اور تصانیف ۳۴'' ۱۹۶۲ء۔

۴۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ''اردو کی منظوم داستانیں ۳۵'' ۱۹۶۴ء۔

۵۔ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، ''اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر ۳۶ (۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ء)''، ۱۹۷۱ء۔

۶۔ ڈاکٹر عبدالسلام ''اردو ناول، بیسویں صدی میں ۳۷'' ۱۹۷۲ء۔

۷۔ ڈاکٹر بسم اللہ نیاز احمد، ''اردو میں گیت''، ۱۹۷۳ء۔

۸۔ ڈاکٹر سید صفدر حسین، ''سر عبدالقادر کی حیات اور ادبی خدمات'' ۱۹۷۵ء۔

۹۔ ڈاکٹر صدیقہ ارمان، ''ممنون۔ حیات اور شاعری'' ۱۹۷۳ء۔

۱۰۔ ڈاکٹر ایس اے علوی، ''جعفر علی حسرت۔ حیات اور تصانیف'' ۱۹۷۵ء۔

۱۱۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل، ''تحریک آزادی میں اردو کا حصہ ۳۸'' ۱۹۷۵ء۔

۱۲۔ ڈاکٹر صفیہ بانو تمنائی، ''انجمن پنجاب، تاریخ و خدمات ۳۹'' ۱۹۷۶ء۔

۱۳۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری، ''اردو کی ترقی میں علمائے کرام کا حصہ'' ۱۹۸۰ء۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی نگرانی میں ایک خاتون ریسرچ فیلو خالدہ افضال قادری کو ۱۹۷۱ء میں ''مخزن، ایک تحریک'' کے موضوع پر ایم فل کی سند بھی ملی۔

کراچی یونیورسٹی سے ۱۹۷۰ء میں ڈاکٹر عبدالقیوم کی زیر نگرانی ''اردو میں شہر آشوب'' کے موضوع پر ڈاکٹر سید قمقام حسین جعفری نے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔

کراچی یونیورسٹی سے بہ تفصیل ذیل چار محققین نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کے کام کی تکمیل کی:

۱۔ ڈاکٹر نسیم سلطانہ، ''داستان امیر حمزہ کا تہذیبی مطالعہ''، ۱۹۷۴ء۔

۲۔ ڈاکٹر شاہدہ بیگم ''سندھ میں اردو کا ارتقا ۴۰، ۱۹۷۸ء۔

۳۔ ڈاکٹر امت الحمید کوثر، ''سرسید اور ان کے رفقائے کار کی علمی خدمات'' ۱۹۸۰ء۔

۴۔ ڈاکٹر محمد احسان الحق، ''پروفیسر حمید احمد خاں۔ احوال و آثار'' ۱۹۸۲ء۔

(ب) ڈی لٹ کا مقالہ:

کراچی یونیورسٹی سے اردو میں ڈی لٹ کی ایک سند بھی تفویض ہوئی۔ ۱۹۷۴ء میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو ان کی کتاب ''اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری'' (مطبوعہ مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۷۴ء۔ ص ۷۵۸) پر عطا کی گئی۔ اس تحقیقی کام پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو ۱۹۷۲ء کے داؤد ادبی انعام سے سرفراز کیا گیا۔ پاکستانی جامعات سے وابستہ وہ پہلے اور واحد محقق اور پروفیسر ہیں جنھیں اردو میں بیک وقت پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کی اسناد فضیلت حاصل ہیں۔

(۶)

پشاور یونیورسٹی، پشاور

پشاور یونیورسٹی میں ایم اے اردو کی جماعتوں کا آغاز ستمبر ۱۹۵۶ء سے ہوا، ابتداً اردو اور فارسی کا شعبہ ایک ہی تھا، ڈاکٹر مظہر علی خاں صدر شعبہ قرار دیے گئے، ۱۹۵۷ء میں مولانا عبدالقادر (ڈائریکٹر پشتو اکیڈمی) مخلوط شعبے کے صدر رہے۔ ۱۹۶۲ء میں فارسی اور اردو کے شعبے الگ الگ کیے گئے اور پروفیسر محمد طاہر فاروقی شعبہ اردو کے صدر بنائے گئے اور مئی ۱۹۶۸ء تک اس خدمت پر مامور رہے۔ ان کے بعد ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی شعبہ اردو کے صدر ہوئے۔ اب وہ کلیہ فنون کے رئیس ہو گئے ہیں اور شعبہ اردو کی صدارت ڈاکٹر سید مرتضیٰ اختر جعفری کے سپرد ہے۔

پشاور یونیورسٹی سے اردو میں پی ایچ ڈی کی صرف ایک سند تفویض ہوئی ہے جو ڈاکٹر عبدالستار جوہر پراچہ نے ۱۹۸۱ء میں ''اردو اور پشتو کے لسانی روابط'' کے موضوع پر ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی اور ڈاکٹر سید مرتضٰی اختر جعفری کی نگرانی میں کامیابی کے ساتھ تحقیقی مقالہ مکمل کر کے حاصل کی۔

(۷)

بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

ملتان یونیورسٹی میں شعبہ اردو کا اجرا ستمبر ۱۹۷۵ء میں ہوا اور شعبے کے انتظامی اور تدریسی امور سید افتخار حسین شاہ کے سپرد ہوئے، پھر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، پروفیسر و صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے ملتان یونیورسٹی سے وابستہ ہوئے اور یونیورسٹی کلیہ فنون کے رئیس بھی رہے۔ ان کے ۱۹۸۰ء کے اوائل میں شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی میں واپس آ جانے کے بعد سے اے بی اشرف، شعبہ اردو کے صدر ہیں۔

پنجاب آرڈیننس نمبر ۱۱، سال ۱۹۷۹ء کے تحت ملتان یونیورسٹی کا نام، چودھویں صدی کے معروف مقامی صوفی بزرگ عالم اور روحانی پیشوا حضرت بہاء الدین زکریا کے اسم گرامی سے منسوب کر کے بہاء الدین زکریا یونیورسٹی رکھ دیا گیا۔ اس یونیورسٹی سے ابھی پی ایچ ڈی کی کوئی سند تفویض نہیں ہوئی۔ بہ تفصیل ذیل پانچ محقق تحقیقی کام میں مصروف ہیں:

۱۔ اے بی اشرف، ''اردو ڈراما نگاری، خصوصی مطالعہ حکیم احمد شجاع''۔ نگران ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا تکمیل ۱۹۸۴ء۔

۲۔ انوار احمد، ''اردو افسانے کا ارتقا''۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، تکمیل ۱۹۸۴ء۔

۳۔ خواجہ ابوالکلام، ''عبدالسلام ندوی، احوال و آثار''، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا۔

۴۔ عبدالرؤف شیخ، ''عابد علی عابد، شخصیت اور خدمات'' ڈاکٹر سلیم اختر، تکمیل، ۱۹۸۶ء۔

۵۔ روبینہ ترین ''ملتان کی تہذیبی و ادبی زندگی میں صوفیائے کرام کا حصہ'' اے بی اشرف، تکمیل ۱۹۸۶ء۔

(پہلے دو مقالات قریب بہ تکمیل ہیں اور امید ہے کہ ۱۹۸۳ء میں سند کے لیے پیش کر دیے جائیں گے۔ باقی موضوعات پر بھی کام تسلی بخش رفتار سے آگے بڑھ رہا ہے)۔

(۸)

اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور

اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور میں ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، شعبہ اردو و اقبالیات کے پروفیسر و صدر کی حیثیت سے برسر کار ہیں۔ اردو بورڈ آف اسٹڈیز میں پیش ہونے سے قبل، پندرہ محقق ان کی رہنمائی میں پی ایچ ڈی کے لیے مختلف موضوعات پر ابتدائی خاکے اور کتابیات کی تیاری میں مصروف ہیں۔

(۹)

جامعہ بلوچستان، کوئٹہ

جامعہ بلوچستان، کوئٹہ کا باقاعدہ آغاز ۱۹۷۲ء میں ہوا۔ شعبہ اردو کا قیام ابتدائی شعبوں کے ساتھ ۱۹۷۳ء میں روبہ عمل آیا۔ مجتبٰی حسین جو سراج الدولہ کالج، کراچی کے پرنسپل تھے، یہاں پروفیسر کی حیثیت میں آئے۔

۱۹۷۷ء سے جامعہ بلوچستان میں پی ایچ ڈی اور ایم فل کا ڈول ڈالا گیا۔ ۱۹۷۷ء ہی میں شعبہ اردو میں پی ایچ ڈی کے لیے شعبے ہی کے دو اسسٹنٹ پروفیسرز اور ایم فل کی سند کے لیے شعبے کے لیکچرز کا اندراج ہوا۔

(الف) پی ایچ ڈی کے موضوعات:

۱۔ شمیم احمد، ''خاندان شاہ ولی اللہ کی اردو خدمات''۔

۲۔ عبدالخالق بلوچ، ''فورٹ ولیم کالج کی اردو خدمات تحقیق مزید کی روشنی میں''۔

(ب) ایم۔فل کے موضوعات:

۱۔ فردوس انور قاضی، ''اردو افسانے کے نئے رجحانات''۔۱۹۸۳ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا ہوئی۔

۲۔ فاروق احمد، ''قیام پاکستان کے بعد اردو شاعری کے جدید رجحانات''۔

کوئٹہ میں اردو کتاب خانے کی روایت بڑی کمزور ہے۔ اعلیٰ تحقیق کے لیے ضروری مواد دستیاب نہیں۔ پروفیسر شمیم احمد نے رجسٹریشن کے ایک سال بعد قاعدے کے مطابق تعلیم رخصت کی درخواست دی تا کہ وہ اپنے زیر تحقیق موضوع پر کام آگے بڑھا سکیں لیکن بوجوہ یہ درخواست نامنظور کردی گئی تو شمیم احمد نے مجبوراً اپنا اندراج منسوخ کرا لیا۔ شمیم احمد صاحب، اب جامعہ کراچی سے وابستہ ہوگئے ہیں۔ اگلے برسوں میں عبدالخالق بلوچ صاحب کا اندراج ایم۔فل میں تبدیل کیا گیا اور فاروق احمد صاحب کا رجسٹریشن عدم دلچسپی کے باعث منسوخ کردیا گیا۔

فردوس انور قاضی صاحب نے پروفیسر مجتبیٰ حسین صاحب کی زیرنگرانی ایم فل کا مقالہ لکھا اور پھر اسے پی ایچ ڈی میں تبدیل کرا لیا۔ ۱۹۸۲ء میں یہ کام مکمل ہوا۔ امید ہے کہ ۱۹۸۳ء میں سند تفویض کردی جائے گی۔ اس صورت میں یہ شعبہ اردو ہی کی نہیں جامعہ بلوچستان کی پی ایچ ڈی کی سند ڈگری ہوگی۔

حوالہ جات

۱۔ ہماری زبان، دہلی، یکم جون ۱۹۷۹ء، ص ۴۔

۲۔ یہ موضوع پاکستان سے باہر بھی خوب پامال ہوا یا طرح طرح سے زیر مشق رہا:

۱۔ اردو ادب پر سماجی اور اقتصادی حالات کا اثر، ڈاکٹر ذکیہ انجم (دہلی)۔

۲۔ دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری منظر، ڈاکٹر محمد حسن (دہلی)۔

۳۔ اودھ میں اردو شاعری کا ارتقا میں حکومت کا اثر، ڈاکٹر زہرہ یاسمین (لکھنؤ)۔

۴۔ اردو شعر کا سیاسی اور سماجی شعور، طلعت رضوی (پٹنہ)۔

۵۔ اردو نظم میں سیاسی شعور، ڈاکٹر احتشام الدین فاروقی (اوجین)۔

۶۔ اردو شاعری کا سماجی پس منظر، ڈاکٹر سید اعجاز حسین (الہ آباد)۔

۳۔ یہ مقالہ ''سعادت یار خان رنگین'' کے نام سے ۱۹۵۶ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی کے زیر اہتمام شائع ہو چکا ہے۔ (صفحات ۵۲۲)۔

۴۔ طبع اول (۱۹۵۸ء) طبع دوم (۱۹۶۶ء) طبع سوم: مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۷۷ء۔

۵۔ مطبوعہ: اردو اکادمی بہاولپور، ۱۹۶۷ء ص ۷۰۸۔ اس کتاب پر ۱۹۶۸ء کا داؤد ادبی انعام دیا گیا۔

۶۔ اس مقالے کا ایک حصہ ''لکھنؤ کی تہذیبی میراث'' کے نام سے کتابی صورت میں لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔

۷۔ ''اردو مرثیے میں مرزا دبیر کا مقام'' کے کتابی نام سے یہ مقالہ ۱۹۷۶ء میں مقبول اکیڈمی، لاہور سے شائع ہوا، (صفحات ۳۴۴)۔

۸۔ مطبوعہ: پنجاب یونیورسٹی پریس، لاہور ۱۹۶۷ء، ص ۵۲۲۔

۹۔ مقالے کا ایک بڑا حصہ ''ڈرامے کا تاریخی وتنقیدی پس منظر'' کے عنوان سے مجلس ترقی ادب، لاہور کے زیر اہتمام ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا، ص ۴۶۶۔

۱۰۔ مطبوعہ: راولپنڈی، اپریل ۱۹۷۰ء، ص ۴۱۳۔ اس کتاب پر داؤد ادبی انعام دیا گیا۔

۱۱۔ مطبوعہ: مجلس ترقی ادب، لاہور، نومبر ۱۹۷۱ء، ص ۴۷۶۔ اس کتاب پر داؤد ادبی انعام دیا گیا۔

۱۲۔ مطبوعہ: کاروان ادب، ملتان، ۱۹۸۲ء، ص ۲۵۵۔ بعنوان ''بچوں کا ادب تاریخ وتنقید''۔

۱۳۔ مطبوعہ: مجلس ترقی ادب، لاہور، مئی ۱۹۸۰ء، ص ۴۸۴، اس کتاب پر داؤد ادبی انعام دیا گیا۔
۱۴۔ مطبوعہ: مکتبہ خیابان ادب، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص ۴۹۶۔
۱۵۔ مطبوعہ: بہ اہتمام مجلس ترقی ادب، لاہور۔
۱۶۔ مطبوعہ: اقبال اکیڈمی، پاکستان، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۲۰+ ۵۰۴+ ۴۶۔
۱۷۔ مقالہ پیش کیا جا چکا ہے۔
۱۸۔ موضوع دوبارہ منظور ہوا، قریب قریب بہ تکمیل ہے۔
۱۹۔ علی رضا شاکر بخاری، فضل میراں گوہر نوشاہی، محمد افضل ضیا، اختر علی، نثار احمد قریشی، طارق عزیز، رضیہ سلطانہ، ملازم حسین اختر، شفیق احمد، بشیر سیفی اور محمد ایوب کو ان مقالات پر ڈگری مل چکی ہے۔
۲۰۔ مطبوعہ: کتاب گھر، ڈھاکہ، ۱۹۵۶ء۔
۲۱۔ مطبوعہ: کتبہ مدرسہ عالیہ، ڈھاکہ۔
۲۲۔ ڈاکٹر محمد حنیف فوق کا مقالہ انگریزی زبان میں لکھا گیا۔
۲۳۔ مطبوعہ: انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۷۹ء، ص ۳۷۶۔
۲۴۔ مطبوعہ: آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۵۴۲۔
۲۵۔ مطبوعہ: مرکزی اردو بورڈ لاہور، مئی ۱۹۷۰ء، ص ۵۱۹۔ اس کتاب پر اڑھائی ہزار روپے کا داؤد ادبی انعام دیا گیا۔
۲۶۔ حصہ اول مطبوعہ: انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۷۹ء، ص ۲۹۲۔
۲۷۔ مقالے کا ایک حصہ ''مولانا ظفر علی خان۔شاعر'' انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی کے زیر اہتمام ۱۹۸۰ء۔
۲۸۔ ''تاریخ ادب اردو'' جلد اول کی صورت میں مقالہ مجلس ترقی ادب، لاہور سے جولائی ۱۹۷۵ء، میں چھپ گیا ہے۔ (صفحات ۷۹۴)۔ اس کتاب پر پانچ ہزار روپے کا داؤد ادبی انعام دیا گیا۔
۲۹۔ زیر طبع انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی۔
۳۰۔ مطبوعہ: انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی ۱۹۷۳ء، ص ۲۹۲۔
۳۱۔ تاریخ جامعہ کراچی، نصیب اختر، مطبوعہ کراچی یونیورسٹی، اکتوبر ۱۹۷۷ء، ص ۷۹۔
۳۲۔ طبع دوم: مئی ۱۹۷۷ء، اقبال اکیڈیمی پاکستان، لاہور، (صفحات ۳۸۱)۔
۳۳۔ مطبوعہ: مجلس ترقی ادب، لاہور دسمبر ۱۹۶۴ء، ص ۷۰۔
۳۴۔ مطبوعہ: انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی ۱۹۶۵ء۔ جلد اول: حیات (صفحات ۴۴۰) جلد دوم: تصانیف (صفحات ۷۹۲)۔ اس کتاب پر داؤد ادبی انعام مبلغ پانچ ہزار روپے دیا گیا۔
۳۵۔ مطبوعہ: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۱ء، ص ۴۹۰۔
۳۶۔ مطبوعہ: ادبی پبلشر، ۱۹۷۵ء، ص ۴۳۹۔ اس کتاب پر پانچ ہزار روپے کا داؤد ادبی انعام دیا گیا۔
۳۷۔ مطبوعہ: اردو اکیڈیمی سندھ، کراچی، اکتوبر ۱۹۶۳ء، ص ۴۴۷۔
۳۸۔ مطبوعہ: انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی ۱۹۷۶ء، ص ۱۰۱۴۔
۳۹۔ مطبوعہ: کفایت اکیڈیمی، کراچی، ۱۹۷۸ء، ص ۴۶۵۔
۴۰۔ مطبوعہ: اردو اکیڈیمی سندھ، کراچی، جون ۱۹۸۰ء، ص ۳۹۷۔

(مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے، اردو تحقیق یونیورسٹیوں میں، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن لاہور، یونیورسل بکس، ۱۹۸۹ء)

❖❖❖❖

ہندوستان میں شائع ہونے والی اہم تحقیقی وتدوینی کتابیں

(آزادی کے بعد)

ڈاکٹر خلیق انجم

آزادی کے بعد ہندوستان میں شائع ہونے والی اہم تحقیقی و تدوینی کتابوں کی فہرست (جو کتابیں پی ایچ ڈی یا ڈی لٹ کے تحقیقی مقالے کے طور پر لکھیں گئی تھیں، ان کے آگے قوسین میں پی ایچ ڈی یا ڈی لٹ لکھ دیا گیا ہے)۔

مخطوطات ومطبوعات کی فہرستیں

۱۔ تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو، مرتبہ پروفیسر محی الدین قادری زور، جلد اول، حیدر آباد، ۱۹۴۳ء۔
۲۔ تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو، مرتبہ پروفیسر محی الدین قادری زور، جلد دوم، حیدر آباد ۱۹۵۱ء۔
۳۔ تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو، مرتبہ پروفیسر محی الدین قادری زور، جلد سوم، حیدر آباد، ۱۹۵۷ء۔
۴۔ تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو، مرتبہ پروفیسر محی الدین قادری زور، جلد چہار، حیدر آباد، ۱۹۵۸ء۔
۵۔ تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو، مرتبہ پروفیسر محی الدین قادری زور، جلد پنجم، حیدر آباد، ۱۹۵۹ء۔
۶۔ تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو، مرتبین محمد اکبر الدین صدیقی اور ڈاکٹر محمد علی، جلد ششم، حیدر آباد۔
۷۔ کتب خانہ جامعہ مسجد میں اردو مخطوطات، حامد اللہ ندوی، بمبئی ۱۹۵۶ء۔
۸۔ کتب خانہ نواب سالار جنگ کی قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست، نصیر الدین ہاشمی، حیدر آباد، ۱۹۵۲ء۔
۹۔ کتب خانہ آصفیہ کے اردو مخطوطات، جلد اول، نصیر الدین ہاشمی، حیدر آباد ۱۹۶۱ء۔
۱۰۔ کتب خانہ آصفیہ کے اردو مخطوطات، جلد دوم، نصیر الدین ہاشمی، حیدر آباد ۱۹۶۱ء۔
۱۱۔ فہرست مخطوطات انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، ابرار حسین، اردو ادب علی گڑھ (جون ۱۹۵۳ء، دسمبر ۱۹۵۴ء)۔
۱۲۔ دہلی کے اردو مخطوطات، ڈاکٹر صلاح الدین، ۱۹۷۵ء۔
۱۳۔ وضاحتی کتابیات (۱۹۷۶ء کی مطبوعات) مرتبین گوپی چند نارنگ، مظفر حنفی، جلد اول، دہلی، ۱۹۸۰ء۔
۱۴۔ وضاحتی کتابیات (۷۸-۱۹۷۷ء کی مطبوعات) مرتبین گوپی چند نارنگ، مظفر حنفی، جلد دوم، دہلی، ۱۹۸۳ء۔

تحقیق اور ترتیب متن پر کتابیں

۱۔ متنی تنقید۔ خلیق انجم، دہلی، ۱۹۶۷ء۔
۲۔ مبادیات تحقیق، عبد الرزاق قریشی، بمبئی، ۱۹۶۷ء۔
۳۔ اصول تحقیق و ترتیب متن، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، دہلی ۱۹۷۷ء۔
۴۔ ادبی تحقیق، مسائل و تجزیہ، رشید حسن خان، علی گڑھ، ۱۹۷۸ء۔
۵۔ رہبر تحقیق، شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی، ۱۹۷۶ء۔
۶۔ تحقیق و تدوین، سید محمد ہاشم، علی گڑھ، ۱۹۷۸ء۔
۷۔ تحقیق کے طریقہ کار، ش۔ اختر، رانچی، ۱۹۷۸ء۔

۸۔ ماہنامہ ''آج کل'' (تحقیق نمبر)، دہلی، اگست ۱۹۶۷ء۔

تذکرے

۱۔ تذکرہ خوش معرکۂ زیبا، سعادت علی ناصر مرتبہ ڈاکٹر سید محمد شمیم لکھنو ۱۹۷۰ء (پی ایچ ڈی)۔

۲۔ شعرا اردو کے تذکرے، ڈاکٹر حنیف نقوی، ۱۹۷۶ء (پی ایچ ڈی)۔

۳۔ شعرائے اردو کے اولین تذکرے، علی گڑھ ۱۹۷۸ء۔

۴۔ رسالہ تذکرات، گارساں دتاسی، ترجمہ ذکا اللہ دہلوی، مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی، دہلی، ۱۹۶۶ء۔

۵۔ تذکرہ ابن طوفان، ابن امین اللہ طوفان، پٹنہ ۱۹۵۴ء۔

۶۔ سفینہ ہندی، بھگوان داس ہندی، مرتبہ پروفیسر عطاء الرحمٰن کاکوی، پٹنہ، ۱۹۵۸ء۔

۷۔ دو تذکرے (تذکرہ شورش از سید غلام حسین۔ تذکرہ عشقی از وجیہہ الدین عشقی، (جلد اول) مرتبہ کلیم الدین احمد، پٹنہ، ۱۹۵۹ء۔

۸۔ دو تذکرے (تذکرہ شورش از سید غلام حسین۔ تذکرہ عشقی از وجیہہ الدین عشقی، (جلد دوم) مرتبہ کلیم الدین احمد، پٹنہ، ۱۹۶۳ء۔

۹۔ عمدہ منتخبہ، اعظم الدولہ میر محمد خان سرور، مرتبہ پروفیسر خواجہ احمد، دہلی، ۱۹۶۱ء۔

۱۰۔ گلشن سخن، مردان علی خان مبتلا، مرتبہ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب، علی گڑھ، ۱۹۶۵ء۔

۱۱۔ طبقات الشعرا، قدرت اللہ شوق، لاہور، ۱۹۶۵ء۔

۱۲۔ گلشنِ ہند، سید حیدر بخش حیدری، پروفیسر مختار الدین احمد، دہلی، ۱۹۶۷ء۔

۱۳۔ مقالات الشعرا، قیام الدین حیرت، مرتبہ پروفیسر نثار احمد فاروقی، دہلی، ۱۹۶۸ء۔

۱۴۔ تین تذکرے (لچھمی نرائن شفیق کا گل رعنا۔ شاہ محمد کمال کا مجمع الانتخاب اور قدرت اللہ شوق کا طبقات الشعرا) مرتبہ پروفیسر نثار احمد فاروقی، دہلی، ۱۹۶۸ء۔

۱۵۔ تذکرہ مسرت افزا، امیر اللہ، مرتبہ، مترجمہ ڈاکٹر مجیب قریشی دہلی، ۱۹۶۸ء۔

۱۶۔ بہارِ بے خزاں، احمد حسین سحر، مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، دہلی ۱۹۶۸ء۔

۱۷۔ نکات الشعرا، میر تقی میر، پروفیسر محمود الٰہی، دہلی ۱۹۷۲ء۔

۱۸۔ تذکرہ آزردہ، مفتی صدر الدین آزردہ، پروفیسر مختار الدین احمد، کراچی، ۱۹۷۴ء۔

۱۹۔ تذکرہ قطعہ منتخب، مولوی عبد الغفور نساخ، ڈاکٹر انصار اللہ نظر، کراچی، ۱۹۷۴ء۔

۲۰۔ تذکرہ شعرائے ہندی، غلام ہمدانی مصحفی، مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری لکھنو، ۱۹۷۹ء۔

۲۱۔ تذکرہ شورش، سید غلام حسین، مرتبہ پروفیسر محمد الٰہی لکھنو (سید عطاء الرحمٰن کاکوی نے اردو شاعروں کے بیشتر تذکرے شائع کیے ہیں۔ انھوں نے تمام تذکروں میں سے نمونہ کلام حذف کر دیا ہے اور فارسی میں لکھے گئے تذکروں کا اردو میں ترجمہ کر دیا ہے۔ ان کے شائع کردہ تذکرے ۲۲ سے ۳۹ تک ہیں)۔

۲۲۔ تین تذکرے (نکات الشعرا از میر تقی میر۔ تذکرہ ریختہ گویان از فتح علی گردیزی اور مخزن نکات از قیام الدین قائم) پٹنہ، ۱۹۶۸ء۔

۲۳۔ گلشن و گلزار (گلشن سخن از مردان علی خان مبتلا۔ گلزار ابراہیم از علی ابراہیم خان خلیل) پٹنہ، ۱۹۶۸ء۔

۲۴۔ بزم سخن و طور کلیم۔ علی حسن خان اور نور الحسن خان، پٹنہ، ۱۹۶۸ء۔

۲۵۔ تذکرہ مسرت افزا۔ امیر اللہ، پٹنہ ۱۹۶۸ء۔

۲۶۔ صبح گلشن، علی حسن خان، پٹنہ، ۱۹۶۸ء۔

۲۷۔ نتائج الافکار، قدرت اللہ گوپاموی، پٹنہ ۱۹۶۸ء۔

۲۸۔ تذکرہ بے نظیر، سید محمد عبد الوہاب افتخار، پٹنہ، ۱۹۶۸ء۔

۲۹۔ روز روشن، محمد مظفر حسین صبا، گوپاموی، پٹنہ، ۱۹۶۸ء۔
۳۰۔ شمع انجمن ونگارستان سخن، صدیق حسن خان اور نور الحسن خان، پٹنہ، ۱۹۶۸ء۔
۳۱۔ چمنستان شعراء، لچھمی نرائن شفیق، پٹنہ، ۱۹۶۸ء۔
۳۲۔ خوش معرکہ زیبا، سعادت خان ناصر، پٹنہ، ۱۹۶۸ء۔
۳۳۔ تذکرہ شعرائے اردو، میر حسن، پٹنہ، ۱۹۷۱ء۔
۳۴۔ انیس الاحبا، موہن لال انیس، پٹنہ، ۱۹۷۱ء۔
۳۵۔ طبقات الشعرائے ہند (طبقہ اول) ایف فلیق وکریم الدین، پٹنہ، ۱۹۷۱ء۔
۳۶۔ طبقات الشعرائے ہند (طبقہ دوم) ایف فلیق وکریم الدین، پٹنہ، ۱۹۷۱ء۔
۳۷۔ مجموعہ نغز، میر قدرت اللہ قاسم، پٹنہ، ۱۹۷۲ء۔
۳۸۔ سخن شعرا، عبد الغفور نساخ، پٹنہ ۱۹۷۲ء۔
۳۹۔ گلشن ہند، مرزا علی لطف، پٹنہ، ۱۹۷۲ء۔
۴۰۔ گلدستہ نازنین، مولوی کریم الدین، پٹنہ ۱۹۷۲ء۔
۴۱۔ مجموعہ نغز، قدرت اللہ قاسم، مرتبہ حافظ محمود شیرانی (دوسرا ایڈیشن) دہلی، ۱۹۷۳ء۔
اتر پردیش اردو اکیڈمی نے تذکروں کا دوسرا ایڈیشن فوٹو آفسٹ کے ذریعے چھاپا۔
۴۲۔ گلستان سخن قطب الدین باطن، لکھنو، ۱۹۸۲ء۔
۴۳۔ سخن شعرا، مولوی عبد الغفور نساخ لکھنو، ۱۹۸۲ء۔
۴۴۔ گلشن بے خار، نواب مصطفیٰ خان شیفتہ، لکھنو، ۱۹۸۲ء۔
۴۵۔ طبقات الشعرائے ہند، کریم الدین لکھنو، ۱۹۸۲ء۔
۴۶۔ گلستان سخن، مرزا قادر بخش قادری، لکھنو، ۱۹۸۲ء۔
۴۷۔ انتخاب یادگار، امیر مینائی، لکھنو ۱۹۸۲ء۔
۴۸۔ تذکرہ معاصرین (جلد اول) دہلی، ۱۹۷۲ء۔
۴۹۔ تذکرہ معاصرین (جلد دوم) دہلی، ۱۹۷۶ء۔
۵۰۔ تذکرہ معاصرین (جلد سوم) دہلی، ۱۹۷۸ء۔
۵۱۔ تذکرہ معاصرین (جلد چہارم) دہلی، ۱۹۸۲ء۔
۵۲۔ تذکرہ شعرائے جے پور، احترام الدین شاغل علی گڑھ، ۱۹۵۸ء۔
۵۳۔ حیدرآباد کے شاعر (جلد اول) خواجہ حمید الدین شاہد، حیدرآباد، ۱۹۵۸ء۔
۵۴۔ حیدرآباد کے شاعر جلد دوم سلیمان ادیب، حیدرآباد، ۱۹۵۸ء۔
۵۵۔ حیدرآباد کے ادیب (جلد اول) زینت ساجدہ، حیدرآباد۔
۵۶۔ حیدرآباد کے ادیب (جلد دوم) زینت ساجدہ، حیدرآباد۔
۵۷۔ بیسویں صدی میں مغربی بنگال کے اردو شعرا، مشتاق احمد، کلکتہ، ۱۹۷۲ء۔
۵۸۔ چند شعرائے بریلی، لطیف حسین ادیب لکھنو۔
۵۹۔ لکھنؤ کے چند نامور شعرا، سید سلیمان حسین لکھنؤ ۱۹۷۳ء۔
۶۰۔ تذکرہ شعرائے اتر پردیش، جلد اول، عرفان عباس لکھنؤ، ۱۹۸۲ء۔

۶۱۔ تذکرہ شعرائے اتر پردیش، جلد دوم، عرفان عباس، لکھنؤ، ۱۹۸۲ء۔

۶۲۔ تذکرہ شعرائے اتر پردیش، جلد سوم، عرفان عباس، لکھنؤ، ۱۹۸۳ء۔

۶۳۔ تذکرہ شعرائے اتر پردیش، جلد چہارم، عرفان عباس، لکھنؤ، ۱۹۸۳ء۔

۶۴۔ تذکرہ شعرائے اتر پردیش، جلد پنجم، عرفان عباس، لکھنؤ، ۱۹۸۳ء۔

۶۵۔ تذکرہ شعرائے اتر پردیش، جلد ششم، عرفان عباس، لکھنؤ، ۱۹۸۳ء۔

۶۶۔ سخنورانِ گجرات، سید ظہیر الدین مدنی، دہلی، ۱۹۸۱ء، (پی ایچ ڈی)۔

۶۷۔ ریاست ٹونک اور اردو شاعری، مختار شمیم، لکھنؤ، ۱۹۷۷ء۔

۶۸۔ غزالانِ سخن (کلکتے کے موجودہ شاعروں کا تذکرہ) کلکتہ، ۱۹۸۵ء۔

غالبیات

۱۔ فرہنگ غالب، مرتبہ امتیاز علی عرشی، رام پور، ۱۹۴۷ء۔

۲۔ دیوان غالب (نسخۂ عرشی) پہلا ایڈیشن مرتبہ امتیاز علی عرشی، علی گڑھ، ۱۹۵۸ء۔

۳۔ دیوان غالب (نسخۂ عرشی) دوسرا ایڈیشن مرتبہ امتیاز علی عرشی، دہلی، ۱۹۸۳ء۔

۴۔ دیوان غالب، مرتبہ مالک رام، دہلی، ۱۹۶۰ء۔

۵۔ خطوط غالب، مرتبہ مہیش پرشاد، نظر ثانی مالک رام، علی گڑھ، ۱۹۶۲ء۔

۶۔ فسانہ غالب، مالک رام، دہلی، ۱۹۷۷ء۔

۷۔ گفتار غالب، مالک رام، دہلی ۱۹۸۵ء۔

۸۔ تلامذہ غالب، مالک رام، پہلا ایڈیشن، دہلی، ۱۹۸۵ء۔

۹۔ تلامذہ غالب، مالک رام، دوسرا ایڈیشن، دہلی ۱۹۸۵ء۔

۱۰۔ قاطع برہان و رسائل متعلقہ، مرتبہ قاضی عبدالودود، دہلی، ۱۹۶۹ء۔

۱۱۔ احوال غالب، مرتبہ پروفیسر مختار الدین احمد، علی گڑھ، ۱۹۵۳ء۔

۱۲۔ نقد غالب، مرتبہ پروفیسر مختار الدین احمد، علی گڑھ، ۱۹۵۶ء۔

۱۳۔ غالب کی نادر تحریریں، خلیق انجم، دہلی، ۱۹۶۱ء۔

۱۴۔ غالب اور شاہان تیموریہ، خلیق انجم، دہلی، ۱۹۷۴ء۔

۱۵۔ غالب کے خطوط (جلد اول) خلیق انجم، دہلی، ۱۹۸۴ء۔

۱۶۔ غالب کے خطوط (جلد دوم) خلیق انجم، دہلی، ۱۹۸۴ء۔

۱۷۔ مرقع غالب، مرتبہ پرتھوی چندر، دہلی، ۱۹۶۶ء۔

۱۸۔ حق جاگیر غالب، پرتھوی چندر، دہلی، ۱۹۶۷ء۔

۱۹۔ غالبیات، پروفیسر عبدالقوی دسنوی، بھوپال، ۱۹۶۸ء۔

۲۰۔ غالب بحیثیت گرافی، ڈاکٹر انصار اللہ نظر، علی گڑھ، ۱۹۷۲ء۔

۲۱۔ دستنبو، مرتبہ صد سالہ یادگار غالب کمیٹی، دہلی، ۱۹۶۹ء۔

۲۲۔ نامہ ہائے غالب، مرتبہ سید اکبر علی ترمذی، دہلی، ۱۹۶۹ء۔

۲۳۔ مطالعہ خطوط غالب، پروفیسر عبدالقوی دسنوی، لکھنؤ، ۱۹۷۵ء۔

۲۴۔ خطوط غالب، فنی تجزیہ، علی گڑھ، ۱۹۸۲ء۔

۲۵۔ متعلقات غالب، کالی داس گپتا رضا، بمبئی، ۱۹۷۸ء۔

۲۶۔ غالبیات۔ چند عنوانات، بمبئی، ۱۹۸۲ء۔

۲۷۔ غالب اور ذکا، ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب، دہلی۔

۲۸۔ دعائے صبا (مع ترجمہ نثر و نیز ترجمہ منظوم) مرتبہ کالی داس گپتا رضا، بمبئی، ۱۹۷۷ء۔

۲۹۔ متفرقات (غالب کے غیر مطبوعہ و نادر مکتوبات و منظومات) مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب (پہلا ایڈیشن) رام پور، ۱۹۴۷ء۔

۳۰۔ متفرقات (غالب کے غیر مطبوعہ و نادر مکتوبات و منظومات) مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب (دوسرا ایڈیشن) لکھنؤ، ۱۹۶۹ء۔

۳۱۔ ذکر سالک (مرزا قربان علی بیگ سالک)، سید سراج الدین علی خان، ۱۹۷۵ء۔

۳۲۔ غالب اور سرور، ایم حبیب خان، دہلی، ۱۹۷۵ء۔

۳۳۔ تفتہ اور غالب، ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن انصاری، دہلی، ۱۹۸۵ء۔

۳۴۔ خاندان لوہارو کے شعرا، حمیدہ سلطان احمد، دہلی، ۱۹۸۱ء۔

اقبالیات

۱۔ آئینۂ اقبال، ڈاکٹر منشاء الرحمٰن منشا، حیدرآباد، ۱۹۷۳ء۔

۲۔ اسرار خودی کا اردو ترجمہ، سید حامد حسین، بھوپال۔

۳۔ اقبال (مضامین کا مجموعہ) محسن، نئی دہلی، ۱۹۷۷ء۔

۴۔ اقبال ادیبوں کی نظر میں، ظفر اقبال، سری نگر، ۱۹۷۹ء۔

۵۔ اقبال اور انسان، اشفاق حسین، حیدرآباد، ۱۹۷۴ء۔

۶۔ اقبال انیسویں صدی میں، عبدالقوی دسنوی، ۱۹۷۷ء۔

۷۔ اقبال اور تصوف، سرور، سری نگر، ۱۹۸۵ء۔

۸۔ اقبال اور دلی، عبدالقوی دسنوی، دلی، ۱۹۷۸ء۔

۹۔ اقبال اور شیش محل، اخلاق اثر، بھوپال، ۱۹۷۷ء۔

۱۰۔ اقبال اور عالمی ادب، عبدالمغنی، گیا، ۱۹۷۲ء۔

۱۱۔ اقبال اور غالب، حامدی کاشمیری، سری نگر، ۱۹۷۸ء۔

۱۲۔ اقبال اور فنون لطیفہ، شکیل الرحمٰن، سری نگر، ۱۹۷۸ء۔

۱۳۔ اقبال اور قومی یکجہتی، سید مظفر حسین برنی، چندی گڑھ، ۱۹۸۴ء۔

۱۴۔ اقبال اور کشمیر، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، سری نگر، ۱۹۷۷ء۔

۱۵۔ اقبال اور مغرب، آل احمد سرور، علی گڑھ، ۱۹۸۱ء۔

۱۶۔ اقبال اور مغربی مفکرین، جگن ناتھ آزاد، دہلی، ۱۹۷۵ء۔

۱۷۔ اقبال ایک تجزیاتی مطالعہ، ساحل احمد، الہ آباد، ۱۹۷۷ء۔

۱۸۔ اقبال ایک تجزیاتی مطالعہ، کلیم الدین احمد، گیا، ۱۹۸۱ء۔

۱۹۔ اقبال، ٹیگور اور نذرل تین شاعر ایک مطالعہ، کلکتہ، ۱۹۷۸ء۔

۲۰۔ اقبال جادوگر ہندی نژاد، عتیق صدیقی، دہلی، ۱۹۸۰ء۔

۲۱۔ اقبال جامعہ کے مصنفین کی نظر میں، گوپی چند نارنگ، دہلی، ۱۹۷۹ء۔
۲۲۔ اقبال دانائے راز، عبدالطیف اعظمی، دہلی، ۱۹۷۸ء۔
۲۳۔ اقبال روشنی کی جمالیات، پروفیسر شکیل الرحمٰن، دہلی، ۱۹۷۷ء۔
۲۴۔ اقبال سخن، رقیہ سلطان، حیدرآباد، ۱۹۵۸ء۔
۲۵۔ اقبال شخصیت اور شاعر، رشید احمد صدیقی، دہلی، ۱۹۷۷ء۔
۲۶۔ اقبال شناسی، علی سردار جعفری، دہلی، ۱۹۷۶ء۔
۲۷۔ اقبال عظمت آدم، قدیر امتیاز، حیدرآباد، ۱۹۷۶ء۔
۲۸۔ اقبال اور فلسفہ، علی گڑھ، ۱۹۷۸ء۔
۲۹۔ اقبال کا تصور خودی، غلام عمر خان، حیدرآباد، ۱۹۶۶ء۔
۳۰۔ اقبال کا تصور عشق، غلام عمر خان، حیدرآباد، ۱۹۶۴ء۔
۳۱۔ اقبال کا فن، گوپی چند نارنگ، دہلی۔
۳۲۔ اقبال کا مطالعہ، پروفیسر حامدی کاشمیری، دہلی، ۱۹۸۳ء۔
۳۳۔ اقبال کامل، عبدالسلام ندوی، اعظم گڑھ، ۱۹۴۹ء۔
۳۴۔ اقبال کا نظام فن، عبدالمغنی، پٹنہ، ۱۹۸۴ء۔
۳۵۔ اقبال کا نظریہ شعر و شاعری، آل احمد سرور، دہلی، ۱۹۷۸ء۔
۳۶۔ اقبال کی تلاش، ظ انصاری، دہلی، ۱۹۷۸ء۔
۳۷۔ اقبال کی تیرہ نظمیں، اسلوب احمد انصاری، دہلی، ۱۹۷۷ء۔
۳۸۔ اقبال کے ابتدائی افکار، ڈاکٹر عبدالحق، جون پور، ۱۹۶۹ء۔
۳۹۔ اقبال کے نثری افکار، عبدالغفار شکیل، دہلی، ۱۹۷۷ء۔
۴۰۔ اقبالیات، پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے بچوں کے لیے بھی اقبال پر کتابیں لکھیں۔
۴۱۔ اوصاف اقبال، بہار الہ آبادی، دہلی۔
۴۲۔ بکھرے خیالات۔ اقبال کی ڈائری، عبدالحق، جون پور، ۱۹۷۵ء۔
۴۳۔ تنقید اقبال اور دوسرے مضامین، عبدالحق، مچھلی شہری، ۱۹۷۶ء۔
۴۴۔ روح اقبال، یوسف حسین خان، دہلی، ۱۹۷۶ء۔
۴۵۔ طلوع مشرق، اقبال کے منتخب فارسی کلام کا ترجمہ، مضطر مجاز، حیدرآباد، ۱۹۷۵ء۔
۴۶۔ فکر اقبال، عالم خوندمیری و مغنی تبسم، حیدرآباد، ۱۹۷۷ء۔
۴۷۔ فلسفہ شاعری اور اقبال، ظفر احمد صدیقی، دہلی، ۱۹۱۵ء۔
۴۸۔ محمد اقبال، جگن ناتھ آزاد، دہلی۔
۴۹۔ مرقع اقبال (علامہ اقبال ان کے متعلقین کی تصویریں اور تحریروں کے عکس) جگن ناتھ آزاد، دہلی، ۱۹۷۷ء۔
۵۰۔ مطالعہ اقبال (اقبال کی شخصیت اور فن پر مقالوں کا مجموعہ) لکھنؤ، ۱۹۷۸ء۔

دکنی ادب

۱۔ کتاب نورس، ابراہیم عادل شاہ ثانی، مرتبہ ڈاکٹر نذیر احمد، لکھنؤ، ۱۹۵۵ء۔

۲۔ چندر بدن ومہیار، مرزا محمد مقیم مقیمی، مرتبہ محمد اکبرالدین صدیقی۔

۳۔ رضوان شاہ وروح افزا، فائزہ، مرتبہ سید محمد، حیدرآباد، ۱۹۵۶ء۔

۴۔ معراج العاشقین، خواجہ بندہ نواز گیسودراز، مرتبہ خلیق انجم، دہلی، ۱۹۵۷ء۔

۵۔ معراج العاشقین، خواجہ بندہ نواز گیسودراز، مرتبہ گوپی چند نارنگ، دہلی، ۱۹۵۷ء۔

۶۔ دیوان اورنگ آبادی، مرتبہ ڈاکٹر خالدہ بیگم، حیدرآباد، ۱۹۵۸ء۔

۷۔ علی نامہ، نصرتی، مرتبہ پروفیسر عبدالمجید صدیقی، حیدرآباد، ۱۹۵۹ء۔

۸۔ پنچھی باچھا، وجیہہ الدین وجدی، مرتبہ سید محمد، حیدرآباد، ۱۹۵۹ء۔

۹۔ کلیات غواصی، ابو محمد غواصی، مرتب محمد بن عمر، حیدرآباد، ۱۹۵۹ء۔

۱۰۔ دیوان عشق، جمال اللہ عشق، مرتبہ محمد اکبرالدین صدیقی، حیدرآباد، ۱۹۶۰ء۔

۱۱۔ دیوان ہاشمی، ہاشمی بیجاپوری، مرتبہ ڈاکٹر حفیظ قتیل، حیدرآباد، ۱۹۶۱ء۔

۱۲۔ کلمۃ الحقائق، برہان الدین جانم، مرتب اکبرالدین صدیقی، حیدرآباد، ۱۹۶۱ء۔

۱۳۔ کلمۃ الحقائق، برہان الدین جانم، مرتبہ ڈاکٹر رضیہ سلطانہ، حیدرآباد، ۱۹۶۱ء۔

۱۴۔ شکار نامہ، خواجہ بندہ نواز گیسودراز، ڈاکٹر ثمینہ شوکت، حیدرآباد، ۱۹۶۲ء۔

۱۵۔ کلیات شاہی، سلطان علی عادل شاہ ثانی شاہی، ڈاکٹر زینت ساجدہ، حیدرآباد، ۱۹۶۲ء۔

۱۶۔ کلیات شاہی، سلطان علی عادل شاہ ثانی شاہی، علی گڑھ، ۱۹۶۲ء۔

۱۷۔ من سمجھاون، شاہ تراب چشتی، پروفیسر سیدہ جعفر، حیدرآباد، ۱۹۶۴ء۔

۱۸۔ لیلیٰ مجنوں، عاجز، مرتبہ ڈاکٹر غلام محمد عمر خان، حیدرآباد، ۱۹۶۷ء۔

۱۹۔ سکھ انجن، شاہ ابوالحسن قادری، پروفیسر سیدہ جعفر، حیدرآباد ۱۹۶۸ء۔

۲۰۔ ابراہیم نامہ، ابراہیم عادل شاہ ثانی کا درباری شاعر، پروفیسر مسعود حسین، علی گڑھ، ۱۹۶۹ء۔

۲۱۔ تاج الحقائق، ملا وجہی، ڈاکٹر نورالسعید اختر، حیدرآباد، ۱۹۷۰ء۔

۲۲۔ ارشاد نامہ، برہان الدین جانم، مرتبہ پروفیسر اکبرالدین صدیقی، ۱۹۷۱ء۔

۲۳۔ داستان نظام علی خان، شاہ کمتر، ڈاکٹر صاحب زادہ میر نجم الدین علی خان،، حیدرآباد، ۱۹۷۸ء۔

۲۴۔ پھول بن، ابن نشاطی، مرتبہ پروفیسر اکبرالدین صدیقی، دہلی، ۱۹۷۸ء۔

۲۵۔ کلمۃ الاسرار، سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ، مرتبہ ڈاکٹر حمیرہ جلیلی، حیدرآباد ۱۹۷۹ء۔

۲۶۔ کلام معظم بیجاپوری، مرتبہ ابو نصر محمد خالد، حیدرآباد، ۱۹۸۰ء۔

۲۷۔ مینا ست ونتی، غواصی، مرتبہ غلام عمر خان، حیدرآباد، ۱۹۸۱ء۔

۲۸۔ کلیات سراج، سراج اورنگ آبادی، مرتبہ عبدالقادر سروری، (دوسرا ایڈیشن) دہلی، ۱۹۸۲ء۔

۲۹۔ کلیات قلی قطب شاہ، دہلی، ۱۹۸۲ء۔

۳۰۔ یوسف زلیخا، مرتبہ ڈاکٹر سیدہ جعفر، حیدرآباد، ۱۹۸۳ء۔

۳۱۔ دکنی لغات، مرتبہ سید ابو تراب خطائی ضامن، بنگلور، ۱۹۷۰ء۔

۳۲۔ دکنی اردو کی لغات، مرتبہ پروفیسر مسعود حسین اور غلام عمر خان، حیدرآباد، ۱۹۶۹ء۔

۳۳۔ سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ، حیات اور کارنامے، ڈاکٹر حسینی شاہد، حیدرآباد، ۱۹۷۳ء۔

۳۴۔ شاہ معظم (منظومات اور تنقید)، ڈاکٹر حسینی شاہد، حیدرآباد، ۱۹۷۸ء۔

۳۵۔ دکنی میں ریختی کا ارتقا، بدیع حسینی، حیدرآباد۔

۳۶۔ غواصی شخصیت اور فن، محمد علی اثر، حیدرآباد، ۱۹۷۷ء۔

۳۷۔ میر شمس الدین فیض، لئیق صلاح، حیدرآباد، ۱۹۸۰ء۔

مونوگراف

۱۔ آرزو لکھنوی حیات اور کارنامے، لکھنو، ڈاکٹر مجاہد حسین ۱۹۷۸ء (پی ایچ ڈی)۔

۲۔ اعجاز حسین، حیات اور کارنامے، الہ آباد، ڈاکٹر سید علی حیدر (پی ایچ ڈی)۔

۳۔ اسرار بیخود، بیخود دہلوی کے سوانح اور انتخاب ڈاکٹر کامل قریشی، ۱۹۸۰ء۔

۴۔ امیر اللہ تسلیم، ڈاکٹر فضل امام، الہ آباد، ۱۹۷۴ء۔ (پی ایچ ڈی)۔

۵۔ اسماعیل میرٹھی، حیات اور کارنامے، ڈاکٹر سیفی پریمی، دہلی، ۱۹۷۶ء۔ (پی ایچ ڈی)۔

۶۔ میر ضمیر، اکبر حیدری کشمیری، لکھنو، ۱۹۷۲ء۔

۷۔ اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر صغرا مہدی، دہلی، ۱۹۷۷ء۔

۸۔ انیسیات، پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب، لکھنو، ۱۹۷۶ء۔

۹۔ انشاء اللہ خان انشا، ڈاکٹر اسلم پرویز، دہلی، ۱۹۶۱ء۔

۱۰۔ حیات ولی، امراؤ حسن فاروقی، نئی دہلی، ۱۹۷۷ء۔

۱۱۔ جلیل مانک پوری، حیات اور کارنامے، ذکی کاکوری، لکھنو، ۱۹۷۸ء۔

۱۲۔ بیان میرٹھی، حیات و شاعری، ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، لکھنو، ۱۹۸۰ء۔

۱۳۔ نسیم دہلوی، حیات اور شاعری، شفیع احمد عثمانی، لکھنو، ۱۹۷۷ء (پی ایچ ڈی)۔

۱۴۔ تذکرہ فانی، مختار، سبزواری، لکھنو، ۱۹۷۶ء۔

۱۵۔ جاں نثار اختر، حیات و فن، ڈاکٹر کشور سلطان، لکھنو، ۱۹۷۷ء (پی ایچ ڈی)۔

۱۶۔ جگن ناتھ آزاد، محمد ایوب واقف، بمبئی، ۱۹۸۰ء۔

۱۷۔ حالی اور نیا تنقیدی شعور، اختر انصاری، علی گڑھ، ۱۹۷۵ء۔

۱۸۔ حامد اللہ افسر، حیات اور کارنامے، اختر یزداں محسن، لکھنو، ۱۹۷۵ء (پی ایچ ڈی)۔

۱۹۔ حیات عابد (ڈاکٹر سید عابد حسین کی سوانح) مرتبہ ڈاکٹر صغرا مہدی، دہلی، ۱۹۸۳ء۔

۲۰۔ حسرت بدایونی، حیات اور ادبی کارنامے، رشید الدین، حیدرآباد، ۱۹۷۹ء۔

۲۱۔ حسرت موہانی، ایم حبیب خان، دہلی، ۱۹۸۵ء۔

۲۲۔ حسرت موہانی، سوانح و انتخاب، طلعت سلطانہ، علی گڑھ، ۱۹۸۲ء۔

۲۳۔ خواجہ غلام السیدین، حیات اور کارنامے، ڈاکٹر سید فرحت حسین، دہلی، ۱۹۸۳ء (پی ایچ ڈی)۔

۲۴۔ خواجہ حسن نظامی، حیات اور ادبی کارنامے، امام مرتضیٰ نقوی، لکھنو، ۱۹۷۸ء (پی ایچ ڈی)۔

۲۵۔ دولہا صاحب عروج، ڈاکٹر نیر مسعود، لکھنو۔

۲۶۔ ڈاکٹر زور، شخصیت اور کارنامے، عطیہ رحمانی، حیدرآباد، ۱۹۸۲ء۔

۲۷۔ ذکر آرزو (ابوالکلام آزاد)، احمد سعید ملیح آبادی، کلکتہ، ۱۹۶۰ء۔

۲۸۔ ذوق، سوانح و انتقاد، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، لاہور، ۱۹۷۸ء۔

۲۹۔ ریاض خیرآبادی، حیات اور ادبی خدمات، ڈاکٹر خلیل اللہ خان، لکھنو، ۱۹۷۴ء (پی ایچ ڈی)۔
۳۰۔ سید نجیب اشرف ندوی، شخصیت اور کارنامے، ریاست علی تاج، حیدرآباد، ۱۹۸۱ء۔ (پی ایچ ڈی)۔
۳۱۔ سرور جہاں آبادی، ڈاکٹر حکم چند نیر، بنارس، ۱۹۶۸ء (پی ایچ ڈی)۔
۳۲۔ شاد عارفی، شخصیت اور فن۔ ڈاکٹر مظفر حنفی، دہلی ۱۹۷۷ء۔
۳۳۔ شفیع الدین نیر، ڈاکٹر اطہر پرویز دہلی۔
۳۴۔ عزیز لکھنوی۔ حیات اور کارنامے، ایس جے صادق، ہمکنڈہ، ۱۹۷۵ء۔
۳۵۔ غلام ربانی تاباں، حیات اور شاعری، شفیق انساء قریشی، دہلی۔
۳۶۔ کنہیالال کپور۔ حیات اور کارنامے، ایس جے صادق ہمکنڈہ ۱۹۷۵ء۔
۳۷۔ کالی داس گپتا رضا، ظفر ادیب، دہلی۔
۳۸۔ گلکرسٹ اور اس کا عہد، عتیق صدیقی، دہلی، (دوسرا ایڈیشن) ۱۹۷۹ء۔
۳۹۔ گوپال متل، محمد عبدالحکیم، دہلی۔
۴۰۔ گویا (فقیر محمد خان گویا)، جعفر ملیح آبادی، لکھنو۔
۴۱۔ بوڑھا درخت (مطالعہ ضیا فتح آبادی)، زرینہ ثانی، مطبوعہ نئی دلی، ۱۹۷۹ء۔
۴۲۔ حالی بہ حیثیت شاعر، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، لکھنو، ۱۹۷۱ء۔
۴۳۔ حالی کا سیاسی شعور، ڈاکٹر معین احسن جذبی، علی گڑھ، ۱۹۵۷ء۔
۴۴۔ دبستان رام پور کا ایک اہم فنکار، میر غلام علی عشرت بریلوی، رانچی، ۱۹۷۸ء۔
۴۵۔ فائز دہلوی اور دیوان فائز، مسعود حسن رضوی ادیب، علی گڑھ ۱۹۶۱ء۔
۴۶۔ فسانۂ عجائب، رجب علی بیگ سرور، مرتبہ اطہر پرویز، الہ آباد ۱۹۶۹ء۔
۴۷۔ ماسٹر رامچند راور اردو نثر کے ارتقا میں ان کا حصہ، ڈاکٹر سیدہ جعفر، حیدرآباد، ۱۹۶۰ء۔
۴۸۔ مانی جائسی حیات اور شاعری، صفدر حسین عابدی، ۱۹۷۵ء۔
۴۹۔ مثنویات راسخ، ممتاز احمد، پٹنہ۔
۵۰۔ مجاز، سوانح شخصیت اور شاعری، محمد حسین دیپک شکوہ آبادی، ۱۹۸۰ء۔
۵۱۔ مرزا محمد علی رضوی حیات شاعری اور کلام، سید محمد حسنین، پٹنہ، ۱۹۵۶ء۔
۵۲۔ مرزا علی لطف حیات اور کارنامے، ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ، حیدرآباد ۱۹۶۹ء۔
۵۳۔ مرزا کلب حسین خان نادر، حیات اور ادبی خدمات، ڈاکٹر معز قیصر، لکھنو ۱۹۸۳ء۔
۵۴۔ مرزا رسوا حیات اور ناول نگاری، ڈاکٹر آدم شیخ، لکھنو، ۱۹۸۱ء۔
۵۵۔ مرزا سلامت علی دبیر، ڈاکٹر محمد زمان آزردہ، ۱۹۸۵ء۔
۵۶۔ مرزا سلامت علی دبیر، ڈاکٹر حیدر کشمیری، لکھنو ۱۹۷۶ء۔
۵۷۔ مرزا یگانہ چنگیزی حیات اور شاعری، ضیاء عظیم آبادی، ۱۹۷۶ء۔
۵۸۔ مسعود حسن رضوی ادیب حیات و خدمات، مرزا جعفر حسین، لکھنو، ۱۹۷۷ء۔
۵۹۔ مضطر خیرآبادی حیات اور شاعری، ڈاکٹر ابومحمد سحر، لکھنو ۱۹۷۹ء۔
۶۰۔ مطالعہ امیر (امیر مینائی) لکھنو، ۱۹۶۵ء۔
۶۱۔ مطالعہ داغ، ڈاکٹر سید محمد علی زیدی، لکھنو، ۱۹۷۴ء۔

۶۲۔ مطالعہ میر، ایم حبیب خان، علی گڑھ ۱۹۷۴ء۔

۶۳۔ مطالعہ ولی، ڈاکٹر شارب ردولوی، لکھنؤ ۱۹۷۴ء۔

۶۴۔ مفتی صدر الدین آزردہ، عبدالرحمٰن پہردار اصلاحی، دہلی ۱۹۷۱ء۔

۶۵۔ مولانا ابوالکلام آزاد فکر و فن، ملک زادہ منظور احمد، لکھنؤ، ۱۹۷۸ء۔

۶۶۔ مولوی کریم الدین، شان احمد صدیقی، لکھنؤ، ۱۹۷۸ء۔

۶۷۔ منشی نولکشور حالات اور خدمات، امیر حسن نورانی، دہلی ۱۹۷۷ء۔

۶۸۔ منور لکھنوی شخصیت اور شاعری، راج نرائن راز، لکھنؤ۔

۶۹۔ منیر شکوہ آبادی سوانح حیات و کلام، بیگم یاسمین، لکھنؤ ۱۹۷۰ء۔

۷۰۔ میراجی شخصیت اور فن، کمار پاشی، دہلی۔

۷۱۔ میر اور میریات، ڈاکٹر صفدر آہ، بمبئی، ۱۹۷۱ء۔

۷۲۔ میر باقر مخلص مرشد آبادی، ڈاکٹر عبدالرؤف، لکھنؤ ۱۹۸۲ء۔

۷۳۔ میر حسن حیات اور ادبی خدمات، ڈاکٹر فضل الحق، دہلی ۱۹۷۳ء۔

۷۴۔ مہدی حسن افادی، عبدالقوی دسنوی، لکھنؤ، ۱۹۷۷ء۔

۷۵۔ مومن شخصیت اور فن، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، دہلی ۱۹۷۲ء۔

۷۶۔ ناسخ شخصیت اور کارنامے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نونہروی، لکھنؤ، ۱۹۷۵ء۔

۷۷۔ نذیر احمد شخصیت اور کارنامے۔ اشفاق احمد اعظمی، گورکھپور ۱۹۷۴ء۔

۷۸۔ نظم طباطبائی حیات اور کارنامے، اشرف رفیع، حیدر آباد ۱۹۷۳ء۔

۷۹۔ نقد بجنوری، حدیقہ بیگم، دہلی، ۱۹۸۵ء۔

۸۰۔ ن۔م راشد شخصیت اور فن، ڈاکٹر مغنی تبسم و ڈاکٹر شہریار، دہلی، ۱۹۸۵ء۔

۸۱۔ نواب صدیق حسن خان، ڈاکٹر رضیہ حامد، دہلی ۱۹۸۴ء۔

۸۲۔ نوح ناروی حیات اور شاعری، ڈاکٹر ظفر الاسلام ظفر، دہلی ۱۹۷۶ء۔

۸۳۔ نوطرز مرصع (میر عطا حسین خان تحسین) ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، لکھنؤ، ۱۹۵۸ء۔

۸۴۔ وجد شاعر اور شخص، یوسف ناظم، دہلی۔

۸۵۔ ولی گجراتی، سید ظہیر الدین مدنی، بمبئی، ۱۹۵۰ء۔

۸۶۔ ہارون خان شیروانی کی ادبی خدمات، صادق نوید، حیدر آباد ۱۹۸۳ء۔

۸۷۔ یاد ادیب، صفیہ ادیب، حیدر آباد ۱۹۸۳ء۔

۸۸۔ یادگار حالی، صالحہ عابد حسین علی گڑھ ۱۹۵۰ء۔

۸۹۔ یادگار غالب، مالک رام، دہلی، ۱۹۷۷ء۔

۹۰۔ یادگار حالی، مالک رام، دہلی ۱۹۷۷ء۔

۹۱۔ یادگار سلیمان، عبدالقوی دسنوی، پٹنہ ۱۹۸۴ء۔

۹۲۔ یادگار امجد حیدر آبادی، اکبر الدین صدیقی، حیدر آباد ۱۹۶۱ء۔

اصناف ادب پر تحقیقی کام

۱۔ اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ، ڈاکٹر سلیم حامد رضوی، بھوپال، ۱۹۶۵ء (پی ایچ ڈی)۔
۲۔ اردو ادب میں تاریخی ناول کا ارتقا، ڈاکٹر نزہت سمیع الزمان لکھنو ۱۹۸۲ء (پی ایچ ڈی)۔
۳۔ اردو نثر کا دہلوی دبستان، ڈاکٹر احمد عبدالرحیم جاگیردار، حیدرآباد، ۱۹۷۵ء۔
۴۔ اردو غزل کی نشو ونما، ڈاکٹر رفیق حسین، الہ آباد، ۱۹۵۵ء۔
۵۔ اردو میں تمثیل نگاری، منظر اعظمی، دہلی، ۱۹۷۷ء (پی ایچ ڈی)۔
۶۔ اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا، ڈاکٹر ممتاز فاخرہ، نئی دلی، ۱۹۷۴ء۔
۷۔ آزادی کے بعد ہندوستان کا اردو ادب، ۱۹۴۷ء تا ۱۹۶۲ء ڈاکٹر محمد ذاکر، دہلی، ۱۹۸۱ء۔
۸۔ اردو کی قدیم داستانیں، ایم حبیب خان، ۱۹۷۴ء۔
۹۔ اردو شاعری میں منظر نگاری، ڈاکٹر سلام سندیلوی، لکھنو، ۱۹۶۸ء (ڈی لٹ)۔
۱۰۔ اردو شاعری میں قومی یکجہتی کی روایت، ڈاکٹر رام آسرا راز، دہلی، ۱۹۷۷ء (پی ایچ ڈی)۔
۱۱۔ اردو ناول آزادی کے بعد، ڈاکٹر اسلم آزاد، متوناتھ بھنجن، ۱۹۸۱ء (پی ایچ ڈی)۔
۱۲۔ اردو ناولوں میں سوشلزم، ڈاکٹر زرینہ عقیل احمد، الہ آباد، ۱۹۸۲ء۔
۱۳۔ آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر بشیر بدر، ۱۹۸۱ء۔
۱۴۔ اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا، ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری، لکھنو، ۱۹۸۱ء (پی ایچ ڈی)۔
۱۵۔ بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا، سید اختر احمد اختر اورینوی، پٹنہ، ۱۹۵۷ء (پی ایچ ڈی)۔
۱۶۔ شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ، ڈاکٹر نعیم احمد، علی گڑھ، ۱۹۷۹ء۔
۱۷۔ بیسویں صدی میں اردو ناول، ڈاکٹر یوسف سرمست، حیدرآباد، ۱۹۷۳ء (پی ایچ ڈی)۔
۱۸۔ ہندوستانی قصوں سے ماخذ اردو مثنویاں، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ۱۹۷۱ء۔ (پی ایچ ڈی)۔
۱۹۔ اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے، پروفیسر عنوان چشتی، دہلی، ۱۹۷۵ء۔
۲۰۔ شمالی ہند میں اردو مثنوی، پروفیسر گیان چند، علی گڑھ، ۱۹۶۶ء۔

مقامی ادب پر تحقیقی کام

۱۔ بہار میں اردو نثر کا ارتقا، مظفر اقبال، ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک، پٹنہ، ۱۹۸۰ء (ڈی لٹ)۔
۲۔ ریاست میسور میں اردو، آمنہ خاتون، بنگلور، ۱۹۶۰ء۔
۳۔ ریاست میسور میں اردو کی نشو ونما، ڈاکٹر حبیب رضا، بنگلور ۱۹۶۲ء۔
۴۔ ریاست میسور کی اردو مثنویاں، فہمیدہ بیگم۔
۵۔ بمبئی میں اردو (۱۹۱۴ء تک)، ڈاکٹر میمونہ دلوی، بمبئی ۱۹۷۰ء (پی ایچ ڈی)۔

تعلیمی اور ادبی اداروں پر تنقید

۱۔ قدیم دلی کالج، مالک رام، دہلی، ۱۹۷۵ء۔
۲۔ دارالترجمہ عثمانیہ کی ادبی خدمات، مجید بیدار، حیدرآباد، ۱۹۸۰ء۔

۳۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، ڈاکٹر عبیدہ بیگم، لکھنؤ ۱۹۸۳ء۔

متن جو مرتب کر کے شائع کیے گئے

۱۔ آرائش محفل، حیدر بخش حیدری، مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز، دہلی ۱۹۷۲ء۔

۲۔ ابن الوقت، نذیر احمد، مرتبہ خلیق انجم، دہلی ۱۹۸۰ء۔

۳۔ افادات سلیم، وحید الدین سلیم، مرتبہ خلیق انجم، دہلی ۱۹۷۲ء۔

۴۔ انتخاب حاتم، ظہور الدین حاتم، ڈاکٹر عبدالحق (دلی یونیورسٹی)، جون پور۔

۵۔ انیس کے مرثیے (دو جلدوں میں) میر انیس، مرتبہ بیگم صالحہ عابد حسین، دہلی، ۱۹۷۷ء۔

۶۔ بکٹ کہانی، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، اور ڈاکٹر مسعود حسین، لکھنؤ۔

۷۔ باغ و بہار، میر امن، مرتبہ رشید حسن خان، دہلی۔

۸۔ خطبات آزاد، مولانا ابوالکلام آزاد، مرتبہ مالک رام، دہلی ۱۹۷۴ء۔

۹۔ خنجر عشق (دیوان) امیر اللہ تسلیم، مرتبہ ڈاکٹر فضل امام لکھنؤ ۱۹۷۳ء۔

۱۰۔ دیوان آبرو، شاہ مبارک آبرو، مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن، علی گڑھ، ۱۹۶۷ء۔

۱۱۔ دیوان اثر، میر اثر، ڈاکٹر کامل قریشی، دہلی، ۱۹۷۸ء۔

۱۲۔ دیوان حسرت عظیم آبادی، حسرت عظیم آبادی، ڈاکٹر اسما سعدی، دہلی، ۱۹۷۸ء۔

۱۳۔ دیوان حضور، مختار الدین احمد، دہلی، ۱۹۷۷ء۔

۱۴۔ دیوان داغ، داغ دہلوی، مرتبہ محمد علی زیدی، الہ آباد، ۱۹۷۸ء۔

۱۵۔ دیوان درد، خواجہ میر درد، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، دہلی، ۱۹۶۳ء۔

۱۶۔ دیوان درد، خواجہ میر درد، رشید حسن خان، دہلی، ۱۹۷۱ء۔

۱۷۔ دیوان درد، خواجہ میر درد، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، دہلی، ۱۹۷۱ء۔

۱۸۔ دیوان درد کا نقش اول، خواجہ میر درد، ڈاکٹر فضل امام، جے پور، ۱۹۷۹ء۔
(یہ دیوان اردوئے معلی کے میر سوز نمبر جلد ۴ شمارہ ۷۔۶ نومبر ۱۹۶۳ء میں شامل ہے)۔

۱۹۔ دیوان سوز، میر سوز، مرتبہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، مقدمہ، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی۔

۲۰۔ دیوان عبداللہ خان مبتلا، مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، علی گڑھ، ۱۹۷۰ء۔

۲۱۔ دیوان عزلت، مرتبہ عبدالرزاق قریشی، بمبئی ۱۹۶۲ء۔

۲۲۔ دیوان قائم، قیام الدین قائم دہلوی، مرتبہ پروفیسر خورشید الاسلام، دہلی، ۱۹۶۳ء۔

۲۳۔ دیوان فائز، فائز دہلوی، مرتبہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب، علی گڑھ۔

۲۴۔ دیوان مومن مع شرح، مومن خان مومن، پروفیسر ضیاء احمد ضیاء بدایونی، الہ آباد طبع چہارم، ۱۹۶۲ء۔

۲۵۔ دیوان ناطق، ناطق گلدوٹھی، مرتبہ محمد عبدالحلیم، ناگ پور ۱۹۷۶ء۔

۲۶۔ رانی کیتکی کی کہانی، انشاء اللہ خان انشا، ڈاکٹر عبدالستار دلوی، بمبئی ۱۹۷۴ء۔

۲۷۔ دیوان شاکر ناجی، مرتبہ ڈاکٹر فضل الحق، دہلوی، ۱۹۶۸ء۔

۲۸۔ رانی کیتکی کی کہانی، انشا، سید سلیمان حسینی لکھنؤ، ۱۹۷۵ء۔

۲۹۔ غبار خاطر، ابوالکلام آزاد، مرتبہ مالک رام، دہلی، ۱۹۷۶ء۔

۳۰۔ فسانۂ عجائب، رجب علی بیگ سرور، الہ آباد، ۱۹۶۹ء۔
۳۱۔ قصہ مہر افروز و دلبر، عیسیٰ خان، مرتبہ ڈاکٹر مسعود حسین، حیدر آباد، ۱۹۶۶ء۔
۳۲۔ کلیات آتش، مرتبہ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، الہ آباد، ۱۹۷۲ء۔
۳۳۔ کلام آتش، آتش لکھنوی، مرتبہ پروفیسر اعجاز حسین، الہ آباد، ۱۹۷۲ء۔
۳۴۔ کلام انشا، مرزا محمد عسکری اور محمد رفیع، الہ آباد، ۱۹۵۲ء۔
۳۵۔ کلیات جرات، جرات لکھنوی، علی گڑھ ۱۹۷۱ء۔
۳۶۔ کلیات چکبست، چکبست لکھنوی، کالی داس گپتا رضا، بمبئی ۱۹۸۱ء۔
۳۷۔ کلیات ذوق، ذوق دہلوی، ہندوستانی ایڈیشن، دہلی، ۱۹۸۰ء۔
۳۸۔ کلیات ذوق، ذوق دہلوی، مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی، لاہور، ۱۹۶۷ء۔
۳۹۔ کلیات سودا، مرزا محمد رفیع سودا، مرتبہ لال عشرت، الہ آباد، ۱۹۷۱ء۔
۴۰۔ کلیات سودا، مرتبہ محمد حسن، دہلی۔
۴۱۔ کلیات شاد عارفی، شاد عارفی، مرتبہ ڈاکٹر مظفر حنفی، دہلی، ۱۹۷۵ء۔
۴۲۔ کلیات عظیم آبادی (تین جلدوں میں)، مرتبہ پروفیسر کلیم الدین احمد، پٹنہ ۱۹۷۵ء۔
۴۳۔ دیوان جوش، مرتبہ ڈاکٹر کلیم الدین احمد، پٹنہ۔
۴۴۔ کلیات نصیر، مرتبہ تنویر احمد علوی، دہلی۔
۴۵۔ کلیات شہزادہ سلیمان شکوہ، ڈاکٹر شاہ عبد السلام، لکھنو، ۱۹۸۲ء۔
۴۶۔ کلیات مصحفی (حصہ اول۔ دیوان اول) غلام ہمدانی مصحفی، مرتبہ پروفیسر نثار احمد فاروقی، دہلی۔
۴۷۔ کلیات مصحفی، مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن نقوی، علی گڑھ۔
۴۸۔ کلیات ممنون (جلد اول قصائد)، ڈاکٹر محمد اکبر الدین صدیقی، حیدر آباد، ۱۹۷۲ء۔
۴۹۔ کلیات مومن، ڈاکٹر مسیح الزمان، الہ آباد، ۱۹۷۱ء۔
۵۰۔ کلیات میر، میر تقی میر، مرتبہ ظل عباس، دہلی، ۱۹۸۳ء۔
۵۱۔ کلیات میر، (حصہ اول، غزلیں) مرتبہ پروفیسر احتشام حسین، الہ آباد، ۱۹۷۲ء۔
۵۲۔ کلیات میر (حصہ دوم۔ مرثیہ و مثنوی) مرتبہ، مسیح الزمان، الہ آباد ۱۹۷۲ء۔
۵۳۔ کلیات میر جعفر زٹلی، مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، علی گڑھ ۱۹۷۹ء۔
۵۴۔ کلیات نظیر اکبر آبادی، اظہر راہی، الہ آباد، ۱۹۷۶ء۔
۵۵۔ کلیات نواب مرزا شوق، مرتبہ ڈاکٹر شاہ عبد السلام۔
۵۶۔ گنج خوبی، میر امن، مرتبہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، دہلی۔

کچھ اور تحقیقی کتابیں

۱۔ مرزا محمد رفیع سودا، خلیق انجم، علی گڑھ، ۱۹۶۵ء۔
۲۔ اثر لکھنوی، حیات اور کارنامے: محمود خاور، حیدر آباد، ۱۹۷۷ء۔
۳۔ اسرار بے خودی (بے خود دہلوی کے سوانح اور انتخاب)، ڈاکٹر کامل قریشی، دہلی، ۱۹۸۰ء۔
۴۔ دبستان آتش، شاہ عبد السلام لکھنو، ۱۹۷۷ء (پی ایچ ڈی) ۔

۵۔ حضرت صوفی منیر کے نثری کارنامے، ڈاکٹر محمد طیب ابدالی، پٹنہ، ۱۹۷۷ء۔
۶۔ دو ادبی سکول، علی جواد زیدی، لکھنؤ ۱۹۷۰ء۔
۷۔ دبستان دبیر، ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی، لکھنو، ۱۹۶۶ء۔
۸۔ انشائے مومن، مومن خان مومن، (فارسی متن اور اس کا ترجمہ)، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، دہلی ۱۹۷۷ء۔
۹۔ انشا کے حریف وحلیف، عابد پشاوری، لکھنؤ ۱۹۷۹ء۔
۱۰۔ قائم اور ان کا کلام، ڈاکٹر محمد امین، علی گڑھ، ۱۹۸۳ء۔
۱۱۔ رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، (پہلا ایڈیشن) حیدر آباد، ۱۹۶۸ء۔
۱۲۔ رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید (دوسرا ایڈیشن) حیدر آباد، ۱۹۷۶ء۔
۱۳۔ اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ، ڈاکٹر محمد عزیز، علی گڑھ، ۱۹۵۳ء۔
۱۴۔ دبستان عشق کی مرثیہ گوئی، ڈاکٹر جعفر رضا، الہ آباد، ۱۹۷۳ء۔ (پی ایچ ڈی)۔
۱۵۔ اردو میں ترقی پسند تحریک، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی، علی گڑھ، ۱۹۵۷ء۔
۱۶۔ اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر، ڈاکٹر پرکاش مونس، الہ آباد ۱۹۷۸ء۔ (پی ایچ ڈی)۔
۱۷۔ پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار، ڈاکٹر شمیم نکہت، لکھنو، ۱۹۷۵ء۔
۱۸۔ اردو کے ادبی معرکے، ڈاکٹر یعقوب عامر، دہلی، ۱۹۸۲ء۔
۱۹۔ ماسٹر رام چندر، اور اردو نثر کے ارتقا میں ان کا حصہ، ڈاکٹر سیدہ جعفر، حیدر آباد، ۱۹۶۰ء۔
۲۰۔ ماسٹر رام چندر، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، دہلی۔
۲۱۔ نسیم دہلوی، حیات اور شاعری، شفیع احمد عثمانی، لکھنؤ ۱۹۷۷ء۔

ایک مصنف پر تحقیقی مضامین کے مجموعے

۱۔ ابوالکلام آزاد، احوال و آثار، مرتبہ مسعود الحسن عثمانی، دہلی، ۱۹۷۷ء۔
۲۔ افکار میر، مرتبہ ایم حبیب خان، علی گڑھ، ۱۹۶۷ء۔
۳۔ انیس شناسی، مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ، دہلی، ۱۹۸۱ء۔
۴۔ بسمل سعیدی، شخص اور شاعر، مرتبہ گوپال متل، دہلی ۱۹۷۶ء۔
۵۔ جگر مراد آبادی، مرتبہ ضامن علی خان، دہلی ۱۹۸۴ء۔
۶۔ شخص کی تلاش کا مسئلہ اور اقبال، مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور، سری نگر، ۱۹۸۵ء۔
۷۔ رام لعل، فن اور شخصیت، مرتبہ نریندر ناتھ سوز، دہلی ۱۹۸۵ء۔
۸۔ فراق، شاعر اور شخص، ڈاکٹر شمیم حنفی، نئی دہلی، ۱۹۸۳ء۔
۹۔ فیض احمد فیض، مرتبہ خلیق انجم، دہلی، ۱۹۸۵ء۔
۱۰۔ مجیب صاحب، احوال و افکار، مرتبین پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی وغیرہ، دہلی ۱۹۸۴ء۔
۱۱۔ مشفق خواجہ، ایک مطالعہ، مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم، دہلی، ۱۹۸۵ء۔
۱۲۔ منٹو، شخصیت اور فن، مرتبہ پریم گوپال متل، دہلی، ۱۹۸۱ء۔
۱۳۔ منور لکھنوی، شخصیت اور کارنامے، راج نرائن راز، لکھنو۔
۱۴۔ منشی پریم چند، شخصیت اور کارنامے، علی گڑھ، ۱۹۸۳ء۔

۱۵۔ منشی دیا نرائن نگم (یادگار جشن صد سالہ)، مرتبہ سری نرائن نگم، کانپور، ۱۹۸۱ء۔

۱۶۔ میرا جی، شخصیت اور فن، مرتبہ کمار پاشی، دہلی ۱۹۸۱ء۔

۱۷۔ ن۔م راشد، شخصیت اور فن، مرتبہ مغنی تبسم اور شہریار، حیدر آباد۔

۱۸۔ نقد فیض، مرتبہ نسیم عباسی، دہلی، ۱۹۷۸ء۔

۱۹۔ وجد، شاعر اور شخص، مرتبہ یوسف ناظم، دہلی۔

۲۰۔ یادگار عرشی ملسیانی، مرتبہ مالک رام، دہلی، ۱۹۸۱ء۔

نذرین

۱۔ نذر عرشی (امتیاز علی خان عرشی، مرتبہ مالک رام، دہلی، ۱۹۶۵ء۔

۲۔ نذر ذاکر (ڈاکٹر ذاکر حسین)، دہلی، ۱۹۶۸ء۔

۳۔ نذر عابد (ڈاکٹر عابد حسین)، دلی ۱۹۷۴ء۔

۴۔ نذر زیدی (کرنل بشیر حسین زیدی)، دہلی، ۱۹۸۰ء۔

۵۔ نذر حمید (حکیم عبدالحمید)، دہلی، ۱۹۸۱ء۔

۶۔ ارمغان مالک (دو جلدوں میں)، مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ، دہلی، ۱۹۷۱ء۔

❖❖❖❖

کتابیات (انگریزی)

BIBLIOGRAPHY

1. Aekoff, R.L; 1953. The Design of Social Research. University of Chicago.
2. Almack, John C., 1930. Research and Thesis Writing. Boston Houghton Mifflinco.
3. Anderson, R.L., and Bancroft, T.A.; 1952. Statistical Theory in Research, Newyork, Mc. Graw-Hill.
4. Andrey, J.Roth; 1969. The Reserch Paper Form and Content, California, Belmont, Wadswarth Publishing Co. Inc.
5. Berelson, B., 1952. Content Analysis in Communication Research, Free Press.
6. Best, John W; 1961. Research and Education, Sixth Printing, Englewood Cliffs, N.J. Prentice-Hall, Inc.
7. Borg, Walter R; 1963. Educational Research an Introduction, David Mc. Key.
8. Butcher, H.J.; 1968. Educational Research in Britain, London University of London Press.
9. Camp Bell, Donald, T and Stanley Julian; 1963. Experimental and Quasi Experimental Designs for Research, Chicago, Ran Mc Nallec.
10. Chapin, F.S.; 1947. Experimental Design and Sociological Research.
11. Churchman, C.W. Ackoff R.L. and Arnoff. E.L.; 1957. Introduction to Operations Research, Wiley.
12. Cochran, W.G.; 1953. Sampling Techniques, Wiley.
13. Cole, Arthur H; and Bigelow, Karl W.; 1956. A Manual of Thesis Writing, Eighth Printing Newyork, John Wiley and Sons.
14. Dewey, John; 1930. The Quest for Certainly, London, George Allen and Urwin Ltd.
15. Duckwort, W.E., Geas A.E., Lockett,A.G:; 1977. A Guide to Operational Research, Newyork John Wiley and Sons.
16. Edwads, A.L., 1950. Experimental Design in Psychological Research, Rhinehart.
17. Elliot, Gathier and Fransesco; 1958. Research and Report Writing, Barns and Noble Series.
18. Festimger, Leon and Domel Katz; 1953. Research Methods on the Behavioural Sciences, Newyork; Holt; Rinehart and Winston.
19. Fisher, R.A,; 1947. Statistical Methods for Research Workers, Oliver and Bayd Edinburgh.
20. Fox David J; 1969. The Research Process in Education, Newyork.
21. Franklin, Billey J. and Hariold W.Osbarne (eds); 1971. Research Methods, Issues and Insights, Belmont, California, Wads Worth Publishing Co.

22. Gatner, Elliot S.M. and Cardasco Fransesco; 1960. Research and report Writing, Eighth Printing, Newyork, Barnes and Noble.

23. Glock Charles Y;1967. Survey Research in the Social Sciences, Newyork; Russell Sage Foundation.

24. Good Carter V. and Scates, Douglas E;1954. Methods of Research, Newyork, Appleton Century, Crafts, Inc.

25. Goode W.J. and P.K.Hatt.; 1952. Methods in Social Research, Megraw-Hill.

26. Hamady A. Taha, Operations Research and Introduction, Newyork Macmillan Publishing Co.Inc.

27. Helmstadter,1970. Research Concepts in Human Behaviour Newyork, Appleton Century Crafts.

28. Holsti Oler; Content Analysis for the Social Science and Humanities.

29. Kelley, Truman, Lec,; 1932. Scientific Method, Newyork, The Macmillan Co.

30. Kerlinger, 1969. Research in Education. Encyclopedeia of Educational Research; Mc Millon.

31. Lehman Irnin,J;1971. Educational Research, Newyork Holt Renehart and Winston

32. Lewis D.G. 1968. Experimental Design in Education, London, University of London Press.

33. Marie Jahoda; Morton Deutsch and Staurt W. Cook; 1961. Research Methods in Social Relations, Newyork; Holt.Rinehart and Winston.

34. Paul D. Leedy; 1974. Practical Research Planning and Design, Newyork; Macmillan Publishing Co. Inc.

35. Pertti,J.Pelto;1970. Anthropological Research. Cambridge, Cambridge University Press.

36. Travers Hillway, 1958. Introduction to Research, Boston Houghton Mifflin. Co.

37. Whitney Fredrick Lamson. The Elements of Research. Newyork, Prentice Hall, Inc. Englewood Cliffs.

38. Whitney, Fredrick Lamson; 1961. The Elements of Research, First Indian Edition, Bombay, Asia Publishing House.

39. Williams Cecil, B. and Stevenson, Allan H.; 1940. A Research Manual First Edition, Newyork Harper and Brothers.

❖❖❖❖

کتابیات (اردو)

۱۔ ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ، رشید حسن خان، علی گڑھ ایجوکیشنل بک ہاؤس، طبع اول ۱۹۷۸ء، طبع دوم، لاہور ۱۹۸۹ء۔

۲۔ ادبی و لسانی تحقیق اصول اور طریق کار، عبدالستار دلوی، بمبئی، بمبئی یونیورسٹی، ۱۹۸۴ء۔

۳۔ ادبی و لسانی تحقیق اور طریق کار، ایضاً، بمبئی ۱۹۹۴ء۔

۴۔ اصول تحقیق و ترتیب متن، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، دہلی، جمال پرنٹنگ پریس، ۱۹۷۷ء۔

۵۔ پاکستان میں اردو تحقیق، موضوعات اور معیار، ڈاکٹر معین الدین عقیل انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی، ۱۹۸۷ء، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۹ء۔

۶۔ تصنیف و تحقیق کے اصول، ڈاکٹر قاضی عبدالقادر، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۲ء۔

۷۔ تصحیح و تحقیق فن، ڈاکٹر نذیر احمد، کراچی، ادارہ یادگار غالب، ۲۰۰۰ء۔

۸۔ تعلیمی پیمائش، پروفیسر عبدالحی علوی، اسلام آباد نیشنل بک فاؤنڈیشن۔ س۔ن۔

۹۔ تعلیمی تحقیق، ڈاکٹر احسان اللہ خان، لاہور، بک ٹریڈرز، ۱۹۷۸ء۔

۱۰۔ تحقیق کے طریقہ کار، ڈاکٹر ش۔ اختر، گیا، تاج پریس، ۱۹۸۵ء۔

۱۱۔ تحقیق کا فن، ڈاکٹر گیان چند جین، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۴ء۔

۱۲۔ رہبر تحقیق، مجموعہ مقالات، لکھنؤ، لکھنؤ یونیورسٹی، ۱۹۷۶ء۔

۱۳۔ لائبریری سائنس اور اصول تحقیق، سید جمیل احمد رضوی، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء۔

۱۴۔ مبادیات تحقیق، عبدالرزاق قریشی، بمبئی، ادبی پبلشرز، ۱۹۶۸ء۔

۱۵۔ متنی تنقید، ڈاکٹر خلیق انجم، دہلی، الجمیت پریس طبع اول ۱۹۶۷ء، کراچی، طبع دوم ۲۰۰۶ء۔

۱۶۔ اردو تحقیق یونیورسٹیوں میں، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، لاہور، یونیورسل بکس، ۱۹۸۹ء۔

۱۷۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو تحقیق، مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی، دہلی، اردو اکیڈمی، ۱۹۹۲ء۔

۱۸۔ تحقیق شناسی، ترتیب و حواشی، رفاقت علی شاہد، لاہور، القمر انٹر پرائزز، ۲۰۰۳ء۔

❖❖❖❖

فہرست مقالات

	مصنف	مقالہ	ماخذ
۱۔	انصار اللہ، محمد،	خالق باری اور اصول تحقیق	اورینٹل کالج میگزین، ۵۶/۳۱۔ لاہور۔
۲۔	احمد فاروقی، ڈاکٹر	مخطوطات شناسی،	مشمولہ مسالک و منازل، نئی دہلی، ۱۹۷۵ء۔
۳۔	تبسم کاشمیری، ڈاکٹر،	تحقیق کے طریقے	نگار، پاکستان، اگست، کراچی، ۱۹۸۱ء۔
۴۔	تبسم کاشمیری، ڈاکٹر،	دستاویزی تحقیق	اورینٹل کالج میگزین، ۵۶/۱، لاہور۔
۵۔	تبسم کاشمیری، ڈاکٹر،	تحقیقی مباحث	قومی زبان، کراچی، اگست، ۱۹۸۱ء۔
۶۔	تبسم کاشمیری، ڈاکٹر،	جدید اردو تحقیق	ہماری زبان، دہلی، ۱۹۸۰ء۔
۷۔	تنویر احمد علوی، ڈاکٹر،	تحقیقی تنقید	جامعہ دہلی، اکتوبر، ۱۹۸۰ء۔
۸۔	روبینہ ترین۔	تحقیق و تدوین، چند اصول	قومی زبان، کراچی اگست، ۱۹۸۴ء۔
۹۔	سید عبداللہ، ڈاکٹر،	تحقیق و تنقید	نیا دور، کراچی، ۱۹۵۶ء۔
۱۰۔	سید عبداللہ ڈاکٹر،	تحقیق و تنقید کے مقامات اتصال	اردو نامہ، کراچی، اپریل تا جون ۱۹۶۰ء۔
۱۱۔	سید محمد عقیل، ڈاکٹر،	تحقیق و مواد کی فراہمی کا مسئلہ	نقوش، مئی، لاہور، ۱۹۶۷ء۔
۱۲۔	سید یحییٰ۔	اردو میں تحقیق	ہماری زبان، ستمبر، ۱۹۷۹ء۔
۱۳۔	عبدالودود، قاضی۔	اصول تحقیق	آج کل، (اردو تحقیق نمبر) دہلی، ستمبر اگست، ۱۹۶۷ء۔
۱۴۔	عبدالودود، قاضی۔	صحت متن	تحریک، دہلی، ستمبر ۱۹۶۲ء۔
۱۵۔	عندلیب شادانی، ڈاکٹر،	تحقیق اور اس کا طریقہ کار	صحیفہ، لاہور، جولائی ۱۹۶۵ء۔
۱۶۔	گیان چند، ڈاکٹر۔	اردو میں تحقیق و تدوین	اردو سہ ماہی، کراچی، ۱۹۸۶ء۔
۱۷۔	گیان چند، ڈاکٹر۔	تحقیق کے تقاضے	شیراز، سری نگر، ۱۹۶۴ء۔
۱۸۔	نگیندر، ڈاکٹر۔	تحقیق و تنقید	مشمولہ رہبر تحقیق، دہلی، ۱۹۷۶ء۔
۱۹۔	مالک رام۔	مخطوطات، تلاش، قرأت اور ترتیب	آج کل، تحقیق نمبر، دہلی، اگست ۱۹۶۷ء۔
۲۰۔	مالک رام۔	اردو میں تحقیق	مشمولہ رہبر تحقیق، دہلی، ۱۹۷۶ء۔
۲۱۔	مجتبیٰ حسین	تحقیق سے تخلیق تک	نگار پاکستان، کراچی، مئی جون، ۱۹۸۰ء۔
۲۲۔	محمد حسین، ڈاکٹر	ادبی تحقیق کے بعض مسائل	نوائے ادب، اپریل، جولائی، ۱۹۶۷ء۔
۲۳۔	مصطفیٰ خان، ڈاکٹر	فن تحقیق	نقوش، لاہور، جنوری ۱۹۶۶ء۔
۲۴۔	نذیر احمد، ڈاکٹر	مخطوطات شناسی میں املائی خواص	جنرل خدا بخش لائبریری، ۱۹۸۰ء۔
۲۵۔	نذیر احمد، ڈاکٹر	تحقیق و تصحیح متن کے مسائل	نقوش، لاہور، مارچ ۱۹۶۳ء۔
۲۶۔	نسیم فاطمہ۔	ادبی تحقیق و کتب خانے	قومی زبان، کراچی، اگست ۱۹۸۱ء۔